کلام الملوک ملوک الکلام
بادشاہوں کا کلام، کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے
الابریز
ملفوظات
حضرت غوث سیدی ابو فارس عبد العزیز دباغ حسنی قادری رضی اللہ عنہ
مرتّب
امام الشیخ احمد بن مبارک السلجماسی المالکی
مترجم
جامع المنقول والمعقول حاوی الفروع والاصول
ابو العلا محمد محی الدین جہانگیر
نوریہ رضویہ پبلیکیشنز
۱۱۔ گنج بخش روڈ لاہور
042-7313885

نام کتاب	——	**الابریز**
ملفوظات	——	سیّدی عبدالعزیز دباغ رحمۃ اللہ علیہ
مرتب	——	شیخ احمد بن مبارک السلجماسی المالکی رحمۃ اللہ علیہ
مترجم	——	ابوالعلاء محمد محی الدین جہانگیر
اشاعت اوّل	——	جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ/ جولائی 2006ء
اشاعت سوم	——	ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ/ جون 2009ء
کمپوزنگ	——	**ورڈز میکر**
تعداد صفحات	——	648
تعداد	——	1100
باہتمام	——	سیّد محمد شجاعت رسول شاہ قادری
ناشر	——	نوریہ رضویہ پبلی کیشنز
مطبع	——	اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز لاہور
کمپیوٹر کوڈ	——	1N-111
قیمت	——	380روپے

ملنے کے پتے

اعلیٰ حضرت بریلوی کے شیخ طریقت

مخدوم شاہ آلِ رسول قادری برکاتی

گدائے آلِ رسول **محمد محی الدین**

اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرمائے
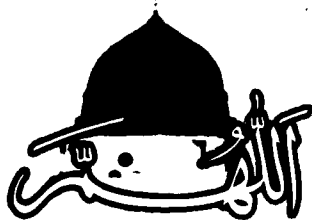
عرضِ ناشر

اللہ تعالیٰ کا بے حد شکر ہے کہ اس نے ہمیں یہ توفیق عطا فرمائی کہ ہم تصوف کی معرکہ آراء تصنیف ''الابریز'' کا ترجمہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ یہ کتاب گیارہویں صدی ہجری کے مشہور صوفی بزرگ غوثِ زماں سیّدی عبدالعزیز دباغ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جسے ان کے فاضل اور چہیتے مرید احمد بن مبارک مالکی نے مرتب کیا۔ سیّدی عبدالعزیز دباغ مراکش کے شہر ''فاس'' کے رہنے والے تھے اور وہیں آپ کا مزارِ مبارک قبلۂ حاجاتِ خلائق ہے۔ ہم اس سے پہلے درود شریف کی مشہور کتاب ''دلائل الخیرات'' کی شرح ''مطالع المسرات'' کا ترجمہ قارئین کی خدمت میں پیش کر چکے ہیں، اس کے مصنف بھی شہر ''فاس'' کے رہنے والے تھے اور اب یہ دوسرا ''مراکشی فاسی'' تحفہ پیشِ خدمت ہے۔ امید ہے یہ کاوش بھی آپ کو پسند آئے گی۔

کسی بھی مخصوص فن سے متعلق کتاب کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنے کے لیے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ مترجم دونوں زبانوں کے محاورے، اور تراکیب کے ساتھ ساتھ متعلقہ فن سے بھی آگاہ ہو۔ ہزار شکر کہ ہمارے فاضل دوست محمد محی الدین ان صفات سے متصف ہیں۔ جس کا اندازہ آپ کو ترجمے کے مطالعہ کے دوران ہو جائے گا۔ اور فنِ تصوف سے متعلق فاضل مترجم کی آگاہی کے ثبوت کے لیے وہ نکات کافی ہیں جو انہوں نے کتاب کے آغاز میں ''العقد الثمین'' کے عنوان کے تحت تحریر کیے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ وہ اس نوعیت کے دیگر نکات وفوائد کو اسی طرح سادہ اور آسان انداز میں مرتب کریں تاکہ فنِ تصوف سے دلچسپی رکھنے والے قارئین ان سے استفادہ کر سکیں۔ ویسے ادارہ عنقریب فاضل مترجم کی مختصر تصنیف ''معارف جہانگیری'' شائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے جس میں نہایت عام فہم انداز میں ''وحدت الوجود'' اور چند دیگر نکات پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ فاضل مترجم نے امیر کبیر سیّد علی ہمدانی کی مشہور تصنیف ''ذخیرۃ الملوک'' کا ترجمہ کیا ہے وہ بھی عنقریب زیورِ طبع سے آراستہ ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ فاضل مترجم کے علم وعمل میں برکت دے اور ہم سب مسلمانوں کو دینِ متین کی خدمت کرنے کی توفیق عطا کرے۔

سیّد محمد شجاعت رسول شاہ قادری

ترتیب

احادیث مبارکہ کی تشریح

تفسیر آیات قرآن

انسان کی ذات اور اعمال میں داخل ہو جانیوالی ظلمتوں کا بیان

دیوان صالحین کا تذکرہ

شیخ اور مرید کے آداب کا بیان

شیخ تربیت کا بیان

برزخ کا بیان

جنت کا بیان

جہنم کا بیان

حدیثِ دل

اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات تمام تر تعریفوں کی مستحق ہے جس نے اپنے ایک عاجز اور کمزور بندے کو یہ ہمت اور صلاحیت عطا کی کہ وہ اس کے برگزیدہ رسول کی اولادِ امجاد میں سے ایک عارف کامل کے ملفوظات وفرمودات کو اُردو زبان میں منتقل کرے تاکہ اُردو داں طبقہ بھی اہل بیت اطہار کے علوم سے فیض یاب ہو سکے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ اس کے فرشتوں اور اہل ایمان کی طرف سے کروڑ ہا کروڑ درود و سلام نازل ہو۔

وہ دہن جس کی ہر بات وحیِ خدا
چشمۂ علم و حکمت پہ لاکھوں سلام

''الابریز'' علم تصوف کی اہم اور مشہور کتب میں سے ایک ہے اس کے ترجمے کی خدمت مجھ جیسے کم علم شخص کے لیے ایک بہت بڑا اعزاز ہے اس کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ رومی کے الفاظ میں ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں۔

ہزار سال بباید کہ تا بباغ ہنر
ز شاخ دولتِ چوں تو گلے ببار آید

کتاب کے مطالعے کے دوران قدم قدم پر اعلیٰ حضرت عظیم البرکت کا یہ مصرعہ نگاہوں میں گھومتا رہا

تیری نسل پاک میں ہے بچہ بچہ نور کا
تو ہے عین نور تیرا سب گھرانہ نور کا

مگر ہمیں اس اعتراف میں کوئی تامل نہیں ہے کہ یہ کتاب جہاں ایک طرف سیّدی عبدالعزیز دباغ کی عظمت شان ورفعت مکان کا منہ بولتا ثبوت ہے وہیں یہ سیّدی احمد بن مبارک سلجماسی کے علم وفضل کی بھی قوی دلیل ہے۔ سیّدی دباغ کے جوابات پر وہ جس طرح اشکال پیش کرتے ہیں اور بعض مقامات پر جہاں انہوں نے اپنی آراء نقل کی ہیں بطور خاص جہاں انہوں نے اپنے ایک استاد کی سیّدی دباغ کے بارے میں بدگمانی دور کرنے کی کوشش کی ہے یا صوفی کے لیے مخصوص قواعد کی پابندی کے مدعی شخص پر گرفت کی ہے نیز امام غزالی سے

منسوب ایک قول پر تنقید و تعاقب کیا ہے وہ مقامات بطور خاص قابل مطالعہ ہیں' ہماری خواہش تھی کہ سیدی احمد بن مبارک سلجماسی کی تحقیقات کا تفصیلی تعارف پیش کرتے مگر کچھ اپنی کوتاہی و کاہلی اور کچھ موقع و محل کی تنگی کے باعث ایسا نہ ہوسکا' مگر اُمید ہے کہ قارئین اس کتاب کے مطالعہ کے دوران خود اس بات کا اندازہ لگا لیں گے۔

بقول حافظ ؎

ترا کہ حسن خدا دادہ است و حجلہ بخت
چہ حاجتست کہ مشاطہ ات بیا راید

مترجم کی حیثیت سے یہ ہمارا اخلاقی فرض تھا کہ نفس کتاب' موضوع یا مصنف کے بارے میں کچھ تحریر کرتے۔ ہم قارئین سے معذرت خواہ ہیں کہ اس میں سے کچھ بھی نہ کرسکے۔ تاہم رسمی خانہ پُری کے لیے ابتداء میں چند صفحات شامل کیے گئے ہیں' جن میں ملفوظات کی طرز پر بعض نکات سے متعلق گفتگو تحریر کی گئی ہے' یہ سوچ کر کہ ؎

کسی طرح تو سجے بزم میکدے والو
نہیں جو بادہ و ساغر تو ''ہاؤ ہو'' ہی سہی

آخر میں ان تمام احباب کا شکریہ جنہوں نے اس کتاب کے ترجمے کے دوران دامے درمے سخنے قدمے تعاون کیا۔ بطور خاص برادرِ عزیز بلال حسن' عمران اعظم' احمد نظامی' محمد خالد اور مدثر اصغر اعوان۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کے مرتب کے شیخ طریقت اور مرتب کے ہمراہ اس کے مترجم' مصحح' طابع' کمپوزرز اور ناشر پر بھی اپنی خاص رحمتیں نازل فرمائے۔ قارئین سے التماس ہے کہ وہ اپنی نیک دعاؤں میں مترجم کو بطور خاص یاد رکھیں۔

محمد محی الدین
(اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرمائے)

العقد الثمین من کلام محی الدین

عرض کی گئی......معرفت الٰہیہ کا مطلب کیا ہے؟

ارشاد فرمایا......اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات کی معرفت ہے اور یہ ایک طے شدہ اصول ہے کہ کسی بھی ذات کی معرفت اس کی صفات کی معرفت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا معرفت الٰہیہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی صفات کی معرفت کا حصول ہوگا۔

عرض کی گئی شاید اسی لیے متکلمین اور صوفیاء اکثر ''صفات الٰہی'' پر بحث کرتے ہیں؟

ارشاد فرمایا......یہ بات درست ہے لیکن یہ نکتہ ذہن نشین کر لیں کہ متکلمین کے غور و فکر اور صوفیاء کے مشاہدے کا تعلق اللہ تعالیٰ کی صفات کی بجائے ''اس کی صفات کے مظاہر'' کے ساتھ ہے اس لیے ''معرفت صفات الٰہی'' سے مراد اللہ تعالیٰ کی ''صفات کے مظاہر'' کی معرفت ہے۔

عرض کی گئی......اللہ تعالیٰ کی بہت سی صفات ہیں اور ان کے مظاہر بھی بے شمار ہیں اس اعتبار سے مظاہر کی معرفت ایک وسیع مضمون ہے؟

ارشاد فرمایا......میں بول رہا ہوں، ہاتھ ہلا رہا ہوں، کھا رہا ہوں، چل رہا ہوں۔ ان تمام امور کو اگر ایک لفظ کے ذریعے بیان کرنا مقصود ہو تو اس کے لیے لفظ ''حرکت'' استعمال کیا جائے گا کیونکہ یہ تمام افعال حرکت ہی کے ''تعینات'' ہیں بالکل اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کی جن صفات کا تعلق مخلوق کے ساتھ ہے ان میں الخالق، الرزاق، الوھاب، المعطی، المنعم، المحی، الممیت، المعز، المذل، السمیع، البصیر، الحکم، العدل، الغفور، الشکور اور ان جیسی دیگر بہت سی صفات شامل ہیں لیکن یہ سب تعینات ہیں ان تمام مفاہیم کو اگر ایک لفظ یا صفت کے ذریعے واضح کرنا مقصود ہو تو اس کے لیے ''صفت تکوین'' کی اصطلاح استعمال کی جائے گی متکلمین نے اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی ہے اگر کوئی شخص اس کے ابتدائی نکات کا مطالعہ کرنا چاہے تو وہ درس نظامی میں داخل علم کلام کی مشہور کتاب ''شرح عقائد نسفیہ'' اس پر ملا خیالی کا حاشیہ، ''خیالی'' کے حاشیے پر ''ملا عبدالحکیم'' کا حاشیہ اور ''شرح عقائد نسفیہ'' کی شرح ''نبراس'' کا مطالعہ کرے۔

عرض کی گئی......صفت ''تکوین'' کا مظہر پوری کائنات ہے اس اعتبار سے معرفت الٰہی کے حصول کیلئے کائنات سے متعلق جملہ علوم سے آگاہی ضروری قرار پائے گی؟

ارشاد فرمایا......اللہ تعالیٰ کی صفات کے دو مظاہر ہیں:

ایک قرآن، یہ صفت کلام کا مظہر ہے۔

دوسرا ''حقیقت محمدیہ'' یہ صفت تکوین کی مظہر ہے۔

عرض کی گئی......یعنی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کائنات حقیقت محمدیہ کے مختلف تعینات پر مشتمل ہے۔

ارشاد فرمایا......آپ نے درست نتیجہ اخذ کیا ہے یہ کائنات اور اس میں دکھائی دینے والے تمام مظاہر حقیقت محمدیہ کے تعینات ہیں۔

عرض کی گئی......قرآن نے کائنات کے لیے ''العالمین'' کی اصطلاح استعمال کی ہے ہم اس سے مراد ''حقیقت محمدیہ'' کس طرح سے لے سکتے ہیں؟

ارشاد فرمایا......''عالم'' کا لغوی معنیٰ ''اللہ'' کے علاوہ کوئی بھی چیز ہے اس اعتبار سے یہ کائنات مجموعی حیثیت سے ایک ''عالم'' ہے لیکن کیونکہ اس کے افراد کی اجناس اور انواع مختلف ہیں لہٰذا ان اجناس اور انواع کے اختلاف کو ظاہر کرنے کے لیے قرآن نے لفظ ''عالمین'' استعمال کیا۔

عرض کی گئی......''حقیقت محمدیہ'' کو مثال کے ذریعے بیان فرمائیں۔

ارشاد فرمایا......سب سے پہلے تو یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ مخلوق میں سے کسی ایک شخص کے لیے بھی حقیقت محمدیہ کا حقیقی فہم حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ نیز یہ ہر ایک مثال اور نظیر سے ماوراء شے ہے۔

عرض کی گئی......شاید اسی لیے مشہور محقق مولوی فضل حق خیر آبادی نے اس موضوع پر ''امتناع نظیر'' تصنیف کی ہے؟

ارشاد فرمایا......مولوی صاحب کی یہ تصنیف اپنے موضوع کے اعتبار سے لاجواب ہے لیکن جس طرح کوئی سیرت نگار یا نعت گو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت کے چند ایک پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے اسی طرح مولوی صاحب نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس خصوصیت کے چند ایک پہلوؤں کو ظاہر کیا ہے۔

عرض کی گئی یہ درست ہے کہ حقیقت محمدیہ ہر ایک مثل اور مثال سے ماوراء ہے۔ تاہم اس کی عظمت شان کے اظہار کے لیے کوئی مثال دی جا سکتی ہے جیسا کہ سنتِ الٰہیہ بھی ہے۔

ارشاد فرمایا سائنس دان کہتے ہیں انسان کا جسم کروڑوں خلیوں پر مشتمل ہوتا ہے اور پھر چند لاکھ یا چند کروڑ خلیے مل کر ایک عضو کی شکل اختیار کر لیتے ہیں مثلاً اگر ایک انسانی جسم مجموعی اعتبار سے چالیس کروڑ خلیوں پر مشتمل ہے تو ان چالیس کروڑ خلیوں میں سے آٹھ لاکھ خلیے مل کر دل کی شکل میں موجود ہوں گے۔ چار لاکھ خلیے ''پتے'' کی شکل میں ہوں گے اس طرح دیگر اعضاء کی مثال سامنے رکھی جا سکتی ہے۔ خلیوں کی تعداد ہم نے بطور مثال بیان کی ہے ورنہ اس تعداد میں کمی و بیشی ممکن ہے۔

بہر حال ہمارے سامنے زید نامی شخص کا پورا جسم موجود ہے۔ یہ جسم مجموعی حیثیت سے ایک ''عالم'' کی

حیثیت رکھتا ہے اور پھر اس جسم کا ہر ایک عضو دِل' دماغ' پھیپھڑے' آنکھیں' زبان اپنی جگہ ایک مستقل ''عالم'' کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک عضو کئی لاکھ یا کئی ہزار خلیوں پر مشتمل ہوتا ہے اور ان میں سے ہر ایک خلیہ ایک مستقل عالم کی حیثیت رکھتا ہے۔ لہٰذا زید کا جسم مجموعی اعتبار سے ایک مستقل عالم ہے اور اس کے اعضاء کی کثرت کے اعتبار سے یہ عالمین بھی ہے۔ جب یہ بات واضح ہو گئی تو اب یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ صوفیاء اس بات کے قائل ہیں کہ ساری کائنات ''عالم اصغر'' ہے اور انسان ''عالم اکبر'' ہے جو اصول اور ضوابط کائنات کے نظام میں جاری و ساری ہیں وہی اصول وضوابط انسانی جسم میں جاری و ساری ہیں۔

عرض کی گئی......اس سے کیا نتیجہ حاصل ہوگا؟

ارشاد فرمایا......جب ہم کائنات میں نظر دوڑاتے ہیں تو ہمارے سامنے بے حد وشمار ستارے بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں سائنس دان بھی یہی بات بیان کرتے ہیں کہ کائنات بے حد وشمار کہکشاؤں پر مشتمل ہے ہر ایک کہکشاں میں کئی ایک ستارے اور سیارے موجود ہیں۔ انہی میں سے ایک ہماری کہکشاں ہے جس میں سورج چاند اور دیگر ستاروں کے ہمراہ ہماری زمین بھی موجود ہے عین ممکن ہے کہ ہم کائنات میں ان ستاروں اور سیاروں کو وہی حیثیت دیں جو انسانی جسم میں خلیوں یا اس سے بھی چھوٹی کسی اکائی کو حاصل ہوتی ہے۔ جس طرح کروڑوں خلیے مل کر ایک انسانی جسم کی حیثیت اختیار کرتے ہیں بالکل اسی طرح یہ کروڑوں ستارے سیارے ان میں موجود مخلوقات مجموعی اعتبار سے ایک جسم کی حیثیت رکھتے ہیں اور وہ مجموعی جسم اپنے اندر موجود روحانی اور باطنی قوت سمیت ''حقیقت محمدیہ'' ہے اگر انسان غور کرے تو کائنات اور انسانی جسم میں بے شمار مشابہتیں پائی جاتی ہیں جس طرح انسانی جسم میں روح کی موجودگی کروڑوں خلیوں کو متحرک رکھتی ہے اسی طرح ''روح محمدی'' کی موجودگی کے باعث اس کائنات میں موجود بے حد وشمار ستارے سیارے اور دیگر مخلوقات حرکت میں ہیں۔ تاہم یہ بات پیش نظر رہے کہ یہ حیثیت حقیقت محمدیہ کا ایک رخ' بلکہ بے حد وشمار حجابات کے ہمراہ اس ایک رخ کا ہزاروں پہلو ہے کیونکہ حقیقت محمدیہ کا حقیقی فہم مخلوق میں سے کسی ایک فرد کو بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

عرض کی گئی......یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی ایک نکتہ اپنی کچھ جھلک دکھا رہا ہے لیکن مکمل طور پر واضح نہیں ہو رہا؟

ارشاد فرمایا......اب ہم واپس اپنے اصل مضمون کی طرف جائیں گے یعنی ''معرفت الٰہیہ'' ہم نے یہ بات بیان کی ہے کہ ''معرفت الٰہیہ'' سے مراد ''معرفت ذات الٰہی'' ہے اور معرفت ذات الٰہی سے مراد ''معرفت صفات الٰہی)) ہے اور معرفت صفاتِ الٰہی سے مراد ''معرفت مظاہر'' ہے۔ اور اصول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت تکوین کا کامل ترین مظہر حقیقت محمدیہ ہے تو نتیجہ یہ سامنے آیا کہ معرفت الٰہی سے مراد ''معرفت حقیقت محمدیہ'' ہو گی۔ اب جو شخص نبی اکرم علیہ السلام کی جس قدر زیادہ معرفت حاصل کرے گا وہ درحقیقت اسی قدر زیادہ معرفت الٰہی حاصل کرنے والا ہوگا۔

عرض کی گئی......اب تک کی گفتگو اس بات پر مشتمل تھی کہ ''معرفت الٰہیہ'' سے مراد کیا ہے؟ اب آپ اس بات کی وضاحت کریں کہ ''معرفت الٰہیہ'' کے حصول کا طریقہ کیا ہے؟

ارشاد فرمایا......معرفت الٰہیہ کے حصول کے تین طریقے ہیں:

۱- عقلی طریقہ' یہ متکلمین کا طریقہ ہے

۲- روحانی طریقہ' یہ صوفیاء کا طریقہ ہے۔

۳- علمی طریقہ' یعنی کوئی طالب علم صوفیاء یا متکلمین کے بیان کردہ نکات کا علم حاصل کرے۔ کوئی بھی شخص ابتدائی طور پر تیسرے طریقے کے ذریعے معرفت الٰہی حاصل کرتا ہے یعنی وہ متکلمین کے بیان کردہ نکات یا صوفیاء کے بیان کردہ مشاہدات کو پڑھ کر اللہ تعالیٰ کی صفات کی عظمت کا علم حاصل کرتا ہے۔

عرض کی گئی......متکلمین صفات الٰہیہ سے متعلق مباحث میں بعض نکات میں ایک دوسرے سے مختلف نکتہ نظر رکھتے ہیں اس کا بنیادی سبب کیا ہے؟

ارشاد فرمایا......میں پہلے اس بات کی وضاحت کر چکا ہوں۔ ''معرفت الٰہیہ'' سے مراد اللہ تعالیٰ کی صفات کے مظاہر کی معرفت ہے اور وہ دو ہیں: ایک قرآن اور دوسرا کائنات۔ بعض اوقات متکلمین کے سامنے کائنات سے متعلق کسی ایک گوشے کا علم ظاہر ہوتا ہے یا قرآن کی کسی ایک آیت کا مفہوم ان کی سمجھ میں آتا ہے اور پھر وہ اپنے فہم کے مطابق مسئلہ بیان کر دیتے ہیں لیکن درحقیقت کائنات یا قرآن کے دیگر گوشوں تک ان کی نظر نہیں پہنچ پاتی۔ اور ان دیگر گوشوں میں سے کوئی ایک پہلو کسی دوسرے متکلم کے سامنے روشن ہو جاتا ہے تو وہ اپنی فہم کے مطابق مسئلہ بیان کر دیتا ہے ان کی مثال ان سائنس دانوں کی مانند ہے جن کے سامنے کوئی ایک یا چند ایک آفاقی اصول روشن ہوتے ہیں اس لیے ان کی آراء میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

عرض کی گئی......شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کو توحید کا بہت بڑا علمبردار سمجھا جاتا ہے؟

ارشاد فرمایا......چند لوگ عقیدہ توحید اختیار کرتے ہوئے شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کی بیان کردہ تعبیرات کے مطابق نظریہ اختیار کرتے ہیں ہم ان سے صرف یہ سوال کریں گے کہ کیا شیخ محمد بن عبدالوہاب معصوم عن الخطاء ہیں؟ اگر ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے انہیں منصب نبوت پر فائز کر دیا ہے اور اگر وہ معصوم عن الخطاء نہیں ہیں تو پھر آپ نے کبھی لمحے بھر کے لیے اس امکان کو پیش نظر رکھا کہ عقیدہ توحید کی وضاحت کے دوران شیخ محمد بن عبدالوہاب سے ''تقاضائے بشریت'' کے تحت کوئی غلطی سرزد ہو سکتی ہے؟ شیطان انہیں بہکا سکتا ہے؟ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے جس ''بشریت'' کا زور شور سے اثبات کیا جاتا ہے وہ شیخ ابن عبد الوہاب النجدی میں کیوں دکھائی نہیں دیتی؟ فقہی مسائل میں امام اعظم کی تقلید کرنے پر ''شرک فی الرسالت'' کی پھبتیاں کسی جاتی ہیں جب کہ عقیدہ توحید میں شیخ نجدی کی اندھی تقلید کی جاتی ہے۔

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے

عرض کی گئی...... شیخ نجدی عقیدہ توحید کی تعبیر میں کس بنیادی غلطی کا شکار ہوئے۔

ارشاد فرمایا...... شیخ نجدی کا طریقہ کار علمی طریقہ تھا اور علمی طریقہ میں انہوں نے صفات الٰہی کے مظہر ''قرآن'' میں غور وفکر کیا اور ''قرآن'' میں غور وفکر کے دوران ان کی توجہ چند آیات کے ظاہری مفہوم تک محدود رہی جس کے نتیجے میں وہ بہت سی فاش غلطیوں کا شکار ہوئے جن کی وضاحت علماء نے مختلف کتابوں میں کی ہے لیکن ہمارا موضوع شیخ کی غلطیوں پر گرفت کرنا نہیں ہے اس لیے ہم اس بحث کو یہیں ختم کرتے ہیں۔

عرض کی گئی...... فہم القرآن کے اُصول کیا ہیں؟

ارشاد فرمایا...... سب سے پہلے یہ نکتہ ذہن نشین کر لیں کہ قرآن میں موجود ہر لفظ ایک مخصوص شرعی و اصطلاحی معنی رکھتا ہے۔ اگرچہ قرآن کے بعض الفاظ کا ترجمہ کرتے ہوئے لغوی معنی ہی بیان کیے جاتے ہیں لیکن درحقیقت وہ لفظ بھی اصطلاحی معنی کا حامل ہوتا ہے۔

عرض کی گئی...... آپ کے اس بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قرآن کے الفاظ کے ایک ظاہری معنی ہیں اور دوسرے باطنی معنی ہیں۔ کیا قرآن کے معنی کی ظاہری و باطنی تقسیم درست ہے؟

ارشاد فرمایا...... ''ظاہر'' اور ''باطن'' اللہ تعالیٰ کی دو صفات ہیں اور ان کے انوار اللہ تعالیٰ کی صفات کے مظاہر یعنی قرآن اور کائنات پر بھی وارد ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں ان مظاہر میں ظاہری اور باطنی دونوں پہلو پائے جاتے ہیں۔

جس طرح انسان کا ایک ظاہری جسم ہے لیکن اس ظاہری جسم کے باطن میں کروڑوں خلیوں اپنی اپنی جگہ پر حرکت میں مصروف ہیں پھر کئی ہزار یا کئی لاکھ خلیوں مل کر ایک عضو کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ اور وہ عضو خود ایک مخصوص عمل میں مشغول ہے جیسے جگر خون پیدا کر رہا ہے دِل اس خون کو پورے جسم تک پہنچا رہا ہے اس طرح دیگر اعضاء بھی اپنے مخصوص عمل میں مصروف ہیں ظاہری طور پر ہمارے سامنے بیٹھا ہوا انسان اپنی جگہ پر ساکت بیٹھا یا لیٹا ہوا ہے لیکن درحقیقت باطنی طور پر اس کا پورا جسم متحرک ہے۔

پھر ظاہری طور پر یہ کروڑوں خلیوں یا چند لاکھ خلیوں کا مجموعہ کوئی عضو ایک مخصوص شکل میں ہمیں دکھائی دے سکتا ہے لیکن درحقیقت ان کی تمام تر حرکت اور عمل اس روح کے تابع ہے جو ان کے باطن میں موجود ہے۔

ہم اسی ایک مثال کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن میں غور کر سکتے ہیں کہ اس کے حروف میں سے ہر ایک حرف ایک مستقل عالم کی حیثیت رکھتا ہے پھر چند حروف کا مجموعہ ایک لفظ کی حیثیت اختیار کر کے ایک اور عالم کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے پھر چند الفاظ مل کر ایک رکوع' سورہ یا پارے کی شکل میں ایک اور عالم کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں تو اب ان حروف کی ظاہری ادائیگی یا تحریری شکل میں موجود نقش ونگار ظاہر کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن یہ جن معنی پر دلالت کرتے ہیں وہ ایک اعتبار سے باطن ہیں مثلاً جو شخص عربی نہیں جانتا بلکہ اس نے صرف الفاظ کی قرأت کا علم حاصل کیا ہے اس کے لیے الفاظ کے معنی باطن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص عربی زبان سے

واقفیت حاصل کر لیتا ہے تو وہ ان الفاظ کے لغوی معنی سے واقف ہو جائے گا لیکن اصطلاحی معنی جاننے کے لئے اسے دیگر شرعی علوم کو حاصل کرنا پڑے گا اب چونکہ قرآن کے الفاظ اللہ تعالیٰ کی صفت کلام کا مظہر ہیں اس لیے قرآن میں موجود تمام الفاظ مخصوص اصطلاحی مفہوم رکھتے ہیں اسی لیے سیّدی عبدالعزیز دباغ نے یہ بات بیان کی ہے کہ قرآن کے ہر لفظ اور ہر حرف میں مخصوص انوار پائے جاتے ہیں یہاں تک کے اگر ایک ہی لفظ کو دو مرتبہ استعمال کیا گیا ہو تو دونوں کے انوار ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے جس شخص کو اللہ تعالیٰ ''فتح'' نصیب کر دے وہ ان انوار کا آسانی سے مشاہدہ کر سکتا ہے۔

عرض کی گئی...... آپ نے فرمایا ہے کہ ''کائنات'' اس کی صفت خلق کی مظہر ہے جب کہ قرآن صفت کلام کا مظہر ہے، کیا وجہ ہے کہ کائنات اس قدر پھیلی ہوئی ہے کہ اس کی انتہاء تک پہنچنا عملاً ناممکن نظر آتا ہے اس کے برعکس قرآن کے الفاظ چند سو صفحات میں سما جاتے ہیں۔

ارشاد فرمایا...... قرآن نے بالکل آغاز میں حضرت آدم علیہ السلام کا واقعہ نقل کیا ہے یعنی وہ انسان جو انسانیت کا نقطہ آغاز ہے اس انسان کو سجدہ کرنے کا حکم فرشتوں کو دیا گیا آپ نے کبھی غور کیا آج دُنیا میں انسانی آبادی 6 ارب سے زائد ہے اور آج سے پہلے اربوں انسان اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور نہ جانے کتنے ارب انسان ابھی مزید دنیا میں آئیں گے۔ لیکن یہ تمام انسان اس وقت ایک آدم کی پشت میں موجود تھے وہ حضرت آدم درحقیقت ان تمام انسانوں کا مجموعہ تھے اور انہی سے پھیلا کر اربوں انسانوں کو دُنیا میں بھیجا گیا کائنات کی بھی یہی مثال ہے۔ قرآن کہتا ہے:

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا۔ (الانبیاء ۲۱: ۳۰)

''اور کیا کافر لوگوں نے نہیں دیکھا کہ جملہ آسمانی کائنات اور زمین (سب) ایک اکائی کی شکل میں جڑے ہوئے تھے، پس ہم نے ان کو پھاڑ کر جدا کر دیا۔''

ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے سامنے موجود قرآن ایک محدود اور مخصوص حجم کا وجود ہے بالکل اسی طرح جیسے شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کے ظاہری جسم کو دیکھ کر اسے محض مٹی کا ایک مختصر وجود گمان کیا تھا۔ حالانکہ درحقیقت مٹی کے اسی وجود میں اولادِ آدم میں آنے والے تمام انبیاء، مصلحین، بہادر، دانشور موجود تھے۔

عرض کی گئی...... اس کا مطلب یہ ہوا کہ ظاہری اعتبار سے قرآن کے الفاظ محدود محسوس ہوتے ہیں لیکن باطنی اعتبار سے ان کے معانی بے حد و شمار ہیں۔

ارشاد فرمایا...... اسی لیے قرآن کہتا ہے:

وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (الانعام ۶: ۵۹)

''اور نہ کوئی تر چیز ہے اور نہ کوئی خشک چیز مگر روشن کتاب میں (سب کچھ لکھ دیا گیا ہے)۔''

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (النحل ۱۲: ۸۹)

''اور ہم نے آپ پر وہ عظیم کتاب نازل فرمائی ہے جو ہر چیز کا بڑا واضح بیان ہے۔''

عرض کی گئی......مفسرین نے بڑی وضاحت کے ساتھ قرآن کی مختلف علوم کو بیان کیا ہے۔

ارشاد فرمایا......اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مفسرین نے اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق قرآن کی تفسیر بیان کرنے کا اہتمام کیا لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ سابقہ تیرہ صدیوں میں انسانیت نے مختلف علوم وفنون کی جزئیات نگاری میں اتنی ترقی نہیں کی جتنی صرف چودھویں صدی ہجری میں ہوئی ہے نیز اس ترقی نے مختلف علوم وفنون کی مزید تفصیلات تک رسائی کو زیادہ آسان اور تیز رفتار کر دیا ہے اس لیے علماءِ اسلام کا یہ فرض ہے کہ وہ ان علوم و فنون کی مدد سے قرآنی علوم کے خفیہ گوشوں کی نقاب کشائی کریں جیسا کہ میں پہلے وضاحت کر چکا ہوں کہ کائنات صفت خلق کی مظہر ہے اور قرآن صفت کلام کا مظہر ہے اور ان دونوں صفات کا تعلق کیونکہ ایک ہی ذات کے ساتھ ہے اس لیے وہ تمام علوم جن کا تعلق کائنات کے ساتھ ہے وہ سب علوم قرآن سے متعلق ہی ہوں گے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان دونوں کے درمیان مناسبت تلاش کی جائے۔

عرض کی گئی......اس کے لیے علماءِ اسلام کو جدید سائنسی تحقیقات سے آگاہی حاصل کرنا پڑے گی؟

ارشاد فرمایا......ایک شخص کے لیے عملاً یہ بات ناممکن ہے کہ وہ سائنس کے جملہ علوم اور ان کی تفصیلات سے پوری طرح آگاہ ہو۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی عالم دین سائنس کے کسی ایک شعبے میں مہارت حاصل کر کے قرآن کی بعض آیات یا اسلام کی بعض تعلیمات کی تفصیلی ترجمانی کر سکے۔

عرض کی گئی......اس کی کوئی مثال عنایت کریں؟

ارشاد فرمایا......قرآن نے بالکل آغاز میں اللہ تعالیٰ کے لیے لفظ رحمٰن اور رحیم استعمال کیا ہے اب اگر سرسری نظر سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا جائزہ لیا جائے تو دنیا میں حاصل ہونے والی تمام نعمتیں اللہ کی رحمت اور فضل کا نتیجہ ہیں اور اگر نسبتاً تفصیل سے جائزہ لیا جائے تو انسان صرف اپنی ہی ذات میں غور کرے کہ کس طرح اس کے جسم میں موجود کروڑوں خلیوں اپنے مخصوص مقام پر مخصوص عمل سرانجام دینے میں مصروف ہیں پھر یہ خلیوں مجموعی طور پر ایک عضو کی شکل اختیار کر کے کسی دوسرے فعل کو انجام دینے میں مصروف ہیں ہمارے جسم میں ہر وقت خون کی روانی برقرار رہتی ہے۔ یہ خون دماغ کی نازک اور باریک نالیوں میں سے گزرتا ہے اس میں گردش کے دوران مختلف خلیے بنتے اور ختم ہوتے رہتے ہیں اگر کسی ایک مقام پر انکا یہ عمل رک جائے تو انسان شدید ترین تکلیف میں مبتلا ہو جائے لیکن اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور فضل کے باعث عام طور پر بنی نوع انسان کو اس طرح کی بیماریوں سے محفوظ رکھتا ہے اور اگر کسی شخص کو ظاہری طور پر اس میں مبتلا کر بھی دے تو بھی وہ ظاہری مصیبت آخرت میں اس کے لیے فائدے کا باعث ہوگی۔

عرض کی گئی......قرآن کی تفسیر کا طریقہ کار کیا ہے؟

ارشاد فرمایا......آج کے زمانہ میں ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن کی تفسیر قرآن کے ذریعے کی جائے جیسے قرآن سورہ فاتحہ کے آغاز میں ارشاد فرماتا ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ (سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں)

وہ اللہ کون ہے؟ فرمایا: رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (جو تمام جہانوں کی پرورش فرمانے والا ہے)

رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ سے مراد کیا ہے؟ قرآن اسی سوال کو فرعون کی زبانی یوں نقل کرتا ہے۔

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (الشعراء، ۲۶:۲۳)

''فرعون نے کہا: سارے جہانوں کا پروردگار کیا چیز ہے؟''

فرعون نے دریافت کیا ''ربّ العٰلمین'' (سے مراد) کیا ہے؟''

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی یہ جواب نقل کیا۔

قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا۔ (الشعراء، ۲۶:۲۴)

''(موسیٰ نے) فرمایا: وہ جملہ آسمانوں کا اور زمین کا اور اس (ساری کائنات) کا ربّ ہے جو ان دونوں کے درمیان ہے۔''

پھر قرآن ایک اور مقام پر اس کی وضاحت یوں کرتا ہے:

رَبُّکُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِیْ فَطَرَھُنَّ۔ (الانبیاء، ۲۱:۵۶)

''تمہارا ربّ آسمانوں اور زمین کا ربّ ہے جس نے ان (سب) کو پیدا فرمایا۔''

اسی لیے قرآن اس سے ملتے جلتے انداز میں اللہ تعالیٰ کی حمد یوں نقل کرتا ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (فاطر، ۳۵:۱)

''تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو آسمانوں اور زمین کی تمام وسعتوں کا پیدا فرمانے والا ہے۔''

مذکورہ بالا آیات میں لفظ ''فطر'' اور ''فاطر'' استعمال ہوئے ہیں جو ''تخلیق'' کے مترادف کے طور پر استعمال ہوتا ہے جیسا کہ ایک مقام پر قرآن ارشاد فرماتا ہے:

اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ۔ (یونس، ۱۰:۳)

''یقیناً تمہارا ربّ اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین (کی بالائی وزیریں کائنات) کو پیدا فرمایا۔''

اسی طرح قرآن کی ہر آیت، آیت کے ہر لفظ کے بارے میں یہ غور کیا جائے کہ اسی مضمون سے متعلق دیگر آیات کون کون سی ہیں؟

عرض کی گئی ...... اس کے علاوہ کوئی اور صورت بنتی ہے؟

ارشاد فرمایا...... اس کے علاوہ قرآن کی تفسیر کی ایک صورت یہ ہے کہ قرآن کے ہر لفظ کے اصل ماخذ اشتقاق کو سامنے رکھتے ہوئے مضمون کی وضاحت کی جائے۔ جیسے قرآن کی سب سے پہلی سورہ کا نام ''الفاتحہ'' ہے یہ لفظ ''فتح'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی کسی چیز کو کھولنا ہے اس معنی کو سامنے رکھتے ہوئے اس بات کی وضاحت کی جائے کہ سورہ فاتحہ کس طرح قرآنی علوم کو کھولتی اور بیان کرتی ہے اس طرح قرآن کی دوسری سورہ کا نام ''البقرہ'' ہے جس کا مادۂ اشتقاق ''بقر'' ہے، جس کے معنی کسی چیز کو ''شق کرنا'' یا ''چیر دینا'' ہے، اب اسی مفہوم کو

سامنے رکھتے ہوئے وضاحت کی جائے گی کہ سورۂ بقرہ کس طرح کائنات یا خالق کائنات کے بارے میں مختلف خفیہ پہلوؤں کو چیر کر روشن اور واضح کرتی ہے اسی طرح سورۂ فاتحہ کے آغاز میں قرآن کے لیے لفظ الکتاب استعمال ہوا ہے لغوی اعتبار سے کتاب کا معنی ''مجموعہ'' ہے۔ لہٰذا جب اس معنی کو سامنے رکھیں گے تو اب قرآن اگر چہ کتابی شکل میں ہمارے سامنے موجود نہ بھی ہو تب بھی آیات کے مجموعے سے ہدایت حاصل کی جا سکتی ہے۔

عرض کی گئی...... آپ نے قرآن اور حقیقت محمد یہ دونوں کو اللہ تعالیٰ کی صفات کے مرکزی مظاہر کے طور پر پیش کیا ہے ان دونوں میں سے افضل کون ہے؟

ارشاد فرمایا...... عام طور پر فقہا اور متکلمین اس مسئلے میں سکوت اختیار کرتے ہیں تاہم اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان نے اس کی نہایت بہترین توجیہہ پیش کی ہے۔ اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں: اگر قرآن سے مراد اللہ تعالیٰ کی صفت کلام ہو تو قرآن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے افضل ہوگا کیونکہ یہ اللہ کی صفت ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور یہ ایک طے شدہ اصول ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام تر صفات جملہ مخلوقات سے افضل ہیں لیکن اگر قرآن سے مراد وہ حادث الفاظ ہوں جو اللہ کی صفت الکلام پر دلالت کرتے ہیں اور جن الفاظ کی ہم تلاوت کرتے ہیں اور جنہیں کتابی صورت میں تحریر کیا جاتا ہے تو یہ الفاظ حادث اور مخلوق ہیں اور یہ ایک طے شدہ اصول ہے کہ نبی اکرم جملہ مخلوقات سے افضل ہیں۔ لہٰذا اس اعتبار سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن سے افضل ہوں گے۔ میری ناقص فہم کے مطابق یہ اس مسئلے کا بہترین حل ہے۔

عرض کی گئی...... قرآن کی معرفت کے حصول کے طریق کار کے چند پہلوؤں کی وضاحت تو آپ نے کر دی اب براہ کرام اس بات کی بھی وضاحت کر دیں کہ ''حقیقتِ محمدیہ'' کی معرفت کے حصول کا طریق کار کیا ہے؟

ارشاد فرمایا...... جیسا کہ میں پہلے وضاحت کر چکا ہوں کہ معرفت کے حصول کے تین طریقے ہیں:

i علمی طریقہ یعنی علماء اور صوفیاء نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت شان اور فضائل و کمالات سے متعلق جن امور کا تذکرہ کیا ہے درس و تدریس اور مطالعہ کے ذریعے ان کا علم حاصل کیا جائے۔

ii آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت شان کے بارے میں منقول مواد میں مزید غور و فکر کر کے اس کی جزئیات اور تفصیلات تک رسائی حاصل کی جائے یہ فکری طریقہ ہے۔

iii روحانی طریقہ صوفیاء کے لیے مخصوص ہے۔ جب کوئی سالک ریاضت اور مجاہدے کے ذریعے سلوک کی منازل طے کرنے لگتا ہے تو اسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض انوار کا مشاہدہ نصیب ہوتا ہے جیسا کہ سیدی عبدالعزیز دباغ نے بھی اس نکتہ کی وضاحت اور اپنا عملی تجربہ بیان کیا ہے۔

عرض کی گئی...... کیا سالک کو اللہ تعالیٰ کی صفات کے انوار سے پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انوار کا مشاہدہ نصیب ہوتا ہے؟

ارشاد فرمایا...... میں پہلے اس بات کی وضاحت کر چکا ہوں کہ صفات الٰہی کا کامل ترین مظہر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس ہے۔ اب جو صوفی یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے انوار کا مشاہدہ

کر رہا ہے تو درحقیقت وہ صوفی حقیقت محمدیہ کے بعض انوار کا مشاہدہ کر رہا ہوتا ہے تاہم اسے محسوس ہوتا ہے کہ شاید وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے انوار کے مشاہدے میں مستغرق ہے۔

عرض کی گئی......اس کی وجہ کیا ہے؟

ارشاد فرمایا......میں پہلے یہ بات بیان کر چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں ''الظاہر'' اور ''الباطن'' دو صفات بھی شامل ہیں۔ جس وقت ''الظاہر'' کے انوار کا غلبہ ہوتا ہے اس وقت سالک خود کو اللہ تعالیٰ کی صفات کے انوار میں گم محسوس کرتا ہے اور جس وقت ''الباطن'' کے انوار کا غلبہ ہوتا ہے اس وقت سالک خود کو حقیقت محمدیہ کے انوار سے فیض یاب ہوتا ہوا محسوس کرتا ہے۔

عرض کی گئی......یہ ایک ایسا نکتہ ہے جو آج سے پہلے ہمارے سننے یا پڑھنے میں نہیں آیا؟

ارشاد فرمایا......اللہ تعالیٰ جو چیز جس کے سامنے چاہے ظاہر فرما دیتا ہے لیکن یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ معرفت الٰہیہ کے باب میں کوئی بھی نکتہ اور کوئی بھی مسئلہ حرف آخر نہیں ہو سکتا۔ حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری نے سیّد الطائفہ جنید بغدادی کا معرکہ آراء قول نقل کیا ہے:

العجز عن درك الادراك ادراك۔

''خود کو ذاتِ باری کے حقیقی ادراک سے عاجز جان لینا ہ حقیقی ادراک ہے۔''

عرض کی گئی......روحانی طریقہ کار کے مطابق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انوار کی معرفت کے لیے کن امور کی پاس داری شرط ہے؟

ارشاد فرمایا......کیونکہ یہ کائنات ایک مخصوص نظم کے مطابق چل رہی ہے اس لیے کائنات کے مختلف اجزاء سے متعلق اصول اور ضوابط بھی بنیادی اعتبار سے ایک دوسرے کی مانند ہوتے ہیں۔ یہ دُنیا عالم اسباب ہے یہاں کوئی بھی کام سبب کے بغیر نہیں ہوتا۔ اگر ''علم حدیث'' یا ''علم سیرت'' کے ذریعے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فضائل و کمالات کا علم حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس کے لیے کسی استاد کی شاگردی اختیار کرنا ضروری ہے اسی طرح اگر آپ باطنی طریقے کے مطابق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت شان سے آگاہ ہونا چاہتے ہوں تو اُس کے لیے بھی کسی اُستاد کی موجودگی ضروری ہے۔ فرق یہ ہے کہ کتاب وسنت کے ظاہری الفاظ سکھانے والے شخص کو عرف میں مولوی صاحب کہا جاتا ہے اور کتاب وسنت کے باطنی اسرار کی تعلیم دینے والے شخص کو عرف میں صوفی صاحب کہا جاتا ہے۔

عرض کی گئی......بعض حضرات شریعت اور طریقت کی تقسیم پر اعتراض کرتے ہیں۔

ارشاد فرمایا......تقسیم کا بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ تفہیم میں آسانی پیدا کی جا سکے۔ جیسے علم منطق کے آغاز میں علم کی دو قسمیں کی جاتی ہیں: تصور اور تصدیق، یہ تصدیق بھی دراصل تصور ہی کی ایک شکل ہے۔ اس طرح طریقت بھی شریعت کی ہی ایک شکل ہے۔ جس طرح منطقی تصور کی دو قسمیں بیان کرتے ہیں اسی طرح ہم آسانی کے لیے پہلے شریعت کو مقسم قرار دیں گے اور پھر دو قسمیں شریعت اور طریقت کے نام سے پیش کریں گے۔

جس طرح شرعی علوم کی تعلیم کے لیے کچھ علوم آلہ کی حیثیت رکھتے ہیں اسی طرح باطنی علوم میں بھی کچھ امور آلہ کی حیثیت رکھتے ہیں جن کی پاسداری ضروری ہے۔

عرض کی گئی......باطنی علوم کے استاد کو کیسے تلاش کیا جائے؟

ارشاد فرمایا......رزق کی طرح علم اور معرفت بھی انسان کو اپنے نصیب کے مطابق ملتی ہے۔ جس طرح رزق انسان کا پیچھا کرتا ہے اسی طرح علم بھی انسان تک پہنچ کر دم لیتا ہے۔ جس شخص کے نصیب میں معرفت کا حصول ہو گا حالات خود کھینچ کر اسے شیخ کامل تک پہنچا دیتے ہیں لیکن اگر کسی کے نصیب میں اس نعمت کا حصول نہ ہو تو وہ لاکھ سر پٹختا رہے اسے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

عرض کی گئی......اگر معرفت کا حصول تقدیر کا مرہونِ منت ہے تو کسی شیخ کامل کا احسان کیوں لیا جائے؟

ارشاد فرمایا......میں پہلے اس بات کی وضاحت کر چکا ہوں کہ دنیا عالمِ اسباب ہے یہاں کوئی بھی چیز سبب کے بغیر نہیں ملتی اور اصول یہ ہے کہ جو شخص کسی نعمت کے حصول کا سبب بنتا ہے وہ قابلِ احترام قرار پاتا ہے۔ اس لیے استاد اور شیخ کی تعظیم کی تلقین کی جاتی ہے۔

عرض کی گئی......آج کے زمانے میں بیعت و ارشاد کی حیثیت صرف ایک رسم کے طور پر باقی رہ گئی ہے؟

ارشاد فرمایا......بیعت و ارشاد ہی کیا آج بیشتر مذہبی عبادات صرف ظاہری رسم کی حد تک باقی رہ گئی ہیں ایک شخص سارا سال حرام کماتا ہے اور آخر میں کچھ رقم خرچ کر کے حج یا عمرہ کر کے یہ سمجھتا ہے اس نے اپنے تمام گناہ معاف کروا لیے ہیں۔

عرض کی گئی......شرعی علوم میں بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال دکھائی دیتی ہے؟

ارشاد فرمایا......بدقسمتی سے جو حضرات علومِ شریعت سے متعلق چند ایک الفاظ کا علم حاصل کر لیتے ہیں وہ خود کو دین کا ٹھیکیدار سمجھ لیتے ہیں۔ حالاں کہ انہیں چاہیے کہ وہ دین کی بنیادی روح کو سمجھ کر پہلے خود اس پر عمل پیرا ہوں اور پھر دوسروں کو اس کی تلقین کریں۔

عرض کی گئی......آج کے زمانے میں ایسے قابل علماء نہایت قلیل تعداد میں ہیں جو جدید مسائل کا صحیح حل پیش کرتے ہیں؟

ارشاد فرمایا......جدید مسائل کا حل پیش کرنے کیلئے یہ بات ضروری ہے کہ مفتی کتاب و سنت کی نصوص سے بھرپور طریقے سے آگاہ ہونے کے ساتھ سابقہ زمانوں کے فقہاء کی فقہی آراء، علم اصول فقہ کے قواعد و ضوابط اور معاشرتی رسوم و علوم سے آگاہ ہو یعنی آسان لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ علم فقہ کا اسپیشلسٹ ہو۔ اور یہ ایک فطری حقیقت ہے کہ آپ کسی بھی شعبے میں صرف چند ایک ہی اسپیشلسٹ فراہم کر سکتے ہیں آپ کو دل و دماغ کے گنے چنے ماہر ڈاکٹر ملیں گے حالانکہ سرکاری اور غیر سرکاری کئی میڈیکل کالجز موجود ہیں جہاں بین الاقوامی معیار کی تعلیم دی جاتی ہے اس کے برعکس مدارس کو حاصل ہونے والی رقم محدود ہوتی ہے اس لیے یہ شکوہ غلط ہے کہ آپ کو زیادہ سے زیادہ قابل مفتی فراہم کیے جائیں۔

عرض کی گئی...... بعض حضرات یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ہمارے علماء جدید علوم سے آگاہ نہیں ہوتے؟

ارشاد فرمایا...... ہر شخص کیلئے اپنے شعبے سے متعلق معلومات سے آگاہ ہونا ضروری ہے جہاں تک عام معلومات کا تعلق ہے تو عام طور پر علماء عام پڑھے لکھے افراد کی مانند عام امور سے آگاہ ہوتے ہیں البتہ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ اعتراض کرنے والے صاحبان اگرچہ وہ خود کو مسلمان کہلاتے ہیں لیکن اس کے باوجود دین کی بنیادی تعلیمات سے بھی بے بہرہ ہوتے ہیں اس لیے انہیں چاہیے کہ دوسرے پر اعتراض کرنے سے پہلے اپنی اصلاح کریں۔

عرض کی گئی...... علماء روحانی طبیب ہوتے ہیں؟

ارشاد فرمایا...... جسم اور روح اس دنیا میں آ کر بہت سی بیماریوں اور خرابیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جس طرح جسمانی بیماریوں سے نجات کے لیے ماہر معالج کی ضرورت پیش آتی ہے اسی طرح روحانی امراض کے علاج کے لیے روحانی طبیب سے استفادہ ضروری ہے۔ جو شخص میڈیکل سٹور پر کھڑا ہو وہ دوائیوں کے نام اور جس کمپنی نے انہیں بنایا ہے ان کے ناموں سے آگاہ ہوتا ہے بلکہ بیشتر میڈیکل سٹور والے اکثر دوائیوں کے خواص سے بھی آگاہ ہوتے ہیں۔ لیکن کون سی دواء کس مخصوص مریض کے لیے مناسب رہے گی؟ اس کا فیصلہ ڈاکٹر کرتا ہے کیونکہ وہ دوا کے خواص سے آگاہ ہونے کے ساتھ انسانی جسم کے خواص اور مسائل سے بھی واقف ہوتا ہے اور پھر مریض کی مخصوص حالت کو سامنے رکھ کر دوا کی مقدار اور معیار تجویز کرتا ہے۔

علماء کی مثال میڈیکل سٹور والوں کی طرح ہے کیونکہ یہ حضرات شرعی مسائل سے آگاہ ہوتے ہیں احادیث و آثار سے واقف ہوتے ہیں لیکن کس شخص کے لیے کیا مناسب ہے؟ اس کا فیصلہ وہ شخص کر سکتا ہے جو انسانی نفس کی کمزوریوں اور خامیوں سے آگاہ ہونے کے ساتھ ان کی اصلاح کے طریق کار سے بھی واقف ہو۔

عرض کی گئی...... صوفیاء نفس کی اصلاح پر بہت زور دیتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟

ارشاد فرمایا...... طب یونانی کے ماہرین عام طور پر معدے کی اصلاح پر زور دیتے ہیں چونکہ بیماری سے نجات حاصل کرنے کے لیے جو دواء مریض کو دی جائے گی وہ پہلے معدے میں جائیگی اور پھر اس کا اثر پورے جسم میں پھیلے گا اگر معدے کا نظام درست نہ ہوگا تو دواء کے مطلوبہ اثرات سامنے نہیں آسکیں گے۔ ظاہری جسم کے نظام میں جو مقام معدے کو حاصل ہے باطن میں وہی حیثیت نفس کو حاصل ہے۔ قرآن کہتا ہے:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا – فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا۔ (الشمس ۹۱: ۷، ۸)

''اور انسانی جان کی قسم اور اسے ہمہ پہلو توازن و درستگی دینے والے کی قسم پھر اُس نے اسے اس کی بدکاری اور پرہیزگاری (کی تمیز) سمجھا دی۔''

کیونکہ خیر اور شر کا بنیادی مادہ نفس میں موجود ہے اس لیے صوفیاء نفس کی اصلاح پر زور دیتے ہیں تا کہ یہ اس قدر مضبوط ہو جائے کہ شیطان کے حملوں سے بچ سکے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ مصنف

اللہ کی ذات ہی تمام تر تعریفوں کی مستحق ہے جس نے اپنے اولیاء کیلئے (روحانیت کے) وسائل کے راستے کھول دیئے اور ان اولیاء کے معزز نفوس کو مختلف طرح کے فضائل و کمالات سے مشرف کیا۔ پس جو شخص ان حضرات کی پیروی کرے گا وہ (اللہ کی) مدد پائے گا اور ہدایت حاصل کرے گا۔ (اس کے برعکس) جو شخص ان حضرات کے راستے سے ہٹ جائے گا وہ ذلیل ورسوا ہوگا اور گمراہی کا شکار ہوگا جس نے اولیاء کا دامن تھام لیا وہ (دنیا وآخرت میں) کامیاب ہوگا اور (رضائے الٰہی کو) پالے گا۔ (اس کے برعکس) جو شخص اولیاء پر اعتراضات کرے گا وہ (اللہ کے مقرب بندوں کے گروہ سے) الگ ہو جائے گا۔ اور (آخرکار) ہلاکت کا شکار ہوگا۔

میں اللہ کی حمد بیان کرتا ہوں اس یقین کے ساتھ کہ اسی کی ذات حقیقی پناہ گاہ ہے اور میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں اس یقین کے ساتھ کہ دنیا و آخرت کی بھلائی اسی کے دست قدرت میں ہے۔ میں اپنے ہر معاملے میں اسی کی ذات سے مدد طلب کرتا ہوں۔

(اس کے بعد) میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل پر اللہ کی مخلوق (کے برابر) اور فضل و کرم (کے مطابق) درود و سلام بھیجتا ہوں۔

(حمد وصلوٰۃ کے بعد واضح ہو کہ) ہر طرح کی حمد اور شکر کی مستحق ذات صرف اللہ کی ہے جس نے مجھ پر اپنا خاص فضل کرتے ہوئے مجھے اپنے مقرب بندے کی معرفت عطا فرمائی۔ وہ بندہ جو کامل ولی ہے جو جلیل القدر غوث ہے' زبردست صوفی ہے' آسمان معرفت کا چمکدار ستارہ ہے' اللہ تعالیٰ نے اس کے ملفوظات کو بلند اشارات' واضح عبارات' قدسی حقائق' محمدی انوار' ربانی اسرار اور عرش تک رسائی سے بہرہ مند کیا ہے۔

جس نے اس وقت طریقت کے راستوں کو واضح کیا جب ان راہوں کے نشانات پوشیدہ ہو چکے تھے جس نے اس وقت معرفت کے علوم کو بیان کیا جب ان علوم کے انوار چھپ چکے تھے۔ یہ معزز بزرگ حسب ونسب کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہیں۔ انہیں جسمانی اور روحانی دونوں طرح کی پاکیزہ نسبتیں حاصل ہیں۔ اسی

طرح انہیں شہادت اور غیب دونوں کی پاکیزہ نسبت حاصل ہے۔ آپ کو ملک اور ملکوت دونوں کی برگزیدہ ولایت حاصل ہے۔ (نسبی اعتبار سے) آپ محمدی، علوی، حسنی ہیں۔ آپ سالکین کیلئے قطب وقت کی حیثیت رکھتے ہیں جبکہ عارفین (کی پیشوائی) کا جھنڈا آپ ہی کے ہاتھوں میں ہے۔

نسب مبارک:

آپ کا نسب نامہ درج ذیل ہے:

عبدالعزیز بن مسعود بن احمد بن محمد بن محمد بن احمد بن عبدالرحمٰن بن قاسم بن محمد بن احمد بن قاسم بن محمد بن ابراہیم بن عمر بن عبدالرحیم بن عبدالعزیز بن ہارون بن قنون بن علوش بن مندیل بن علی بن عبدالرحمٰن بن عیسیٰ بن احمد بن احمد بن محمد بن عیسیٰ بن ادریس بن ادریس بن عبداللہ الکامل بن حسن المثنیٰ بن امام حسن بن حضرت علی بن ابوطالب۔ (رضی اللہ عنہم اجمعین)

شیخ کے فضائل وکمالات:

میں نے شیخ کے علوم ومعارف آپ کی شخصی خصوصیات اور روحانی لطائف کا اس طرح مشاہدہ کیا ہے کہ عقل دنگ رہ جائے۔ میں نے شیخ کی زبانی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان کے بارے میں ایسی باتیں سنی ہیں جو مجھے کسی اور سے سننے کا اتفاق نہیں ہوا بلکہ کبھی کسی کتاب میں بھی ان کے بارے میں نہیں پڑھا۔ میں آگے چل کر ان میں سے بعض امور کا تذکرہ کرونگا۔ (یہ ایک طے شدہ اصول ہے) کہ جس شخص کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جس قدر زیادہ معرفت (دنیا میں) نصیب ہوگی وہ قیامت کے دن آپ کے اسی قدر زیادہ قریب ہوگا۔

اسی طرح میں نے شیخ کی زبانی اللہ تعالیٰ کی معرفت، اللہ کی صفات، اللہ تعالیٰ کے اسماء کے بارے میں ایسے نکات سنے ہیں جنہیں صرف اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ صلاحیت کے نتیجے میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

انبیاء کرام اور رسل عظام کے بارے میں آپ نے ایسی معلومات بیان کی ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ کو ہر نبی کے ساتھ، اس نبی کے زمانے میں رہنے کا موقع ملا ہے۔ آپ نے فرشتوں، ان کی اقسام، ان کے درجات میں تفاوت کے بارے میں ایسی گفتگو کی کہ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کسی شخص کی معلومات کا دائرہ اس قدر وسیع ہوسکتا ہے؟ آپ نے سابقہ انبیاء پر نازل ہونے والی آسمانی کتابوں اور ان انبیاء کی شریعتوں کے احکام کے بارے میں وہ معارف بیان کیے ہیں کہ اگر کوئی شخص انہیں سن لے تو اسے اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ آپ عارفین کے پیشوا ہیں اور اپنے زمانے کے اولیاء کے امام ہیں۔

آپ نے قیامت کے دن، حشر ونشر، پل صراط، میزان، جنت کے بارے میں اس طرح بیان کیا ہے کہ گویا آپ انہیں براہِ راست ملاحظہ فرما رہے ہیں۔

(جب میں نے ان علوم و معارف کا مشاہدہ کیا) تو مجھے یقین ہو گیا کہ آپ ولایت کے عظیم مرتبے پر فائز ہیں اس لیے میں نے آپ کی غلامی اختیار کی اور اب میں یہ کہتا ہوں کہ تمام تر تعریفوں کی مستحق اللہ کی ذات ہے جس نے شیخ کی طرف میری رہنمائی کی اور اگر اللہ میری رہنمائی نہ کرتا تو میں یہاں نہیں پہنچ سکتا تھا۔

(میں یہ سمجھتا ہوں) کہ بندہ مومن کو مختلف امور کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہیے تا کہ اس کا ایمان مضبوط ہو جیسا کہ روایات کے مطابق حضرت جبرائیل نے ہمارے آقا و مولا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان کی حقیقت کے بارے میں دریافت کیا: تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا:

"(ایمان یہ ہے کہ) تو اللہ' اس کے فرشتوں' اس کی کتابوں' اس کے رسولوں' آخرت کے دن اور اچھی یا بری تقدیر کے اللہ کی جانب سے ہونے پر ایمان لائے۔"

پس جو شخص ان امور کی زیادہ معرفت حاصل کرے گا اس کا ایمان زیادہ بہتر اور عرفان زیادہ کامل ہو گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس بات کی توفیق دے تو درحقیقت یہی واضح اور روشن راستہ ہے۔

۱۱۲۵ھ میں رجب المرجب کے مہینہ میں مجھے پہلی مرتبہ آپ کی خدمت میں حاضری کی سعادت حاصل ہوئی۔ بعد میں گاہے بگاہے حاضری کا موقع ملتا رہتا۔ میں نے آپ کی زبانی بہت سے معارف سنے لیکن ان میں سے کسی ایک کو بھی ضبط تحریر میں نہیں لایا۔ البتہ میں آپ کی باتیں سن کر انہیں یاد رکھتا اور ان میں سے چند امور کا تذکرہ اپنے بعض احباب کے سامنے کر دیتا۔ وہ یہ باتیں سن کر حیران رہ جاتے اور یہ کہتے کہ ہم نے اس پائے کی معرفت کی باتیں کبھی نہیں سنیں۔ ان کی حیرت میں اس وقت مزید اضافہ ہو جاتا جب انہیں یہ بتایا جاتا کہ حضرت شیخ "اُمّی" ہیں۔ آپ نے مروجہ طور پر کوئی علم حاصل نہیں کیا بلکہ ظاہری طور پر آپ نے ہمیشہ علم کے حصول سے گریز کیا۔

میرے احباب شیخ کے ملفوظات سنتے تو کچھ حضرات ایک یا دو دن تک اس کی لذت محسوس کرتے بعض حضرات ایک یا دو ہفتے تک ان کی لذت محسوس کرتے۔ یہاں تک کہ جب وہ مجھ سے ملتے تو دریافت کرتے کہ کیا تم نے حضرت کی زبانی معرفت کی کوئی اور بات سنی ہے؟ اس وقت جو بات مجھے یاد ہوتی وہ میں ان کے سامنے بیان کر دیتا جسے سن کر ان کی محبت اور حیرانگی میں مزید اضافہ ہو جاتا۔

اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا تو میں ان حضرات کے اسماء یہاں تحریر کرتا جو میری زبانی حضرت کا کلام سن کر محظوظ ہوا کرتے تھے۔ ان اسماء کو پڑھ کر ہی آپ کو شیخ کی عظمت شان کا اندازہ ہو جاتا کیونکہ یہ وہ حضرات ہیں جن کی ولایت اور بزرگی سے ہر خاص و عام آگاہ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اکثر و بیشتر اولیاء کاملین کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل رہتا ہے اس لیے یہ حضرات ولایت کے اسرار و رموز' اہل محبت کی صفات' اولیاء کاملین کی علامات' مشائخ صادقین کے مناقب اور ہدایت دینے والوں اور ہدایت حاصل کرنے والوں کے

احوال سے بخوبی آگاہ ہیں۔ یہ حضرات بذات خود اکابر علماء اور جلیل القدر فقہاء کے گروہ میں شامل ہیں۔ جب ان حضرات نے مجھ سے شیخ کے کلام کو سنا تو مجھے تاکید کی کہ شیخ کی محبت میں ثابت قدم رہنا کیونکہ اللہ کی قسم آپ ولی کامل اور عارف واصل ہیں۔ مختصر یہ کہ جس کسی عالم یا فقیہہ نے شیخ کے کلام کو سنا تو اس نے فوراً اسے قبول کیا۔ اس کا اندازہ آپ کو ہماری کتاب کے مطالعہ کے دوران ہو جائے گا۔

۱۱۲۹ھ میں رجب کے مہینے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے میرے دل میں یہ بات القاء کی کہ میں حضرت کے ملفوظات مرتب کروں تا کہ ان کا فیض عام ہو جائے لہٰذا رجب کے مہینے سے لے کر ذی القعد کے مہینے تک میں نے آپ کے ملفوظات کو تحریر کیا تو یہ پندرہ اجزاء پر پھیل گئے جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ اگر میں سابقہ چار برسوں میں بھی آپ کے ملفوظات تحریر کرتا تو یہ دوسو اجزاء سے تجاوز کر جاتے۔ (مشہور مقولہ ہے:)

"آفة العلم عدم التقييد" (اگر تحریر نہ کیا جائے تو علم ضائع ہو جاتا ہے۔)

تاہم یہ بات پیش نظر رکھیں کہ جو کچھ میں نے تحریر کیا ہے وہ حضرت کے علوم کے سمندروں میں سے چند قطرے ہیں جبکہ حضرت کا علم ایک ایسا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے جس کا کوئی ساحل ہے نہ کوئی تہہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان قطروں کے ذریعے ہمیں نفع عطا فرمائے ان کے علاوہ بہت سے علوم وہ ہیں جو حضرت کے سینہ مبارک میں مخفی ہیں جن کے بارے میں اللہ کے علاوہ اور کسی کو علم نہیں ہے جس نے حضرت کو یہ علوم عطا کیے اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی پسندیدہ باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں خاتمہ بالخیر کے ذریعے دائمی سعادت عطا فرمائے۔

کیونکہ اس مجموعے کو مرتب کرنے کا مقصد شیخ کے بعض ملفوظات کو جمع کرنا ہے اس لیے ہم کتاب کے آغاز میں ایک مقدمہ تحریر کریں گے جس میں شیخ کے فضائل' آپ کی روحانی کیفیات' آپ کے ظاہری و باطنی مشائخ کا تذکرہ کیا جائے گا۔ ہم ان تمام امور کو تین فصلوں میں بیان کریں گے۔

پہلی فصل:

سیّدی دباغ کی ولادت سے پہلے کے حالات

شیخ عربی فشتالی

شیخ فرماتے ہیں: شیخ عربی فشتالی کا شمار اولیاء کاملین میں ہوتا ہے۔ شیخ فشتالی کے شیخ طریقت کا نام محمد بن ناصر تھا۔ ان کے علاوہ آپ نے شیخ مبارک بن علی سے بھی فیض حاصل کیا۔

شیخ مبارک بن علی قصاب کا کام کرتے تھے۔ شیخ عربی فشتالی کی شیخ مبارک بن علی سے پہلی ملاقات (شہر) فاس کی جامع مسجد میں ہوئی تو شیخ فشتالی نے محسوس کیا کہ آپ بزرگ آدمی ہیں۔ اس وجہ سے شیخ فشتالی نے مبارک بن علی کی خدمت میں درخواست کی: حضرت! آپ مجھے بتائیں کہ اہل سرٗ اس سر کو کیسے؟ حاصل کرتے ہیں تو شیخ مبارک نے جواب دیا۔ چھینکو' شیخ فشتالی نے عرض کی: اس وقت تو مجھے چھینک نہیں آ رہی۔ شیخ مبارک نے فرمایا اسی طرح مجھے بھی اس وقت سمجھ نہیں آ رہی کہ میں تمہیں کیسے تعلیم دوں؟ (یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ ابھی مزید کچھ دیر میرے پاس رہو) لہٰذا شیخ فشتالی رحمۃ اللہ علیہ' شیخ مبارک بن علی رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ بگوش ہوئے اور آخر کار معرفت خداوندی حاصل کی۔

شیخ عربی فشتالی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بہن تھی جس کی ایک بیٹی بھی تھی۔ اس بچی کے باپ کا نام علال القمارشی تھا جو ایک صاحب ثروت آدمی تھا۔ اس کے انتقال کے بعد شیخ فشتالی کی بہن نے مکناسۃ الزیتون (نامی بستی) کے رہنے والے ایک شخص سے نکاح کر لیا مگر وہ بچی شیخ فشتالی کی زیر تربیت رہی۔ انہوں نے نہایت اہتمام کے ساتھ اس بچی کی تربیت کی۔ شیخ فشتالی کا شمار علم فقہ کے ماہرین میں ہوتا تھا۔ آپ علم قرأت میں بھی دسترس رکھتے تھے اور ان دونوں علوم کا درس دیا کرتے تھے۔ طلبہ کو املا سکھاتے تھے۔

میرے والد ابو مسعود بھی شیخ فشتالی کے شاگرد تھے۔ ایک دن جب وہ سبق پڑھ کر جانے لگے تو شیخ فشتالی نے انہیں روک کر کہا: ''میری خواہش ہے کہ میں اپنی بھانجی کا نکاح تمہارے ساتھ کر دوں۔'' شیخ فشتالی کی ہمشیرہ کا نام راضیہ اور بھانجی کا نام فارحہ تھا۔ ابو مسعود نے رضامندی کا اظہار کیا تو شیخ فشتالی نے کہا کہ مہر کی ادائیگی اور

جہیز کی تیاری میرے ذمہ ہے تم اس معاملے میں پریشان نہ ہونا۔ یہ سن کر میرے والد بہت خوش ہوئے۔ شیخ فشتالی ویسے بھی میرے والد سے بہت محبت کرتے تھے اور وقتاً فوقتاً میرے والد کو روپے پیسے دیتے رہتے تھے۔
جب نکاح ہو گیا تو جہیز کے ہمراہ لڑکی (میری والدہ) میرے والد کے گھر آ گئی اس کے بعد شیخ فشتالی نے میرے والد کو تاکید کی: تم میری دکان پہ آ جایا کرو۔ شیخ فشتالی کی دکان سماط العدول (نامی محلے) میں تھی۔ میرے والد روزانہ نماز عصر کے بعد آپ کی دکان پر جاتے اور شیخ فشتالی انہیں کچھ رقم دے دیتے۔

شیخ محمد بن عبدالرحیم الفاسی فرماتے ہیں: میں شیخ فشتالی کو املا لکھ کر دکھایا کرتا تھا۔ اسی دوران تمہارے والد وہاں تشریف لاتے اور شیخ فشتالی رقم ان کے حوالے کر دیتے۔

شیخ فشتالی کی بھانجی کو وراثت میں اپنے والد کی جانب سے ''زواغہ'' کے مقام پر کچھ زرعی زمین ملی تھی۔ ایک دن شیخ فشتالی نے میرے والد سے کہا کہ تمہاری بیوی بہت نیک عورت ہے اسے چاہیے کہ وہ تمہیں اپنا وکیل مقرر کرے تاکہ تم زواغہ والی زمین فروخت کر دو۔ میرے والد اپنی اہلیہ کے پاس تشریف لائے تو انہوں نے میرے والد کو اپنا وکیل مقرر کیا۔ میری والدہ کی ایک سوتیلی بہن بھی تھی جو وراثت والی زمین میں حصہ دار تھی۔ میرے والد ان کے پاس بھی گئے تاکہ وہ بھی والد صاحب کو اپنا وکیل مقرر کر دیں لیکن انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اس لیے میرے والد نے میری والدہ کے حصہ والی زمین کو فروخت کر دیا جبکہ میری خالہ تین برس تک اس زمین سے محصول وصول کرتی رہیں۔ اس کے بعد کچھ ظالم لوگوں نے زواغہ میں موجود تمام زرعی زمینوں پر زبردستی قبضہ کر لیا جن میں میری خالہ کی زمین بھی شامل تھی۔ اس دن کے بعد میری خالہ کو اس زمین سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا اور سب لوگ یہ جان گئے کہ شیخ فشتالی نے اپنے کشف کے ذریعے والد صاحب کی رہنمائی کی تھی۔

شیخ فشتالی میرے والد سے بہت محبت کرتے تھے اور انہیں مختلف طرح کے کھانے کھلایا کرتے تھے۔ میں نے والدہ کی زبانی ایک مرتبہ سنا کہ شیخ فشتالی کی وفات کے بعد ہمیں ''طنجیہ'' کھانے کو نہیں ملا جبکہ شیخ کی حیات میں آپ روز ہمیں طنجیہ کھلایا کرتے تھے۔ عشاء کی نماز کے بعد آپ روزانہ طنجیہ کے ہمراہ ہمارے ہاں تشریف لایا کرتے تھے اور آپ کا یہ معمول تادم وفات جاری رہا۔

فشتالی کی پیشین گوئی

(والدہ فرماتی ہیں:) شیخ فشتالی اکثر یہ پیشین گوئی کیا کرتے تھے کہ تمہارے ہاں ایک بچہ پیدا ہوگا جس کا نام عبدالعزیز ہوگا اور وہ ولایت کے عظیم مرتبے پر فائز ہوگا۔

والدہ فرماتی ہیں: ایک مرتبہ شیخ فشتالی نے ہمیں بتایا: خواب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ بشارت دی ہے عنقریب تمہاری بھانجی کے ہاں ایک بڑا ولی پیدا ہوگا۔ میں نے عرض کی: یارسول اللہ! اس بچے کا باپ کون ہوگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: اس کا باپ مسعود دباغ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ فشتالی نے اپنی بھانجی کا نکاح میرے والد مسعود دباغ کے ساتھ کیا۔

فشتالی کے تبرکات

شیخ فشتالی کی یہ خواہش تھی کہ ان کی زندگی میں ہی حضرت عبدالعزیز دباغ کی ولادت ہو جائے لیکن ۱۰۹۰ھ میں ایک وباء پھیلی اور اسی وبا کے دوران شیخ فشتالی انتقال فرما گئے۔ جب شیخ فشتالی کو یہ محسوس ہوا کہ اب وقت رخصت قریب آ چکا ہے تو انہوں نے میرے والد کو بلوایا جب وہ آ گئے تو والدہ کو بھی بلوایا۔ جب دونوں آ موجود ہوئے تو دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا میں اللہ کی ایک امانت تم دونوں کے سپرد کر رہا ہوں جب تمہارے ہاں عبدالعزیز کی پیدائش ہو تو تم یہ امانت اسے دے دینا۔ یہ امانت کپڑے کے ایک ٹکڑے اور جوتوں پر مشتمل تھی۔ یہ دونوں چیزیں اس زمانے کے عام رواج کے مطابق تھیں۔ میری والدہ نے یہ دونوں اشیاء سنبھال کے رکھ لیں لیکن ان کے ہاں پہلے ایک بچی پیدا ہوئی پھر اس کے کچھ عرصہ بعد میری ولادت ہوئی۔ جب میں بالغ ہو گیا تو اسی دوران رمضان کے مہینے میں میری والدہ کو وہ امانت یاد آ گئی۔ انہوں نے وہ امانت لا کر مجھے دی اور کہا: میرے بچے! شیخ فشتالی نے یہ امانت تمہیں دینے کی وصیت کی تھی۔ میں نے وہ امانت لے لی۔ کپڑے کو سر پہ رکھا اور جوتا پاؤں میں پہن لیا۔ اچانک مجھے شدید گرمی کا احساس ہوا۔ یہاں تک کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور شیخ فشتالی نے میرے بارے میں جو پیشین گوئی اور وصیت کی تھی اس کا مفہوم میرے سامنے واضح ہو گیا۔

یہ واقعہ ۱۱۰۹ھ میں پیش آیا۔

فشتالی کے فضائل

(الابریز کے مؤلف احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے شیخ فشتالی کے بارے میں حضرت عبدالعزیز دباغ کی زبانی سنا ہے۔ مجھے خود ان کا زمانہ پانے کا شرف حاصل نہیں ہوا کیونکہ ان کی وفات کے وقت میری عمر صرف چھ ماہ کے لگ بھگ تھی البتہ میں نے دیگر بہت سے لوگوں کی زبانی ان کی تعریف سنی ہے کہ شیخ فشتالی نہایت عابد و زاہد شخص تھے۔ رات کے وقت کثرت سے نوافل ادا کیا کرتے تھے۔ ان کے زمانے کے مشہور بزرگ احمد بن عبداللہ‘ شیخ فشتالی کی بہت زیادہ تعریف کیا کرتے تھے اور یہ فرماتے کہ شیخ فشتالی اکابر اولیاء میں سے ہیں۔ شیخ احمد بن عبداللہ کی جلالت شان سے میں بخوبی واقف ہوں اور اس زمانے کے تمام لوگ آپ کی ولایت پر متفق ہیں۔ آپ کے کشف‘ سر اور نور بصیرت کے معتقد ہیں۔

صفر (نامی شہر) کے باسی فقیہہ عبدالقادر احماموش‘ جو شیخ احمد بن عبداللہ کے مریدین میں سے ہیں اور بکثرت شیخ احمد کی خدمت میں حاضر رہا کرتے‘ فرماتے ہیں: جب شیخ فشتالی کا انتقال ہوا تو شیخ احمد بن عبداللہ نے ارشاد فرمایا: شیخ فشتالی اس زمانے کے اکابر اولیاء میں سے ایک تھے۔ اگر ان کی وفات نہ ہوتی تو میں یہ بات تمہارے سامنے ذکر نہ کرتا۔

مذکورہ فقیہہ (عبدالقادر احماموش) فرماتے ہیں: میں خود شیخ فشتالی کا شاگرد ہوں لیکن میں نے (ان کے

ظاہری احوال کی وجہ سے) کبھی یہ گمان تک نہیں کیا کہ شیخ فشتالی اللہ کے ولی بھی ہو سکتے ہیں۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ فشتالی اپنے احوال کو پوشیدہ رکھتے تھے۔

شیخ احمد بن عبداللہ نے ایک مرتبہ بیان کیا۔ ایک مرتبہ میں ''سالیں'' کے مقام پر فشتالی کے ہمراہ موجود تھا۔ وہ مجھے کہنے لگے: ایک بڑا حادثہ پیش آ گیا ہے۔ میں نے دریافت کیا وہ کیا؟ انہوں نے کہا شیخ محمد بن ناصر کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں نے حیرانگی سے دریافت کیا: آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ انہوں نے فرمایا: ان کی وفات میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ میری حیرانگی برقرار رہی۔ شیخ فشتالی نے فرمایا: دور سامنے دیکھو ایک شخص آ رہا ہے وہ محمد بن ناصر کی وفات کی خبر لا رہا ہے پھر ہم دونوں اس طرف چل پڑے یہاں تک کہ اس شخص سے ملے اور دریافت کیا: کیا خبر لائے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ شیخ محمد بن ناصر رحمۃ اللہ علیہ انتقال فرما گئے ہیں۔

یہی شیخ احمد بن عبداللہ بیان کرتے ہیں: زیدان کی موت کے بعد جب ہمارے شہر کا محاصرہ کر لیا گیا اور شہر پر سنگ باری شروع ہو گئی تو اس کے پتھر میرے گھر کے قریب آ کے گرتے تھے۔ میں ایک دن فصیل شہر کا جائزہ لینے کیلئے نکلا میرے ارادے سے کوئی باخبر نہیں تھا۔ راستے میں میری ملاقات شیخ فشتالی سے ہو گئی۔ انہوں نے مجھ سے دریافت کیا: کہاں کا ارادہ ہے؟ میں نے کہا' فصیل شہر کی حالت دیکھنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے مجھے منع کیا لیکن میں نے اپنی بات پر اصرار کیا تو وہ فرمانے لگے' میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا اور آپ میرے ہمراہ چل دیئے اور وہاں ایک جگہ پر آپ نے مجھے بروقت ہٹا لیا ورنہ ایک برج میرے اوپر گر جاتا۔

احمد بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ''قرویین'' کے مقام پر میری شیخ فشتالی سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت میرا نکاح کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ جب انہوں نے مجھے دیکھا تو ارشاد فرمایا کہ وہ عورت بہت مبارک ہے۔ میں نے دریافت کیا کون سی عورت؟ آپ نے فرمایا وہی عورت جس سے تم شادی کرو گے۔ میں نے کہا میرے ذہن میں تو ایسا کوئی خیال نہیں ہے۔ آپ نے کہا تم شادی کرو گے۔ احمد بن عبداللہ کہتے ہیں اس واقعہ کو ابھی ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ میرے اندر نکاح کی شدید خواہش پیدا ہوئی اور میں نے شادی کر لی۔

ایک مرتبہ احمد بن عبداللہ نے یہ بات بیان کی: ایک مرتبہ میں شیخ فشتالی کے ہمراہ اولیاء کرام کی عظمت شان کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا۔ گفتگو کے دوران میں نے اس علاقے کے چند اولیاء کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا کہ میں تمہارے ساتھ اکابر اولیاء کی گفتگو کر رہا تھا ورنہ جہاں تک اصاغر کا تعلق ہے تو میں یہاں سے لے کر بازغہ کے مقام تک کے علاقے میں موجود چار سو اصاغر اولیاء سے واقف ہوں۔

(مؤلف کتاب احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے یہی واقعہ بذات خود شیخ احمد بن عبداللہ کی زبانی سنا ہے البتہ اس وقت انہوں نے دوسرے شخص کا نام ذکر نہیں کیا تھا۔

ایک مرتبہ میں نے شیخ احمد بن عبداللہ کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا: شیخ فشتالی اپنے احوال کو لوگوں سے چھپاتے تھے اور اپنے اسرار پوشیدہ رکھتے تھے۔ ایک دفعہ اپنے شاگردوں سے گفتگو کرتے ہوئے فرمانے لگے

تمہارا کیا خیال ہے کہ کشف کیا ہے؟ میرے خیال میں تو یہ صرف چالاکی اور تیزی ہے۔ تم مجھے ہی دیکھ لو تم میرے تمام حالات سے واقف ہو اور یہ بات جانتے ہو کہ میں ولی نہیں ہوں۔ تمام شاگردوں نے جواب دیا ہم آپ سے بخوبی واقف ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ آپ ولی نہیں ہیں۔ شیخ فشتالی نے ایک طالبعلم سے کہا: کیا تم فلاں وقت میں فلاں کام نہیں کرنا چاہتے تھے؟ اس طالبعلم نے اقرار کیا کہ ایسا ہی ہے تو شیخ فشتالی نے کہا کہ میں تم سے یہی بات کہہ رہا تھا کہ کشف صرف چالاکی کا دوسرا نام ہے۔ تمام طالبعلموں نے اس بات کی تائید کی۔ یوں فشتالی نے ان سب کو بے وقوف بنایا۔

اسی طرح شیخ احمد بن عبداللہ نے ایک مرتبہ بیان کیا۔ ایک مرتبہ مجھے مسجد قرویین میں جانے کا اتفاق ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ شیخ فشتالی پہلے سے وہاں موجود ہیں اور آپ کے چہرے کی رنگت تبدیل ہو کے زرد ہو چکی ہے۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگے اس وقت جو میری کیفیت ہے اس کی وجہ سے میں تمہارے بلکہ کسی کے ساتھ بھی کوئی بات نہیں کر سکتا۔ میں نے اس کا سبب دریافت کیا تو فرمایا ابھی میں نے ابن فارض کے قصیدہ تائیہ کا یہ شعر پڑھا ہے:

فلو خطرت لی فی سواك ارادة ۔۔۔ علی خاطری سهوا قضيت بردتی

ترجمہ: ''اگر میرے دل میں ایک لمحے کیلئے تمہارے علاوہ کسی اور کی چاہت آ جائے اگرچہ وہ کسی بھول کا نتیجہ ہی کیوں نہ ہو تو میں خود کو مرتد قرار دے دوں گا۔''

جب میں نے یہ شعر پڑھا تو اس وقت میرے ذہن میں کسی اور کا خیال موجود تھا اس لیے میں نے سوچا کہ شاید میں مرتد ہو چکا ہوں اور اب میرے اندر کوئی بھلائی باقی نہیں رہی نہ تو میں کسی سے ملنے کے قابل رہا اور نہ ہی اس قابل رہا کہ کوئی مجھے پہچانے (یہ کہتے ہوئے) آپ کے چہرے کی رنگت مزید تبدیل ہو گئی۔ شیخ احمد بن عبداللہ فرماتے ہیں میں نے عرض کی: یہ ایک خاص کیفیت تھی جو وقتی طور پر ابن فارض پر طاری ہوئی اور اس دوران انہوں نے یہ شعر کہہ دیا یہ کیفیت مستقل طور پر تو ابن فارض کو بھی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ میری یہ بات سن کر شیخ فشتالی پرسکون ہو گئے اور فرمایا خدا تمہیں جزائے خیر دے تم نے میرے سر سے ایک بڑا بوجھ ہٹا دیا۔

(فشتالی کے معاصرین میں) شیخ عربی القادری نامی ایک بزرگ گزرے ہیں جو روحانیات میں کچھ دخل رکھتے تھے اور انہیں کچھ انوار کے مشاہدے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ شیخ القادری، شیخ فشتالی کو صرف عالم دین سمجھتے تھے اور ان کی ولایت کے قائل نہیں تھے۔ فشتالی کا معمول تھا کہ جب ان کی شیخ القادری سے ملاقات ہوتی تو مسرور ہوتے اور شیخ القادری کی خوب خاطر مدارات کرتے' ایک مرتبہ شیخ القادری، شیخ احمد بن عبداللہ سے ملاقات کیلئے آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ دونوں حضرات علوم عالیہ اور معرفت سے متعلق امور پر تبادلہ خیال میں مصروف تھے۔ شیخ القادری نے وہاں موجود ایک اور بزرگ محمد دریج النطاونی سے دریافت کیا: کیا شیخ فشتالی آج پہلی مرتبہ شیخ احمد بن عبداللہ کے ساتھ علم معرفت کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں یا آج سے پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے؟ شیخ محمد دریج نطاونی نے جواب دیا یہ دونوں حضرات ہمیشہ انہی موضوعات پر تبادلہ خیال کیا کرتے ہیں۔

شیخ عبدالقادر المشد (نامی بزرگ) فرماتے ہیں اس دن پہلی مرتبہ شیخ القادری کو شیخ فشتالی کی ولایت کا پتہ چلا اور جب شیخ فشتالی کو اس بات کا علم ہوا کہ شیخ القادری ان کی ولایت سے باخبر ہو چکے ہیں تو اس کے بعد فشتالی کا یہ معمول ہو گیا کہ جہاں کہیں شیخ القادری کو دیکھتے تو چھپ جاتے۔ اسی طرح آپ نے شیخ القادری سے خوش ہو کے ملنا اور ان کی خاطر مدارات کرنا ترک کر دیا کیونکہ فشتالی اپنی ولایت کو پوشیدہ رکھنا پسند کرتے تھے۔

یہی شیخ عبدالقادر المشد بیان فرماتے ہیں۔ جب زیدیوں نے شہر فاس کا محاصرہ کیا تو میں وہیں مقیم تھا جب محاصرہ طویل ہو گیا اور شہر والوں کو اس کی وجہ سے نہایت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تو اس دوران فشتالی یہی کہتے رہے کہ سلطان اسماعیل کا آنا بہت ضروری ہے خواہ محاصرہ طویل ہو یا کم ہو۔ آپ مسلسل یہی بات دہراتے رہے یہاں تک کہ یہ بات آپ کی پہچان بن گئی اور وہ لوگ جو سلطان اسماعیل کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ (بطور استہزاء) کہنے لگے کہ فشتالی ہی سلطان اسماعیل ہیں۔ ابھی چند ہی دن گزرے تھے کہ فشتالی کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی اور باغیوں نے ہتھیار ڈال کر سلطان سے امان کی درخواست کی جس کے نتیجے میں صلح ہو گئی۔

یہی بزرگ بیان کرتے ہیں میں نے شیخ فشتالی کے بعض پڑوسیوں کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا ہے کہ فشتالی اکثر اوقات رات کا بیشتر حصہ نوافل کی ادائیگی اور تلاوتِ قرآن میں بسر کیا کرتے تھے۔ عام طور پر رات کے ابتدائی حصہ میں آپ کی تلاوت کی آواز سنائی دیتی تھی لیکن جب آپ پر احوال و واردات کا نزول ہوتا تو رات کے آخری پہر میں صرف ان کی اضطرابی حرکتوں اور زمین پر رینگنے کی آواز سنائی دیتی۔

مشہور فقیہہ شیخ مہدی بن یحیٰی فرماتے ہیں۔ شیخ احمد بن عبداللہ، شیخ فشتالی کی بہت تعریف کیا کرتے تھے اور اکثر فرمایا کرتے تھے کہ فشتالی رحمۃ اللہ علیہ مکمل ولایت اور زبردست کشف کے مالک ہیں اور اپنی اس بات کی تائید میں بہت سے واقعات بیان کرتے تھے جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

شیخ احمد بن عبداللہ فرماتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں شیخ فشتالی کے ہمراہ بازار سے گزر رہا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب سلطان رشید کی حکومت تھی۔ پوری مملکت پر اس کا کنٹرول مضبوط تھا۔ سب لوگ آرام سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ کہیں کوئی لڑائی جھگڑا نہیں تھا۔ اچانک فشتالی مجھے مخاطب کر کے کہنے لگے ابھی مجھے کسی شخص کی آواز سنائی دی ہے جو سلطان رشید کی وفات پر ماتم کر رہا ہے۔ سلطان اس وقت مراکش میں مقیم تھا۔ میں نے دریافت کیا یہ کیسے ممکن ہے کچھ ہی دن گزرے تھے کہ سلطان کی وفات کی خبر بھی موصول ہو گئی۔

شیخ مہدی روایت کرتے ہیں کہ شیخ احمد بن عبداللہ فرمایا کرتے تھے کہ فشتالی نہایت نیک اور بزرگ آدمی ہیں۔ آپ کو ظاہری ولایت حاصل ہے اور آپ شریعت کے ظاہری احکام کی سختی سے پیروی کرتے ہیں۔ ایک دن میں آپ کے ہمراہ مسجد قرویین میں موجود تھا اور ہم دونوں تبادلہ خیال کر رہے تھے کہ اسی دوران اذان ہو گئی۔ شیخ فشتالی اٹھے اور مسجد سے باہر نکل گئے۔ تھوڑی دیر بعد دوبارہ واپس آ گئے۔ میں نے دریافت کیا آپ باہر کیوں نکلے تھے جبکہ آپ کو باہر جا کر کوئی کام بھی نہیں کرنا تھا۔ اگر کوئی کام ہوتا تو چلے بھی جاتے؟ کیونکہ ابھی

جماعت کا وقت بھی نہیں ہوا پھر آپ باہر کیوں گئے تھے؟ آپ نے جواباً خاموشی اختیار کی۔ میں نے اصرار کیا تو کہنے لگے تم اصرار کرتے ہو (تو بتا دیتا ہوں) میں اس لیے نکلا تھا تا کہ میں نماز کی ادائیگی کی نیت سے مسجد کی طرف چل کے آؤں جبکہ اس سے پہلے میں صرف تم سے ملنے کیلئے مسجد میں آیا تھا۔

شیخ احمد بن عبداللہ کہتے ہیں مجھے یہ سن کر بہت حیرانگی ہوئی اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ فشتالی رحمۃ اللہ علیہ آداب شریعت کا غیر معمولی خیال رکھتے ہیں۔

شیخ احمد بن عبداللہ کا قول ہے کہ شیخ فشتالی نہایت اچھے اخلاق کے مالک تھے۔ لوگوں کی ایذا رسانی کے جواب میں آپ نہایت صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ منصف مزاج تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے کسی شخص کے خلاف صحیح گواہی دی تو وہ شخص نہایت غضب ناک ہوا اور آپ کو برا بھلا کہنے لگا۔ جب وہ خاموش ہوا تو شیخ فشتالی نے صرف اتنا کہا کہ میں نے شریعت کے احکام کے مطابق تمہارے خلاف گواہی دی ہے اس کی شرعی وجہ یہ ہے اس کا حکم یوں ہے اور درست مسئلہ یہ ہے۔ آپ نے اس کی بدزبانی کا کوئی ذکر نہیں کیا اور چشم پوشی سے کام لیا۔ وہ آپ کے اس حسن سلوک سے بڑا متاثر ہوا اور اپنے فعل پر نادم ہوا۔ آخر میں اس نے توبہ بھی کی۔

شیخ فشتالی کے پڑوسی ہمیشہ اچھے الفاظ میں ان کا ذکر کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہا کہ ان پڑوسیوں کا بیان ہے کہ فشتالی جب اپنے گھر کے لیے گوشت خریدا کرتے تو پڑوسیوں کیلئے بھی گوشت خریدتے اور فرماتے کہ یہ نہیں ہوسکتا کہ میرے گھر میں تو گوشت پکے اور میرے پڑوسی کے گھر میں نہ پک سکے۔

ایک مرتبہ شیخ فشتالی رحمۃ اللہ علیہ مسجد کے ایک گوشے میں آئے اور فرمایا یہاں ایک بڑا دروازہ ہونا چاہیے تا کہ لوگ بآسانی مسجد میں داخل ہوسکیں اور پھر واقعی اس مقام پر ایک بڑا دروازہ قائم کیا گیا۔

ایک مرتبہ ایک شخص شیخ فشتالی سے ملاقات کیلئے گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ آپ نہایت خوش و خرم ہیں اور کبھی آپ کے منہ سے شطحیات بھی صادر ہو جاتی ہیں۔ اس نے دریافت کیا کہ یہ کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: (یہ شطحیات) اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا فرما دیتا ہے۔

ایک بزرگ بیان کرتے ہیں ایک مرتبہ میں فشتالی سے گفتگو کر رہا تھا۔ دوران گفتگو میں نے اس وقت کے حکام کی تعریف بیان کرنا شروع کردی اور کچھ سابقہ حکمرانوں کی مذمت بھی کی تو شیخ فشتالی نے میرے سامنے آئندہ آنے والے حکمرانوں کے حالات بیان کرنا شروع کردیئے تو مجھے اندازہ ہوا کہ یہ شیخ کا کشف ہے۔

بہت سے لوگوں نے یہ گواہی دی ہے کہ فشتالی ایک عادل شخص تھے۔ آپ نہایت پرہیز گار تھے۔ آپ صرف ان ہی امور میں گواہی دیا کرتے تھے جو روز روشن کی طرح صاف اور نمایاں ہوں۔ اگر کوئی آپ کو زیادہ معاوضہ دے دیتا تو آپ زیادہ رقم واپس لوٹا دیتے۔ اگر کوئی شخص آپ کو کسی معاملے میں اپنا گواہ بنا لیتا اور پھر دوسرا فریق اسی معاملے میں آپ کو اپنا گواہ بنانا چاہتا تو آپ اسے صاف لفظوں میں کہہ دیتے: تم میرے پڑوسی کو گواہ بنالو کیونکہ دوسرا فریق پہلے ہی مجھے گواہ بنا چکا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) شیخ فشتالی کی کرامات بے شمار ہیں۔ آپ کے مناقب سے ہر خاص و عام آگاہ ہے۔ آپ کی عظمت شان کے اظہار کیلئے صرف اس تعلق کو پیش نظر رکھنا ہی کافی ہے جو آپ کے اور غوث زماں سیّدی عبدالعزیز دباغ کے درمیان قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کی بدولت اور اپنے (محبوب پیغمبر جو) انبیاء و مرسلین کے پیشوا (ہیں) کے وسیلے سے ہمیں ان بزرگوں کے ساتھ حسن عقیدت قائم رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

سیّدی دباغ کے روحانی تجربات

حضرت خضر سے ملاقات

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں جب میں نے شیخ فشتالی کی امانت کو پہن لیا اور اس کے نتیجے میں مجھے انوار و برکات حاصل ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں خالص بندگی اختیار کرنے کا شوق القاء کیا۔ میں نے شیخ کامل کی تلاش شروع کر دی یہاں تک کہ جب کبھی کسی شخص کے بارے میں مجھے پتا چلا کہ لوگ اسے شیخ کامل سمجھتے ہیں یا اسے ولی گردانتے ہیں میں اس شخص کے پاس گیا۔ اس کا حلقہ بگوش ہوا۔ اس کے تلقین کردہ اوراد و وظائف کرتا رہا لیکن ہر مرتبہ ایسا ہوا کہ کچھ مدت گزرنے کے بعد مجھے گھٹن کا احساس ہوتا اور معرفت میں کوئی اضافہ محسوس نہ ہوتا تو میں اسے چھوڑ کر کسی دوسرے شیخ کے پاس چلا جاتا اور اسے اپنا استاد بنا لیتا۔ وہاں بھی یہی کچھ ہوتا۔ مختصر یہ کہ ۱۱۰۹ھ سے لے کر ۱۱۲۱ھ تک میں یوں ہی حیران پریشان سرگرداں گھومتا رہا۔ میری یہ عادت تھی کہ میں ہر جمعرات کی رات مشہور بزرگ علی بن حرزہم کی قبر مبارک کے پاس بیٹھ کر دیگر حاضرین کے ہمراہ ''قصیدہ بردہ'' مکمل پڑھا کرتا تھا۔ ایک جمعرات کی رات ہم لوگوں نے اپنے عام معمول کے مطابق قصیدہ بردہ ختم کیا اور درگاہ سے واپس روانہ ہوئے۔ جب میں درگاہ مبارک سے باہر نکلا تو درگاہ کے مرکزی دروازے کے قریب موجود بیری کے درخت کے نیچے ایک شخص بیٹھا ہوا نظر آیا۔ اس نے (مجھے اپنے پاس بلا کر) مجھ سے گفتگو شروع کی اور مجھے میری باطنی کیفیت سے آگاہ کرنا شروع کر دیا جس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ شخص کوئی جلیل القدر بزرگ ہے۔ میں نے عرض کی: حضرت! مجھے کسی ورد یا ذکر کی تلقین کریں اس نے میری بات پر زیادہ توجہ نہیں دی اور دیگر امور پر گفتگو کرتا رہا۔ میں نے زیادہ عاجزی کے ساتھ اپنی درخواست دہرائی لیکن اس نے پھر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ شاید وہ میرے پختہ عزم کا جائزہ لینا چاہتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اس کے تلقین کردہ ذکر کو ترک کر دوں۔ صبح تک میرا اصرار اور اسکا انکار جاری رہا۔ اگلی صبح جب ہلکی سی روشنی میں درگاہ نظر آنے لگی تو اس شخص نے مجھے کہا کہ میں اس وقت تک تمہیں وظیفہ نہیں بتاؤں گا جب تک تم اللہ کے نام پر یہ عہد نہیں کرو گے کہ تم کبھی اس وظیفے کو ترک نہیں کرو گے' تو میں نے یہ عہد کیا۔

(سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں) میرا یہ خیال تھا کہ شاید وہ بھی ان دوسرے بزرگوں کی طرح کا کوئی وظیفہ بتا دے گا جن سے میں پہلے مل چکا تھا۔ اس نے مجھے نصیحت کی کہ روزانہ سات ہزار مرتبہ یہ ورد کیا کرو:

"اَللّٰهُمَّ يَارَبِّ بِجَاهِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ اِجْمَعْ بَيْنِيْ وَبَيْنَ سَيِّدِنَا مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ فِي الدُّنْيَا قَبْلَ الْاٰخِرَةِ

(اے اللہ! اے میرے رب! تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان کے وسیلے سے آخرت سے پہلے ہی دنیا میں مجھے ان سے ملا دے۔)

پھر ہم وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے اسی دوران درگاہ مبارک کے متولی حضرت شیخ عمر بن محمد الہواری وہاں تشریف لے آئے تو اس شخص نے شیخ الہواری کو یہ نصیحت کی کہ تم اس شخص (یعنی میرا) خاص خیال رکھنا' شیخ الہواری نے جواب دیا یہ تو ہمارا سردار ہے۔

جب شیخ الہواری کے وصال کا وقت قریب آیا تو انہوں نے مجھ سے دریافت کیا: کیا تم جانتے ہو کہ بیری کے درخت کے نیچے تم سے ملنے والا شخص کون تھا؟ میں نے جواب دیا: نہیں' شیخ نے مجھے بتایا: وہ حضرت خضر تھے۔

(سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں) جب اللہ تعالیٰ نے مجھے فتح (روحانی کمال) عطا فرمائی تو اس وقت مجھے شیخ عمر الہواری کی بات کا مطلب سمجھ میں آیا (یعنی جب انہوں نے حضرت خضر کو یہ جواب دیا تھا کہ یہ ہمارا سردار ہے)۔

میں نے یہ وظیفہ پڑھنا شروع کیا۔ ابتداء میں اس قدر مشکل محسوس ہوا کہ پہلے دن رات تک بمشکل پورا ہوا پھر آہستہ آہستہ آسان محسوس ہونے لگا۔ جب کچھ عرصہ گزرا اور میں اس سے مانوس ہوا تو زوال تک اسے مکمل کر لیتا پھر کچھ اور وقت گزرنے کے بعد چاشت کے وقت تک مکمل ہو جاتا پھر کچھ اور آسانی نصیب ہوئی۔ اب یہ عالم ہے کہ میں طلوع آفتاب تک اسے مکمل کر لیتا ہوں۔ اس تمام عرصے کے دوران میں حضرت شیخ عمر بن محمد الہواری کی خدمت میں اکثر و بیشتر حاضر ہوتا رہا آپ مجھ سے بہت محبت فرماتے تھے۔ ۱۱۲۵ھ میں شیخ الہواری واصل بحق ہوئے۔

جب ان کا وقت رخصت قریب آیا تو میں اس وقت ان کے پاس موجود تھا۔ آپ نے مجھ سے دریافت کیا کیا تم جانتے ہو۔ میرے شیخ طریقت کون ہیں؟ میں نے جواب دیا نہیں۔ آپ نے فرمایا: شیخ العربی الفشتالی۔ شیخ نے مجھے اس بات سے اپنی وفات کے وقت آگاہ کیا اور میں اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے شیخ عمر بن محمد الہواری کے واسطے سے شیخ العربی الفشتالی کے روحانی فیوض و برکات مجھے عطا فرمائے۔ جب مجھے مکمل روحانی کشف حاصل ہوا تو اس وقت مجھے پتہ چلا کہ شیخ عمر بن محمد الہواری' شیخ العربی الفشتالی کے تمام اسرار کے حامل نہیں تھے بلکہ انہیں شیخ العربی الفشتالی کے چند اسرار نصیب ہوئے لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے خاص فضل و کرم کے نتیجے میں مجھے شیخ فشتالی کے تمام اسرار کا حامل بنایا بلکہ ان سے زیادہ اسرار عطا فرمائے۔ میں اس بات پر اللہ کا شکر ادا نہیں کر سکتا۔

شیخ العربی الفشتالی بڑے بلند پایہ بزرگ تھے اور آپ کو اپنی زندگی میں دیوان صالحین (اقطاب وقت کی مجلس) میں شامل ہونے کا شرف بھی حاصل تھا۔ میں (احمد بن مبارک) نے دریافت کیا: کیا وصال کے بعد بھی انہیں یہ شرف حاصل ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں۔ اسی طرح شیخ منصور (جو سیّدی عبدالعزیز دباغ کے مشائخ میں سے ایک ہیں) کے بارے میں فرمایا کہ وہ بھی اپنی حیات میں اہل دیوان میں شامل تھے لیکن وصال کے بعد انہیں بھی یہ شرف حاصل نہیں ہوا۔ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے اس کی ایک وجہ بھی بیان کی جس کا ذکر آگے چل کر کیا جائے گا۔

فتح کا حصول

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں: شیخ عمر بن محمد الہواری کی وفات کے تین دن بعد یعنی ۸ رجب ۱۱۲۵ھ بروز جمعرات اللہ تعالیٰ نے مجھے فتح (ایک خاص اصطلاح ہے) نصیب فرمائی۔ اس دن میں اپنے گھر سے نکلا تو کسی شخص نے کچھ رقم نذر پیش کی میں نے اس کی مچھلی خریدی اور گھر واپس آ گیا تو مجھے میری اہلیہ نے کہا کہ شیخ علی بن حرزہم کی درگاہ کے قریب سے تیل لے آؤ تاکہ ہم اس میں مچھلی تل لیں۔ میں گھر سے نکلا، ابھی باب فتوح (نامی جگہ) تک پہنچا تھا کہ اچانک یوں محسوس ہوا جیسے مجھ پر کپکپی طاری ہوئی ہے اور میرا جسم کانپنے لگا پھر یوں لگا جیسے میرے گوشت میں بہت سی چیونٹیاں رینگ رہی ہیں۔ میں اسی حال میں چلتا رہا اور میری حالت مزید بگڑتی چلی گئی یہاں تک کہ راستے میں شیخ یحییٰ بن علال کی درگاہ کے پاس پہنچنے تک میری حالت اچھی خاصی خراب ہوگئی اور سینے میں شدید اضطراب محسوس ہونے لگا۔ مجھے ایسا لگا جیسے وقت آخر قریب آ گیا ہے پھر میرے جسم سے دھوئیں کی مانند کچھ نکلا اور میرا جسم بڑھنا شروع ہوا اور اتنا بڑھا کہ تمام اشیاء بالکل نمایاں طور پر میرے سامنے آگئیں۔ میں نے تمام بلاد وامصار دیکھے میں نے دیکھا کہ عیسائیت اپنی گود میں موجود بچے کو دودھ پلا رہی ہے (یعنی آنے والے وقتوں میں عیسائی حکمرانوں کو دنیا میں غلبہ نصیب ہوگا) میں نے تمام سمندر دیکھے ساتوں زمینیں اور ان میں موجود تمام جانوروں اور دیگر مخلوقات کو دیکھا۔ اسی طرح جب میں نے آسمان کو دیکھا تو یوں لگا کہ جیسے میں خود آسمان سے اوپر ہوں اور اس میں موجود تمام موجودات کا مشاہدہ کر رہا ہوں اچانک میرے سامنے چمکتی ہوئی بجلی کی مانند ایک عظیم نور ظاہر ہوا جو میرے اوپر نیچے، دائیں بائیں، آگے پیچھے سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ مجھے شدید ٹھنڈک کا احساس ہوا اور یوں لگا جیسے ابھی کچھ دیر میں میری موت واقع ہو جائے گی۔ میں جھکا اور منہ کے بل لیٹ گیا تاکہ اس نور کی طرف نہ دیکھ سکوں، لیکن پھر یوں ہوا جیسے میرا پورا جسم آنکھ بن گیا۔ میرا سر بھی اس نور کو دیکھ رہا ہے اور پاؤں بھی اس نور کو دیکھ رہے ہیں یہاں تک کہ میرے تمام اعضاء اسی نور کو دیکھ رہے ہیں۔ جب میں نے اپنے جسم پر موجود کپڑوں پر نظر ڈالی تو یوں لگا کہ میرے جسم پر موجود وہ کپڑے بھی اس نور کے لیے حجاب نہیں بن سکتے۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ اس کیفیت میں لیٹنا یا کھڑے رہنا برابر ہے۔ یہ کیفیت کچھ دیر باقی رہی اور پھر ختم ہوگئی لیکن پھر بھی میں شیخ علی بن حرزہم کی درگاہ تک نہیں پہنچ سکا اور راستے میں

سے شہر واپس آ گیا مجھے شدید رونا آ رہا تھا اور لگ رہا تھا کہ جیسے ابھی میری جان نکل جائے گی۔ ایک مرتبہ پھر ایک لمحے کیلئے یہی کیفیت طاری ہوئی اور پھر ختم ہوگئی اس کے بعد یہ حال ہوا کہ کبھی یہ کیفیت طاری ہو جاتی اور کبھی ختم ہو جاتی۔ آخر کار دائمی طور پر یہ کیفیت نصیب ہوئی۔

اسی دوران اللہ تعالیٰ کا خاص فضل یوں ہوا کہ مجھے ایک جلیل القدر بزرگ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ اس کی صورت یوں پیدا ہوئی کہ فتح کے اگلے روز شیخ ادریس کی درگاہ کی زیارت کیلئے جا رہا تھا کہ راستے میں شیخ احمد جراوندی سے ملاقات ہوگئی جو شیخ ادریس کی درگاہ سے متصل مسجد کے امام تھے میں نے اپنی اس کیفیت کا ذکر ان سے کیا تو وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئے۔ ان کے گھر پہنچ کر ہم دونوں ایک چبوترے پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے فرمائش کی اپنی کیفیت دوبارہ بیان کرو۔ میں نے پورا واقعہ دوبارہ بیان کیا۔ اچانک میری نظر ان کے چہرے پر پڑی تو کیا دیکھتا ہوں کہ شیخ زار و قطار رو رہے ہیں پھر شیخ نے کہا لا الہ الا اللہ پچھلے چار سو برس میں کسی ایک ولی کے بارے میں بھی یہ کیفیت سننے کو نہیں ملی۔ اس کے بعد شیخ نے مجھے بہت سے درہم عطا کئے بلکہ ایک مرتبہ آپ نے پانچ مثقال سونا بھی دیا کہ تم اس رقم کے ذریعے اپنی ضروریات پوری کرو اور جب یہ ختم ہو جائے تو تم کسی اور سے نہ کہنا بلکہ سیدھے میرے پاس آنا۔ میں تمہیں مزید رقم دے دوں گا۔ تمہارے لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ تم شیخ عبداللہ التاودی کی خدمت میں حاضر ہو جاؤ۔ انشاءاللہ فائدہ ہوگا۔ (سیدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں) اس ملاقات کے بعد مجھے شیخ احمد جراوندی سے دوبارہ ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا کیونکہ اس کے کچھ دن بعد ہی اچانک شیخ کا انتقال ہو گیا۔

شیخ عبداللہ برناوی

شیخ احمد جراوندی کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے میں شیخ عبداللہ التاودی کی زیارت کیلئے روانہ ہو گیا۔ جب میں باب الحسبیہ کے قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دروازے کے باہر کھڑا ایک سیاہ فام شخص بڑی غور سے میری طرف دیکھ رہا ہے۔ میں نے دل میں سوچا کہ یہ شخص کیا چاہتا ہے۔ وہ شخص اس بڑے پتھر کے قریب کھڑا تھا جس کے قریب شیخ مجلی بیٹھا کرتے تھے۔ جب میں اس شخص کے قریب پہنچا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے سلام کیا تو میں نے اس کے سلام کا جواب دیا۔ وہ کہنے لگا میری یہ خواہش ہے کہ آپ میرے ساتھ جامع مسجد چلیں وہاں کچھ دیر بیٹھ کر ہم دونوں تبادلہ خیال کریں گے۔ میں نے رضامندی ظاہر کی اور اس کے ساتھ جامع مسجد چلا گیا۔ مسجد میں پہنچ کر وہ مجھے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ میرے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا ہے اور پھر اس نے وہ تمام کیفیات بیان کرنا شروع کر دیں جو میرے (یعنی عبدالعزیز دباغ کے) ساتھ پیش آئی تھیں اس کی یہ گفتگو سن کر میرے ذہن سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا اور مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ شخص کوئی ولی کامل ہے۔ اس نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے مجھے بتایا کہ اس کا نام عبداللہ برناوی ہے اور اس کا تعلق ''برناؤ'' کے مقام سے ہے اور وہ ''فاس'' میں صرف مجھ سے ملاقات کیلئے آیا ہے۔ اس وقت شیخ احمد جراوندی کی نصیحت کی برکت کا اثر میرے سامنے ظاہر

ہوا۔اس کے بعد شیخ عبداللہ برناوی میری ہدایت و رہنمائی کرتے رہے اور میرا حوصلہ بڑھاتے رہے اور مشاہدات کے دوران جو خوف پیدا ہوتا ہے اسے ختم کرتے رہے۔ یہ معمول رجب سے لے کر ذی قعدہ کے مہینے تک جاری رہا۔

رحمتِ عالم کی بارگاہ میں

ذوالحج کے مہینہ میں عیدالضحیٰ کے تیسرے دن مجھے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی۔ اس کے بعد شیخ عبداللہ برناوی نے فرمایا: آج تک مجھے یہ اندیشہ تھا (کہ کہیں تم بھٹک نہ جاؤ) لیکن آج جب کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کی بدولت تمہیں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ تک پہنچادیا ہے تو میرا دل مطمئن ہوگیا ہے اس لیے اب میں تمہیں اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔

(سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں) اس کے بعد شیخ عبداللہ برناوی اپنے وطن واپس تشریف لے گئے۔ دراصل وہ میرے ہمراہ اس لیے رہے تھے کہ جو فتح مجھے حاصل ہوئی ہے اس میں کسی ظلمت کی آمیزش نہ ہو اور جب مجھے بارگاہ رسالت کی حاضری نصیب ہوگئی تو پھر آپ تشریف لے گئے کیونکہ جب انسان اس بارگاہ تک پہنچ جائے تو اس کے بعد کسی گمراہی کا اندیشہ باقی نہیں رہتا۔ تمام تر خطرات کا تعلق اس سے پہلے کی کیفیات کے ساتھ ہے۔

شیخ عبداللہ برناوی کی معیت میں رہتے ہوئے بہت سے عجیب وغریب واقعات پیش آئے جن میں سب سے زیادہ عجیب قصہ ایک عورت کا ہے۔ ایک دن ایک نقاب پوش عورت میرے پاس آئی اس کا وجود خوشبو میں نہایا ہوا تھا۔ رنگ انتہائی سفید تھا۔ وہ ایک حسین وجمیل عورت تھی۔ میرے پاس آ کر کہنے لگی میں تنہائی میں آپ سے کوئی بات کہنا چاہتی ہوں میں ڈر گیا اور تیزی سے اٹھ کر وہاں سے دور چلا گیا۔ اب میں نے سوچا کہ اس عورت سے جان چھوٹ گئی ہے اور میں لوگوں کے درمیان آ گیا ہوں۔ دوسری جگہ پہنچ کر کیا دیکھتا ہوں کہ وہی عورت کھڑی مجھے اپنی طرف آنے کے اشارے کر رہی ہے۔ میں وہاں سے بھی چل پڑا اور ایک اور مقام پر پہنچ کر یہ سوچا کہ اب وہ مجھ تک نہیں پہنچ سکتی لیکن یہ دیکھ کر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی کہ وہ عورت وہاں بھی موجود تھی۔ اس طرح میں بھاگ بھاگ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا رہا لیکن وہ عورت ہر جگہ موجود تھی۔ یہاں تک کہ آخر کار میں مسجد قروین میں داخل ہوگیا اور خیال کیا کہ اب مجھے اس سے نجات مل گئی ہے لیکن جب میں مسجد کی بڑی مشعل کے پاس پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ عورت وہاں بھی موجود ہے۔ میری حالت خاصی خراب ہو چکی تھی۔ اس وقت میں نے سوچا کہ میں بلند آواز میں چیخ کر لوگوں کو اپنے پاس بلاؤں ابھی میں چیخنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک وہ عورت عبداللہ برناوی کی شکل اختیار کر گئی۔ شیخ برناوی نے مجھے کہا کہ میں دراصل تمہارا امتحان لے رہا تھا کیونکہ عام طور پر لوگ عورتوں کی طرف جلد مائل ہو جاتے ہیں خدا کا شکر ہے کہ میں نے تمہیں ویسا ہی پایا جیسا میں چاہتا تھا۔

(مرتب کتاب شیخ احمد بن مبارک فرماتے ہیں) شیخ عبداللہ برناوی کے معارف میں سے بعض آئندہ صفحات میں نقل کیئے جائیں گے۔ ۱۲۶اھ میں شیخ عبداللہ برناوی کا وصال ہوا۔

جب شیخ عبداللہ برناوی اپنے وطن واپس چلے گئے تو اس کے بعد ایک دن سیّدی عبدالعزیز دباغ نے مجھے بتایا کہ آج میں شیخ عبداللہ برناوی کے ہمراہ تھا۔ انہوں نے مجھے یہ کہا اور میں نے یہ جواب دیا اور ہم دونوں نے مل کر فلاں فلاں کام کیا۔ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جو وقت بتایا تھا اس وقت میں بہت تھوڑی دیر کیلئے آپ سے جدا ہوا تھا اس لیے میں نے حیرانگی سے دریافت کیا: کیا شیخ عبداللہ برناوی اپنے وطن واپس تشریف نہیں لے گئے؟ تو آپ نے فرمایا کہ اولیاء ظاہری طور پر ایک دوسرے سے کتنے ہی دور کیوں نہ ہوں لیکن پھر بھی ان کے درمیان فاصلہ نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی ایک ولی مراکش میں موجود ہو اور دوسرا سوڈان یا بصرہ میں موجود ہو تو وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت کر سکتے ہیں اور اس طرح بات کرتے ہیں جیسے کوئی شخص اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے کسی دوسرے شخص سے بات کرتا ہے۔ اس طرح کوئی تیسرا یا چوتھا ولی ان کی گفتگو میں برابر کا شریک ہو سکتا ہے۔ یہاں تک کہ اولیاء کا ایک پورا گروہ مختلف مقامات پر موجود ہونے کے باوجود آپس میں اس طرح گفتگو کر سکتا ہے جیسے کسی ایک مقام پر موجود مختلف لوگ ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت کر سکتے ہیں۔

شیخ منصور بن احمد

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں۔ شیخ عبداللہ برناوی کی وفات کے بعد ان کے تمام اسرار مجھے وراثت میں ملے۔ اسی طرح جو بزرگ قطبیت کے مرتبے پر فائز تھے مجھے ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ان میں سے ایک قطب وقت شیخ منصور بن احمد ہیں جن سے میری ملاقات سورج گرہن کے مشہور واقعہ سے ایک ماہ پہلے ہوئی تھی۔

ملاقات کی صورت یوں ہوئی کہ حضرت شیخ سوت کاتنے کا کام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ میں بھی سوت کے بازار میں اپنے بھائی علال کے ہمراہ گیا تا کہ کوئی شخص میرے بھائی کو یہ پیشہ سکھا دے یہاں تک کہ ہم کشیدہ کاری کی ایک دکان میں داخل ہوئے جہاں ایک استاد اپنے شاگردوں کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ معاملہ طے کیا اور جب میں وہاں سے رخصت ہونے لگا تو اچانک ایک اجنبی نے آواز دے کر مجھ روک لیا اور مجھ سے گفتگو کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں اس کے پاس گیا تو اس نے مجھ سے دریافت کیا (نسبی اعتبار سے) تم کون ہو؟ میں نے جواب دیا: ''سید'' ہوں۔ اس نے کہا: نیک پاکیزہ اور صاف ستھرے لوگوں کی اولاد ہو پھر اس نے میرا نام دریافت کیا: میں نے جواب دیا: ''عبدالعزیز'' اس نے دوبارہ تعریف کی اور دریافت کیا: تمہارے والدین حیات ہیں؟ میں نے کہا: دونوں کا انتقال ہو چکا ہے۔ کیا آپ کے بیوی بچے ہیں؟ میں نے جواب دیا: ہاں! اس نے دریافت کیا: کیا تمہارے پاس کچھ مال و دولت ہے؟ میں نے جواب دیا: نہیں۔ اس نے مجھے کچھ رقم دی جو اچھی خاصی رقم تھی۔ یہ میری ان سے پہلے ملاقات تھی پھر جب ان سے تعلق قائم ہوا تو ان

کی معیت میں بہت سے عجیب وغریب واقعات پیش آئے۔(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) ان میں سے بعض واقعات کا ذکر اس کتاب میں کیا جائے گا۔۱۱۲۹ھ میں آپ کا وصال ہوا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) سورج گرہن کا مشہور واقعہ ۲۹ محرم الحرام ۱۱۱۸ھ میں پیش آیا تھا۔ اس لحاظ سے سیّدی عبدالعزیز دباغ اور شیخ منصور بن احمد کے درمیان بارہ برس تک رفاقت رہی۔

ایک دن میں نے سیّدی عبدالعزیز دباغ سے دریافت کیا: شیخ عبداللہ برناوی اور شیخ منصور بن احمد میں سے کون بلند مرتبے کا حامل تھا تو آپ نے جواب دیا: اگرچہ یہ دونوں حضرات قطبیت کے مرتبے پر فائز تھے لیکن شیخ عبداللہ برناوی کا مرتبہ فائق ہے۔

(سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں) شیخ منصور بن احمد کی وفات کے بعد میں ہی ان کا روحانی وارث بنا تھا۔ آپ جبل حبیب کے نزدیک فحص (نامی شہر) کے رہنے والے تھے۔

شیخ محمد لہواج

جن حضرات سے مجھے (یعنی سیّدی عبدالعزیز دباغ کو) ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ان میں شیخ محمد لہواج ہیں جو شہر تطاون کے قریب کسی بستی کے رہنے والے تھے۔ ان سے ملاقات کی صورت یوں پیدا ہوئی کہ میرے والد کی وفات کے بعد میرے چچا مجھے اور میرے ایک بھائی کو کشیدہ کاری کی دکان پر کام سکھانے کی غرض سے لے گئے۔ جہاں ململ پر کشیدہ کاری کا کام کیا جاتا تھا اس کارخانے میں شیخ محمد لہواج کا ایک قریبی عزیز بھی کاریگر کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ شیخ محمد لہواج جب اپنے اس عزیز سے ملنے کے لیے آتے تو کچھ دیر میرے پاس بیٹھ کر میرے ساتھ بھی باتیں کیا کرتے۔ یہاں تک کہ میرے اور ان کے درمیان مکمل جان پہچان ہوگئی۔ ان کی معیت میں بھی بہت سے عجیب وغریب واقعات پیش آئے جن میں سے چند ایک کا ذکر اس کتاب میں کیا جائے گا۔ میری ان سے پہلی ملاقات شیخ منصور بن احمد سے ملنے سے پہلے ہوئی اور یہ ۱۱۱۲ھ کا واقعہ ہے لیکن ان کا انتقال شیخ منصور بن احمد کی وفات کے کچھ دن بعد ہوا اور ان کے وصال کے بعد ان کی روحانی وراثت بھی مجھے نصیب ہوئی۔ اس طرح مجھے درج ذیل مشائخ کی صحبت میں رہنے کا شرف حاصل ہوا:

۱- عارفین کے قطب اولیاء وصالحین کے امام مشائخ کے پیشوا حضرت خضر علیہ السلام
۲- شیخ عمر بن محمد الہواری جو شیخ علی بن حرزہم کی درگاہ کے متولی تھے اور ان کی صحبت اختیار کرنے کی تاکید حضرت خضر نے کی تھی۔
۳- شیخ عبداللہ برناوی جن سے میری ملاقات فتح حاصل ہونے کے اگلے دن ہوئی۔
۴- شیخ منصور بن احمد
۵- شیخ محمد لہواج

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) ہمارے شیخ سیّدی عبدالعزیز دباغ کو اور بھی بہت سے مشائخ کی صحبت اختیار

کرنے کا شرف حاصل ہوا اور آپ ان دیگر مشائخ کے بھی روحانی وراثت قرار پائے۔ ان حضرات کا ذکر آئندہ صفحات میں مختلف مقامات پر کیا جائے گا۔ ان جلیل القدر حضرات میں سے ایک اپنے زمانے کے غوث اور اپنے وقت کے جلیل القدر عارف شیخ احمد بن عبداللہ المصری ہیں۔

دیوان الصالحین میں شرکت

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں جب مجھے پہلی مرتبہ دیوان (اقطاب جہاں کی مجلس) میں شامل ہونے کا موقع ملا تو پہلے دن احمد بن عبداللہ المصری (جو اس وقت کے غوث اور میر مجلس تھے) سمیت تمام حاضرین نے مجھے بطور خاص کتمان سر (یعنی معرفت حقیقی کے راز کو چھپانے) کی تاکید کی۔ یہاں تک کہ شیخ احمد بن عبداللہ نے تمام حاضرین مجلس کو یہ حکم دیا کہ وہ اس بارے میں کوئی حکایت سنائیں۔ لہٰذا تمام حضرات نے تقریباً دو سو واقعات سنائے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) حضرت نے ان میں سے صرف آٹھ واقعات میرے سامنے بیان کئے ہیں۔

پہلی حکایت:

پہلا واقعہ خود غوث زمان شیخ احمد بن عبداللہ المصری کا ہے۔ آپ فرماتے ہیں مجھے اپنے ایک مرید کے ساتھ شدید محبت تھی ایک دن میں اس کے سامنے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و کمالات کا ذکر کر رہا تھا کہ اس دوران میں نے اسے بتایا کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نور مبارک نہ ہوتا تو زمین کے اسرار میں سے کوئی ایک راز بھی ظاہر نہ ہوتا۔ اگر آپ کا نور مبارک نہ ہوتا تو کوئی چشمہ نہ پھوٹتا اور نہ ہی کسی دریا کا وجود ہوتا۔ میرے عزیز! آپ کا نور مبارک مارچ کے مہینے میں تین مرتبہ تمام بیجوں پر مہکتا ہے جس کے نتیجے میں پھل پیدا ہوتا ہے۔ اگر آپ کا نور مبارک نہ ہوتا تو کوئی پھل پیدا نہ ہوتا۔ میرے بیٹے! درجے کے اعتبار سے سب سے کم تر ایمان اس شخص کا ہے جس کے نزدیک اس کا اپنا ایمان پہاڑ کے برابر بلکہ اس سے بھی زیادہ وزنی ہوتا ہے۔ لہٰذا بعض اوقات انسان اس کی شدت سے گھبرا کر ایمان ترک کرنے کا سوچ لیتا ہے۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نور ایمان کے وزن کو برداشت کرنے میں انسان کا مددگار ثابت ہوتا ہے جس کی وجہ سے انسان کو ایمان خوشنما اور پاکیزہ محسوس ہونے لگتا ہے۔ اسی دوران کہ جب میں اس کے سامنے آپ کی عظمت شان اور روحانی فیوض و برکات کا تذکرہ کر رہا تھا میری اپنی توجہ اس سے ہٹ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار و تجلیات کی طرف مبذول ہوگئی۔ جب اس نے میری اس کیفیت کا مشاہدہ کیا تو درخواست کی کہ حضرت! نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے مجھے سر عطا فرما دیں۔ پہلے میں نے یہ ارادہ کیا کہ میں اسے صاف انکار کر دوں لیکن جب مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے کا خیال آیا تو میں نے اس کی درخواست قبول کر لی اور اسے اپنا ''سر'' عطا کر دیا۔ (کیونکہ درحقیقت وہ اس کے قابل نہ تھا) اس لیے چند ہی دن کے اندر اس پر کفر کا فتویٰ لگا اور اسے قتل کر دیا گیا۔ یہ شخص

عرب تھا اور مصر کی کسی بستی کا رہائشی تھا۔ مجھ سے سر حاصل کرنے کے بعد یہ اپنے وطن واپس چلا گیا۔ اس نے لوگوں کو اکٹھا کیا اور ان کے سامنے وہ باتیں بیان کی جو ان کی عقل سے ماوراء تھیں اس لیے انہوں نے اسے قتل کروا دیا۔

دوسری حکایت:

ایک صاحب نے بیان کیا میرا ایک مرید تھا جس نے بارہ برس تک میری خدمت کی۔ مجھے اس سے بہت محبت تھی۔ یہاں تک کہ میں نے سوچ لیا تھا کہ اپنی ایک بیٹی کا نکاح اس کے ساتھ کر دوں گا۔ میری یہ عادت تھی کہ میں ہر ہفتے تین دن کیلئے ساحل سمندر پر تنہائی میں عبادت کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ عبادت کے انہی ایام کے دوران عید کا دن آ گیا۔ میرے چھ بیٹے' تین بیٹیاں اور ایک خادم تھا۔ جب میں گھر واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس نے ان سب کو نیا لباس لے کر دیا اور ضرورت کی دیگر تمام اشیاء خرید کر دی ہیں۔ یہ دیکھ کر مجھے نہایت خوشی ہوئی پھر جب میں اس سے ملا تو اس نے نہایت اصرار کے ساتھ مجھ سے سر عطا کرنے کی درخواست کی چنانچہ میں نے مجبوری کے عالم میں اسے سر عطا کیا۔ ابھی اس بات کو چالیس دن بھی نہیں گزرے تھے کہ اس کے بیان کردہ اسرار کی بدولت لوگوں نے اسے قتل کر دیا کیونکہ یہ باتیں ان کی عقل سے ماوراء تھیں۔

تیسری حکایت:

ایک صاحب نے بیان کیا میرا ایک مرید تھا۔ جس نے نہایت عمدہ اور احسن طریقے سے نو برس تک میری خدمت کی وہ میرے محلے کا رہنے والا تھا اور مجھے اس سے شدید محبت تھی۔ میری بیوی اکثر بیمار رہتی تھی جبکہ اس مرید کی بھی ایک خوبصورت بیوی تھی۔ وہ اپنی بیوی کو میرے ہاں لے آتا اور اس کی بیوی گھر کے وہ تمام کام نمٹاتی جنہیں پورا کرنا میری بیوی کے بس میں نہیں تھا۔ مختصر یہ کہ وہ دونوں میاں بیوی ہماری خدمت کیا کرتے تھے اس لیے میں ان سے بہت محبت رکھتا تھا۔ ایک دن میں کہیں کھڑا ہوا تھا کہ اچانک وہ مرید اپنی چھوٹی سے بچی کے ساتھ میرے پاس آ کھڑا ہوا۔ اس بچی کے ہاتھ میں قرآن مجید تھا۔ میری اس پر نظر اس وقت پڑی جب وہ بچی میرے قدموں میں بیٹھی تھی اور اس کے ہاتھوں میں قرآن مجید تھا۔ میں ایک قدم پیچھے ہٹا اور اس سے دریافت کیا: تم کیا چاہتے ہو؟ کیونکہ تم اپنے ساتھ ایک عظیم واسطہ لے کر آئے ہو۔ اس نے درخواست کی: آپ مجھے ''سر'' عطا کر دیں۔ میں نے اس سے کہا۔ تم اسے حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے کیونکہ وہ ایک بلند مرتبہ شے ہے۔ اسے صرف وہی شخص حاصل کر سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ اس کی صلاحیت بھی عطا فرما دے کیونکہ عام طور پر اس کے حامل کو دو تہائی لوگ برا بھلا کہتے ہیں بلکہ اس میں ہلاکت کا اندیشہ بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس نے دوبارہ اصرار کیا کہ آپ مجھے سر عطا کر دیں میں اس کی صلاحیت رکھتا ہوں جب میں نے اس کی اور اس کی بیوی کی خدمت' ان کے ساتھ اپنے سابقہ تعلقات اور اس واسطے پر نظر ڈالی جسے وہ اپنے ساتھ لایا تھا تو میں نے سر عطا

کرنے کا اقرار کرلیا اور اسے سر عطا کردیا۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں۔اس شخص نے ذات کے بغیر سر حاصل کیا تھا اور جو شخص ذات کے بغیر سر حاصل کرتا ہے وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ میں نے عرض کی: ذات سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا یعنی شیخ کی ذات اور اس کے اسرار۔ (یاد رکھو) شیخ کے اسرار مرید کو شیخ کی وفات کے بعد حاصل ہوتے ہیں پھر آپ نے مزید ارشاد فرمایا: کوئی بھی شیخ کسی مرید کو سر تو دے سکتا ہے ذات نہیں دے سکتا۔

مختصر یہ کہ وہ شخص وہ سر لے کر چلا گیا اور اگلے تین دن تک اپنے شیخ کی خدمت میں حاضر نہ ہوا اور اس کے بعد اپنے شیخ کی شان میں نازیبا کلمات استعمال کرنے لگا۔ کسی نے شیخ کو اطلاع دی کہ آپ کا فلاں مرید آپ کی شان میں نازیبا کلمات استعمال کر رہا ہے۔ شیخ نے اس کے حال سے لاپرواہی اختیار کی اور وہ شخص گمراہی کی دلدل میں دھنستا چلا گیا۔ اسی دوران وہ کسی قافلے کے ہمراہ بحری سفر پر روانہ ہوا اور راستے میں کسی جگہ قید ہو گیا۔ بعد میں اس نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا اس کی بد نصیبی یہ تھی کہ اس نے سر کے حصول میں عجلت کا مظاہرہ کیا تھا جس کے نتیجے میں اسے اسلام سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے سلامتی طلب کرتے ہیں۔

چوتھی حکایت:

ایک شیخ نے یہ واقعہ بیان کیا۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ میں نے اپنے دینی بھائی کے ہمراہ سیاحت کا پروگرام بنایا تاکہ ہم اللہ کے ولی کو تلاش کریں جو ہمارا ہاتھ تھام کر ہمیں اللہ کی بارگاہ تک پہنچا دے ہم سفر پر نکل کھڑے ہوئے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک ولی تک پہنچنے کا شرف عطا کیا۔ وہ ولی ایک ہوٹل کا مالک تھا۔ ہم نے اس کے پاس رہنا شروع کر دیا۔ وہ ولی خود کھانا تیار کرتا اور ہم دونوں میں سے ایک آگ جلاتا اور دوسرا وہ کھانا گاہکوں میں تقسیم کرتا۔ ایک طویل عرصہ تک یہی معمول جاری رہا۔ جب شیخ کے وصال کا وقت قریب آیا اور اسی دوران ان پر غشی طاری ہوئی تو میرے ساتھی نے ان سے درخواست کی۔ آپ مجھے سر عطا کر دیں۔ شیخ نے جواب دیا ابھی تم اس کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اس نے کہا آپ مجھے ضرور دیں شیخ نے مجھ سے دریافت کیا: تمہارا کیا ارادہ ہے۔ میں نے عرض کی: جیسے آپ مناسب سمجھیں۔ شیخ نے جواب دیا: اگر تم ابھی اسے حاصل نہ کرو تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا بہتر بدلہ عطا فرمائے گا۔ اس پر میں نے خاموشی اختیار کی جبکہ میرے ساتھی نے سر حاصل کر لیا۔ دو دن بعد شیخ کا انتقال ہو گیا اور میرا ساتھی اپنے وطن واپس چلا گیا۔

میں بدستور شیخ کی دکان پر کام کرتا رہا اور اس کی آمدنی شیخ کے اہل خانہ کو دیتا رہا۔ شیخ کے پسماندگان میں ایک بیوہ' تین بیٹیاں اور ایک بیٹا شامل تھے۔ تقریباً بارہ برس تک میں شیخ کی دکان پر کام کرتا رہا اور اس تمام عرصے کے دوران شیخ کیلئے عقیدت کے جذبات بدستور قائم رہے اور ان میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ اس تمام عرصے کے دوران شیخ کی تینوں بیٹیوں کی شادی ہو گئی۔ شیخ کا بیٹا۔ وہ جگہ چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا۔ اسی طرح شیخ کی بیوہ

نے دوسری شادی کر لی۔ اب میرا وہاں کوئی واقف نہیں رہا۔ اس لیے تنگ آ کر میں نے اپنے وطن واپس جانے کا ارادہ کر لیا۔ اپنا ساز و سامان فروخت کر کے میں نے سفر کی تیاری کی اور آخر کار شیخ کی قبر کی زیارت کیلئے روانہ ہو گیا جو عام آبادی سے ہٹ کر ایک ویرانے میں تھی۔ حاضری کے بعد جب واپس آنے لگا تو میرے دل نے کہا: افسوس! آج کے بعد میں کبھی بھی شیخ کی قبر کی زیارت نہیں کر سکوں گا۔ میرے دل میں شیخ کیلئے الفت کا احساس پیدا ہوا اور بے چینی سی محسوس ہوئی میں واپس قبر کے پاس آ کر بیٹھ گیا کچھ دیر بعد دوبارہ اٹھ کر واپس جانے لگا تو وہی کیفیت طاری ہوئی میں پھر بیٹھ گیا اور رات تک وہاں بیٹھا رہا۔ شیخ کی محبت کی بدولت میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور شیخ کی جدائی مجھے بے چین کر رہی تھی۔ اسی حالت میں میں نے ساری رات قبر کے پاس گزار دی یہاں تک کہ جب صبح صادق کا وقت ہوا تو حضرت خضر علیہ السلام وہاں تشریف لائے تو آپ نے مجھے ذکر کی تلقین کی اور اللہ تعالیٰ نے مجھے ''فتح'' عطا فرما دی۔

اب میں اپنے وطن واپس روانہ ہوا راستے میں ایک مقام پر میرے ساتھی کا شہر تھا اس لیے میں اس شہر میں رک گیا تا کہ اپنے ساتھی کے احوال دریافت کر سکوں۔ جب میں شہر میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ کچھ لوگ لکڑیاں اکٹھی کر کے کسی شخص کو جلانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ میں نے سوچا دیکھیں تو سہی وہ کون شخص ہے؟ آگے جا کر دیکھا تو وہ میرا ساتھی تھا۔ میں نے لکڑیاں اکھٹی کرنے والوں سے دریافت کیا کہ اس شخص نے کیا گناہ کیا؟ انہوں نے جواب دیا: یہ شخص اس اس طرح کی باتیں کرتا ہے یعنی اس نے اللہ کے اسرار میں سے ایک راز لوگوں کے سامنے بیان کیا جوان کی عقل سے ماوراء تھا۔ انہوں نے اس بارے میں علماء سے فتویٰ طلب کیا تو علماء نے اسے جلانے کا فتویٰ دے دیا۔ میں اس کے قریب گیا میں اسے پہچان چکا تھا لیکن وہ اپنی حالت حال کے باعث مجھے نہیں پہچان سکا۔ میں نے اس سے دریافت کیا: یہ لوگ تمہیں کیوں جلا رہے ہیں؟ اس نے کہا میں نے انہیں یہ بات بتائی ہے۔ میں نے کہا کہ تم تو بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو پھر میں نے اس سے دریافت کیا: تم نے اس کے علاوہ تو انہیں کچھ نہیں کہا؟ اس نے جواب دیا نہیں۔ لہٰذا میں نے لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر انہیں کہا میں حاکم شہر سے ملنے جا رہا ہوں اور جب تک میں واپس نہ آ جاؤں تم اسے کچھ نہ کہنا کیونکہ میں حاکم کو یہ بتاؤں گا کہ یہ شخص قتل کا حقدار نہیں ہے اس لیے میری واپسی تک تم لوگ صبر سے کام لو اور اگر تم نے اسے مارنے کی کوشش کی تو وہ اپنے فعل کا خود ذمہ دار ہو گا کیونکہ مجھے پورا یقین ہے کہ حاکم اس کے قتل کا فیصلہ واپس لے گا۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ تمہاری واپسی تک ہم اسے کچھ نہیں کہیں گے۔ میں حاکم کے پاس چلا گیا۔

جب میں حاکم کے پاس پہنچا تو اس وقت وہاں علماء بھی موجود تھے جو اسی شخص کا تذکرہ کر رہے تھے اور حاکم کو اس بات کی ترغیب دے رہے تھے کہ اس شخص کو فوراً قتل کروا دیا جائے۔ میں نے حاکم سے کہا اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی مدد عطا فرمائے اور آپ کو اپنی پسند کے مطابق اعمال سرانجام دینے کی توفیق عطا فرمائے (میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں) کہ ہر انسان کے ساتھ ۳۶۶ فرشتے ہوتے ہیں۔ جب کوئی انسان کسی کو ناحق قتل کر دے تو وہ سب

فرشتے قاتل کو بددعا دینا شروع کر دیتے ہیں اور یہ طے شدہ امر ہے کہ فرشتوں کی دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔ اس لیے آپ کو ان کی بددعا سے بچنا چاہئے اسی طرح ہر انسان کے ساتھ معزز فرشتے ہوتے ہیں جن کا کام اعمال تحریر کرنا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کو ناجائز طور پر قتل کر دے تو یہ فرشتے مقتول کے سارے گناہ قاتل کے نامہ اعمال میں لکھنا شروع کر دیتے ہیں اور قاتل کی تمام نیکیاں مقتول کے نامہ اعمال میں درج کرتے ہیں اور قاتل کے مرنے تک ان کا یہ مشغلہ جاری رہتا ہے۔ قاتل کے مرنے کے بعد یہ فرشتے اس کی برائیوں کا تذکرہ کرنا شروع کر دیتے ہیں اور فرشتوں کا تذکرہ بارش کی مانند ہے۔ اگر وہ کسی کی برائیوں کا تذکرہ کریں گے تو ایسا شخص مزید بری حالت کا شکار ہوگا اور اگر وہ کسی شخص کی اچھائیوں کا تذکرہ کریں گے تو ایسے شخص کی حالت مزید بہتر ہوگی۔ یہ فرشتے قاتل کا ذکر برائی کے ساتھ کرتے ہیں اور مقتول کا تذکرہ اچھے الفاظ میں کرتے ہیں اس لیے قاتل ہمیشہ بری حالت کا شکار رہتا ہے۔ اے حاکم کیا تم اس بات سے خوف زدہ نہیں ہو؟ حاکم نے جواب دیا: ان علماء نے اس شخص کے قتل کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ میں نے کہا ان علماء نے فتویٰ دینے میں جلد بازی کا مظاہرہ کیا ہے۔ انہیں چاہیے تھا کہ وہ قاتل کے الفاظ اور اس کی نیت دونوں کا جائزہ لیتے۔ اگر اس کے الفاظ کے ذریعے قتل کے جواز کی راہ نکلتی تو اس شخص سے اس کی نیت اور ارادہ دریافت کرتے بالفرض اگر اس شخص کی نیت درست ہوتو اس کے قتل کا فتویٰ دینا درست نہیں ہوگا۔ لہٰذا تم اس شخص کو بلوا کر اس کی نیت دریافت کرو وہاں موجود علماء نے میرے مشورے کی تائید کی اس شخص کو وہاں بلوا کر اس کی نیت دریافت کی گئی تو اس کی نیت درست تھی۔ اس لیے قتل کا فتویٰ واپس لے لیا گیا اور اس شخص کو آزاد کر دیا گیا۔

(شیخ احمد بن مبارک فرماتے ہیں) میں نے سیّدی عبدالعزیز دباغ سے دریافت کیا: رہائی کے بعد اس شخص کی کیا حالت ہوئی؟ آپ نے جواب دیا اس کے جس ساتھی نے اسے قتل ہونے سے بچایا تھا اسی نے اس کا ''سر'' سلب کر کے اسے ایک عام آدمی کی مانند کر دیا۔ میں نے دریافت کیا اور پہلی تین حکایات جن لوگوں کے بارے میں تھیں ان کا کیا انجام ہوا؟ آپ نے فرمایا: پہلے دو شخص تو ولایت کی حالت میں انتقال کر گئے جبکہ تیسرا کفر کی حالت میں مرا۔

پانچویں حکایت:

ایک صاحب نے یہ واقعہ بیان کیا:

میرا ایک مرید بارہ برس تک میری خدمت کرتا رہا۔ وہ ایک صاحب ثروت اور سخی دل شخص تھا۔ اس نے میرے اور اپنے پیر بھائیوں پر ایک بڑی رقم خرچ کی۔ میرا ایک بھائی سرکاری ملازم تھا۔ ایک مرتبہ حاکم نے ناراض ہو کر اس کو بھاری جرمانہ کر دیا جس کی ادائیگی اس کے بس میں نہیں تھی۔ کیونکہ عام لوگ میری عزت کرتے تھے اس لیے حکومت نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ اس مرید نے اس موقع کو غنیمت شمار کرتے ہوئے مجھ سے کہا: حضرت! یا تو آپ مجھے ''سر'' عطا کر دیں یا وہ ساری رقم واپس کر دیں جو میں نے آپ پر اور دوسرے

درویشوں پر خرچ کی ہے ورنہ میں حاکم کے پاس شکایت کر دوں گا۔ آپ ان دونوں میں سے کوئی ایک صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ میں نے اس سے کہا: میرے بیٹے! اللہ سے ڈرو اگر تمہیں میری بات میں شک ہو تو میں تمہارے ساتھ اللہ کے نام پر عہد کرتا ہوں کہ ایسا ضرور ہوگا۔ میری یہ بات سن کر وہ اور ڈھیٹ ہو گیا اور کہنے لگا: اللہ کی قسم! اگر تم نے میرا سارا مال مجھے واپس نہ کیا تو میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا بلکہ گرفتار کروا دوں گا۔ اس وقت صورتحال کچھ یوں تھی کہ وہ مجھے گرفتار بھی کروا سکتا تھا۔ وہ اپنی بات پر اسی طرح شدت سے اصرار کرتا رہا یہاں تک کہ میں نے سجدے میں سر رکھ کر اس کے لیے "سر" کی دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے اسے سر عطا کر دیا۔ چند دن بعد اسے ایک شے دکھائی دی جسے اللہ تعالیٰ نے عام لوگوں کی کم عقلی کے باعث لوگوں سے اسے پوشیدہ رکھا تھا۔ اس نے اس شے کا تذکرہ لوگوں کے سامنے کر دیا۔ لوگوں نے اس کے خلاف قاضی سے رجوع کیا اور اسے قتل کر دیا گیا۔

(سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں) اگر وہ شخص کچھ اور صبر کر لیتا تو اللہ تعالیٰ اسے "سر ذات" بھی عطا کر دیتا جس کی بدولت "سر ولایت" باقی رہتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہ شخص لوگوں کے سامنے ان اسرار کا تذکرہ نہ کرتا لیکن اس نے جلدی بازی کا مظاہرہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے اسے سزا دی۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا اس کا انجام کیا ہوا؟ آپ نے فرمایا وہ ولایت کی حالت میں مرا ہے اس پر میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) جن اسرار کو بیان کرنے کی وجہ سے ان تمام حضرات کو قتل ہونا پڑا وہ میں نے سیّدی عبدالعزیز دباغ کی زبانی سنے ہیں لیکن بیان اس لیے نہیں کئے کیونکہ وہ بیان سے ماوراء ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ حضرت شیخ اور آپ کے پاکیزہ نسب کی برکت سے ہمیں اپنی رضا کے مطابق زندگی بسر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ طوالت سے بچنے کیلئے ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں تاکہ قارئین اکتاہٹ کا شکار نہ ہو جائیں۔

☆☆☆

تیسری فصل

کراماتِ شیخ کا بیان

یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ شیخ عبدالعزیز دباغ ایک نادر روزگار شخصیت تھے۔ آپکا مرتبہ بہت بلند ہے۔ آپ جیسی شخصیت کی عظمت کے اظہار کیلئے کسی کرامت کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ آپ سراپا کرامت تھے۔ آپ علوم میں اس قدر مہارت رکھتے تھے کہ اکابر علماء کو بھی یہ مرتبہ نصیب نہ ہوا۔ معقول و منقول ہر فن میں اپنی مثال آپ تھے اگرچہ آپ نے کسی ظاہری استاد کے سامنے زانوئے تلمذ طے نہیں کیا۔ آپ نے تو قرآن مجید بھی حفظ نہیں کیا تھا۔ چہ جائیکہ آپ دیگر علوم سیکھتے۔ یہاں تک کہ آپ کو بچپن سے لے کر کبیر سنی تک کے درمیانی عرصہ میں کبھی کسی مجلس علم میں درس حاصل کرتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔

عقیدے کی درستگی

سب سے پہلے ہم آپ کی اس کرامت کا تذکرہ کریں گے جسے سب سے عظیم کرامت کہا جا سکتا ہے اور وہ عقیدے کی درستگی ہے۔ جب میری آپ سے پہلی ملاقات ہوئی تو میں نے آپ سے عقیدۂ توحید کے بارے میں دریافت کیا: آپ نے کوئی ایک نکتہ ترک کئے بغیر اہلسنّت والجماعت کا عقیدہ (تمام جزئیات سمیت) بیان کر دیا۔

اسی طرح ایک مرتبہ آپ نے یہ بات ارشاد فرمائی کہ جب تک کوئی شخص اہل سنت والجماعت کے عقیدے پر ثابت قدم نہیں ہوگا اس وقت تک اسے ''فتح'' نصیب نہیں ہوگی اور اللہ تعالیٰ کے کسی ایک بھی ولی کا عقیدہ اہل سنت والجماعت سے ہٹ کر نہیں تھا۔ بالفرض اگر فتح کے حصول سے پہلے کسی کا ایسا عقیدہ تھا تو بھی فتح کے حصول کے فوراً بعد توبہ کر کے اہل سنت کا عقیدہ اختیار کرنا اس پر واجب ہوگا۔ میں (احمد بن مبارک) کہتا ہوں کہ علامہ بدرالدین زرکشی نے امام سبکی کی ''جمع الجوامع'' کی شرح میں یہی بات تحریر کی ہے۔ سیّدی عبدالعزیز دباغ ہمیشہ اہل سنت والجماعت کی تعریف کیا کرتے تھے اور یہ بات ارشاد فرمایا کرتے تھے: میں اہل سنت سے بہت محبت کرتا ہوں۔ آپ اکثر یہ دعا مانگا کرتے تھے کہ آپ کا انتقال اس حال میں ہو کہ آپ اہل سنت کے عقیدے پر

ثابت قدم ہوں۔ اسی طرح بعض اوقات میں آپ کے سامنے بدمذہبوں کے شبہات بیان کرتا اور آپ ان کے تسلی بخش جواب عنایت کرتے' جس سے یوں محسوس ہوتا کہ آپ اپنی آنکھوں کے ذریعے امور کا مشاہدہ کرنے کے بعد جواب دے رہے ہیں۔

ہم نے آپ کی زبانی اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت اور شان الوہیت کے ان اسرار کا بیان سنا ہے جو کسی کتاب میں بھی نظر سے نہیں گزرا اور نہ ہی کسی عالم کی زبانی ایسی باتیں سنی ہیں۔ ہم نے خود اگرچہ بڑی محنت کے بعد معقولات و منقولات میں مہارت حاصل کی ہے لیکن ان اسرار تک ہمارا ذہن بھی نہیں پہنچ سکا۔ لیکن اگر اللہ تعالیٰ کسی کو یہ صلاحیت عطا کر دے تو وہ شخص علمی مسائل میں آپ کے ساتھ تبادلہ خیال کر کے بدمذہبوں کا رد کرنے کا فن سیکھ سکتا ہے۔ اس طرح اس کا ایمان مضبوط اور اس کے اندر ۷۲ (گمراہ) فرقوں کا رد کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک مرتبہ شیخ نے یہ بات ارشاد فرمائی تھی: میں صرف انہی چیزوں پر ایمان لایا ہوں جنہیں دیکھ چکا ہوں۔ کیا کوئی شخص دیکھے بغیر بھی ایمان لا سکتا ہے کیونکہ دیکھے بغیر وسوسے ختم نہیں ہوتے؟ دراصل آپ نے اس جملے میں اپنے کشف کی طرف اشارہ فرمایا جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے خاص فضل و کرم سے عطا فرمایا ہے۔

احادیث صفات:

ایک مرتبہ میں نے احادیث صفات کے بارے میں دریافت کیا: اس مسئلے میں سلف صالحین کے نظریے کے مطابق ''تفویض'' کرنا ضروری ہے یا متاخرین کے طریقہ کار کے مطابق ''تاویل'' بہتر ہے؟ آپ نے فرمایا ''تفویض'' بہتر ہے کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی شان اس قدر عظیم ہے کہ انسان اس کی عظمت کا اندازہ نہیں لگا سکتا اور نہ ہی اس کی حقیقت تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ آپ نے مزید ارشاد فرمایا: دنیا میں رہنے والوں نے جنت کی نعمتوں کا تذکرہ سن رکھا ہے لیکن یہ لوگ دنیا میں رہ کر جنت کی نعمتوں کی حقیقت کے بارے میں نہیں جان سکتے کیونکہ جنت کا انگور دنیاوی انگور کی مانند نہیں ہے اور جنت کی کھجور دنیا کی کھجور سے مختلف ہے۔ اسی طرح جنت کا سونا دنیاوی سونے سے مختلف ہے۔ اگر کسی شخص کو کشف نصیب ہو اور وہ جنت کی نعمتوں کو دیکھ لے تو اسے پتہ چلے گا کہ جنت کی نعمتوں اور دنیاوی نعمتوں کے درمیان مشترکہ چیز صرف ان کے نام ہیں ورنہ درحقیقت یہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں تک کہ اگر دوسری زمین والوں کے سامنے شہد' گھی' روٹی' دودھ یا اسی طرح کے کھانے پینے کی دیگر اشیاء کا تذکرہ کیا جائے تو وہ اس کا مطلب نہیں سمجھتے کیونکہ یہ اشیاء دوسری زمین پر پائی ہی نہیں جاتی ہیں۔ یہ دونوں حادث ہیں اور دو حادث چیزوں کے درمیان جب اس قدر تفاوت پایا جاتا ہے تو بھلا ذات قدیم (یعنی ذات باری تعالیٰ) کی معرفت کوئی حادث (یعنی مخلوق) کیسے حاصل کر سکتا ہے؟ اس لئے بندگانِ خدا پر لازم ہے کہ جب وہ احادیث صفات کے بارے میں سنیں تو ان کے ظاہری معانی' جنہیں مراد لینا محال ہے' انہیں مراد لینے کی بجائے ان کے معانی اللہ کے سپرد کر دیں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں: سلف صالحین میں سے) امام مالک' سفیان عینیہ' سفیان ثوری' حماد بن زید' حماد بن سلمہ' شعبہ' شریک' ابوعوانہ' ربیعہ' الاوزاعی' ابوحنیفہ' شافعی' احمد بن حنبل' ولید بن مسلم' بخاری' ترمذی' ابن مبارک' ابن ابی حاتم اور یونس بن عبدالاعلیٰ کا مسلک بھی ''تفویض'' ہے۔ قرونِ ثلاثہ جو کہ بہترین زمانہ ہے اس زمانے کے لوگ بھی اسی نظریے کے قائل ہیں۔ یہاں تک کہ امام ابوحنیفہ کے شاگرد رشید امام محمد بن حسن شیبانی فرماتے ہیں:

''قرآن کی وہ آیات اور ثقہ راویوں سے مروی وہ تمام احادیث جن میں اللہ تعالیٰ کی مختلف صفات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان کے بارے میں مشرق ومغرب کے تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ ان پر کسی تشبیہہ اور تفسیر کے بغیر ایمان لایا جائے گا۔''

امام الحرمین ''رسالہ نظامیہ'' میں تحریر کرتے ہیں:

''اس طرح کی آیات واحادیث کے بارے میں علماء کی آراء مختلف ہیں۔ بعض اہل علم اس بات کے قائل ہیں کہ ان کی تفسیر بیان کی جائے گی اور ان حضرات نے اس نوعیت کی آیات اور مستند روایات میں یہی طریق کار اختیار کیا ہے جبکہ ائمہ سلف کی رائے یہ ہے کہ اس نوعیت کی آیات و روایات میں ''تاویل'' کرنے سے گریز کیا جائے اور ان کے حقیقی معانی اللہ کے سپرد کر دیئے جائیں۔ ہماری رائے یہی ہے کہ اللہ کی ذات کے بارے میں عقیدہ رکھتے ہوئے ہمیں ائمہ سلف کی پیروی کرنی چاہئے کیونکہ یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ امت کا اجماع ''حجت'' ہے بالفرض اگر ان آیات و روایات کی تاویل کرنا ضروری ہوتا تو فقہی مسائل کی بہ نسبت (صحابہ و تابعین) ان کی تاویل کا زیادہ اہتمام کرتے۔ اسی لیے جب صحابہ کرام اور تابعین عظام نے ''تاویل'' سے گریز کیا ہے تو ہمارے لیے انہی حضرات کی پیروی کرنا زیادہ بہتر ہے۔''

حافظ ابن حجر تحریر کرتے ہیں:

''ہم پہلے یہ بات بیان کر چکے ہیں کہ تیسرے زمانے کے لوگ (تفویض کو بہتر سمجھتے تھے) اور اس طبقے میں اپنے وقت کے جلیل القدر فقہاء شامل ہیں جن میں سفیان ثوری' ابوعبدالرحمٰن الاوزاعی' امام مالک' لیث بن سعد اور ان کے معاصرین فقہاء شامل ہیں بلکہ ان حضرات کے تلامذہ میں شامل ائمہ کا بھی یہی مسلک ہے اس لیے جس نکتے پر قرونِ ثلاثہ کے لوگوں کا اتفاق ہو قابل اعتماد سمجھا جائے گا کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زمانے کے بہتر ہونے کی گواہی دی ہے۔''

ہمارے شیخ سیدی عبدالعزیز دباغ کا عقیدہ بھی قرونِ ثلاثہ سے تعلق رکھنے والے حضرات کے عقیدے کے مطابق تھا اور یہی سب سے بڑی کرامت ہے۔

حافظ ابن حجر' شیخ ناصرالدین بن منیر کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

''صحیح عقیدے پر استقامت اختیار کرنا یقینی طور پر ایک بڑی کرامت ہے۔ اس کے برعکس دیگر کرامات کی حالت یہ ہے کہ وہ کبھی رحمت کا باعث بنتی ہیں اور کبھی فتنہ کا سبب بنتی ہیں۔''

یہ نکتہ واضح ہو جانے کے بعد اب آپ یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ میں نے سیّدی عبدالعزیز دباغ کی جتنی کرامات اور مکشوفات کا مشاہدہ کیا ہے ان سب کو احاطہ تحریر میں لانا ممکن نہیں ہے البتہ ان میں سے چند کرامات کا یہاں ذکر کیا جائے گا:

کرامت:

جن دنوں میں شیخ سے ابتدائی طور پر متعارف ہوا تھا۔ انہی ایام کے دوران میں میرے بیٹے کا انتقال ہو گیا جس کا میری اہلیہ کو بہت صدمہ ہوا کیونکہ اس سے پہلے بھی ہمارے ایک بیٹے کی وفات ہو چکی تھی۔ میں نے اسے تسلی دینے کی خاطر کہا: (مشہور بزرگ) شیخ احمد بن عبداللہ فرماتے ہیں۔

''جب میری نظر بچوں اور ان پر نازل ہونے والی مصیبتوں پر پڑتی ہے تو مجھے ان پر بہت رحم آتا ہے اور جو بچے انتقال کر جاتے ہیں وہ بہت سے مصائب کا سامنا کرنے سے بچ جاتے ہیں۔''

چونکہ تمہارا بیٹا بھی وفات پا چکا ہے (اس لیے وہ بہت سے مصائب کا سامنا کرنے سے بچ گیا ہوگا)۔ غرضیکہ اسی طرح میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے صبر کی تلقین کی۔

اگلے دن جب میں شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے شیخ احمد بن عبداللہ کے قول سمیت میری تمام باتیں دہرا دیں۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ آپ نے اپنے کشف کے ذریعے یہ بات معلوم کر لی ہے۔

کرامت:

سیّدی شیخ عبدالعزیز دباغ کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ آپ سینے کی کسی تکلیف کے باعث ''لونگ'' استعمال کیا کرتے تھے جس کی وجہ سے سانس لیتے وقت آپ سے لونگ کی خوشبو آیا کرتی تھی۔ جب میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو اس خوشبو کو محسوس کرتا اور جب رات کو اپنے گھر موجود ہوتا تو دروازے بند ہونے کے باوجود یہ خوشبو محسوس ہوتی حالانکہ حضرت شیخ کی رہائش ایک دوسرے محلے میں تھی۔ ایک دفعہ میں نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا تو اپنی بیوی کو بھی اس بارے میں بتایا۔ میری بیوی بھی شیخ کی بہت معتقد تھی۔ ایک مدت تک یہ کیفیت باقی رہی۔ ایک دن میں نے عرض کی: حضرت آپ کی خوشبو رات کے وقت بھی ہمیں محسوس ہوتی ہے۔ کیا آپ ہمارے پاس موجود ہوتے ہیں؟ آپ نے جواب دیا: ''ہاں'' میں نے ازراہ مذاق عرض کی: میں خوشبو کے مخرج کو تلاش کرتے ہوئے آپ کو پکڑ لیا کرونگا تو آپ نے خوش طبعی کے طور پر ارشاد فرمایا: میں گھر کے کسی دوسرے کونے میں چلا جاؤں گا۔

اسی طرح ایک مرتبہ میں نے خوشبو کا ذکر کیا تو ارشاد فرمایا: سونگھنے کی یہ کیفیت ہے تو شوق کا کیا عالم ہوگا۔

ایک مرتبہ فرمایا: ''میں رات اور دن میں کسی بھی وقت تم سے جدا نہیں ہوتا ہوں۔''

ایک مرتبہ فرمایا: ''اگر میں ایک گھڑی میں پانچ سو مرتبہ تمہاری طرف توجہ نہ کروں تو تم اللہ کی بارگاہ میں میری شکایت کر دینا۔''

ایک دفعہ میں نے عرض کی: میں نے خواب میں اپنے آپ کو اور آپ کو ایک ہی کپڑے میں موجود دیکھا ہے' تو آپ نے جواب دیا: ''یہ سچا خواب ہے۔'' دراصل آپ نے اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ آپ کسی بھی وقت مجھ سے جدا نہیں ہوتے۔

ایک مرتبہ آپ نے مجھے فرمایا: ''تیار رہنا۔ آج رات میں تمہارے پاس آؤں گا۔ جب رات کا آخری پہر شروع ہوا اور میری حالت اس وقت نیند اور جاگنے کے درمیان تھی کہ آپ تشریف لے آئے۔ میں نے آپ کا دست اقدس تھام کر اسے بوسہ دیا پھر آپ کے سر کو بوسہ دیا اس کے فوراً بعد آپ غائب ہو گئے۔

کرامت:

ایک دفعہ بادشاہ وقت نے اپنے دو قاصدوں کے ہمراہ تحریری طور پر مجھے یہ حکم بھیجا کہ میں ''مکناسہ'' (نامی شہر) میں جا کر جامع ریاض میں امامت کے فرائض سرانجام دوں۔ میں یہ حکم پڑھ کر سخت پریشان ہوا۔ جب شیخ کو اسکی اطلاع ملی تو آپ نے مجھے تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ڈرو نہیں جب تم مکناسہ جاؤ گے تو میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا' تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا اور جو فائدہ وہ تم سے حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ حاصل نہیں کر سکیں گے۔ میں ان قاصدوں کے ہمراہ مکناسہ روانہ ہو گیا اور یہ معاملہ شیخ کے بیان کے مطابق بخیر و خوبی انجام پذیر ہوا۔ جب میں اپنے وطن فاس واپس آیا اور میری آمد کی اطلاع میرے سسر مفتی محمد بن عمر کو ہوئی تو انہوں نے مجھے تحریر کیا: تم مکناسہ گئے تھے اور سلطان سے ملے یا استعفاء دیئے بغیر ہی واپس آ گئے ہو؟ تمہیں چاہیے کہ فوراً واپس مکناسہ چلے جاؤ اور سلطان سے ملاقات کر کے امامت کے فرائض سرانجام دینے پر رضامندی کا اظہار کرو' ایسا ضرور کرنا۔ میں وہ خط لے کر شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا اپنے گھر واپس جاؤ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور پھر ایسا ہی ہوا جیسا شیخ نے فرمایا تھا۔

یہ ایک نادر کرامت ہے۔ اگر میں اس کی وضاحت کروں تو اس میں پوشیدہ محیر العقول امور ظاہر ہو سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ مکناسہ میں ایک شخص نے مجھے کہہ دیا کہ مجھے حیرت ہے کہ بادشاہ نے تاکید کے ساتھ اپنے دو قاصدوں کے ہمراہ تمہیں بلوایا تھا لیکن اس کے باوجود تم نے سلطان سے ملاقات کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی اور اپنے وطن واپس چلے گئے۔ واقعی یہ عجیب بات ہے لیکن یہ سب حضرت کی برکات ہیں۔

کرامت:

ایک مرتبہ میری بیوی حاملہ ہوئی تو آپ نے فرمایا: تمہارے ہاں بیٹا پیدا ہوگا۔ عام طور پر میری بیوی کے

ہاں نویں مہینے کے آغاز میں بچے کی پیدائش ہو جاتی تھی۔ معمول کے مطابق جب نویں مہینے کا آغاز ہوا تو اسے تکلیف شروع ہوئی۔ ہم یہ سمجھے کہ شاید بچے کی پیدائش نزدیک ہے لیکن آپ نے فرمایا کہ یہ تکلیف کسی اور وجہ سے ہے بچے کی پیدائش کچھ دن بعد ہوگی اور پھر ایسا ہی ہوا۔

کرامت:

ایک دفعہ حضرت مولانا محمد میارہ سے میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے چند سکے مجھے دیئے تا کہ میں ان کی طرف سے حضرت کی خدمت میں بطور نذر پیش کر دوں۔ جب میں نے پیش کیے تو شیخ نے فرمایا: مولانا محمد میارہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ انہوں نے پہلے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس میں سے خراب سکے نکلے وہ انہوں نے اپنے پاس رکھ لیے اور دوبارہ ہاتھ ڈال کر جب اچھے سکے نکلے تو وہ اچھے سکے انہوں نے مجھے بھجوا دیئے۔

(احمد بن مبارک فرماتے ہیں) بعدازاں مولانا صاحب سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے ان کے سامنے شیخ کے بیان کا تذکرہ کیا تو انہوں نے تصدیق کی کہ واقعی پہلی مرتبہ کھوٹے سکے نکلے تھے جو میں نے اپنے پاس رکھ لیے اور دوسری مرتبہ کھرے سکے نکلے جو میں نے شیخ کی خدمت میں بھجوا دیئے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ انہی مولانا صاحب کے ساتھ گفتگو کے دوران میں کسی تیسرے شخص کا ذکر چل نکلا۔ مولانا صاحب اس شخص کے بارے میں اچھی رائے رکھتے تھے جبکہ میری رائے اچھی نہیں تھی میں نے اپنے علم کے مطابق اس کی خامیوں کا تذکرہ کر دیا (بعد میں) جب میری ملاقات شیخ کے ساتھ ہوئی تو آپ نے فرمایا جب تم اس شخص کی خامیوں کا تذکرہ کر رہے تھے تو اپنی نیک نیتی اور حسن ظن کی وجہ سے مولانا صاحب کے پیٹ میں موجود رگیں بھی لرزنے لگی تھیں۔ بعد میں میری جب مولانا صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے حضرت کے بیان کا تذکرہ کیا تو انہوں نے اس بات کی تصدیق کی۔

کرامت:

ایک مرتبہ حضرت کے صاحبزادے جن کا نام ادریس تھا سخت بیمار ہو گئے۔ ان کی بیماری کے باعث حضرت کی اہلیہ شدید پریشان ہو گئی۔ ایک دفعہ مجھے مغرب کے بعد حاضری کا موقع ملا۔ اس وقت صاحبزادہ صاحب کی حالت اس قدر تشویش ناک تھی کہ وہ کلام بھی نہیں کر سکتے تھے۔ مجھے بہت پریشانی ہوئی۔ جب میں حضرت کے ہمراہ ان کے گھر سے باہر نکلا تو آپ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ یہ بچہ اس بیماری میں انتقال نہیں کرے گا بلکہ عنقریب تندرست ہو جائے گا۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔

ایک مرتبہ حضرت کی صاحبزادی فاطمہ سخت بیمار ہو گئی اور اسکی بیماری خاصی طویل ہو گئی تو آپ نے فرمایا: اس بچی کا ابھی انتقال نہیں ہوگا بلکہ عنقریب یہ تندرست ہو جائے گی۔ اور ایسا ہی ہوا۔

ایک مرتبہ میں شیخ کے ہمراہ مولانا محمد میارہ کے بیمار صاحبزادے کی عیادت کیلئے گیا۔ اگرچہ اس کی حالت

بہت خراب تھی لیکن آپ نے فرمایا: یہ بچہ اس بیماری کی وجہ سے انتقال نہیں کرے گا بلکہ عنقریب صحت یاب ہو جائے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔

بحمدہ تعالیٰ یہ تمام بچے آج مورخہ ۱۲ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ کے دن تک بقید حیات ہیں۔

کرامت:

ایک مرتبہ ہم قطب دوران شیخ عبدالسلام بن مشیش کی درگاہ کی زیارت کے لیے روانہ ہوئے ہم ظہر کے وقت سیدی عبدالعزیز دباغ کی خدمت میں پہنچے۔ ہمارا خیال تھا کہ آپ ہمیں ٹھہرنے کیلئے کہیں گے مگر آپ نے فرمایا کہ اپنی سواری سے نہ اترو' پہلے درگاہ کی زیارت کر آؤ۔ میں آپ کے ہمراہ اس پہاڑ پر چڑھا جہاں شیخ عبدالسلام بن مشیش کا مزار مبارک ہے۔ (دعا سے فراغت کے بعد) آپ نے مجھ سے دریافت کیا: تم نے کیا دعا کی ہے؟ میں نے عرض کی: میں تو صرف آپ کیلئے دعا کرتا رہا ہوں' دوسرے لوگ تو بہت دور کی بات ہے' میں نے اپنے لیے بھی دعا نہیں کی۔ آپ نے فرمایا: میں نے بھی تمہارے سوا اور کسی کیلئے دعا نہیں کی۔ یہ سن کر مجھے بے انتہا خوشی ہوئی۔

واپسی پر ہم پہاڑ سے نیچے اترے تو آپ نے شہر ''تطاون'' کی طرف کوچ کرنے کا حکم فرمایا۔ میں نے عرض کی: یہ شہر بہت دور ہے ہم آج وہاں تک نہیں پہنچ سکیں گے' باقی آپ جو فرمائیں گے اسی کے مطابق عمل ہوگا آپ نے اپنی بات پر اصرار کیا تو ہمیں اندازہ ہو گیا کہ آپ کی رائے درست ہوگی۔ ہم اسی وقت اپنے جانوروں پر سوار ہوئے اور اگلے دن صبح صادق کے وقت ''تطاون'' (نامی شہر) میں داخل ہو گئے۔ ابھی ہم شہر میں داخل ہوئے تھے کہ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی جو لگاتار دو دن جاری رہی۔ آپ میرے ہمراہ اس گھر کی چھت پر چڑھے جہاں ہم قیام پذیر ہوئے تھے۔ اس وقت بارش ہو رہی تھی۔ آپ نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا: دیکھا! کتنی زبردست بارش ہو رہی ہے۔ میں نے عرض کی: جی ہاں فرمایا اسی بارش کی وجہ سے تمہیں ساری رات سفر کروایا ہے۔ جب میں حضرت شیخ عبدالسلام کی درگاہ پر حاضر ہوا تھا۔ اسی وقت میں نے اس بارش کو دیکھ لیا تھا۔ خود ہی سوچو! راستے میں بارش ہو جاتی تو ہمارا کیا حال ہوتا جبکہ ہمارے پاس اپنے یا جانوروں کے کھانے کیلئے کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے عرض کی: اس حالت میں اگر ہم موت سے بچ بھی جاتے تو شدید ترین مشقت برداشت کرنا پڑتی۔ پھر میں نے دعا کی: اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

دو دن بعد ہم ''تطاون'' سے روانہ ہوئے تو بارش بدستور جاری تھی۔ میں نے عرض کی: ہم بارش سے بچنے کیلئے وہاں آئے تھے اور اب دوبارہ بارش میں سفر کرنے لگے ہیں؟ لیکن آپ خاموش رہے شہر سے نکلتے وقت ہم نے جانوروں کیلئے چارہ خریدنا چاہا لیکن آپ نے منع فرما دیا۔ جب ہم شہر سے باہر نکلے تو اس وقت بھی شدید بارش جاری تھی۔ ابھی ہم نے ایک یا دو میل کا سفر کیا ہوگا کہ بادل چھٹ گئے' ہوا ٹھہر گئی اور سورج نکل آیا۔ موسم بھی خوشگوار ہو گیا۔ ہم بہت حیران ہوئے' جب عصر کی نماز کا وقت نصف سے زیادہ بیت گیا تو میں نے عرض کی

کہ اب جانور کیا کھائیں گے؟ آپ نے نزدیک ترین آبادی کے بارے میں دریافت کیا تو پتا چلا کہ آبادی تک نصف رات ہونے سے پہلے تک نہیں پہنچا جا سکتا۔ آپ خاموش ہو گئے۔ ہم آپ کی ہمراہی میں فرمانبرداری کے ساتھ چلتے رہے۔ خیر مغرب کا وقت قریب آیا تو آپ نے دائیں جانب مڑنے کی ہدایت کی۔ ہم اپنے راستے سے ہٹ کر دائیں طرف مڑ گئے۔ ابھی ہم کچھ ہی دور گئے تھے کہ سامنے ایک بڑی چراگاہ دکھائی دی جس کے پاس ایک چشمہ بھی موجود تھا۔ آپ نے وہاں پڑاؤ کرنے کا حکم دیا۔ اسطرح اللہ تعالیٰ نے ہمارے جانوروں کیلئے خوراک کا بندوبست کر دیا۔ ہم وہاں ٹھہر گئے۔ عشاء کے قریب چراگاہ کا مالک بھی وہاں آ گیا اور ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ آپ نے جانوروں کے کھائے ہوئے چارے کی قیمت سے زیادہ رقم اسے عطا کی تو وہ اور خوش ہو گیا اور رات اس نے ہمارے ساتھ بسر کی' ہمارے ساتھ کھانا کھایا اور ہم میں خوب گھل مل گیا۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ شیخ عبدالسلام بن مشیش کی درگاہ کی زیارت کیلئے روانہ ہوئے۔ راستے میں شام ہو گئی۔ جب ہم نے بنوزکار کی گھاٹی کو عبور کیا تو اس وقت عصر کا وقت ختم ہو چکا تھا (سورج غروب ہونے والا تھا) جو لوگ ہم سے پہلے اس گھاٹی کو عبور کر چکے تھے انہوں نے وہیں پڑاؤ کر لیا تھا۔ ہم نے عرض کی: جو لوگ ہم سے پہلے یہاں پہنچ چکے تھے وہ یہیں ٹھہر گئے ہیں (ہمارے لیے کیا حکم ہے)؟ آپ نے فرمایا: تم چلتے رہو۔ ہم نے عرض کی کہ ہم کیسے آگے سفر کر سکتے ہیں جبکہ ہمیں راستہ بھی نہیں معلوم۔ آپ نے فرمایا: چلتے رہو۔ ہم نے دوسرے لوگوں کو وہیں چھوڑ دیا اور آگے روانہ ہو گئے۔ ہمارے ساتھ کوئی رہنما بھی نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ جو ہمارے دل میں القاء کرتا رہا ہم اس کے مطابق چلتے رہے یہاں تک کہ ہم پانی کے ایک چشمے کے پاس پہنچے جس کے نزدیک ایک چراگاہ موجود تھی۔ ہم اس کے مالک سے ملے اور اس نے ہمیں وہاں قیام کرنے کی دعوت دی۔ ہم نے نہایت عمدہ طور پر وہاں رات بسر کی۔ اسی طرح جانور ساری رات چرتے رہے لیکن جن لوگوں نے گھاٹی پر پڑاؤ ڈالا تھا انہیں کھانے کیلئے کچھ بھی نہ ملا۔

اس سفر کے دوران میں' ہمیں حضرت شیخ کی زبانی مختلف علوم کے باریک نکات سننے کا موقع ملا جن میں سے اکثر کا ذکر ہم نے اس کتاب میں کیا ہے۔ حضرت شیخ کا طریق مبارک یہ تھا کہ جب آپ کسی خطے کا ذکر کرتے تو یوں محسوس ہوتا کہ جیسے آپ اس علاقے کو دیکھ چکے ہیں حالانکہ آپ صرف اپنے کشف کی روشنی میں احوال بیان کرتے تھے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ آپ نے کسی مقامی رہنما کے بغیر طویل سفر کیا اور مروجہ طویل راستوں سے ہٹ کر ان مختصر راستوں پر چلتے رہے جن سے اکثر لوگ ناواقف ہوا کرتے ہیں۔

حضرت مولانا علی بن عبداللہ صباغی جو ''فاس'' سے چار مراحل کے فاصلے پر موجود ''صباغات'' نامی بستی کے باشندے ہیں' ایک دن حضرت شیخ نے ان سے فرمایا: ایک مرتبہ میں دیگر گھڑسواروں کے ہمراہ تمہارے علاقے میں گیا تھا اور فلاں فلاں مقام کی سیر کی تھی۔ پھر آپ نے اس جگہ کا پورا نقشہ بیان کر دیا اور فرمایا: میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر تمہارے شیخ کے پاس چلا گیا۔ اور آپ نے حضرت مولانا اور ان کے شیخ طریقت کے گھر کے

بارے میں یوں بیان کرنا شروع کیا جیسے آپ اسی وقت انہیں ملاحظہ کررہے ہیں۔ بعد میں حضرت مولانا نے مجھے بتایا کہ آپ نے تمام تفاصیل بالکل درست بیان کی ہیں۔(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) آپ نے اپنے کشف کو چھپانے کیلئے گھڑسواروں کا ذکر کیا تھا۔

حضرت شیخ نے مولانا صاحب کو یہ بھی بتایا کہ جس جگہ تم اپنے گھوڑے باندھتے ہو وہاں ایک بڑے بزرگ کی قبر ہے اس لیے وہاں گھوڑے نہ باندھا کرو۔ مولانا صاحب نے جب تحقیق کی تو یہ بات درست ثابت ہوئی اور انہوں نے وہاں مزار بنوا دیا۔(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) ایک مرتبہ حضرت نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ولی ہمارے آباء میں سے ہیں یعنی وہ بھی اپنے وقت اور زمانے کے غوث تھے۔

ایک دن میں آپ کی خدمت میں موجود تھا کہ اسی دوران ''زا'' (نامی بستی) سے ایک شخص آیا۔ آپ نے اس سے دریافت کیا کہاں سے آئے ہو؟ اس نے عرض کی ''زا'' سے۔ آپ نے اس بستی کے مختلف مقامات اور علامات کا ذکر کرنا شروع کیا اور وہ شخص آپ کے بیان کی تصدیق کرتا رہا۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید آپ وہاں تشریف لے جاچکے ہیں۔ جب وہ چلا گیا تو آپ نے مجھے مخاطب کرکے ارشاد فرمایا: لوگ کشف کو پسند کرتے ہیں حالانکہ یہ ولی کیلئے نقصان دہ ہے اور اس شخص کیلئے بھی جو اس بات کا خواہش مند ہو کہ ولی اس کے سامنے اپنے کشف کا اظہار کرے۔ ولی کیلئے اس طرح نقصان دہ ہے کہ ایسی حالت میں ولی کا مشاہدہ حق سے منتقل ہوکر خلق کی طرف مبذول ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال بالکل اس طرح ہے جیسے کوئی شخص پہاڑ کی چوٹی سے نیچے اترے۔ اسی طرح جو شخص ولی سے کشف کے اظہار کا خواہش مند ہوگا اس کے دل میں عقیدت کا احساس کم ہوگا اور جب حسب خواہش کشف کا مظاہرہ ہو جائے تو اب اس کی عقیدت مشروط ہو جائے گی۔

ان دونوں نکات کی تشریح ہم آگے چل کر بیان کرینگے۔

کرامت:

ایک سیّد صاحب مجھ سے ایک دقیق فن سیکھ رہے تھے۔ ایک دن میں نے اس کے سامنے ایک مسئلے کی تشریح کرتے ہوئے مفصل تقریر کی اسے میری تقریر بہت پسند آئی۔ کہنے لگا: مسائل کی جو وضاحت آپ کرتے ہیں وہ اور کوئی استاد نہیں کرتا۔ ایک مرتبہ دوران درس ایک مسئلہ آ گیا جس میں مصنف نے اللہ کے اسرار میں سے کسی ایک سر کی طرف اشارہ کیا تھا۔ سیّد صاحب نے مجھ سے اس کا مفہوم دریافت کیا: مجھے کیونکہ افشاء سر سے ڈرلگتا تھا اس لیے میں نے لاعلمی ظاہر کی لیکن سیّد صاحب کا اصرار جاری رہا۔ میں نے کہا: میں اس شرط پر اس کی تفسیر بیان کروں گا کہ تم اللہ کے نام پر یہ عہد کرو کہ مجھ سے سنی ہوئی بات کا تذکرہ کسی بھی واقف یا اجنبی کے ساتھ نہیں کرو گے۔ سیّد نے یہ وعدہ کرلیا۔ میں نے اس کے سامنے اس نکتے کی تشریح بیان کی اس کے بارے اعتراضات اور ان کے جوابات کا بھی تذکرہ کر دیا۔ یہاں تک کہ نفس مسئلہ روز روشن کی طرح واضح ہو گیا۔ اسے سن کر سیّد صاحب بے انتہا خوش ہوئے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ اگر کبھی تمہیں سیدی عبدالعزیز دباغ کی خدمت

میں حاضر ہونے کا موقع ملے اور پھر وہاں یہی مسئلہ زیر بحث آ جائے اور حضرت شیخ اس پر اظہار خیال شروع کریں تو تم لاعلمی کا اظہار کرنا اور یوں ظاہر کرنا کہ گویا تم نے اس مسئلے کو کبھی بھی نہیں سنا۔ حسن اتفاق سے مجھے اسی دن حضرت سیّدی عبدالعزیز دباغ کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف ہوا۔ آپ نے دریافت کیا کہ تم نے فلاں سید کو یہ بات کہی تھی اور پھر اصل مسئلہ سمیت ساری گفتگو بھی بیان کر دی۔ میں نے اقرار کیا اور ساتھ یہ بھی عرض کیا کہ میرے ذہن میں کوئی منفی سوچ نہیں تھی۔ اس کے بعد میں نے یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہوئے لیکن آپ کا دل دودھ کی طرح صاف شفاف تھا۔

آپ کے کشف و کرامات بے شمار ہیں۔ آپ کی کرامات کا تذکرہ کرنے کیلئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اس کتاب میں جو مسائل و نکات تحریر کئے گئے ہیں وہ بھی آپ کی کرامات کا حصہ ہیں۔

کرامت:

آپ کی ایک بڑی کرامت یہ ہے کہ آپ کی گفتگو دل پہ اثر کرتی ہے۔ ایک مرتبہ ایک مفتی صاحب آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست گزار ہوئے: حضرت! آپ میرے لئے دعا کریں کہ مجھے وسوسوں سے نجات مل جائے۔ آپ نے فرمایا: وسوسہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب راستہ موجود نہ ہو۔ اگر کوئی شخص اپنی منزل کا راستہ نہ جانتا ہو تو یقیناً راستے میں قدم قدم پر یہی گمان ہوگا کہ شاید میں غلط راستے پر چل رہا ہوں اور ایسا شخص وقتاً فوقتاً راستہ تبدیل کرتا رہے گا۔ آخر حیران ہو کر رک جائے گا اور سوچے گا: اب کہاں جاؤں؟ لیکن جو شخص راستے کو جانتا ہے وہ سیدھا اپنی منزل کی طرف چلتا جائے گا۔ دنیا و آخرت میں (بھلائی کے حصول) کا راستہ ذات باری تعالیٰ ہے جو شخص اس بات کو سمجھ لے گا۔ وہ دنیا و آخرت میں کامیاب رہے گا اور اللہ تعالیٰ اسے اچھی زندگی عطا فرمائے گا۔ لیکن جو شخص اس بات کو نہیں سمجھے گا اس کا انجام اس کے برعکس ہوگا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) جب سے میں نے حضرت کی یہ بات سنی تو اس کے بعد میری قلبی کیفیت یہ ہو گئی ہے کہ جب کوئی ضرورت پیش آ جائے اور میری توجہ کسی شخص کی طرف مبذول ہونے لگے تو یوں لگتا ہے کہ جیسے کسی نے مجھے کھینچ کر اللہ کی طرف متوجہ کر دیا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ اس میں کمال نصیب کرے۔

ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا: جب مومن سونے لگتا ہے تو اس کی توجہ اللہ کی طرف ہوتی ہے اور جب بیدار ہوتا ہے تو بھی اس کی توجہ اللہ ہی کی طرف مبذول ہوتی ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) جب میں نے آپ کی یہ بات سنی تو اس کا یہ اثر ہوا کہ جب میں سونے لگتا ہوں تو میری توجہ اللہ کی طرف مبذول ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا: کوئی بھی شخص اس وقت تک اللہ کی معرفت حاصل نہیں کر سکتا جب تک اسے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت حاصل نہ ہو جائے اور کسی بھی شخص کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی

معرفت حاصل نہیں ہو سکتی جب تک اسے اپنے شیخ کی معرفت حاصل نہ ہو۔ اور کسی بھی شخص کو اس وقت تک معرفت نصیب نہیں ہوتی جب تک اس کی توجہ تمام مخلوق سے ہٹ نہ جائے' یہاں تک کہ اسے کچھ دکھائی نہ دے گویا اس نے سب کو دفن کر دیا ہے اور اب اس کے دل میں کسی کی چاہت باقی نہیں رہی۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) حضرت کی اس گفتگو کا مجھ پر بہت اثر ہوا کہ اس کی بدولت مجھے بہت سے فوائد حاصل ہوئے اس قول کی تشریح میں نہایت طویل گفتگو کی جا سکتی ہے لیکن سر دست ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا: جب انسان کی توجہ غیر اللہ کی طرف مبذول ہوتی ہے تو اللہ سے اس کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے پھر بعض لوگ ایک یا دو گھڑی کے اندر بلکہ بعض اس سے بھی پہلے واپس اللہ کی طرف لوٹ جاتے ہیں اور بعض بہت دیر تک منقطع رہتے ہیں اس لئے انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی قلبی کیفیت کا خاص خیال رکھے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اللہ کا فضل ہے آپ کی یہ بات میرے دل کیلئے لگام کی حیثیت رکھتی ہے۔ جب میرا دل غفلت کا شکار ہوتا ہے تو یہ مجھے اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے حضرت شیخ کے بعض اُن مریدین سے جو جید اہل علم میں شامل ہیں۔ ان سے درخواست کی کہ وہ اپنے مشاہدات کی روشنی میں حضرت کی کرامات تحریر کر کے مجھے ارسال کریں۔ اس کے جواب میں اپنے وقت کے جید فقیہہ مفتی ابوعبداللہ محمد بن احمد بن حسنین الزریاری نے اپنے بعض مشاہدات تحریر کر کے مجھے بھجوائے۔ میں نے انہیں سیّدی عبدالعزیز دباغ کی خدمت میں پیش کیا تو آپ نے ان کی تصدیق فرمائی۔

زریاری کے مشاہدات:

شیخ زریاری رحمۃ اللہ علیہ کا مکتوب درج ذیل ہے:

اللہ تعالیٰ' جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے' نے مجھ پر بہت احسانات کیے ہیں اور ان میں سے ایک بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے مجھے غوث زمان سیّدی عبدالعزیز دباغ کی خدمت میں حاضری کا شرف عطا کیا۔ آپ سے ملاقات سے پہلے میرا دل دنیاوی امور یعنی زراعت اور تجارت کی طرف مائل تھا۔ آخرت کی کوئی فکر نہیں تھی۔ تمام تر کوششوں کا مقصد صرف اور صرف دنیا تھی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے علم دین حاصل کرنے کی سعادت عطا فرمائی تھی اس لیے میری خواہش تھی کہ یا تو میں قاضی بن جاؤں یا کسی اور اچھے سرکاری عہدے پر فائز ہو جاؤں۔ پس اللہ تعالیٰ نے مجھ پر رحم کیا اور مجھے آپ کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا۔ آپ کی برکت اور حسن سلوک کی وجہ سے میرا دل دنیا کی محبت سے پاک ہو گیا۔ جب میں نے پہلی مرتبہ آپ کی خدمت میں اپنی اس خامی یعنی دنیا کی محبت کا ذکر کیا تو آپ نے مجھے زراعت سے متعلق تمام اشیاء فروخت کر کے ایک دوسرا

کام کرنیکا حکم دیا۔ جو دنیاوی اسباب کے اعتبار سے مناسب تھا لیکن آپ یہ چاہتے تھے کہ میرے دل سے دنیاوی اسباب کی محبت ختم ہو جائے۔ آپ کا طرز تربیت اس قدر عمدہ تھا کہ جب آپ مجھے کسی خامی سے نکالنے کا ارادہ فرماتے تو مجھے اس بات کا اندازہ بھی نہ ہوتا لیکن بعد میں سوچتا تو پتہ چلتا کہ میری حالت پہلے سے بہتر ہے۔ مجھ سمیت جملہ مریدین کی تربیت کا یہی انداز تھا۔

آپ کی یہ عادت تھی کہ جب آپ کسی شخص میں کوئی خامی دیکھتے تو صراحتاً یہ نہ کہتے کہ اسے چھوڑ دو اسی طرح برا بھلا بھی نہ کہتے اور نہ ہی یہ کہتے کہ اگر تم نے اب یہ کام کیا تو میں تم سے بیزار ہو جاؤں گا کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں انسان ہٹ دھرمی پر اتر آتا ہے اور شیخ کی مخالفت پر اتر آتا ہے۔ آپ کی عادت شریفہ یہ تھی کہ آپ ہر شخص کے ساتھ اچھا سلوک کرتے اور ہر ایک کو اپنے ساتھ لے کر چلتے یہاں تک کہ انسان اپنے آپ کو ایک ایسے مقام پر پاتا ہے جہاں وہ پہلے موجود نہیں تھا اور سابقہ حالت کی خرابی بھی اس کے سامنے واضح ہو جاتی اور (اپنی اس ترقی کی وجہ سے) انسان نہایت خوش ہوتا ہے۔

جب حضرت نے مجھے زراعت کا سامان فروخت کرنے کا حکم دیا تو اس کے چند دن بعد زراعت سے میرا لگاؤ ختم ہو گیا بلکہ میں اسے ناپسند کرنے لگا تھا پھر آپ نے مجھے تمام کتابیں فروخت کرنے کا حکم دیا اور پھر مجھے اپنی پسند کا کوئی اور کام کرنے کو کہا اس کے بعد میرے دل میں لالچ پیدا ہونا شروع ہوا اور میری یہ خواہش ہوتی تھی کہ لوگ اپنا مال واسباب مجھے دیں لیکن آپ اپنی تربیت کے ذریعے مجھے اس مقام پر لے گئے کہ لالچ تو کجا اب میری یہ حالت ہے کہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی انسان (اللہ کی مرضی کے بغیر) کسی کو کوئی فائدہ یا نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

کرامت:

ابتدائی ملاقات کے چند دن بعد کا ذکر ہے کہ آپ نے مجھ سے دریافت کیا: کیا تمہارے پاس گھی ہے؟ میں نے عرض کی: جی ہاں بہت ہے۔ آپ نے فرمایا: کچھ گھی لے آنا۔ میرے ایک ساتھی نے کہا: باقی بچنے والا گھی شاید ارزانی کے موسم تک پورا نہیں ہو سکے گا۔ میں نے کہا تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ حضرت نے دریافت کیا کہ اب باقی ماندہ گھی فلاں وقت تک ساتھ دے دے گا؟ میں نے عرض کی: جی ہاں۔ آپ نے فرمایا: پھر اس سے زائد جتنا بھی گھی ہو میرے پاس لے آؤ۔ لہٰذا میں وہ گھی لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ جب باقی ماندہ گھی ختم ہونے لگا تو ایک شخص نے آ کر اللہ کی رضا کے حصول کیلئے (بغیر کسی معاوضے کے) مجھے اتنا گھی دے دیا جو ارزانی کے موسم تک میری ضروریات کیلئے کافی تھا۔

کرامت:

میری یہ عادت تھی کہ میں اپنی زرعی پیداوار کو فروخت کرتے وقت آپ سے مشورہ لیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ

آپ نے مشورہ دیا: فلاں مہینے کی پانچ تاریخ کو جو کچھ فروخت کرنا ہوا سے بیچ دینا۔ جب وہ مہینہ آیا تو اس مہینے میں پانچ اور چھ تاریخ کو بہت زیادہ فروخت ہوئی لیکن سات تاریخ کو زبردست بارش ہوئی جس کی وجہ سے پیداوار کی قیمت گر گئی۔

کرامت:

ایک مرتبہ میری بیوی امید سے ہوئی۔ جب میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس بات کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: تمہارے ہاں ایک بیٹے کی پیدائش ہوگی جس کا نام احمد ہوگا۔ گھر آ کر میں نے اپنی اہلیہ کو بھی یہ خوشخبری سنائی (اور بعد میں) آپ کا بیان درست ثابت ہوا (اس بچے کی پیدائش کے بعد) میری دوسری بیوی کو رشک آیا کہ اس کی سوکن کے ہاں بیٹے کی پیدائش ہوئی ہے جبکہ اس کی اپنی گود میں ایک شیر خوار بچی موجود ہے۔ اس دوسری بیوی نے اس امید پر کہ شاید دوبارہ حاملہ ہو جائے اس بچی کا دودھ چھڑوا دیا۔ میں نے اسے برا بھلا کہا تو کہنے لگی میں امید سے ہوں۔ اگر میں نے اس حالت میں اس بچی کو دودھ پلایا تو یہ بچی بیمار ہو سکتی ہے۔ ساتھ ہی اس نے قسم بھی کھالی۔ جب میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس واقعے کا تذکرہ کیا۔ آپ نے فرمایا: تمہاری بیوی نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ میں نے واپس آ کر بیوی سے تفتیش کی تو اس نے اپنی غلط بیانی کا اقرار کیا۔ تین ماہ بعد مجھے دوبارہ حضرت شیخ کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا تو آپ نے دریافت کیا تمہاری (دوسری) بیوی امید سے ہے؟ میں نے عرض کی: مجھے نہیں معلوم۔ آپ نے فرمایا: حمل کو پندرہ دن گزر چکے ہیں انشاءاللہ اب بیٹا ہوگا۔ تم اس کا نام میرے نام کے مطابق رکھنا کیونکہ اس کی شکل بھی میرے جیسی ہوگی۔ میں نے واپس آ کر اپنی دوسری بیوی کو یہ خبر سنائی (مقررہ مدت کے بعد) ہمارے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی جس کی شکل حضرت سے مشابہ تھی۔

میری پہلی بیوی دوبارہ امید سے ہوئی میں نے حضرت سے دریافت کیا تو فرمایا: تمہارے ہاں بیٹی کی پیدائش ہوگی اس کا نام میری والدہ کے نام کے مطابق رکھا۔ چنانچہ ہمارے ہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی اور ہم نے اس کا نام حضرت کی والدہ کے نام کے مطابق رکھا۔

کرامت:

ایک مرتبہ میں آپ کی خدمت میں حاضر تھا اور آپ میرے ساتھ خوش مزاجی فرما رہے تھے۔ آپ نے مجھ سے دریافت کیا کیا تم نے کبھی یہ حرکت کی ہے؟ آپ نے دراصل ایک ایسے عمل کے بارے میں دریافت کیا تھا جو گناہ تھا۔ میں نے عرض کی: امیرے خیال میں میں نے یہ حرکت کبھی نہیں کی۔ آپ نے مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا: یاد کرو۔ میں نے دوبارہ قسم کھا کر کہا کہ میں نے یہ حرکت کبھی نہیں پھر تیسری اور چوتھی مرتبہ اپنی بات دہرائی۔ چوتھی مرتبہ مجھے خیال آیا آج سے پندرہ سال پہلے ''فاس'' سے سات مرحلوں کے فاصلے پر موجود فلاں

بستی میں' میں نے یہ عمل کیا تھا۔ یہ سوچ کر مجھے شرم آ گئی۔ آپ نے اندازہ لگا لیا اور فرمایا کیا تم اب قسم اٹھاتے ہو؟ میں نے عرض کی: نہیں۔ اور پھر آپ کی دست بوسی کر کے عرض کیا: آپ کو اس بات کا کیسے پتا چلا؟ آپ نے فرمایا: کیا یہ بات اللہ سے چھپی رہ سکتی ہے؟ (میں نے انکار کیا تو فرمایا) اسی طرح ان لوگوں سے بھی مخفی نہیں رہ سکتی جنہیں اللہ نے علم ''لدنی'' عطا کیا ہو پھر آپ نے چند دیگر امور کا تذکرہ بھی کیا۔ اس پر میں نے پوری نیک نیتی کے ساتھ آپ کے دست اقدس پر توبہ کی۔

کرامت:

ایک دن میں آپ کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ آپ اس وقت دائیں پہلو کے بل غنودگی کے عالم میں نیم دراز تھے اچانک میرے دل میں ایک برا خیال آیا۔ آپ نے آنکھیں کھول کر مجھ سے دریافت کیا: تم نے کچھ کہا ہے؟ میں نے عرض کی: جی نہیں آپ نے فرمایا: تم نے دل میں کیا سوچا ہے؟ مجھے بہت شرم آئی اور میں نے اللہ کی بارگاہ میں توبہ کی۔

ایک مرتبہ میں اپنی اہلیہ کے ہمراہ اپنے کمرے میں موجود تھا۔ وہ سیدھی لیٹی ہوئی تھی' اس کے ساتھ خوش مزاجی کے اظہار کے دوران میں نے قصداً اس کی شرم گاہ کی طرف دیکھا (بعد میں) جب میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے دریافت کیا: بیوی کی شرم گاہ کی طرف دیکھنے کے مسئلے میں فقہاء کی رائے کیا ہے؟ میں نے فقہاء کا قول نقل کر دیا' آپ نے دریافت کیا: کیا تم ایسا کرتے ہو؟ میں نے عرض کی: جی نہیں۔ اس وقت میں اپنا واقعہ بھول چکا تھا۔ آپ نے پوچھا کیا تم نے فلاں رات ایسا نہیں کیا تھا مجھے وہ بات یاد آ گئی۔ آپ نے فرمایا: آئندہ ایسا نہیں کرنا بلکہ اپنی نگاہ کو کعبے کی طرف مبذول رکھو۔

ایک مرتبہ میری دو بیویاں ایک ہی کمرے میں الگ الگ بستر پر سو گئیں۔ تیسرے بستر پر میں خود سو گیا۔ کمرے میں ایک چوتھا بستر موجود تھا۔ جو خالی رہا۔ رات کے کسی پہر میں صحبت کی خواہش محسوس ہوئی تو میں نے یہ سوچ کر ایک بیوی کے ساتھ صحبت کر لی کہ شاید دوسری بیوی سو رہی ہو گی۔ بعد میں جب میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے دریافت کیا: اگر کوئی شخص ایک ہی کمرے میں دو بیویوں کو رکھ کر رات کے وقت ان میں سے ایک کے ساتھ صحبت کرے تو ایسے شخص کے بارے میں فقہاء کی کیا رائے ہے؟ میں سمجھ گیا کہ آپ کا اشارہ میرے عمل کی طرف ہے میں نے عرض کی: میں یہ سمجھتا تھا کہ شاید دوسری بیوی سو رہی ہے۔ آپ نے فرمایا: اس وقت تمہاری دونوں بیویاں جاگ رہی تھیں۔ اگر بالفرض دوسری بیوی سو رہی ہوتی تو بھی ایسا کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے عرض کی: فقہاء بھی اسی بات کے قائل ہیں۔

ایک مرتبہ میں آپ کے چند دیگر مخلصین کے ہمراہ حاضر خدمت تھا۔ اس وقت آپ کی اہلیہ محترمہ گھر میں موجود نہیں تھیں۔ ایک شخص کو رفع حاجت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ بیت الخلاء آپ کے گھر کے دروازے کے عین سامنے تھا۔ جو شخص گھر میں داخل ہوا اس کی نظر بیت الخلاء میں پڑ سکتی تھی۔ آپ اچانک اٹھے اور جا کر گھر کا

دروازہ بند کر دیا۔ ہم بہت حیران ہوئے کہ آپ نے ایسا کیوں کیا ہے لیکن جب کچھ دیر بعد آپ کی اہلیہ تشریف لائیں تو ہمیں اندازہ ہوا کہ آپ نے ان کیلئے دروازہ بند کیا تھا۔

ایک مرتبہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جب رات سونے کا وقت ہوا تو آپ نے مجھے سونے کی ہدایت کی اور خود نچلی منزل میں موجود اپنی خواب گاہ میں تشریف لے گئے۔ میں آرام سے لیٹ گیا اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی مجھے گدگدی کر رہا ہے۔ میری ہنسی چھوٹ گئی اور مجھے اندازہ ہوا کہ آپ نے میرے ساتھ خوش طبعی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ایک مرتبہ چند دیگر مخلصین کے ہمراہ آپ کی زیارت کے بعد واپس روانہ ہوا۔ ہمارے پاس اپنی حفاظت یا دفاع کیلئے کوئی ہتھیار موجود نہیں تھا۔ دوران سفر ہم راستہ بھول کر ایک ویران میدان میں پہنچ گئے جو ڈاکوؤں کا مرکز تھا اور وہیں رات بسر کی۔ ہمارے تمام ساتھی سو گئے صرف ایک صاحب میرے ہمراہ جاگتے رہے۔ اچانک ہم نے کیا دیکھا کہ ایک شیر آ کر ہمارے قریب کھڑا ہو گیا ہے۔ میں نے اپنے ساتھی کو مشورہ دیا کہ سوئے ہوئے حضرات کو جگایا نہ جائے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ شیر کو دیکھ کر گھبرا جائیں کیونکہ ان میں بعض ناتجربہ کار لوگ بھی شامل ہیں۔ شاید اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے نجات عطا فرما دے۔ صبح جب ہم روانہ ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں ہمارے پڑاؤ کے نزدیک ایک مردہ خرگوش پڑا ہوا ہے پھر جب دوبارہ ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مجھے پھر پہرہ دینا پڑا تو آپ کی خدمت میں پہنچ کر میں نے درخواست کی: میں سونا چاہتا ہوں کیونکہ پچھلی رات مجھے سونے کا موقع نہیں ملا۔ آپ نے دریافت کیا: تم کیوں نہیں سوئے؟ میں نے عرض کی: میں جانوروں کی نگرانی کرتا رہا تھا۔ آپ نے فرمایا: تمہاری نگرانی سے کیا ہوتا ہے؟ اگر کوئی درندہ آ جاتا تو تم کیا کر لیتے؟ آپ نے اس پہلی رات کی طرف اشارہ کیا جب شیر ہمارے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔ میں نے عرض کی: کہ وہ شیر کیسے آ گیا تھا؟ آپ نے فرمایا: اس رات سفر کے دوران جب تم فلاں وادی سے گزرے تھے کیا تمہارے ساتھ تین اجنبی شامل نہیں ہوئے تھے؟ میں نے عرض کی: جی ہاں۔ آپ نے فرمایا: وہ تینوں تم سے جدا ہو کر فلاں پہاڑ پر چڑھ گئے جہاں چار ڈاکو موجود تھے۔ ان تینوں نے ان چاروں ڈاکوؤں کو تمہارے قافلے کے بارے بتایا اور یوں ان ساتوں نے رات کے وقت تمہارا قافلہ لوٹنے کا پروگرام بنایا۔ جب تم نے پڑاؤ کیا تو وہ تمہارے سونے کا انتظار کرنے لگے جب ان کے اندازے کے مطابق تم سو چکے تو وہ تمہارے قریب آئے کیا دیکھتے ہیں کہ تمہارے پاس ایک شیر کھڑا ہے۔ اب انہوں نے یہ مشورہ کیا کہ اگر شیر کا مقابلہ کیا تو تم لوگ بیدار ہو جاؤ گے اور سیدھے تمہاری طرف آئے تو شیر راستہ روک لے گا۔ اس لیے وہ تمہیں چھوڑ کر دوسرے قافلے کو لوٹنے کیلئے چلے گئے لیکن جب وہاں سے کچھ نہیں ملا تو دوسری سمت سے تمہاری طرف آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہاں بھی شیر کھڑا ہوا ہے۔ وہ یہ سمجھے کہ شاید یہ دوسرا شیر ہے۔ حیران ہو کر کہنے لگے یہ کون لوگ ہیں جن کے دونوں جانب شیر پہرہ دے رہے ہیں۔ انہوں نے اسے سمجھنے کی کوشش کی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے دل پر مہر لگا دی۔ میں نے حضرت سے خرگوش کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: انسانوں کی طرح شیر میں بھی

عزت نفس کا جذبہ پایا جاتا ہے جس طرح کسی انسان کے چہرے پر مکھی بیٹھ جائے تو وہ اسے اڑا دیتا ہے اسی طرح اس شیر نے اپنے پاس موجود خرگوش کو دیکھا تو اسے مار ڈالا۔ البتہ خرگوش شیر کو نہیں دیکھ سکا تھا۔

میں نے ایک زیاری عورت سے شادی کرنے کا ارادہ کیا۔ میں اس کی خوبیوں سے آگاہ نہیں تھا آپ نے اس کی خوبیاں بیان کی پھر شادی کی پہلی رات آپ نے فرمایا: آج رات میں تمہارے گھر آؤں گا۔ میں نے عرض کی: مجھے کیسے پتہ چلے گا؟ آپ نے فرمایا: میں کوئی ایسا عمل کرونگا جس سے تمہیں اندازہ ہو جائے۔ جب میں اپنی بیوی کے پاس پہنچا تو میں نے کیا دیکھا کہ اس کی ناک سے خون بہہ رہا ہے۔ میں نے اس کی وجہ دریافت کی تو اس نے کہا کہ آپ ہی نے تو میری ناک پر گھونسا رسید کیا ہے۔ میں خاموش ہو گیا اور مجھے اندازہ ہو گیا کہ حضرت نے ایسا کیا ہوگا۔ بعد میں جب میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو یہ واقعہ بیان کیا۔ آپ نے فرمایا: اگر میں ایسا نہ کرتا تو وہ بیمار ہو جاتی کیونکہ وہ ایک لمبا سفر کر کے یہاں آئی تھی اور اس دن ٹھنڈک بہت زیادہ تھی جس کی وجہ سے اس کی کسی ایک رگ میں خون جم گیا تھا۔

ایک مرتبہ میں آپ کے ہاں اوپری منزل میں موجود تھا۔ آپ اس وقت نچلی منزل میں کسی کام میں مصروف تھے۔ اسی دوران سامنے والے مکان کی چھت پر ایک عورت چڑھی جس کا چہرہ انتہائی سرخ تھا۔ میں نے غور سے دیکھا کہ یہ سرخی اس کی اصل رنگت کی ہے یا اس کے چہرے پر خون لگا ہوا ہے؟ آپ نے نیچے سے آواز دے کر فرمایا کہ اللہ سے ڈرو! میری موجودگی میں یہ حرکت کر رہے ہو؟

ایک مرتبہ میں آپ کی زیارت کی نیت سے ایک خچر پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔ راستے میں ایک دشوار گزار جگہ سے گزرتے ہوئے خچر سے اترا اور پیدل اس مقام کو طے کیا۔ اس کے بعد جب میں دوبارہ خچر پر سوار ہونے لگا تو وہ خچر بھاگ گیا۔ میں نے بلند آواز سے پکارا: اے میرے آقا! میرے سردار! عبدالعزیز! (میری مدد کیجئے)۔ اچانک میں نے کیا دیکھا کہ کچھ لوگ اسے پکڑ کر میرے پاس لے آئے ہیں۔ جب میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا: عبدالعزیز کیا کر سکتا ہے۔ تم فلاں مقام پر موجود تھے جبکہ وہ فلاں مقام پر موجود تھا۔ البتہ اگر وہ تمہارے نزدیک ہوتا تو ضرور تمہاری مدد کرتا۔ میں نے عرض کی: یا سیّدی! (دور و نزدیک) سب کچھ آپ کیلئے یکساں ہے۔

ایک دن میں شیخ عبدالقادر الفاسی کی خانقاہ میں قبلہ کی جانب موجود دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ میرے سامنے ایک ستون موجود تھا۔ اس وقت وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا اور میں اللہ کے ذکر میں مشغول تھا۔ کافی دیر بعد میں حضرت شیخ کے ہاں جانے کیلئے وہاں سے اٹھا۔ چند قدم جانے کے بعد مجھے یاد آیا کہ میں کوئی چیز بھول گیا ہوں میں واپس پلٹا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سیّدی عبدالعزیز ستون کے ہمراہ کھڑے ہوئے ہیں وہاں آنے کا کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ میں نے حیرانگی سے دریافت کیا: آپ یہاں کیسے آ گئے اور کب تشریف لائے ہیں؟ آپ نے فرمایا: جب تم نے ذکر شروع کیا تھا حالانکہ میں نے دل میں ذکر کیا تھا جسے سننا ممکن نہیں ہے۔

اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ آپ اس وقت ایسی حالت میں موجود تھے کہ جس حالت میں عام آنکھ آپ کو نہیں دیکھ سکتی۔

ایک مرتبہ میں نے ایک اجنبی عورت کو ایک ایسی بات کہہ دی جسے شریعت پسند نہیں کرتی اگر چہ وہ کوئی گناہ کی بات نہیں تھی۔(بعد میں) میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا: مجھے تمہارے اور اس عورت کے درمیان خطرے کا نشان نظر آ رہا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ مجھے اپنا واقعہ یاد آ گیا حالانکہ اس بات کو پانچ سال گزر چکے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے آپ سے کچھ ساز و سامان خریدنے کے بارے میں مشورہ کیا تو آپ نے فرمایا: یہ ساز و سامان تمہارے پاس تمہاری ضرورت کے مطابق موجود ہے۔ البتہ گھی ضرورت سے کم ہے اس لیے تم گھی خرید لو۔ میں نے عرض کی: فلاں عورت نے میرے پاس بطور امانت گھی رکھوایا ہے۔ ایک دن میں نے اس کے سامنے اپنی ضرورت کا تذکرہ کیا تو اس عورت نے مجھے کہا تم میرے گھی میں سے جتنا چاہو لے لینا چونکہ میرے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ گھی موجود ہے۔ لیکن یہ واضح نہیں ہو سکا کہ آیا وہ بطور تحفہ مجھے گھی دے رہی ہے یا بطور قرض دے رہی ہے۔ تاہم مجھے اس کی بات پر اعتماد ہے۔ آپ کچھ دیر خاموش رہے اور پھر ارشاد فرمایا کہ تم گھی خرید ہی لو اور پھر آپ نے اس بات کو دو مرتبہ دہرایا جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ شاید وہ عورت اپنا وعدہ وفا نہیں کر سکے گی اور پھر ایسا ہی ہوا کیونکہ جب گھی کی فروخت میں تیزی کا رجحان آیا تو اس نے میرے ہی گھر میں بیٹھ کر وہ تمام گھی فروخت کر دیا۔ حالانکہ اسے میری حالت زار کا پتہ تھا بعد میں اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخ کی برکت سے مجھے فراخی عطا کی یہاں تک کہ جس قدر اس عورت سے حاصل ہونے کی امید تھی مجھے اس سے زیادہ کسی اور طریقے سے نصیب ہو گیا۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے مجھے کچھ درہم قرض دیئے اور کچھ درہم میرے پاس امانت رکھوا گیا کچھ عرصہ بعد وہ آیا اور قرض سمیت امانت کی واپسی کا تقاضا کرنے لگا جب کہ میں اس وقت قرض ادا کرنے کے قابل نہیں تھا اور نہ ہی میرے پاس کوئی ایسی چیز تھی جسے فروخت کر کے اس کا تقاضا پورا کر سکوں۔ میں نے اس کی امانت واپس کی اور دل ہی دل میں حضرت شیخ کو یاد کرنے لگا۔ آخر کار وہ شخص مزید تقاضا کیے بغیر صرف امانت لے کر واپس چلا گیا۔ اس بات کو تقریباً چھ ماہ گزر چکے ہیں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) یہاں پر شیخ زیراری کا مکتوب ختم ہو گیا۔

صباغی کے مشاہدات:

ہمارے زمانے کے جید فقیہہ سیّدی علی بن عبداللہ الصباغی نے حضرت شیخ کی درجہ ذیل کرامات تحریر کر کے بھجوائے اور میں نے ان تمام کا تذکرہ حضرت شیخ کے سامنے کیا تو آپ نے ان کی تصدیق فرمائی۔ میری یہ خواہش تھی کہ میں اس کتاب میں شیخ کی وہی کرامت درج کروں جو میں نے خود دیکھی ہوں یا حضرت شیخ خود ان کی تصدیق کر دیں۔ صباغی کی تحریر کا متن درج ذیل ہے:

اللہ کی ذات تمام تعریفوں کی مستحق ہے جو یکتا ہے۔ اپنی اس تحریر میں' میں اپنے پیشوا' سب سے بڑے استاد (اپنے زمانے کے) سب سے مشہور غوث' میرے آقا و مولا عبدالعزیز بن مسعود کی بعض کرامات اور مکاشفات کے بارے میں اپنے مشاہدات بیان کروں گا۔ حضرت شیخ ''فاس'' میں بسنے والے سادات کے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں جنہیں عرف عام میں ''دباغ'' کہا جاتا ہے۔

جب میں پہلی مرتبہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اخذ و استفادہ کے بعد اپنے گھر واپس لوٹا تو تقریباً دس دن گزرنے کے بعد ہمارے بعض رشتے داروں کے ہاں ایک بڑا مسئلہ کھڑا ہو گیا جس کے بارے میں چھوٹے بڑے مل کر تقریباً بیس افراد واقف تھے لیکن اگر یہ واقعہ حکومت کے علم میں آ جاتا تو پورا قبیلہ ہلاک ہو جاتا۔ میں نے تنہائی میں جا کر بلند آواز سے تین مرتبہ حضرت شیخ کو ندا دی اور عرض کی اس قبیلے کو اس مسئلے کی آگ سے بچائیں۔ اس کے بعد یوں لگا جیسے یہ مسئلہ کسی پہاڑ کے نیچے دب گیا ہے یا اسے سمندر میں پھینک دیا گیا ہے۔ جو لوگ اس سے واقف تھے انہوں نے مکمل خاموشی اختیار کی گویا وہ اس سے واقف ہی نہیں ہیں اور اگر کوئی شخص چوری چھپے اس کا تذکرہ کرتا تو دوسرے لوگ اسے جھٹلا دیتے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخ کی برکت سے ہمارے پورے قبیلے کو محفوظ رکھا۔ جب میں دوسری مرتبہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو لوگوں کو جواب دینے کے دوران آپ کے کشف کے مظاہرے دیکھ کر عرض کیا: اے میرے آقا! آپ کے قریب رہنے والے لوگ بڑے خوش قسمت ہیں۔ انہیں جب بھی کوئی ضرورت ہو آپ کے پاس آ کر مشورہ کر لیتے ہیں لیکن اگر مجھے کوئی مسئلہ درپیش ہو تو میں کیا کروں۔ کیونکہ میرے اور آپ کے درمیان چار دن کی مسافت حائل ہے؟ آپ نے فرمایا: جب تمہیں مسئلہ درپیش ہو اور اس وقت یہ سمجھ نہ آئے کہ کیا کرنا چاہیے؟ تو تم تنہائی میں جا کر دو رکعت نفل ادا کرو۔ ہر رکعت میں گیارہ مرتبہ سورہ اخلاص پڑھو سلام پھیرنے کے بعد تین مرتبہ مجھے ندا کرو اور یہ سمجھو کہ میں تمہارے پاس موجود ہوں پھر اپنے مسئلہ کے بارے میں مجھ سے مشورہ کرو تو تمہیں جواب مل جائے گا۔ (صباغی کہتے ہیں) ایک مرتبہ مجھے ایک سخت مشکل پیش آ گئی میں نے آپ کی ہدایت کے مطابق جنگل میں جا کر یہ وظیفہ کیا تو آپ کی برکت سے میرا وہ مسئلہ حل ہو گیا۔ اس وقت میں شیخ سے چار دن کی مسافت کے فاصلے پر موجود تھا اور ٹھیک اسی وقت بعض پیر بھائی حضرت کی خدمت میں موجود تھے۔ کچھ عرصہ بعد جب میری ان پیر بھائیوں سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھ سے دریافت کیا: کیا تم نے فلاں دن فلاں مسئلے کیلئے حضرت شیخ سے مدد مانگی تھی؟ میں نے اقرار کیا تو انہوں نے بتایا کہ اس وقت ہم حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر تھے اچانک آپ مسکرائے اور فرمایا: علی بن عبداللہ پریشانی کا شکار ہیں اور انہوں نے اس نیت سے تنہائی میں آ کر مجھے پکارا ہے' وہ ندا دے رہے ہیں: اے میرے آقا! عبدالعزیز! بھلا عبدالعزیز وہاں کیسے پہنچ سکتا ہے۔ (صباغی کہتے ہیں) پھر جب میں حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا: کہ آئندہ کبھی پریشان نہ ہونا کتنی ہی بڑی مشکل کیوں نہ ہو (یہی عمل کر لینا) آپ کی یہ بات سن کر میری تمام پریشانی دور ہو گئی اس کے بعد جب بھی کوئی

پریشانی درپیش ہوئی تو اللہ نے حضرت شیخ کی برکت سے مجھے آسانی نصیب کی۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے عرض کی: اس عمل کی اجازت صرف سیّدی علی بن عبداللہ کو ہے یا ہر شخص یہ عمل کرسکتا ہے۔آپ نے فرمایا: ہرشخص یہ عمل کرسکتا ہے۔اس پر میں نے اللہ کا شکرادا کیا۔

(علی بن عبداللہ مزید لکھتے ہیں) جب پہلی مرتبہ حاضری کے بعد میں آپ سے رخصت ہونے لگا تو آپ نے فرمائش کی: بڑی عید پر ہمارے لیے ایک دنبہ لے کرآنا۔ان دنوں ماہ رمضان کا آخری عشرہ گزر رہا تھا۔ میں نے رضامندی ظاہر کی اور عیدالاضحیٰ سے کچھ دن پہلے دو دنبے خرید لئے۔اس وقت میرا ایک پیر بھائی حضرت شیخ کی خدمت میں موجود تھا جو میرے اور حضرت شیخ کے درمیان واقع ایک اور شہر کا رہنے والا تھا۔ میرے شہر سے اس کے شہر تک دو دن کی مسافت تھی۔آپ نے اسے میرے بارے میں حکم دیا کہ جب وہ (یعنی میں) تمہارے پاس دو دنبے لے کرآئے تو ایک دنبہ قربانی کیلئے اپنے پاس رکھ لینا اور دوسرا میرے پاس لے آنا۔ جب میری اس پیر بھائی سے ملاقات ہوئی تو اس نے حضرت کا یہ پیغام مجھ تک پہنچایا۔مجھے اس بات کا کوئی شک نہیں ہوا کیونکہ حضرت کی بارگاہ میں اس شخص کے مرتبہ ومقام سے میں بخوبی آگاہ تھا میں نے اس سے کہا کہ تم ان میں سے جو چاہو رکھ لو اس پیر بھائی نے کہا کہ کم تر دنبہ میں رکھ لیتا ہوں اور بہتر حضرت شیخ کی خدمت میں لے جاتے ہیں۔ہم ان دونوں میں سے بظاہر بہتر نظر آنے والے دنبے کو لے کر حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

جب ہم آپ کی خدمت میں پہنچے اور آپ کو دنبے کے بارے میں بتایا تو آپ نے فرمایا کہ اس شخص نے تمہیں دھوکا دے کر بہتر اپنے پاس رکھ لیا ہے اور کم تر یہاں بھجوادیا ہے۔ہم نے عرض کی ہمارے اندازے کے مطابق تو یہی بہتر ہے آپ نے فرمایا: ایسا نہیں ہے بعد میں تحقیق کی تو پتہ چلا کہ حضرت شیخ کا فرمان درست تھا جب ہم اس دنبے کو لے کر روانہ ہونے لگے تھے تو اس وقت یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ سواری کی حالت میں اس دنبے کو اپنے ہمراہ کیسے لے جایا جاسکتا ہے؟ اس وقت اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور ''فاس'' جانے والا بکریوں کا ایک ریوڑ مل گیا۔میرا ایک سوتیلا بھائی پیدل سفر کررہا تھا۔ہم نے وہ دنبہ اس کے حوالے کرکے اسے ہدایت کی کہ تم اس ریوڑ کے ہمراہ آجانا۔وہ بھائی دنبے سمیت ہم سے دو دن بعد وہاں پہنچا۔آپ نے خوش ہوکر اسے فرمایا ہم نے تمہیں بیٹا دیا۔میں نے عرض کی: یہ تو اس کی سب سے بڑی خواہش ہے اور واقعی میرے بھائی کو اولاد کی بڑی خواہش تھی۔اس کی شادی کو پندرہ برس بیت چکے تھے اور اس کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی تھی۔اسکی بیوی کا خیال تھا کہ شاید وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں ہے۔وہاں سے ہم شیخ کے گھر روانہ ہوگئے۔رات کے وقت آپ ہمارے کمرے میں تشریف لائے اور چراغ کی روشنی میں میرے بھائی کو دیکھ کر اسے حکم دیا' میرے پاس آؤ! پھر آپ نے اس کی پیشانی پکڑ کر فرمایا: اے فلاں! یہ شخص نامرد نہیں ہے۔آپ نے تین مرتبہ یہ بات دہرائی پھر آپ نے اس سے دریافت کیا: تم اپنے بیٹے کا کیا نام رکھو گے؟ اس نے عرض کی جو آپ حکم دیں گے۔آپ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد فرمایا کہ اس کا نام ''رحال'' رکھنا۔ ہمارے پورے قبیلہ بلکہ آباؤ اجداد میں بھی کسی شخص کا یہ

نام نہیں تھا۔ حاضرین نے دریافت کیا: یہ عجیب نام آپ کے ذہن میں کیسے آ گیا۔ آپ نے مسکراتے ہوئے فرمایا: مجھے یہی دکھائی دے رہا ہے۔ پھر آپ کے فرمان کے مطابق میرے بھائی کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی اور اس کا نام "رحال" رکھا گیا۔ لوگ اس نام کو سن کر حیرت کا اظہار کرتے لیکن آپ کی کرامت اس وقت ظاہر ہوئی جب وہ بچہ تین برس کی عمر میں انتقال کر گیا۔ آپ نے اس کے نام "رحال" (کوچ کرنے والا) میں اس بچے کی جلد وفات کی طرف اشارہ فرمایا۔ اس بچے کی وفات کے کچھ عرصہ بعد میرا بھائی حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا کہ اب میں تمہیں ایسا بیٹا دوں گا جو تمہارے پاس رہے گا اور کوچ نہیں کرے گا۔

مجھے شکار کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ ایک دن میں اپنے دوست کے ہمراہ شکار کیلئے گیا۔ صبح جلدی میں گھر سے روانہ ہوتے ہوئے دوپہر کا کھانا گھر میں بھول گیا۔ ہمارا خیال تھا کہ جلدی شکار سے فارغ ہو جائیں گے۔ شکار کے علاقے میں بہت سے ہرن پائے جاتے تھے۔ شکار کرتے ہوئے رات ہو گئی۔ ہمیں بہت زیادہ بھوک محسوس ہو رہی تھی (بعد میں میں جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوا) تو آپ نے فرمایا کہ تم فلاں دن کھانے کے بغیر ہی شکار کو چلے گئے تھے اور تمہیں راستے میں ایک شخص ملا تھا (جس نے تمہارے سامان کو ٹٹولا اور اس میں کھانے کو کچھ بھی نہ تھا پھر تم نے پہاڑ کے دامن میں ایک شکار کیا۔ غرضیکہ آپ نے اس دن کی تمام صورتحال بیان کر دی۔

آپ نے فرمایا کہ اس پہاڑ کی چوٹی پر ایک پیالے کے مانند ایک چشمہ ہے جس کا پانی کبھی خشک نہیں ہوتا لیکن وہ اپنے مخصوص مقام سے نکل کر باہر بہتا بھی نہیں ہے۔ اس کے پانی میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی (صباغی کہتے ہیں) میں اسے چشمے سے واقف نہیں تھا کیونکہ بہت کم شکاری پہاڑ کی چوٹی پر جاتے تھے۔ جب میں اپنے وطن واپس آیا تو لوگوں سے اس چشمے کے بارے دریافت کیا: ایک صاحب جو اس چشمے کو دیکھ چکے تھے انہوں نے چشمے کے بارے حضرت شیخ کے بیان کی تصدیق کی۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے حضرت شیخ سے دریافت کیا جس شخص نے ان کے سامان کی تلاشی لی تھی وہ کون تھا؟ آپ نے فرمایا: "میں" پھر آپ نے بتایا کہ میں نے کئی مرتبہ شیخ منصور (جو اپنے وقت کے قطب تھے) کے ہمراہ اس چشمے کے پاس نماز ادا کی ہے۔ یہ جگہ اپنی بلندی کی وجہ سے ہم دونوں کو بہت پسند تھی۔

(صباغی مزید لکھتے ہیں) ایک مرتبہ حضرت شیخ نے میرے سامنے میرے شہر اور ایک مرتبہ میرے گھر کا پورا نقشہ بیان کر دیا جو سو فیصد درست تھا۔ اگرچہ ہمارا شہر آپ سے چار دن کی مسافت پر واقع ہے۔

جب میں دوسری مرتبہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے میرے گھر کا نقشہ بیان کیا اور اسی دوران مجھ سے دریافت کیا کہ تم فلاں مقام پر اپنا گھوڑا کیوں باندھتے ہو؟ اس جگہ ایک بزرگ دفن ہیں۔

(صباغی کہتے ہیں) ہم نے وہاں قبر کا کوئی نشان نہیں دیکھا بلکہ قبرستان وہاں سے نصف میل دور تھا۔ آپ نے فرمایا: تمہارے اصطبل میں سات قبریں ہیں جن میں سے صرف اس ایک بزرگ کی قبر کا احترام کرنا ضروری ہے اس لیے تم اپنے گھوڑوں کو وہاں سے منتقل کر دو اور اس بزرگ کی قبر کی تعظیم و تکریم کرتے ہوئے اس کے

اردگرد احاطہ بنوا دو تا کہ اس کی بے حرمتی نہ ہو۔ حاضرین میں سے کسی صاحب نے دریافت کیا: وہ بزرگ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا: وہ ''وجدہ'' اور ''تلمسان'' کے درمیان بسنے والے عربوں میں سے تھے۔ بعد میں ''صباغات'' میں آ کر مقیم ہوئے۔ لوگ انہیں ایک ولی کی بجائے ایک طالبعلم سمجھتے تھے اور وہیں ان کا وصال ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔ ہم نے ''وجدہ اور تلمسان'' کے درمیان بسنے والے عرب قبائل کا نام لینا شروع کیا آپ انکار کرتے رہے۔ جب ''آل ریاح'' کا ذکر آیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ بزرگ اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔

(یہ حضرت کی ایک بڑی کرامت ہے) کیونکہ آپ کبھی وجدہ تلمسان یا صباغات تشریف نہیں لے گئے اور نہ ہی وہاں بسنے والے عرب قبائل سے واقف تھے پھر حضرت نے فرمایا تم تحقیق کرنا چاہتے ہو تو اس جگہ کو کھود کر دیکھ لو تمہیں ان کی قبر مل جائے گی۔ میں نے عرض کی: ان کی قبر کہاں ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ تمہارے بیٹے کے گھر کے مغربی حصے میں اصطبل کے دروازے کے سامنے موجود تہہ خانے کے قریب ہے۔ ہمارے گھر میں تین تہہ خانے موجود تھے۔ جب ہم نے آپ کے بیان کے مطابق مذکورہ تہہ خانے کے قریب کھدائی کی تو آپ کا بیان درست ثابت ہوا۔ اس قبر کو دیکھ کر لوگ حیران رہ گئے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا صرف اس ولی کی قبر کا احترام کیوں کیا گیا جبکہ وہاں دوسری قبریں بھی موجود تھیں آپ نے فرمایا: اس کی وجہ یہ ہے کہ اس ولی کی روح آزاد ہے جبکہ دیگر دوسری قبر والوں کی ارواح کو برزخ میں قید کر دیا گیا تھا۔ (آپ نے مزید بتایا) ان لوگوں کو انتقال کئے ہوئے تین صدیاں گزر چکی ہیں۔ (صباغی کہتے ہیں) ایک مرتبہ میں اپنے چچازاد بھائی کے ہمراہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میرا چچازاد بھائی میرا برادر نسبتی بھی تھا۔ اس وقت اس کی اہلیہ امید سے تھی۔ وہ اس مقصد کیلئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا تا کہ مال واسباب کی تنگی اور فقر کی زیادتی کی شکایت کرے۔ یہ اس کی پہلی حاضری تھی۔ آپ نے اسے دیکھ کر دریافت فرمایا۔ تمہاری بیوی امید سے ہے؟ تو اس نے اقرار کیا۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تم اس بات کو پسند کرو گے کہ تمہارے ہاں بیٹی کی پیدائش ہو اور اس کے ساتھ وافر رزق بھی نصیب ہو؟ اس نے عرض کی: ضرور کیوں نہیں۔ اس طرح آپ نے بیٹی کی پیدائش اور رزق کی فراخی کی پیشین گوئی فرمائی۔ کچھ دیر بعد ان کے ہاں بیٹی کی پیدائش ہوئی تو اس نے اپنی بیٹی کا نام حضرت کی خواہش کے مطابق خدیجہ رکھا۔ حالانکہ ہمارے ہاں یہ نام رکھنے کا رواج نہیں تھا۔ لوگ اس نام پر حیرانگی کا اظہار کیا کرتے۔ احمد بن مبارک کہتے ہیں: میں نے عرض کی: آپ نے اس کی بیٹی کا نام خدیجہ کیوں تجویز کیا تھا؟ سیدی دباغ نے جواب دیا: جس شخص کو اللہ تعالیٰ ''فتح کبیر'' (بلند روحانی مرتبہ) عطا فرما دے اور پھر وہ نکاح کرنے کا ارادہ کرے تو اسے چاہیے کہ ایسی عورت تلاش کرے جس کا نام خدیجہ ہو۔ اگر میرے ہاں کوئی بیٹی پیدا ہوئی تو میری خواہش ہے کہ میں اس کا نام خدیجہ رکھوں گا کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سیدہ خدیجہ کی رفاقت کے دوران دین و دنیا کی بہت سی کامیابیاں نصیب ہوئی تھیں۔

(صباغی مزید لکھتے ہیں) ایک مرتبہ آپ نے میری بیوی کی تمام خوبیوں اور خامیوں کو اس قدر تفصیل سے

بیان کیا کہ اتنی تفصیل کے ساتھ میں خود بھی بیان نہیں کرسکتا حالانکہ میری بیوی کو کبھی بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع نہیں ملا (مزید لکھتے ہیں) مجھے بہت زیادہ سونے کی عادت تھی۔ بعض اوقات ایسا ہوتا کہ صبح صادق کے وقت آنکھ کھلتی اور اس وقت میں وظیفہ زوجیت ادا کرتا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ فجر کے وقت میں سویا رہتا۔ ایک دن میں آپ کی خدمت میں حاضر تھا۔ آپ نے دیگر حاضرین کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا:

ایک صاحب ایسے بھی ہیں جو ہمیشہ صبح صادق کے وقت یا سوئے رہتے ہیں یا وظیفہ زوجیت ادا کرنے میں مصروف ہوتے ہیں۔ اس وقت دونوں میں سے کونسا عمل بہتر ہے؟ نیند کی بہ نسبت وظیفہ زوجیت کی ادائیگی بہتر ہے لیکن نماز کے اوقات میں ادا کئے جانے والے وظیفہ زوجیت کے نتیجے میں پیدا ہونے والا بچہ والدین کا نافرمان ہوتا ہے۔ آپ کی اس بات کا مجھے پر اتنا اثر ہوا کہ اس کے بعد آج تک نہ تو کبھی میں اس وقت سویا اور نہ ہی وظیفہ زوجیت ادا کیا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) بچوں کے نافرمان ہونے کا تذکرہ دوسری کرامت ہے کیونکہ شیخ صباغی (بعد میں) اکثر اپنے بچوں کی نافرمانی کی شکایت کیا کرتے تھے۔ بعض اوقات میں نے بھی ان کی اولاد کو ان کے ساتھ ناروا سلوک کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ (صباغی مزید لکھتے ہیں) یہ مکتوب تحریر کرتے وقت صرف اسی قدر واقعات یاد تھے جو میں نے تحریر کر دیئے ہیں ورنہ آپ کی کرامات اس سے بھی زیادہ ہیں اللہ تعالیٰ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے اور حضرت شیخ کے وسیلے سے ہمیں نفع عطا فرمائے۔ آپ کی محبت میں ہمیں موت نصیب کرے اور قیامت کے دن آپ کے ساتھیوں کے گروہ میں دوبارہ زندہ کرے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اللہ تعالیٰ نے صباغی کی اس دعا کو قبول کیا۔ اس کی صورت یوں ظاہر ہوئی کہ جب آپ کی وفات کا وقت قریب آیا تو دل میں خیال آیا کہ موت حضرت کے قدموں میں نصیب ہو۔ اپنے گھر والوں سے رخصت ہو کر فاس تشریف لے آئے اور حضرت کی خانقاہ میں مقیم ہوئے۔ آپ کی بیماری میں اضافہ ہوا۔ حضرت شیخ نے انہیں وصیت کرنے اور بارگاہ رب العزت میں حاضری کی تیاری کا حکم دیا۔ آپ کی بیماری کے دوران حضرت شیخ سمیت حضرت شیخ کے تمام اہل خانہ وخدام ان کی تیمارداری کرتے رہے۔ جب آپ کی وفات کا وقت قریب آیا تو حضرت شیخ نے اپنے پاس موجود حاضرین کو فرمایا کہ ابھی جناب علی صباغی کو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زیارت نصیب ہوئی ہے۔ صباغی اس وقت گھر کی اوپری منزل میں موجود تھے۔ کچھ حاضرین فوراً اٹھ کر اوپری منزل پر آئے تاکہ صباغی سے حقیقت حال دریافت کرسکیں مگر صباغی اس وقت تک کلام کرنے کے قابل نہ رہے تھے۔ ان لوگوں نے ان کے سامنے حضرت شیخ کی بات بیان کی تو صباغی نے سر کے اشارے سے اس کی تائید کی اور ان کے ہونٹوں پر ہلکی سی جنبش ہوئی۔ یوں جیسے کوئی شخص مسکرانے لگے اور پھر یہی دھیمی سی مسکراہٹ ان کے چہرے پر باقی رہ گئی یہاں تک کہ ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

آپ کی وفات کے بعد ایک مرتبہ حضرت شیخ نے ارشاد فرمایا: اگر صباغی اپنے وطن صباغات میں مزید نوے برس تک بھی زندہ رہتے تو بھی اس مقام تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔

عبداللہ التازی کے مشاہدات:

مفتی عبداللہ التازی نے حضرت شیخ کی درج ذیل کرامات تحریری شکل میں ارسال کی تھیں اور حضرت نے ان کی تصدیق بھی فرمائی۔ آپ کی تحریر درج ذیل ہے:

تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔ (میں اپنی اس تحریر میں) اپنے شیخ 'اپنا خزانہ' اپنا ذخیرہ' اس وقت کے غوث اور معرفت کے سرچشمے میرے آقا و مولا سیّدی عبدالعزیز دباغ کی بعض کرامات کا تذکرہ کروں گا۔

ایک مرتبہ مجھے میرے با اعتماد دوست عبدالرحمٰن نے بتایا کہ ایک دن وہ جناب شیخ کے ہمراہ حضرت شیخ محمد ادریس کی درگاہ کے قریب موجود تھے (الابریز کے مرتب) علامہ احمد بن مبارک بھی شیخ کے ہمراہ تھے حضرت شیخ نے میرے دوست کو کسی کام سے اپنے گھر بھیجا۔ میرے دوست کا بیان ہے کہ میں انتہائی تیز رفتاری سے چلتا ہوا حضرت شیخ کے گھر کی طرف روانہ ہوا اور حضرت وہیں ٹھہرے رہے۔ جب میں آپ کے گھر کے پاس پہنچا تو آپ کے گھر کے باہر دھوبی کھڑا ہوا تھا تاکہ دھونے کے لئے کپڑے لے جائے۔ ہم دونوں وہیں کھڑے ہو کر مولائے ادریس کی درگاہ سے حضرت کی واپسی کے منتظر تھے کہ حضرت ہاتھوں میں کپڑے لیے ہوئے اپنے گھر سے باہر نکلے اور دھوبی کو وہ کپڑے دیئے۔ میں بہت حیران ہوا کیونکہ جب میں نے حضرت کو مولائے ادریس کی درگاہ کے پاس چھوڑا تھا اس وقت آپ نے اپنے پاؤں میں کھڑاویں پہن رکھی تھیں جبکہ سارا راستہ کیچڑ سے بھرا ہوا تھا۔ اگر آپ عام عادت کے مطابق چل کر آتے تو کسی بھی صورت میں مجھ سے پہلے گھر نہیں پہنچ سکتے تھے کیونکہ میں بہت تیزی سے آیا تھا۔ (یہی عبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں) آپ کا شیشہ گم ہو گیا جسے آپ کتب کے مطالعہ کے وقت استعمال کرتے تھے میں نے اپنے دوست اور ساتھی الحاج محمد الکواش کی دکان سے دوسرا شیشہ لا دیا لیکن اس کی حالت بہتر نہیں تھی۔ آپ نے حکم دیا کہ پہلے والے کو تلاش کرو کیونکہ وہ زیادہ صاف شفاف تھا۔ شاید وہ بھی مل جائے۔ ہم نے اس جگہ تلاش کی جہاں عام طور پر رکھا جاتا تھا لیکن ہمیں نہیں ملا۔ آپ کے چہرے پر ناراضگی کے آثار ظاہر ہوئے۔ میں نے عرض کی: کیا ہوا؟ آپ نے فرمایا: مجھے اس پر غصہ آ رہا ہے کہ وہ کہاں کھو گیا ہے پھر آپ نے کتاب کو اٹھایا تو وہاں وہ شیشہ موجود تھا۔ آپ نے اپنے ایک صاحبزادے مولا عمر سے فرمایا: اپنی والدہ کو بتا دو کہ مجھے میرا شیشہ مل گیا ہے۔

یہی عبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں۔ سخت سردی کے موسم میں حضرت شیخ کو سخت پسینہ آیا کرتا تھا لیکن بعد میں یہ کیفیت باقی نہ رہی۔ ہم نے اس کا سبب دریافت کیا تو فرمایا پہلے میری یہ حالت تھی کہ کبھی مشاہدہ میرے سامنے آتا تھا۔ اس حالت میں جسم سے پسینہ پھوٹ پڑتا تھا اور جب یہ کیفیت ختم ہوتی تو میں ایک عام آدمی کی مانند ہو جاتا اس طرح کی صورت میرے لیے بہت تکلیف دہ تھی لیکن اب مجھے مستقل مشاہدہ نصیب ہو گیا ہے جو کبھی

غائب نہیں ہوتا میرا وجود اس سے مانوس ہو گیا ہے اس لیے اب یہ کیفیت ظاہری جسم پر اثر انداز نہیں ہوتی۔

(عبداللہ التازی کہتے ہیں) ایک دن میں اپنے بھائی عبدالرحمٰن کے ہمراہ "مدرسہ عطارین" کی چھت پر چڑھا۔ ہمیں آس پاس گھروں کی چھتوں پر بہت سی عورتیں کھڑی نظر آئیں کہیں اکٹھی اور کہیں الگ الگ۔ ہم انہیں دیکھ کر کبھی ہنستے کبھی انہیں دیکھتے اور انہی کے بارے میں گفتگو کرتے۔ یہاں تک کہ ہم دونوں میں سے ایک نے خوشی کے مارے ہوا میں چھلانگ لگائی۔ بعد میں ہم حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ہمیں دیکھ کر بہت ہنسے اور فرمایا جس شخص کو کشف نہ ہو وہ بہت خوش نصیب ہے پھر آپ نے فرمایا: تم دونوں کہاں تھے؟ سچ بتاؤ' جھوٹ نہیں بولنا۔ ہم نے صورتحال عرض کر دی۔ آپ نے وہ ساری صورتحال اس طرح بیان کرنی شروع کر دی گویا آپ بھی ہمارے ہمراہ موجود تھے۔ یہاں تک کہ ہوا میں چھلانگ لگانے کا واقعہ ہم نے ذکر نہیں کیا تھا مگر آپ نے وہ بھی بیان کر دیا اور فرمایا اس وقت کچھ لوگ میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ تمہیں چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھ کر میری ہنسی چھوٹ گئی وہ یہ سمجھے کہ شاید میں ان کی کسی بات پر ہنسا ہوں۔

عبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں ایک مرتبہ میری اہلیہ امید سے ہوئی میں نے اس بات کا ذکر حضرت شیخ سے کر دیا۔ حاضرین میں سے کسی نے ازراہ تمسخر یہ کہا کہ بیٹی پیدا ہوگی۔ حضرت شیخ نے مجھے اپنے پاس بلا کر میرے کان میں فرمایا: بیٹا پیدا ہوگا' اور ایسا ہی ہوا۔

اسی طرح ایک مرتبہ میں حاضر ہوا تو ان دنوں میرا بیٹا سخت بیمار تھا۔ میں نے اس کی صحت یابی کیلئے دعا کی درخواست کی تو فرمایا: پھر کسی وقت کرنا۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس بچے کا آخری وقت قریب آ گیا ہے اور پھر ایسا ہی ہوا۔

ایک مرتبہ میری بیوی امید سے ہوئی تو فرمایا کہ تمہارے ہاں بیٹی کی ولادت ہوگی اور یہ بات درست ثابت ہوئی۔ ایک مرتبہ میں آپ کی زیارت کیلئے "فاس" روانہ ہوا اور تیس اوقیے (کچھ رقم) بطور نذر پیش کرنے کیلئے ساتھ رکھ لی "فاس" کے قریب پہنچ کر ان میں سے ایک اوقیہ نکال لیا۔ باقی رقم جب حضرت شیخ کی خدمت میں پیش کی تو آپ نے فرمایا: کہ تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے۔ جاؤ! تم نے جو ایک اوقیہ نکالا تھا اس میں سے ایک آنے کی کھجور اور تین آنے کا پنیر لے کر آؤ۔ میں نے عرض کی: اے میرے آقا۔ آپ کا کشف کتنا خالص ہے؟

ایک مرتبہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے دریافت کیا اتوار کی رات تم نے کیا حرکت کی ہے۔ میں نے حیرانگی سے دریافت کیا کون سی؟ آپ نے فرمایا: تم نے چراغ گل کیے بغیر اپنی بیوی سے صحبت کی جبکہ اس وقت تمہارا بچہ ابھی سویا نہیں تھا۔

(عبداللہ التازی لکھتے ہیں) حضرت شیخ کی کرامات بے شمار ہیں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) یہ کتاب تحریر کرنے تک آپ سے لاتعداد کرامات کا صدور ہو چکا ہے۔ ان

حضرات نے جن کرامات کا ذکر کیا ہے۔ وہ ۱۱۲۸ھ سے پہلے کی ہیں اور انہیں میں نے ۱۰ محرم الحرام یعنی عاشورہ کے دن ۱۱۲۹ھ میں حضرت شیخ کی خدمت میں (تصدیق کیلئے) پیش کیا۔

زیادی کے مشاہدات:

معروف فقیہہ سیّد العربی الزیادی نے درج ذیل کرامات تحریر کر کے بھیجی ہیں۔ ان میں سے اکثر کرامات کا میں خود (احمد بن مبارک) عینی شاہد ہوں اور جو میری غیر موجودگی میں صادر ہوئی ہیں ان کے بارے میں میں نے حضرت سے تصدیق کروائی ہے۔ زیادی کی تحریر درج ذیل ہے:

(میں ان کرامات کا تذکرہ کروں گا) جو میرے شیخ 'پیشوا' سیّدی عبدالعزیز دباغ سے صادر ہوئی ہیں۔

میں ایک سرکاری اہلکار کیلئے کتابیں خریدا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے بہت سی کتابیں خرید کرا سے بھجوائیں جس کی قیمت اس نے کتابیں موصول ہونے سے پہلے ہی مجھے بھجوا دی تھی۔ جب کتابیں اسے ملیں تو اسے پسند نہ آئیں۔ اس نے ناراضگی کا اظہار کر کے وہ کتابیں مجھے واپس بھجوا کر یہ ہدایت کی کہ کتابیں ان کے اصل مالکان کو واپس کر کے رقم مجھے بھجوا دو ورنہ بہت برا ہوگا۔ میں سخت پریشان ہوا۔ حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر سارا ماجرا بیان کیا اور یہ بھی بتایا کہ ان کتابوں کے اصل مالکان نے کتابیں واپس لینے سے انکار کر دیا ہے اور میں سرکاری اہلکار کا معاوضہ ادا کرنے کے قابل نہیں ہوں جبکہ وہ نہایت اثر ورسوخ کا مالک ہے۔ میں نے ساری صورتحال کی وضاحت کی تو آپ نے فرمایا: میرے عزیز! ڈرو نہیں! انشاء اللہ عنقریب تمہیں اس سے نجات مل جائے گی۔

(زیادی کہتے ہیں) کچھ دن بعد حاکم وقت نے اس سرکاری اہل کار کو قتل کروا دیا اور حضرت شیخ کے فرمان کے مطابق مجھے اس کی زیادتی سے نجات مل گئی۔

ایک مرتبہ ہمارے شہر میں بڑی خطرناک صورتحال پیدا ہوگئی۔ قاضی شہر میرا دوست تھا مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں اسے کوئی نقصان نہ پہنچے۔ میں اس کے لیے دعائے خیر کروانے کے لیے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ قاضی کو کچھ نہیں ہوگا مگر اس کے سیکرٹری کی ضمانت نہیں دیتا۔ اگرچہ وہ سیکرٹری میرا اور قاضی شہر کا اچھا دوست تھا لیکن میں نے اس کے لیے دُعا نہیں کروائی۔ بعد میں اس سیکرٹری کو قتل کر دیا گیا اور قاضی صاحب بچ گئے۔ یہ مقتول سیکرٹری وہی آدمی تھا جس نے کتابوں کے معاملے میں میرے ساتھ زیادتی کی تھی۔ اس سیکرٹری کے قتل کی خبر عام نہیں ہوئی تھی کہ میں حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا میں نے اس کی موت کا ذکر نہیں کیا بلکہ آپ نے خود ہی دریافت کیا: وہ سیکرٹری مر گیا ہے؟ میں نے عرض کی: جی ہاں۔ آپ نے فرمایا میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا پھر آپ نے دریافت کیا تمہارے پاس اس سیکرٹری کی کوئی کتاب تو نہیں ہے؟ میں نے عرض کی: موجود ہے۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ تمام معاملے کو بخیر و عافیت حل فرما دے گا۔ آپ کے یہ الفاظ سن کر مجھ پر کپکپی طاری ہوگئی۔ گھبرا کر میں نے حضرت کی دست بوسی کرتے ہوئے عرض کی: میرے آقا!

مجھے اس سیکرٹری کے معاملے میں ڈر لگ رہا ہے' حاضرین نے بھی میرے ساتھ مل کر دعائے خیر کی درخواست کی۔
آپ نے فرمایا: تمہاری طلبی ضرور ہوگی لیکن بخیر و عافیت انجام پذیر ہوگی انشاء اللہ!
میں نے اس طلبی کا انتظار شروع کر دیا۔ آخر کار اس سیکرٹری سے تعلق رکھنے والے تمام لوگوں کی طلبی اور تفتیش شروع ہوئی۔ کچھ لوگوں کو گرفتار کر کے سخت سزائیں دی گئیں اور کچھ لوگوں کو قتل کروا دیا گیا۔ کسی کا مال ضبط کیا گیا اور کسی کو دوسرے طریقوں سے ذلیل ورسوا کیا گیا۔ میں اور زیادہ پریشان ہو گیا۔ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتا تو آپ فرماتے: موت نہیں ہے البتہ تنگی ہوگی۔ آخر کار مجھے ''مکناسہ'' لے جانے کیلئے سرکاری نمائندہ پہنچ گیا۔ میں اس کے ہمراہ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے خندہ پیشانی کے ساتھ اس سے ملاقات کی اور اس کے لیے دعائے خیر کی اور میرے بارے میں چند نصیحتیں کیں جنہیں اس نے قبول کیا۔ آپ نے اس نمائندے کے ہاتھ تفتیشی افسر کو سلام بھجوایا اور مجھے تسلی دی کہ تم بخیر و عافیت واپس آ جاؤ گے۔ میں مکناسہ گیا۔ سیکرٹری کی جو کتابیں میرے پاس تھیں وہ انہیں واپس کر دیں۔ انہوں نے رسمی تفتیش کے بعد مجھے واپس جانے کی اجازت دے دی اور میں واپس اپنے وطن ''ماس'' آ گیا۔ اس کے بعد چند درباری خوشامدی لوگوں نے تفتیشی افسر کو میرے خلاف بھڑکا کر مجھ پر یہ الزام عائد کیا کہ میرے پاس اس سیکرٹری کا کچھ مال موجود ہے چنانچہ میرے وطن واپس آنے کے ایک ہفتہ بعد سرکاری نمائندہ دوبارہ میرے پاس آ گیا اور مجھے بتایا کہ جب قاضی مکناسہ کو اس بات کا علم ہوا کہ تمہارا معاملہ بخیر و عافیت ختم ہو چکا ہے تو اس نے تفتیشی افسر کو یہ لکھا ہے کہ وہ تمہیں قاضی کے پاس بھجوائے اور تم ''سلا'' (نامی شہر) میں قاضی صاحب سے ملاقات کرو۔ اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ تم اس قاضی سے ملنا چاہتے ہو یا نہیں؟ میں اس سرکاری نمائندے کو ساتھ لے کر حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے ساری صورتحال حضرت کے گوش گزار کی۔ آپ خاموشی سے سنتے رہے پھر فرمایا: میرا تو خیال ہے کہ تم اس کے ساتھ چلے جاؤ البتہ جاتے ہوئے اپنے ساتھ تیس اوقیے اضافی طور پر لیتے جانا اور یہ رقم تفتیشی افسر کو دینا۔ سرکاری نمائندے نے بھی حضرت کے خیال کی تائید کی۔ میں نے عرض کی: (قاضی میرا دوست ہے) اگر قاضی سے ملنے جانا ہے تو پھر سرکاری نمائندے کے ساتھ جانے کی کیا ضرورت ہے؟ اور بالفرض اگر اس سرکاری نمائندہ کے ساتھ جانا ضروری ہو تو تیس اوقیے ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت ہے؟ حضرت شیخ نے فرمایا: میری بات مان لو۔ لیکن مجھے سرکاری نمائندہ کے باطن کے بارے میں معلوم نہیں تھا کہ وہ مجھے دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہے لیکن جب میں نے اپنی کم علمی اور کم عقلی کے باعث اپنی بات پر اصرار کیا تو حضرت نے صراحتاً ارشاد فرمایا: یہ سرکاری نمائندہ تمہارے ساتھ غلط بیانی کر رہا ہے۔ اس نمائندے نے یہ بات سن کر اسے ہنسی میں اڑا دیا۔ جب ہم شیخ کی بارگاہ سے اٹھنے لگے تو آپ نے فرمایا: کہ تمہاری موت کا خطرہ نہیں ہے البتہ قید ہو سکتی ہے۔
آخر کار میں اس سرکاری نمائندے کے ہمراہ مکناسہ روانہ ہو گیا اور شیخ کے حکم کے باوجود تیس اوقیے اپنے ہمراہ نہیں لے کر گیا۔ جب تفتیشی افسر کے پاس پہنچے تو اس نے مجھے قید کرنے کا حکم دیتے ہوئے کہا: جب تک

میں تمہارے بارے میں سلطان سے مشورہ نہ کرلوں اس وقت تک تم باہر نہیں جاسکتے۔ عام طور پر مجھ سے پہلے جن لوگوں کے بارے میں سلطان سے مشورہ کیا گیا تھا ان میں سے اکثر کو قتل کروادیا گیا تھا۔ اس لیے میں مزید خوف زدہ ہوگیا اور میں نے یہ سوچ لیا کہ میرے قتل کا وقت قریب آ گیا ہے۔ جب تفتیشی افسر سلطان کے دربار میں پہنچا تو اسی وقت مقتول سیکرٹری کے بعض رشتہ دار مشہور صوفی بزرگ سیّدی ابوالعباس سبتی کا پیراہن بطور تبرک وسفارش لے کر دربار میں پہلے سے موجود تھے۔ سلطان نے اس کی برکت سے مقتول سیکرٹری کے مقدمے سے متعلق تمام لوگوں کو معاف کر دیا۔ اس طرح حضرت شیخ کی برکت سے مجھے خلاصی نصیب ہوئی۔ البتہ مجھے تیس اوقیہ کے برابر ایک قیمتی شے کے عوض میں مزید قید رکھا گیا۔ اگر میں تیس اوقیے ادا کر دیتا تو مجھے مکمل رہائی مل جاتی اس وقت مجھے حضرت شیخ کی ہدایت یاد آئی اور میری بے قراری میں اضافہ ہوگیا۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم کے نتیجے میں اور حضرت شیخ کی برکت سے مجھے اس آزمائش سے نجات عطا فرمائی۔

ایک مرتبہ میں مغرب کی نماز کے بعد حضرت شیخ کے خانہ اقدس کی طرف گیا اور دروازے پر دستک دیے بغیر باہر بیٹھا رہا۔ آپ اوپری منزل سے نیچے اترے تو سیڑھیاں اترنے کی آہٹ سنائی دی۔ آپ نے میرا نام پکارا تو میں نے جواب دیا۔ آپ نے فرمایا: تم ایک گھنٹہ سے یہاں بیٹھے ہوئے ہو؟ میں نے عرض کی: جی ہاں۔ حالانکہ اس وقت تاریکی چھا چکی تھی۔ میں نے دروازے پر دستک بھی نہ دی تھی اور نہ کسی کو اپنی آمد کی اطلاع دی تھی۔ جب آپ نیچے تشریف لائے تو میں نے آپ کی دست بوسی کا شرف حاصل کیا۔

ایک دفعہ میں نے گھر کی بجائے کسی اور جگہ پر رات بسر کی۔ اگلے دن آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے دریافت کیا: کل رات تم کہاں رہے تھے؟ میں نے غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے عرض کی اپنے گھر میں۔ آپ نے فرمایا: کیا تم کل رات فلاں جگہ پر نہیں رہے؟ میں نے عرض کی: جی نہیں آپ نے فرمایا: اگر تم نے سچ نہ بولا تو میں کل رات کی ساری کارگزاریاں بیان کرنا شروع کر دونگا۔ یہ سن کر مجھے بہت شرمندگی ہوئی میں نے آپ کی دست بوسی کی اور عرض کیا آپ بجا ارشاد فرمارہے ہیں۔

ایک مرتبہ مدرسے میں ایک شخص جو حضرت کے مرتبہ ومقام سے ناواقف تھا' نے ''شیخ کی عظمت وشان'' کے موضوع پر میرے ساتھ بحث شروع کردی۔ بعد میں جب میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا کہ وہ کون شخص تھا جس سے تم بحث کررہے تھے اور تم دونوں نے کیا گفتگو کی؟ میں خاموش رہا۔ آپ نے من وعن وہ ساری گفتگو بیان کردی۔

(زیادی لکھتے ہیں) حضرت شیخ کی کرامات بے شمار ہیں (یہاں پر زیادی کی تحریر ختم ہوگئی)

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) ایک مرتبہ آپ کے سامنے کسی صاحب کا تذکرہ چھڑ گیا۔ میں نے عرض کیا کہ وہ صاحب آپ سے بڑی عقیدت رکھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: ایسا نہیں ہے اگر تمہیں آزمائش مقصود ہو تو اس کے سامنے یہ ظاہر کرنا کہ گویا تم نے میری عقیدت مندی ترک کر دی ہے پھر دیکھنا وہ کیا کہتا ہے؟ کچھ عرصہ بعد

میری اس شخص سے ملاقات ہوئی تو میں نے اس سے کہا کہ میں بڑی عجیب صورتحال کا شکار ہو گیا ہوں۔ میں نے یوں ظاہر کیا جیسے حضرت شیخ سے قطع تعلقی اختیار کر لی ہے۔ وہ کہنے لگا کہ یہی بات میں نے تم سے پہلے کہی تھی اور پھر اپنی باطنی خباثت ظاہر کرنے لگا۔ میں نے اس سے کہا میں تمہارے باطن کا حال جاننا چاہتا تھا جو ظاہر ہو گیا۔ اس پر وہ بہت شرمندہ ہوا۔ بعد میں جب میں نے حضرت شیخ کے سامنے اس بات کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: یہ بات میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دی تھی۔

ایک مرتبہ میں حضرت شیخ کی رہائش گاہ کی اوپری منزل کے کمرے میں بیٹھا آپ کے ساتھ تبادلہ خیال میں مصروف تھا کہ اچانک آپ کی اہلیہ کے رونے کی بلند آواز سنائی دی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی صدمے کی وجہ سے وہ گھر میں چکر کاٹ رہی ہیں۔ پتہ چلا کہ ابھی انہیں اپنے بھائی کی وفات کی اطلاع ملی ہے جو کسی اور شہر میں مقیم تھا۔ آپ نے اوپر سے جھانک کر اہلیہ سے کہا: تمہارا بھائی ابھی زندہ ہے‘ اس کی موت کی اطلاع غلط ہے۔ لیکن آپ کی اہلیہ شدت غم کی وجہ سے روتی رہیں۔ بعد میں حضرت شیخ کا فرمان درست ثابت ہوا اور آپ کی اہلیہ کا وہ بھائی آج تک زندہ ہے۔

ایک مرتبہ حضرت شیخ کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ راستے میں آپ نے ایک شخص کو دیکھا جو ولایت کے ایک نام نہاد دعویدار کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ آپ کو دیکھ کر وہ شخص اٹھ کر آپ کے پاس آیا اور عرض کی: یا سیّدی عبدالعزیز! میرا بھائی گم ہو چکا ہے‘ آپ مجھے اس کے بارے میں بتائیں کہ آیا وہ زندہ ہے یا مر چکا ہے؟ فلاں حضرت (یعنی ولایت کے نام نہاد دعویدار) نے یہ بتایا ہے کہ وہ زندہ ہے۔ حضرت شیخ نے پہلوتہی کی کوشش کی لیکن اس شخص کا اصرار جاری رہا۔ آپ نے فرمایا کہ اب تم اصرار کر رہے ہو تو سچی خبر سنو۔ الحاج عبدالکریم سبکی پر اللہ رحم کرے۔ اس کے بارے میں تمہیں اطلاع وہ شخص دے گا جس نے اس کی نماز جنازہ پڑھی ہو گی کیونکہ سلطان نے اسے قتل کروا دیا ہے۔ بعد میں آپ کا بیان درست ثابت ہوا۔

حضرت شیخ کے باغ میں ایک شخص ماہانہ تنخواہ کے عوض ملازمت کرتا تھا۔ وہ شخص حکومت سے چھپتا پھر رہا تھا۔ اس ملازم کا ایک بھائی اسے نقصان پہنچانا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض گزار ہوا کہ میرے بھائی کو میرے حوالے کر دیں۔ شیخ نے انکار کر دیا۔ شیخ نے اسے منع کیا کہ تم اسے نقصان نہ پہنچاؤ لیکن وہ نہ مانا۔ یہاں تک کہ کوتوال سے یہ شکایت کی کہ (حکومت کو مطلوب) میرا بھائی حضرت عبدالعزیز دباغ کے ہاں ملازم ہے اور وہ اسے میرے حوالے نہیں کر رہے۔ کوتوال نے اپنا سپاہی میرے پاس بھیجا۔ میں اس وقت آپ کی خدمت میں حاضر تھا۔ سپاہی نے حضرت سے کہا: کوتوال کے پاس چلیں۔ آپ نے فرمایا: میں؟ اس نے عرض کی جی ہاں۔ آپ نے فرمایا: ٹھیک ہے۔ میں تو ایک عام اور غریب آدمی ہوں۔ اور مجھے فرمایا تم بھی میرے ساتھ چلو۔ ہم دونوں کوتوال کی طرف چل پڑے۔ یہ دیکھ کر سپاہی بہت شرمندہ ہوا۔ اس نے عرض کی ہمیں آپ کے ملازم کی ضرورت ہے کیونکہ اس کے بھائی نے اس کے خلاف شکایت کی ہے۔ اگر آپ اسے

ہمارے حوالے کر دیتے ہیں تو آپ کو جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا: کہ میں تمہیں نہیں روکتا۔ وہ سپاہی اس ملازم کو لے کر چلا گیا لیکن صرف ایک مہینے کے بعد اس کی شکایت لگانے والا اس کا بھائی چل بسا اور وہ خادم دوبارہ آپ کے ہاں ملازم ہو گیا۔

ایک مرتبہ ''بنو بزتاسن'' قبیلے کے افراد نے سلطان کے خلاف بغاوت کر دی۔ ایک سرکاری اہلکار نے اس صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ''تازہ'' کے رہنے والوں کے خلاف سازش کرتے ہوئے ایک جھوٹا خط تیار کیا جس کے مطابق ''تازہ'' کے رہنے والوں نے ''بزتاسن'' قبیلے سے تعلق رکھنے والے باغیوں سے سلطان کے خلاف مدد مانگی تھی۔ اور پھر یہ جھوٹا خط سلطان کے سامنے پیش کر دیا۔ سلطان یہ خط سن کر سیخ پا ہو گیا۔ پہلے اس نے اہل تازہ پر فوج کشی کا ارادہ کیا لیکن پھر کچھ سوچ کر اس اہلکار کو قید کرنے کا حکم دیا۔ جب اس بات کی اطلاع اہل تازہ کو ہوئی اور ان کے قبیلے کا ایک شخص مشورے کیلئے حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ اہل تازہ کو کیا کرنا چاہئے؟ کیا وہ سلطان کے خوف سے جلاوطنی اختیار کر لیں؟ آپ نے انہیں مشورہ دیا۔ اگر تم اس پر عمل کا وعدہ کرو تو میں تمہیں اس کا مشورہ دوں؟ انہوں نے عرض کی یا سیّدی ہم آپ سے رہنمائی حاصل کرنے کیلئے ہی حاضر ہوئے ہیں۔ آپ نے فرمایا: پھر تمہیں چاہئے کہ تم سلطان سے ملو۔ ہاں! سلطان سے پہلے اس کے وزیر سے ضرور مل لینا۔ انہوں نے آپ کے مشورے پر عمل کیا اور پہلے وزیر سے ملے۔ وزیر انہیں اپنے ہمراہ لے کر سلطان کے پاس گیا اور ان کی تعریف کرتے ہوئے انہیں بغاوت کے الزام سے بری الذمہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ لہٰذا سلطان نے اس سرکاری اہلکار کو قتل کرنے کا فرمان جاری کیا جو اسی انجام کا مستحق تھا۔

اسی طرح کا ایک واقعہ ''فاس'' میں پیش آیا۔ ۱۱۳۰ھ میں شوال المکرّم کے مہینے میں فاس کے سرکاری اہلکاروں میں سے بیس افراد قتل کر دیئے گئے۔ جب تفتیش کا آغاز ہوا تو ایک شخص مشورے کیلئے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا: تم فرار نہیں ہونا بلکہ خود کوتوال کے پاس جاؤ اور اس سے کہو میں آپ کے سامنے موجود ہوں آپ جو حکم دیں گے میں اس پر عمل کرونگا۔ اس شخص نے آپ کے مشورے پر عمل کیا جب وہ کوتوال کے پاس گیا تو کوتوال نے اس سے کہا۔ اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو ''ینج'' نامی گاؤں میں جا کر تیر اندازوں کے دستے میں شامل ہو جاؤ۔ وہ شخص دوبارہ مشورے کیلئے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے اسے مشورہ دیا کہ تم فوراً وہاں چلے جاؤ (اس شخص نے اس پر بھی عمل کیا) اس کے جانے کے کچھ دن بعد وہ کوتوال اپنے ساتھیوں سمیت قتل ہو گیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو حضرت شیخ کی برکت سے محفوظ رکھا۔

اس نوعیت کے معاملات میں آپ کا طریق مبارک یہی تھا کہ اگر کوئی شخص راہ فرار اختیار کرنے کے بارے میں آپ سے مشورہ کرتا تو آپ اسے حکومتی اہلکاروں سے بذات خود ملنے کا مشورہ دیتے جس کے نتیجے میں اس شخص کو فائدہ ہوتا۔ اگر اس نوعیت کے دیگر واقعات کا بھی تذکرہ کیا جائے تو بات بہت طویل ہو جائے گی۔

ایک مرتبہ ایک حاکم کو سلطان نے معزول کر دیا۔ اس نے اپنے عہدے کی بحالی کیلئے دعا کی درخواست بھجوائی۔ آپ نے دعا فرمائی۔ کچھ عرصہ بعد وہ حاکم دوبارہ اپنے عہدے پر بحال ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد آپ نے اسی حاکم کو چند حفاظ کا ٹیکس معاف کرنے کی سفارش بھجوائی جس پر اس نے انکار کر دیا۔ (کچھ دن بعد) اس حاکم کا بھائی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تا کہ آپ کی دعا کی برکت سے وہ بھی اپنے بھائی کی طرح اچھا عہدہ حاصل کرے۔ آپ نے اسے خوشخبری دی کہ تم اپنے بھائی کے عہدے پر فائز ہو گے اور ایسا ہی ہوا۔ آپ کی سفارش رد کرنے کے کچھ دن بعد اس حاکم کا انتقال ہو گیا اور اس کا بھائی اس کے عہدے پر فائز ہوا جس نے آپ کی ارسال کردہ سفارشات کے مطابق عملدرآمد کیا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) حضرت شیخ سے واقفیت کے بالکل ابتدائی دنوں کی بات ہے۔ میری بیوی مشہور فقیہہ علامہ محمد بن عمر سلجماسی کی صاحبزادی تھی جو مشہور بزرگ مولائے ادریس کی درگاہ کے امام و خطیب تھے۔ میں ان کے مرتبہ و مقام سے بخوبی آگاہ تھا۔ ان کی صاحبزادی اور اپنی اہلیہ کی ذہانت اور حسن معاشرت کی وجہ سے میں اس سے شدید محبت کرتا تھا۔ وہ بہت سی ظاہری خوبیوں سے بھی آراستہ تھی۔ جب حضرت کو میرے والہانہ لگاؤ کا علم ہوا تو آپ نے دریافت کیا: کیا تم مجھ سے زیادہ محبت کرتے ہو یا اپنی بیوی سے؟ میں نے عرض کی: اپنی بیوی کے ساتھ۔ میں معذور تھا کیونکہ مجھے حضرت شیخ کی عظمت اور روحانی مرتبہ و مقام سے واقفیت نہیں تھی۔ آپ اس جواب سے ناخوش ہو گئے اور آپ اس کے حقدار بھی تھے کیونکہ جب کسی مرید کے دل میں اللہ اس کے رسول یا اپنے شیخ سے زیادہ کسی اور کی محبت ہوگی اس وقت تک وہ کچھ حاصل نہیں کر سکتا۔ آپ اس بات کے خواہش مند تھے کہ میں اس کیفیت سے باہر آ جاؤں لیکن میری حالت درست نہ ہوئی اور آخر کار تقدیر کا لکھا پورا ہو کر رہا۔

۲۷ رمضان المبارک ۱۱۲۵ھ کی صبح میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دوران گفتگو آپ نے فرمایا: اولیاء کے ساتھ تعلق قائم کرنا زہر کھانے کی مانند ہے۔ فلاں بزرگ نے مرید کو اپنا بنانے کے لیے اس کی بیوی اور بچے کو بھی باقی نہیں رہنے دیا۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں آپ کا اشارہ نہیں سمجھ سکا۔ اس واقعہ کے چند دن بعد میری بیوی سخت بیمار ہو گئی اور آخر کار اللہ کو پیاری ہو گئی۔ حضرت شیخ اسکی بیماری کے دوران ضروری ادویات و دیگر ساز و سامان بھجواتے رہے اور اس سے شفاء کا وعدہ بھی کرتے رہے لیکن بعد میں آپ نے مجھے بتایا اس سے مراد آخرت کی شفاء تھی۔ بیوی کی وفات کے بعد مجھے بچے سے والہانہ لگاؤ ہو گیا کیونکہ یہ بچہ اس کی نشانی تھی۔ میں جب بھی بچے کو دیکھتا محبت اور زیادہ ہوتی۔ آخر بیوی کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد وہ بچہ بھی راہی ملک عدم ہوا۔ اس کے بعد میں نے مرحومہ کی بہن کے ساتھ شادی کر لی جو ظاہری حسن کے ساتھ باطنی فضل و کمال میں بھی اپنی مثال آپ تھی۔ اس نے مجھے اپنا گرویدہ بنالیا۔ کچھ عرصہ بعد اس کا بھی انتقال ہو گیا اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مجھے حضرت شیخ کی کامل محبت عطا فرما دی جس سے بلند اور کوئی محبت نہیں ہے۔

ایک دن میں آپ کی خدمت میں حاضر تھا آپ محبت الٰہی کے حصول اور اس کے طریق کار پر گفتگو فرما رہے تھے میں نے آپ سے بہت سے سوالات کیے۔ جن کے آپ نے جوابات عنایت فرمائے میں نے اس مکالمے کو تحریری صورت میں محفوظ کر لیا جسے آپ اس کتاب کے مطالعے کے دوران ملاحظہ فرمائیں گے۔

اس کے بعد آپ نے مسکراتے ہوئے فرمایا: تم بتاؤ تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ اللہ تعالیٰ نے تمہیں دو بیویاں عطا کی تھیں۔ تم نے ان دونوں سے شدید محبت کی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو اپنی رحمت کی طرف منتقل کر دیا اور عالم برزخ میں دیگر ارواح کے ساتھ رکھا ہے۔ (ان دونوں کی وفات کے باوجود) تم اب بھی ان دونوں سے شدید محبت کرتے ہو۔ مجھے صرف یہ بتا دو کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں کو برزخ سے کہاں منتقل کرے تا کہ ان کی محبت تمہارے دل سے زائل ہو جائے؟

آپ کی یہ بات سن کر میری عجیب کیفیت ہوئی اور یوں لگا کہ جیسے ایک لمحے میں ان کی محبت میرے دل سے ختم ہو گئی ہے اور حضرت شیخ کی محبت میرے دل میں گھر کر چکی ہے۔ اس کے بعد میں نے مرحومہ کی دوسری بہن سے نکاح کیا لیکن اب والہانہ محبت کی کیفیت پیدا نہیں ہوئی اور یہ اہلیہ بفضل خدا ابھی تک حیات ہیں۔

ایک مرتبہ حضرت شیخ کی اہلیہ محترمہ امید سے ہوئیں تو انہوں نے آپ کی خدمت میں درخواست کی کہ مجھے اب مزید اولاد کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں الحمد اللہ صاحب اولاد ہوں۔ گھر کے کام کاج کی کثرت کی وجہ سے میں اس قابل نہیں ہوں۔ میرے پاس کوئی باندی بھی نہیں ہے جو میرا ہاتھ بٹا سکے۔ اگر آپ لوگوں کے بیان کے مطابق واقعی ولی ہیں تو اللہ سے دعا کریں کہ میرا یہ حمل ضائع ہو جائے۔ (آپ خاموش رہے۔) حضرت شیخ اکثر اپنی اہلیہ کو یہ ہدایت کیا کرتے تھے کہ رات سوتے وقت چہرہ ڈھانپ کر سویا کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں کوئی ایسی چیز نظر آ جائے جسے دیکھنا تمہارے بس سے باہر ہو۔ ایک مرتبہ نصف رات گزرنے کے بعد اچانک آنکھ کھلنے پر انہوں نے اپنے چہرے سے کپڑا ہٹایا تو حضرت شیخ کے ہمراہ تین رجال غیب کو بیٹھے دیکھا۔ انہیں دیکھ کر وہ اس قدر خوف زدہ ہوئیں کہ ان کا حمل ضائع ہو گیا۔

آپ کے اہل خانہ سمیت اکثر زائرین نے آپ کی اس کرامت کا مشاہدہ کیا ہے کہ بعض اوقات آپ پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی جس کے بعد آپ کا جسم یوں محسوس ہوتا جیسے آپ کی روح جسم مبارک سے پرواز کر گئی ہے۔ ایسی حالت میں آپ کے جسم میں سانس، ہونٹ یا کسی ایک رگ میں ہلکی سی حرکت کا احساس بھی نہیں ہو پاتا تھا۔ ایک مرتبہ اسی خاص کیفیت کے دوران ایک شخص آپ کی زیارت کیلئے آیا تو اس نے کیا دیکھا کہ ایک نور بلند ہوتے ہوئے پھیل رہا ہے۔ وہ نور آسمانی بجلی سے زیادہ چمکدار تھا لیکن اسکی رفتار کم تھی۔ اس نے باہر آ کر لوگوں کو اس بارے میں بتایا تو دیگر لوگوں نے بھی اس کیفیت کا مشاہدہ کیا۔ اگلے دن جب وہ شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کے ہمراہ باغ کی جانب کھڑا ہوا تو آپ نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور فرمایا: کل ایک ایسی بات ظاہر ہو گئی جسے میں پوشیدہ رکھا کرتا تھا۔ میں نے عرض کی: اس واقعہ کے بارے میں،

میں نے سن رکھا ہے لیکن اس میں راز کی بات کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا: یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نور مبارک تھا اور پھر آپ نے سارا واقعہ بیان کیا۔

میرا ایک دوست حافظ قرآن تھا اور مشہور قبیلے "صبانیہ" سے تعلق رکھتا تھا۔ ۱۱۲۷ھ میں جب اس قبیلے پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے تو میں نے اپنے دوست کے بچاؤ کیلئے ایک صاحب کو سفارش کرنے کیلئے حاکم وقت کے پاس بھیجا۔ جس نے میرے دوست کو رہا کر دیا۔ دو برس بعد وہ حاکم معزول ہو گیا۔ نئے حاکم کے بارے میں مجھے پختہ یقین تھا کہ وہ کبھی بھی میری سفارش رد نہیں کرے گا۔ میں نے اسی دوست کے بارے میں سفارش بھجوائی تو نئے حاکم نے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ میں نے اعلیٰ حکام کے ہاں سفارش کرنے کا ارادہ کیا تو حضرت شیخ نے فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ نے اسے رہائی نصیب کرنا ہوتی تو نچلے درجہ کا اہلکار تمہاری سفارش مان لیتا۔ لیکن میں نے اعلیٰ حکام کو سفارش بھجوا دی۔ یکے بعد دیگرے کئی رقعے بھجوائے۔ اعلیٰ حاکم حامل رقعہ کے ساتھ نہایت خندہ پیشانی سے پیش آتا اور یہ وعدہ کرتا کہ میں یہ مسئلہ حل کردوں گا لیکن اس دوست کو رہائی نصیب نہ ہوئی۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن اللہ کی مرضی کے بغیر کیا ہوسکتا ہے۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ شیخ کا کشف صحیح تھا۔

ایک دفعہ میں آپ کے ہمراہ باغ میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں شیخ عبدالسلام بن مشیش کی اولاد میں سے ایک سیّد صاحب بھی موجود تھے۔ انہوں نے شیخ کو بتایا کہ شیخ عبدالسلام کی قبر مبارک جس پہاڑ پر واقع ہے اس کے پاس رہنے والے ایک شخص نے (جو سیّد نہیں ہے) شیخ کی اولاد میں سے ایک سیّدہ خاتون سے نکاح کر لیا ہے اس لیے بعض سادات نے سلطان کے دربار میں اس شخص کے خلاف شکایت کی ہے اور سلطان اس بات کو سخت ناپسند کرتا ہے کہ کوئی غیر سیّد کسی سیّدہ سے نکاح کرے اس لیے سلطان نے اس شخص کو گرفتار کر لیا ہے اور اسے قتل کی دھمکی دی ہے۔ آپ نے فرمایا: کیا وہ شخص اللہ سے نہیں ڈرتا اس نے کیسے مولائے عبدالسلام کی پوتی سے نکاح کیا ہے؟ سیّد صاحب نے عرض کی: آپ اس شخص کو کیسے جانتے ہیں جبکہ آپ نے کبھی اس شخص کو دیکھا ہے نہ کبھی اس شخص سے ملے ہیں بلکہ میرا غالب گمان یہ ہے کہ اس سے پہلے کبھی آپ نے اس کا تذکرہ بھی نہیں سنا ہوگا۔ اس کی جس خامی کا آپ نے ذکر کیا ہے اس سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ غرضیکہ وہ سیّد آپ کا کشف دیکھ کر بہت حیران ہوا اور اس نے آپ کی دست بوسی کی۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے الحاج عبدالقادر التازی کے رجسٹر میں حضرت شیخ کے اپنے دست مبارک کے ہاتھوں یہ تحریر لکھی ہوئی دیکھی ہے جس کے مطابق حضرت شیخ بچپن میں محمد بن عمر دلائی نامی ایک صاحب کے ہاں ملازم تھے۔ جب وہ حج کے لئے روانہ ہوئے تو حضرت شیخ الحاج عبدالقادر التازی کے ہاں ملازم ہو گئے۔ یہی الحاج عبدالقادر التازی بیان کرتے ہیں: ایک دن شیخ نے رجسٹر لے کر اس پر لکھا: "تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جو یکتا ہے۔ سیّدی محمد بن عمر آج قضائے الٰہی سے انتقال کر کے اللہ کے جوارِ رحمت میں منتقل ہو گئے ہیں۔ یہ بات عبدالعزیز بن دباغ نے ۱۱۱۸ھ میں ذیقعد کے مہینے میں تحریر کی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس

پر اپنا خاص لطف و کرم کرے۔'' آمین

الحاج عبدالقادر التازی کہتے ہیں۔ میں نے بلند آواز سے دریافت کیا کہ کیا لکھ رہے ہو؟ الحاج کے بقول اس سے پہلے بھی آپ کی بعض کرامات ظاہر ہو چکی تھیں۔ میری آواز سن کر آپ نے فرمایا: کچھ نہیں اور قلم لے کر اپنی لکھی ہوئی عبارت کو خراب کر دیا اور فرمایا میں نے کچھ نہیں لکھا۔ کچھ عرصہ بعد حاجیوں کا قافلہ واپس آیا تو انہوں نے ہمیں سیّدی عبدالعزیز دباغ کی تحریر کے مطابق شیخ محمد بن عمر دلائی کے انتقال کی خبر سنائی۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے حضرت شیخ سے دریافت کیا: اس کم عمری میں آپ کو کیسے پتہ چلا حالانکہ آپ کو ۱۱۲۵ھ میں ''فتح'' نصیب ہوئی تھی (اور یہ واقعہ ۱۱۱۸ھ کا ہے) آپ نے فرمایا: میں نے جب پہلی مرتبہ شیخ خضر کی وصیت کے مطابق ان کی امانت پہنی تھی۔ اسی وقت مجھے ''فتح'' حاصل ہو گئی تھی لیکن اس فتح کا دائرہ کار محدود تھا۔ اگر میں کسی بات کی طرف توجہ کرتا تو وہ ظاہر ہو جاتی لیکن اس کے علاوہ اور کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) شیخ نے بالکل صحیح بات بیان کی ہے کیونکہ اس زمانے کے اور بھی بہت سے لوگوں نے آپ کی مختلف کرامات کا ذکر کیا ہے۔ مثال کے طور پر جب آپ محمد بن عمر دلائی کے ہاں ملازم تھے۔ ایک دن آپ بھٹی کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے بھٹی کے منتظم نے آپ کو برا بھلا کہا جس سے شیخ ناراض ہو گئے اور فرمایا: تم جتنی بھی لکڑیاں جلا لو اللہ کی قسم یہ بھٹی کبھی گرم نہیں ہوگی۔ چنانچہ وہ صبح سے لے کر عصر کے وقت تک لکڑیاں جلاتے رہے اور بہت سی لکڑیاں ضائع کیں مگر بھٹی (یعنی پانی گرم کرنے والے انگیٹھی) گرم نہ ہوئی اور پانی بدستور ٹھنڈا رہا۔

(حمام کے مالک محمد بن عمر دلائی اس وقت وہاں موجود نہیں تھے) جب وہ آئے اور انہیں اصل قصے کا علم ہوا تو انہوں نے عرض کی: اے میرے آقا! کیا آپ مجھ سے جدا ہونا چاہتے ہیں جبکہ میں آپ سے محبت کرتا ہوں اور میں نے ہمیشہ آپ سے اچھا سلوک کیا ہے؟ جس شخص نے آپ کو ڈانٹا ہے اس کا تو کوئی نقصان نہیں ہوا جبکہ میں بے گناہ بھی ہوں۔ اور واقعی وہ حضرت شیخ کے ساتھ نہایت لطف و مہربانی کا سلوک کیا کرتے تھے۔ شیخ فرماتے ہیں: مجھے ان کی بات سن کر بہت شرم آئی کیونکہ میں کام کروں یا نہ کروں وہ مجھے تنخواہ ضرور دیا کرتے تھے اور ساتھ میں یہ بھی کہتے تھے کہ میں نے آپ کو ملازمت کے لئے اپنے پاس نہیں رکھا بلکہ صرف برکت کے لئے رکھا ہوا ہے۔ اس پر میں نے لکڑی پکڑ کے انگیٹھی میں ڈالی اور کہا: تمہیں تو آگ جلانے کا طریقہ بھی نہیں آتا۔ یہ دیکھو پانی گرم تو ہو رہا ہے۔ انہوں نے دیکھا تو واقعی پانی گرم تھا اس پر سب لوگ بہت حیران ہوئے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) یہ کرامت میں نے اور بھی بہت سے لوگوں کی زبانی سنی ہے۔ ایک مرتبہ حضرت شیخ نے خود بھی اس کا تذکرہ فرمایا تھا۔

کرامت:

آپ کی ایک بڑی کرامت یہ ہے کہ اگرچہ آپ نے ظاہری طور پر بالکل بھی علم حاصل نہیں کیا لیکن میں

نے جب کبھی جس مسئلے کے بارے میں آپ سے علماء کی آراء کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے نفس مسئلہ کے بارے میں علماء کے اتفاق' اختلاف اور علمائے ظاہر و باطن کے اقوال کی پوری وضاحت فرمائی۔ لگا تار چھ برس تک میں اس بات کا تجربہ کرتا رہا۔

ایک مرتبہ ''سوق الخمیس'' میں' میں نے آپ سے بجلی کی گرج اور کڑک کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے اس کی ایسی وضاحت فرمائی کہ جو آپ ہی کے شایان شان ہے۔ اسی طرح آپ گزرے ہوئے حالات و واقعات کو بھی تفصیلاً بیان کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ دوران گفتگو ۶۵۴ھ میں ''قریظہ'' میں ظاہر ہونے والی آگ کا ذکر چل نکلا جس کے بارے میں امام قرطبی نے اپنی کتاب ''التذکرہ''، حافظ ابن حجر نے اپنی کتاب ''الفتن'' اور ابوشامہ اور امام نووی نے اپنی تصانیف میں اس کا ذکر کیا ہے اور اپنی معلومات کے مطابق اس واقعہ کی تفصیل بیان کی ہے۔ ابھی میں نے یہ ارادہ ہی کیا تھا کہ آپ کے سامنے ان حضرات کی روایات بیان کروں کہ آپ نے از خود ان کا تذکرہ شروع کر دیا۔ آپ نے پورا واقعہ' اس کے بارے میں علماء کے اقوال اور (اپنے کشف کے مطابق) اس کا اصل سبب بھی بیان کیا۔ اس کے ہمراہ آپ نے اس شخص کا نام بھی ذکر کیا جسے آخرت میں اس آگ کا عذاب دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ آپ نے اور بھی بہت سے اسرار بیان کئے جنہیں یہاں ذکر نہیں کیا جا سکتا اور جنہیں سن کر میں بہت حیران ہوا۔ یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ حضرت شیخ کی کرامات بے شمار ہیں۔ اپنے اور دیگر پیر بھائیوں کے علم کے مطابق اگر میں ان کرامات کا ذکر کروں تو یہ ایک ضخیم کتاب کی شکل اختیار کر جائے گی۔ اس لیے ہم اسی پر اکتفا کرتے ہوئے اس گفتگو کو یہیں سمیٹتے ہیں جس طرح ہم نے کرامات کے باب کے آغاز میں آپ کی ایک بڑی کرامت کا تذکرہ کیا تھا اسی طرح اس بحث کے اختتام پر بھی ایک عظیم الشان کرامت ذکر کریں گے۔

جب مجھے آپ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر آپ کے عرفان (علم لدنی) اور ایمان کے فیضان (روحانی مشاہدات) کا مشاہدہ کرنے کا اتفاق ہوا تو میں نے صحیح اور جھوٹی روایات کے بارے میں آپ سے سوالات کرنے شروع کئے۔ اس وقت میرے پاس امام جلال الدین سیوطی کی تصنیف لطیف ''الدر المنتشرہ فی الاحادیث المشتھرۃ'' موجود تھی۔ یہ ایک زبردست کتاب ہے جس میں امام سیوطی نے لوگوں میں مشہور تمام روایات کو حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا ہے۔ آپ نے ہر روایت کی حیثیت متعین کی ہے۔ آپ صحیح روایت کو صحیح اور جھوٹی روایت کو غلط قرار دیتے ہیں۔ ہر عالم دین کے پاس یہ کتاب ضرور ہونی چاہئے۔

میں نے حضرت شیخ سے درج ذیل روایت کے بارے میں دریافت کیا:

۱- اُمِرْتُ اَنْ اَحْكُمَ بِالظَّاهِرِ وَاللّٰهُ يَتَوَلَّى السَّرَائِرَ - (اللآلی المصنوعہ للسیوطی)

(مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ظاہر کے مطابق فیصلہ دوں' باطن کا نگران اللہ تعالیٰ ہے۔)

حضرت شیخ نے فرمایا: یہ حدیث نہیں ہے۔ امام جلال الدین سیوطی کی بھی یہی رائے ہے۔

۲-كُنْتُ كَنْزًا لَا اُعْرَفُ-(اللآلی المصنوعہ للسیوطی)

(میں ایک ایسا خزانہ تھا جسے پہچانا نہیں جا سکتا تھا۔)

اس روایت کے بارے میں حضرت نے فرمایا کہ یہ حدیث نہیں ہے۔امام سیوطی کی بھی یہی رائے ہے۔

۳-اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْعَقْلَ

(اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے عقل کو پیدا کیا۔)

اس روایت کے بارے میں حضرت نے فرمایا: یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں ہے۔امام احمد بن حنبل کی بھی یہی رائے ہے۔امام ابن جوزی نے اس روایت کو جھوٹ قرار دیا ہے۔ابن تیمیہ کی بھی یہی رائے ہے۔امام زرکشی کے نزدیک بالاتفاق موضوع ہے۔امام سیوطی نے (موضوع روایات سے متعلق اپنی تصنیف "اللآلی المصنوعہ فی الاحادیث الموضوعۃ" میں اس روایت کا تذکرہ کیا ہے۔البتہ "الدرر المنتثرہ" میں اس کی تائید میں ایک اور روایت ذکر کی ہے (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) یہ روایت جناب حسن بصری سے منقول ہے اور ابن حجر نے اپنی شرح میں یہ بات ذکر کی ہے کہ خواجہ حسن بصری سے منقول اس نوعیت کی روایات قابل اعتبار نہیں ہیں۔

۴-اِتَّخِذُوْا عِنْدَ الْفُقَرَاءِ يَدًا فَاِنَّ لَهُمْ دَوْلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ

(فقراء کے پاس بیٹھا کرو کیونکہ انہیں قیامت کے دن ایک خاص مقام نصیب ہوگا۔)

حضرت نے فرمایا یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نہیں ہے۔امام سیوطی نے "الحاوی للفتاویٰ" میں یہی بات ذکر کی ہے۔

۵-اُحِبُّ الْعَرَبَ لِثَلَاثٍ: لِاَنِّيْ عَرَبِيٌّ، وَالْقُرْاٰنَ عَرَبِيٌّ، وَكَلَامَ اَهْلِ الْجَنَّةِ عَرَبِيٌّ

(تین وجہ سے میں عربوں سے محبت کرتا ہوں کیونکہ میں عربی ہوں، قرآن عربی زبان میں ہے اور اہل جنت کی زبان بھی عربی ہوگی۔)

حضرت نے فرمایا: یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نہیں ہے۔ امام ابن جوزی نے اپنی کتاب "الموضوعات" میں اسے موضوع قرار دیا ہے۔امام حاکم نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے لیکن حاکم کی اس رائے پر تنقید کی گئی ہے۔

۶-عُلَمَاءُ اُمَّتِيْ كَاَنْبِيَاءِ بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ

(میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی مانند ہیں۔)

حضرت نے فرمایا کہ یہ حدیث نہیں ہے۔امام سیوطی نے "الدرر المنتثرہ" میں اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔

۷-اَكْرِمُوْا عَمَّاتِكُمُ النَّخْلَ

(اپنی پھوپھی کھجور کی عزت کرو۔)

آپ نے فرمایا: یہ حدیث نہیں ہے۔ ابن حجر نے اپنی ''شرح'' میں سیوطی نے ''اللآلی المصنوعہ'' اور ابن جوزی نے ''الموضوعات'' میں اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔

۸- أَنَا أَفْصَحُ مَنْ نَطَقَ بِالضَّادِ

(مترجم کے خیال میں اس روایت کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں جو درج ذیل ہیں:

ا- میں عربوں میں سب سے زیادہ فصیح ہوں (اور یہی قرین قیاس محسوس ہوتا ہے)

ب- ''ضاد'' کے مخرج کی سب سے زیادہ صحیح ادائیگی میں کر سکتا ہوں۔''

حضرت نے فرمایا یہ حدیث نہیں ہے۔ ابن کثیر ابن جزری اور سیوطی کی بھی یہی تحقیق ہے۔

(احمد بن مبارک فرماتے ہیں) قصہ مختصر یہ کہ میں نے حضرت سے بہت سی روایات کے بارے میں دریافت کیا اور ہمیشہ آپ کی رائے علماء کی تحقیق کے مترادف ہوتی تھی۔ اس سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ احادیث پر گفتگو کے دوران آپ ''بخاری و مسلم'' کی روایات میں اس بات کی تمیز کر لیتے تھے کہ اس روایت کو صرف بخاری نے نقل کیا ہے۔ مسلم نے نہیں اور اس دوسری روایت کو صرف مسلم نے نقل کیا ہے۔ بخاری نے نہیں۔

ایک طویل عرصے تک آزمائش کے بعد مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ آپ علم حدیث کے بہت بڑے ماہر ہیں اور صحیح و غلط روایات میں تمیز کر سکتے ہیں۔ ایک دن میں نے آپ سے دریافت کیا: آپ کو کس طرح پتہ چلتا ہے (کہ کوئی جملہ حدیث ہے یا نہیں ہے)؟ آپ نے فرمایا: سردی کے موسم میں جب کوئی شخص بات کرتا ہے تو اس کے منہ سے بھاپ نکلتی ہے لیکن گرمی کے موسم میں ایسا نہیں ہوتا بالکل یہی کیفیت اس شخص کی ہے جو نبی اکرم کا فرمان پڑھتا ہے کیونکہ اس وقت اس کے منہ سے ''نور'' نکلتا ہوا محسوس ہوتا ہے لیکن جو شخص کسی اور کی بات بیان کر رہا ہو تو اس کے منہ سے نور نکلتا ہوا محسوس نہیں ہوتا۔

ایک مرتبہ میں نے یہی سوال کیا تو فرمایا: جب چراغ میں تیل ڈال دیا جائے تو اس کی روشنی زیادہ ہو جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جب کوئی عارف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام سنتا ہے تو اس کے اپنے انوار میں زیادہ روشنی آ جاتی ہے اور معرفت میں اضافہ ہوتا ہے لیکن جب وہ حدیث کے علاوہ کوئی اور بات سنتا ہے تو اپنی حالت پر قائم رہتا ہے۔

جب میرے سامنے یہ بات واضح ہو گئی کہ آپ کی معرفت نہایت قوی ہے اور احادیث کی پہچان کے حوالے سے آپ کسی پہاڑ کی مانند ثابت قدم ہیں تو میں نے قرآن کی آیات اور احادیث کے بارے میں آپ کی آزمائش شروع کی کیونکہ آپ قرآن کے حافظ نہیں تھے اس لیے بعض اوقات میں آپ کے سامنے کوئی آیت پڑھ کے دریافت کرتا کہ یہ حدیث ہے یا قرآن ہے؟ آپ فرماتے یہ قرآن ہے پھر میں آپ کے سامنے کوئی حدیث پڑھ کے دریافت کرتا کہ یہ قرآن ہے یا حدیث ہے؟ آپ فرماتے: یہ حدیث ہے۔

ایک مدت تک میں اسی نوعیت کے سوالات کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک دن میں نے یہ جملہ پڑھا۔

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطٰى: هِيَ صَلٰوةُ الْعَصْرِ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ۔

(البقرۃ ۲، ۲۳۸)

"سب نمازوں کی محافظت کیا کرو۔ اور بالخصوص درمیانی نماز کی (جو عصر کی نماز ہے) اور اللہ کے حضور سراپا ادب و نیاز بن کر قیام کیا کرو۔"

میں نے دریافت کیا یہ قرآن ہے؟ یا حدیث ہے؟ آپ نے فرمایا: اس میں کچھ الفاظ قرآن کے ہیں اور کچھ حدیث کے اور واقعی اس جملے میں "وهى صلوٰة العصر" کے الفاظ حدیث ہیں اور باقی تمام الفاظ قرآن کی آیت ہے۔ جب میں نے آپ سے یہ سوال کیا تھا۔ اس وقت علماء کی ایک جماعت آپ کی خدمت میں حاضر تھی۔ ہم سب آپ کی یہ بات سن کر بہت حیران ہوئے۔

جب یہ بات میرے سامنے واضح ہوگئی کہ آپ قرآن اور حدیث میں فرق محسوس کر سکتے ہیں تو پھر مجھے خیال آیا کہ قرآن اور احادیث قدسیہ کے درمیان موجود فرق کے بارے میں آپ کا امتحان لینا چاہئے لہٰذا میں نے آپ کے سامنے ایک حدیث قدسی بیان کی اور دریافت کیا: یہ قرآن ہے یا حدیث ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ قرآن نہیں ہے اور یہ وہ حدیث بھی نہیں ہے جو تم پہلے ذکر کیا کرتے تھے بلکہ یہ حدیث کی دوسری قسم ہے۔ اسے "حدیث ربانی" کہا جاتا ہے۔

میں نے یہ بات سن کر آپ کی دست بوسی کی اور عرض کی میں یہ درخواست کرونگا کہ آپ میرے سامنے (قرآن، حدیث قدسی اور حدیث) ان تینوں میں فرق بیان کریں کیونکہ حدیث قدسی اللہ کا کلام ہونے کے اعتبار سے قرآن سے مشابہت رکھتی ہے جبکہ دوسری طرف یہ عام حدیث سے بھی مشابہت رکھتی ہے کیونکہ اس کی تلاوت کا حکم نہیں دیا گیا۔ آپ نے فرمایا: یہ تینوں اگرچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہونٹوں سے برآمد ہوئے ہیں اور ان میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ انوار بھی پائے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے درمیان فرق موجود ہے۔

۱- قرآن کا نور قدیم ہے جس کا تعلق اللہ کی ذات کے ساتھ ہے کیونکہ اللہ کا کلام قدیم ہے (لہٰذا یہ نور بھی قدیم ہوگا)۔

۲- حدیث قدسی میں موجود نور کا تعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارکہ کے ساتھ ہے اور یہ قرآن کے نور کی مانند نہیں ہے کیونکہ قرآن کا نور قدیم ہے جبکہ یہ قدیم نہیں ہے۔

۳- حدیث میں پایا جانے والا نور آپ کی ذات (بشری) کا نور ہے۔ روح کا نہیں ہے۔

لہٰذا نور کی تین قسمیں ہونگی اور اپنی نسبت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہوں گی۔ قرآن کے نور کی نسبت ذات باری تعالیٰ کے ساتھ ہوگی۔ حدیث قدسی کے نور کی نسبت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارکہ کی طرف ہوگی جبکہ جو حدیث قدسی نہیں ہے اس کے نور کی نسبت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات

(بشری) کی طرف ہوگی۔

میں نے عرض کیا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارکہ کے نور اور ذات (بشری) کے نور میں کیا فرق ہے؟ آپ نے فرمایا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات (بشری) کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے اور تمام بنی نوع انسان بھی مٹی سے پیدا کیے گئے ہیں جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کا تعلق ملاء اعلیٰ کے ساتھ ہے اور ساری مخلوق میں سے ملاء اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی سب سے زیادہ معرفت رکھتے ہیں (اصول یہ ہے کہ) ہر شے اپنی اصل کی طرف لوٹ جاتی ہے اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارکہ کے نور کا تعلق ذات باری تعالیٰ کے ساتھ ہوگا جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات (بشری) کے نور کا تعلق مخلوق کے ساتھ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ احادیث قدسیہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی عظمت شان اور اللہ کی رحمت کے اظہار کو واضح کیا گیا ہے۔ نیز اللہ کی بادشاہی کی وسعت اور اس کے انعامات کی کثرت کے بارے میں مخلوق کو آ گاہ کیا گیا ہے۔

چنانچہ پہلی قسم کی حدیث قدسی کی مثال یہ روایت ہوگی جسے حضرت ابوذر غفاری نے نقل کیا ہے:

''اے میرے بندو! اگر تم سب انسان اور جنات مل کر'' الخ

اظہار رحمت سے متعلق حدیث قدسی کی مثال یہ روایت ہوگی!

''میں نے اپنے نیک بندوں کیلئے (اجر وثواب) تیار کر رکھا ہے۔''

تیسری قسم جس میں وسعت ملک اور کثرت عطا کا ذکر ہو اس کی مثال یہ روایت ہے:

اللہ تعالیٰ اگر ہر وقت (اپنے بندوں کو) عطا کرتا رہے تو (اس کے خزانے میں) کوئی کمی نہیں آئے گی۔''

احادیث قدسیہ کے مضامین کا تعلق عام طور پر روح کے علوم کے ساتھ ہوتا ہے جبکہ عام احادیث کے مضامین کا تعلق دنیاوی زندگی کے معاملات کے ساتھ ہوتا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: حدیث قدسی اللہ کا کلام ہے یا نہیں؟ سیّدی دباغ نے فرمایا: نہیں، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہے۔ میں نے دریافت کیا: اسے اللہ تعالیٰ کی طرف کیوں منسوب کیا جاتا ہے؟ نیز اس طرح کی روایات میں متکلم کی ضمیر کیوں استعمال کی جاتی ہے؟ احادیث قدسیہ کو اللہ کا کلام ہونا چاہئے اگرچہ ان کے الفاظ معجزہ نہیں ہیں اور نہ ہی ان کے الفاظ کی تلاوت کا حکم دیا گیا ہے؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: یہ احادیث ایک خاص کیفیت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ہوتی ہیں اور اس کیفیت میں غیب، شہادت اور باطن، ظاہر کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ گویا زبان حال سے یہ الفاظ روایت کیے جاتے ہیں۔

سیّدی دباغ نے ایک مرتبہ اس کا یہ جواب دیا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے انوار کی تین کیفیات ہیں: اگر انوار ایک خاص حد تک محدود رہیں تو اس صورت میں عام حدیث صادر ہوگی، اس سے زیادہ پھیل جائیں تو وہ حدیث قدسی ہوگی اور بہت زیادہ پھیل جائیں تو یہ نزول قرآن کا وقت ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ یہ جواب ارشاد فرمایا: اگر یہ کلام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار سے باہر ہو تو قرآن ہوگا اگر

اختیار کے اندر ہو لیکن عارضی انوار پھیل جائیں تو حدیث قدسی ہوگی اور اگر انوار مستقل ہوں تو یہ عام حدیث ہوگی کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر کلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے انوار موجود ہوتے ہیں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: کیا حدیث قدسی اور قرآن کے درمیان فرق صرف کشف کے ذریعے معلوم کیا جاسکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہر عقل مند شخص قرآن اور غیر قرآن کے درمیان فرق محسوس کرسکتا ہے۔ میں نے دریافت کیا: مشرکین عرب کو کیسے پتہ چلا کہ یہ اللہ کا کلام ہے کیونکہ وہ اپنی جبلت کے تحت زیادہ سے زیادہ یہ اندازہ کرسکتے تھے کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے مگر یہ کسی فرشتے کا کلام بھی ہوسکتا تھا؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: اللہ تعالیٰ کے کلام کی مثال شاہی فرمان کی مانند ہے اور اس کی مانند رعب ودبدبہ کسی اور کلام کو حاصل نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کے کلام اور مخلوق کے کلام کے درمیان چار اعتبار سے فرق پایا جاتا ہے: پہلی صورت ایسا کلام مخلوق کے بس سے باہر ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا علم محیط ہے جبکہ مخلوق کا علم محدود ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ اللہ کے کلام میں رعب ودبدبہ پایا جائے گا۔ مخلوق کا کلام اس سے خالی ہوگا۔ تیسرا فرق یہ ہے کہ جب فانی حروف کو درمیان سے ہٹا دیا جائے تو کلام الٰہی میں خالص قدیم معانی رہ جائیں گے اور ہر صاحب عرفان شخص ان قدیم معانی کا مشاہدہ کرسکتا ہے۔ چوتھی صورت یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام الٰہی اور غیر کلام الٰہی کے درمیان تحریری اعتبار سے فرق کیا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) سیّدی دباغ کے کلام کی یہ مختصر سی تلخیص تھی۔ شیخ ابوبکر باقلانی نے بھی اپنی تصنیف ''الانتصار'' میں اسی طرح کی باتیں بیان کی ہیں جب میں نے سیّدی دباغ کے سامنے شیخ ابوبکر باقلانی کے کلام کا تذکرہ کیا تو آپ نے کلام الٰہی اور غیر کلام الٰہی کے درمیان ایک پانچویں فرق کی بھی وضاحت کی جو کشف سے تعلق رکھتا ہے جسے تحریر نہیں کیا جاسکتا کیونکہ وہ انسانی عقل سے ماوراء ہے۔

ہم اپنے مقدمے کو یہیں پر ختم کرتے ہوئے سیّدی دباغ کے ملفوظات اور معارف کا تذکرہ شروع کرتے ہیں۔

پہلا باب

احادیث مبارکہ کی تشریح

پہلی حدیث

امام ترمذی، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے حوالے سے روایت کرتے ہیں۔

خرج علینا رسول اللہ وفی یدیہ کتابان فقال للذی فی یدہ الیمنی ھذا کتاب من رب العالمین فیہ اسماء اھل الجنۃ واسماء آبائھم وقبائلھم فلا یزاد فیھم ولا ینقص منھم ابدا، ثم قال للذی فی شمالہ مثلہ فی اھل النار

''ایک دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ کے دونوں ہاتھوں میں دو کتابیں موجود تھیں۔ آپ نے دائیں ہاتھ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: یہ تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے ہے۔ اس میں اہل جنت، ان کے آباؤ اجداد اور قبائل کے نام تحریر ہیں۔ اب ان میں کوئی کمی بیشی نہیں ہو سکتی پھر اس کے بعد آپ نے بائیں ہاتھ میں موجود کتاب کے بارے میں اس طرح کے الفاظ اہل جہنم کے بارے ارشاد فرمائے۔''

ایک اور روایت میں یوں بیان کیا گیا:

فقال بیدہ فنبذھما ثم قال: فرغ ربکم من العباد فریق فی الجنۃ و فریق فی السعیر

''پھر آپ نے ان دونوں کتابوں کو پھینک دیا اور فرمایا تمہارا پروردگار اپنے بندوں کی طرف سے فارغ ہو چکا ہے۔ ان میں سے ایک فریق جنت میں داخل ہوگا اور دوسرا جہنم کا ایندھن ہوگا۔''

حاضرین کی الجھن

حافظ ابن حجر بیان کرتے ہیں۔ اس روایت کی سند حسن ہے۔ بعض لوگوں نے اس روایت کے بارے میں الجھن کا اظہار کیا ہے کیونکہ اس میں قدرت باری تعالیٰ کو ایک ناممکن چیز کے ساتھ متعلق کیا گیا ہے۔ وہ اس طرح کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں دست اقدس میں موجود مختصر کتاب میں تمام اہل جنت کے اسماء کا پایا جانا

عملاً ناممکن ہے اس لیے حاضرین میں سے ایک صاحب نے یہ سوال پیش کر دیا جس کے ضمن میں بعض دیگر نکات بھی شامل تھے۔ (سوال یہ تھا) علماء کرام نے یہ اصول بیان کیا ہے کہ قدرت باری تعالیٰ کا تعلق محال کی بجائے ممکن کے ساتھ ہے جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات منقول ہے۔

انه خرج ذات يوم بكتابين في يديه على اصحابه فقال ان في الكتاب الواحد اسماء اهل الجنة واسماء آبائهم واسماء قبائلهم وعشائرهم' وفي الكتاب الآخر اسماء اهل النار وآبائهم و قبائلهم و عشائرهم

''ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے پاس تشریف لائے تو اس وقت آپ کے دونوں ہاتھوں میں دو کتابیں موجود تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان میں سے ایک کتاب میں اہل جنت' ان کے آباؤ اجداد اور خاندان وقبائل کے نام تحریر ہیں جبکہ دوسری کتاب میں اہل جہنم ان کے خاندان وقبائل کے نام تحریر ہیں۔''

(اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے) کتاب کا ظاہری حجم مختصر ہوگا اور جنتیوں اور جہنمیوں کے اسماء بے شمار ہیں جو اتنے مختصر صفحات میں نہیں سما سکتے تو گویا یہاں ایک بڑی چیز کو چھوٹی میں موجود ثابت کیا گیا ہے حالانکہ نہ تو چھوٹی چیز کو بڑا کیا گیا ہے اور نہ ہی بڑی چیز کو چھوٹا کیا گیا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ آخر وہ کتنا بڑا رجسٹر ہوگا جس میں یہ تمام اسماء تحریر کیے جا سکتے ہیں۔ اس لیے عقلی طور پر یہ بات ناممکن ہے کہ ناموں کی وسعت اور اس کتاب کے حجم کے اختصار کو اپنی اپنی جگہ پر باقی رکھتے ہوئے اس قدر زیادہ نام اس مختصر کتاب میں تحریر کیے جا سکیں۔ (مگر دوسری طرف یہ نکتہ بھی قابل غور ہے) کہ اس بات کی اطلاع نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں جو غلط بیانی یا غلطی دونوں سے معصوم ہیں کیونکہ ان کا قول وحی الٰہی کے تابع ہوتا ہے۔

سید عبدالعزیز دباغ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا: اہل سنت کے علماء کرام نے جو اصول بیان کیا ہے ہم اسی کے مطابق عقیدہ رکھیں گے کہ کسی نبی سے بطور معجزہ اور کسی ولی سے بطور کرامت کوئی ایسی چیز صادر نہیں ہو سکتی جو عقلاً ناممکن ہو (لیکن یہ نکتہ ذہن نشین کر لیں) کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ عقل کو کوئی نکتہ سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے لیکن جب حقیقت حال کی طرف اس کی رہنمائی کی جائے تو عقل اس بات کے امکان کو قبول کر لیتی ہے۔

کتاب کا مفہوم

(پھر آپ نے مذکورہ حدیث کی تشریح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا) اس حدیث میں کتابت سے مراد تحریری شکل نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اوراق کی طرف توجہ فرمائی تو یہ تمام نام آپ کو ان اوراق میں موجود دکھا دیئے۔ اس کی مزید وضاحت یوں کی جا سکتی ہے کہ جس وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسی بھی چیز پر نظر مبارک ڈالتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے تمام حجابات اٹھا لیے

جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کامل ترین روحانی بصیرت عطا فرمائی ہے اور جب یہ روحانی بصیرت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری بصارت کے ساتھ مل جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری آنکھوں کے سامنے سے بھی تمام حجابات ہٹ جاتے ہیں اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی بھی مجوب چیز کو اسی شے میں دیکھ لیتے ہیں جو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے موجود ہو۔ بالفرض اگر اس وقت آپ کے سامنے کوئی دیوار موجود ہو تو آپ دیوار میں اس مجوب چیز کا مشاہدہ فرمائیں گے اگر اس وقت آپ کے سامنے آپ کا دست اقدس ہوگا تو وہی چیز آپ کو اپنے ہاتھ میں نظر آئیگی اور اگر اس وقت آپ کے سامنے کوئی کاغذ موجود ہوگا تو وہ مجوب چیز آپ کو کاغذ میں دکھائی دے گی۔

ایک روایت کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: میرے سامنے اس دیوار میں جنت اور دوزخ دکھائی گئی۔ اس روایت کا بھی یہی مفہوم ہوگا کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کسوف کی ادائیگی کے دوران اپنی توجہ جنت اور دوزخ کی طرف کی تو اس وقت آپ کے سامنے دیوار موجود تھی تو اسی دیوار کے سامنے آپ کو جنت اور دوزخ دونوں کی صورت دکھائی دی۔

اہل جنت اور اہل دوزخ کے اسماء سے متعلق روایت کا مفہوم بھی یہی ہوگا کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل جنت کے اسماء کی طرف توجہ فرمائی تو وہ آپ کے دائیں ہاتھ میں موجود کتاب میں دکھائی دیئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

هذا كتاب من رب العالمين فيه اسماء اهل الجنة و قبائلهم و آبائهم

''یہ کتاب تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے ہے اور اس میں اہل جنت کے اسماء ان کے آباؤ اجداد اور قبائل کے نام درج ہیں۔''

پھر جب آپ نے جہنم کی طرف توجہ فرمائی تو اس وقت آپ کے سامنے بائیں ہاتھ میں کتاب موجود تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہنم اور اس میں موجود افراد کو دیکھ کر ارشاد فرمایا:

هذا كتاب من رب العالمين فيه اسماء اهل النار و آبائهم و قبائلهم

''یہ کتاب تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے ہے اور اس میں اہل جہنم اور ان کے آباؤ اجداد اور قبائل کے نام تحریر ہیں۔''

اگر دیوار میں جنت و دوزخ کے دکھائی دیکھنے پر کوئی اشکال وارد ہو سکتا ہے اور اگر وہاں کوئی اشکال نہیں ہوتا تو یہاں بھی نہیں ہوگا کیونکہ اشکال تو اس وقت وارد ہوگا جب ہم کتابت سے مراد تحریری شکل میں ہونا مراد لیں گے۔ لیکن اگر یہ معانی مراد لیا جائے تو پھر یہ حدیث کے آخری حصے کے ساتھ منسلک نہیں ہو سکے گا کیونکہ اس روایت کے آخر میں اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ اپنی بات پوری کر لینے کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کتابوں کو پرے پھینک دیا تھا (غور کا مقام یہ ہے) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے

بھیجی جانے والی کتاب کو پرے کس طرح پھینک سکتے ہیں۔ خاص طور پر اس وقت جبکہ اس کتاب میں اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں اور دیگر برگزیدہ لوگوں کے اسماء بھی موجود ہوں کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم' اللہ تعالیٰ' اس کے رسولوں اور فرشتوں کی سب سے زیادہ تعظیم کیا کرتے تھے۔

(اب رہا یہ سوال کہ جب یہ نام تحریری صورت میں موجود نہیں تھے تو آپ نے ان کیلئے کتاب کا لفظ کیوں استعمال کیا؟ تو اس کا جواب یہ ہوگا) آپ نے ان اوراق میں نظر آنے والی صورت کو کتاب اس لیے کہا کہ خارجی وجود پر دلالت کرنے کے اعتبار سے وہ کتابت کے مشابہ تھی کیونکہ ''کتابت'' کا لغوی معنی ''اکٹھا کرنا'' ہے۔ لہٰذا کسی بھی مجموعے کو مکتوب کہا جا سکتا ہے کیونکہ فوجی دستوں میں بہت سے سپاہی اکٹھے ہوتے ہیں اس لیے ان دستوں کو ''کتائب'' کہا جاتا ہے اور اس کا واحد ''کتیبہ'' ہے' اس کا معنی مجموعہ ہے۔

(اب یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ اس کتاب کو رب العالمین کی طرف کیوں منسوب کیا گیا جبکہ کتابت سے مراد تحریری شکل نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے) جس روحانی بصیرت کے باعث وہ نام دکھائی دیئے تھے وہ نہ تو عام انسان کے بس میں ہے اور نہ ہی اسے اکتساب کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ صرف عطیہ خداوندی ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کے خاص فضل کی بدولت یوں ظاہر ہوا کہ ایک مختصر شے میں بے شمار اشیاء نظر آ گئیں۔

(یہاں ایک اور سوال پیدا ہوگا' وہ یہ کہ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان تمام اشیاء کی صورتیں اس مختصر چیز میں ظاہر ہوگئی تھیں لیکن تمام صورتوں کو ایک نظم میں کس طرح دیکھا گیا؟ اس کا جواب یہ ہوگا) کہ یہ بات ناممکن نہیں ہے کیونکہ انسانی آنکھ کی پتلی مسور کے دانے کے برابر ہے مگر اس میں وسیع وعریض آسمان دکھائی دے جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ روایت کسی بھی اعتبار سے ناممکن سے متعلق نہیں ہے اور اسی طرح دیگر معجزات بھی ناممکن سے متعلق نہیں ہوا کرتے۔

''سات حروف'' کی تشریح

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے کئی مرتبہ آپ سے اس حدیث کے معنی دریافت کئے۔

ان ھذا القرآن انزل علی سبعة احرف

''بے شک اس قرآن کو سات حروف پر اتارا گیا ہے۔''

آپ نے اس کے بہت سے جوابات عنایت کئے لیکن اس کے باوجود میری تسلی نہیں ہو سکی اور میں کسی جامع اور تسلی بخش جواب کا منتظر رہا۔ اصل الجھن یہ تھی کہ ''حرف'' کا لغوی معانی ظاہر ہے لیکن بعض سورتوں کے آغاز میں آنے والے حروف مقطعات سمجھ نہیں آتے۔ مفسرین نے اس حدیث کی تشریح میں بہت سے اقوال بیان کئے ہیں جن کے مطالعہ کے بعد بے چینی میں اضافہ ہو جاتا ہے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا ایک ہی مقصد ہوگا لیکن شارحین نے اس کے چالیس مختلف معانی بیان کئے ہیں جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے جس کے اصل معنی سے عدم واقفیت کی وجہ سے اتنے بہت سے اقوال ذکر کئے

گئے ہیں اور بالواسطہ طور پر یہ امکان سامنے آتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل مراد ان تمام اقوال سے بھی مختلف ہو۔

اس حدیث کو بہت سے صحابہ نے روایت کیا ہے جن میں حضرت عمر بن خطاب' ہشام بن حکیم' ابی بن کعب' عبدالرحمٰن بن عوف' عثمان بن عفان' عمر بن ابی سلمہ' ابوجہیم' سمرہ بن جندب' عمرو بن العاص' ام ایوب انصاریہ رضی اللہ عنہم شامل ہیں' اور اس کے علاوہ دیگر بہت سے صحابہ نے بھی یہ روایت نقل کی ہے۔ یہاں تک کہ مشہور محدث حافظ ابویعلیٰ موصلی اپنی کتاب ''مسند کبیر'' میں درج ذیل روایت نقل کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے منبر پر کھڑے ہو کر خطبے کے دوران حاضرین سے یہ بات دریافت کی کہ میں تمہیں اللہ کا واسطہ دے کر یہ بات کہہ رہا ہوں کہ تم میں سے جس شخص نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان سن رکھا ہے وہ کھڑا ہو جائے (وہ فرمان یہ ہے)

ان ھذا القرآن انزل علی سبعۃ حرف و کل لشأن

''بے شک اس قرآن کو سات حروف پر نازل کیا گیا اور ان میں سے ہر حرف کی اپنی مخصوص شان ہے۔''

(حضرت عثمان غنی کی یہ بات سن کر) بہت سے حضرات کھڑے ہو گئے جن میں سے ہر ایک اس بات کا اقرار کر رہا تھا کہ اس نے بذات خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی یہ فرمان مبارک سنا ہے۔ (یہ دیکھ کر) حضرت عثمان غنی نے فرمایا: میں نے خود بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی یہ فرمان سن رکھا ہے۔

مشہور محقق حافظ ابوعبیدہ اور علم حدیث کے بعض دیگر ماہرین بھی اس بات کے قائل ہیں کہ یہ روایت حدیث متواتر کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے میں علماء نے اس کے معانی کی وضاحت میں مختلف تشریحات بیان کی ہیں بلکہ بعض اہل علم نے صرف اس حدیث کے معانی کی وضاحت میں کتابیں تحریر کی ہیں جن میں سے ایک حضرت شیخ ابوشامہ ہیں۔

اہلِ علم کی تحقیقات

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس مسئلے سے متعلق جن حضرات کی تحقیق مجھے ذاتی طور پر بڑی پسند آئی ہے وہ یہ چار حضرات ہیں:

ا- لسان المتکلمین قاضی ابوبکر باقلانی' آپ نے اپنی کتاب ''الانتصار'' میں اس موضوع پر انتہائی نفیس بحث کی ہے۔

ب- امام ابن جزری' آپ نے اپنی تصنیف ''النشر'' کی دس فصول میں اس روایت کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی بحث کی ہے اور اس روایت کو نقل کرنے والے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اسماء کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

ج- امام ابن حجر عسقلانی آپ نے اپنی تصنیف ''فتح الباری شرح صحیح البخاری'' میں ''فضائل قرآن'' کے باب میں اس موضوع پر عمدہ اظہار خیال کیا ہے۔

د- امام جلال الدین سیوطی نے اپنی تصنیف ''الاتقان فی علوم القرآن'' میں اس روایت کے معانی کی وضاحت میں ۴۰ مختلف اقوال نقل کیے ہیں۔

اگرچہ میں ان چاروں حضرات کی تحقیقات کا مطالعہ کر چکا تھا اور اس مسئلے کے مختلف پہلو میرے پیش نظر تھے لیکن اس کے باوجود یہ بات واضح نہیں ہو سکی کہ اس فرمان کے ذریعے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد کیا ہے؟ اس لیے میں نے حضرت شیخ سیّدی عبدالعزیز دباغ کی خدمت میں عرض کی۔ میں آپ سے صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد کے بارے جاننا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: انشاءاللہ۔ میں کل تمہیں اس بارے میں جواب دوں گا اور اگلے دن آپ نے جواب مرحمت فرمایا۔ جو بالکل سچ تھا۔ آپ نے فرمایا: میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس حدیث کے مرادی معنی دریافت کیے تو آپ علیہ السلام نے اپنی مراد کی تشریح فرمائی۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں: حضرت شیخ نے یہ معانی میرے سامنے بیان کئے) تو میں تین دن شیخ کے ساتھ بحث میں مصروف رہا اور آپ اس کے معانی کی وضاحت کرتے رہے۔ اس کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ یہ حدیث (معنوی وسعت کے اعتبار) سے نہایت عظیم مرتبے کی حامل ہے۔ اس کی تشریح کے دوران میں نے اس قدر اسرار کا علم حاصل کیا جن کی وضاحت کرنا ممکن نہیں ہے۔ تاہم میں اپنے الفاظ میں ان کا خلاصہ بقدر استطاعت تحریر کر رہا ہوں (جو درج ذیل ہے)

سات انوار کی وضاحت

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں اللہ تعالیٰ نے ایک خاص قوت پیدا فرمائی ہے جس کے انوار سات قسم پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نور کے دو رخ ہیں۔ ایک رخ آپ اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں ہے اور دوسرے پہلو کا تعلق مخلوق کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق سے ہے۔ یہ انوار پہلے رخ (یعنی ذات باری کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق) کے حوالے سے مسلسل بہاؤ کی شکل میں رہتے ہیں اور ان میں کبھی کوئی رکاوٹ نہیں آتی۔ جب اللہ تعالیٰ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کی کوئی آیت نازل کرتا ہے تو اس آیت کے ہمراہ اس پہلے رخ کا کچھ نور موجود ہوتا ہے۔ پہلے رخ سے تعلق رکھنے والا یہ نور مکمل طور پر نازل نہیں ہوتا کیونکہ اس کا تعلق ذات باری تعالیٰ کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق سے ہے اور اس میں کوئی رکاوٹ نہیں آتی اس لیے دیگر مخلوق کے سامنے اس نور کا کچھ حصہ ظاہر ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر آیت کے ساتھ ان ساتوں انوار میں سے کسی ایک نور کا کچھ حصہ موجود ہوتا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے عرض کی: یہ انوار کون سے ہیں جنہیں سات حروف کا نام دیا گیا ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ یہ ہیں:

حرف نبوت' حرف رسالت' حرف آدمیت' حرف روح' حرف علم' حرف قبض اور حرف بسط

(i) حرفِ نبوت:

اس کی علامت یہ ہے کہ آیت مبارکہ میں صبر کا حکم دیا گیا ہو۔ حق کی طرف رہنمائی کی گئی ہو۔ وہ آیت دنیا اور اس کی خواہشات سے گریز کی تعلیم دیتی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبوت طبعی طور پر حق کی طرف مائل ہوتی ہے اور حق بیان کرتی ہے۔ حق کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور اس بارے میں خیر خواہی کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔

(ii) حرفِ رسالت:

اس کی نشانی یہ ہے کہ آیت میں دار آخرت' اس کے درجات' وہاں رہنے والوں کے مقامات اور انہیں حاصل ہونے والے ثواب کا ذکر موجود ہو۔

(iii) حرفِ آدمیت:

اس سے مراد وہ نور ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اولاد آدم کے اندر پیدا کیا ہے اور اسی کی بدولت بنی نوع انسان کو اپنے مخصوص انداز میں گفتگو کرنے کی صلاحیت عطا فرمائی ہے جس کی بدولت انسان کا کلام فرشتوں' جنات اور گفتگو کی صلاحیت رکھنے والی دیگر تمام مخلوقات سے ممتاز ہو جاتا ہے۔ یہ صفت اگرچہ تمام بنی نوع انسان میں مشترک ہے لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں کیونکہ درجہ کمال میں پائی جاتی ہے اس لیے یہ آپ کے سات انوار میں سے ایک ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صفائی اور طہارت کے اعتبار سے سب سے بلند و بالا ہیں اس لیے آپ اس صفت کے اعتبار سے جس مرتبے پر فائز ہیں وہاں تک کسی بھی دوسرے فرد کی رسائی ممکن نہیں ہے۔ مزید برآں کلام کی صلاحیت پیدا کرنے والا نور جب دیگر انوار یعنی نور نبوت' نور رسالت' نور روح' نور علم' نور قبض اور نور بسط کے ساتھ مل جاتا ہے تو کمال کے انتہائی مرتبہ پر فائز ہو جاتا ہے۔ اب کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ان چھ دیگر انوار سے بھی مدد حاصل کرتی ہے اس لیے آپ پر نازل ہونے والی تمام آیات میں یہ نور بھی پایا جائے گا کیونکہ قرآن بنی نوع انسان ہی سے تعلق رکھنے والے ایک گروہ کی زبان یعنی عربی میں نازل ہوا ہے۔

(iv) حرف روح:

اس کی علامت یہ ہے کہ قرآن کی آیت اللہ تعالیٰ کی ذات یا اس کی صفات کے بیان پر مشتمل ہو اور اس میں مخلوق کا کوئی ذکر نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ روح ہمیشہ مشاہدۂ حق میں مستغرق رہتی ہے۔ اس لیے جب اس نوعیت کی کوئی آیت نازل ہوتی ہے تو اس میں نورِ روح موجود ہوتا ہے۔

(v) حرفِ علم:

اس کی علامت یہ ہے کہ کسی آیت میں سابقہ اقوام کے حالات ذکر کیے گئے ہوں جیسے عاد و ثمود یا حضرت نوح، ہود، صالح یا دیگر انبیاء علیہم السلام کی اقوام کے بارے میں کوئی بات بیان کی گئی ہو یا کسی آیت میں کسی بات کی مذمت بیان کی گئی ہو جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ

(البقرہ ۲:۱۶)

''یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی لیکن ان کی تجارت فائدہ مند نہ ہوئی اور وہ (فائدہ مند اور نفع بخش سودے کی) راہ جانتے ہی نہ تھے۔''

مختصر طور پر ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ وہ تمام آیات جن میں واقعات بیان کئے گئے ہیں، وعظ و نصیحت کی گئی ہے یا حکمت آمیز باتیں بیان کی گئی ہیں وہ اسی قسم سے متعلق ہونگی۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں۔ اس حرف کا نور انسان سے جہالت کو دور کر کے اسے عارف اور معرف بنا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر یہ فرض کیا جائے کہ کوئی شخص کسی پہاڑ کی چوٹی پر پیدا ہوا اور اس نے زندگی بھر کسی انسان کو دیکھا تک نہیں پھر جوانی کے عالم میں وہ شخص کسی شہر میں آئے اور اس وقت اس کی باطنی کیفیت یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے حرف علم کے ذریعے اس کی دستگیری فرمائی ہو تو شہر میں رہ کر ساری زندگی علم حاصل کرنے والا کوئی بھی شخص کسی بھی موضوع پر اس شخص کے ساتھ گفتگو نہیں کر سکے گا۔

(vi) حرفِ قبض:

اس کی علامت یہ ہے کہ آیت کریمہ میں کفار و مشرکین کو مخاطب کیا گیا ہو۔ کبھی انہیں تباہی کی نوید سنائی گئی ہو اور کبھی دوسرے طریقوں سے ڈرایا جا رہا ہو جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ

(البقرہ ۲:۱۰)

''اور ان کے دلوں میں بیماری ہے، پس اللہ نے ان کی بیماری کو اور بڑھا دیا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے، اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔''

نور اور ظلمت کی افواج ہمیشہ برسرِ پیکار رہتی ہیں۔ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ ان ظلمتوں کی طرف مبذول ہوتی ہے اس وقت حرف قبض کا یہ نور ظاہر ہوتا ہے اور اس نور میں سے مذکورہ بالا قسم کی آیات سامنے آتی ہیں۔

(vii) حرفِ بسط:

اس کی علامت یہ ہے کہ کسی آیت میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہو۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی

توجہ اللہ کی نعمتوں کی طرف مبذول ہوتی ہے اس وقت بسط کی کیفیت طاری ہوتی ہے اور یہ آیات مقام بسط سے ظاہر ہوتی ہیں۔

سیدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا: ان ساتوں حروف کی یہی پہچان ہے لیکن اگر تفصیلی اعتبار سے جائزہ لیا جائے تو ان ساتوں حروف میں سے ہر ایک حرف کی 366 مختلف وجوہ ہیں۔ اگر میں ہر حرف کی 366 مختلف وجوہ میں سے ہر ایک کا تذکرہ شروع کروں تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے باطن کا سورج سب لوگوں کے سامنے روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے گا لیکن یہ وہ اسرار ہیں جنہیں چھپانا واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل کے تحت جن لوگوں کو فتح کبیر عطا فرماتا ہے وہ ان کا علم حاصل کر لیتے ہیں اور جسے فتح حاصل نہیں ہوتی اس کے لئے مناسب یہی ہے کہ وہ اپنی ظاہری حالت پر ہی باقی رہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے حضرت کے سامنے یہ اشکال پیش کیا کہ اس بارے میں جس قدر روایات منقول ہیں ان سب میں حروف سبعہ سے مراد قرآن کے الفاظ کی ادائیگی کا اختلاف ہے جیسا کہ حضرت عمر کا یہ بیان نقل کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ میں نے ہشام بن حکیم کو قرأت کرتے ہوئے سنا اور ان کی قرأت کا طریقہ اس قرأت سے مختلف پایا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تعلیم فرمائی تھی۔ بعد میں جب ہم دونوں نے اپنا مقدمہ بارگاہ رسالت میں پیش کیا تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کی قرأت کو درست قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

ان هذا القرآن انزل علی سبعة احرف فاقرء وا ماتيسر منه

(صحیح بخاری، ۴:۱۹۰۹، رقم الحدیث: ۴۷۰۶)

''بے شک اس قرآن کو سات حروف پر نازل کیا گیا ہے لہٰذا جسے جو آسان محسوس ہو ویسے قرأت کرے۔''

(میں نے عرض کی: یہ روایت اس بات کی دلیل ہے کہ قرأت کا تعلق الفاظ کی ظاہری ادائیگی کے ساتھ لیکن) آپ کے بیان کے مطابق یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں موجود چند ربانی انوار اور باطنی اوصاف ہیں (اگر واقعی ایسا ہے تو پھر) حضرت عمر اور حضرت ہشام بن حکیم کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہئے تھا جس کے جواب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی وضاحت کرنا پڑتی کہ قرآن سات حروف میں نازل ہوا۔

سیدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا: اس طرح کی روایات میں جس اختلاف کا ذکر کیا ہے وہ باطنی اختلاف کی فرع ہے کیونکہ قبض کی بدولت کسی حروف کو ساکن پڑھا جاتا ہے اس پر پیش پڑھی جاتی ہے۔ اسی طرح زبر حرف رسالت کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے جبکہ زیر کا تعلق حرف آدمیت کے ساتھ ہے۔ ہر آیت کی ایک مخصوص فتح اور متعین ذوق ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) جب میں نے یہ نورانی بیان سنا تو فوراً آپ کے سامنے سورہ فاتحہ اور سورۃ بقرہ کا کچھ حصہ تلاوت کیا۔ آپ نے ان آیات کی ایسی تفسیر بیان کی کہ میں مبہوت رہ گیا پھر میں نے ان آیات کو دوبارہ پڑھا اور قرأت کی ساتوں روایات یعنی نافع' ابن کثیر' ابوعمرو بن العلاء البصری' ابن عامر' عاصم' حمزہ اور کسائی (جو علم قرأت کے سات بڑے ماہر ہیں) کی قرأت میں سے ہر ایک کی مخصوص قرأت کے تحت آیات کو پڑھا تو آپ نے اختلاف رائے کے نتیجے میں معنی میں درآنے والی تبدیلی کی ایسی عظیم الشان تفسیر بیان کی جو نہایت حیرت انگیز تھی۔ اب میرے سامنے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ ان ساتوں قرأت میں باطنی اعتبار سے بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس روایت کے حقیقی مفہوم کو میں 30 برس سے تلاش کر رہا تھا وہ اب مجھے مل گیا۔ مجھ سے پہلے حافظ ابن جوزی بھی کم و بیش تیس برس کے عرصے تک اس کے حقیقی مفہوم کے حصول میں سرگرداں رہے اس کے بعد انہیں اس کے مفہوم کا پتہ چلا تو انہوں نے دوسروں کو بھی اس کی بابت بتایا۔ اس کی پوری تفصیل ''الانتصار'' کے مصنف (ابوبکر باقلانی نے) بیان کی ہے لیکن ان کا تمام تر بیان الفاظ کی ظاہری ادائیگی تک محدود ہے۔ انہوں نے ان باطنی انوار کا کوئی ذکر نہیں کیا جن کی وجہ سے الفاظ کی ادائیگی میں اختلاف سامنے آتا ہے۔ الغرض یہ کہ اس روایت کے مفہوم کی وضاحت میں دیگر علماء نے جو تحقیقات پیش کی ہیں ان کی حیثیت درخت کے سائے کی سی ہے اور ہمارے شیخ طریقت نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر کے جو وضاحت بیان کی ہے اس میں درخت' اس کی جڑوں' شاخوں اور پھل سب کا ذکر موجود ہے۔

سات حروف کی ذیلی اقسام

سیّدی عبدالعزیز دباغ ارشاد فرماتے ہیں۔ اگر میں چاہوں تو اس بیان کی وضاحت میں سات کتابیں املاء کرواسکتا ہوں لیکن افشائے راز سے بچنے کیلئے ایسا نہیں کرونگا۔ اسی طرح جب آپ نے میرے سامنے آیات کی تشریح کرتے ہوئے یہ بات ارشاد فرمائی کہ اس آیت میں ساتوں حروف میں سے ایک حرف کا کوئی نہ کوئی جز پایا جاتا ہے تو میں نے عرض کی: کہ آپ ان ساتوں حروف کے اجزاء کی بھی تشریح فرما دیں اور ان حروف سے مسائل کی تفریع کے طریق کار کی بھی وضاحت کر دیں تا کہ ان سے مکمل فائدہ حاصل کیا جا سکے۔

آپ نے ارشاد فرمایا: ان ساتوں حروف میں سے ہر ایک حرف کے مزید سات اجزاء ہیں۔ یوں ان ساتوں حروف کے مجموعی طور پر 49 اجزاء ہوں گے۔

1- حرف آدمیت:

حرف آدمیت کے اجزاء درج ذیل ہیں:

(i) آدمیت کا پہلا جزو ظاہری اعتبار سے کامل حسین ہونا ہے یعنی انسان کے اعضاء اور نقوش نہایت خوبصورت ہوں۔

(ii) انسانی جسم کے ظاہری منافع مرتبہ کمال تک پہنچے ہوئے ہوں جیسے حواس خمسہ یعنی انسان کی بینائی' قوت سماعت' سونگھنے اور چکھنے کی صلاحیت مکمل طور پر درست ہو۔ اس طرح آواز' حروف کی ادائیگی سب کچھ بالکل ٹھیک ہو۔

(iii) انسان کے جسم کا باطنی حصہ یعنی دل دماغ جگر' تمام رگیں وغیرہ درست کام کرتے ہوں۔

(iv) باطنی اعتبار سے انسان کامل طور پر حسین ہو (یعنی تمام اچھی عادات وخصائل کا مالک ہو)

(v) مردانگی۔ مردانگی ہی آدمیت کا کمال ہے کیونکہ اسی صفت کی وجہ سے انسان دوسرے کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کے برعکس نسوانیت خود دوسروں سے جلد متاثر ہو جاتی ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو اپنی (بندگی) کے لیے پیدا کیا تھا اور باقی تمام اشیاء حضرت آدم کی ضروریات کی تکمیل کیلئے پیدا کی تھیں جن میں عورت بھی شامل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو اپنے لیے پیدا کیا تھا اس لیے اسے اپنے اسرار عطا فرمائے اور زمین میں اپنا خلیفہ مقرر کیا اور ہمیشہ کیلئے اولاد آدم میں سے مردوں کو اپنی خلافت کیلئے مقرر فرمایا۔

(vi) انسان کے جسم سے شیطانی حصے کو نکال دیا جائے کیونکہ اسی صورت میں حرف آدمیت کامل تصور ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک کو چاک کر کے اس میں سے ایمان وحکمت بھرا گیا تھا۔

(vii) عقل کا کامل ہونا۔ وہ اس صورت میں کہ عقل میں کوئی فتور نہ ہو اور یہ معرفت کے حصول کی بہترین صلاحیت سے بہرہ مند ہو۔

یہ حرف آدمیت کے سات اجزاء ہیں اور ان ساتوں اجزاء کا سب سے زیادہ کامل ترین مجموعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ آپ کے علاوہ اور کسی کو بھی ان امور میں آپ سے زیادہ (بلکہ آپ کے برابر) کمال نصیب نہیں ہوا۔

2-حرفِ قبض:

(i) اس کا سب سے پہلا جز' محسوس کرنے کی وہ صلاحیت ہے جو انسان کے پورے جسم میں پھیلی ہوئی ہے اور اسی کی بدولت انسان کے جسم کا ہر ایک حصہ خیر سے اسی طرح لذت حاصل کرتا ہے جیسے انسان کی زبان شہد کی لذت کو محسوس کرتی ہے اور اسی صلاحیت کی بدولت انسان کے جسم کا ہر ایک حصہ شر سے اسی طرح بیزاری محسوس کرتا ہے جیسے انسان کی زبان ''حنظل'' (نامی کڑوے پھل) کی کڑواہٹ سے بیزاری محسوس کرتی ہے۔

(ii) انصاف کرنا۔ یہ قبض کا ایک ایسا جز ہے جس کے بغیر قبض کامل نہیں ہوتی کیونکہ ہم نورانی قبض کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں اور نورانی قبض میں اگر انصاف موجود نہ ہو تو پھر یہ نورانی کی بجائے ظلمانی قبض کی شکل اختیار کر جائے گی اور ایسا شخص اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا مستحق قرار پائے گا۔

(iii) متضاد چیز سے نفرت کرنا۔ ایسا شخص (خیر کی) جملہ متضاد اشیاء سے نفرت کرے گا اور کوئی ایک متضاد خامی بھی اس کے اندر اسی طرح نہیں آ سکے گی جیسے سفیدی اور سیاہی یا قیام اور نشست بیک وقت اکٹھے نہیں ہو سکتے۔

(iv) ایسا شخص حق بات کہنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرے گا اگرچہ وہ حق کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو اور اس بارے میں کسی کی ملامت کی پرواہ نہیں کرے گا۔

(v) شرعی احکام پر عمل پیرا ہونا۔ کیونکہ ہم نورانی قبض پر گفتگو کر رہے ہیں اس لئے اگر کوئی شخص شرعی احکام کی مخالفت کرتا ہو تو وہ ظلمانی قبض کا شکار ہو گا اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا مستحق قرار پائے گا۔

(vi) اپنے ہم جنس (نیک) لوگوں کی طرف مکمل میلان رکھنا اور اپنے اندر بھی ان لوگوں کی کیفیت کی مانند کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرنا جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اگر کسی شخص کی زبانی یہ بات سن لیتے: اللہ حق ہے، وہ ہمارا خالق و رازق ہے، وہ ایک ہے، اس کی بادشاہی میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس جملے کا اثر اپنے قلب اطہر پر محسوس کرتے جس کے نتیجے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرح اور کشادگی کا احساس ہوتا اور اس کلام کا ''سر'' ایک مخصوص کیفیت کی شکل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر طاری ہو جاتا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس اس کلام کے نور کو اپنے اندر جذب کر لیتی۔ جس طرح کسی متضاد چیز سے نفرت ضروری ہے اسی طرح کسی ہم جنس کی جانب مکمل میلان بھی ضروری ہے۔

(vii) گرفت کی مکمل قوت۔ جب انسان کسی ایک چیز کو گرفت میں لے تو اس کے ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ ہم عام فہم مثال کے ذریعے اس کی وضاحت یوں کر سکتے ہیں جیسے ایک شخص دس چیزوں کو پکڑے اور پھر ان میں سے ایک گر جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کی گرفت مکمل نہیں ہے لیکن اگر اس سے کوئی ایک چیز بھی نہیں گرتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی گرفت مکمل ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی چیز کو مستقل طور پر اپنی گرفت میں نہیں رکھ سکتا تو اس کی گرفت بھی کمزور شمار ہو گی۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ قبض کے اجزاء میں ایک جز اپنے ہم جنس کی طرف مکمل میلان رکھنا اور دوسرا جز متضاد چیز سے نفرت کرنا ہے اگر یہ دونوں کیفیات مستقل طور پر انسان کے اندر موجود رہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی گرفت مضبوط ہے، ان دونوں کیفیات کی مستقل بقا کیلئے گرفت کا کامل ہونا ضروری ہے۔

3- حرفِ بسط:

(i) اس کا پہلا جز کامل خوشی ہے جو درحقیقت باطن میں موجود ایک نور ہے اور جس شخص کے باطن میں یہ نور موجود ہو گا اس کے باطن میں کینہ، حسد، تکبر، بخل اور عداوت باقی نہیں رہیں گے کیونکہ یہ اور ان جیسی دیگر منفی صفات کی موجودگی میں کامل خوشی حاصل نہیں ہو سکتی۔ جب انسان کے اندر ایمان کے نور کے ہمراہ کامل خوشی کی کیفیت بھی پیدا ہو جائے تو انسان میں ساری مثبت صفات پیدا ہو جاتی ہیں کیونکہ اس خوبی کی

مثال ایک پاکیزہ زمین پر نازل ہونے والی بارش کی مانند ہے اور اس خوبی کے نتیجے میں تمام پاکیزہ اخلاق انسان کے اندر پیدا ہو جاتے ہیں۔

(ii) شر کی بجائے خیر انسان کے اندر جاگزین ہو جائے۔ یہ ایک ایسا نور ہے جس کی موجودگی میں نیکی انسان کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہے۔ ایسا انسان ہر طرح کی نیکی اور نیک لوگوں سے محبت کرنے لگتا ہے یہاں تک کہ اس کے تمام خیالات کا مرکز بھی صرف اور صرف نیکی ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے ساتھ عمدہ سلوک کرے تو یہ اس کے احسان کو کبھی نہیں بھولتا۔ اس کے برعکس اگر کسی شخص نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہو تو کچھ عرصے بعد اسے بھلا دیتا ہے اور پھر اس زیادتی کا خیال بھی اسے نہیں آتا۔ یہاں تک کہ اگر کچھ عرصے کے بعد آپ اسے پرکھنے کی کوشش کریں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ اس کے دل میں کوئی کینہ یا بغض باقی نہیں ہے اور وہ بالکل اسی طرح خوش و خرم ہوگا جیسے اس کے ساتھ کبھی کوئی زیادتی نہیں ہوئی' اور یہی کیفیت بسط کا کمال ہے۔

(iii) ظاہری حواس کا کشادہ ہو جانا: یہ ایک ایسی لذت ہے جو حواس سے متعلق رگوں کو کشادہ کر دیتی ہے جس کے نتیجے میں حواس کو حاصل ہونے والے ادراک کی کیفیت ان رگوں میں بھی محسوس ہوتی ہے اور اسی لذت کے ذریعے بسط کامل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ دیکھنے کے حس میں ایک لذت پائی جاتی ہے جس کی بدولت انسان خوشنما چیزوں کی طرف مائل ہوتا ہے اور نتیجے میں عشق اور یکسوئی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح سننے کی حس میں بھی لذت پائی جاتی ہے جس کی بدولت خوبصورت آوازیں اور بہترین نغمات کانوں میں رس گھولتے ہیں اور انسان وجد میں آ کر جھومنے لگتا ہے۔ اسی طرح دیگر تمام حواس میں بھی یہی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ ہر ایک حس میں کسی بھی شے کو محسوس کرنے کی صلاحیت کے ساتھ ایک اور مزید خوبی بھی پائی جاتی ہے جس کی بدولت انسان کسی عمدہ اور بہترین شے سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

ظاہری حواس کی کشادگی ''حرف بسط'' کا جز ہے اور ظاہری حواس کا کمال ''حرفِ آدمیت'' کا جز ہے۔ ان دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ ظاہری حواس کی کشادگی کی صورت میں حواس سے متعلق رگیں کھل جاتی ہیں اور ان کے اندر کسی چیز سے لطف اندوز ہونے کی اضافی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر یہ اضافی صلاحیت موجود نہ ہو تو محض ادراک کے ذریعے انسان کسی چیز سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا جیسے بہت سے لوگ دیکھنے کی حس کی مدد سے بہت سے خوبصورت مناظر دیکھتے ہیں لیکن اس کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور بہت سے لوگ بہت خوبصورت آوازیں سننے کے باوجود ان سے متاثر نہیں ہوتے۔ اس لئے ان رگوں کی کشادگی کی بدولت بسط میں کمال حاصل ہوتا ہے۔

(iv) باطنی حواس کی کشادگی: اس میں بھی وہی کیفیت ہوگی جو سابقہ قسم میں بیان کی جا چکی ہے۔ فرق صرف یہ

ہے کہ ان کیفیات کا تعلق باطنی حواس کے ساتھ ہوگا۔

(v) بلند مرتبے کا حصول: کیونکہ انسان جس وقت حرف آدمیت اور حرفِ قبض کے اجزاء سے آراستہ ہو جائے اور اس کے اندر حرف بسط کے مذکورہ بالا چار اجزاء بھی موجود ہوں تو اسے اس بات کا احساس نصیب ہوتا ہے کہ اسے یہ تمام خصوصیات کسی خاص خوبی کے پیش نظر عطا کی گئی ہیں کیونکہ یہ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی ہیں۔ اس لئے اس شخص کو یہ احساس ہوگا کہ وہ یقیناً کوئی منفرد اور نمایاں شخصیت کا مالک ہے۔ اس لئے ہر بڑے آدمی کو نہ صرف اچھے اخلاق کا مظاہرہ کرنا چاہئے بلکہ اسے اچھے کام انجام دینے کی کوشش کرنی چاہئے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

۱- وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (بنی اسرائیل، ۱۷: ۷۰)

''اور بے شک ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی۔''

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

۲- لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (التین، ۹۵: ۴)

''بے شک ہم نے انسان کو بہترین (اعتدال اور توازن والی) ساخت میں پیدا فرمایا ہے۔''

لہٰذا جب انسان کو اس بات کا احساس ہوگا کہ وہ ایک بلند مرتبے کا مالک ہے تو اس کا بسط بھی کامل ہوگا۔

(vi) اچھے طریقے سے درگزر کرنا: لہٰذا ایسا شخص اپنے ساتھ ہونے والی ہر زیادتی اور ظلم سے درگزر کرے گا کیونکہ ہم نورانی بسط پر گفتگو کر رہے ہیں اس لئے اپنی قدر و منزلت کے احساس کے ساتھ دوسروں سے درگزر کرنے کا جذبہ بھی نہایت ضروری ہے کیونکہ اگر کوئی شخص اپنی قدر و منزلت کا احساس کرتے ہوئے بھی دوسروں کے ساتھ زیادتی کرے گا تو اس کا اپنی قدر و منزلت کا احساس نورانی کی بجائے ظلمانی ہوگا اور ایسا شخص اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا مستحق ہوگا۔ لہٰذا بسط کے ضروری اجزاء میں دوسروں سے درگزر کی صلاحیت بھی ایک بنیادی رکن ہے۔

(vii) تواضع: اسے بھی اسی سبب کے تحت اجزاءِ بسط میں شامل کیا گیا ہے جس سبب کی بدولت درگزر کرنے کو بسط کا حصہ بنایا گیا تھا۔ کیونکہ حرف بسط کا مالک بلند مرتبے کا حامل ہوتا ہے اس لئے اسے چاہیے کہ اپنے ہم جنس افراد کے ساتھ تواضع اور انکساری کا سلوک کرے کیونکہ اگر وہ خود کو نمایاں کرنے کی کوشش کرے گا تو اس کے اندر تکبر داخل ہو جائے گا جس کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا مستحق قرار پائے گا۔

یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ حرف آدمیت، حرفِ قبض اور حرفِ بسط کے تمام اجزاء نبی اور غیر نبی، کافر اور مسلمان، ہر شخص میں پائے جاتے ہیں لیکن (انبیاء کرام میں بالعموم اور بالخصوص) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں یہ اجزاء اپنے مرتبہ کمال کی حد تک پائے جاتے ہیں اور یہ مرتبہ کسی اور کو نصیب نہیں ہوتا۔ حرف آدمیت کے اجزاء میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے شیطانی حصے کے اخراج سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا

شرح صدر ہے اور عام افراد میں یہ تمام اجزاء صرف ایک خاص حد تک پائے جاتے ہیں۔ عام انسانوں میں شیطانی حصے کے اخراج سے مراد بے حیائی اور قباحت کا اخراج ہوگا تاکہ وہ شخص برے اخلاق سے محفوظ رہے۔ عام افراد کیلئے شق صدر ممکن نہیں ہے کیونکہ یہ صرف نبوت کے خصائص میں سے ایک ہے۔ اسی طرح حرفِ قبض میں بلند ترین نورانی قبض نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین کو اپنے اپنے مخصوص مرتبہ ومقام کے اعتبار سے اس نورانی قبض کا ایک محدود حصہ نصیب ہوتا ہے۔ کمال کسی کو بھی حاصل نہیں ہوسکتا کیونکہ انتہائی کمال صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے لیکن اگر کوئی شخص شریعت محمدیہ کے احکام کی پیروی نہیں کرتا' اس کا قبض ظلمانی ہوگا اور اس کی کیفیت' نورانی قبض کی تمام تر کیفیات کے برعکس ہوگی۔ یہ شخص شر سے لذت حاصل کرے گا اور خیر سے اسے تکلیف ہوگی۔ کسی بھی معاملے میں انصاف کا دامن تھامنا اس کیلئے ناممکن ہوگا کیونکہ جب یہ شخص برائی سے لذت اور نیکی سے تکلیف محسوس کرے گا تو یہ انصاف پر کس طرح کاربند رہ سکتا ہے۔ اسی طرح یہ شخص شر کی متضاد چیز ہر قسم کی بھلائی سے نفرت کرے گا اور یہی کیفیت دیگر تمام اجزاء قبض میں ہوگی اور یہ ظلمانی قبض کفار اور شیاطین کے اندر پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے بے شمار معجزات کا ظہور دیکھنے کے باوجود کفار آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔ عام مسلمانوں میں قبض کی دونوں اقسام کے بعض اثرات پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح بسط میں بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کمال کے انتہائی مرتبے پر فائز ہیں۔ قبض کی طرح بسط کی بھی دو قسمیں ہیں: بسط ظلمانی اور بسط نورانی۔ بسط نورانی وہ ہے جس میں تواضع اور درگزر کرنے کی خوبی موجود ہو اور اگر یہ دونوں خوبیاں مفقود ہوں تو پھر وہ بسط ظلمانی ہوگا۔

4- حرفِ نبوت:

(i) حق گوئی: حرفِ نبوت کا سب سے پہلا جز حق گوئی ہے اور یہ خصوصیت انسان کے وجود میں موجود اس نور کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے جو انسان کو حق گوئی پر مجبور کرتا ہے یہاں تک کہ یہ خصوصیت انسان کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہے۔ اور وہ حق کی خاطر اپنے ذاتی دوست احباب کی مخالفت کی بھی پرواہ نہیں کرتا' اپنا وطن چھوڑ دیتا ہے' یہاں تک کہ سر کٹانے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ مشرکین مکہ نے اپنی پوری کوشش کی' ہر طرح کے حیلے آزمائے لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حق بات کے اظہار سے نہیں روک سکے۔ آخرکار وہ دشمنی میں اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کا منصوبہ بھی بنا لیا لیکن اس تمام تر مخالفت کے باوجود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حق پر ثابت قدم رہے کیونکہ حق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت میں داخل تھا اور یہ ناممکن ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حق کے علاوہ کوئی اور راستہ اختیار کرتے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس کے بعد سیّدی دباغؒ نے دو واقعات بیان کیے جن سے حق گوئی کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ سیّدی دباغ فرماتے ہیں: عجم کے بعض شہروں' میں گھروں کے دروازے پر سدھائے ہوئے

پرندے رکھنے کا رواج ہے۔ جیسے ہی کوئی چور گھر میں داخل ہونے کی کوشش کرے گا تو وہ پرندہ فوراً چلاّئے گا: ''چور۔'' اگر اس پرندے کو ڈرانے کی کوشش کی جائے یا اس کے آگے کوئی چیز کھانے کیلئے ڈال دی جائے تو وہ پھر بھی چیخنے چلاّنے سے باز نہیں آئے گا اگرچہ اسے قتل ہی کیوں نہ کر دیا جائے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) سیّدی دباغ نے اس واقعے کے ذریعے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ حق گوئی کتنی اہم ہے اور اگر انسان اس کو اپنی سرشت کا حصہ بنا لے تو زندگی کے کسی بھی موڑ پر متزلزل نہیں ہوتا کیونکہ اگر ایک پرندہ اس بات کو اپنی فطرت بنا سکتا ہے تو ایک انسان اور وہ بھی بالخصوص بندہ مومن ایسا کیوں نہیں کر سکتا؟

(سیّدی دباغ نے دوسرا واقعہ یہ بیان کیا) ایک مرتبہ ایک مرید نے اپنے شیخ سے دریافت کیا: مجھے کوئی ایسی بات بتائیں جس کی بدولت میں ہر حال میں خوش رہوں۔ شیخ نے جواب دیا: اگر تم یہ خصوصیت حاصل کرنا چاہتے ہو تو اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے کسی ایک صفت کو اپنا لو۔ اگر تم نے ایسا کر لیا تو قیامت کے دن تمہارا حشر اولیاء کرام کے ہمراہ ہوگا اور تم جہنم کے عذاب سے محفوظ رہو گے۔ مرید نے عرض کی: حضرت! یہ کیسے ممکن ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اوصاف بے شمار ہیں۔ شیخ نے فرمایا: تم کسی ایک صفت کو اختیار کر لو۔ مرید نے عرض کیا: مثلاً کون سی صفت؟ شیخ نے جواب دیا: ہمیشہ حق بات کہنا' تم ان لوگوں کی مانند ہو جاؤ جو ہمیشہ حق بات کہتے ہیں کیونکہ اگر تم نے ایسا کر لیا تو اللہ تعالیٰ تم پر خاص رحمت نازل فرمائے گا۔ مرید نے عہد کیا کہ وہ ہمیشہ حق بات کہے گا پھر وہ شیخ کی خدمت سے رخصت ہو کر اپنے گھر چلا گیا۔ اس مرید کے پڑوس میں ایک لڑکی رہتی تھی۔ ایک دن شیطان نے اسے ورغلایا اور اس نے اس لڑکی کے ساتھ زنا کر لیا۔ اگرچہ اس فعل میں لڑکی کی رضامندی شامل تھی لیکن بعد کی صورتحال کے اندیشے کے خوف سے اس لڑکی نے اپنے والد کے سامنے اس جرم کا اعتراف کر لیا۔ اس کے والد نے عدالت میں دعویٰ دائر کیا۔ قاضی نے اس مرید سے دریافت کیا: تمہیں معلوم ہے۔ تمہارے پڑوسی نے تم پر کیا الزام عائد کیا ہے؟ مرید کو اپنے شیخ کے ساتھ کیا ہوا عہد یاد تھا' اس نے اعتراف کر لیا: میرا پڑوسی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ قاضی نے یہ سن کر کہا: اس شخص کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے کیونکہ کوئی بھی عقل مند آدمی ایسی بات کا اقرار نہیں کرتا جس کے نتیجے میں اسے سخت سزا کا سامنا کرنا پڑے اس لئے اسے پاگل خانے لے جاؤ۔ چنانچہ اس مرید کو پاگل خانے بھیج دیا گیا اور پھر کسی کی سفارش پر اسے وہاں سے بھی رہائی مل گئی۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) سیّدی دباغ کا مقصد یہ تھا کہ سچ بولنے کا انجام ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔

(ii) صبر: یہ ایک ایسا نور ہے جس کی بدولت اللہ تعالیٰ کے راستے میں پیش آنے والی مشکلات کا انسان کو احساس بھی نہیں ہوتا۔ حقیقی صبر وہی ہے جس میں تکلیف کا احساس بھی نہ ہو کیونکہ صبر کرنے والے شخص کی عقل اور سوچ دونوں نہایت وسیع ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے شخص کو ''فتح'' نصیب ہو چکی ہوتی ہے لہٰذا وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کمالات کے مشاہدے میں مشغول رہتا ہے اور ان کمالات کی کوئی انتہا نہیں ہے اس لئے جب بھی جسم کو ظاہری طور پر کوئی تکلیف لاحق ہوتی ہے تو جسم اس تکلیف سے

توجہ ہٹا کر ان امور کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے جو عقل کی توجہ کا مرکز ہیں۔ چنانچہ ایک بزرگ جو اپنے وقت کے غوث تھے انہیں چار افراد ظلماً قتل کرنے کی نیت سے ان کے گھر سے انہیں گھسیٹتے ہوئے اٹھا کر لے گئے۔ ان کے اہل خانہ چیختے چلاتے رہ گئے۔ ان ظالموں نے اس بزرگ کو شہید کر دیا لیکن وہ بزرگ اس وقت مشاہدہ حق میں مستغرق تھے اس لیے ان کی توجہ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی اور بیوی بچوں کی چیخ و پکار کی طرف مبذول نہ ہو سکی۔ صبر کی ایسی مثال ملنا مشکل ہے لیکن یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے ایک ولی تھے۔ ان کے صبر کا یہ عالم تھا تو خود آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کے صبر کی کیفیت کا عالم کیا ہوگا؟

اگر انسان کی ذات محجوب ہو تو عقل کا سارا نور جسم کے اندر جمع ہو جاتا ہے اور اسی میں پھنس جاتا ہے لہٰذا جب جسم کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو یہ تکلیف زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ ایسی کیفیت میں انسان کو اگر ایک سلاخ سے داغا جائے تو اسے 100 سلاخوں کے ساتھ داغے جانے کے برابر تکلیف محسوس ہوتی ہے حالانکہ اگر آپ اسی سلاخ سے کسی ''صاحب فتح'' ولی کو داغ دیں تو ولی اس کی اذیت کو محسوس ہی نہیں کرے گا یا اگر محسوس کیا بھی تو ہلکی سی تکلیف کا احساس ہوگا۔

(iii) رحمت: یہ انسان کے وجود کے اندر موجود ایک ایسا نور ہے جس کے باعث انسان کے دل میں ساری مخلوق کیلئے مہربانی اور نرمی کا احساس بیدار ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بندے پر جو رحمت نازل کرتا ہے اس کے نتیجے میں یہ نور انسان کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی بندے پر جتنی زیادہ رحمت فرمائے گا وہ بندہ دوسروں کیلئے اتنا ہی زیادہ مہربان ثابت ہوگا اور اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس ساری مخلوق میں اللہ تعالیٰ کی سب سے زیادہ رحمت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ساری مخلوق کیلئے سب سے بڑی رحمت ہیں۔ مخلوق کے ہر حصے ہر گوشے ہر جنس اور ہر نوع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت کا فیضان جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی درج ذیل آیت میں چار امور کی طرف اشارہ کیا ہے:

بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (یہ رسول اہل ایمان کیلئے نہایت (ہی) شفیق بے حد رحم فرمانے والے ہیں۔

اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ساری مخلوق (اور بطور خاص وہ لوگ) جنہیں اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہے وہ سب نور محمدی سے فیض حاصل کرتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اس نور کو بارگاہِ رب العزت میں مرتبہ و مقام کے اعتبار سے سب سے زیادہ قرب حاصل ہے۔ تیسری بات یہ کہ مذکورہ بالا نور جو اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ مقرب ہے وہ اپنے تمام اسرار سمیت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں پایا جاتا ہے اور چوتھی بات یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم اقدس کو اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت اور طاقت عطا فرمائی ہے کہ وہ اس نور کو برداشت کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس نور کو برداشت کرنے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی تکلیف یا مشقت محسوس نہیں ہوتی اور اسی خصوصیت کی بناء پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ساری مخلوق پر فضیلت حاصل ہے۔

اس آیت میں دیگر بہت سے اسرار بھی موجود ہیں لیکن انہیں ظاہر کرنا مناسب نہیں ہے۔

(iv) اللہ تعالیٰ کی ویسی معرفت' جیسی ہونی چاہئے۔

(v) (اللہ تعالیٰ کا) مکمل خوف۔ مکمل خوف سے مراد یہ ہے کہ باطن کے ساتھ ظاہر میں بھی اللہ تعالیٰ کا خوف موجود ہو۔ انسان کی عقل اور اللہ تعالیٰ کی معرفت کے نتیجے میں یہ خوف پیدا ہوتا ہے۔ باطنی خوف جسم اور جسم کے ہر حصے میں پایا جاتا ہے کیونکہ '' جسم اور اس کے ہر ایک حصے کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور ہر مخلوق کے اندر اپنے خالق کا خوف موجود ہوتا ہے۔ یہ خوف ہر جاندار اور بے جان مخلوق کے اندر موجود ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

۳- ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَ لِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَا اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ۝ (حم السجدۃ ۴۱:۱۱)

'' پھر وہ سماوی کائنات کی طرف متوجہ ہوا تو وہ (سب) دھواں تھا' سو اُس نے اسے (یعنی آسمانی کروں سے) اور زمین سے فرمایا: خواہ باہم کشش و رغبت سے ناگزیری و ناگواری سے ہمارے نظام کے تابع آجاؤ' دونوں نے کہا: ہم بخوشی سے حاضر ہیں۔''

ساری مخلوق کی اس اطاعت کا محرک یہی خوف تھا اور اسی خوف کی بدولت ہر مخلوق ہر وقت تسبیح میں مشغول رہتی ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

۴- وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (بنی اسرائیل ۱۷:۴۴)

'' اور (جملہ کائنات میں) کوئی بھی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو۔''

یاد رکھیں! باطنی خوف ہر وقت موجود رہتا ہے۔ البتہ ظاہری خوف کا بنیادی سبب اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہنا ہے۔ جب تک انسان کی توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف مبذول رہے گی یہ خوف باقی رہے گا اور جیسے ہی توجہ منتشر ہوگی' خوف ختم ہو جائے گا۔ تاہم جس شخص پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہو اس کے سامنے سے ظاہری اور باطنی خوف کے درمیان موجود حجاب ہٹ جاتا ہے جس کے نتیجے میں' باطنی خوف کی طرح' ظاہری خوف بھی مستقل طور پر نصیب ہو جاتا ہے۔ اس وقت ظاہری خوف معرفتِ الٰہیہ سے مدد حاصل کرتا ہے کیونکہ معرفت الٰہیہ کی کوئی انتہا نہیں ہے اس لئے اس خوف کی بھی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ گویا اس عالم میں ظاہر باطن سے صفائی اور دوام حاصل کرتا ہے اور باطن ظاہر سے اضافہ اور فیض حاصل کرتا ہے۔ اسی کیفیت کو مکمل خوف کہا جائے گا۔ باطن میں ظاہر کے ذریعے اس لئے اضافہ ہوتا ہے کیونکہ باطن کا جسم کے ہر حصے کے ساتھ برابر کا تعلق ہے لیکن ظاہری خوف کا تعلق جسم کے مختلف حصوں کے ساتھ مختلف ہوتا ہے کیونکہ ظاہری خوف کا بنیادی سبب اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے اور معرفت کے اعتبار سے جسم کے مختلف حصوں کا حکم ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

(vi) باطل سے بغض رکھنا: یہ کیفیت انسان کے وجود کے اندر موجود اس نور سے پیدا ہوتی ہیں جو جسم میں ہر

وقت موجود رہتا ہے اور اس کا کام ہر وقت ظلمت کی طرف متوجہ رہنا اور بوقت ضرورت ہر طرح کی ظلمت کا مقابلہ کرنا ہے جیسے دو دشمن ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار رہتے ہیں۔ زندگی کے ہر لمحے میں باطل سے بغض رکھنا ''حرف نبوت'' کے اجزاء میں سے ایک جز ہے۔

(vii) عفو: یہ کیفیت اس نور کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے جو انسان کے وجود میں ہر وقت موجود رہتا ہے اور اس نور کی فطرت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کرے تو یہ اسے فائدہ پہنچانے کی کوشش کرتا ہے' جو شخص اس سے لاتعلقی اختیار کرے یہ اس کے ساتھ تعلق مضبوط کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جو شخص اس کے ساتھ زیادتی کرے یہ اس سے درگزر کرتا ہے۔ ایسا عفو ''حرف نبوت'' کے اجزاء میں سے ایک جز ہے لیکن اس کیفیت کو مستقل موجود ہونا چاہئے کیونکہ اس کا سبب سابقہ نور ہے جو ہر وقت انسان کے وجود میں موجود رہتا ہے لہٰذا عفو کا جذبہ بھی انسان میں ہمیشہ موجود رہنا چاہئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی کیفیت تھی۔

یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ نبوت کے خصائل سب سے زیادہ کامل طور پر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں موجود ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حرفِ آدمیت' حرفِ قبض اور حرفِ بسط کے تمام اجزاء سب سے زیادہ کامل شکل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں موجود ہیں۔ لہٰذا جب یہ تمام اجزاء انتہائی کامل شکل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں موجود ہوں گے اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مرتبہ نبوت بھی نصیب ہو تو ان تمام اجزاء کے انوار اپنی انتہائی شکل میں روشن ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا نبوت کے خصائل کے تین مرتبے ہوں گے:

پہلے مرتبے میں' حرفِ آدمیت' حرفِ قبض اور حرفِ بسط کے تمام اجزاء شامل ہوں گے جن کی تعداد مجموعی طور پر 21 ہے۔ دوسرے مرتبے میں مذکورہ بالا 21 اجزاء کے انوار کے ہمراہ 22 واں نور' صبر کا نور ہوتا ہے اور تیسرے مرتبے میں ان 22 انوار کے ہمراہ 23 واں نور' رحمت کا نور ہوتا ہے۔ لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی نور کے ہمراہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم اقدس میں موجود انوار کی مجموعی تعداد 24 ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت ساری مخلوق پر حاوی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے پروردگار کی جو معرفت حاصل ہے اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مختصر یہ کہ جب آپ مرتبہ نبوت پر غور کریں اور مذکورہ بالا تمام تشریحات کو سامنے رکھتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان کا اندازہ لگانے کی کوشش کریں تو آپ بھی اسی نتیجے پر پہنچیں گے جو کسی شاعر (امام شرف الدین بوصیری نے قصیدہ بردہ شریف میں) یوں بیان کیا:

منزہٌ عن شریکٍ فی محاسنہٖ　　　فجوھر الحسن فیہ غیر منقسم

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس محاسن (قابل تعریف عادات' خصائل) میں کسی کی شرکت (برابری و ہمسری) سے پاک ہے کیونکہ آپ کی ذات میں جو حسن موجود ہے اسے تقسیم ہی

نہیں کیا جا سکتا (تو وہ کسی اور کو کیسے مل سکتا ہے؟)

5-حرفِ روح

(i) حرفِ روح کا پہلا جز انوار کو چکھنا (یعنی محسوس کرنا) ہے۔ یہ دراصل روح میں موجود ایک نور ہے جس کی بدولت ساری کائنات میں موجود اللہ تعالیٰ کے افعال کے انوار کو محسوس کیا جاتا ہے اور یہ انوار تقدیر کے فیصلے کے مطابق عالم علوی میں موجود ہوتے ہیں۔ روح کا چکھنا' جسم کے چکھنے سے مختلف ہے چونکہ روح کے چکھنے کا تعلق نور کے ساتھ ہوگا کیونکہ روح خود نور ہے جبکہ جسم کسی مادی چیز کو چکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے جیسے ہم شہد کی مٹھاس کو اسی وقت محسوس کر سکتے ہیں جب شہد کا مادی وجود ہماری زبان سے مس ہوگا لیکن اگر روح شہد کی مٹھاس کو محسوس کرنا چاہے تو اس کیلئے شہد کے مادی وجود کی موجودگی ضروری نہیں ہوگی بلکہ روح کے اندر موجود عقل اس سے مٹھاس کو محسوس کرے گی۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ جسم کے چکھنے کیلئے یہ بات ضروری ہے کہ جس چیز کو چکھا جا رہا ہے وہ زبان کے ساتھ مس ہو لیکن روح کیلئے چیز کو چھونا شرط نہیں ہے۔ تیسرا بنیادی فرق یہ ہے کہ ظاہری جسم میں صرف زبان کے ذریعے کسی چیز کا ذائقہ محسوس کیا جا سکتا ہے لیکن روح کے جملہ اجزاء اس ذائقے کو محسوس کر سکتے ہیں۔ لہٰذا جب روح کوئی چکھنے والی چیز دیکھے گی مثلاً شہد تو شہد کو دیکھتے ہی اس کی مٹھاس کو محسوس کرے گی یا روح لفظ شہد سنے گی تو یہ لفظ سننے کے ساتھ ہی اسے شہد کی مٹھاس محسوس ہو جائے گی۔ اسی طرح جب روح لفظ جنت' رضوان یا رحمت سنے گی تو ان الفاظ کے سننے کے ساتھ ہی ان کے معنی اور مفہوم سے آگاہ ہو جائے گی۔ اسی طرح جب روح قرآن مجید کی تلاوت سنے گی تو سب سے پہلے اس کی حقانیت کے نور کو محسوس کرے گی اور پھر اس میں موجود دیگر تمام انوار کو محسوس کرنے میں مشغول ہو جائے گی جن کی کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی۔ مختصر یہ کہ روح اپنے پورے جسم' جسم کے ہر ایک جز اور تمام تر حواس کے ذریعے کسی بھی چیز کو محسوس کر سکتی ہے تاہم بعض ارواح میں محسوس کرنے کی یہ صلاحیت کمزور ہوتی ہے اور بعض ارواح میں یہ کیفیت انتہائی طاقتور ہوتی ہے اور سب سے زیادہ طاقتور روح وہ ہے جس کے محسوس کرنے کی صلاحیت عرش' فرش بلکہ ساری کائنات پر محیط ہو اور یہ خصوصیت صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارکہ کو حاصل ہے کیونکہ یہ روح تمام ارواح کی سلطان ہے اور یہ روح' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم اقدس میں پوری رضامندی' محبت اور قبولیت کے ساتھ سکونت پذیر ہو چکی ہے۔ لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم اقدس اور روح مبارکہ کے درمیان موجود تمام حجابات اٹھا لئے گئے ہیں' اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارکہ کے جملہ کمالات جسم اقدس کو بھی حاصل ہیں اور یہ ایک ایسا کمال ہے جس سے بڑا اور کوئی کمال نہیں ہو سکتا۔

(ii) طہارت: یعنی روح اسی طرح پاک وصاف ہو جیسے پیدائش کے وقت پاک تھی۔ طہارت کی دو قسمیں ہیں: پہلی قسم طہارتِ حسی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ روح ایک نور ہے اور نور نہایت پاک وصاف ہوتا ہے۔

طہارت کی دوسری قسم معنوی طہارت ہے یعنی ظاہری اور باطنی معرفت کا حصول' اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر مخلوق اپنے خالق کو پہچانتی ہے خواہ وہ مخلوق ناطق ہو یا خاموش' متحرک ہو یا جامد ہر مخلوق کے ہر ایک جز میں اپنے خالق کی باطنی معرفت موجود ہے جیسا کہ ہم اس سے پہلے اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ جس شخص پر اپنا خاص فضل وکرم نازل کرے اس کیلئے اس کا ظاہر بھی' اس کے باطن کی مانند ہو جاتا ہے اور اس کے ظاہری جسم کے تمام اجزاء اپنے پروردگار کی معرفت حاصل کر لیتے ہیں اور یہ معرفت کا بلند ترین درجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارواح کو یہ صلاحیت عطا کی ہے کہ وہ اپنے پروردگار سے واقف ہیں لیکن روح کی صفائی کے اعتبار سے یکساں ہونے کے باوجود ارواح کے درمیان تفاوت پایا جاتا ہے کسی روح کا حجم بڑا ہوتا ہے اور کسی روح کا حجم چھوٹا ہوتا ہے اور بلاشبہ جس روح کا حجم جتنا بڑا ہوگا اور اس کے جواہر (اجزاء) اسی قدر زیادہ ہوں گے اور اسے اسی قدر زیادہ معرفت نصیب ہوگی۔ لہٰذا تمام تر ارواح میں سب سے بڑا حجم اور سب سے زیادہ مرتبہ ومقام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارکہ کو حاصل ہے کیونکہ یہ ساری زمینوں اور تمام آسمانوں میں موجود ہے لیکن اس کے ساتھ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم اقدس میں موجود ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک نے اس روح کے تمام تر اسرار کو اپنے اندر جذب کر رکھا ہے۔ اللہ کی وہ ذات ہر عیب سے پاک ہے جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم اطہر کو یہ صلاحیت عطا کی ہے۔

جب کوئی روح کسی جسم میں اپنی پوری رضامندی اور پسند کے ساتھ فروکش ہو جائے تو جسم اور روح کے درمیان موجود حجاب کو اٹھا دیا جاتا ہے اور جسم روح سے حسی اور معنوی صفائی حاصل کرتا ہے۔ جب جسم کو حسی صفائی نصیب ہو جائے تو اس کے نتیجے میں جسم میں موجود خون بھی صاف ہو جاتا ہے۔ خون کی صفائی چار صورتوں میں حاصل ہوتی ہے: خون ہلکا ہو جاتا ہے اور اس کا وزن کم ہو جاتا ہے کیونکہ جب خون کا وزن زیادہ ہوگا تو اس کے اندر خباثت زیادہ ہو جائے گی اور شہوانی خواہشات زیادہ پیدا ہوں گی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ خون کی بو صاف ہو جاتی ہے اس کی علامت یہ ہے کہ خون میں سے گوندھے ہوئے آٹے کی سی مہک محسوس ہوتی ہے لیکن خبیث خون سے بدبودار کیچڑ کی بو محسوس ہوتی ہے۔ تیسری صورت خون کے رنگ کی صفائی ہے کیونکہ خبیث خون کا رنگ سیاہی مائل ہوتا ہے جبکہ صاف خون کا رنگ زردی مائل ہوتا ہے۔ چوتھی صورت خون کے ذائقے کی تبدیلی ہے کیونکہ صاف خون کا ذائقہ میٹھا محسوس ہوتا ہے جبکہ خبیث خون کا ذائقہ کسی جلی ہوئی چیز کی مانند محسوس ہوتا ہے۔

خون کے صاف ہو جانے کے بعد اس میں سے تمام تر شیطانی اثرات خارج ہو جاتے ہیں' شہوت اور گناہ کی تاریکی منقطع ہو جاتی ہے اور پھر جب یہ صاف خون جسم کی دوسری رگوں تک پہنچتا ہے تو وہ تمام رگیں بھی صاف ہو کر شیطانی اثرات اور شہوانی خواہشات سے پاک ہو جاتی ہیں۔ جب جسم کو یہ حسی صفائی حاصل ہو جائے

تو معنوی صفائی کے حصول کیلئے روح اس کی مدد کرتی ہے۔ یہاں تک کہ جسم کے ہر ایک جز کو اللہ تعالیٰ کی معرفت نصیب ہو جاتی ہے اور کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم اقدس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارکہ پر حاوی ہے اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم اقدس کو روح مبارکہ کے تمام اسرار حاصل ہیں۔

(iii) تمیز: یہ روح میں موجود ایک خاص نور ہے جس کی مدد سے روح کسی بھی چیز کی حقیقت کو مکمل طور پر پہچان لیتی ہے اور اس پہچان کیلئے روح کو باقاعدہ طور پر کچھ سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ محض کسی چیز کو دیکھ کر یا اس کا نام سن کر روح اس سے متعلق تمام امور سے واقف ہو جاتی ہے کہ یہ چیز کیا ہے؟ اس کے احوال کیا ہیں؟ اس کا آغاز اور انجام کیا ہے؟ یہ کہاں پائی جاتی ہے؟ اس کا مقصد تخلیق کیا ہے؟ وغیرہ' پھر تمیز کی اس صلاحیت کے اندر ارواح کی کیفیات مختلف ہیں۔ بعض ارواح میں یہ صلاحیت مضبوط اور بعض ارواح میں خاصی کمزوری ہوتی ہے البتہ یہ صلاحیت سب سے زیادہ قوی شکل میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارکہ کو حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارکہ کے سامنے کائنات کا کوئی بھی گوشہ مجوب نہیں ہے۔ اسے عرش' اس کی بلندی' اس کا نچلا حصہ' دنیا' آخرت' جنت' دوزخ سب کی اطلاع حاصل ہے کیونکہ یہ سب کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے ہی پیدا کیا گیا ہے لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ صلاحیت تمام جہانوں پر محیط ہے۔ کس جہان کو کہاں سے' کب اور کیوں پیدا کیا گیا ہے؟ ہر آسمان کا مخصوص وجود کہاں ہے؟ کون سا فرشتہ کون سے آسمان سے تعلق رکھتا ہے؟ فرشتوں کو کب' کہاں اور کیوں پیدا کیا گیا؟ یہ اس وقت کہاں موجود ہیں؟ ان کے مراتب کے درمیان کیا اختلاف ہے؟ ان کا سب سے بلند ترین درجہ کون سا ہے؟

70 حجابات اور ہر حجاب میں موجود ہر فرشتے سے متعلق جملہ معلومات' آسمان میں موجود جملہ اجرامِ فلکی' سورج چاند' ستارے ان کے علاوہ لوح' قلم' برزخ' ارواح' ان کے بارے میں جملہ معلومات' سات زمینیں' ان میں موجود جملہ مخلوقات' خواہ وہ خشکی پر بستی ہوں یا سمندروں میں رہتی ہوں۔ ان سے متعلق جملہ معلومات' جنت کے درجات' جنتیوں کی تعداد' ان میں سے ہر ایک کا مخصوص مقام غرضیکہ کائنات کے ہر حصے سے متعلق ہر چیز کا علم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے۔ لیکن اس قدر وسیع معلومات کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم مبارک اللہ تعالیٰ کے علم کے مساوی نہیں ہو سکتا کیونکہ علم الٰہی کی کوئی انتہا نہیں ہے (جبکہ کائنات سے متعلق تمام تر معلومات محدود حیثیت کی مالک ہیں) علم الٰہی کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کے اسرار کے ساتھ ہے جن کی کوئی انتہا نہیں ہے اور ان اسرار کی معلومات کا ساری کائنات کی معلومات سے کوئی موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔

جب روح کو جسم سے محبت ہو جاتی ہے تو تمیز کی یہ روحانی خصوصیت جسم کو بھی حاصل ہو جاتی ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارکہ کو حاصل شدہ مذکورہ بالا تمام تر معلومات' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم

مبارک کو بھی حاصل ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ کی وہ ذات ہر عیب سے پاک ہے جس نے اپنے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مرتبہ و مقام عطا کیا ہے۔

(iv) **بصیرت:** اس سے مراد ہے سمجھنے کی صلاحیت یعنی یہ روح کے تمام اجزاء کے اندر اس طرح سرایت کر جائے جیسے تمام حواس مثلاً دیکھنے، سونگھنے، چکھنے، سننے وغیرہ کی صلاحیت روح کے ہر جز کو حاصل ہوتی ہے، روح کا ہر جز جانتا ہے، دیکھ سکتا ہے، سونگھ سکتا ہے، سن سکتا ہے وغیرہ۔ چنانچہ روح ہر سمت میں دیکھ سکتی ہے اسی طرح روح کے دیگر تمام حواس ہر سمت میں کام کر سکتے ہیں۔ جب روح اور جسم کے درمیان سے حجابات ہٹا دیئے جاتے ہیں تو ان تمام حواس میں روح جسم کی مدد کرتی ہے۔ لہٰذا جسم بھی چاروں طرف دیکھ سکتا ہے بلکہ جسم کا ہر جز ہر طرف دیکھ سکتا ہے، سن سکتا ہے، سونگھ سکتا ہے۔ روح کی ہر صلاحیت جسم کو بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارکہ اور جسم اقدس کے درمیان موجود حجاب کو پہلی مرتبہ اس وقت ہٹایا گیا جب بچپن میں ''شق صدر'' کا واقعہ پیش آیا۔ اسوقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک کو وہ تمام معلومات اور کمالات حاصل ہو گئے جو روح مبارکہ کو حاصل تھے اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیچھے بھی اسی طرح دیکھ سکتے تھے جیسے اپنے سامنے دیکھ سکتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا تھا:

اقیموا رکوعکم و سجودکم فانی اراکم من خلفی کما اراکم من امامی

''رکوع اور سجود ٹھیک طرح سے ادا کیا کرو کیونکہ میں اپنے پیچھے موجود تمہیں اسی طرح دیکھ سکتا ہوں جیسے اپنے سامنے موجود کسی چیز کو دیکھ سکتا ہوں۔''

(v) **عدم غفلت:** اس کا مفہوم یہ ہے کہ روح کو جس قدر علم حاصل ہے اس سارے علم سے غفلت، سہو اور نسیان ختم ہو جائے کیونکہ ان تینوں صورتوں میں جہالت لازم آتی ہے۔ روح کو بتدریج معلومات حاصل نہیں ہوئی تھیں بلکہ ایک لمحے کے اندر اسے تمام تر معلومات نصیب ہوگئی تھیں۔ نیز روح کا علم ایسا نہیں ہے کہ اگر وہ کسی ایک چیز کی طرف متوجہ ہو تو دوسری سے غافل ہو جائے بلکہ جب روح کسی ایک چیز کی طرف توجہ کرتی ہے تو اسے دیگر بہت سی معلومات بھی حاصل ہو جاتی ہیں لیکن ان معلومات کے حصول کی طرف شعوری توجہ کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ روح کو فطری طور پر علوم حاصل ہوتے ہیں اس لئے پیدائش کے فوراً بعد اسے جملہ معلومات حاصل ہو جاتی ہیں اور پھر یہ معلومات ہمیشہ اس کے پاس موجود رہتی ہیں۔ یہ خصوصیت ہر روح کو حاصل ہے۔ تاہم ارواح کی معلومات کی مقدار کے درمیان فرق ہوتا ہے۔ بعض ارواح کی معلومات بہت زیادہ ہوتی ہیں اور بعض ارواح کی معلومات محدود ہوتی ہیں۔ علم کی وسعت اور نظر کی قوت کے اعتبار سے سب سے بڑی روح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارکہ ہے کیونکہ یہ تمام ارواح کی پیشوا ہے۔ اسی لیے پیدائش کے فوراً بعد اسے ساری کائنات کے بارے میں جملہ معلومات فوراً

بیک وقت حاصل ہوگئی تھیں اور پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارکہ اور جسم اطہر کے درمیان موجود حجاب ہٹ گیا تو جسم مبارک کو بھی یہ تمام علوم حاصل ہو گئے لیکن جسم کو حاصل ہونے والی معلومات' روح کے علم سے مختلف ہیں کیونکہ روح کو یہ تمام تر معلومات بیک وقت حاصل ہوگئی تھیں لیکن جسم مبارک کو یہ تمام تر معلومات بتدریج حاصل ہوئی ہیں۔ اس لیے جسم مبارک جب کسی چیز کی طرف متوجہ ہوگا تو اسے اس چیز کے بارے میں جملہ معلومات سامنے دکھائی دیں گی۔ اگر توجہ نہ ہو تو معلومات بھی سامنے سے ہٹ جائیں گی۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے جس چیز کی طرف توجہ مبذول ہوتی جائے گی اس سے متعلق معلومات سامنے آتی چلی جائیں گی۔ یہاں تک کہ تمام تر معلومات جسم مبارک کے سامنے آ جائیں گے۔ بیک وقت حصول کی جو صلاحیت روح کو حاصل ہے وہ جسم کو حاصل نہیں ہے۔ اسی طرح عدم غفلت کے اعتبار سے بھی جسم اور روح کے درمیان فرق پایا جاتا ہے یعنی جب توجہ کسی چیز کی طرف مبذول ہوگی تو اس وقت اس چیز کے بارے میں غفلت یعنی نسیان یا سہو لاحق نہیں ہوں گے لیکن اگر جسم کی توجہ کسی چیز کی طرف مبذول نہ ہو (بلکہ جسم مشاہدہ حق میں مستغرق ہو) تو اس وقت جس چیز کی طرف توجہ مبذول نہیں ہے اس میں سہو یا نسیان طاری ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں منقول ایک روایت کے مطابق جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کے دوران سہو لاحق ہوا اور صحابہ کرام نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ سہو کی طرف مبذول نہیں کروائی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

انما انا بشر انسی کما تنسون فاذا نسیت فذکرونی۔

''میں ایک انسان ہوں اور تمہاری طرح میں بھی بھول سکتا ہوں' اگر کبھی میں بھول جاؤں تو مجھے یاد کروادیا کرو۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اللہ تعالیٰ سیّدی دباغ پر اپنا خاص لطف و کرم نازل کرے۔ آپ نے شریعت اور حقیقت دونوں کے حقوق کو سامنے رکھتے ہوئے اس حدیث کی وضاحت کر دی ہے۔ ایک اور روایت یوں منقول ہے۔

انی لا انسی ولکن انسی لاسن

''میں بھولتا نہیں ہوں بلکہ مجھے بھلا دیا جاتا ہے تاکہ دوسرے رہنمائی حاصل کرسکیں۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) علامہ ابن عبدالبر اندلسی (اپنی تصنیف) ''التمہید'' (جو موطا امام مالک کی شرح ہے) میں' حافظ ابن حجر عسقلانی (اپنی تصنیف) ''فتح الباری'' میں (جو صحیح بخاری کی شرح ہے) اور امام جلال الدین سیوطی' موطا امام مالک کے حاشیے میں تحریر کرتے ہیں اس روایت کی کوئی بھی سند مستند نہیں ہے۔ ابن حجر لکھتے ہیں کہ اس روایت کی تردید کیلئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی فرمان کافی ہے: ''میں بھی ایک انسان ہوں اور تمہاری طرح میں بھی بھول سکتا ہوں'' کیونکہ اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اپنی طرف

بشریت ہی کو منسوب نہیں کیا بلکہ اپنے نسیان کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے نسیان سے تشبیہہ بھی دی ہے۔(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) ساری بحث آپ ''فتح الباری'' میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

(vi) کسی چیز میں سرایت کر جانے کی قوت: اللہ تعالیٰ نے روح کو یہ قوت عطا کی ہے کہ وہ کسی بھی جسم کے اندر داخل ہو سکتی ہے۔ خواہ وہ جسم پہاڑ' پتھر' چٹان یا دیوار کی صورت میں موجود ہو اور جب روح کسی جسم کے اندر سرایت کر جاتی ہے اور اس جسم سے محبت کرنے لگتی ہے تو پھر وہ اس جسم کی مدد کرتی ہے اور وہ جسم بھی وہی کام کرنے کے قابل ہو جاتا ہے جو روح کر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سیدنا یحییٰ علیہ السلام کی قوم کے لوگوں نے انہیں گرفتار کرنا چاہا تو آپ ایک درخت کے تنے کے اندر داخل ہو گئے کیونکہ آپ کی روح نے آپ کے جسم کو بھی یہ صلاحیت دیدی تھی کہ وہ جسم' کسی بھی جسم میں داخل ہو سکے' اولیاء کرام کی وہ تمام تر کرامات جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دروازے سے گزرے بغیر کسی مکان کے اندر داخل ہو گئے تو ان کرامات کی بھی یہی توجیہہ ہو گی۔ اسی طرح وہ تمام واقعات جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کسی ولی نے ایک قدم مشرق میں رکھا اور دوسرا مغرب میں' اس کی بھی یہی توجیہہ ہو گی کیونکہ انسانی جسم اتنی تیزی کے ساتھ حرکت نہیں کر سکتا۔ اگر جسم اتنی تیزی سے حرکت کرے گا تو ہوا اس کو توڑ پھوڑ کر اس کے اعضاء کو ریزہ ریزہ کر دے گی اس کے جسم میں موجود خون اور رطوبتیں خشک ہو جائیں گے۔ البتہ اگر روح جسم کی مدد کرے تو جسم اتنی تیزی سے حرکت کر سکتا ہے۔ واقعہ معراج کی بھی یہی توجیہہ ہو گی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک کی مدد کی جس کے نتیجے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک لمحے کے اندر معراج کا سفر مکمل کر کے واپس تشریف لے آئے۔

(vii) حرف روح کا ساتواں جزیہ ہے کہ جن امور کے ذریعے جسم کو تکلیف ہوتی ہے روح ان کو محسوس نہیں کرتی مثلاً گرمی' سردی' بھوک' پیاس اسی طرح کسی چیز کی سختی یا گندگی بھی روح پر اثر انداز نہیں ہوتی البتہ فرشتے گندگی سے تکلیف محسوس کرتے ہیں کیونکہ فرشتے خوشبو کو پسند اور بدبو کو ناپسند کرتے ہیں۔ اگر روح میں عدم احساس کی یہ صلاحیت نہ ہوتی تو روح ایک لمحے کیلئے بھی جسم میں موجود نہیں رہ سکتی تھی۔

یہ وہ سات امور ہیں جن کا تعلق ہر روح کے ساتھ ہے اسی لیے ہم نے انہیں روح کے اجزاء قرار دیا ہے۔

تاہم اس سے پہلے ہم اس بات کی وضاحت بیان کر چکے ہیں کہ ارواح کی صلاحیت کے درمیان فرق موجود ہوتا ہے اور سب سے بلند مرتبے کی مالک روح' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارکہ ہے اور ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ مذکورہ بالا ساتوں صفات جس قدر کامل طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارکہ کو حاصل ہیں اتنی کسی اور روح کو حاصل نہیں ہیں۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارکہ کے تمام اوصاف' جسم مبارک کو بھی حاصل ہیں لہٰذا جب ان ساتوں انوار کو سابقہ صفحات میں ذکر شدہ' حرف آدمیت' قبض' بسط اور نبوت کے اجزاء کے انوار سے ملایا جائے گا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں انوار کی مجموعی تعداد 35 ہو جائے گی۔

6- حرف علم:

اس سے مراد وہ علم ہے جو پاکیزگی اور صفائی کے انتہائی درجے تک پہنچ چکا ہو اور اس میں وہ سات صفات پائی جاتی ہوں جن کا ذکر آئندہ سطور میں کیا جائے گا۔ اس سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ علم عقل کا نور ہے اور عقل روح کا نور ہے اور روح جسم کا نور ہے۔ اس سے پہلے ہم اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ جب جسم اور روح کے درمیان موجود حجابات زائل ہو جائیں تو روح کے تمام تر انوار جسم کو بھی نصیب ہو جاتے ہیں اس لئے روح کی طرح جسم کو بھی نور عقل نصیب ہو جائے گا جو درحقیقت علم ہی ہے۔ آئندہ سطور میں علم کے جن سات انوار کا ذکر کیا جائے گا۔ روح ان انوار سے متصف ہوتی ہے بلکہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ روح کو اس سے بھی زیادہ انوار نصیب ہوتے ہیں۔

(i) حرف علم کا سب سے پہلا جز معلومات کو محفوظ رکھنے کی صلاحیت ہے۔ یہ صلاحیت علم میں موجود ایک نور ہے جس کی مدد سے تمام حواس کے ذریعے حاصل کی ہوئی معلومات کو محفوظ رکھا جاتا ہے۔ کسی حس میں کسی چیز کے بارے میں جو چیز محسوس ہوتی ہے اس کی مثال ایک سائے کی مانند ہے (جس کا کوئی وجود نہیں ہوتا) لیکن حس کے ذریعے حاصل ہونے والی معلومات جب اس نور تک پہنچتی ہیں تو وہ ایک شے کی شکل اختیار کر کے (محفوظ ہو جاتی ہیں) اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حس کا ادراک خیالی ہوگا اور نور کا ادراک حقیقی ہوگا۔ عام طور پر لوگ اس کے برعکس خیال کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا علم محدود ہوتا ہے۔ اصل علم کے مقابلے میں انہیں صرف ایک بال کے برابر علم عطا کیا جاتا ہے، جب ان کا علم محدود ہوتا ہے تو پھر وہ حواس پر اعتماد کرنا شروع کر دیتے ہیں لیکن جسے اللہ تعالیٰ نے علم کامل عطا کیا ہو اس کے نزدیک علم کامل کے مقابلے میں حواس کی حیثیت خیال کی سی ہوگی۔ بالفرض ایک شخص، ایک گھر بناتا ہے اور اس کی تعمیر کے دوران ہر چھوٹا بڑا کام خود کرتا ہے۔ خود ہی مٹی جمع کر کے ان کی اینٹیں بنا کے انہیں پکاتا ہے، پتھر لا کے ان کا چونا بناتا ہے۔ لکڑی کاٹ کر، لا کے اس کے دروازے اور کھڑکیاں بناتا ہے۔ اس سارے کام میں وہ کسی کی کوئی مدد حاصل نہیں کرتا۔ تعمیر کے دوران ہر کام اس نے اپنی پسند کے مطابق کیا ہو اور گھر کے ایک ایک حصے اور کونے کا نقشہ اس کے ذہن میں نقش ہو اب وہ کچھ دن کیلئے کہیں چلا جاتا ہے۔ واپسی پر اس کے ہمراہ ایک اور شخص بھی ہوتا ہے۔ تب یہ دونوں حضرات اس گھر کو دیکھنے کے حوالے سے برابر کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن گھر بنانے والے اور اجنبی کے دیکھنے میں زمین آسمان کا فرق ہے کیونکہ بنانے والا اس گھر کے ہر ایک حصے، کونے، ان میں موجود پتھر اور اینٹوں، ان پتھروں اور اینٹوں کے بنانے کی کیفیت غرضیکہ اسی طرح کی تمام جزوی معلومات سے واقف ہوگا اور اس کا علم اس گھر کے ظاہر اور باطن دونوں پر محیط ہوگا لیکن اس گھر کو دیکھنے والے دوسرے شخص کی معلومات کا دائرہ اتنا وسیع نہیں ہوگا۔

بالکل یہی کیفیت علم کامل کی ہے کیونکہ علم کامل ہر چیز کے ظاہر و باطن، ان کے اجزاء، اجزاء کی تفصیلات اور

ان تفصیلات کی تفصیلات سے بھی آگاہ ہوگا لیکن بصارت کا تعلق صرف ظاہری سطح تک ہوگا۔ بصارت کبھی بھی باطن تک نہیں پہنچ سکتی۔ ہم نے بطور مثال یہ بات بیان کی ہے اور یہ کوئی تحقیقی مثال بھی نہیں ہے کیونکہ علم کامل صرف اسی شخص کو نصیب ہوسکتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہو اور علم کامل کی حقیقت تک مثالوں کے ذریعے نہیں پہنچا جاسکتا۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: اشیاء (کی معلومات) علم کامل (کے نور) میں کیسے حاصل ہوتی ہیں؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ علم کامل کے نور کی مثال ایک لیٹر صاف پانی کی ہے جو بالکل صاف شفاف ہے اور اس میں کسی بھی چیز کی کوئی ملاوٹ نہیں ہے پھر ہم اس میں مزید ایک لیٹر پانی ملا دیتے ہیں لیکن یہ دوسرا پانی مختلف قطرات کا مجموعہ ہے ان میں سے کوئی ایک قطرہ نمکین ہوگا تو دوسرا میٹھا ہوگا' کوئی کڑوا ہوگا اور کوئی ترش ہوگا' کوئی ٹھنڈا ہوگا اور کوئی گرم ہوگا وغیرہ۔ اب اگر یہ پانی صاف پانی میں ڈال دیا جائے تو دونوں مل کر ایک جیسے ہو جائیں گے اور ایک ہی پانی کی شکل اختیار کر جائیں گے۔ پہلے والے پانی کی مثال علم کی مانند ہے اور دوسرے پانی کی مثال معلومات کی مانند ہے کیونکہ معلومات ہمیشہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: کیا یہ تمام قطرات مل کر ایک دوسرے میں خلط ملط ہو جاتے ہیں یا انہیں ایک دوسرے سے ممتاز کیا جاسکتا ہے؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: خلط ملط ہو جاتے ہیں پھر آپ نے تھوڑا سا پانی لے کر ارشاد فرمایا: ہم فرض کر لیتے ہیں کہ یہ ایک لیٹر پانی علم کا نور ہے پھر آپ نے ایک قطرہ اس میں ٹپکا کر ارشاد فرمایا: یہ قطرہ ایک قسم کی معلومات کے مترادف ہے پھر مجھ سے دریافت کیا: کیا یہ قطرہ (یعنی معلومات) اس پانی (یعنی نور علم) کا حصہ نہیں بن گیا؟ میں نے عرض کی: جی ہاں! اس کے بعد آپ یکے بعد دیگرے قطرات اس میں ٹپکاتے گئے اور اپنا یہی سوال دہراتے گئے؟ اور میں ہر بار اقرار کرتا رہا۔ آخر آپ نے فرمایا: علم کا نور آغاز میں معلومات سے خالی ہوتا ہے اور پھر اس میں بتدریج معلومات جمع ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ معلومات میں اضافے کے ساتھ علم کے نور میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور جس طرح معلومات کی کوئی انتہا نہیں ہے اسی طرح نور علم کی بھی کوئی انتہا نہیں ہوگی۔ گویا نور علم کی مثال معلومات کیلئے ایک غلاف کی مانند ہے۔ غلاف کے اندر موجود حجم جتنا چھوٹا ہوگا غلاف بھی اتنا ہی چھوٹا ہوگا۔ اور غلاف کے اندر موجود چیز جتنی زیادہ ہوگی غلاف بھی اتنا ہی بڑا ہوگا اور نور علم کے غلاف کی کیفیت یہ ہے کہ آغاز میں یہ اس قدر چھوٹا ہوتا ہے کہ اس میں کوئی ایک معلوم (شے) ہی سما سکتی ہے لیکن جب دوسری معلومات کا اضافہ ہوتا ہے تو یہ پھیلتا چلا جاتا ہے اور پھر اس کے پھیلاؤ کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔

(ii) حرف علم کا دوسرا بنیادی جز یہ ہے کہ علم کو ضائع نہ کیا جائے۔ یہ خصوصیت علم کے اندر موجود ایک خاص قسم کا نور ہوتا ہے جس کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ علم کا نور صرف مستحق فرد تک پہنچے۔ لہٰذا یہ نور علم کو نااہل لوگوں تک پہنچنے سے روکتا ہے۔ اول تو یہ نور' علم کو کسی نااہل تک پہنچنے ہی نہیں دیتا اور اگر بالفرض غلطی سے علم کا نور کسی نااہل تک پہنچ جائے تو یہ نور اسے واپس کھینچ لیتا ہے اور نااہل کے پاس علم کے نور کو موجود نہیں رہنے دیتا۔

یہی وجہ ہے کہ جس وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم گفتگو فرمایا کرتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے علوم کے انوار خارج ہوتے تھے۔ برے اور نیک' مومن اور منافق' ہر طرح کے لوگ اس بیان کو سنتے تھے لیکن کسی بھی برے یا منافق شخص کے پاس اس علم کا نور نہیں ٹھہرتا تھا اور نہ ہی ان کے دل پر اثر انداز ہوتا تھا اور مذکورہ بالا نور' علم کے نور کو واپس اس کی اصل یعنی ذات محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لے آتا تھا۔ جہاں تک اہل محبت اور اہل ایمان کا تعلق ہے تو کیونکہ ان کا باطن حکمت اور بھلائی کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا اس لئے علم کا نور ان کے اندر برقرار رہتا تھا۔ ان حضرات کی اہلیت کی طرف قرآن نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا (الفتح' ۲۶:۴۸)

''وہ اس کے زیادہ حقدار اور اہل ہیں۔''

لہٰذا علم کی دو قسمیں ہوں گی: ایک پاکیزہ جس کا نور سفید ہوگا' اور دوسرا ناپاک جس کا نور نیلا ہوگا۔ اب اگر ہم یہ فرض کریں کہ چار افراد ہیں جن میں سے ایک کا علم پاک اور مکمل ہے۔ دوسرے کا پاک تو ہے لیکن تعداد میں کم ہے۔ تیسرے کا علم ناپاک ہے اور مکمل ہے اور چوتھے کا علم ناپاک بھی ہے اور نامکمل ہے۔ فرض کریں یہ چاروں اشخاص ایک جگہ پر اکٹھے ہو جاتے ہیں تو وہاں جس شخص کا علم پاک لیکن تعداد میں کم تھا وہ پاک اور مکمل علم والے شخص سے استفادہ کرے گا۔ اس کے برعکس جس کا علم ناپاک اور کم تھا وہ اس شخص سے استفادہ کرے گا جس کا علم ناپاک اور مکمل ہے۔ ناپاک علم والا' پاک علم والے سے اور پاک علم والا' ناپاک علم والے سے استفادہ نہیں کرے گا کیونکہ دونوں کی جنس ایک دوسرے سے مختلف ہے اور علم کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ضائع نہیں ہوتا اسی لئے کوئی بھی علم کسی مخالف جنس والے کے پاس نہیں ٹھہر سکتا۔

(iii) حرف علم کا تیسرا جز یہ ہے کہ حیوانات اور جمادات کی زبانوں اور آوازوں کی معرفت حاصل ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علم کامل میں ہر چیز کے حقائق' ذاتیات' لوازم اور عوارض کا علم بھی حاصل ہو جاتا ہے اور کسی چیز کی آواز یا زبان اس شے کے عوارض کے ذریعے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے یہ ناممکن ہے کہ عوارض کا علم حاصل ہو جائے لیکن عوارض کے ذریعے پیدا ہونے والی کسی چیز کا علم نہ ہو پھر اشیاء کی دو قسمیں ہیں: حیوانات اور جمادات' جمادات کی بھی مخصوص آواز ہوتی ہے' جیسے پانی کے چلنے کی آواز' دروازہ کھلتے وقت کی آواز' ایک پتھر کے دوسرے پتھر سے ٹکرانے کی آواز' علم کامل کا مالک شخص ان آوازوں کو سن کر ان کے مفہوم سے واقف ہو جاتا ہے۔ اسی طرح حیوانات کی بھی دو قسمیں ہے: حیوان ناطق اور حیوان غیر ناطق' حیوان ناطق سے مراد انسان ہے جبکہ غیر ناطق کی دو قسمیں ہوں گی: پرندے اور جانور' ان میں سے ہر ایک کی اپنی مخصوص بولی ہوتی ہے اور علم کامل رکھنے والا شخص ان میں سے ہر ایک کی بولی کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس بارے میں سیدی دباغ نے بہت سی حکایات بیان کی ہیں جن میں سے

چند ایک کا ذکر اس کتاب میں کیا جائے گا۔ سیّدی دباغ فرماتے ہیں: جمادات جیسے دیوار، گھر، جنگل، میدان، پہاڑ، درخت وغیرہ کی آواز کو صرف اللہ تعالیٰ جان سکتا ہے۔ تاہم بعض اوقات اللہ تعالیٰ کسی نبی کے معجزے یا ولی کی کرامت کی شکل میں اسی آواز کو ظاہر بھی فرما دیتا ہے۔

(iv) حرف علم کا چوتھا جز یہ ہے کہ کسی بھی چیز کے انجام سے آگاہی حاصل کی جائے۔ اس سے پہلے حرف روح کے اجزاء میں ہم نے یہ بات بیان کی تھی کہ روح کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اشیاء کی حقیقت کے درمیان فرق جان سکتی ہے اور اس نور کے نتیجے میں بعض اشیاء دیگر اشیاء سے ممتاز ہو جاتی ہیں اور جب یہ اشیاء اپنی انتہا تک پہنچ جائیں گی تو اس مقام پر روح کے اس نور کا کام ختم ہو جائے گا۔ اور حرف علم کے اس جز کے کام کا آغاز ہوگا کہ ہر چیز کے انجام سے متعلق تمام تفصیلات سامنے دکھائی دیں گی، انجام کی دو قسمیں ہیں، ایک یہ کہ وہ موجودات جن کا وجود آخرت میں باقی نہیں رہے گا اور دوسری وہ موجودات جن کا وجود آخرت میں باقی رہے گا حرف علم کے اس جز کے ذریعے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ فنا ہونے والی چیز کا انجام کب اور کس صورت میں ہوگا؟ کس طرح یہ بتدریج اپنے انجام کی طرف بڑھتی ہوئی فنا کے گھاٹ اتر جائے گی؟ فنا کا مقام کیا ہوگا؟ اس کے اسباب کیا ہوں گے؟ وغیرہ گویا علم کامل رکھنے والا شخص کسی بھی چیز کے انجام کو بخوبی ملاحظہ کر سکتا ہے۔ اسی طرح جو موجودات آخرت میں باقی رہیں گی حرف علم کے اس جز کے ذریعے جنت یا جہنم میں اس کے مرتبہ و مقام سے بھی آگاہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس کی تفصیل بہت طویل ہے ہو سکتا ہے کہ ہم اس کتاب میں کسی مقام پر اس نکتے کے بارے میں سیّدی دباغ کی زبانی کچھ واقعات موقع و محل کی مناسبت سے نقل کر دیں۔

(v) حرف علم کا پانچواں جز یہ ہے کہ انسانوں اور جنات سے متعلق تمام تر علوم سے آگاہی حاصل کی جائے۔ ان علوم کی تعداد بے شمار ہے۔ سیّدی دباغ فرماتے ہیں: صرف انسانوں سے متعلق علوم کی تعداد 366 ہے جبکہ جنات سے متعلق علوم کی تعداد 363 ہے۔ ان میں وہ علوم بھی شامل ہیں جن کا تعلق ان کی حیات اور بقا دونوں کے ساتھ ہے۔ حیات سے مراد وہ امور جو ان کی ظاہری زندگی سے تعلق رکھتے ہیں جیسے زراعت، تجارت، دستکاری وغیرہ اس کے علاوہ جدید (سائنسی، معاشرتی، معاشی، عمرانی غرضیکہ جملہ) علوم اس میں شامل ہوں گے۔ باطنی بقا سے مراد وہ علوم ہیں جن کا تعلق شریعت اور طریقت کے ساتھ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سرخرو ہونے کا طریقہ کیا ہے؟ شریعت کے احکام اور ان میں موجود انوار و اسرار کیا ہیں؟ دنیا اور آخرت میں انسان کو ان سے کیا فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اگر میں اس بارے میں سیّدی دباغ کے تمام ملفوظات نقل کروں جن میں ان تمام امور کی تفصیلات اور جزئیات شامل ہیں تو قارئین کو بہت سی حیرت انگیز معلومات حاصل ہوں گی جنہیں سن کر ہر شخص یہ اندازہ لگا لے گا کہ یہ بات بالکل درست ہے۔ میں بھی کئی برس تک سیّدی دباغ سے ان امور پر گفتگو کرتا رہا ہوں مثلاً مختلف

سلاسل طریقت کے مشائخ کے درمیان (تربیت کے طریقے) مختلف ہونے کا بنیادی سبب کیا ہے؟ علم فقہ کے ماہرین ائمہ کرام کی فقہی آراء ایک دوسرے سے مختلف کیوں ہوتی ہیں؟ مختلف انبیاء کرام کی شریعتوں کے احکام ایک دوسرے سے مختلف کیوں ہوتے ہیں؟ ان تمام امور کی بابت میں نے سیّدی دباغ کی زبانی بے شمار اسرار سنے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کی بدولت دنیا اور آخرت میں ہمیں سیّدی دباغ کے علوم سے نفع حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ سیّدی دباغ فرماتے ہیں: ان علوم میں ان آفات کا علم بھی شامل ہوگا جو انسان کی ظاہری یا باطنی بربادی کا باعث بنتی ہیں۔ ان آفات کی اقسام، وجہ نزول، نقصانات، ان نقصانات سے بچنے کے طریقے وغیرہ سب چیزیں ان میں شامل ہوں گی۔ اس میں علم طب میں مکمل مہارت بھی شامل ہوگی۔ خواہ اس کا تعلق انسان کی ظاہری زندگی کے ساتھ ہو یا باطنی زندگی کے ساتھ ہو۔

(vi) حرف علم کا چھٹا جز کائنات سے متعلق تمام امور سے آگاہی ہے۔ اس میں عالم علوی اور عالم سفلی دونوں شامل ہیں۔ عالم سفلی سات امور پر مشتمل ہے۔ چار عناصر یعنی آگ، ہوا، مٹی، پانی اور تین مرکبات یعنی جمادات، حیوانات اور نباتات لہٰذا علم کامل میں ان تمام امور سے آگاہی شامل ہوگی جس میں ان اشیاء کی حقیقت سے آگاہی، ان کی امتیازی خصوصیات سے واقفیت، ان کے نفع اور نقصان کا علم، غرضیکہ ان سے متعلق تمام معلومات شامل ہیں کیونکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک چیز بظاہر حجم میں کم ہوتی ہے لیکن اس کا اثر زیادہ ہوتا ہے اور دوسری چیز حجم میں زیادہ ہوتی ہے لیکن اس کا اثر کم ہوتا ہے۔

(vii) حرف علم کا ساتواں جز یہ ہے کہ علم کامل کے سامنے کل جہان سمٹ کر ایک جہت کی شکل اختیار کر جاتا ہے کیونکہ علم ایک نور ہے اس لئے یہ ہر ایک سمت میں موجود اشیاء کا ادراک کرتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ علم کامل کے مالک شخص کو یہ صلاحیت عطا کرتا ہے کہ وہ اپنے پیچھے، اوپر، نیچے، دائیں، بائیں موجود اشیاء کو اسی طرح دیکھ سکتا ہے جیسے وہ اپنے سامنے موجود اشیاء کو دیکھ سکتا ہے اس صورت میں تمام تر جہات سمٹ کر ایک جہت کی شکل اختیار کر جاتی ہیں۔ اس کے سامنے صرف آگے کی سمت باقی رہ جاتی ہے اور بقیہ تمام جہات معدوم ہو جاتی ہیں۔ یہ کیفیت صرف ''صاحب فتح'' ولی کو حاصل ہوتی ہے اور درج ذیل حدیث میں بھی اسی خصوصیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

انی لاراکم من خلفی کما اراکم من امامی

''میں اپنے پیچھے تمہیں اسی طرح دیکھتا ہوں جیسے اپنے سامنے دیکھتا ہوں۔''

اس لئے صحابہ کرام اگرچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے موجود ہوتے تھے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں اسی طرح ملاحظہ کر لیتے تھے جیسے اپنے سامنے موجود اشیاء کو ملاحظہ کرتے، جو شخص ان خصوصیات کا مالک نہ ہو اس کا علم کامل نہیں ہوتا۔

۶-حرف رسالت:

(i) حرف رسالت کا سب سے پہلا جز یہ ہے کہ روح جسم میں اپنی پوری رضامندی، قبولیت اور محبت کے ہمراہ قیام پذیر ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکیزہ اجسام میں کچھ مخصوص انوار موجود ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان کے نور سے فیض حاصل کرتے ہیں۔ انہی انوار کی قلت یا کثرت روح کی پسندیدگی یا ناپسند کا باعث بنتی ہے کیونکہ نور ہمیشہ نور ہی کی طرف مائل ہوتا ہے اور روح بھی ایک نور ہے۔ تاہم اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان کا نور، روح کے نور سے زیادہ روشن اور چمکدار ہوتا ہے لہٰذا جب کسی روح کو کسی جسم میں یہ نور دکھائی دے جائے تو وہ اس میں قیام کرنا پسند کرتی ہے۔ بالفرض ایک جسم کے اندر ایمان باللہ کا نور ایک بالشت کے برابر ہے اور دوسرے جسم میں دو بالشت کے برابر ہے تو روح دوسرے جسم میں قیام کرنا زیادہ پسند کرے گی۔ اسی طرح ایمان کا نور، اجر کے انوار کی بدولت بڑھتا رہتا ہے۔ ہر عمل کا مخصوص اجر اور ہر اجر کا مخصوص نور ہوتا ہے اور تمام اجور کے اثرات انسان کی ذات پر منعکس ہوتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے انسان کو دنیا میں یہ فائدہ نصیب ہوتا ہے کہ اس کے ایمان کے انوار زیادہ ہو جاتے ہیں اور آخرت میں یہ اجور، جنت کی نعمتوں کی شکل میں نیک اعمال کرنے والوں کو نصیب ہوں گے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: بالفرض اگر دو افراد کا نور ایمان برابر ہو اور پھر ان دونوں میں سے ایک سارا دن نیک اعمال کرتا رہے مگر دوسرا کوئی نیک عمل نہ کرے اور پھر رات کو دونوں ایک ساتھ سو جائیں تو جس شخص نے سارا دن نیک اعمال کیے تھے اس کے ایمان کا نور ساری رات جگمگاتا رہے گا۔ سیّدی دباغ فرماتے ہیں: سب سے زیادہ اجر رسول کو عطا کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی رسول کے ایمان کے مرتبے تک پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ اس کے بعد مرسلین میں (فضیلت کے فرق کے علاوہ) امتیوں کی قلت و کثرت کے اعتبار سے بھی مراتب میں فرق ہوتا ہے اور متبعین کی کثرت کے اعتبار سے کوئی بھی رسول ہمارے پیارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبے تک نہیں پہنچ سکتا۔ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیگر تمام مرسلین سے زیادہ اجر و ثواب عطا کیا جاتا ہے۔ لہٰذا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان کا نور دیگر تمام انبیاء و مرسلین کے نور سے اس قدر زیادہ ہوگا کہ دوسرا کوئی بھی اس تک پہنچنے کی صلاحیت نہیں رکھ سکتا۔ اس ساری گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ انبیاء کرام کی ارواح جس قدر رضا و رغبت کے ہمراہ ان حضرات کے اجسام میں قیام کرتی ہیں یہ کیفیت دیگر اہل ایمان کو حاصل نہیں ہے اور ارواح کے اس مخصوص قیام کی کیفیت کو ہم نے ''حرف رسالت'' کا پہلا جز قرار دیا ہے۔ آپ پر یہ بات بھی بخوبی واضح ہوگئی ہوگی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم اقدس میں جس قدر رضا و رغبت کے ہمراہ اور جس کیفیت میں سکونت پذیر ہے، یہ کیفیت دیگر انبیاء کو حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں ''حرف رسالت'' کا یہ جز اپنے مرتبہ کمال پر موجود ہے۔ جسم میں روح کی سکونت کی کیفیت میں فرق کا ایک اور سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ ایمان کا نور اگر روح سے کم ہو تو پھر روح کو بے

چینی محسوس ہوتی ہے۔ اگر ایمان کا نور زیادہ ہو تو روح کو راحت محسوس ہوتی ہے۔ سیّدی دباغ فرماتے ہیں: کفار میں ایمان کا نور سرے سے موجود ہی نہیں ہوتا۔ ان کے اجسام میں ارواح صرف اس لئے قیام کرتی ہیں تا کہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ تقدیر کے فیصلے کو نافذ کیا جا سکے وگرنہ ارواح ان اجسام میں قیام کو سخت ناپسند کرتی ہیں۔

(ii) غیب اور شہادت کا کامل علم: یہاں غیب سے مراد وہ علم ہے جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کی معرفت کے ساتھ ہے جبکہ شہادت سے مراد وہ علم ہے جس کا تعلق مخلوق کے ساتھ ہے جس میں انسانوں' جنات کے جملہ احوال کا علم' دنیا اور آخرت سے متعلق تمام علوم شامل ہیں۔ اس بارے میں ہم پہلے بھی تفصیلی طور پر تحریر کر چکے ہیں۔ تاہم یہاں علم کامل سے مراد ان تمام علوم کی انتہائی درجے کی معرفت ہے جس کا ہر رسول میں پایا جانا ضروری ہے اور ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ وصف سب سے زیادہ کمال کی صورت میں موجود ہے۔

(iii) حرف رسالت کا تیسرا جزیہ ہے کہ ہر حال میں ہر ایک کے ساتھ اقوال اور احوال میں سچائی اختیار کی جائے یعنی وہ تمام اقوال اور افعال اللہ تعالیٰ کی پسند اور رضا کے مطابق ہوں کیونکہ انبیاء اکرام تمام بنی نوع انسان کے پیشوا ہیں اور سب انسان ان حضرات کی پیروی کے پابند ہیں اس لئے ان حضرات میں یہ خصوصیت بدرجہ اتم موجود ہونی چاہئے۔ اس لئے انبیاء کرام ہمیشہ حق بات کہتے ہیں' سچ بولتے ہیں' ان کے مزاح میں بھی حقیقت کی ترجمانی موجود ہوتی ہے۔ ان کی کہی ہوئی بات وہ پوری ہو کر رہتی ہے اور اگر بظاہر پوری ہوتی دکھائی نہ دے تو ان کے قول کی صحیح تاویل کی جائے گی۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس کتاب میں بعض مقامات پر ہم ایسی چند باتوں کا تذکرہ کریں گے۔ مختصر یہ کہ ان حضرات کا کلام اہلِ جنت کی خواہشات کی مانند ہوگا جیسے اہل جنت' جنت میں جب بھی' کسی بھی چیز کی خواہش کریں گے تو وہ خواہش ضرور پوری ہوگی ''حرف نبوت'' کے پہلے جز (حق گوئی) اور ''حرف رسالت'' کے موجودہ جز کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ اس جز کا مالک گویا صرف تقدیر کا پیغام آگے بیان کر رہا ہے اس کا اپنا کوئی ارادہ نہیں ہے لیکن ''حق گوئی'' میں یہ خصوصیت نہیں ہوتی اس لئے ''حرف رسالت'' کے موجودہ جز کا نور ''حرف نبوت'' کے پہلے جز سے زیادہ بہتر ہوگا۔

(iv) حرف رسالت کا چوتھا جز سکون اور وقار ہے۔ اس سے مراد دل میں موجود وہ نور ہے جس کی موجودگی میں انسان ہمیشہ مطمئن رہتا ہے اور ہر حال میں صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد کرتا ہے یہاں تک کہ اگر اس شخص کو تبلیغ کا حکم ہو اور پھر ساری دنیا کے لوگ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں تو یہ ان کی کثرت کی کوئی پرواہ نہیں کرے گا بلکہ ان کی تمام تر اکثریت اس کی نظر میں نہ ہونے کے برابر ہوگی۔ کیونکہ وہ اس بات سے بخوبی واقف ہوگا کہ مخلوق میں ذاتی طور پر کسی بھی شخص کی مخالفت یا موافقت کرنے کی کوئی صلاحیت نہیں ہے۔ (سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہے) اس کے برعکس جس شخص میں سکون کا نور موجود

نہیں ہوگا اگر اس شخص کو یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص مجھے نقصان پہنچانے کے در پے ہے اور وہ ایسا کر بھی سکتا ہے تو اب یہ اس کے خلاف مدافعت کی تدبیریں سوچنا شروع کر دے گا کہ مقابلے یا فرار میں سے کون سی صورت بہتر رہے گی اور پھر اسی کشمکش میں دشمن سر پر آ جاتا ہے اور کچھ بھی نہیں ہوتا کیونکہ اس کا دل پریشان اور خیالات منتشر ہوتے ہیں۔ سکون اور وقار کو حرف رسالت کا جز اس لئے قرار دیا گیا ہے کیونکہ مرتبہ رسالت پر فائز شخص کا یہ فرض ہے کہ جب تک لوگ کفر سے باز نہ آ جائیں اس وقت تک ان سے دشمنی کی توقع رکھے اس لیے ایسا شخص کسی کی توجہ' عدم توجہ' محبت یا نفرت کی پرواہ نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نبی کے زمانے میں' کفار نے متحد ہو کر مقابلے کی کوشش کی لیکن انبیاء کرام کی دعوت و تبلیغ کے کام میں کوئی رکاوٹ نہ آ سکی۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: قرآن مجید کی جن آیات میں ''سکینہ'' کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد سکون کا یہی نور ہے' جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ۔

''پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور اہل ایمان پر سکینت نازل فرمائی۔''

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ''سکون'' نازل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ثابت قدمی کے آثار کا مشاہدہ کروایا گیا اور دشمن کی کثیر تعداد کے مقابلے میں ڈٹے رہنے کا انجام دکھایا گیا جبکہ مومنین پر ''سکون'' نازل کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے اور برکت سے اہل ایمان بھی پر سکون رہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس کے بعد سیّدی دباغ نے قرآن پاک کی درج ذیل آیت اور دیگر احادیث کی طرف بھی اشارہ کیا جن میں ''سکینہ'' کا ذکر موجود ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ۔

''تمہارے پاس ایک تابوت آئے گا جس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے سکون ہوگا۔''

اس کے بعد حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ سے منقول روایت میں موجود ''سکینہ'' کا تذکرہ ہوا۔ اس کے علاوہ ''سکینہ'' کے بارے میں چند دیگر روایات بھی منقول ہیں۔ مفسرین نے ''سکینہ'' کی تفسیر میں جو اقوال نقل کیے تھے وہ میرے علم میں تھے۔ تاہم سیّدی دباغ نے اس مقام کی ایسی تشریح کی جیسے آپ اس کا مشاہدہ کر کے بیان کر رہے ہوں۔ یہاں تک کہ مختلف نکات کے گرد گھومتی ہوئی گفتگو اس نکتے تک پہنچی کہ حضرت جبرائیل امین علیہ السلام کس طرح حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی صورت میں بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ اگر قارئین کی اکتاہٹ کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں وہ تمام گفتگو یہاں نقل کرتا۔

(۷) حرف رسالت کا پانچواں جز کامل مشاہدہ ہے کیونکہ یہ عقل سے ماورا مقام ہے اس لئے اس کی تشریح بیان نہیں کی جا سکتی بالکل اسی طرح جیسے ''حرف نبوت'' کے اجزاء میں ''معرفت الٰہیہ'' کی تشریح بیان نہیں کی

جاسکتی۔

(vi) حرف رسالت کا چھٹا جز یہ ہے کہ رسول کی زندگی میں ہی اسے وہ مشاہدات نصیب ہوں جو دوسروں کو مرنے کے بعد نصیب ہوتے ہیں۔ اسے حرف رسالت کا جز اس لئے قرار دیا گیا ہے کیونکہ انبیاء کرام لوگوں کو (آخرت کے عذاب یا ثواب) سے ڈرا کر یا ترغیب دے کر تبلیغ دین کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں اور یہ کام وہی شخص صحیح طریقے سے سرانجام دے سکتا ہے جو امور آخرت کا مشاہدہ کر رہا ہو کیونکہ اسی مشاہدے کی بدولت وہ امور آخرت سے متعلق جزئیات بیان کر سکے گا۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے عرض کیا: انبیاء کرام پر نازل ہونے والی وحی کی موجودگی میں مشاہدے کی کیا ضرورت ہے؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: وحی ایک خطاب ہے اور خطاب ان لوگوں سے کیا جا سکتا ہے جو ان کے معنی ومفہوم سے آگاہ ہوں۔ لہٰذا یہ مشاہدہ انبیاء کرام کے سامنے آخرت کے حالات کو مزید واضح کر دیتا ہے اور نبی اس کی بدولت آخرت کے احوال کا معائنہ کر لیتا ہے۔ وحی کے ذریعے گویا نبی کو اس بات کی اجازت دی جاتی ہے کہ اب وہ لوگوں کی فہم اور برداشت کے مطابق ان احوال کی تبلیغ کرے۔ جو باتیں لوگوں کی برداشت سے باہر ہوں ان کا مشاہدہ بھی نبی کو نصیب ہوتا ہے لیکن ان کی تبلیغ نہیں کی جاتی۔ اگر کسی ایسے شخص کے ساتھ کوئی کلام کیا جائے جو اس کے معنی ومفہوم سے آگاہ ہی نہ ہو تو وہ دوسروں تک اس کلام کو کیسے منتقل کر سکتا ہے؟

(vii) حرف رسالت کا ساتواں جز یہ ہے کہ نبی دنیا میں جنتیوں کی مانند زندگی بسر کرے یعنی نبی کی ذات دنیا میں انہی انوار سے سیراب ہو جن انوار سے اہل جنت' جنت میں سیراب ہوں گے۔ اس کی تشریح ہم یوں کر سکتے ہیں کہ کائنات کے دو حصے ہیں: ایک عالم فنا اور دوسرا عالم بقا۔ پھر ان دونوں میں سے ہر ایک کی دو قسمیں ہیں: ایک ظلمانی اور دوسری نورانی' عالم بقا کی نورانی قسم کو جنت اور ظلمانی قسم کو جہنم کہا جائے گا۔ اگر عالم فنا اور عالم بقا کے درمیان موجود حجاب زائل ہو جائے تو عالم بقا کی ہر قسم' عالم فنا سے تعلق رکھنے والی اپنی ہم جنس قسم کی مدد کرتی ہے چنانچہ نورانی بقا' نورانی فنا کی اور ظلمانی بقا' ظلمانی فنا کی مدد کرتی ہے۔ اس حجاب کے زائل ہونے کی کیفیت مختلف ہوتی ہے اور چھٹے جز (حرف علم) میں ہم اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ یہ حجابات انبیاء کرام کے سامنے سے' اسی دنیا میں ہٹا دیئے جاتے ہیں کیونکہ ان کا وجود نورانی ہوتا ہے اور یہ عالم بقا کے نورانی حصے سے سیراب ہوتے ہیں۔ عامۃ الناس کیلئے یہ حجاب قیامت کے دن زائل ہوگا اور اسی دن ہر مومن جنت سے اور ہر کافر دوزخ سے سیراب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم کی بدولت ہمیں دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھے۔ مختصر یہ کہ آخرت کے انوار سے سیرابی کا انحصار حجاب کے زوال کی کیفیت پر منحصر ہے کیونکہ انبیاء کرام کے سامنے سے یہ حجاب مکمل طور پر زائل ہو جاتا ہے اس لئے یہ حضرات دنیا میں بھی جنتیوں کی مانند زندگی بسر کرتے ہیں۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: آدمیت' قبض' بسط' نبوت' روح' علم' رسالت کے اجزاء کی یہی تشریح ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں یاددہانی کیلئے ان کو دہرا دیتا ہوں۔

ظاہری صورت کی خوبصورتی کا کمال' ظاہری حواس کا کمال' باطنی اخلاق کا حسن کمال' باطنی حواس کا حسن کمال' مردانگی' شیطانی اثرات سے محفوظ رہنا اور عقل کا کامل ہونا حرف آدمیت کے اجزاء ہیں۔

خیر سے لذت اور شر سے نفرت کی حس' انصاف' متضاد سے نفرت' امتثال امر' اپنی جنس کی طرف میلان' انقباض اور حق کے بارے میں کسی بھی قسم کی شرم نہ کرنا حرف قبض کے اجزاء ہیں۔

کامل خوشی' وجود میں خیر کا قیام' ظاہری حواس کی فتح' باطنی حواس کی فتح' رفعت' حسن تجاوز اور انکساری حرف بسط کے اجزاء ہیں۔

قول حق' صبر' رحمت' معرفت الٰہیہ' خوف تام' بغض باطل اور عفو حرف نبوت کے اجزاء ہیں۔

ذوق انوار' طہارت' تمیز' بصیرت' عدم غفلت' قوت سریان اور مادی اشیاء سے متاثر نہ ہونا حرف روح کے اجزاء ہیں۔ علوم کا بار اٹھانا' انہیں ضائع ہونے سے محفوظ رکھنا' تمام زبانوں اور آوازوں سے واقف ہونا' انجام سے واقف ہونا' کائنات سے متعلقہ علوم سے آگاہ ہونا' دنیا و آخرت کے جملہ علوم سے آگاہی اور تمام جہات کا ایک ہی جہت میں سمٹ آنا حرف علم کے اجزاء ہیں۔ روح کا پوری رضامندی اور محبت کے ہمراہ جسم میں قیام' علم کامل' صدق' سکون و وقار' کامل مشاہدہ' زندگی ہی میں مرحومین کی مانند ہونا اور اہل جنت کی مانند زندگی بسر کرنا حرف رسالت کے اجزاء ہیں۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں: صحابہ کرام اور تابعین سے منقول بعض الفاظ میں قرأت کا اختلاف انہی اصول پر منطبق ہوگا۔ ہم پہلے واضح کر چکے ہیں کہ حروف کی کل اقسام 49 ہیں اور عربی زبان میں 29 حروف تہجی ہیں۔ ان تمام حروف میں مذکورہ 7 حروف کے اجزاء میں سے کوئی نہ کوئی جزء موجود ہوگا۔

حروف تہجی میں سات حروف کے اجزاء

''ا'' امتثال کیلئے ہے جو ''قبض'' کا جز ہے۔

''ب'' سکون کے لیے ہے' جو ''رسالت'' کا جز ہے۔

''ت'' ظاہری حواس کے کمال کیلئے ہیں' جو ''آدمیت'' کا جز ہے۔

''ث'' انصاف کے لئے ہے' یہ ''قبض'' کا جز ہے۔

''ج'' صبر کیلئے ہے' یہ ''نبوت'' کا جز ہے۔

''ح'' کامل رحمت کیلئے ہے' یہ بھی نبوت کا جز ہے۔

''خ'' ذوق انوار کے لئے ہے' یہ ''روح'' کا جز ہے۔

''د'' طہارت کیلئے ہے' یہ ''روح'' کا جز ہے۔

''ذ'' زبانوں کی معرفت کیلئے ہے یہ ''علم'' کا جز ہے۔

''ر'' حسن تجاوز کیلئے ہے' یہ ''بسط'' کا جز ہے۔

''ز'' ہر ایک کے ساتھ صدق کیلئے ہے' یہ ''رسالت'' کا جز ہے۔

''ط'' تمیز کیلئے ہے' یہ ''روح'' کا جز ہے۔

''ظ'' شیطانی حصے سے محفوظ رہنے کیلئے ہے' یہ آدمیت کا جز ہے۔

''ک'' معرفت الہیہ کیلئے ہے' یہ ''نبوت'' کا جز ہے۔

''ل'' علم کامل کیلئے ہے' یہ ''رسالت'' کا جز ہے۔

''م'' مردانگی کیلئے ہے' یہ ''آدمیت'' کا جز ہے۔

''ن'' کامل خوشی کیلئے ہے' یہ ''بسط'' کا جز ہے۔

''ص'' کامل عقل کیلئے ہے' یہ ''آدمیت'' کا جز ہے۔

''ض'' قول حق کیلئے ہے' یہ ''نبوت'' کا جز ہے۔

''ع'' عفو کیلئے ہے' یہ ''نبوت'' کا جز ہے۔

''غ'' ظاہری صورت کے کمال کیلئے ہے' یہ ''آدمیت'' کا جز ہے۔

''ف'' حمل علوم کیلئے ہے' یہ ''علم'' کا جز ہے۔

''ق'' بصیرت کیلئے ہے' یہ ''روح'' کا جز ہے۔

''س'' عاجزی کیلئے ہے' یہ ''بسط'' کا جز ہے۔

''ش'' گرفت کے کمال کیلئے ہے اور یہ ''قبض'' کا جز ہے۔

''ہ'' ضد سے نفرت کیلئے ہے' یہ بھی ''قبض'' کا جز ہے۔

''و'' زندگی میں مرحوم کی مانند ہو جانے کیلئے ہے' یہ ''رسالت'' کا جز ہے۔

''لا'' عدم غفلت کیلئے ہے' یہ ''روح'' کا جز ہے۔

''ی'' آخری حرف ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے مکمل خوف کیلئے ہے جو ''نبوت'' کا جز ہے۔ گویا 5 حروف (ت' ض' م' ص' غ) کا تعلق ''آدمیت'' کے ساتھ ہے۔ 4 حروف (ا' ث' ش' ہ) کا تعلق ''قبض'' کے ساتھ ہے۔ 3 حروف (ر' ن' س) کا ''بسط'' کے ساتھ ہے۔ 6 حروف (ج' ح' ک' ض' ع' ی) کا تعلق ''نبوت'' کے ساتھ ہے۔ 5 حروف (د' خ' ط' ق' لام الف) کا تعلق ''روح'' کے ساتھ ہے' 2 (ذ' ف) حروف کا تعلق ''علم'' کے ساتھ ہے' 4 حروف (ب' ز' ل' و) کا تعلق ''رسالت'' کے ساتھ ہے۔ یہ 29 حروف تہجی' ''حروف سبعہ'' کے 49 میں سے 29 اجزاء کے بالمقابل آ گئے۔ اب باقی 20 اجزاء رہ گئے جن میں سے دو حرف ''آدمیت''' تین حروف قبض' چار حروف بسط' ایک حرف نبوت' دو حرف روح' پانچ حرف علم اور تین حرف رسالت

کے ساتھ تعلق رکھے ہیں۔ ان 20 حروف میں سے 18 حروف ''مدولین'' (ا، و، ی) میں اس طرح تقسیم ہوں گے کہ تینوں میں سے ہر ایک حرف کے حصے میں چھ حروف آئیں گے یعنی ''ا'' کے 6 ''و'' کے 6 اور ''ی'' کے 6۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ''حروف مدولین'' کو 6 گنا تک لمبا کر دیا کرتے تھے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) علم قرأت کے امام ابن جزری نے اپنی کتاب ''النشر'' میں ''مد'' کے احکام پر بحث کرتے ہوئے اس کے ''6'' مراتب بیان کیے ہیں جن کی تلخیص یہ ہے:

۱- ''مد'' کو ایک الف کے برابر کھینچا جائے۔ یہ ابن کثیر اور ابو جعفر کی قرأت ہے۔

2- ''مد'' کو 2 یا ڈیڑھ الف کے برابر کھینچا جائے۔ یہ دوری اور قالون کی قرأت ہے۔

3- 3 الف کے برابر کھینچا جائے۔ بعض نے اڑھائی بھی کہا ہے۔ یہ کسائی کی قرأت ہے۔

4- 4 الف یا ساڑھے تین الف کے برابر کھینچا جائے۔ یہ عاصم اور ابن عامر کی قرأت ہے۔

5-5 یا ساڑھے چار الف کے برابر کھینچا جائے یہ حمزہ اور ورش کی قرأت ہے۔

6- تقریباً 6 الف کے برابر کھینچا جائے۔

اس کے بعد ابن الجزری نے ''مد'' کے دو اور مراتب بھی بیان کیے ہیں۔ پہلا مرتبہ مذکورہ بالا مراتب میں سے سب سے پہلے مرتبے یعنی ایک الف کے برابر سے بھی کچھ کم ہے جسے اصطلاح میں ''بتر'' کہا جاتا ہے اور یہاں ''حرف مد'' کو حذف کر دیا جاتا ہے لیکن علم قرأت کے بعض ماہرین نے اسے غلط قرار دیا ہے۔ دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ سابقہ ذکر شدہ مراتب میں پانچویں اور چھٹے مرتبے کے درمیان ایک مرتبہ ہے لیکن اسے بھی درست قرار نہیں دیا جاتا اور مذکورہ بالا 6 مراتب ہی مستند ہیں جن کی طرف سیّدی دباغ نے اشارہ کر دیا ہے۔ اس بارے میں اور بھی بہت سی جزوی مباحث موجود ہیں جنہیں ہم سر دست نظر انداز کرتے ہیں۔ اس لیے ہم اپنے اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ''الف ممدودہ'' کیلئے مخصوص ''حروف سبعہ'' کے 6 اجزاء یہ ہیں: باطنی صورت کا کمال، روح کا پوری رضامندی کے ساتھ جسم میں داخل ہونا، احساس کا جسم کے ہر رگ و پے میں سرایت کر جانا، باطنی حواس کا کمال، بغض باطل، ذات میں بھلائی کا رچ بس جانا۔

''الف ممدودہ'' کی دو قسمیں ہیں: کبھی ''مد'' کا تعلق ضمیر متکلم کے ساتھ ہوتا ہے جیسے ''اِنَّـا اٰمَـنَّـا'' کیونکہ یہاں ''مد'' کے ذریعے متکلم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کبھی اس کا تعلق کسی دوسرے لفظ کے ساتھ ہوتا ہے جیسے ''مِنَ السَّمَآءِ مَآءً'' اس میں متکلم کے ساتھ کوئی نسبت نہیں ہے۔ جب ''مد'' کے ذریعے متکلم کی طرف اشارہ کیا گیا ہو تو یہ ''مد'' کا سب سے پہلا مرتبہ ہوگا یعنی یہاں پر ایک الف کے برابر ''مد'' کو کھینچا جائے گا۔ اور یہ ''باطنی حس کے کمال'' پر دلالت کرے گی۔

دوسرے مرتبے میں جب ''مد'' کو دو الف کے برابر کھینچا جائے گا تو یہ روح کے جسم میں برضا و رغبت قیام پر دلالت کرے گی۔

تیسرے مرتبے میں یہ ''حاسہ ساریہ'' پر دلالت کرے گی۔
چوتھے مرتبے میں یہ ''کمال حواس باطنی'' پر دلالت کرے گی۔
پانچویں مرتبے میں بغض باطل پر دلالت کرے گی اور چھٹے مرتبے میں یہ ''جسم میں بھلائی کے رچ بس جانے'' پر دلالت کرے گی۔

یہ اصول یاد رکھیں کہ مذکورہ بالا ہر مرتبے میں سابقہ مرتبے کی خصوصیت بھی شامل ہوتی چلی جائے گی یعنی پہلے مرتبے میں ایک جز موجود ہوگا۔ دوسرے مرتبے میں 2' تیسرے میں 3' چوتھے میں 4 اور پانچویں میں 5 اور چھٹے مرتبے میں 6 اجزاء موجود ہوں گے۔

لیکن اگر یہ ''الف ممدودہ'' متکلم کے علاوہ کسی اور لفظ کیلئے استعمال کیا گیا ہوگا تو اس وقت ''مد'' کا پہلا مرتبہ باطنی صورت کے کمال' دوسرا مرتبہ بغض باطل' تیسرا ذات میں بھلائی کا رچ بس جانا' چوتھا قوت ساریہ' پانچواں باطنی حس کا کمال اور چھٹا روح کا پوری رضامندی کے ساتھ جسم میں قیام کے ساتھ مخصوص ہوگا اور یہاں بھی ہر مرتبے میں سابقہ مرتبے کی خصوصیت جمع کی جائے گی۔

مذکورہ بالا 2 مراتب میں سے پہلے مرتبے کو حسن باطن کے کمال سے اس لیے شروع کیا گیا کیونکہ جب الف کو ضمیر متکلم کا جز قرار دیا جائے گا تو یہ کمال حسن باطن کی طرف اشارہ ہوگا کیونکہ ''آدمیت'' کمال کا بچھونا ہے جس کے ذریعے کمال کی تربیت ہوتی ہے لیکن جب ''الف ممدودہ'' کے ذریعے متکلم کے علاوہ کسی اور کی طرف اشارہ کیا جائے گا تو متکلم کے علاوہ کوئی اور ذات مراد ہوگی۔ اب اصول یہ ہے کہ باطنی صورت کا کمال ہی انسان کی باطنی خصوصیات کو سنوارتا ہے جیسے ایک آواز اسی وقت خوبصورت ہوگی جب باطنی خوبی اپنے مرتبہ کمال پر موجود ہوگی۔ یہاں باطنی حس کے کمال کو ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ اس کا تعلق صرف نفس کے اجزاء کی خوبصورتی کے ساتھ ہے۔

(''حروف مدہ'' میں سے) ''و'' کیلئے یہ 6 اجزاء مخصوص ہیں: عدم حیا' میل الی الجنس' فتح حواس ظاہرہ' فتح حواس باطنہ' مادی اشیاء کا عدم تاثر' قوت سریان۔

اگر ''واؤ ممدودہ'' کا تعلق ذات کے علاوہ کسی اور چیز کے ساتھ ہو جیسے "لیسوؤا وجوهكم لي" تو ایک ''و'' کے برابر ''مد'' میں عدم حیا ہوگی۔

دو ''و'' کے برابر مد میں عدم حیا کے ہمراہ اپنی جنس کی طرف میلان ہوگا۔
تین ''و'' کے برابر مد میں مذکورہ بالا دونوں اجزاء کے ہمراہ ظاہری حواس کی فتح ہوگی۔
چار ''و'' کے برابر مد میں مذکورہ بالا تین اجزاء کے ہمراہ باطنی حواس کی فتح ہوگی۔
پانچ ''و'' کے برابر مد میں مذکورہ بالا چار اشیاء کے ہمراہ المناک چیزوں کا عدم احساس ہوگا۔
چھ ''و'' کے برابر مد میں مذکورہ بالا پانچ چیزوں کے ہمراہ قوت سرایت ہوگی۔

لیکن اگر اس کا تعلق متکلم کی ذات کے ساتھ ہو تو پہلی صورت میں باطنی حواس کی فتح' دوسری میں اس کے ہمراہ ظاہری حواس کی فتح' تیسری میں ان دونوں کے ہمراہ اپنی جنس کی طرف میلان' چوتھی میں ان تینوں کے ہمراہ المناک اشیاء کا عدم احساس' پانچویں میں ان چاروں کے ہمراہ عدم حیاء' چھٹی میں ان پانچوں کے ہمراہ قوت سرایت ہوگی۔

''ی'' کے اجزاء 6 ہیں ضائع نہ کرنا' سامنے کی جہت میں موجود ہونا' انجام کی معرفت' انسان اور جنات سے متعلق علوم سے آگاہی' دنیا و آخرت سے متعلق علوم سے آگاہی' اہل جنت کی سی زندگی بسر کرنا۔

اگر ''ی'' کی نسبت ضمیر متکلم کی طرف ہوگی تو پہلی صورت میں احوال کونین کی معرفت' دوسری میں اس کے ہمراہ ضائع نہ کرنا' تیسری میں ان دونوں کے ہمراہ انجام کے معرفت' چوتھی میں ان تینوں کے ہمراہ انحصار جہات' پانچویں میں' ان چاروں کے ہمراہ جن و انس سے متعلق معلومات سے آگاہی اور چھٹی میں ان پانچوں کے ہمراہ اہل جنت کی مانند زندگی بسر کرنا ہوگا۔

اگر ''ی'' کی نسبت متکلم کی بجائے کسی اور چیز کی طرف ہو تو پہلی صورت میں انحصار جہات' دوسری میں ثقلین سے متعلق علوم سے آگاہی' تیسری میں اہل جنت کی مانند زندگی بسر کرنا' چوتھی میں انجام کی معرفت' پانچویں میں ضائع نہ کرنا' چھٹی میں دنیا اور آخرت سے متعلق علوم سے آگاہی شامل ہوگی۔ تاہم ہر قسم میں سابقہ قسم کا جز بلکہ اجزاء بھی شامل ہوں گے۔

18 اجزاء اور ان کے مراتب کی یہی تشریح ہے۔ بقیہ دو جز مشاہدہ حق اور کمال رفعت ہیں اور قرآن کے رسم الخط کا تعلق انہی دونوں کے انوار کے ساتھ ہے اور قرآن میں جس مقام پر ''ا' و' ی'' لکھے جائیں مگر پڑھے نہ جائیں تو ان مقامات میں ان حروف کے رسم الخط کا تعلق انہی دونوں اجزاء کے ساتھ ہوگا۔ اگر حرف کا مدلول بظاہر دکھائی دے تو اس کا تعلق مشاہدے کے ساتھ ہوگا اور اگر دکھائی نہ دے تو اس کا تعلق مقام رفعت کے ساتھ ہوگا۔

☆☆☆

قرآنی رسم الخط کی بحث

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: یہ رسم الخط نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دیا تھا یا صحابہ کرام نے خود اسے اختیار کیا؟ سیدی دباغ نے جواب دیا: یہ طریقہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے تحت اختیار کیا گیا تھا۔ صحابہ کرام نے اپنی طرف سے اس میں کوئی کمی بیشی نہیں کی۔ میں نے عرض کی: بعض اہل علم اس بات کے قائل ہیں کہ یہ رسم الخط صحابہ کرام نے خود اختیار کیا اس لیے اسے ضروری قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ صحابہ کرام زمانہ جاہلیت میں قریش میں رائج رسم الخط کے تحت لکھا کرتے تھے۔ اس لیے علم قرأت کے ماہرین ''ربا'' کو ''ربوا'' لکھتے ہیں کیونکہ قریش ایسے ہی لکھا کرتے تھے۔ قریش نے ''حیرہ'' کے رہنے والوں سے لکھنے کا فن

سیکھا تھا اسلئے وہ انہی کی نقل کرتے ہوئے یہ لفظ لکھا کرتے تھے لیکن بولتے وقت اپنے محاورے کے مطابق واؤ نہیں پڑھتے تھے جبکہ ''حیرہ'' کے رہنے والے اپنے محاورے کے مطابق اس لفظ میں واؤ بھی پڑھتے تھے اس لیے قریش کے رسم الخط میں بعض الفاظ دوسرے علاقوں کے تلفظ کے مطابق ہی موجود تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ ابوبکر باقلانی نے اپنی کتاب ''الانتصار'' میں یہ بات تحریر کی ہے کہ رسم الخط تلفظ کے تابع ہوتا ہے اس لیے ایسے طریقے سے تحریر کرنا چاہئے جس میں ہر تلفظ مکمل طور پر نمایاں تحریر ہو جائے۔ اگرچہ اس بارے میں شیخ ابوبکر باقلانی کا کلام کچھ طویل ہے لیکن ہم مِنْ وعَنْ اسے یہاں نقل کریں گے:

حضرت عثمان غنی کا قول

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا تھا: قرآن میں بعض مقامات پر ''لحن'' پایا جاتا ہے جسے عرب اپنے محاورے کے مطابق خود ہی درست کرلیں گے۔

اسی قول پر تبصرہ کرتے ہوئے باقلانی لکھتے ہیں کہ اس کی درست تاویل یہی ہوگی کہ جن حروف کو کتابت کے دوران تحریر کیا جاتا ہے لیکن زبانی تلفظ میں وہ استعمال نہیں ہوتے عرب قرأت کے دوران خود ہی انہیں حذف کردیا کریں گے۔ لیکن اگر تلفظ کی رعایت کرتے ہوئے رسم الخط تجویز کیا جاتا تو یہ مناسب تھا تاکہ غیر عرب کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوتے۔ مذکورہ بالا قول کا مطلب یہ تھا کہ عرب لوگ رسم الخط کی ظاہری شکل کی پرواہ کیے بغیر اپنے محاورے کے مطابق قرآن کی درست تلاوت کیا کریں گے۔ جیسے الصلوٰۃ' الزکوٰۃ' الحیوٰۃ' ان تینوں الفاظ میں ''واؤ'' موجود ہے لیکن پڑھنے کے دوران اس کا تلفظ موجود نہیں ہوگا۔ اسی طرح اسمٰعیل' اسحاق' الرحمٰن' ملک میں ظاہری طور پر ''الف'' دکھائی نہیں دے رہا لیکن اس کا تلفظ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح قالوا' خرجوا' کفروا کے آخر میں ''الف'' دکھائی دے رہا ہے لیکن اس کا تلفظ نہیں کیا جائے گا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ زیادہ بہتر یہی ہے کہ ان حروف کو تلفظ کے مطابق تحریر کیا جائے لیکن وہ یہ بات جانتے تھے کہ عرب پڑھتے وقت الفاظ کی تحریری ساخت کی بجائے اپنے محاورے کو سامنے رکھیں گے۔ اسی لیے فرمایا کہ عرب خود ہی اسے ٹھیک کرلیں گے۔ اس تاویل کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جسے شیخ عکرمہ نے نقل کیا ہے کہ جب کچھ قرآن مجید تحریری صورت میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش کیے گئے تو انہوں نے فرمایا اس میں ''لحن'' موجود ہے لیکن عرب خود ہی اسے ٹھیک کرلیں گے۔ اگر املاء کرانے والا قبیلہ ''ہذیل'' اور لکھنے والا قبیلہ ''ثقیف'' سے تعلق رکھتا تو رسم الخط کا کوئی اختلاف سامنے نہ آتا کیونکہ قبیلہ ''ثقیف'' کے لوگ رسم الخط کو تلفظ کے مطابق تحریر کرتے تھے جبکہ قبیلہ ''ہذیل'' کے لوگ اپنے محاورے میں ''ہمزہ'' کثرت سے استعمال کرتے تھے جنہیں کاتب نے تحریری صورت میں نقل کردیا۔ اب قرأت کرنے والے کو اس بات کا اختیار ہے کہ وہ لفظ کو بنو ہذیل کے محاورے کے مطابق ''ہمزہ'' کے ہمراہ ادا کرے یا قریش کے محاورے کے مطابق ''ء'' کے بغیر ادا کرے۔ اگر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے قول کی یہی تاویل نہ ہوتی تو ثقیف اور ہذیل کے قبیلے کا تذکرہ بے

معنی ہوتا۔ اس لیے ثابت یہ ہوا کہ مذکورہ بالا قول میں ''لحن'' کا مطلب یہ ہے کہ کاتب نے تحریر کرتے وقت الفاظ کے ظاہری تلفظ کا لحاظ نہیں رکھا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اس رسم الخط کو خود بھی تبدیل نہیں کیا اور دوسروں کو بھی ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ رسم الخط قرآن کے تحریری نسخوں میں ہر جگہ پھیل چکا تھا جسے مکمل طور پر تبدیل کروانا عملی طور پر ممکن نہیں رہا تھا۔

اس تاویل پر اعتراض

اگر اس تاویل پر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس صورت میں قرآن کی تحریری شکل میں غلطی واقع ہوگئی ہے اور اس میں ایسے حروف شامل ہو گئے ہیں جو درحقیقت قرآن کا حصہ نہیں ہیں اور یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ اگر انہیں تحریر نہ کیا جاتا تو یہ زیادہ بہتر تھا اس لیے اس تحریری شکل پر سب کا اتفاق ہے یعنی ایک غلط بات پر اتفاق ہے؟ تو ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے الفاظ اور ان کی ترتیب و تناسب کی حفاظت ہم پر لازم کی ہے یعنی اس کے الفاظ میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوسکتی مگر ہم کسی خاص رسم الخط کے مکلف نہیں ہیں کیونکہ اگر کسی مخصوص رسم الخط میں قرآن کا لکھنا واجب ہوتا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ضرور اس کا حکم دیتے لیکن احادیث کے ساتھ قرآن میں بھی ایسا کوئی حکم موجود نہیں ہے جس کے مطابق کسی مخصوص رسم الخط میں قرآن کا لکھنا لازم ہوتا۔ اجماع اور قیاس کے ذریعے بھی اس بات کی تائید نہیں ہوتی بلکہ احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو تحریری شکل میں محفوظ کرتے وقت کسی معین رسم الخط کی پابندی کا تذکرہ نہ کر کے بالواسطہ طور پر اس بات کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ ہر کاتب اپنے مخصوص رسم الخط کے مطابق تحریر کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خط کوفی اور خط اول میں قرآن کو لکھنا جائز ہے۔ ''ل'' کو ''ک'' سے مشابہ شکل میں لکھا جا سکتا ہے۔ ''الف'' کو ذرا ٹیڑھا کر کے لکھا جا سکتا ہے۔ غرضیکہ کسی ایک رسم الخط کی پابندی ضروری نہیں ہے اور تمام صحابہ کرام کے نزدیک رسم الخط میں اختلاف جائز تھا اور اس میں کوئی شرعی خرابی نہیں تھی کیونکہ رسم الخط صرف ایک علامتی اشارہ ہے اور جو حضرات کسی معین رسم الخط کو واجب قرار دیتے ہیں وہ شرعی دلیل دینے کے پابند ہیں جو ناممکن ہے۔

سیّدی دباغ کی رائے

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) یہ تمام گفتگو شیخ ابوبکر باقلانی کی تھی لیکن سیّدی دباغ ارشاد فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے عین مطابق قرآن کی آیات کو تحریر کیا اور اس میں بال برابر بھی اپنی طرف سے کوئی کمی بیشی نہیں کی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی (تلفظ کے اعتبار سے رسم الخط میں) مخصوص کمی بیشی کی ہدایت کی تھی تاکہ وہ اسرار ظاہر ہوسکیں جو عام انسانوں کی پہنچ سے باہر ہیں اور یہ رسم الخط زمانہ جاہلیت میں عربوں یا دنیا کی کسی قوم کے ہاں رائج نہیں تھا کیونکہ کسی کی بھی عقل یہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔ یہ رسم

الخط ایک ''سر'' ہے جو صرف قرآن مجید کے ساتھ مخصوص ہے اور یہ طرز تورات' انجیل بلکہ کسی بھی آسمانی صحیفے میں موجود نہیں ہے۔ نظم قرآن کی طرح رسم الخط میں ایک معجزہ ہے۔ انسان کی عقل یہ نہیں سمجھ سکتی کہ قرآن کی حروف میں (تلفظ ایک جیسا ہونے کے باوجود) ''مائۃ'' میں ''الف'' کیوں موجود ہے؟ اور ''فئۃ'' میں کیوں موجود نہیں ہے؟ یا ''بایید'' میں ایک ''ی'' زائد کیوں ہے؟ ''سعوا'' کے آخر میں ''الف'' کیوں موجود ہے؟ جبکہ ''سورہ سبا'' میں ''سعو'' کے آخر میں ''الف'' موجود نہیں ہے۔ قرآن میں ایک مقام پر ''عتوا'' موجود ہے اور دوسرے مقام پر ''عتو'' تحریر ہے (دونوں کا تلفظ یکساں ہے) ایک مقام پر ''یعفوا'' موجود ہے اور دوسرے مقام پر ''یعفو'' موجود ہے۔ ''امنوا' کفروا' خرجوا'' کے آخر میں ''الف'' تحریری شکل میں موجود ہے لیکن ''باؤ' جاؤ' فاؤ'' کے آخر میں موجود نہیں ہے۔ اسی طرح کی اور بھی بہت سی مثالیں موجود ہیں جیسے بعض مقامات پر ایک ہی جیسے الفاظ میں کوئی حرف موجود ہے اور پھر کسی دوسرے مقام پر اسی لفظ میں وہ حرف موجود نہیں ہے۔ اسی طرح رحمۃ' نعمۃ' قرۃ' شجرۃ کو کہیں ''ۃ'' کے ساتھ لکھا گیا ہے اور کہیں ''ۃ'' کے ساتھ لکھا گیا ہے۔

صلوٰۃ' حیوٰۃ وغیرہ جیسے الفاظ کو کہیں ''واؤ'' کے ہمراہ لکھا گیا تھا اور کہیں ''الف'' کے ہمراہ لکھا گیا ہے جیسے ''صلاتی'''' حیاتکم'' وغیرہ یہ تمام تبدیلیاں اور اختلاف کسی نہ کسی ''سر'' کا مظہر ہیں اور فتح کے حصول کے بعد ہی ان کے اسرار سے آگاہی نصیب ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ان کی حیثیت حروف مقطعات کی مانند ہے جن میں بہت سے اسرار پائے جاتے ہیں لیکن بہت سے لوگ ان اسرار سے واقف نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ حروف مقطعات ان سورتوں کے نام ہیں اور ہر ایک نے اپنے فہم کے مطابق ان کی تفسیر بیان کی ہے۔ حالانکہ یہ سب لوگ ان کے اصل حقائق سے بے بہرہ ہیں۔ اسی طرح قرآن کی تحریری شکل میں آنے والے ہر حرف میں مخصوص اسرار پائے جاتے ہیں۔

قرآن کے رسم الخط کو صحابہ کرام کی طرف منسوب کرنے سے کئی قباحتیں پیدا ہوں گی کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی موجودگی میں ایک مخصوص رسم الخط میں قرآن تحریر کروایا تھا۔ اگر صحابہ کا رسم الخط اسی کی مانند ہے تو یہ درحقیقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ہوگا اور اسے صحابہ کی ایجاد قرار نہیں دیا جا سکتا اور اس کی پیروی ضروری ہوگی۔ لہٰذا اس رسم الخط کو صحابہ کی ایجاد قرار دینے کا بالواسطہ مفہوم یہ ہوگا کہ آپ نماز کا طریقہ کار یا رکعات کی تعداد کو بھی صحابہ کی ایجاد قرار دیدیں لیکن اگر یہ مختلف ہو تو یہ کیسے ممکن ہے کہ صحابہ کرام' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تجویز کردہ رسم الخط کے برعکس طرز اختیار کر لیں کیونکہ ساری امت کی طرح صحابہ کرام کا بھی اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن مجید میں کسی بھی قسم کی کمی بیشی کرنا جائز نہیں ہے۔ اور ہم پہلے یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ قرآن مجید میں بعض الفاظ کو دو مختلف مقامات پر مختلف طرز میں تحریر کیا گیا ہے جن میں کسی حرف کی کمی یا اضافہ پایا جاتا ہے۔ اگر یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے مطابق نہ ہوتا تو اس کا بالواسطہ مطلب یہ ہوتا کہ صحابہ کرام اپنی طرف سے قرآن کے حروف میں کمی بیشی کی اجازت دی ہے تو یہ طے کرنا مشکل ہو جائے گا کہ

قرآن کے کون سے حروف میں کون سی کمی یا بیشی کی گئی ہے۔ البتہ اگر صحابہ کرام نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال ظاہری کے بعد قرآن کو تحریر کیا ہوتا تو ہم یہ کہہ سکتے تھے کہ اس کا رسم الخط صحابہ کا ایجاد کردہ ہے لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی حیات طیبہ میں قرآن مجید کو اس طرز میں تحریر کروایا تھا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے عرض کی: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو لکھنے کے طریقے سے واقف ہی نہیں تھے جیسے خود قرآن نے اس بات کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتَابٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ

''قرآن کے نزول سے پہلے تم لکھنا یا پڑھنا نہیں جانتے تھے کہ اہل باطل کسی شک کا شکار ہوں (کہ یہ تم نے اپنی طرف سے تحریر کیا ہے)''

سیّدی دباغ نے جواب دیا: اس کا مفہوم یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصطلاحی معنی میں کتابت کا فن نہیں سیکھا تھا۔ البتہ ''فتح ربانی'' کے اعتبار سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف کتابت بلکہ دیگر بے شمار علوم وفنون سے آگاہ تھے۔ آخر ایسا کیوں نہ ہو جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت سے تعلق رکھنے والے صاحب ''فتح'' اولیاء کرام' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے اور برکت کی وجہ سے' حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک آنے والی تمام اقوام وملل کی زبانوں اور طرز تحریر سے واقف ہوتے ہیں۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کو ''فتح'' نصیب فرما دے اور وہ شخص قرآنِ مجید اور لوح محفوظ دونوں کو دیکھے تو حروف کے طرز تحریر میں اسے مکمل مشابہت دکھائی دے گی۔ یہاں تک کہ ''آمَنُوْا'' ''كَفَرُوْا'' بھی لوح محفوظ میں اس طرح تحریر ہوں گے جس طرح ہمارے ہاں رائج قرآن مجید میں تحریر ہیں اور اس وقت اس شخص کو پتہ چلے گا کہ اس خاص طرز تحریر میں ایسے کون سے اسرار پائے جاتے ہیں جو عام لوگوں کی عقل سے ماوراء ہیں۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اگرچہ سیّدی دباغ خود اُمی ولی ہیں لیکن میں نے آپ کی زبانی قرآن کے ایسے تمام الفاظ کے اسرار کا بیان سنا ہے جن کے ظاہری طرز تحریر میں کسی حرف کی کمی بیشی ہو جاتی ہے جیسے ''کفروا'' اور ''مائۃ'' وغیرہ پھر میں نے اس بیان کو رسم الخط کے ماہرین کی تحریروں کی روشنی میں جانچا تو یہ بالکل درست معلوم ہوئے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال رہی تو میں اس موضوع پر ایک مستقل کتاب تحریر کروں گا تاکہ اہل علم صرف رسم الخط کے ماہرین کے بیان پر ہی اکتفاء نہ کریں کیونکہ ان حضرات نے صرف مخصوص حد تک ایسے الفاظ کی توجیہہ بیان کی ہے۔ غرضیکہ میں مسلسل سیّدی دباغ کے سامنے قرآن کے رسم الخط اور اس کی صحابہ کرام کی طرف نسبت کے حوالے سے مختلف اشکالات پیش کرتا رہا اور سیّدی دباغ نے ان سب کے تسلی بخش جوابات عنایت کیے۔ اللہ تعالیٰ ہماری طرف سے سیّدی دباغ کو جزاء خیر عطا فرمائے۔

الفاظِ قرآنی کا تحریری اختلاف

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اگرچہ مجھے یہ بات معلوم تھی کہ سیّدی دباغ کو قرآن مجید کا ایک پارہ بھی مکمل

یاد نہیں ہے اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ آپ میرے سوال کا صحیح جواب دے سکتے ہیں لیکن پھر بھی میں نے امتحان کے طور پر آپ سے سوال کیا۔ (قرآن میں استعمال ہونے والے) لفظ ''بایید'' میں کون سی ''ی'' زائد ہے؟ پہلی یا دوسری؟ آپ نے فرمایا: دوسری' میں نے آپ کو شک کا شکار کرنا چاہا مگر آپ نے پھر پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ فرمایا: دوسری! (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) شیخ ابوعبداللہ الخراز نے بھی یہی بات بیان کی ہے (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) ایک مرتبہ میں نے (قرآن میں استعمال ہونے والے لفظ ''ملاۂ'' کے بارے میں دریافت کیا: اس لفظ میں ''الف'' اور ''ہمزہ'' میں کون سا حرف زائد ہے؟ آپ نے فرمایا: ''الف۔'' (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اسی طرح میں نے اور بھی بہت سے الفاظ کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے ان سوالات کے مکمل طور پر درست جوابات یوں عنایت کیے جیسے کوئی ماہر حافظ جواب دیتا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے سوال کیا' ہم آپ کے اس بیان کو تسلیم کر لیتے ہیں کہ قرآن مجید کا رسم الخط توقیفی ہے لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوگا کہ قرآن مجید کو قیاسی (مروجہ) رسم الخط کے مطابق لکھنے میں کیا حرج ہے؟ (یعنی عام محاورے کے مطابق) حروف کو شامل یا حذف کر لیا جائے؟ سیدی دباغ نے جواب دیا: اللہ تعالیٰ کے قدیم کلام میں مخصوص اسرار پائے جاتے ہیں اور کتابت میں بھی مخصوص اسرار پائے جاتے ہیں اس لیے جو شخص قرآن مجید کو (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ) توقیفی طرز تحریر کے مطابق لکھے گا اس میں تمام اسرار موجود ہوں گے لیکن جو شخص قیاسی طرز تحریر کے مطابق اسے لکھے گا اس کی تحریر میں اسرار کم ہو جائیں گے۔ اب یہ تحریر اس شخص کی تحریر شمار ہوگی اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ کلمات قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس کے بعد سیّدی دباغ نے ایک مثال کے ذریعے اس بات کی وضاحت فرمائی۔ ایک شخص ''کان'' کو ''کون'' کی شکل میں لکھ دیتا ہے اور اس کے نزدیک اس رسم الخط میں لکھنے میں ایک مخصوص راز موجود ہے پھر ایک اور شخص آ کر اور اس رسم الخط کو دیکھ کر یہ اصرار کرتا ہے کہ میں اس لفظ کو ''کان'' کی شکل میں ہی تحریر کروں گا تو گویا اب اس نے پہلے شخص کے طرز تحریر میں موجود مخصوص ''سر'' کو نظر انداز کر دیا ہے۔ کیونکہ پہلے شخص کا مقصد یہ تھا کہ وہ لفظ ''کون'' کے اندر ''کان'' اور ''کون'' دونوں کے اسرار کو جمع کر دے یعنی ''کون زید'' لکھنے کا مفہوم یہ ہوگا ''کان زید وکونہ اللہ تعالیٰ'' (زید موجود تھا اور اللہ تعالیٰ نے اسے وجود عطا کیا ہے) بالکل اسی طرح جو شخص ''الصلوٰۃ' الزکوٰۃ' الحیوٰۃ کو الصلاۃ' الزکاۃ' الحیاۃ'' لکھے گا۔ وہ بھی ان الفاظ کے اسرار میں کمی کا مرتکب ہوگا۔

رسم الخط کا متواتر نہ ہونا

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: اگر قرآن کا رسم الخط توقیفی ہے اور اس رسم الخط کی مثال بھی الفاظِ قرآن کی مانند ہے جو مِنْ وَعَنْ وحی کے مطابق ہیں تو الفاظ قرآن کی طرح یہ رسم الخط بھی تواتر کے ساتھ منقول ہونا چاہیے تاکہ الفاظ قرآن کی طرح رسم الخط میں بھی کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہے؟ کیونکہ قرآن کا ہر ایک حرف تواتر کے ساتھ منقول ہے۔ جس میں کسی اختلاف یا اضطراب کی کوئی گنجائش موجود

نہیں ہے جبکہ رسم الخط اخبار آحاد سے منقول ہے جیسا کہ اس موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں میں اس بات کی تصریح کی گئی ہے اور جو چیز بھی اخبار آحاد کے طور پر منقول ہوگی اس میں اضطراب واقع ہوگا اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کا رسم الخط نقل کرنے والے حضرات کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے جس کا بالواسطہ نتیجہ یہ ہوگا کہ امت نے وحی کے ایک حصے (یعنی قرآن کے طرز تحریر) کو ضائع کر دیا ہے اور یہ کیسے ممکن ہے؟

سیّدی دباغ نے جواب دیا: امت نے وحی کے کسی ایک حصے کو بھی ضائع نہیں کیا اور الفاظ و طرز تحریر دونوں کے حوالے سے قرآن مجید مکمل طور پر محفوظ ہے اور اہل عرفان و مشاہدہ نے قرآن کے الفاظ اور ان کے مخصوص طرز تحریر کو یاد کر رکھا ہے اور اس میں ایک بال کے برابر بھی فرق نہیں آنے دیا کیونکہ یہ حضرات مشاہدے کے ذریعے ان علوم سے واقف ہوتے ہیں اس لیے یہ مشاہدہ تواتر سے زیادہ مستند ہوگا۔ جو حضرات کشف نہیں رکھتے انہوں نے قرآن کے الفاظ کو تو محفوظ رکھا لیکن چند الفاظ کے مخصوص طرز تحریر کو محفوظ نہ رکھ سکے لیکن یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے اور نہ ہی اس صورتحال میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ امت نے وحی کے ایک حصے کو ضائع کر دیا۔ بعض صوفیاء کا قرآن کے مخصوص طرز تحریر سے واقف ہونا اور اکثر علماء کا ان سے ناواقف ہونا بالکل اسی طرح ہوگا جیسے اکثر مسلمان قرآن کے حافظ نہیں ہوتے لیکن بعض حفاظ کی موجودگی ہی قرآن کی حفاظت کیلئے کافی ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) سیّدی دباغ کا یہ جواب نہایت خوبصورت ہے۔ آپ نے اس کے علاوہ اور بھی بہت سے اسرار بیان کیے جنہیں ہم طوالت کے خوف سے یہاں تحریر نہیں کریں گے۔

حضرت عثمانِ غنی کے قول کی تشریح

جہاں تک حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے اس قول کا تعلق ہے کہ قرآن مجید میں ''لحن'' پایا جاتا ہے اور عرب خود ہی اسے درست کرلیں گے تو یہ روایت حدیث مرسل ہے اس کے علاوہ اس کی سند بھی مشکوک ہے۔ شیخ ابوبکر باقلانی نے اس روایت کو مسترد کیا ہے۔ اسی طرح دیگر اہل علم بھی اس روایت کو قابل اعتماد قرار نہیں دیتے جن میں سے ایک شیخ ابوعمرو الدانی المقری ہیں جنہوں نے اپنی تصنیف ''المقنع'' میں یہ بات تحریر کی ہے:

''اگر کوئی شخص آپ کے سامنے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا یہ قول پیش کرے جس کے ظاہری معنی کے مطابق قرآن مجید کے رسم الخط میں غلطی پائی جاتی ہے تو آپ اسکے جواب میں یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ یہ روایت مستند نہیں ہے اس میں ایک خامی یہ ہے کہ اس کی سند اور روایت کے الفاظ میں اضطراب پایا جاتا ہے کیونکہ اس روایت کو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے حوالے سے عکرمہ اور ابن یعمر نے روایت کیا ہے حالانکہ یہ دونوں حضرات کبھی بھی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے نہیں ملے۔ نیز اس روایت کے الفاظ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ حضرت عثمان غنی کا کلام نہیں ہوسکتا کیونکہ اس روایت سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی دینی حمیت قابل

اعتراض ہے حالانکہ آپ کی دینی حمیت' مرتبہ و مقام' اسلام اور اہل اسلام کیلئے آپ کی خیر خواہی ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ یہ بات عقل سے ماورا ہے کہ آپ امت کی بہتری کیلئے صحابہ کرام کے ساتھ مل کر ''جمع قرآن'' کا کام تو پورے اہتمام کے ساتھ سرانجام دیں لیکن اس میں ''لحن'' کی غلطیاں چھوڑ دیں اور ان غلطیوں کی اصلاح ان لوگوں کے سپرد کر دیں جو مقام و مرتبہ کے اعتبار سے کسی بھی طرح آپ کے ہم پلہ نہیں ہو سکتے اس لیے ایسی بات کرنا یا اس بات کو درست سمجھنا بالکل غلط ہے۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس کے بعد شیخ المقری نے اس روایت کی سند پر تفصیل سے بحث کی۔ اسی طرح ''الانتصار'' میں زیادہ بہتر انداز میں اس بات کی تردید کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ شیخ ابوالقاسم الشاطبی اپنی کتاب ''العقیلہ'' میں تحریر کرتے ہیں:

ومن روی ستقیم العرب السنہا لحنا بہ قول عثمان فما شھرا

(عرب خود ہی لحن کی غلطی کو دور کر لیں گے جس میں اس بات کو حضرت عثمان سے منسوب کیا گیا ہے وہ ایک غیر مستند روایت ہے۔)

اس کتاب کی شرح میں شیخ الجعبری لکھتے ہیں: یہ روایت درست نہیں ہے کیونکہ اس کی سند میں اضطراب پایا جاتا ہے۔ حالانکہ اس روایت کے الفاظ میں بھی اضطراب پایا جاتا ہے کیونکہ ایک روایت کے مطابق حضرت عثمان غنی نے اس رسم الخط میں قرآن کو تحریر کرنے والوں کی تعریف کی تھی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت عثمان غنی ایک غلط کام پر کسی کی تعریف کریں۔ اگر حضرت عثمان غنی کے قول سے یہ مراد لی جائے کہ صحابہ کرام خود ہی ان کی طرف رجوع کر لیں گے تو یہ بات بھی مشکوک ہے کیونکہ اس صورت میں دور لازم آئے گا۔ اگر مصحف سے مراد جنس لی جائے تو یہ ایک قابل اعتراض بات ہوگی لیکن اگر اس سے صرف ایک مخصوص مصحف مراد ہو تو ہم نے وہ مصحف دیکھا ہی نہیں جس میں لحن کا اختلاف موجود تھا لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کے ہر نسخے کے اندر کوئی لحن موجود نہیں ہے۔ فصاحت اور کتابت کا تعلق قبیلہ قریش کے ساتھ تھا۔ دیگر تمام قبائل قریش ہی سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ قرآن میں موجود لحن کی درستگی کو دیگر قبائل کے سپرد کر دیا جائے۔ یہاں تک شیخ الجعبری کا کلام تھا (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اگر اس روایت کو مسترد کر دیا جائے تو معاملہ آسان ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ شیخ ابوالحسن القابسی پر رحم فرمائے کہ انہوں نے شیخ استاذ ابوبکر بن فورک پر اعتراض کرتے ہوئے یہ بات تحریر کی ہے کہ شیخ ابن فورک باطل روایات کی بھی توجیہہ پیش کر دیتے ہیں۔ القابسی فرماتے ہیں: احادیث کے مشکل مقامات کی تشریح صرف اسی وقت کی جا سکتی ہے جب حدیث صحیح ہو' کسی بھی باطل قول کو مسترد کرنے کیلئے یہی بات کافی ہے کہ وہ قول باطل ہے۔ جہاں تک شیخ ابوبکر کے اس قول کا تعلق ہے کہ کتاب و سنت اور اجماع و قیاس میں کوئی ایک دلیل بھی ایسی نہیں ہے جس کے ذریعے کسی مخصوص رسم الخط کو لازم قرار دیا جا سکے تو

اس بات کا جواب ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ رسم الخط کی بنیاد اصطلاح ہے اور جب یہ رسم الخط توقیفی ہوگا تو قرآن کی یہ آیت اس رسم الخط کی اتباع کے وجوب پر دلالت کرے گی:

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (الحشر ۵۹:۷)

"اور جو کچھ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہیں عطا فرمائیں سوأسے لے لیا کرو اور جس سے تمہیں منع فرمائیں سو (اُس سے) رُک جایا کرو۔"

شارع نے ایک مخصوص رسم الخط کو متعین کیا ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دیا ہے اس لیے کوئی بھی دوسرا رسم الخط وہ مخصوص معانی ادا نہیں کر سکے گا جو شارع کا اصل مقصد ہیں۔ اس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مخصوص طرز تحریر کی تعلیم دینا بھی ایک دلیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کو کسی مخصوص طرز تحریر میں لکھنے کا حکم نہیں دیا تھا تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس مخصوص طرز تحریر کو برقرار رکھنا بھی حدیث تقریری کی حیثیت رکھتا ہے۔ امام مالک اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک قرآن مجید کے رسم الخط میں کسی بھی طرح کی تبدیلی جائز نہیں ہے۔ شیخ ابوعمرو الدانی اپنی کتاب "المقنع" میں روایت نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ امام مالک سے دریافت کیا گیا کہ قرآن مجید کے رسم الخط میں ہمارے مروجہ طرز تحریر کے مطابق تبدیلی کرنا جائز ہے؟ تو امام مالک نے اسے ناجائز قرار دیا۔ شیخ ابوعمرو فرماتے ہیں: علماء امت میں سے کسی ایک نے بھی امام مالک کی اس رائے سے اختلاف نہیں کیا۔ ایک اور مقام پر لکھتے ہیں: ایک روایت کے مطابق امام مالک سے قرآن مجید کے بعض زائد حروف مثلاً "الف" "واؤ" کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ کیا انہیں تبدیل کرنا جائز ہے؟ تو امام مالک نے فرمایا: نہیں۔ شیخ ابوعمرو فرماتے ہیں: اس سے مراد وہ "الف" یا "واؤ" ہیں جو بعض الفاظ میں زائد طور پر لکھ دیئے جاتے ہیں۔

جیسے اولئک اولی اولات وغیرہ میں حرف "و" زائد ہے۔

لن ندعوا' قتلوا' اوضعوا' لا اذبحنه' مائة' مائتین وغیرہ میں "الف" زائد ہے۔

نبائ المرسلین اور ملاۂ وغیرہ میں "ی" زائد ہے۔

شیخ الجعبری نے بطور خاص امام مالک کا قول اس لیے نقل کیا ہے کیونکہ وہ خود بھی مالکی ہیں۔ اس موضوع پر گفتگو نہایت طویل ہو سکتی ہے یہاں تک کہ صرف اس موضوع پر ایک یا دو کتابیں تحریر بھی کی جا سکتی ہیں لیکن چونکہ ہمارا مقصد صرف سیدی دباغ کے ملفوظات کو جمع کرنا ہے اس لیے ہم اپنے اصل مقصد کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

(احمد بن مبارک فرماتے ہیں) 49 انوار' 29 حروف تہجی میں کس طرح تقسیم ہوں گے اور کن مقامات پر "مد" اور "حروف زائدہ" کا اعتبار کیا جائے گا۔ نیز کون سے حرف کے کون سے مخصوص انوار ہیں؟ اس کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔ اب ہم تین حرکات یعنی زبر' زیر' پیش کے اسرار بیان کریں گے۔ اس کے علاوہ جزم

(جو حرکت کی ضد ہوتی ہے) کے اسرار بھی بیان کریں گے۔

زبر کا تعلق حرف رسالت کے ساتھ ہے جبکہ زیر کا تعلق حرف آدمیت کے ساتھ ہے اور پیش اور جزم کا تعلق حرف قبض کے ساتھ ہے۔ کسی حرف قبض پر اگر جزم یا پیش ہو تو گویا اس میں دو اعتبار سے "حرف قبض" پایا جائے گا لیکن اگر کوئی حرف تہجی، حرف قبض سے متعلق نہ ہو اور اس پر پیش یا جزم موجود ہو تو حرف تہجی اپنے مخصوص انوار کی طرف منسوب ہوگا جبکہ جزم یا پیش کی نسبت "حرف قبض" کے ساتھ ہوگی جیسے "ث، ش، ہ" حرف قبض سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر ان حروف پر جزم یا پیش آ جائے تو ان میں دو اعتبار سے "قبض" پائی جائے گی۔ لیکن اگر حرف تہجی کا تعلق صرف قبض کے ساتھ نہ ہو جیسے "ب، ت" وغیرہ تو اس صورت میں اگر ان پر جزم یا پیش آ جائے تو صرف اس جزم یا پیش کا تعلق حرف قبض کے ساتھ ہوگا۔

اسی طرح حرف رسالت کے ساتھ تعلق رکھنے والے حروف تہجی پر اگر زبر آ جائے تو ان میں حرف رسالت کے دو اجزاء پائے جائیں گے۔ اسی طرح اگر حرف آدمیت کے ساتھ تعلق رکھنے والے کسی حرف تہجی پر زیر آ جائے تو اس میں حرف آدمیت کے دو اجزاء پائے جائیں گے۔ البتہ حرف نبوت، حرف بسط، حرف روح اور حرف علم کا کسی حرکت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ پیش کا تعلق حرف قبض کے ساتھ، زبر کا تعلق حرف رسالت کے ساتھ اور زیر کا تعلق حرف آدمیت کے ساتھ ہے جبکہ جزم کا تعلق حرف قبض کے ساتھ ہے لہٰذا یہ بات واضح ہوگئی کہ حرکات اور سکون کے ساتھ صرف تین حروف یعنی قبض، رسالت اور آدمیت متعلق ہیں۔

پیش کی اقسام

پیش کا تعلق حرف قبض کے ساتھ ہے، حرفِ قبض کے سات اجزاء کی مانند "پیش" کی بھی سات قسمیں ہونگی۔

ھدی، متقین، یومنون، الحمدللہ، نعبد، نستعین میں موجود پیش کا تعلق حرف قبض کے اس جز کے ساتھ ہے جو انسان کے پورے جسم میں موجود ہوتا ہے اور اس کے باعث انسان بھلائی سے لذت اور شر سے نفرت حاصل کرتا ہے۔

کفروا، الکافرون، الظالمون میں موجود پیش کا تعلق (حرف قبض کے جز) "ضد کے ساتھ نفرت" سے ہے۔

انزل اور اس جیسے الفاظ میں موجود پیش کا تعلق "امتثال" کے ساتھ ہے۔

اولئک میں آنے والی پیش، اپنی جنس کی طرف میلان سے متعلق ہے۔

خرجوا، اخرجوھم میں موجود پیش کا تعلق "گرفت کی مضبوطی کے ساتھ" ہے (جو حرف قبض کا ایک جز ہے)

"اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ" کا تعلق ایسے حق کے ساتھ ہے جس میں کوئی اختلاف نہ ہو۔

"قال اللہ" میں موجود پیش کا تعلق "حق بات کہنے میں حیا نہ کرنے کے ساتھ" ہے۔
اسی طرح جزم کی بھی سات قسمیں ہونگی۔
"الحمد" میں آنے والی جزم جسم میں موجود حسن کیلئے مخصوص ہوگی۔
"العالمین" میں موجود جزم انصاف کیلئے ہوگی۔
"الرحمن" میں موجود جزم امتثال امر کے لیے ہوگی۔
"نعبد" کی جزم قوت گرفت کی مضبوطی کیلئے ہوگی۔
"اھدنا" کی جزم ضد سے نفرت کیلئے ہوگی۔
"غیر" کی جزم قول حق کی ادائیگی میں عدم حیاء کیلئے ہوگی۔
"ربھم" کی جزم اپنی جنس کی طرف میلان کیلئے ہوگی۔

زبر کی سات اقسام

اسی طرح زبر کی بھی سات قسمیں ہونگی لیکن ان کا تعلق حرف رسالت کے اجزاء کے ساتھ ہوگا۔
"الحمد" میں "ا" پر آنے والی زبر مشاہدے کیلئے اور "ح" پر آنے والی زبر "سکینت" کیلئے ہوگی۔
"العالمین" کے "ن" کا زبر حیات اہل جنت کے لئے جبکہ "یوم" میں "ی" پر آنے والی زبر صدق کیلئے ہوگی۔
"ایاك" میں "ک" پر آنے والی زبر کا تعلق اور علیھم میں "ع" اور "ل" پر موجود زبر کا تعلق علم کامل کے ساتھ ہے۔
"نستعین" میں "ت" کی زبر اور "الصراط" میں "ص" پر آنے والی زبر کا تعلق جسم میں روح کی برضا و رغبت قیام کے ساتھ ہے۔
"عبدك، عبادك، اولئك" میں "ک" پر آنے والی زبر کا تعلق زندگی ہی میں مر جانے کی کیفیت کے ساتھ ہے۔

زیر کی سات اقسام

حرفِ آدمیت کے اجزاء کے اعتبار سے زیر کی سات قسمیں ہونگی۔
"اللہ" میں "ل" پر آنے والی زیر بلکہ ہر وہ لام جو کلمے کے آغاز یا درمیان میں آئے اس پر آنے والی زیر باطنی حسن کے کمال کیلئے ہوگی۔
"رب" میں آنے والی زیر عقل کامل کیلئے ہے۔
"العالمین" میں "م" پر آنے والی زیر ظاہری حواس کے کمال کیلئے ہے۔

''الرحمن'' کے آخر میں آنے والی زیر باطنی صورت کے کمال کیلئے ہے۔

''مالك'' کے آخر میں آنے والی زیر ظاہری صورت کے کمال کیلئے ہے۔

''الدین'' کے آخر میں آنے والی زیر شیطانی اثرات کو دور کرنے کیلئے ہے۔

جب یہ بات آپ کے سامنے واضح ہو گئی کہ تمام حروف' حرکات یہاں تک کہ ''مد'' کے مختلف مراتب بھی سات باطنی انوار سے باہر نہیں ہیں تو اب آپ کو اس حدیث کا مفہوم بآسانی سمجھ میں آ جائے گا:

''بے شک قرآن کو سات حروف پر نازل کیا گیا ہے'' (صحیح بخاری'۲:۸۵۱'رقم:۲۲۸۷)

علم قرأت کے ماہرین کے درمیان پایا جانے والا اختلاف بھی اس حدیث کے مفہوم سے خارج نہیں ہوگا۔اس کی وضاحت ہم سورہ فاتحہ کی تشریح کے ضمن میں کرتے ہیں۔

الحمدللہ کی تفسیر:

الحمدللہ میں حرف آدمیت کے تین اجزاء موجود ہیں۔''م'' ذکوریت کیلئے''ہ'' پر آنے والی زیر بھی ذکوریت کیلئے''ل'' پر آنے والی زیر باطنی حس کے کمال کیلئے ہے۔

اس میں حرف نبوت کا ایک جز موجود ہے جو''ح'' میں ہے اور یہ جز رحمت ہے۔اس میں''د'' میں حرف روح کا ایک جز طہارت موجود ہے۔

اس میں حروف' حرکات اور جزم کے اعتبار سے حرف قبض کے پانچ اجزاء موجود ہیں۔

''ا'' یہ امثال امر کیلئے ہے جو حرف قبض کا جز ہے۔''ل'' پر موجود جزم حاسہ ساریہ کیلئے ہے۔''م'' پر موجود جزم بھی حاسہ ساریہ کیلئے ہے۔''د'' پر پیش بھی حاسہ ساریہ کیلئے ہے غرضیکہ سورۃ فاتحہ میں موجود ہر پیش حاسہ ساریہ کیلئے ہے۔''ہ'' ضد کے ساتھ نفرت کیلئے ہے اور یہ تمام اجزاء حرف قبض سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس میں حرف رسالت کے 6 اجزاء موجود ہیں۔

''ا'' پر آنے والی زبر مشاہدے کیلئے ہے۔''ل'' علم کامل کیلئے ہے۔''ح'' پر آنے والی زبر سکینت کیلئے ہے۔''ل'' پر آنے والی زیر بھی علم کامل کیلئے ہے۔مشدد''ل'' بھی علم کامل کیلئے ہے۔اس پر مشدد زبر مشاہدے کیلئے ہے۔سورۃ فاتحہ میں ہر وہ مشدد حرف جس پر زبر موجود ہو مشاہدے کیلئے ہوگا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ اس میں حرف آدمیت کے تین' حرف نبوت کا ایک' حرف روح کا ایک' حرف قبض کے پانچ اور حرف رسالت کے چھ اجزاء موجود ہیں۔

''ا'' میں حرف کے اعتبار سے قبض ہوگا اور اس پر حرکت کے اعتبار سے حرف رسالت موجود ہوگا جبکہ''ل'' میں اس کے برعکس حرف کے اعتبار سے حرف رسالت موجود ہوگا اور جزم کی بدولت حرف قبض موجود ہوگا۔''ح'' میں حرف کے اعتبار سے حرف نبوت اور اس پر موجود حرکت کے اعتبار سے حرف رسالت ہوگا۔''م'' میں حرف کے اعتبار سے حرف آدمیت اور اس پر موجود جزم کے اعتبار سے حرف قبض موجود ہوگا۔''د'' میں حرف کے اعتبار

سے حرف روح اور اس پر موجود حرکت کے اعتبار سے حرف قبض ہوگا۔ پہلے ''ل'' میں حرف کے اعتبار سے حرف رسالت اور اس پر موجود حرکت کے اعتبار سے حرف آدمیت ہوگا۔ دوسری ''ل'' جو مشدد ہے اس میں حرف کے اعتبار سے حرف رسالت اور حرکت کے اعتبار سے بھی حرف رسالت ہوگا۔ ''ہ'' میں حرف کے اعتبار سے حرف قبض اور حرکت کے اعتبار سے حرف آدمیت ہوگا۔

رب العالمین کی تفسیر:

اس میں حرف آدمیت کے چار اجزاء موجود ہیں۔ ''ب'' کے نیچے آنے والی زیر عقل کامل کیلئے ''ع'' کے بعد آنے والا ''ا'' حس ظاہری کے کمال کیلئے ''م'' ذکوریت کیلئے اور اس پر موجود زیر ظاہری حواس کے کمال کیلئے ہوگی اور یہ سب حرف آدمیت کے اجزاء ہیں۔

اس میں حرف قبض کے دو اجزاء پائے جاتے ہیں: ہمزہ فصل امتثالِ امر کیلئے اور ''ل'' ساکن (جو ''ال'' میں موجود ہے) انصاف کیلئے ہے۔ یہ دونوں حرف قبض کے اجزاء ہیں۔

اس میں حرف بسط کے بھی دو اجزاء پائے جاتے ہیں: ''ر'' حسن تجاوز کیلئے اور ''ن'' فرح کامل کیلئے۔ اس میں حرف نبوت کا ایک جز پایا جاتا ہے اور وہ ''ع'' ہے جو حرف نبوت کے جز عفو کیلئے مخصوص ہے۔ اس میں حرف رسالت کے آٹھ اجزاء پائے جاتے ہیں: ''ر'' پر موجود زبر اور ''ب'' سکینت کیلئے ہیں۔ ''ا'' پر زبر مشاہدہ کیلئے ہے۔ ''ل'' علم کامل کیلئے ہے۔ ''ع'' پر زبر سکینت کیلئے ہے پھر ''ل'' علم کامل کیلئے ہے اور اس پر موجود زیر مشاہدہ کیلئے ہے۔ ''ن'' پر موجود زبر اہل جنت کی مانند زندگی بسر کرنے کیلئے ہے اور یہ سب حرف رسالت کے اجزاء ہیں۔

اس میں حرف علم کا ایک جز پایا جاتا ہے اور وہ (العالمین میں موجود) ''ی'' ہے کیونکہ یہ تمام جہات کے سامنے کی جہت میں سمت جانے کیلئے مخصوص ہے اور یہ حرف علم کا ایک جز ہے۔

(نتیجہ یہ نکلا کہ) ''ر'' میں حرف کے اعتبار سے حرف بسط اور حرکت کے اعتبار سے حرف رسالت پایا جاتا ہے۔

''ب'' میں حرف کے اعتبار سے حرف رسالت اور حرکت کے اعتبار سے حرف آدمیت پایا جاتا ہے۔

''ا'' میں حرف کے اعتبار سے حرف قبض اور حرکت کے اعتبار سے حرف رسالت پایا جاتا ہے۔

''ل'' میں حرف کے اعتبار سے حرف رسالت اور سکون کے اعتبار سے حرف قبض پایا جاتا ہے۔

''ع'' میں حرف کے اعتبار سے حرف نبوت اور حرکت کے اعتبار سے حرف رسالت پایا جاتا ہے۔

''ا'' میں حرف آدمیت پایا جاتا ہے۔

''ل'' میں حرف کے اعتبار سے حرف رسالت اور حرکت کے اعتبار سے بھی حرف رسالت پایا جاتا ہے۔

''م'' میں حرف کے اعتبار سے حرف آدمیت اور حرکت کے اعتبار سے بھی حرف آدمیت پایا جاتا ہے۔

''ی'' میں حرف علم پایا جاتا ہے۔

''ن'' میں حرف کے اعتبار سے حرف بسط اور حرکت کے اعتبار سے حرف رسالت پایا جاتا ہے۔

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کی تفسیر

اس میں آدمیت کے پانچ اجزاء پائے جاتے ہیں:

''م'' ذکوریت کیلئے ''ن'' پر آنے والی زیر باطنی صورت کے کمال کیلئے ''ح'' پر آنے والی زیر ظاہری حسن کے کمال کیلئے ''م'' پھر ذکوریت کیلئے' اس پر آنے والی زیر عقل کے کمال کیلئے ہوگی اور یہ سب حرف آدمیت کے اجزاء ہیں۔ اس میں حرف قبض کے بھی پانچ اجزاء موجود ہیں:

''ا'' امتثال امر کیلئے ''ل'' ساکن ''حاسہ ساریہ'' کیلئے ''ح'' ساکن امتثال قول حق کیلئے ''ا'' پھر امتثال امر کیلئے ''ل'' ساکن پھر حاسہ ساریہ کیلئے یہ سب حرف قبض کے اجزاء ہیں۔

اس میں حرف بسط کے تین اجزاء موجود ہیں:

''ر'' حسن تجاوز کیلئے ''ن'' فرح کامل کیلئے دوسری ''ر'' حسن تجاوز کیلئے

اس میں حرف نبوت کے دو اجزاء پائے جاتے ہیں:

''ح'' دو مرتبہ استعمال ہوئی اور دونوں مرتبہ کامل رحمت کیلئے' جو حرف نبوت کا ایک جز ہے۔ اس میں حرف رسالت کے سات اجزاء موجود ہیں۔

''ا'' پر زبر مشاہدے کیلئے ''ل'' علم کامل کیلئے' مشدد ''ر'' پر زبر مشاہدے کیلئے ''م'' پر زبر ہر ایک کے ساتھ سچائی کیلئے ''ا'' پر زبر مشاہدے کیلئے ''ل'' علم کامل کیلئے' مشدد ''ر'' پر زبر مشاہدے کیلئے۔

اگر بعد والے حرف (ر) میں مدغم ہونے کے باعث دونوں ''ل'' کو نکال دیا جائے تو پھر یہاں پر حرف رسالت کے پانچ اجزاء باقی رہ جائیں گے۔ اس صورت میں یہاں سے حرف رسالت کے دو اور حرف قبض کے بھی دو اجزاء ساقط ہو جائیں گے۔

اس میں حرف علم کا صرف ایک جز موجود ہے۔ (الرحیم میں آنے والی) ''ی'' جسے کھینچ کر ادا کیا جاتا ہے اور یہ تمام جہات کے سامنے کی جہت میں سمٹ آنے کیلئے مخصوص ہے۔

''م'' کے بعد آنے والی ''ا'' حواس ظاہری کے کمال کیلئے ہے اس لیے یہاں پر حرف آدمیت کے ایک جز کا اضافہ ہو جائے گا۔

حرف اور حرکت کے اعتبار سے کون سے حرف تہجی کے ساتھ کون سا نورانی حرف متعلق ہوگا اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔

مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کی تفسیر:

اس میں حرف آدمیت کے سات اجزاء پائے جاتے ہیں:

''م'' ذکوریت کیلئے ''ل'' پر موجود زیر باطنی حواس کے کمال کیلئے ''ک'' پر موجود زیر ظاہری صورت کے کمال کیلئے ''م'' ذکوریت کیلئے اس پر موجود زیر ظاہری حواس کے کمال کیلئے ''د'' پر موجود زیر باطنی صورت کے کمال کیلئے ''ن'' پر موجود زیر شیطانی اثرات کو دور کرنے کیلئے۔

یہ تقسیم اس وقت ہوگی جب آپ قصر کے طور پر پڑھیں گے۔ (یعنی ملک پڑھیں گے) اگر آپ ''مد'' کے ساتھ پڑھیں گے (یعنی مالک پڑھیں گے) اور ''م'' کے بعد ''ا'' کا اضافہ کر دیں گے تو اس صورت میں حرف آدمیت کے اجزاء آٹھ ہو جائیں گے کیونکہ ''ا'' باطنی حواس کے کمال کیلئے استعمال ہوا ہے کیونکہ جب بھی ''ا'' ممدودہ ضمیر متکلم کے طور پر استعمال نہیں ہوگا وہ ہمیشہ باطنی حواس کے کمال کیلئے استعمال ہوگا۔

اس میں حرف قبض کا ایک جز استعمال ہوا ہے اور وہ ساکن ''د'' ہے جو حاسہ ساریہ کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ جس ''ل'' کو (لفظ ''الدین'') ''د'' میں مدغم کر دیا گیا ہے اس پر موجود جزم لغو شمار ہوگی۔

اس میں حرف بسط کا بھی ایک جز موجود ہے یعنی ''ن'' فرح کامل کیلئے استعمال ہوا ہے۔

اس میں حرف نبوت کے دو اجزاء موجود ہیں۔ ''ک'' معرفت الٰہی اور ''ی'' خوف تام کیلئے استعمال ہوا ہے۔ اس میں حرف روح کا ایک جز ہے یعنی ''د'' طہارت کیلئے استعمال ہوا ہے۔

اس میں حرف رسالت کے تین اجزاء ہیں۔ ''ل'' علم کامل کیلئے ''ال'' کا ''ا'' اور ''ل'' دونوں ساقط ہوں گے۔ ''م'' پر موجود زبر صدق کیلئے اور ''ی'' پر موجود زبر بھی صدق کیلئے استعمال ہوئی ہے۔

اس میں حرف علم کے دو اجزاء موجود ہیں۔ ''د'' زندگی میں ہی مر جانے اور ''ی'' تمام جہات کے سامنے کی جہت میں سمٹ آنے کیلئے استعمال ہوا ہے۔

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ:

اس میں حرف آدمیت کے چھ اجزاء موجود ہیں:

''ا'' پر زیر کمال عقل کیلئے مد والا ''ا'' ظاہری حواس کے کمال کیلئے ''ایاک'' میں ''ا'' پر زیر اور (نستعین میں) ''ت'' ظاہری حواس کے کمال کیلئے اور ''ع'' پر آنے والی زیر باطنی حس کے کمال کیلئے ہے۔

اس میں حرف قبض کے چھ اجزاء موجود ہیں:

پہلا ''ا'' امتثال امر کیلئے ''ع'' پر جزم گرفت کی مضبوطی کیلئے ''ب'' پر پیش حاسہ ساریہ کیلئے ''د'' پر پیش بھی حاسہ ساریہ کیلئے ''س'' پر جزم امتثال امر کیلئے اور ''ن'' پر پیش حاسہ ساریہ کیلئے۔

اس میں حرف بسط کے چار اجزاء پائے جاتے ہیں:

تین ''ن'' فرح کامل کیلئے اور ''س'' عاجزی وانکساری کیلئے۔

اس میں حرف نبوت کے چھ اجزاء پائے جاتے ہیں

''ی'' مکمل خوف کیلئے ''ک'' معرفت الٰہیہ کیلئے ''ع'' عفو کیلئے۔ (نستعین میں بھی) یہی تینوں حروف

ہیں۔

اس میں حرف روح کا صرف ایک جز پایا جاتا ہے یعنی ''ذ'' طہارت کیلئے استعمال ہوا ہے۔اس میں حرف رسالت کے دس اجزاء استعمال ہوئے ہیں۔

''ی'' پر آنے والی زبر، ہر ایک کے ساتھ سچائی کیلئے ''ک'' پر آنے والی زبر علم کامل کیلئے ''ن'' پر آنے والی زبر اہل جنت کی مانند زندگی بسر کرنے کیلئے ''ی'' سکینت کیلئے ''ذ'' زندگی میں ہی مر جانے کیلئے، اس پر موجود زبر مشاہدے کیلئے ''ی' ک اور ن'' پر زبر کا حکم حسب سابق ہوگا۔''ی'' پر موجود زبر روح کے برضا و رغبت جسم میں قیام کیلئے ہے۔

اس میں حرف علم کا صرف ایک جز موجود ہے اور وہ ''مد'' والی ''ی'' ہے جو کونین سے متعلق علوم کی معرفت سے متعلق ہے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ:

اس میں حرف آدمیت کے 9 اجزاء موجود ہیں:

''ا'' پر زیر کمال عقل کیلئے ''د'' پر زیر باطنی صورت کے کمال کیلئے ''ص'' کمال عقل کیلئے اس پر موجود زیر باطنی حس کے کمال کیلئے ''مد'' والا ''ا'' باطنی حس کے کمال کیلئے ''م'' ذکوریت کیلئے ''ت'' ظاہری حس کے کمال کیلئے ''ق'' پر موجود زیر ظاہری حواس کے کمال کیلئے اور آخری ''م'' ذکوریت کیلئے۔

اس میں حرف قبض کے آٹھ اجزاء موجود ہیں:

''ا'' امتثال امر کیلئے ''ہ'' ضد سے نفرت کیلئے ''ہ'' پر موجود جزم بھی ضد سے نفرت کیلئے۔ ''ہمزہ وصل'' امتثال امر کیلئے (الصراط اور المستقیم میں) دو مرتبہ استعمال ہوا ہے۔''ل'' پر موجود جزم حاسہ ساریہ کیلئے ''م'' پر موجود پیش حاسہ ساریہ کیلئے اور ''س'' پر موجود جزم انصاف کیلئے۔

اس میں حرف بسط کے تین اجزاء موجود ہیں:

''ن'' فرح کامل کیلئے ''ر'' حسن تجاوز کیلئے ''س'' عاجزی و انکساری کیلئے (یہ اس صورت میں ہوگا جب ''ص'' کی قرأت کی جائے) اگر ''ص'' کی بجائے ''س'' کی قرأت کی جائے تو اس میں بسط کے اجزاء چار ہوں گے۔

اس میں حرف نبوت کا کوئی جز موجود نہیں ہے۔

اس میں حرف روح کے تین اجزاء موجود ہیں:

''ذ'' طہارت کیلئے ''ط'' تمیز کیلئے ''ق'' کامل بصیرت کیلئے۔

اس میں حرف رسالت کے آٹھ اجزاء موجود ہیں:

''ن'' پر موجود زبر اہل جنت کی مانند زندگی بسر کرنے کیلئے ''ا'' پر موجود زبر مشاہدے کیلئے ''ر'' پر زبر

سکینت کیلئے ''ط'' پر زبر روح کے برضا و رغبت جسم میں قیام کیلئے ''ا'' پر زبر مشاہدے کیلئے ''ل'' علم کامل کیلئے ''ت'' پر زبر سکینت کیلئے اور ''م'' پر زبر بھی سکینت کیلئے۔

اس میں حرف علم کا ایک جز موجود ہے یعنی ''مد'' والی ''ی'' جو تمام جہات کے سامنے کی جہت میں سمٹ آنے کیلئے استعمال ہوئی ہے۔

صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ:

اس میں حرف آدمیت کے آٹھ اجزاء موجود ہیں:

''ص'' کمال عقل کیلئے اس پر موجود زیر باطنی حس کے کمال کیلئے ''مد'' والی ''ا'' ظاہری حس کے کمال کیلئے ''ذ'' پر موجود زیر باطنی حسن کے کمال کیلئے ''م'' ذکوریت کیلئے ''ت'' ظاہری حس کے کمال کیلئے ''ہ'' پر زیر ظاہری حواس کے کمال کیلئے اور ''م'' ذکوریت کیلئے ہے۔

اس میں حرف قبض کے سات اجزا پائے جاتے ہیں:

''انعمت'' کا ''ا'' امتثال امر کیلئے ''ن'' پر موجود جزم حاسہ ساریہ کیلئے ''م'' پر موجود جزم انصاف کیلئے ''ہ'' ضد سے نفرت کیلئے (حمزہ کی قرأت کے مطابق) اس پر موجود پیش اپنی جنس کی طرف میلان کیلئے ''م'' پر موجود جزم بھی اپنی جنس کی طرف میلان کیلئے اور (ابن کثیر کی قرأت کے مطابق) اس پر موجود پیش بھی اپنی جنس کی طرف میلان کیلئے استعمال ہوا ہے۔

اس میں حرف بسط کے چار اجزاء موجود ہیں:

(ایک قرأت کے مطابق) ''صراط'' کی بجائے ''سراط'' کی ''س'' (حمزہ کی قرأت کے مطابق) ''ص'' کو ''ز'' میں اشمام کر کے پڑھا جائے گا۔ لہٰذا اس صورت میں ''ص'' کے باعث اس میں حرف آدمیت کا ایک جز موجود ہوگا اور ''ز'' کے باعث حرف رسالت کا ایک جز موجود ہوگا۔

''ر'' حسن تجاوز کیلئے اور دو مرتبہ ''ن'' فرح کامل کیلئے استعمال ہوا ہے۔

اس میں حرف نبوت کے تین اجزاء موجود ہیں:

دو مرتبہ ''ع'' عفو کیلئے اور ''ی'' پر موجود جزم مکمل خوف کیلئے

اس میں حرف رسالت کے 12 اجزاء موجود ہیں:

''ر'' پر موجود زبر سکینت کیلئے ''ط'' پر موجود زبر روح کے ذات میں قیام کیلئے ''ہمزہ وصل'' پر موجود زبر مشاہدے کیلئے ''ل'' علم کامل کیلئے اس پر موجود زبر مشاہدے کیلئے ''ن'' پر موجود زبر اہل جنت کی مانند زندگی بسر کرنے کیلئے ''ا'' پر موجود زبر مشاہدے کیلئے ''ع'' پر موجود زبر سکینت کیلئے ''ت'' پر موجود زبر علم کامل کیلئے ''ع'' اور ''ل'' کی زبر کا حکم بھی یہی ہے اور آخر میں ''ل'' علم کامل کیلئے۔

اس میں حرف علم کے دو اجزاء موجود ہیں:

''د'' زبانوں کی معرفت کیلئے' مدوالی ''ی'' تمام جہات کے سامنے کی جہت میں سمٹ آنے کیلئے۔ اس میں حرف روح کا صرف ایک جز موجود ہے اور وہ ''ط'' ہے جو تمیز کیلئے استعمال ہوا ہے۔

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ:

''غ'' ظاہری صورت کے کمال کیلئے استعمال ہوا ہے جو حرف آدمیت کا جز ہے۔
اس پر موجود زبر سکینت کیلئے ہے جو حرف رسالت کا جز ہے۔
''ی'' خوف تام کیلئے ہے جو حرف نبوت کا جز ہے۔
اس پر موجود جزم حق بات کہنے میں حیا نہ کرنے کیلئے ہے جو حرف قبض کا جز ہے۔
''ر'' حسن تجاوز کیلئے ہے اور یہ حرف بسط کا جز ہے۔
اس پر موجود زیر باطنی صورت کے کمال کیلئے ہے جو حرف آدمیت کا جز ہے۔
''ہمزہ وصل'' امتثال امر کیلئے ہے جو حرف قبض کا جز ہے۔
اس پر موجود زبر مشاہدے کیلئے ہے جو حرف رسالت کا جز ہے۔
''ل'' علم کامل کیلئے ہے جو حرف رسالت کا جز ہے۔
اس پر موجود جزم حاسہ ساریہ کیلئے ہے جو حرف قبض کا جز ہے۔
''م'' ذکوریت کیلئے ہے جو حرف آدمیت کا جز ہے۔
اس پر موجود زبر سکینت کیلئے ہے جو حرف رسالت کا جز ہے۔
''غ'' ظاہری صورت کے کمال کیلئے ہے جو حرف آدمیت کا جز ہے۔
اس پر موجود جزم گرفت کی مضبوطی کیلئے ہے جو حرف قبض کا جز ہے۔
''ض'' قول حق کیلئے ہے جو حرف نبوت کا جز ہے۔
اس پر موجود پیش حاسہ ساریہ کیلئے جو حرف قبض کا جز ہے۔
''و'' حق بات کہنے سے شرم نہ کرنے کیلئے ہے جو حرف قبض کا جز ہے۔
''ب'' سکینت کیلئے ہے جو حرف رسالت کا جز ہے۔
اس پر موجود زیر عقل کامل کیلئے ہے جو حرف آدمیت کا جز ہے۔
''ع'' عفو کیلئے ہے جو حرف نبوت کا جز ہے۔
اس پر موجود زبر علم کامل کیلئے ہے جو حرف رسالت کا جز ہے۔
''ل'' علم کامل کیلئے ہے اور یہ حرف رسالت کا جز ہے۔
اس پر موجود زبر بھی علم کامل کیلئے ہے جو حرف رسالت کا جز ہے۔
''ی'' اللہ تعالیٰ کے مکمل خوف کیلئے ہے جو حرف نبوت کا جز ہے۔

اس پر موجود جزم انصاف کیلئے ہے جو حرف قبض کا جز ہے۔

''ہ'' ضد سے نفرت کیلئے ہے اور یہ حرف قبض کا جز ہے۔

اس پر موجود زیر ظاہری حسن کے کمال کیلئے ہے اور یہ حرف آدمیت کا جز ہے۔

ایک قرأت کے مطابق ''ہ'' پر پیش بھی پڑھی گئی ہے۔ اس صورت میں یہ پیش ضد سے نفرت کیلئے استعمال ہوگی۔

''اَنْعَمْتَ عَلَیْہِمْ'' میں بھی ''ہ'' پر پیش پڑھی گئی ہے لیکن وہ پیش اپنی جنس کی طرف میلان کیلئے استعمال ہوگی کیونکہ جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوگا انسان ان کی طرف فطری طور پر مائل ہوگا اور جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوگا ان سے فطری طور پر نفرت ہوگی۔

''م'' ذکوریت کیلئے ہے جو حرف آدمیت کا جز ہے۔

ابن کثیر کی قرأت کے مطابق اس پر پیش پڑھی جائے گی اور یہ پیش ضد سے نفرت کیلئے ہوگی جو حرف قبض کا جز ہے۔ دیگر حضرات کی قرأت کے مطابق اس کو ساکن پڑھا جائے گا۔ اور یہ سکون ضد کے ساتھ نفرت اور زور دینے کیلئے استعمال ہوگا۔

''وَ'' زندگی میں ہی مر جانے کیلئے ہے اور یہ حرف رسالت کا جز ہے۔

اس پر موجود زبر مشاہدے کیلئے ہے یہ بھی حرف رسالت کا جز ہے۔

''ل'' علم کامل کیلئے ہے جو حرف رسالت کا جز ہے۔

اس پر موجود زبر بھی علم کامل کیلئے ہے۔

''ا'' وصلی امتثال امر کیلئے ہے جو حرف قبض کا جز ہے۔

اس پر موجود زبر مشاہدے کیلئے جو حرف رسالت کا جز ہے۔

''ض'' مشدد قول حق کیلئے ہے جو حرف نبوت کا جز ہے۔

اس پر موجود زبر مشاہدے کیلئے ہے جو حرف رسالت کا جز ہے۔

اگلا ''ا'' چونکہ متکلم کی ذات سے متعلق نہیں ہے اس لیے ''مد'' کے 6 مراتب کے مطابق اس کے 6 مفاہیم ہوں گے:

اگر اسے ایک ''ا'' کے برابر پڑھا جائے تو یہ باطنی صورت کے کمال کیلئے ہوگا۔

اگر اسے دو ''ا'' کے برابر پڑھا جائے تو یہ باطنی صورت کے کمال کے ساتھ روح کے برضا و رغبت جسم میں قیام کیلئے ہوگا۔

اگر اسے تین ''ا'' کے برابر پڑھا جائے تو مذکورہ بالا دونوں معانی کے ساتھ حاسہ ساریہ کیلئے ہوگا۔

اگر اسے چار ''ا'' کے برابر پڑھا جائے تو مذکورہ بالا تینوں معانی کے ہمراہ حسن باطنی کے کمال کیلئے ہوگا۔

اگر اسے پانچ ''ا'' کے برابر پڑھا جائے تو مذکورہ بالا چاروں معانی کے ہمراہ بغض باطل کے لیے ہوگا۔
اگر اسے چھ ''ا'' کے برابر پڑھا جائے تو یہ مذکورہ بالا پانچوں معانی کے ہمراہ بھلائی کے ذات میں رچ بس جانے کیلئے ہوگا۔

یہ بات آپ جانتے ہیں کہ باطنی صورت کا کمال حرف آدمیت کا جز ہے۔ روح کا سکون حرف رسالت کا' قوت سار یہ حرف قبض کا' حسن باطنی کا کمال حرف آدمیت کا' بغض باطل حرف نبوت کا اور سکون خیر فی الذات حرف بسط کا جز ہے۔

جب آپ ایک ''ا'' کے برابر پڑھیں گے تو اس میں حرف آدمیت کا جز موجود ہوگا۔
جب دو ''ا'' کے برابر پڑھیں گے تو اس میں حرف آدمیت اور حرف رسالت کے اجزاء موجود ہوں گے۔
جب تین ''ا'' کے برابر پڑھیں گے تو حرف آدمیت' حرف رسالت اور حرف قبض کے اجزاء موجود ہوں گے۔

جب چار ''ا'' کے برابر پڑھیں گے تو حرف آدمیت کے دو اور حرف رسالت اور حرف قبض کا ایک ایک جز موجود ہوگا۔

جب پانچ ''ا'' کے برابر پڑھیں گے تو حرف آدمیت کے دو' حرف رسالت' حرف قبض اور حرف نبوت کا ایک ایک جز موجود ہوگا۔

اگر چھ ''ا'' کے برابر پڑھیں گے تو حرف آدمیت کے دو' رسالت' قبض' نبوت اور بسط کا ایک ایک جز موجود ہوگا۔

''ل'' علم کامل کیلئے ہے جو حرف رسالت کا جز ہے۔
اس پر موجود زیر حس باطنی کے کمال کیلئے ہے جو حرف آدمیت کا جز ہے۔
''مد'' والی ''ی'' کے بھی چھ مراتب ہیں:
اگر ایک ''ی'' کے برابر پڑھیں تو یہ تمام جہات کے سامنے کی جہت میں سمٹ آنے کیلئے ہوگا۔
اگر دو ''ی'' کے برابر پڑھیں تو یہ پہلے مفہوم کے ہمراہ انسان و جنات سے متعلق علوم کی معرفت کیلئے ہوگا۔
اگر تین ''ی'' کے برابر پڑھیں تو مذکورہ بالا دونوں مفاہیم کے ہمراہ اہل جنت کی مانند زندگی بسر کرنے کیلئے ہوگا۔

اگر چار ''ی'' کے برابر پڑھیں تو مذکورہ بالا تینوں مفاہیم کے ہمراہ انجام کی معرفت کیلئے ہوگا۔
اگر پانچ ''ی'' کے برابر پڑھیں تو مذکورہ بالا چاروں مفاہیم کے ہمراہ عدم تضیع کیلئے ہوگا۔
اگر چھ ''ی'' کے برابر پڑھیں تو مذکورہ بالا پانچوں مفاہیم کے ہمراہ دونوں جہانوں سے متعلق علوم کی معرفت کیلئے ہوگا۔

یہ بات آپ جان چکے ہوں گے کہ سات روحانی حروف میں سے تین حروف کے اجزاء زیادہ پائے جاتے ہیں یعنی حرف آدمیت' حرف قبض اور حرف رسالت اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اسرار حروف اور حرکات دونوں میں پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا پیش اور جزم حرف قبض کے ساتھ مخصوص ہیں' زبر حرف رسالت کے ساتھ مخصوص ہے اور زیر حرف آدمیت کے ساتھ مخصوص ہے۔ لہٰذا جہاں زبر زیادہ تعداد میں ہوگی وہاں حرف رسالت کے انوار زیادہ موجود ہوں گے اور جہاں زیر زیادہ تعداد میں ہوگی وہاں حرف آدمیت کے انوار زیادہ تعداد میں موجود ہوں گے اور جہاں پیش یا جزم زیادہ تعداد میں موجود ہوں گے وہاں حرف قبض کے انوار زیادہ موجود ہوں گے۔

دیگر قرأتوں کی توضیح

سات مشہور قرأتوں کے علاوہ چند دیگر قرائتیں بھی منقول ہیں لیکن ان میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک شیخ زید اور شیخ الکلی کی قرأت ہے جس کے مطابق "الحمد" کی "د" پر پیش کی بجائے زبر پڑھی جائے گی۔ اس کی نحوی توجیہہ یہ ہے کہ یہ فعل محذوف کا مفعول مطلق واقع ہوگی اور اصل جملہ یوں ہوگا: احمد اللہ حمداً پھر اس جملے کو ایک خاص ترکیب میں تبدیل کر دیا گیا۔

عام قرأت کے مطابق "د" پر پیش اس لئے پڑھی جاتی ہے کہ یہ لفظ مبتداء ہے۔

ان دونوں کی باطنی توجیہہ زبر اور پیش کے انوار کے مطابق ہوگی۔

اگر آپ "د" پر پیش پڑھیں گے تو یہ پیش حاسہ ساریہ کیلئے ہے جو پورے جسم میں موجود ہوتا ہے۔ گویا آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی تو اس حمد کے معانی کی کیفیت کو آپ کے پورے جسم نے محسوس کیا۔ گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قولی اور فعلی دونوں طریقوں سے حمد کی ہے۔

اگر "د" پر زبر پڑھی جائے تو یہ زبر علم کامل کیلئے ہے گویا اس بات کا مکمل علم موجود ہے کہ حمد کی مستحق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ لیکن کیا جسم نے اس کیفیت کو محسوس کیا؟ اس بات کا ذکر آیت میں نہیں ہوگا اسی لیے عام قرأت میں "د" پر پیش پڑھی جاتی ہے۔

اگر آپ یہ سوال کریں "الحمد" میں "ل" اور "م" پر موجود جزم حاسہ ساریہ کیلئے ہے۔ جس کے نتیجے میں وہی کیفیت حاصل کی جا سکتی ہے جو "د" پر پیش پڑھنے کی صورت میں حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا "د" پر پیش یا زبر پڑھنے میں کوئی فرق نہیں ہوگا؟ تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ یہ بات درست ہے لیکن اگر یہ صورت لفظ کے مکمل ہونے سے پہلے پیدا ہو جائے تو کیفیت کا تعلق صرف لفظ کے ساتھ ہوگا یعنی انسان نے اس لفظ سے مکمل طور پر لذت حاصل کی ہے لیکن اگر لفظ کے آخری حرف میں یہ خصوصیت موجود ہو تو گویا لذت کی کیفیت کا تعلق معانی کے ساتھ ہوگا۔ اس لیے پیش کی قرأت میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے۔

امام حسن بصری کی ایک قرأت کے مطابق "د" اور "ل" دونوں پر زبر پڑھی جائے گی جس کی ظاہری توجیہہ یہ ہے کہ "ل" کی قرأت "د" کی قرأت کے تابع ہوگی لیکن باطنی اعتبار سے "ل" پر زبر یا زیر پڑھنے سے معنی

مختلف ہو جائے گا۔ اگر آپ ''ل'' پر زیر پڑھتے ہیں تو یہ باطنی حس کے کمال کیلئے ہوگی گویا اللہ کی حمد کو انسان کے باطن نے مکمل طور پر محسوس کیا ہے لیکن اگر آپ ''ل'' پر زبر پڑھیں گے تو یہ علم کامل کیلئے ہے اس کا احساس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوگا اور یہ ایک طے شدہ اصول ہے کہ محض علم کے مقابلے میں علم کے ہمراہ احساس کا پایا جانا زیادہ بہتر ہے۔ اسی لیے عام طور پر ''ل'' پر زیر پڑھی جاتی ہے۔

کسائی کی قرأت کے مطابق دوسرے ''ل'' کی کھڑی زبر کو امالہ کر کے پڑھا گیا ہے۔ اس صورت میں احساس کا مفہوم مزید اجاگر ہو جائے گا۔

ایک قرأت کے مطابق العلمین، الرحمٰن اور مالک یوم الدین کو بھی امالہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے لیکن اس امالہ کا تعلق کیونکہ لفظ کے آخری حرف کی بجائے پہلے کے کسی حرف کے ساتھ ہے اس لیے باطنی مفہوم کا تعلق معنی کی بجائے صرف ظاہری لفظ کے ساتھ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ امالہ کی بہ نسبت زبر کو افضل قرار دیا گیا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھار خاص کیفیت کے عالم میں امالہ کیا کرتے تھے لیکن امت کی تعلیم کیلئے آپ نے اسی قرأت کو پسند کیا جو عام حالات کے مناسب ہے۔

رب، الرحمٰن، الرحیم پر شیخ ابوزید الانصاری نے (زیر کی بجائے) پیش پڑھی ہے اور ایک قرأت کے مطابق ان پر زبر بھی پڑھی گئی ہے۔ اس کی ظاہری توجیہہ یہ ہے کہ لفظ اللہ کی صفت واقع ہونے کے باعث ان الفاظ کے آخر میں زیر پڑھی جائے گی۔ اگر پیش پڑھی جائے تو ان سے پہلے مبتداء محذوف ماننا پڑے گا جبکہ زبر کی صورت میں فعل ناصب کو محذوف ماننا پڑے گا۔

اس کی باطنی توجیہہ یہ ہے کہ زیر عقل کیلئے ہے جو حرف آدمیت کا جز ہے جس کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ انسان پر ہر وقت عاجزی وانکساری کا غلبہ رہے۔ لہٰذا یہاں عقل انسان کو اس بات کی طرف مائل کرے گی کہ وہ اپنے پروردگار کے حضور ہمیشہ عاجزی وانکساری کا مظاہرہ کرتا رہے۔ زبر علم کامل کیلئے ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہوگا کہ متکلم کو اس بات کا مکمل شعور حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام جہانوں کا پروردگار ہے لیکن اس علم کے باوجود کیا وہ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں عاجزی اختیار کرتا ہے؟ یہ بات زبر کی قرأت میں واضح نہیں ہوسکتی۔ پیش کی قرأت کا تعلق حاسہ سار یہ کے ساتھ ہے لیکن یہ حاسہ مفہوم کی تکمیل سے پہلے حاصل ہو جاتا ہے (کیونکہ رب العلمین میں لفظ رب مضاف ہے) اور جب تک مضاف الیہ ذکر نہ کیا جائے اس وقت تک مضاف کا مفہوم واضح نہیں ہوتا اس لیے زیر کی قرأت زیادہ بہتر ہے۔

ایک قرأت کے مطابق ''مالک'' کو ''ملک'' پڑھا گیا ہے۔ ظاہری اعتبار سے ملک صفت مشبہ کا صیغہ ہے اور مالک اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ لیکن باطنی اعتبار سے ''ل'' کے بعد آنے والا ''ا'' باطنی صورت کے کمال کیلئے ہوگا جس کے ذریعے اس بات کی طرف اشارہ ہوگا کہ اللہ کی ذات ہر چیز کی بادشاہ ہے اور سامعین کو اس بات سے آگاہ ہو جانا چاہیے۔ یہ مفہوم ''ملک'' کی قرأت میں ادا نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ ملک کی قرأت میں ایک اور راز

موجود ہے کہ "ملک" کی اضافت "یوم الدین" کی طرف کی گئی ہے اور یہ مفہوم "مالک" کی قرأت میں کم پایا جاتا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) نحوی اعتبار سے دیکھا جائے تو "مالک" اسم فاعل کا صیغہ ہے جو حدوث اور تجدد پر دلالت کرتا ہے۔ سیّدی دباغ کے کہنے کا یہی مقصد تھا کہ اس صیغے میں ملکیت کے مفہوم کی جامعیت کم ہے۔

ایک قرأت کے مطابق "ملیک" بھی پڑھا گیا ہے۔ یہاں پر "ی" انجام کی معرفت کیلئے استعمال ہوئی ہے جس کے ذریعے متکلم کے وجود کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ اگر وہ اپنے انجام سے واقف ہوگا تو اپنے نفس کی اصلاح کر سکے گا لیکن یہ مفہوم نہایت ضعیف ہے۔

ایک قرأت کے مطابق لفظ "ملاک" بھی پڑھا گیا ہے لیکن اس صورت میں مفہوم محدود ہو جائے گا۔ اور اس سے مراد یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن صرف مکلّف لوگوں (یعنی بنی نوع انسان) کا مالک ہوگا اور کسی مخلوق کا مالک نہیں ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "ک" کے نیچے آنے والا زیر ظاہری صورت کے کمال کیلئے ہے جو صرف بنی نوع انسان کے ساتھ مخصوص ہے۔ "ملاک" میں "ل" کے بعد آنے والا "ا" اسی بات پر تنبیہہ کرتا ہے اور مشدد "ل" اس معنی میں تاکید پیدا کرتا ہے جس کے نتیجے میں دیگر مخلوقات ملکیت کے حکم سے خارج تصور کی جائیں گی جبکہ مشہور قرأت میں ایسا نہیں ہوتا اسی لیے اس قرأت کو ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اسم مبالغہ کا تقاضا بھی یہی ہے (ملاک اسم مبالغہ کا صیغہ ہے) کیونکہ "ملک" وہ ذات ہوگی جو صاحب تصرف ہو اور کیونکہ قیامت کا دن حساب و کتاب کے ساتھ مخصوص ہے یہ حساب و کتاب بطور خاص بنی نوع انسان سے لیا جائے گا اس لیے ملاک کا مفہوم بنی نوع انسان کے ساتھ خاص ہوگا لیکن مشہور قرأت میں بنی نوع انسان کے ساتھ تمام مخلوقات بھی شامل ہوں گی۔

ایک قرأت کے مطابق "مالک" کے "ک" پر زبر بھی پڑھی گئی ہے۔ ظاہری اعتبار سے یہ منادی مضاف ہوگا یا اس کا فعل محذوف ہوگا۔ باطنی اعتبار سے زبر کا تعلق علم کامل کے ساتھ ہے۔ اس لیے پڑھنے والا اس بات سے واقف تو ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا مالک ہے لیکن ان الفاظ کے ذریعے اس نے خود کو اور دوسروں کو اللہ کی ملکیت شمار نہیں کیا لیکن اگر آپ "ک" پر زیر پڑھیں گے تو "ک" کا تعلق حرف آدمیت کے ساتھ ہے جس کا ایک اہم جز عاجزی وانکساری ہے اور یہ زیر ظاہری صورت کے کمال پر بھی دلالت کرے گا۔ اس لیے یہاں اللہ تعالیٰ کے دواحسانات کا اعتراف موجود ہوگا اور یہ مفہوم زبر کی قرأت میں نہیں پایا جاتا۔

ایک قرأت کے مطابق "ملک" میں "ل" کو ساکن پڑھا گیا ہے جیسے "کتف" میں آسانی کیلئے "ت" کو ساکن پڑھا جاتا ہے لیکن اصل میں "ت" پر زیر موجود ہے۔ اسکی باطنی توجیہہ یوں سمجھ سکتے ہیں کہ یہ الفاظ درحقیقت اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور انسان اللہ تعالیٰ کے نائب کے طور پر ان الفاظ کو ادا کرتا ہے اور ہیبت کے

باعث ''ل'' پر زیر پڑھنے کی بجائے ساکن پڑھ لیتا ہے۔

اس مفہوم پر دلالت کی وجہ یہ ہے کہ پچھلے حرف کی حرکت بھی علم کامل کیلئے ہے لیکن اگر ''ل'' پر جزم نہ ہوتو پچھلے حرف کی حرکت علم کامل کیلئے نہیں ہوگی اسی لیے ''ل'' پر جزم دی گئی تاکہ پچھلے حرف کی حرکت علم کامل کے معنی میں استعمال ہو کیونکہ اگر ''ل'' پر حرکت موجود ہوتی تو پچھلے حرف یعنی ''م'' کی حرکت علم کامل کی بجائے صدق کیلئے ہوتی۔ لفظ میں تغیر صرف اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب انسان پر خوف اور لرزہ طاری ہو کیونکہ انسان اللہ تعالیٰ کے کلام کو ادا کر رہا ہے اس لیے گویا اس پر لرزہ طاری ہو گیا جس کے نتیجے میں اس نے ''ل'' پر حرکت نہیں پڑھی۔

ایک قرأت کے مطابق ''ملک'' کو فعل ماضی کے صیغے کے مطابق پڑھا جائے گا۔ اور ''یوم'' کے آخر میں زبر آئے گی۔ کیونکہ یہ ''ملک'' کا مفہوم بنے گا۔ ایک روایت کے مطابق ''مالک'' کے آخر میں پیش کے ہمراہ تنوین آئے گی۔ ایک قرأت کے مطابق تنوین کے بغیر پیش آئے گی۔

''ایاک'' کے ''ا'' کے نیچے جمہور نے زیر پڑھی ہے لیکن ایک قرأت کے مطابق اس پر زبر پڑھی جائے گی۔ اس کی باطنی توجیہہ یہ ہے کہ زیر کا تعلق عقل کامل کے ساتھ ہے جو عاجزی وانکساری کی طرف راغب کرتی ہے جبکہ زبر کا تعلق کامل مشاہدے کے ساتھ ہے جو حرف رسالت کا جز ہے اس لیے عام مخلوق کی حالت کی مناسبت سے مشاہدے کی بجائے عقل کامل کا مفہوم زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس میں عاجزی وانکساری پائی جاتی ہے اور یہی مشہور قرأت ہے۔

ایک قرأت کے مطابق ''ایاک'' میں ''ی'' پر ''شد'' نہیں پڑھی جائے گی۔ فرق یہ ہے کہ شد والی قرأت میں اللہ تعالیٰ کے خوف میں تاکید کا مفہوم پایا جاتا ہے جبکہ اس قرأت میں ایسا نہیں ہے اور یہ بات ہم پہلے واضح کر چکے ہیں کہ ''ی'' خوف کیلئے استعمال ہوئی ہے۔ اس لیے مشہور قرأت میں زیادہ واضح اور بہتر مفہوم پایا جاتا ہے۔

''نعبد'' میں ایک قرأت کے مطابق ''د'' کو ساکن پڑھا گیا ہے۔ باطنی اعتبار سے اگرچہ پیش اور جزم کا مفہوم ایک دوسرے کے قریب ہے لیکن پیش زیادہ بہتر ہے کیونکہ پیش اصل ہے اور جزم عارضی طور پر واقع ہوتی ہے۔

ایک قرأت کے مطابق ''نعبد'' کو غائب کے مجہول صیغے کے طور پر ''یعبد'' پڑھا گیا ہے۔ اس کی باطنی توجیہہ یہ ہوگی: ''ی'' کا پیش انقباض کیلئے ہے اور جس چیز سے انقباض پیدا ہوگا وہ ''ی'' اور ''ع'' کی ضد ہوگی۔ ''ی'' کا تعلق خوف سے ہے اور اس کی ضد عدم خوف ہے اور ''ع'' کا تعلق عفو کے ساتھ ہے جس کی ضد عدم عفو ہے۔ گویا متکلم ان دونوں متضاد معانی سے اس قدر دور ہو گیا کہ اس کا شمار ان اولیاء میں ہونے لگا جو اہل جنت کی مانند زندگی بسر کرتے ہیں اور اب متکلم ہر مخلوق کی تسبیح کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ ''ع'' پر آنے والا زبر اہل جنت کی

زندگی کے مفہوم پر دلالت کرتا ہے لیکن یہ قرأت صرف اکابر صوفیاء ہی پڑھ سکتے ہیں۔ مشہور صوفی بزرگ سعید بن جبیر یہ قرأت پڑھا کرتے تھے۔

لیکن مشہور قرأت کے مطابق عبادت کے مفہوم میں عارف اور غیر عارف سب شامل ہوں گے تاہم جمہور کی قرأت بہتر ہے کیونکہ جب کوئی شخص قرأت کرنے لگتا ہے تو حروف کے معانی کے انوار چمکنے لگتے ہیں اس لیے اگر عام شخص ''ن'' کی قرأت کرے گا تو اسے ''ن'' کے انوار حاصل ہوں گے لیکن اگر وہی عام شخص ''ی'' کی قرأت کرے گا تو وہ ''ن'' کی قرأت کے انوار سے محروم رہ جائے گا کیونکہ ''ی'' کی قرأت صرف کامل عارف ہی کر سکتا ہے۔

ایک قرأت کے مطابق ''نعبد'' میں ''د'' کے بعد ''و'' بھی آتی ہے ظاہری اعتبار سے ''د'' کی پیش کے باعث بعد میں ''و'' کو پڑھا گیا ہے اور باطنی اعتبار سے ''و'' کا مفہوم یہ ہے کہ انسان حق کہتے ہوئے نہ شرمائے۔ اس مفہوم کے بہتر ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے لیکن زیادہ بہتر یہ ہے کہ انسان اس کو نہ پڑھے۔ سیّدی دباغ فرماتے ہیں: ''و'' کی قرأت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے لیکن ہمارے لیے مشہور قرأت کی پیروی کرنا بہتر ہے کیونکہ ''و'' والی قرأت کے مخصوص انوار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہیں۔

ایک قرأت کے مطابق ''نستعین'' میں ''ن'' پر زیر پڑھی جائے گی۔ باطنی اعتبار سے زیر پڑھنے کی صورت میں متکلم کے علاوہ تمام افراد کو خارج کر دیا جائے گا اس لیے زبر کی قرأت بہتر ہے۔

ایک قرأت کے مطابق ''غیر'' میں ''ر'' پر زیر کی بجائے پیش اور ایک قرأت کے مطابق زبر پڑھی جائے گی۔ زیر کی قرأت کی صورت میں عاجزی پائی جائے گی۔ پیش کی قرأت میں غضب کا شکار لوگوں سے نفرت پائی جائے گی اور زبر کی قرأت کی صورت میں کلام کا مفہوم متعین کی بجائے عام ہو جائے گا۔

ایک قرأت کے مطابق ''ولا الضالین'' میں ''ا'' کو ساکن کر دیا گیا ہے۔ اس کی باطنی توجیہہ یہ ہے کہ یہ امتثال امر کیلئے استعمال ہوگا چنانچہ ''ا'' اور اس کی حرکت کے باعث حرف قبض کے دو اجزاء موجود ہوں گے اور اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ گمراہ لوگ ہمارے دشمن ہیں۔

دباغ کے کلام کا نچوڑ

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اختلاف قرأت کے حوالے سے قرآن مجید کے معانی میں پیدا ہو جانے والے اختلاف کے بارے میں سیّدی دباغ کے کلام کی تلخیص ہم نے نقل کر دی ہے۔ سیّدی دباغ نے کچھ ایسی قرأتوں کا تذکرہ بھی کیا ہے جنہیں علم قرأت کے ماہرین نے ذکر نہیں کیا لیکن ہم نے انہیں نظر انداز کر دیا ہے تاکہ قارئین اکتاہٹ کا شکار نہ ہو جائیں کیونکہ اگر میں اس بارے میں سیّدی دباغ کے کلام کو مکمل طور پر تحریر کرتا تو وہ کئی جلدوں پر مشتمل ہوتا۔ تاہم سیّدی دباغ کی مذکورہ بالا تشریح میں چند قیمتی نکات پائے جاتے ہیں جن کی طرف میں قارئین کی توجہ مبذول کروانا چاہوں گا۔

پہلا نکتہ

پہلا نکتہ یہ ہے کہ سیّدی دباغ کے کلام میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے باطنی عظمت وکمال کی وضاحت کر گئی ہے تاکہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان کا اندازہ کر سکیں کہ 49اجزاء جس قدر کمال کی صورت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں موجود ہیں۔ یہ مرتبہ کسی اور کو حاصل نہیں ہوسکا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں سب سے زیادہ حقائق اور انوار پائے جاتے ہیں۔ اس لئے اگر کوئی شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان سے آگاہ ہونا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ مذکورہ بالا سات حروف کے ذیلی اجزاء جو 49 اقسام پر مشتمل ہیں ان میں سے ہر ایک جز کو سامنے رکھ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان کا تصور کرے تو اسے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ اس قدر عظمت شان کسی اور کو حاصل نہیں ہوسکی ہے تو اس شخص کے دل میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں اضافہ ہو جائے گا۔ گویا سیّدی دباغ کے اس کلام کے ذریعے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہری و باطنی کمالات سے واقفیت حاصل ہو جاتی ہے۔

دوسرا نکتہ

اس گفتگو میں دوسرا نکتہ یہ ہے کہ یہاں روح کی کیفیت اور اس کے عجیب وغریب کمالات کا تذکرہ کیا گیا ہے (جو حرف روح کی سات اقسام کی صورت میں بیان کیا گیا ہے)۔ جو شخص ان نکات سے آگاہی حاصل کر لے گا اسے روح کے لوازم اور خصوصیات کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہو جائیں گی۔ حالانکہ روح کے بارے میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے بعض اہل علم نے اس موضوع پر گفتگو کو ممنوع قرار دیا ہے اور بعض نے اپنے علم کے مطابق اظہار خیال کیا ہے لیکن ان حضرات نے بھی روح کے خواص کے بارے میں کوئی بات بیان نہیں کی ہے۔ اس لیے ان کا موقف پڑھنے والے شخص کی حیرانگی برقرار رہتی ہے جبکہ سیّدی دباغ نے نہایت واضح طور پر روح کے لوازم اور خصوصیات کا تذکرہ کر دیا ہے اور اس سے متعلق نہایت حیرت انگیز جزئیات بیان کی ہیں جن میں سے بعض کا تذکرہ آئندہ صفحات میں کیا جائے گا۔

تیسری خصوصیت

سیّدی دباغ کے کلام میں تیسری خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے اولیاء کرام کے معارف کی شرح بیان کی ہے جس سے خود سیّدی دباغ کے علم وعرفان کا اندازہ ہو جاتا ہے چونکہ کوئی بھی شخص اس وقت تک ولی اور غیر ولی کے درمیان کوئی فرق نہیں کر سکتا۔ جب تک اس کے جسم اور روح کے درمیان موجود حجاب زائل نہ ہو جائے لہٰذا جس شخص کا حجاب زائل ہو جائے اور اس کے جسم کو بھی اس کی روح کے اسرار کا علم حاصل ہو جائے تو وہی صاحب فتح ولی کہلائے گا۔ اس کے برعکس جس شخص کے جسم اور روح کے درمیان حجاب موجود ہے وہ ایک عام شخص ہے اگرچہ وہ ہوا میں اڑ سکتا ہو یا پانی پر چل سکتا ہو۔ ان امور میں سے بعض کا تذکرہ آئندہ صفحات میں کیا جائے گا۔

چوتھی خصوصیت

چوتھی خصوصیت حدیث مبارکہ کی شرح ہے۔ سیّدی دباغ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے باطنی انوار اور قلبی اسرار کی روشنی میں بیان کیا ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا باطن نہایت عظیم ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب انور کو حاصل ہونے والے انوار بے شمار ہیں۔ اس لیے قرآن مجید آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر نازل کیا گیا۔ سیّدی دباغ نے نہایت خوبصورت انداز میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے باطنی و قلبی اسرار و انوار کا تذکرہ کیا ہے۔ جن شارحین نے اس حدیث کی ظاہری تشریح بیان کی ہے اس تشریح کا مقام نبوت یا مقام رسالت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ حروف کی ادائیگی میں تلفظ کے اختلاف کا باطن کے اسرار کے اختلاف کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا اور اس سے بھی زیادہ حیران کن وہ تشریح ہے جس میں سات حروف سے مراد حلال، حرام، وعدہ، وعید، خبر دینا، خبر حاصل کرنا، ندا قرار دیا گیا ہے کیونکہ یہ تشریح حدیث کے ظاہری الفاظ سے مطابقت نہیں رکھتی۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

"بے شک قرآن کو سات حروف پر نازل کیا گیا ہے۔ لہٰذا تم اپنی آسانی کے مطابق اس کی قرأت کر سکتے ہو۔" (صحیح بخاری، ۲: ۸۵۱، رقم: ۲۲۸۷)

نیز صحابہ کرام کیلئے بھی یہ بات ممکن نہیں تھی کہ مذکورہ بالا سات حوالوں میں سے کسی ایک حوالے میں بھی آپس میں کوئی اختلاف کرتے۔ اس لیے کوئی بھی عقل مند اس تشریح کو قبول نہیں کر سکتا۔

پانچویں خصوصیت

سیّدی دباغ کی تشریح میں پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ آپ کی بیان کردہ تشریح علم قرأت کے ماہرین کی بیان کردہ تشریح کے مطابق ہے بلکہ علم قرأت کے ماہرین کا بیان محدود مفہوم رکھتا ہے جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت کا اندازہ نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ حضرات مثال کے طور پر دوسرے الفاظ پیش کر دیتے ہیں جو عام محاورے میں شامل ہوتے ہیں جس سے یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ قرآن مجید میں بطور خاص اس لفظ کو کیوں بیان کیا گیا ہے۔ اس کی وضاحت کیلئے آپ سابقہ صفحات میں تحریر شدہ "مالک" اور "نعبدہ" کی تفسیر ملاحظہ کر سکتے ہیں کہ سیّدی دباغ نے کس طرح ہر حرف اور اس کی مخصوص حرکت کی تشریح بیان کی ہے۔

چھٹا نکتہ

چھٹا نکتہ یہ ہے کہ قارئین اس غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائیں کہ قرآن مجید کی تفسیر صرف انہی سات حروف پر مشتمل ہے کیونکہ قرآن مجید کا ایک مخصوص معنی ہے جس میں تمام علوم موجود ہیں اور یہ ساتوں حروف اس معنی کیلئے لباس کی حیثیت رکھتے ہیں جس کا بالواسطہ نتیجہ یہ نکلے گا کہ لباس اور معنی دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اگر آپ سابقہ صفحات میں ذکر شدہ سورۃ فاتحہ کی تفسیر ملاحظہ کر لیں تو آپ کو اس بات کا تھوڑا سا اندازہ ہو جائے گا۔ اگر قرآن

کے حقیقی معنی کی تفسیر بیان کی جائے تو اس میں ظاہری اور باطنی دونوں طرح کی تفسیر شامل ہو جائے گی۔ باطنی تفسیر کے ذریعے یہ پتہ چل جائے گا کہ ارواح کے جسم میں داخل ہونے سے پہلے ان کی کیا کیفیت تھی؟ اور جسم سے جدا ہو جانے کے بعد ان کی کیا کیفیت ہوگی؟ اسی طرح یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ قرآن مجید سے علوم کا استخراج کیسے کیا جا سکتا ہے؟ بلکہ کائنات کی جملہ اقسام میں موجود اور ان سے متعلق امور سے کس طرح آگاہی حاصل کی جا سکتی ہے؟ غرضیکہ یہ تمام معلومات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے باطن کے سمندر کا ایک قطرہ ہیں۔ اگر قرآن مجید کو اس طریقے سے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو بہت سی ایسی باتیں ظاہر ہوں گی جنہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جائے گی اور اس وقت یہ انداز ہوگا کہ ساری مخلوق مل کر بھی قرآن مجید کی ایک سطر کی مانند سطر تحریر نہیں کر سکتی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی وہ ذات پاک ہے جس نے اپنے محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ انوار عطا کیے ہیں جن کی کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی۔

ساتواں نکتہ

اس ساری گفتگو کے نتیجے میں ساتواں نکتہ یہ حاصل ہوا کہ قرآن مجید میں موجود ہر حرف کا ایک مخصوص ''سر'' ہے۔ جیسے ''ا'' امتثال کیلئے ''ب'' سکون کیلئے ''ت'' ظاہری حسن کے کمال کیلئے وغیرہ استعمال ہوتے ہیں اور ان اسرار سے صرف اہل فتح ہی آگاہ ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح اعراب اور حرف کے درمیان تعلق اور ان میں موجود اسرار سے بھی صاحب فتح ہی آگاہ ہو سکتا ہے۔ اگر ان اسرار کا کوئی ضابطہ موجود ہوتا تو بہت سے افراد ان اسرار سے آگاہ ہو جاتے اس لیے اگر کوئی صاحب ان اسرار سے آگاہ ہونا چاہیں تو انہیں چاہیے کہ کسی صاحب فتح بزرگ کی خدمت میں حاضر ہو کر اخذ واستفادہ کریں۔

آٹھویں خصوصیت

آٹھویں خصوصیت یہ ہے کہ ہمیں اس بات کا پتہ چل گیا کہ قرآن مجید کا موجودہ رسم الخط توقیفی ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اسی طرح تحریر کرنے کا حکم دیا تھا۔ نیز اس رسم الخط میں بھی مخصوص انوار موجود ہیں لیکن بعض اہل علم اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے کہ شاید یہ رسم الخط صحابہ کرام نے ایجاد کیا ہے۔ ایسے اہل علم دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے بعض اہل علم کے نزدیک صحابہ کرام کے ایجاد کردہ رسم الخط میں بعض ایسے اسرار موجود ہیں جن سے ہم واقف نہیں ہو سکتے لیکن یہ حضرات یہ بات بھول گئے کہ صرف اللہ تعالیٰ کے احکام پر ہی کسی قسم کے غور وخوض کے بغیر عمل کیا جا سکتا ہے۔ صحابہ کرام یا دیگر افراد کے ایجاد کردہ قوانین میں غور وفکر کی گنجائش موجود رہتی ہے۔ اس کے برعکس اہل علم کے دوسرے گروہ نے اس رسم الخط کو صحابہ کرام کی مخصوص اصطلاح نہیں سمجھا۔ ان کے نزدیک عرب کیونکہ کتابت کے فن سے آشنا نہیں تھے اس لیے انہوں نے اپنے فہم کے مطابق الفاظ کو مختلف شکلوں میں تحریر کر دیا۔

نویں خصوصیت

9ویں نکتے کا تعلق دو سوالات کے ساتھ ہے جو میں نے سیّدی دباغ کی خدمت میں پیش کیے۔ پہلا سوال یہ تھا کہ ہم نے باطنی انوار کے اعتبار سے حروف کی تقسیم کی ہے کہ فلاں حرف تہجی فلاں حرف باطنی (آدمیت' بسط' قبض وغیرہ) کیلئے مخصوص ہے حالانکہ یہ حروف تہجی عام افراد کے کلام میں بھی پائے جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ عام لوگوں کے کلام میں بھی یہ انوار پائے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ انوار قرآن مجید کے ساتھ مخصوص ہیں؟ عام انسان تو کجا دیگر آسمانی کتابوں میں بھی یہ انوار نہیں پائے جاتے کیونکہ ایک روایت کے مطابق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا تھا:

ان الکتب کانت تنزل من السماء من باب واحد علی حرف واحد' وان القرآن انزل من سبعة ابواب علی سبعة احرف

''تمام آسمانی کتابیں آسمان سے ایک ہی دروازے سے ایک ہی حرف پر نازل ہوئی ہیں جبکہ قرآن سات دروازوں سے سات حروف پر نازل ہوا ہے۔''

سیّدی دباغ نے جواب دیا: حروف کی یہ باطنی تقسیم صرف قرآن مجید کے ساتھ مخصوص ہے۔ ہم نے ہر حرف تہجی کیلئے جو مخصوص باطنی حرف بیان کیا ہے اس کا تعلق صرف قرآن مجید کے حروف کے ساتھ ہے۔ قرآن مجید کے علاوہ دیگر آسمانی کتابوں یا عام لوگوں کے کلام میں تقسیم مختلف ہوگی کیونکہ یہاں تمام حروف تہجی حرف آدمیت کے سات اجزاء میں تقسیم ہو جائیں گے اور بقیہ 6 باطنی حروف یعنی قبض' بسط' روح' نبوت' علم' رسالت کے انوار قرآن مجید کے علاوہ کسی اور کلام میں نہیں پائے جائیں گے۔

میں نے عرض کیا: یہ 6 انوار دیگر انبیاء کرام میں بھی پائے جاتے ہیں اس لیے ان حضرات پر نازل ہونے والی کتب میں بھی یہ تمام انوار موجود ہونے چاہئیں؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: تمام انبیاء کرام میں یہ انوار پائے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی حدیث قدسی یا اپنی بات بیان کرتے ہیں تو اس کلام میں بھی یہ انوار موجود نہیں ہوتے کیونکہ ان انوار کا تعلق صرف قرآن مجید کے ساتھ ہے کیونکہ قرآن مجید کے نزول میں ایک مخصوص ''سر'' موجود ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں دوسرا ''سر'' موجود ہے کیونکہ دیگر تمام آسمانی کتابوں میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کا ''سر'' موجود نہیں ہے اس لیے ان میں صرف ایک ''سر'' (یعنی نزول کا سر) پایا جاتا ہے جبکہ احادیث مبارکہ میں نزول کا سر موجود نہیں ہوتا لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کا سر پایا جاتا ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) سیّدی دباغ نے کشف کے ذریعے ان دونوں اسرار کی وضاحت کی ہے۔ سیّدی دباغ فرماتے ہیں: نظم' ترکیب اور معانی کے اعتبار سے قرآن مجید کی مثال اسی لیے پیش نہیں کی جا سکتی (کیونکہ اس میں دونوں اسرار پائے جاتے ہیں) لیکن سابقہ آسمانی کتابوں میں کیونکہ صرف ایک سر پایا جاتا ہے اس لیے نظم اور ترکیب کے اعتبار سے ان کی مثال پیش کی جا

سکتی ہے۔ البتہ معانی کے اعتبار سے ان کی مثال بھی پیش نہیں کی جا سکتی کیونکہ معانی کا تعلق علم قدیم کے ساتھ ہے۔

دباغ کے جواب اور احادیث میں تطبیق

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میرے دوسرے سوال کا تعلق سیّدی دباغ کی بیان کردہ تشریح اور اس بارے میں منقول احادیث میں تطبیق سے متعلق تھا اس لیے میں پہلے اس بارے میں منقول روایات نقل کروں گا۔

ان میں سب سے پہلی روایت متفق علیہ ہے جو حضرت عمر اور حضرت ہشام بن حکیم رضی اللہ عنہما کے واقعے پر مشتمل ہے۔ ابن حجر کہتے ہیں اس روایت کو طبری نے یوں نقل کیا ہے:

قراء رجل فغير عليه عمر فا ختصما عندالنبي عليه السلام فقال الرجل الم تقرئني يارسول الله! قال بلى قال فوقع في صدر عمر شيء عرفه النبيّ في وجهه قال فضربه في صدره وقال: ابعد شيطانا قالها ثلاثا' ثم قال: يا عمر القرآن كله صواب ما لم تجعل رحمة عذابا' وما لم تجعل عذابا رحمة

(فتح الباری'۹:۲۶'مسند احمد'۲:۳۰)

''ایک مرتبہ ایک شخص نے قرآن کی بعض آیات کی تلاوت کی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے ڈانٹ دیا۔ یہ دونوں حضرات فیصلے کیلئے بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اس شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا آپ نے مجھے اس طرح سے قرأت نہیں سکھائی؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ الجھن کا شکار ہو گئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے چہرے پر الجھن کے آثار دیکھ کر ان کے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے تین مرتبہ فرمایا: شیطان کو دور کر دو۔ پھر فرمایا: اے عمر! قرآن مکمل طور پر درست ہے تاوقتیکہ عذاب کو رحمت اور رحمت کو عذاب نہ بنا دیا جائے۔''

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے حوالے سے یہ روایت منقول ہے:

''دخلت المسجد اصلي' فدخل رجل فافتتح النحل فقرأ فخالفني في القراءة' فلما انفتل قلت: من أقرأك؟ قال رسول الله صلى الله عليه وسلم' ثم جاء رجل فقام يصلي' فافتتح النحل فخالفني وخالف صاحبي' فلما انفتل قلت: من أقرأك؟ قال رسول الله صلى الله عليه وسلم' فدخل قلبي من الشك والتكذيب اشد مما كان في الجاهلية' فاخذت بايديهما فانطلقت الى النبي صلى الله عليه وسلم بهما' فقلت استقرئ هذين' فاستقرأ احدهما فقال احسنت' فدخل صدرى من الشك والتكذيب أكثر مما كان في الجاهلية ثم استقرأ الأخر فقال احسنت' فدخل

صدری من الشك والتكذيب اكثر مما كان في الجاهلية ثم استقرأ الأخر فقال احسنت، فدخل صدری من الشك والتكذيب اكثر مما كان في الجاهلية، فضرب رسول الله صلى الله عليه وسلم صدری بيده، وقال اعيذك بالله من الشك يا ابی، ثم قال: ان جبريل عليه السلام اتاني فقال: ان ربك عزوجل يامرك ان تقرا القرآن على حرف واحد، فقلت: اللهم خفف عن امتي، ثم عاد فقال: ان ربك عز وجل يامرك ان تقرا القرآن على حرفين، فقلت: اللهم خفف عن امتي، ثم عاد فقال: ان ربك عزوجل يامرك ان تقرا القرآن على سبعة احرف واعطاك بكل حرف مسئلة.

''ایک دن میں مسجد میں نماز ادا کر رہا تھا اسی دوران ایک شخص مسجد میں داخل ہوا اور اس نے سورۃ نحل پڑھنا شروع کی مگر اس کی قرأت مجھ سے مختلف تھی جب وہ فارغ ہوا تو میں نے اس سے پوچھا: تم نے قرأت کا یہ طریقہ کس سے سیکھا ہے؟ اس نے جواب دیا: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے' اس کے بعد ایک اور شخص مسجد میں داخل ہوا اور اس نے بھی سورۃ نحل پڑھنا شروع کی لیکن اس کی قرأت ہم دونوں کی قرأت سے مختلف تھی۔ میں نے اس سے پوچھا' تمہیں یہ قرأت کس نے سکھائی ہے؟ اس نے جواب دیا: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے' یہ سن کر میرے دل میں ایسے شکوک پیدا ہوئے جو زمانہ جاہلیت کے شکوک سے زیادہ مضبوط تھے' میں نے ان دونوں صاحبان کے ہاتھ کو پکڑا اور انہیں ہمراہ لے کر بارگاہ رسالت میں حاضر ہو گیا اور عرض کی: ان دونوں کی قرأت ملاحظہ فرمائیں۔ ان دونوں میں سے ایک نے قرأت کی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعریف کی۔ یہ دیکھ کر میرے دل میں اور شکوک پیدا ہو گئے پھر دوسرے صاحب نے قرأت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بھی تعریف کی۔ یہ دیکھ کر میرے دل میں مزید شبہات پیدا ہو گئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اے ابی! میں اس شک سے تمہیں اللہ کی پناہ میں دیتا ہوں پھر آپ نے فرمایا: جبرائیل میرے پاس آئے اور کہنے لگے' آپ کے پروردگار نے آپ کو یہ حکم دیا ہے کہ آپ ایک ہی طریقے کے مطابق قرآن کی قرأت کریں۔ میں نے دعا کی' اے میرے پروردگار! تو میری امت کو آسانی عطا کر' جبرائیل دوبارہ آئے اور کہا' آپ کے پروردگار نے آپ کو یہ اجازت دی ہے کہ آپ دو طرح سے قرأت کر سکتے ہیں۔ میں نے پھر دعا کی' اے میرے پروردگار! میری امت کو آسانی نصیب کر' جبرائیل دوبارہ آئے اور عرض کی: آپ کے پروردگار نے آپ کو اجازت دی ہے کہ آپ سات حروف پر قرآن پڑھ سکتے ہیں اور ہر ایک طرز کے عوض میں آپ کی ایک درخواست کو پورا کیا جائے

گا۔''

اس روایت کو شیخ حرث بن ابی اسامہ نے اپنی مسند میں نقل کیا ہے جسے ابن الجزری نے اپنی کتاب ''النشر'' میں نقل کیا ہے۔ البتہ صحیح مسلم کی روایت کے الفاظ یوں ہیں:

''عن ابی بن کعب ان جبریل لقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وھو عند اضاۃ بنی غفار فقال: ان اللہ یامرك ان تقرئ امتك القرآن علی حرف، فقال: اسال اللہ معافاتہ ومعونتہ، فان امتی لا تطیق ذلك، ثم اتاہ الثانیۃ علی حرفین، فقال لہ مثل ذلك، ثم اتاہ الثالثۃ بثلاثۃ، فقال لہ مثل ذلك، ثم اتاہ الرابعۃ فقال لہ: ان اللہ یامرك ان تقرأ القرآن علی سبعۃ احرف فایما حرف قرءوا علیہ فقد اصابوا۔

(صحیح مسلم ۱:۲۷۳ ذ رقم ۸۲۱)

''حضرت ابی بن کعب فرماتے ہیں، ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، بنوغفار کے تالاب کے پاس تشریف فرما تھے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام حاضر خدمت ہوئے اور عرض کی: یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ ایک مخصوص طریقے کے مطابق اپنی امت کو قرأت کی تعلیم دیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اللہ تعالیٰ سے مدد اور عافیت کا سوال کرتا ہوں کیونکہ میری امت اس بات کی طاقت نہیں رکھتی۔ جبرائیل دوسری مرتبہ آئے اور دو مختلف طرح سے قرأت کی اجازت کی نوید سنائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ دعا کی۔ جبرائیل تیسری مرتبہ تین طرح کی قرأت کی نوید لائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ اپنی دعا دہرائی تو چوتھی مرتبہ حضرت جبرائیل حاضر خدمت ہوئے اور عرض کی: اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ اجازت دی ہے کہ آپ کی امت سات مختلف طریقوں میں سے کسی ایک طریقے کے مطابق بھی قرأت کرلے گی تو اس کی قرأت درست شمار ہوگی۔''

امام مسلم ایک اور سند کے اعتبار سے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا یہ بیان نقل کرتے ہیں:

'قال کنت فی المسجد فدخل رجل یصلی فقرا قراءۃ انکرتھا علیہ، ثم دخل اخر فقراءۃ سوی قراءۃ صاحبہ، فلما قضینا الصلاۃ دخلنا جمیعا علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، فقلت: ان ھذا قرأ قراءۃ انکرتھا علیہ، ودخل اخر فقرا سوی قراءۃ صاحبہ، فامرھما فقرآ فحسن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قراء تھما، قال: فسقط فی نفسی اولا اذ کنت فی الجاھلیۃ فضرب فی صدری ففضت عرقا وکانما انظر الی اللہ فرقا فقال: یا ابی ارسل الی ان اقرا القرآن'' الی آخرہ۔

(صحیح مسلم ۱:۲۷۱ ذ رقم ۸۲۰)

''ایک مرتبہ میں مسجد میں نماز ادا کر رہا تھا۔ اسی دوران ایک اور شخص نے آ کر قرأت شروع کر دی۔ میں نے اسے ٹوکا اسی دوران ایک اور شخص مسجد میں داخل ہوا اور اس نے بھی قرأت شروع کر دی۔ اس کی قرأت ہم دونوں سے مختلف تھی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد ہم بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے۔ میں نے عرض کی: یہ شخص مسجد میں داخل ہوا اور اس نے قرأت شروع کی' میں نے اس کی قرأت کا انکار کیا پھر دوسرا شخص داخل ہوا جس کی قرأت اس پہلے سے مختلف تھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں حضرات کو قرأت کا حکم دیا اور پھر دونوں کی قرأت کو درست قرار دیا۔ یہ دیکھ کر میرے دل میں زمانہ جاہلیت کی مانند خلش پیدا ہوگئی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سینے پر ہاتھ مارا جس سے میرا سارا جسم پسینے میں ڈوب گیا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں خوفزدہ حالت میں اللہ کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابی! مجھے ان مختلف طریقوں سے قرأت کی اجازت دی گئی ہے۔''

طبری کی ایک روایت میں یہ الفاظ موجود ہیں:

فدخلني وسوسة الشيطان حتى احمر وجهي فضرب في صدري وقال: اللهم اخسئ منه الشيطان۔

''شیطان نے میرے دل میں وسوسہ ڈالا۔ یہاں تک کہ میرا چہرہ سرخ ہو گیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے ارشاد فرمایا: اے اللہ! اس سے شیطان کو دور کر دے''

طبری نے ایک اور واقعہ یوں روایت کیا ہے جس کے مطابق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابی بن کعب اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ دونوں کی مختلف قرأت سن کر ارشاد فرمایا:

كلاكما محسن' وكلاكما مجمل' قال ابي: فقلت ما كلانا احسن ولا كلانا اجمل' قال فضرب في صدري۔

''تم دونوں کی قرأت درست ہے۔ ابی کہتے ہیں: میں نے عرض کی: ہم دونوں کی قرأت کسی طرح بہترین اور درست ہو سکتی ہے؟ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سینے پر ہاتھ مارا۔''

ایک اور روایت کے مطابق ایک مرتبہ کسی شخص کی زبانی قرأت سن کر حضرت عمرو بن العاص نے اسے ٹوکا پھر جب اس واقعے کا تذکرہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ان هذا القرآن انزل على سبعة احرف فأي ذلك قرأتم فقد احسنتم ولا اصبتهم فلا تماروا فيه۔

''بے شک یہ قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے تم جس طرح سے چاہو قرأت کر سکتے ہو اور اس لیے اختلاف قرأت کے بارے میں جھگڑا نہ کرو۔'' (مسند احمد' ۴: ۲۰۵)

اس روایت کو امام احمد بن حنبل نے نقل کیا ہے۔

امام احمد' ابوعبید اور طبری' ابوجہیم کے حوالے سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ دو اشخاص کا کسی آیت کی قرأت میں اختلاف ہوا۔ انہوں نے اپنا مقدمہ بارگاہ رسالت میں پیش کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں ارشاد فرمایا:

امام طبری اور طبرانی' حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کے حوالے سے روایت کرتے ہیں:

جاء رجل الی رسول اللّٰہ فقال: ان ابن مسعود اقرانی سورۃ اقرانیھا زید واقرانیھا ابی بن کعب فاختلفت قراء تھم' فقراءۃ ایھم آخذ؟ فسکت رسول اللّٰہ وعلی الی جنبہ فقال علی: لیقرأ کل انسان منکم کما علم فانہ حسن جمیل

(مناہل العرفان' ۱:۱۰۳)

''ایک شخص بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا اور عرض کی: ابن مسعود' زید اور ابی بن کعب نے مجھے ایک ہی سورۃ پڑھنا سکھائی ہے لیکن تینوں کی قرأت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ میں کون سی قرأت کو اختیار کروں؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اس وقت وہاں موجود تھے۔ انہوں نے فرمایا: انسان کو جو قرأت سکھائی جائے وہی بہتر ہوتی ہے۔''

ابن حبان اور حاکم' حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے حوالے سے یہ روایت نقل کرتے ہیں:

اقرانی رسول اللّٰہ من آل عمران فرحت الی المسجد فقلت لرجل اقراھا فاذا ھو یقرا حروفا ما اقراھا' فقال: اقرانیھا رسول اللّٰہ' فانطلقنا الی رسول اللّٰہ فاخبرناہ فتغیر وجھہ' وقال: انما اھلک من قبلکم الاختلاف' ثم اسرالی علی شیئا' فقال علی: فان رسول اللّٰہ یامرکم ان یقراکل انسان کما علم' قال فانطلقنا وکل رجل منا یقرا حروف لا یقرؤھا صاحبہ

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے سورۃ آل عمران کی قرأت سکھائی۔ اس کے بعد میں مسجد چلا گیا۔ وہاں ایک شخص اسی سورۃ کو ایک اور طریقے سے پڑھ رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا۔ مجھے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قرأت سکھائی ہے۔ ہم دونوں بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور اپنے اختلاف کا ذکر کیا تو ناراضگی کے باعث نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک کا رنگ تبدیل ہو گیا اور فرمایا' تم سے پہلے والے لوگ آپس کے اسی اختلاف کے باعث تباہی کا شکار ہو گئے تھے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آہستہ آواز میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کچھ کہا' حضرت علی نے بلند آواز میں کہا' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں حکم دیا تم میں سے جو شخص جس طرح قرأت سیکھے اسی طرح قرأت کرے۔ ابن مسعود کہتے ہیں' ہم واپس آ گئے اور ہم میں سے ہر شخص ایک دوسرے

سے مختلف طریقے سے قرأت کرتا تھا۔''

ترمذی شریف میں ایک روایت یوں منقول ہے:

انه قال یا جبریل انی بعثت الی امة امیین فمنهم العجوز والشیخ الکبیر والغلام والجاریة والرجل الذی لم یقرأ کتاباقط فقال مرهم فلیقرئوا القرآن علی سبعة احرف (جامع الترمذی '٥: ١٩٤' رقم الحدیث: ٢٩٤٤)

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے جبرائیل! مجھے اَن پڑھ قوم کی طرف بھیجا گیا ہے جن میں بوڑھی عورتیں اور بوڑھے مرد موجود ہیں' کمسن بچے اور بچیاں موجود ہیں اور ایسے افراد بھی ہیں جو پڑھنا نہیں جانتے۔ تو حضرت جبرائیل نے عرض کی: آپ انہیں حکم دیجئے کہ وہ سات طریقوں میں سے کسی ایک طریقے کے مطابق قرأت کریں۔''

الفاظ اور ان کے باطنی انوار

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس طرح کی روایات بے شمار ہیں اور ان سب سے ایک بات ظاہر ہوتی ہے کہ ان احادیث میں سات حروف سے مراد قرأت کے تلفظ میں سات مختلف طرح کے طریقے ہیں؟

سیّدی دباغ نے جواب دیا: تلفظ سے متعلق اختلاف کی مثال ایک سائے کی سی ہے جبکہ باطنی انوار کی مثال جسم کی مانند ہے اس لیے اگر کوئی شخص سائے کے وجود کا قائل ہو تو اسے جسم کے وجود کا منکر قرار نہیں دیا جا سکتا بالواسطہ طور پر وہ شخص جسم کے وجود کا قائل ہوگا کیونکہ کوئی بھی سایہ جسم کے بغیر نہیں پایا جا سکتا۔ اگر سایہ ایک ہو تو جسم بھی ایک ہوگا اگر سائے متعدد ہوں تو جسم بھی متعدد ہوں گے اس لیے جب حضرت جبرائیل علیہ السلام سائے کے ایک یا دو حروف لے کے آئیں گے تو گویا وہ جسم کے ایک یا دو حروف لائے ہیں اور جب وہ سات حروف لیکر آئیں گے تو گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتوں باطنی انوار کے مطابق پڑھنے کی اجازت دیدی گئی ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے عرض کی: آپ کی برکت سے سات باطنی حروف کا مفہوم سمجھ میں آ گیا ہے لیکن سات لفظی اختلافات سے کیا مراد ہے؟ کیا اس کا تعلق لغت کے ساتھ ہے؟ بعض اہل علم اس بات کے قائل ہیں لیکن پھر ان کے درمیان بھی بہت زیادہ اختلاف ہے۔ بعض دیگر اہل علم کے نزدیک ان سات اقسام کا تعلق احکام کے ساتھ ہے۔ یہ حضرات' حضرت عبداللہ بن مسعود سے منقول اس روایت سے استدلال کرتے ہیں۔

''پہلی کتابیں ایک دروازے سے' ایک حرف پر نازل ہوتی تھیں لیکن قرآن مجید سات دروازوں سے سات حروف پر نازل ہوا ہے۔ (وہ سات حروف یہ ہیں:) زجر' امر' حلال' حرام' محکم' متشابہ' امثال۔ لہٰذا تم قرآن کے حلال کو حلال سمجھو اس کے حرام کو حرام سمجھو' جس کام میں تمہیں حکم دوں اس

پر عمل کرو جس سے منع کردوں اس سے باز آجاؤ۔ قرآن کی امثال سے نصیحت حاصل کرو اس کے محکم پر عمل کرو۔ اس کے متشابہ پر ایمان لاؤ اور یہ کہو کہ ہم اس بات پر ایمان لاتے ہیں کہ قرآن اللہ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔"

لیکن بعض اہل علم نے اس روایت کو غیر مستند قرار دیا ہے۔ اہل علم کا ایک گروہ سات حروف سے مراد اختلاف قرأت لیتا ہے اور یہ حضرات بھی کئی گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ بعض اہل علم کے نزدیک سات سے مراد کوئی متعین عدد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وسعت اور سہولت ہے اور حدیث کا مفہوم یہ ہوگا کہ قرآن مجید کو عام لوگوں کی سہولت اور آسانی کیلئے نازل کیا گیا ہے لہٰذا ہر شخص اپنی آسانی کے مطابق قرأت کر سکتا ہے۔

سیّدی دباغ نے جواب دیا: اس اختلاف کا تعلق قرأت کے ساتھ ہے۔

اختلاف قرأت کی سات اقسام

سیّدی دباغ کی گفتگو سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قرأت میں اختلاف سات طرح سے ہوسکتا ہے۔

1- اعراب کے اعتبار سے حرکات یا سکون میں اختلاف ہوگا جیسے "اَلِیۡمِ" کو "اَلِیۡمٌ" بھی پڑھا گیا ہے۔

2- کسی حرف کی کمی یا بیشی میں اختلاف ہوگا جیسے "سارعو" کو "سارعوا" بھی لکھا جا سکتا ہے۔

3- کسی لفظ کی کمی و بیشی میں اختلاف ہوگا جیسے "ان اللہ هو الغنی الحمید" کو "ان اللہ الغنی الحمید" بھی پڑھا گیا ہے۔

4- الفاظ کی تقدیم و تاخیر میں اختلاف ہوگا جیسے "جاء ت سکرة الموت بالحق" کو "جاء ت سکرة الحق بالموت" بھی پڑھا گیا ہے۔

5- مخارج حروف میں اختلاف ہوگا جیسے لفظ "صراط" میں "ص" کا مخرج اشمام قرار دیا گیا ہے حالانکہ "ص" کا مخرج مختلف ہے وغیرہ۔

6- فتح، امالہ، ادغام یا اظہار میں اختلاف ہوگا۔

7- تیز یا آہستہ ادائیگی کے اعتبار سے قرأت میں اختلاف ہوگا کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھار آہستگی کے ساتھ اور کبھی تیزی کے ساتھ قرأت کیا کرتے تھے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: یہ تمام تر اختلافات باطنی انوار سے مربوط ہو سکتے ہیں اور ان انوار کا تعلق حروف اور حرکات کی تقسیم سے متعلق انوار کے ساتھ نہیں ہے۔ (یہ انوار درج ذیل ہیں)

آہستگی سے پڑھنے کا تعلق "حرف روح" کے ساتھ ہے۔

مخارج کی درست ادائیگی کے ہمراہ تیز پڑھنے کا تعلق حرف قبض کے ساتھ ہے۔

امالہ کا تعلق حرف نبوت کے ساتھ ہے۔

فتح کا تعلق حرف رسالت کے ساتھ ہے۔

اشام کا تعلق حرف روح کے ساتھ ہے۔

حروف کی زیادتی کا تعلق حرف قبض اور کمی کا تعلق حرف روح کے ساتھ ہے۔

الفاظ کی کمی کا تعلق حرف علم اور بیشی کا تعلق حرف رسالت کے ساتھ ہے۔

الفاظ میں تقدیم کا تعلق حرف آدمیت اور تاخیر کا تعلق حرف علم کے ساتھ ہے۔

جہاں حرکات میں اختلاف نہ ہو اس مقام کا تعلق حرف بسط کے ساتھ ہو گا جیسے یہ آیت ہے:

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (الضحیٰ ۹۳: ۷)

''اور اس نے آپ کو اپنی محبت میں خود رفتہ وگم پایا تو اس نے مقصود تک پہنچا دیا۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) یہ تمام بیان سیّدی عبدالعزیز دباغ کا ہے۔ شیخ ابن قتیبہ نے اپنی کتاب ''المشکل'' میں قرأت کی مختلف صورتوں کی وضاحت کی ہے۔ ان کے کلام کو شیخ ابن الجزری نے اپنی تصنیف ''النشر'' اور ابن حجر نے اپنی تصنیف ''فتح الباری'' میں نقل کیا ہے۔ قاسم بن ثابت نے اپنی تصنیف ''الدلائل'' میں ابن قتیبہ کے بیان پر اعتراضات وارد کیے ہیں۔ شیخ ابوالفضل رازی اور ابن الجزری نے بھی ان کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ شیخ ابوبکر نے اپنی تصنیف ''الانتصار'' میں اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے۔

اگر آپ ان علماء کی تحقیقات اور سیّدی دباغ کے بیان کا تقابلی جائزہ لیں تو حق آپ کے سامنے واضح ہو جائے گا کیونکہ سیّدی دباغ اپنے کشف کی روشنی میں بیان کرتے ہیں اور آپ صرف اس اختلاف قرأت کا تذکرہ کرتے ہیں جو آپ کو کشف کے ذریعے پتہ چلتا ہے اور پھر بطور خاص اس اختلاف کو باطنی انوار سے مربوط کرنا آپ ہی کا خاصہ ہے۔

اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں ہمیں سیّدی دباغ کے علوم و برکات سے بہرہ مند فرمائے۔

رؤیائے صالحہ اور فرمانِ نبوی

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے سیّدی عبدالعزیز دباغ سے درج ذیل حدیث کے بارے میں دریافت کیا:

الرؤیا الصالحة من الرجل الصالح جزء من ستة واربعین جزءا من النبوة۔

(فتح الباری' ۱۲: ۳۶۷)

''کسی نیک آدمی کو دکھائی دینے والا' اچھا خواب' نبوت کا 46واں حصہ ہے''

امام بخاری نے اور دیگر محدثین نے اس روایت کو اسی طرح نقل کیا ہے جبکہ امام مسلم حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ یہ 45واں حصہ ہے۔ امام طبری اور امام احمد بن حنبل نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے حوالے سے 49ویں حصے کی روایت نقل کی ہے۔ قرطبی نے 47ویں حصے کی روایت نقل کی ہے۔ طبری نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے حوالے سے 44ویں حصے کی روایت نقل

کی ہے۔ امام ابن عبدالبر حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے 26 ویں حصے کی روایت کرتے ہیں۔ شرح نووی میں 24 ویں حصے کی روایت موجود ہے جبکہ ابن ابی جمرہ کی شرح میں 25 ویں حصے کی روایت اور 26 ویں حصے کی روایت موجود ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) یہ کل 9 روایات ہیں جن میں سے پانچ 40 کی اکائیوں کے ہمراہ اور چار 20 کی اکائیوں کے ہمراہ منقول ہیں۔ ان کے علاوہ چند دیگر روایات بھی ہیں جن میں 70' 72' 76' 50' 40' 42' 15 کا عدد بھی منقول ہے۔ تاہم ان میں سب سے زیادہ مستند 46 ویں حصے اور پھر اس کے بعد 45 ویں حصے کی روایت ہے۔ ان کی علاوہ دیگر تمام روایات مشکوک ہیں۔ تاہم 70 ویں حصے والی روایت کو کسی حد تک مستند قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ اسے امام مسلم نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے حوالے سے صحیح مسلم میں نقل کیا ہے۔

اجزاء نبوت سے کیا مراد ہے؟

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: اجزاء نبوت سے مراد کیا ہے؟ اس بارے میں منقول روایت میں اختلاف کی حکمت کیا ہے؟ کیا ان تمام روایات کے درمیان تطبیق کی جا سکتی ہے؟ محدثین اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے حیرت کا شکار ہو جاتے ہیں اور وہ اس کا کوئی غیر متنازع حل پیش نہیں کر سکے ہیں؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: اجزائے نبوت سے مراد وہی اجزاء ہیں جو حرف آدمیت' حرف قبض' حرف بسط اور حرف نبوت کے اجزاء ہیں (جن کی تفصیل پہلے بیان کی جا چکی ہے) ان میں سے ہر ایک کے سات اجزاء ہیں اور ان کی مجموعی تعداد 28 ہو گی۔ ان میں سے حرف آدمیت کا ایک جز ''مذکر ہونا'' خارج کر دو کیونکہ مرد اور عورت دونوں خواب دیکھتے ہیں تو بقیہ 27 جز رہ جائیں گے۔ اس لئے 27 ویں جز کے بارے میں منقول روایت درست قرار پائے گی۔ اگر (حرف آدمیت کے اجزاء میں سے) ظاہری صورت کے کمال کے جز کو خارج کر دیا جائے تو 26 اجزاء باقی رہ جائیں گے اس لئے ابن عبدالبر کی نقل کردہ روایت درست ہو گی۔ اگر ہم (حرف آدمیت کے اجزاء میں سے) باطنی صورت کے کمال کے جز کو خارج کر دیں کیونکہ خواب میں اس کی ضرورت باقی نہیں رہتی تو 25 اجزاء باقی رہ جائیں گے اور ابن ابی جمرہ کی نقل کردہ 25 اجزاء والی روایت درست ہو گی۔ اگر ہم اسی علت کی بنیاد پر (حرف آدمیت کے اجزاء میں سے) ظاہری حواس کے کمال کے جز کو خارج کر دیں تو 24 اجزاء باقی رہ جائیں گے اور امام نووی نے بھی 24 اجزاء کی روایت نقل کی ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: ابھی ہم نے صرف 4 حروف (آدمیت' قبض' بسط اور نبوت) کے اجزاء سامنے رکھے تھے۔ اگر آپ ان میں حرف رسالت' حرف روح اور حرف علم کے سات' سات اجزاء بھی شامل کر دیں تو اجزاء نبوت کی مجموعی تعداد 49 ہو جائے گی اور امام احمد اور امام طبری نے یہی تعداد نقل کی ہے۔ اگر ہم سابقہ طرز کے مطابق اس میں سے مذکر ہوتے اور ''باطنی صورت کے کمال'' کو ساقط کر دیں تو 47 اجزاء باقی رہ جائیں گے جن کی روایت قرطبی نے کی ہے۔ اگر آپ اس کے ہمراہ ''باطنی صورت کے کمال'' کو بھی ساقط کر دیں تو اب 46

اجزاء باقی رہ جائیں گے جو امام بخاری کی نقل کردہ روایت کے عین مطابق ہیں اور اگر آپ اس میں سے ''ظاہری حواس کے کمال'' کو بھی ساقط کر دیں تو 45 اجزاء باقی رہ جائیں گے۔ (سیّدی دباغ فرماتے ہیں:) یہ ان سات روایات کی توجیہہ ہے۔ بقیہ روایات کی سند مشکوک ہے اس لئے ان کی توجیہہ پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ایک اہم اشکال

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے عرض کی: اس روایت کی جو توجیہہ آپ نے بیان کی ہے اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ خواب بھی اجزاء نبوت میں سے ایک جز ہے جبکہ حدیث کے الفاظ میں یہ صراحت موجود ہے کہ خواب اجزاء نبوت کا ایک جز ہیں؟ پھر آپ نے انہیں اجزاء نبوت کا ایک حصہ شمار کیوں نہیں کیا؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: ہر نیک خواب حرف آدمیت کے اجزاء میں سے ایک جز یعنی ''شیطانی اثرات سے بچاؤ'' اور حرف روح کے اجزاء میں سے ایک جز یعنی ''بصیرت'' سے مدد حاصل کرتا ہے اور انہی دونوں اجزاء کی مدد سے اچھا خواب دکھائی دیتا ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے عرض کی: اس صورت میں احادیث میں 'اجزاء نبوت کے ایک جز کی بجائے (اس کا بات کا ذکر ہونا چاہئے تھا کہ خواب نبوت کے) دو اجزاء پر مشتمل ہے؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: درحقیقت اچھا خواب 'شیطانی اثرات سے محفوظ رہنے کی بدولت ہی دکھائی دیتا ہے۔ روحانی بصیرت صرف اس حصے کی مدد کرتی ہے لہٰذا جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کو شیطانی اثرات سے محفوظ کر دے تو اس شخص کے خیالات نیک ہو جاتے ہیں اور اسے نیک خواب دکھائی دینے لگتے ہیں اور جو شخص شیطانی اثرات کا شکار ہو جائے اس کے خیالات بھی برے ہو جاتے ہیں اور اسے برے خواب دکھائی دینے لگتے ہیں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) سیّدی دباغ نے صرف اپنی روحانی معرفت کی بدولت اتنا جامع و مانع جواب عنایت کیا ہے ورنہ اکابر اہل علم نے اجزاء نبوت میں سے کسی ایک جز کا ذکر بھی نہیں کیا اور ان اجزاء کی تعداد بیان کرنے کی ذمہ داری ان حضرات کے سر ڈال دی ہے جو مرتبہ نبوت کے معارف سے آگاہ ہوتے ہیں۔ امام ابوعبید اللہ الحلیمی الشافعی نے اس حدیث کی شرح میں کچھ تکلف سے کام لیتے ہوئے چند امور کا تذکرہ کیا ہے جنہیں میں یہاں نقل کرنا چاہوں گا۔

حلیمی کے بیان کردہ اجزاء نبوت

شیخ علاؤ الدین قونوی تحریر کرتے ہیں' امام حلیمی شافعی نے اس حدیث کی شرح میں نبوت کے دیگر 46 اجزاء کو ذکر کرنے کی کوشش کی ہے اور اجزاء نبوت کو درج ذیل حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

1- اللہ تعالیٰ کے ساتھ بلاواسطہ کلام کرنا۔ 2- ایسا (بلاواسطہ) الہام جس میں کلام موجود نہ ہو۔
3- فرشتے کی وساطت سے وحی کا نزول۔ 4- فرشتے کا دل میں کوئی بات القاء کرنا۔ 5- عقل کا کامل ہونا۔
6- یادداشت کا مضبوط ہونا۔ 7- اجتہاد میں خطا سے محفوظ ہونا۔ 8- استنباط مسائل کی صلاحیت۔ 9- بصارت کا

طاقتور ہونا یعنی نبی دنیا کے کسی بھی حصے میں موجود کسی بھی چیز کو بآسانی دیکھ سکے۔10- سماعت کا طاقتور ہونا یعنی نبی ان آوازوں کو بھی سن سکے جنہیں عام انسان نہیں سن سکتے۔11- سونگھنے کی صلاحیت کا طاقتور ہونا جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام نے دور سے حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص کی بو سونگھ لی تھی۔12- جسمانی طاقت کا اس قدر زیادہ ہونا کہ ایک ہی رات میں تین دن کی مسافت کے برابر سفر طے کر سکے۔13- آسمانوں کی معراج۔14- گھنٹی کی مانند وحی کا نزول۔15- بھیڑ' بکریوں (یعنی جانوروں) کی گفتگو کو سمجھنا۔16- نباتات کی گفتگو سمجھنا۔17- کھجور کے تنے کی بات کو سمجھنا۔18- پتھروں کے کلام کو سمجھنا۔19- بھیڑیوں کی پکار کو سمجھنا۔20- اونٹوں کی پکار کو سمجھنا۔21- ایسی آواز کو سننا جسے بولنے والا دکھائی نہ دے۔22- جنات کا مشاہدہ کرنا۔

23- بظاہر نگاہوں سے اوجھل چیز کا سامنے آ جانا' جیسے معراج کے اگلے دن بیت المقدس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔

24- کسی واقعے سے کسی چیز کے انجام کا اندازہ لگا لینا جیسے صلح حدیبیہ کے موقع پر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی بیٹھ گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ جملہ ارشاد فرمایا تھا جس کا مفہوم یہ ہے کہ میری اس اونٹنی کو اسی ذات نے مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا ہے جس نے (ابرہہ کے) ہاتھیوں کو مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا تھا۔

25- کسی نام کو سن کر آئندہ کی صورتحال کا اندازہ لگا لینا جیسے صلح حدیبیہ کے موقع پر جب کفار کا نمائندہ مذاکرات کیلئے آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پتہ چلا کہ اس کا نام ''سہیل'' ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اب تمہارا معاملہ ''سہل'' ہو جائے گا۔

26- آسمان میں موجود کسی چیز کو دیکھ کر زمین کے کسی واقعے سے آگاہ ہو جانا جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ بادل کو دیکھ کر یہ ارشاد فرمایا تھا: یہ بادل بنو کعب کی فتح کی مبارکباد دے رہا ہے۔

27- اپنی پشت کی جانب موجود اشیاء کو دیکھ لینا۔

28- کسی مرحوم شخص کے بارے میں اس بات کی اطلاع پانا جس کا تعلق اس کی زندگی کے ساتھ تھا۔ جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ انہیں فرشتوں نے غسل دیا ہے کیونکہ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ شہادت سے پہلے جنبی تھے۔

29- کسی واقعے کو دیکھ کر آئندہ پیش آنے والے واقعات سے آگاہ ہو جانا جیسے غزوۂ خندق کے موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شام اور ایران کی فتوحات کو ملاحظہ کیا تھا۔

30- دنیا میں رہنے کے باوجود جنت اور دوزخ کا مشاہدہ کرنا۔

31- فراست۔32- نباتات کا پیروی کرنا جیسے ایک درخت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر اپنی جڑوں سمیت

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گیا تھا۔

33- جانوروں کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں درخواست پیش کرنا۔ جیسے ایک ہرنی نے اپنے بچے کے بارے میں درخواست پیش کی تھی۔

34- خواب کی ایسی تعبیر بیان کرنا جس میں غلطی کا کوئی امکان نہ ہو۔

35- کسی بھی چیز کے بارے میں بالکل درست اندازہ لگا لینا اور پھر اس اندازے کا درست ثابت ہونا۔

36- لوگوں کی احکام کی طرف رہنمائی کرنا۔

37- لوگوں کو دینی و دنیاوی معاملات صحیح طریقے سے انجام دینے کی تعلیم دینا۔

38- لوگوں کو نیکی اور ہدایت کی طرف دعوت دینا۔

39- طب کے قوانین کے مطابق لوگوں کو جسمانی صحت سے متعلق مشورے دینا۔

40- قرب الٰہی کے حصول کیلئے لوگوں کی رہنمائی کرنا۔

41- لوگوں کو مفید صنعتوں کی تعلیم دینا۔

42- غیب سے متعلق ان امور کی خبر دینا جن کا ذکر پہلے کسی نے نہ کیا ہو۔

43- مستقبل کی واقعات سے آگاہ ہونا۔

44- لوگوں کے پوشیدہ معاملات اور اسرار سے واقف ہونا۔

45- استدلال کے طریقوں کی تعلیم دینا۔

46- بہترین معاشرتی اقدار کی تعلیم دینا۔

(حلیمی کہتے ہیں) اس طرح نبوت کے اجزاء کی تعداد 46 ہو جاتی ہے اور ان تمام اجزاء کو خواب کے ہمراہ منسلک بھی کیا جا سکتا ہے کیونکہ حدیث میں خواب کو نبوت کا 46 واں حصہ قرار دیا گیا ہے۔ اگرچہ بیشتر خوابوں کا تعلق غیر انبیاء کے ساتھ ہوتا ہے لیکن نبی کو دکھائی دینے والے خواب میں غلطی کا کوئی امکان موجود نہیں ہوتا ہے۔

حلیمی کے بیان پر نقد

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) امام حلیمی شافعی کا یہ بیان محلِ نظر ہے کیونکہ انہوں نے مطلق اعتبار سے نبوت کے اجزاء شمار کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ جبکہ جن اجزاء کا انہوں نے ذکر کیا ہے۔ ان میں سے بیشتر ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہیں جیسے بھیڑ' بکریوں کا گفتگو کرنا۔ پتھروں کا سلام کرنا' کھجور کے تنے کی گریہ و زاری اور جانوروں کی زبان سمجھنا' بیت المقدس کو اپنے سامنے دیکھنا' بادل کو دیکھ کر بنو کعب کی فتح سے واقف ہو جانا' حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کی جنابت سے واقف ہونا' غزوہ خندق کے دوران خندق کی کھدائی کے وقت شام اور ایران کی فتوحات سے واقف ہو جانا وغیرہ یہ تمام جزئیات ہیں جو رونما ہو کر ختم ہو گئی ہیں۔ انہیں اجزاء نبوت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ (کیونکہ اجزاء ہمیشہ باقی رہتے ہیں) حلیمی کے بیان کردہ ابتدائی 16 اجزاء کا تعلق صرف لغت

کی معرفت کے ساتھ ہے۔اسی طرح صلح حدیبیہ کا واقعہ اور اگلے چار نکات انجام کی معرفت کی چار مختلف صورتیں ہیں۔اس طرح کل گیارہ اقسام درحقیقت صرف دو قسمیں ہیں۔نیز حلیمی کی بیان کردہ تمام تر صورتوں کو سیدی دباغ کی بیان کردہ ''حرف رسالت'' کے صرف ایک جز یعنی ''علم کامل'' میں سمویا جاسکتا ہے جیسا کہ ہم اس سے پہلے علم کامل کی تشریح میں یہ بات بیان کر چکے ہیں۔مزید برآں حلیمی نے صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ہونے والے چند معجزات کو مطلق طور پر نبوت کے اجزاء قرار دیدیا ہے۔حالانکہ نبوت کے اجزاء، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ دیگر تمام انبیاء کرام میں بھی پائے جاتے ہیں جبکہ حلیمی نے جن معجزات کو اجزاء نبوت قرار دیا ہے ان میں سے بعض معجزات کی مانند کرامات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اولیاء سے بھی صادر ہوئی ہیں کیونکہ اہل سنت کا یہ متفقہ عقیدہ ہے کہ نبی سے صادر ہونے والے بہت سے معجزات ولی سے بطور کرامت بھی صادر ہوسکتے ہیں اسلئے ان معجزات کو اجزاء نبوت قرار دینا درست نہیں ہے۔

غزالی کی تشریح

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس حدیث کی شرح بیان کرتے ہوئے امام غزالی ارشاد فرماتے ہیں: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حقیقت کو بیان کرتے ہوئے خواب کو نبوت کا 46 واں حصہ قرار دیا ہے۔یہ عدد اتفاقیہ طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ادا نہیں ہوا۔یہ ایک درست اندازہ ہے اور عام امتی اس سے واقف نہیں ہوسکتا کیونکہ نبوت ایک ایسے مرتبے کا نام ہے جو صرف مخصوص افراد (یعنی انبیاء کرام) کے ساتھ خاص ہے اور اسی مرتبے کی بدولت نبی اور غیر نبی کے درمیان امتیاز کیا جاسکتا ہے۔اس مرتبے کی چند خصوصیات ہیں تاکہ نبی اللہ تعالیٰ، اس کی صفات، فرشتوں، آخرت کے بارے میں حقیقی معرفت حاصل کرسکے۔نبی کی معرفت عام لوگوں کی معرفت سے مختلف ہوتی ہے کیونکہ نبی کو عام لوگوں کی بہ نسبت کثیر تعداد میں یقینی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔نبی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کو ایک ایسی بصیرت حاصل ہوتی ہے جس کی بدولت وہ عالم ملکوت اور فرشتوں کا مشاہدہ کرسکتا ہے اور اسی بصیرت کے حوالے سے نبی اور غیر نبی کے درمیان وہی فرق ہوتا ہے جو کسی نابینا اور ''بینا'' شخص کے درمیان ہوتا ہے۔نبی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنی بصیرت کے ذریعے بہت سے غیوب سے آگاہ ہوتا ہے، لوح محفوظ کا مطالعہ کرسکتا ہے اور اس خصوصیت کے اعتبار سے نبی اور عام شخص کے درمیان وہی فرق ہوگا جو کسی پڑھے لکھے اور ان پڑھ شخص کے درمیان ہوتا ہے۔نبی کے اندر ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ خرق عادت امور کو اس طرح انجام دیتا ہے جیسے کوئی عام انسان عادت کے مطابق امور سرانجام دیتا ہے۔یہ تمام خصوصیات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں بھی پائی جاتی ہیں۔ان میں سے ہر ایک قسم کو مزید ذیلی اقسام میں بھی تقسیم کیا جاسکتا ہے اور یہ ممکن ہے کہ ہم ان اقسام کو 40، 50 یا اس سے بھی زیادہ اقسام میں تقسیم کرلیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہم ان اقسام کو 46 حصوں میں اس طرح تقسیم کریں کہ خواب بھی ان کا ایک حصہ بن جائے لیکن ہماری یہ تقسیم صرف ہمارا اپنا اندازہ ہوگی ہم اسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی

مراد قرار نہیں دے سکتے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) یہ امام غزالی کے بیان کا خلاصہ تھا ہم نے اسے یہاں اس لئے نقل کیا ہے کہ قارئین کو سیدی عبدالعزیز دباغ کے علم وفضل اور مرتبہ ومقام کا اندازہ ہو جائے بیشک اللہ تعالیٰ اپنی فضل کے مطابق جسے جو چاہے عطا فرمادے۔

دیگر علماء کی تشریحات

امام مازری تحریر کرتے ہیں: یہ لازم نہیں ہے کہ ہر عالم کو ہر چیز کا اجمالی اور تفصیلی علم ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر عالم کیلئے ایک مخصوص حد مقرر کی ہے جس کے پاس پہنچ کر وہ ٹھہر جاتا ہے۔ بہت سی معلومات ایسی ہیں جن کے بارے میں کسی بھی عالم کو اجمالی یا تفصیلی کوئی بھی علم نہیں ہوتا۔ بہت سی معلومات ایسی بھی ہیں جن کا اجمالی علم حاصل ہو جاتا ہے لیکن تفصیلی علم حاصل نہیں ہوتا اور یہ (روایت) بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) یعنی وہ روایت جس میں خواب کو نبوت کا 46 واں جز قرار دیا گیا ہے۔ شیخ ابن ابطال' ابن العربی اور شیخ خطابی نے بھی اس نوعیت کی رائے بیان کی ہے۔ شیخ ابن بطال' شیخ ابوسعید سفاقسی کے حوالے سے یہ بات نقل کرتے ہیں: بعض علماء نے اس راویت کی یہ توجیہہ پیش کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم پر 16 ماہ تک خواب کی حالت میں وحی نازل کی اور پھر بقیہ ساری زندگی میں' بیداری کی حالت میں وحی نازل ہوتی رہی۔ مشہور روایت کے مطابق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پہلی وحی کے نزول کے بعد 23 برس زندہ رہے۔ اس طرح خواب اور بیداری کی وحی کے درمیان ایک اور 46 کی نسبت پائی جاتی ہے (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) لیکن اس جواب پر بہت سے اشکالات وارد ہو سکتے ہیں' سب سے پہلا اشکال تو یہ ہے کہ خواب کی حالت میں نازل ہونے والی سب سے پہلی وحی کے بعد کتنے عرصے تک وحی کا نزول جاری رہا؟ اس بارے میں مختلف روایات منقول ہیں اور 23 برس کا قول متفقہ نہیں ہے؟ دوسرا اشکال یہ ہے کہ بالفرض اس روایت کو درست تسلیم کر لیا جائے تو ان روایات کی کیا توجیہہ پیش کی جائے گی جن میں 46 کی بجائے 45' 49' 70' 50 اور دیگر اعداد کا ذکر ہے؟ تیسرا اشکال یہ ہے کہ ہم اس قول کو ہی درست تسلیم نہیں کرتے کہ خواب کی حالت میں نازل ہونے والی وحی کی مدت صرف 6 ماہ تھی کیونکہ اس کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے؟ چوتھا اشکال یہ ہے کہ بالفرض اگر 6 ماہ تک خواب کی حالت میں وحی نازل ہوئی تھی تو اس کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے کہ اس کے بعد وحی ہمیشہ بیداری کی ہی حالت میں نازل ہوتی رہی بلکہ بعد میں بھی خواب کی حالت میں وحی کے نزول کی روایات موجود ہیں۔ اگر انہیں آپ کے ذکر کردہ 6 ماہ میں شامل کر لیا جائے تو خواب میں وحی کے نزول کا زمانہ 6 ماہ سے بڑھ جائے گا۔

ان میں سے تیسرے اعتراض کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ (مشہور سیرت نگار) شیخ ابن اسحاق نے یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے نزول کا آغاز (خواب کی شکل میں) 40 برس کی عمر میں ربیع

الاول کے مہینے میں ہوا پھر اسی سال رمضان المبارک کے مہینے میں' غار حرا میں' حضرت جبرائیل امین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس جواب پر یہ اشکال وارد ہوگا کہ یہ روایت متفقہ نہیں ہے کیونکہ بعض دیگر محدثین اور سیرت نگاروں نے' حضرت جبرائیل امین کی آمد کے بارے میں رمضان کی بجائے رجب اور بعض دیگر حضرات نے ربیع الاول ہی کی روایت نقل کی ہے اور اگر بالفرض اس روایت کو درست تسلیم کرلیا جائے تو اس کے الفاظ میں اس بات کی صراحت موجود نہیں ہے کہ ان تمام 6 ماہ کے دوران خواب کی صورت میں وحی نازل ہوتی رہی۔

مذکورہ بالا اعتراضات میں سے چوتھے اعتراض کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ خواب سے ہماری مراد متواتر خواب ہیں۔ اس لئے بعد میں دکھائی دینے والے خوابوں سے ہم پر اعتراض وارد نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ روایات میں اختلاف اس وقت کے اعتبار سے ہے جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث بیان کی تھی۔ مثلاً وحی کے نزول کے 13 سال مکمل ہونے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا ہوگا خواب نبوت کا 26 واں حصہ ہیں۔ وحی کے نزول کے 20 سال مکمل ہونے کے بعد یہ فرمایا' 40 واں حصہ ہیں' 22 سال مکمل ہونے کے بعد فرمایا' 44 واں حصہ ہیں اور آخری عمر میں ارشاد فرمایا: 46 واں حصہ ہیں اور ان روایات کے علاوہ دیگر تمام روایات مستند نہیں ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ 50 ویں حصے یا 70 ویں حصے کی روایات درست ہو اس صورت میں 50 ویں حصے سے مراد (عربوں کے عام محاورے کے مطابق اکائی کی شکل میں 46 کہنے کی بجائے دہائی کی شکل میں) 46 واں حصہ مراد ہو۔ (یعنی 50 سے مراد یہ ہے کہ 41 سے لے کر 50 تک کوئی ایک عدد مراد ہوسکتا ہے) جبکہ 70 واں حصہ قرار دے کر مبالغہ کرنا مقصود ہوگا۔ یہ تمام گفتگو شیخ ابن حجر نے نقل کی ہے اور فرماتے ہیں کہ اس توجیہہ سے بعد میں آنے والے اہل علم میں سے کسی ایک نے بھی اختلاف نہیں کیا۔

ابن حجر کا اعتراف

شیخ ابن حجر لکھتے ہیں لیکن اس میں ایک اشکال باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ حدیث کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسی نیک مسلمان کو دکھائی دینے والے خواب کی فضیلت بیان کررہے ہیں جبکہ مذکورہ بالا تشریح سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھائی دینے والے خواب مراد ہیں کیونکہ خواب اور بیداری کے درمیان نازل ہونے والی وحی میں ایک اور چھیالیس کی نسبت پائی جاتی ہے لیکن عام مسلمان کے ساتھ یہ صورتحال پیش نہیں آتی۔ اسی لئے شیخ ابن ابی جمرہ نے اس تاویل کو مسترد کرتے ہوئے تحریر کیا ہے۔ اس تاویل کے ذریعے مسئلے کا حل سامنے نہیں آیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جیسی فصیح و بلیغ شخصیت کے کلام سے اس طرح کے معنی اخذ کرنا مناسب نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ تاویل پیش کرنے والے کے ذہن میں یہ بات موجود ہو کہ وہ اس تاویل کے ذریعے خواب اور نبوت کے درمیان کوئی مناسب واضح کرنا چاہتا ہو پھر تعداد کے اختلاف

کو اس نے اس تاویل کے ذریعے منطبق کرنے کی کوشش کی ہو۔(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) ان کے علاوہ اور بھی بہت سے اہل علم نے ان روایات میں تطبیق دینے کی کوشش کی ہے۔

امام ابوجعفر طبری تحریر کرتے ہیں۔ 70 ویں حصے والی روایت ہر مسلمان کو دکھائی دینے والے سچے خواب کے بارے میں ہے۔ 40 ویں حصے والی روایت کسی متقی اور پرہیزگار مسلمان کو دکھائی دینے والے خواب کے بارے میں ہے اور دیگر تمام روایات دیگر مسلمانوں کے احوال پر منطبق ہوں گی۔

ابن بطال کی تاویل

شیخ ابن بطال تحریر کرتے ہیں' روایات میں جو اختلاف پایا جاتا ہے ان میں سب سے زیادہ مستند 46 ویں اور 70 ویں حصے والی روایت ہے۔ کیونکہ خواب دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک بالکل صاف اور واضح' جیسے خواب میں کسی نے دیکھا کہ اسے ایک مخصوص فن دیا گیا ہے اور پھر بیداری کی حالت میں اسے وہی فن مل جائے تو اب اس خواب کی تعبیر میں کسی مشکل یا تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ دوسری قسم کے خواب وہ ہیں جن کی تعبیر کوئی ماہر ہی بیان کرسکتا ہو کیونکہ اس خواب میں بہت دور کی مثال دی گئی ہوگی اس لئے ممکن ہے کہ دوسری قسم سے مراد 70 واں حصہ اور پہلی قسم سے مراد 46 واں حصہ ہو کیونکہ جس قدر اجزاء کم ہوتے چلے جائیں گے خواب حقیقت کے قریب ہوتا جائے گا۔ اور اس کی تعبیر میں غلطی کا امکان باقی نہیں رہے گا۔ اس کے برعکس جس قدر اجزاء زیادہ ہوتے چلے جائیں گے ان کی تعبیر میں غلطی کا امکان بڑھتا چلا جائے گا۔

شیخ ابن بطال کہتے ہیں' میں نے یہ تاویل بہت سے علماء کو سنائی۔ انہوں نے اس کی تعریف کی اور پھر ایک عالم دین نے اس میں مزید اضافہ یہ کیا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی انہی دو طریقوں سے نازل ہوئی تھی جیسے خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: بعض اوقات مجھ پر اس طرح وحی نازل ہوتی ہے کہ میں بغیر کسی مشقت کے جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ کلام کرتا ہوں۔ اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جبرائیل علیہ السلام آپ کے سامنے کچھ کلمات سناتے تو ان کے نتیجے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر شدید لرزہ طاری ہو جاتا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مبارک پسینے میں ڈوب جاتا۔(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) امام مازری نے اس ساری گفتگو کا خلاصہ یوں بیان کیا ہے کہ خواب کسی واقعے پر دلالت کرتے ہیں اور یہ دلالت کبھی واضح ہوتی ہے اور کبھی غیر واضح ہوتی ہے۔ عام طور پر واضح دلالت بہت کم پائی جاتی ہے اور غیر واضح زیادہ تعداد میں پائی جاتی ہے اور ان کے درمیان بھی مختلف مراتب ہیں۔ (جن پر احادیث میں منقول مختلف تعداد کو چسپاں کیا جا سکتا ہے۔)

امام ابن ابی حمزہ کی تشریح

امام ابومحمد بن ابی حمزہ نے اس روایت کی جو شرح بیان کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ نبوت کے ہمراہ آنے والے تمام احکام واضح ہوتے ہیں لیکن بعض اقسام کی وحی میں اجمال ہوتا ہے جسے کسی اور وحی میں واضح طور پر

بیان کیا گیا ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض خواب واضح ہوتے ہیں جن میں کسی تاویل کی ضرورت پیش نہیں آتی اور بعض خواب ایسے ہیں جنہیں علم تعبیر کا کوئی ماہر ہی سمجھ سکتا ہے اسی لیے خواب کو نبوت کا جز قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ جز کبھی کم سمجھ میں آتا ہے اور کبھی واضح طور پر سمجھ میں آ جاتا ہے اور اسی فہم کے اعتبار سے اس جز کو مختلف مراتب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خواب کی تعبیر جاننے والا شخص جس قدر زیادہ ماہر ہوگا اس کے اندر اجزاء کی تعداد اتنی ہی کم ہوگی اور جس شخص کو علم تعبیر سے سب سے کم واقفیت ہوگی اس میں اجزاء کی تعداد سب سے زیادہ ہوگی لیکن یہ تاویل محل نظر ہے کیونکہ اس تاویل میں اجزاء نبوت کی تقسیم کو تعبیر بیان کرنے والے شخص سے منسلک کیا گیا ہے جبکہ خواب کسی اور نے دیکھا تھا۔ اگر حدیث کا مفہوم تعبیر کرنے والے شخص کی صلاحیت کے مطابق ہوتا تو حدیث کے الفاظ یہ ہوتے ''نیک آدمی کا نیک خواب کو سمجھنا نبوت کا 46 واں جز ہے۔'' اس اعتبار سے یہ تعبیر بیان کرنے والے کی خوبی ہوگی' خواب (یا خواب دیکھنے والے) کی نہیں اور یہ بات حدیث کے مفہوم کے خلاف ہے۔

شیطانی خوابوں کا حکم

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے سیّدی دباغ سے ان خوابوں کے بارے میں دریافت کیا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں اور وہ بھی جو شیطان کی طرف سے ہوتے ہیں؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: انسان دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو ہر وقت حق کے ساتھ مشغول اور متعلق رہتے ہیں۔ دوسرے وہ جو باطل کے ساتھ مشغول اور متعلق رہتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو اپنے حسب حال (حق یا باطل) کی مدد حاصل رہتی ہے اور ان کی یہ حالت ہمیشہ برقرار رہتی ہے۔ اس کے بعد آپ نے اسی بات کو ایک مثال کے ذریعے واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: فرض کریں کہ دو سائل ہیں۔ دونوں نے دس دینار کا سوال کیا اور دونوں کو دس' دس دینار مل بھی گئے۔ دونوں بہت خوش ہوئے لیکن ایک کی خوشی کا تعلق عطا کرنے والی ذات کے ساتھ تھا اور اس کی یہ خوشی اس کے باطن پر بھی اثر انداز ہوتی ہے یہاں تک کہ اس کا باطن بھی عطا کرنے والی ذات سے منسلک ہو جاتا ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو ہمیشہ حق کے ساتھ مشغول اور متعلق رہتا ہے جبکہ دوسرے سائل کی ساری خوشی کا تعلق حاصل ہونے والی رقم کے ساتھ ہے لہٰذا جب اس کی توجہ رقم کی طرف مبذول ہوگی تو اسے اپنی بہت سی ضروریات کا خیال آئے گا جو اس رقم کے ذریعے پوری ہو سکتی ہیں۔ ان ضروریات کی تکمیل کے بعد وہ مزید رقم کا سوال کرنا شروع کر دے گا اور کہے گا: اے میرے پروردگار! مجھے مزید دس دینار عطا فرما کیونکہ اس کی پوری توجہ اپنی ضروریات کی طرف مبذول ہے۔ اس لیے درحقیقت وہ خدا کی طرف متوجہ نہیں ہے صرف ظاہری طور پر اللہ تعالیٰ کو مخاطب کر رہا ہے ورنہ درحقیقت وہ اللہ تعالیٰ سے لاتعلق اور محجوب ہے۔ یہی وہ شخص ہے جو ہر وقت باطل کے ساتھ مشغول اور متعلق رہتا ہے۔

اسی طرح پہلی قسم کے خواب کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے اور دوسری قسم کے خواب کو شیطان سے منسوب کیا جائے گا حالانکہ درحقیقت دونوں طرح کے خواب اللہ تعالیٰ کی جانب سے آتے ہیں لیکن دوسری قسم کو شیطان سے اس لیے منسوب کیا گیا ہے کہ ان کے ذریعے شیطان خوش ہوتا ہے اور وہ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اولادِ آدم اس طرح کے خواب دیکھے کیونکہ یہ خواب شیطان کی پسندیدہ ظلمتوں کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور شیطان کی اصل بھی ظلمت ہے اس لئے وہ ظلمت کو پسند کرتا ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) ائمہ حدیث مثلاً ابن حجر' ابن العربی' ابن بطال' ابن ابی جمرہ اور دیگر بہت سے محدثین نے یہی بات بیان کی ہے' ہر خواب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوتا ہے لیکن بعض خوابوں کو شیطان سے اس لیے منسوب کیا جاتا ہے کیونکہ شیطان ان سے خوش ہوتا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میرا اگلا سوال سچے اور جھوٹے خوابوں کے بارے میں تھا۔ سیّدی دباغ نے جواب دیا: سچا خواب وہ ہے جسے دیکھنے والا بیداری کی مانند نیند کی حالت میں بھی مشاہدہ حق میں مشغول رہے اور جھوٹے خواب دیکھنے والے شخص کی مثال اس کے برعکس ہوتی ہے۔ بیداری کی طرح نیند کی حالت میں بھی وہ طرح طرح کے وسوسوں اور وہموں کا شکار رہتا ہے۔ بیداری کی طرح خواب کی حالت میں بھی وہ حق سے محجوب رہتا ہے۔

اہل ظلمت کے سچے خواب

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے عرض کی: بعض اہل ظلمت کو بھی سچے خواب دکھائی دیتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ نیند کی حالت میں بھی ان کا دل محجوب نہیں ہوتا جبکہ آپ پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اہل ظلمت کو دکھائی دینے والے خواب شیطان کی طرف سے ہوتے ہیں اور ان میں لازمی طور پر حجاب پایا جائے گا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مصر کے حکمران کے ایک خواب کا تذکرہ بیان کیا ہے:

وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّیْۤ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ۔ (یوسف ۱۲:۴۳)

''بادشاہ نے کہا میں نے خواب میں سات صحت مند گائیں دیکھی ہیں''

سیّدی دباغ نے جواب دیا: اس کی وجہ یہ ہے کہ اس خواب میں حضرت یوسف علیہ السلام کا ''سر'' پوشیدہ تھا کیونکہ یہی خواب حضرت یوسف علیہ السلام کی رہائی' شہرت اور حکومت کا باعث بنا۔ اگر خواب کا تعلق کسی اور کے ساتھ ہو تو بعض اوقات کسی کافر کو دکھائی دینے والا خواب بھی سچا ثابت ہوتا ہے جیسا کہ بادشاہ مصر کو دکھائی دینے والے خواب کا تعلق پورے ملک کے ساتھ تھا اور یہ خواب صرف بادشاہ کی ذات کے ساتھ مخصوص نہیں تھا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) لیکن قید خانے میں حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھی قیدیوں کو دکھائی دینے والے خواب کا تعلق ان کی اپنی ذات کے ساتھ تھا اور بعد کے واقعات نے یہ بات ثابت کیا کہ یہ خواب بالکل درست تھے۔ لہٰذا آپ کا بیان کردہ اصول یہاں منطبق نہیں ہوسکتا؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس کے ذریعے حضرت یوسف علیہ السلام کی شہرت اور رہائی کا راستہ نکلتا تھا۔ لیکن عام اصول یہی

ہے کہ اہل ظلمت کو دکھائی دینے والا خواب اس وقت سچ ثابت ہوتا ہے جب اسکا تعلق کسی دوسرے کے ساتھ ہو یا خواب میں اسے دین حق پر گامزن ہونے کی تلقین کی گئی ہو یا وہ خواب اس دیکھنے والے کی توبہ کا باعث بن سکتا ہو یا اس طرح کا کوئی اور دینی فائدہ حاصل ہوسکتا ہو (تو اہل ظلمت کو دکھائی دینے والا خواب بھی سچا ہوتا ہے۔احمد بن مبارک کہتے ہیں:) حافظ ابن حجر نے گنہگاروں اور مشرکین کو دکھائی دینے والے خوابوں کیلئے بھی یہی اصول بیان کیا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) علم تعبیر کے ماہرین کی یہ رائے ہے کہ اگر کوئی بددیانت یا گنہگار شخص کوئی اچھا خواب دیکھ لے تو یہ اس کیلئے ایمان یا توبہ قبول کرنے کی خوشخبری ثابت ہوتا ہے یا کفر اور فسق پر گامزن رہنے کے بارے میں تنبیہہ کی حیثیت رکھتا ہے۔بعض اوقات اس کے خواب کا تعلق کسی اور صاحب فضیلت شخص کی عظمت شان کے اظہار کے ساتھ ہوتا ہے۔بعض اوقات انہیں ایسا خواب بھی دکھائی دیتا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ کفر یا گناہ پر ان کی ثابت قدمی لائق تعریف ہے۔ایسا خواب صرف ایک دھوکہ اور فریب ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) جب خواب میں اسے یہ دکھائی دے کہ کفر یا گناہ پر ثابت قدم رہنا بہتر ہے تو اس کا بالواسطہ مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی اچھا خواب نہیں ہے اور صرف اچھا خواب ہی سچ ثابت ہوتا ہے جیسا کہ ہم اس سے پہلے اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں۔ہوسکتا ہے کہ یہ جواب دیتے وقت سیّدی دباغ کی توجہ' اچھے خواب سے ہٹ کر' صرف کفار کو دکھائی دینے والے خوابوں کی طرف مبذول ہوگئی ہو (اس لیے آپ نے ایسا جواب عنایت کیا۔)

خوابِ پریشاں کا حکم

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: کون سا پریشان خواب نقصان دہ ہوتا ہے اور کون سا نقصان دہ نہیں ہوتا؟ اس سوال سے پہلے میں نے سیّدی دباغ کو ایک روایت سنائی جس کے مطابق ایک مرتبہ ایک خاتون نے یہ خواب دیکھا کہ اس کے گھر کا ایک ستون گر گیا ہے اور اس کے ہاں ایک یک چشم (کانا) بچہ پیدا ہوا ہے۔جس وقت اس خاتون نے یہ خواب دیکھا تھا اس وقت اس کا شوہر تجارت کے سلسلے میں کہیں دور گیا ہوا تھا۔اس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خواب سنایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''انشاء اللہ! تمہارا شوہر صحیح سلامت واپس آئے گا اور تمہارے ہاں صحت مند بچہ پیدا ہوگا۔'' کچھ دن بعد وہ عورت دوبارہ حاضر خدمت ہوئی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت وہاں موجود نہیں تھے۔اس عورت نے ام المومنین سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ کو اپنا خواب سنایا تو ام المومنین نے جواب دیا: ''اگر تمہارا خواب سچا ہے تو تمہارا شوہر سفر کی حالت میں انتقال کر جائے گا۔اور تمہارے ہاں ایک فاسق و فاجر بچہ پیدا ہوگا۔جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ نے یہ خواب اور اس کی تعبیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتائی تو آپ

صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تعبیر کو ناپسند کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''اے عائشہ! کسی بھی مسلمان کو اس کے خواب کی اچھی تعبیر بتایا کرو کیونکہ خواب تعبیر کے مطابق واقع ہوتے ہیں۔'' (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) حافظ ابن حجر کہتے ہیں اس روایت کو امام دارمی نے مستند طور پر نقل کیا ہے۔ (یہاں تک احمد بن مبارک کا سوال تھا۔)

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا: پریشان خواب اللہ تعالیٰ کی جانب سے انسان کیلئے تنبیہہ اور آزمائش ہوتے۔ ہیں کہ کیا یہ شخص اب بھی اپنے پروردگار کے ساتھ تعلق کو برقرار رکھتا ہے یا اسے منقطع کر دیتا ہے۔ لہٰذا جب انسان اپنے پروردگار کے ساتھ تعلق برقرار رکھے تو کوئی بھی پریشان خواب اسے پریشان نہیں کر سکتا کیونکہ وہ یہ بات بخوبی جانتا ہے کہ یہ خواب اس ذات کی طرف سے ہے جس کے دست قدرت میں ہر چیز کا تصرف ہے اور جس نے اپنے اختیار کے مطابق سب کچھ طے کر دیا ہے۔ اس لئے ایسا شخص کبھی بھی کسی خواب سے پریشان یا خوفزدہ نہیں ہوگا اور انشاء اللہ ایسا کوئی بھی خواب انسان کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اس کے برعکس جو شخص اللہ تعالیٰ سے لاتعلق ہوگا اور کوئی پریشان خواب دیکھ لے تو اس کی پوری توجہ اسی خواب کی طرف مبذول ہو جائے گی اور اس کے دل میں یہ اندیشہ پیدا ہوگا کہ یہ خواب ضرور سچ ثابت ہوگا۔ لہٰذا یہ شخص تقدیر سے غافل ہو کر خواب کی طرف متوجہ ہو جائے گا۔ اور آخر کار اسی مصیبت کا شکار ہو جائے گا جس سے وہ خوفزدہ تھا۔ پریشان خواب اسی طرح کے لوگوں کیلئے نقصان کا باعث ہوتے ہیں۔

برا خواب دیکھنے پر تعوذ کی حکمت

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: برا خواب دیکھنے کی صورت میں اعوذ باللہ پڑھنے، برے خواب اور شیطان کے شر سے محفوظ رہنے کی دعا کرنے اور بائیں جانب تین مرتبہ تھوکنے کا حکم کیوں دیا گیا ہے؟

سیّدی دباغ نے جواب دیا: ہر مسلمان کا دل اللہ ہی کے ذکر کی حالت میں سوتا اور اسی حالت میں بیدار ہوتا ہے گویا سوتے اور جاگتے وقت، ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کی یاد ان کے دل میں موجود ہوتی ہے۔ ایسا شخص جب کوئی پریشان خواب دیکھ کر بیدار ہو تو اس کا دل اس حالت سے متزلزل ہو چکا ہوتا ہے جو سوتے وقت موجود تھی اسی لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی سابقہ حالت کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا ہے کہ بندہ مومن دوبارہ اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف رجوع کرے اور اس پریشان خواب کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی مدد طلب کرے اور اس پریشان خواب سے لاتعلق ہو جائے کیونکہ شیطان اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ انسان کا تعلق دوبارہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہو جائے اس لئے شیطان کے شر سے محفوظ رہنے کیلئے اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تھوکنے کا حکم دینے کی حکمت یہ ہے کہ وہ متزلزل ہونے کی سابقہ کیفیت کو ایک گندگی شمار کرتے ہوئے اس کی جانب تھوک دے۔ بائیں جانب تھوکنے کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ شیطان ہمیشہ بائیں جانب سے حملہ آور ہوتا ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: ہر بھلائی دائیں جانب سے حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا ہر مسلمان کا وہ محافظ فرشتہ

جس کا نور مضبوط ہو وہ دائیں جانب موجود رہتا ہے اور جس کا نور کمزور ہوگا وہ بائیں جانب موجود رہتا ہے۔ جنت بھی دائیں جانب موجود ہے جبکہ جہنم بائیں جانب موجود ہے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام ہمیشہ دائیں جانب سے بارگاہ رسالت مآب میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ دائیں جانب سے متوجہ ہو کر شہداء کی ارواح کا مشاہدہ کیا کرتے تھے۔ جب کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہداء بدر و احد یاد آتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دائیں جانب متوجہ ہوتے اور شہداء کو کفار کے ساتھ نبرد آزما دیکھتے تھے۔ عرش بھی دائیں جانب موجود ہے جبکہ فرش بائیں جانب موجود ہے۔ زمین کے جس حصے میں اولاد آدم میں سے اہل ایمان آباد ہیں وہ زمین کا دایاں حصہ ہے اور جس حصے میں جنات آباد ہیں وہ بایاں حصہ ہے۔ انسانی جسم میں دائیں طرف موجود رگیں کثرت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتی ہیں اور بائیں جانب کی رگوں پر خاموشی طاری رہتی ہے۔ حق کا نور ہمیشہ دائیں جانب سے آتا ہے اور باطل ہمیشہ بائیں جانب سے آتا ہے۔ مختصر یہ کہ ہر بھلائی دائیں جانب سے اور ہر برائی بائیں جانب سے آتی ہے۔

دائیں اور بائیں جانب کا حکم

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: دائیں جانب سے مراد کیا ہے؟ سیدی دباغ نے جواب دیا: جہاں تک ''صاحب فتح'' ولی کا تعلق ہے اسے ہمیشہ ہر بھلائی دائیں جانب سے آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور ہر برائی بائیں جانب دکھائی دیتی ہے۔ اگر وہ رخ بدل دے تو برائی اور بھلائی کی سمت بھی تبدیل ہو جاتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی ولی مشرق کی سمت منہ کر کے کھڑا ہے تو اب ہر طرح کی بھلائی اسے اپنی دائیں جانب یعنی جنوب کی سمت میں دکھائی دے گی۔ یہاں تک کہ جنت' عرش' شہداء کی ارواح کو بھی وہ اپنے دائیں طرف محسوس کرے گا جبکہ اسے اپنے بائیں طرف یعنی شمال کی جانب ہر طرح کی برائی مثلاً جہنم' شیاطین' بدبخت لوگوں کی ارواح اور دیگر ظلماتی اشیاء دکھائی دیں گی۔ پھر وہی شخص اپنا رخ مغرب کی طرف کر لیتا ہے تو اب اسے اپنی دائیں جانب یعنی شمال کی سمت میں تمام بھلائیاں دکھائی دیں گی اور بائیں جانب یعنی جنوب کی سمت میں تمام برائیاں دکھائی دیں گی۔ اگر وہ اپنا رخ کسی اور سمت میں یعنی شمال یا جنوب کی طرف پھیر لیتا ہے تو ان برائیوں اور بھلائیوں کی جہت بھی تبدیل ہو جائے گی۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: اس کا ''سر'' یہ ہے کہ ہر ''صاحب فتح'' ولی کے پاس دو آئینے ہوتے ہیں جن کی مدد سے وہ تمام اشیاء دیکھتا ہے۔ ان میں سے ایک آئینہ نورانی ہوتا ہے اور اس کے ذریعے صرف نورانی اشیاء ہی دکھائی دے سکتی ہیں جبکہ دوسرا آئینہ ظلماتی ہے جس میں صرف ظلمت والی اشیاء دکھائی دیتی ہیں لہٰذا نورانی آئینہ اس کے دائیں جانب موجود ہوتا ہے اور یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان کا نور ہے جبکہ ظلماتی آئینہ بائیں جانب موجود ہوتا ہے جو درحقیقت خبیث نفس کی شہوات کی خباثت ہوتی ہے جو ایمان کے نور کے مدمقابل موجود ہوتی ہے۔ اس لئے جب وہ شخص دائیں طرف دیکھتا ہے تو اس کے ایمان کے نور کی مدد شامل حال ہوتی ہے۔ جس

کے نتیجے میں اسے وہ تمام اشیاء دکھائی دیتی ہیں جو اس کے ایمان کے نور کی مانند حق اور نور ہوتی ہیں اسی طرح جب وہ اپنے بائیں طرف دیکھتا ہے تو اس وقت نفسانی خواہشات کی ظلمت اس کی مدد کرتی ہے اور اس وقت اسے صرف وہی اشیاء دکھائی دیتی ہیں جو نفسانی خواہشات کی مانند ظلمت اور تاریکی کا شکار ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہر چیز کو اپنی ذاتی فطرت کے اعتبار سے دیکھتا ہے کیونکہ فطری طور پر وہ روح اور جسم کا مجموعہ ہے جب روح پوری رضامندی اور رغبت کے ساتھ اس کے جسم میں قیام پذیر ہو جائے تو روح اور جسم دونوں کو ایمان کا نور نصیب ہوتا ہے اور یہ نور اس کے وجود کا حصہ بن جاتا ہے۔ کسی بھی چیز کو عقل دیکھتی ہے لہٰذا جب عقل روح کے نور کے آئینے کی مدد سے کچھ دیکھنے کی کوشش کرتی ہے تو اسے صرف پاکیزہ چیزیں دکھائی دیتی ہیں اور جب عقل جسم کے آئینے کی مدد سے کوئی چیز دیکھنے کی کوشش کرتی ہی تو اسے صرف ظلمت اور اس کی مانند دیگر اشیاء دکھائی دیتی ہیں۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اسی اصول کے تحت ہم اس حدیث کا مفہوم بآسانی سمجھ سکتے ہیں جس کے مطابق سیدنا آدم علیہ السلام جب اپنے دائیں جانب دیکھتے تھے تو مسکرا دیتے تھے اور جب اپنے بائیں جانب دیکھتے تھے تو رونے لگ جاتے کیونکہ ان کے دائیں جانب اہل ایمان کی ارواح موجود تھیں اور بائیں جانب بدبخت لوگوں کی ارواح موجود تھیں۔

تین مرتبہ تھوکنے کی حکمت

سیّدی دباغ ارشاد فرماتے ہیں (براخواب دیکھنے کے بعد بیدار ہونے پر بائیں جانب) تین مرتبہ تھوکنے کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ پہلی مرتبہ جسم کی طرف سے، دوسری مرتبہ روح کی طرف سے اور تیسری مرتبہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی مدد حاصل ہو جانے کے بعد تھوکا گیا ہے۔ حکم یہ ہے کہ جیسے ہی انسان کی آنکھ (براخواب دیکھنے کے بعد) کھلے تو فوراً کروٹ تبدیل کرلے تاکہ سابقہ نیند کا تعلق وہیں ختم ہو جائے اور گویا وہ نئے سرے سے اپنی نیند کا آغاز کرے جس میں وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہوگا لیکن اگر وہ کروٹ تبدیل نہیں کرتا تو گویا سابقہ نیند کا حکم برقرار رہتا ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: (براخواب دیکھنے کے بعد بیدار ہونے پر) نماز پڑھنے کا حکم، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک مرتبہ دیا تھا۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) یہ بات امام مسلم نے بھی نقل کی ہے جبکہ امام بخاری کی نقل کردہ روایت کے مطابق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ ''اگر کوئی شخص چاہے تو ایسی حالت میں اٹھ کر نماز پڑھ لے۔'' (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) ایسی حالت میں نماز کی ادائیگی کا حکم اس لئے دیا گیا ہے تاکہ پریشان خواب دیکھنے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ظلمت سے اپنے وجود کو پاک کیا جاسکے۔

خواب پریشاں سے متعلق آداب

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) پریشان خواب دیکھنے کے آداب درج ذیل ہیں:

اس خواب کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگی جائے۔ شیطان کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگی جائے۔ بائیں جانب تین مرتبہ تھوکا جائے' کروٹ تبدیل کر لی جائے' اٹھ کر نوافل ادا کیے جائیں۔ ان میں سے ابتدائی چار امور ضرور ادا کیے جائیں اور پانچویں کے بارے میں اختیار ہے کہ اسے ادا کیا جائے یا نہ کیا جائے کیونکہ ابتدائی چاروں امور' اس بارے میں منقول تمام روایات میں مذکور ہیں جبکہ پانچویں امر کا تذکرہ صرف ایک روایت میں اور وہ بھی صرف ایک مرتبہ مذکور ہے۔ علماء کرام نے ان کے علاوہ دیگر آداب بھی ذکر کیے ہیں' مثلاً (آنکھ کھلنے کے بعد) آیۃ الکرسی پڑھ لی جائے۔ ابن حجر لکھتے ہیں' بعض علماء نے اس بات کا تذکرہ کیا ہے لیکن مجھے اس بارے میں کوئی حدیث نہیں مل سکی ہے۔ سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں (ابن حجر کا بیان) درست ہے کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آیۃ الکرسی پڑھنے کا حکم نہیں دیا۔ دوسرا ادب یہ ہے کہ پریشان خواب کا تذکرہ کسی سے نہ کیا جائے اور یہ بات صحیح بخاری میں موجود ہے۔

برا خواب دیکھنے کے بعد کن الفاظ میں اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگی جائے؟ ابن حجر کہتے ہیں: اس بارے میں ایک مستند روایت (مشہور تابعی) ابراہیم نخعی سے منقول ہے جسے سعید بن منصور' ابن ابی شیبہ اور حافظ عبدالرزاق نے اپنی اپنی تصانیف میں نقل کیا ہے۔ جب کوئی شخص کوئی برا خواب دیکھے تو بیدار ہونے کے بعد یہ دعا پڑھے:

اعوذ بما اعاذت به ملائكة الله ورسله منشر رؤياى هذه ان يصيبنى منها ما اكره فى دينى و دنياى

''میں اس ذات کی پناہ مانگتا ہوں جس کی فرشتے اور رسول پناہ مانگتے ہیں (اس بات سے کہ) مجھے اس خواب کے نتیجے میں کوئی دینی یا دنیاوی مصیبت درپیش ہو''

امام مالک نقل کرتے ہیں' حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ خواب میں ڈر جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے اس بات کا تذکرہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں (بیدار ہونے کے بعد) یہ دعا پڑھنے کا مشورہ دیا:

اعوذ بكلمات الله التامة من غضبه وعقابه و شر عباده' ومن همزات الشياطين' ان يحضرون۔ (مؤطا امام مالک' ۲:۹۵۰)

''میں اللہ تعالیٰ کے مکمل کلمات کی پناہ مانگتا ہوں۔ اس کی ناراضگی سے' اس کے عذاب سے' اس کے بندوں کے شر سے' شیطانی وسوسوں سے' اور (اے اللہ! میں اس بات سے تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ شریر شیاطین اور انسان) میرے پاس آ سکیں۔''

اس روایت کو امام نسائی نے بھی نقل کیا ہے تاہم نسائی کی روایت میں اس بات کا اضافہ موجود ہے کہ سونے سے پہلے اس دعا کو پڑھا جائے: بسم الله اعوذ بالله

اسی روایت کو امام ابوداؤد' حاکم اور ترمذی نے بھی نقل کیا ہے۔

ایک حدیث کی تشریح

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے سیّدی عبدالعزیز دباغ سے اس خواب کے بارے میں دریافت کیا: جس کی تعبیر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں بیان کی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آدھی تعبیر درست ہے اور آدھی تعبیر غلط ہے۔ اس واقعے کو امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے یوں نقل کیا ہے:

ان رجلا اتی رسول اللّٰہ النبی فقال انی رایت اللیلۃ فی المنام ظلۃ تنطف السمن والعسل' فاری الناس یتکففون منھا فالمستکثر والمستقل' واذا سبب واصل من الارض الی السماء فاراك اخذت بہ فعلوت' ثم اخذ بہ رجل آخر فعلا بہ' ثم اخذہ رجل آخر فعلا بہ' ثم اخذ بہ رجل آخر فانقطع ثم وصل' فقال ابوبکر: یارسول اللّٰہ' بابی انت وامی! واللّٰہ لتدعنی فاعبرھا' فقال النبی: اعبر' قال: اما الظلۃ، فالاسلام' واما الذی ینطف من العسل والسمن: فالقرآن حلاوتہ تنطف فالمستکثر من القرآن والمستقل' واما السبب الواصل من السمآء الی یاخذ بہ الارض: فالحق الذی انت علیہ یاخذ بہٖ فیعلیك اللّٰہ' ثم یا خذبہ رجل من بعدك فیعلوبہ' ثم یاخذ بہٖ رجل آخر فیعلوبہ' ثم یاخذرجل آخر فینقطع بہ ثم یوصل لہ فیعلوبہ' فاخبرنی یارسول اللّٰہ بابی انت: اصبت ام اخطات قال النبی: اصبت بعضا واخطات بعضا' قال: فواللّٰہ یارسول اللّٰہ لتحد ثنی بالذی اخطات؟ قال لا تقسم (صحیح بخاری' ۶:۲۵۸۲)

ایک مرتبہ ایک شخص بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا اور عرض کی: یارسول اللہ! آج رات میں نے خواب میں ایک بادل دیکھا جس سے گھی اور شہد ٹپک رہا تھا اور لوگ اسے جھولیوں میں بھر رہے تھے۔ کسی کو کم ملا اور کسی کو زیادہ پھر میں نے ایک رسی کو دیکھا جو زمین سے آسمان کی طرف جاتی ہوئی دکھائی دی۔ میں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رسی کو تھاما اور آسمان پر چڑھ گئے پھر ایک شخص نے اس رسی کو تھاما اور وہ بھی آسمان پر چڑھ گیا پھر ایک اور شخص نے رسی کو تھاما اور وہ بھی آسمان پر چڑھ گیا پھر ایک اور شخص نے رسی کو تھاما تو وہ رسی ٹوٹ گئی لیکن پھر جڑ گئی۔ (یہ خواب سن کر) حضرت ابوبکر صدیق نے عرض کی: یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہو جائیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس کی تعبیر بیان کروں؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دیدی' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: بادل سے مراد اسلام ہے اور اس سے ٹپکنے والے شہد اور گھی سے مراد قرآن ہے کیونکہ مٹھاس کے اعتبار سے کوئی قرآن سے کم فیض حاصل کر رہا ہے اور کوئی زیادہ

فیض حاصل کر رہا ہے۔ آسمان سے زمین کی طرف.. بانے والی رسی سے مراد وہ حق ہے جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم گامزن ہو کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچ جاتے ہیں پھر آپ کے بعد یکے بعد دیگرے دو اشخاص بھی پہنچ جاتے ہیں پھر تیسرے کیلئے رسی ٹوٹ کر دوبارہ جڑ جاتی ہے۔ یارسول اللہ! مجھے بتایئے' میں نے صحیح تعبیر بیان کی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہاری کچھ تعبیر ٹھیک ہے اور کچھ غلط ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی: خدارا مجھے بتایئے کہ اس میں کیا غلطی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے قسم نہ دو۔''

تعبیر میں غلطی کیا تھی؟

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس روایت کے بعض الفاظ ایک دوسرے سے مختلف ہیں جنہیں دیگر محدثین نے نقل کیا ہے۔ علماء کے درمیان اس بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خواب کی تعبیر کے دوران کہاں غلطی کی؟ مہلب اور ان کے متبعین کی رائے یہ ہے' خواب دیکھنے والے نے یہ خواب دیکھا تھا کہ تیسرے شخص کیلئے رسی ٹوٹ کر دوبارہ جڑ گئی جبکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تعبیر میں یہ بات بیان کی کہ وہ رسی اس تیسرے شخص کیلئے دوبارہ جڑ گئی کیونکہ اگر رسی جڑتے وقت خاص اس شخص کا ذکر نہ کیا جائے تو خواب کا مفہوم یہ ہوگا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کیلئے رسی ٹوٹ جائے گی اور پھر کسی اور کیلئے جڑ جائے گی یعنی خلافت کسی اور کو منتقل ہو جائے گی۔

قاضی عیاض مالکی کہتے ہیں' تعبیر کی غلطی یہی تھی کہ اس شخص نے خواب بیان کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ وہ رسی ٹوٹنے کے بعد دوبارہ جڑ گئی لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تعبیر کرتے ہوئے یہ بات بیان کی کہ جس تیسرے شخص کیلئے رسی ٹوٹی تھی اسی کیلئے دوبارہ جڑ گئی جبکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بجائے حضرت علی رضی اللہ عنہ کیلئے رسی کو جوڑا گیا یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلافت ملی۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس کے علاوہ چند دیگر روایات میں یہ بات موجود ہے کہ جس شخص کیلئے رسی ٹوٹی تھی اسی کیلئے دوبارہ جوڑی گئی۔ بعض علماء نے یہ بات بیان کی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے یہ غلطی سرزد ہوئی کہ انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم دینے سے پہلے خود ہی اپنے آپ کو تعبیر بیان کرنے کیلئے پیش کر دیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کا مفہوم یہ ہوگا کہ تم نے تعبیر صحیح بیان کی ہے لیکن تعبیر بیان کرنے کیلئے خود کو پیش کر کے غلطی کی ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) یہ تاویل درست نہیں ہے کیونکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تعبیر بیان کرنے کیلئے باقاعدہ اجازت حاصل کی تھی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ سے بھی یہی بات ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ تعبیر نصف درست اور نصف غلط تھی۔

امام ابوجعفر طحاوی' خطابی' ابن العربی' ابن جوزی اور محدثین کی ایک جماعت کی یہ رائے ہے کہ حضرت

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے گھی اور شہد سے مراد قرآن لیا ہے حالانکہ یہ دو الگ چیزیں ہیں اس لئے دونوں کی تعبیر ایک دوسرے سے مختلف ہوگی جیسے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے حوالے سے ایک روایت امام احمد بن حنبل نے نقل کی ہے۔

حضرت عبداللہ فرماتے ہیں:

رایت فیما یری النائم لکان فی احدی اصبعی سمنا وفی الاخری عسلا' فأنا العقهما' فلما اصبحت ذکرت ذلك لرسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فقال: تقرا الکتابین التوراة والفرقان' فکان یقرؤهما بعد ذلك۔ (مسند احمد'۲:۲۲۲)

''ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میری ایک انگلی پر گھی اور دوسری انگلی پر شہد لگا ہوا ہے اور میں ان دونوں کو چاٹ رہا ہوں۔ جب میں نے اس خواب کا تذکرہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم تورات اور قرآن مجید دونوں کے عالم بنو گے۔ (راوی کہتے ہیں) بعد میں ایسا ہی ہوا۔''

اس روایت میں گھی اور شہد کی تعبیر الگ الگ بیان کی گئی ہے اس لئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بھی تعبیر بیان کرتے وقت گھی اور شہد کی الگ الگ تعبیر بیان کرنا چاہئے تھی کہ دونوں سے مراد کتاب وسنت ہو سکتے ہیں یا علم وعمل ہو سکتے ہیں یا حفظ وفہم ہو سکتے ہیں۔

بعض اہل علم اس بات کے قائل ہیں کہ تعبیر میں بادل سے مراد اسلام کی بجائے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات لینی چاہئے تھی۔ نیز گھی اور شہد سے مراد کتاب وسنت ہو سکتے ہیں یا علم وعمل ہو سکتے ہیں یا حفظ وفہم ہو سکتے ہیں۔

بعض اہل علم کے نزدیک یہاں ''خطا'' (غلطی) سے مراد ترک کرنا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا مفہوم یہ ہوگا کہ تم نے خواب کے کچھ حصے کی تعبیر تو بیان کر دی ہے اور کچھ حصے کو ترک کر دیا ہے کیونکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خواب کی تعبیر بیان کرتے ہوئے تین اشخاص کی تعبیر بیان نہیں کی تھی۔ اسی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے قسم دینے کے باوجود اس کی تعبیر بیان نہیں فرمائی کیونکہ قسم اسی وقت دی جاتی ہے جب قسم پورا کرنے کی صورت میں کسی خرابی کا اندیشہ موجود نہ ہو لیکن اگر اس میں کوئی خرابی پائی جائے تو پھر قسم پوری کرنا ضروری نہیں ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور میں پیش آنے والے واقعات کا علم ہو اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے قسم کی پورا کر دیتے تو ان تینوں افراد کو بھی متعین کرنا پڑتا اور اگر ان تینوں کو متعین کر دیا جاتا تو یہ ان تینوں حضرات کی خلافت کا صریح حکم قرار پاتا جبکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ خلافت کو متعین نہ کیا جائے۔ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تینوں اشخاص کی تعین نہیں کی۔ یہ ساری گفتگو امام محی

الدین نووی نے تحریر کی ہے۔

بعض اہل علم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تعظیم کے پیش نظر اس بحث کو ممنوع قرار دیا ہے یہاں تک کہ شیخ ابوبکر بن العربی فرماتے ہیں۔ میں نے ''علم تعبیر'' کے ایک ماہر سے دریافت کیا: اس خواب کی تعبیر کے دوران حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کیا غلطی سرزد ہوئی؟ تو اس نے جواب دیا: اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا تعبیر کیلئے خود کو پیش کرنا غلطی ہے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی غلطی کی نشاندہی اس سے بھی بڑی غلطی ہے اس لیے اس بحث سے گریز کرنا چاہئے۔

(یہاں تک ساری گفتگو شیخ احمد بن مبارک سلجماسی نے تحریر کی)۔

سیّدی دباغ کی بیان کردہ تعبیر

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں اس حدیث میں بادل سے مراد اسلام ہے اور شہد اور گھی سے مراد نیک اعمال ہیں جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہوتے ہیں۔ قرآن کی تلاوت کے ساتھ اس میں نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ' صدقہ کرنا' غلام آزاد کرنا' کسی کی حاجت روائی کرنا' نماز جنازہ ادا کرنا' فدیہ ادا کر کے قیدیوں کو رہائی دلوانا وغیرہ تمام نیک اعمال شامل ہیں۔ یہی وہ اعمال ہیں جو برزخ کی طرف بلند ہوتے ہیں اور برزخ میں موجود ارواح انہیں دیکھ کر کہتی ہیں: یہ فلاں شخص کی نیکیاں ہیں جو فلاں دن ہم تک پہنچ جائے گا۔ یہاں تک کہ اس نیکی کرنی والے شخص کے آباؤ اجداد بھی اس نیکی کو ملاحظہ کرتے ہیں۔ نیز تمام ارواح ان نیکیوں کا مشاہدہ کرتی ہیں خواہ وہ ارواح ان اعمال کے بعد زمین پر اتر کر دوبارہ برزخ میں واپس چلی گئی ہوں یا زمین پر نازل ہی نہ ہوئی ہوں۔ یہاں تک کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی کمسن بچے کو ''فتح'' نصیب کر دے تو وہ ہر شخص کو یہ بات بتا سکتا ہے کہ تمہارا فلاں نیک عمل فلاں دن برزخ میں ہمارے پاس پہنچا تھا۔ اے فلاں! فلاں دن تمہارا فلاں مقبول عمل مجھے دکھائی دیا تھا۔ لیکن کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اعمال کی مقبولیت کو پوشیدہ رکھنے کا ارادہ فرمایا ہے اس لئے روح کے جسم میں داخل ہونے کے بعد اسے یہ تمام باتیں بھلا دی جاتی ہیں۔

اعمال کی دو قسمیں ہیں' کچھ اعمال ایسے ہیں جو صرف اللہ تعالیٰ کیلئے مخصوص ہیں اور بظاہر مخلوق کو ان سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا جیسے نماز' روزہ' رکوع وسجود' خشیت الٰہی اور تمام نیکیاں جن کا تعلق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہے۔ دوسری قسم کے اعمال وہ ہیں جن میں ظاہری طور پر مخلوق کو کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے جیسے غلام آزاد کرنا' صدقہ کرنا' قیدیوں کو رہائی دلانا' لوگوں کی حاجت روائی کرنا اور اسی جیسے دیگر تمام نیک اعمال شامل ہیں۔

پہلی قسم کے اعمال کی جزاء یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عمل کرنے والے شخص کو ایک ایسا نور عطا کرتا ہے جس کی بدولت اس شخص کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کی معرفت مضبوط ہوتی ہے۔ وسوسے اور شکوک وشبہات ختم ہو جاتے ہیں۔ دنیا میں ایمان میں اضافہ ہے۔ جبکہ دوسری قسم سے تعلق رکھنے والے اعمال کی جزا یہ ہے کہ انسان

کی ذات کی اصلاح ہوتی ہے' رزق میں برکت ہوتی ہے اور انسان آفات و بلیات سے محفوظ رہتا ہے جس کے نتیجے میں انسان کو دنیا میں بہت سی نعمتیں حاصل ہوتی ہیں اور آخرت میں یہی صدقات جنت کی نعمتوں کی شکل میں ڈھل جائیں گے جن سے وہ شخص لطف اندوز ہوگا۔

اس سے یہ واضح ہو گیا کہ پہلے قسم کے اعمال کی جزاء کا فائدہ ایمان کی شکل میں حاصل ہوتا ہے اور دوسری قسم کے اعمال کی جزاء کا فائدہ ذات کی اصلاح کی شکل میں حاصل ہوتا ہے اس لئے اس خواب میں شہد سے مراد پہلی قسم کے اعمال ہوں گے اور گھی سے مراد دوسری قسم کے اعمال ہوں گے کیونکہ بنیادی طور پر شہد جسم کو طاقت دیتا ہے اور کمزوری کو دور کرتا ہے لیکن اس کے ذریعے مزید گوشت پیدا نہیں ہوتا اس لئے شہد سے مراد ایمان ہوگا کیونکہ ایمان کے ذریعے روحانی قوت تو حاصل ہوتی ہے لیکن یہ رزق میں اضافے کا باعث نہیں بنتا۔ اس کے برعکس گھی کے ذریعے گوشت میں اضافہ ہوتا ہے انسان کا جسم فربہ ہو جاتا ہے لیکن اس کے ذریعے وہ طاقت پیدا نہیں ہوتی جو شہد کے ذریعے پیدا ہوتی ہے لہٰذا مخلوق کے فائدے سے تعلق رکھنے والے دوسری قسم کے اعمال کی مثال گھی کی مانند ہوگی کیونکہ انہی اعمال کے نتیجے میں رزق میں برکت پیدا ہوتی ہے۔ مصائب و آلام دور ہوتے ہیں اس لئے مذکورہ بالا خواب میں شہد اور گھی سے مراد یہی دونوں طرح کے اعمال ہوں گے۔

اس تعبیر پر ایک اعتراض

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: ان دونوں طرح کے اعمال میں سے کون سی قسم افضل ہے؟ سیّدی دباغ نے جواباً مجھ سے دریافت کیا: تم کیا پسند کرو گے' یہ تم بظاہر دبلے پتلے ہو لیکن تمہارے اندر 40 آدمیوں کے برابر طاقت موجود ہو یا پھر یہ کہ تم بے انتہا موٹے ہو جاؤ یہاں تک کہ چلنا پھرنا دوبھر ہو جائے مگر تمہارے اندر ذرا بھی طاقت موجود نہ ہو؟ میں نے عرض کی: میں یہی پسند کروں گا کہ میں بظاہر دبلا پتلا دکھائی دوں مگر میرے اندر 40 افراد کے برابر طاقت موجود ہو۔ سیّدی دباغ نے فرمایا: اسی سے تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ ایمان کے نور میں اضافہ کرنے اور رزق میں اضافے کا باعث بننے والے اعمال کے درمیان کیا فرق ہوگا۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: یہ دونوں طرح کے اعمال آسمان کی طرف بلند ہوتے ہیں جبکہ خواب میں اس شخص نے گھی اور شہد کو آسمان سے زمین کی طرف سے نازل ہوتے ہوئے دیکھا تھا اس لئے یہ تعبیر کس طرح درست ہو سکتی ہے؟

سیّدی دباغ نے جواب دیا: اتار چڑھاؤ ایک اضافی امر ہے کیونکہ ایک چیز ہمیں بظاہر اوپر کی طرف جاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے لیکن کسی دوسرے شخص کے نزدیک وہی چیز پستی کی طرف جا رہی ہوتی ہے اس لئے یہ ممکن ہے کہ خواب دیکھنے والے شخص کی روح آسمان میں اس طرف ہو جو ہمارے مدمقابل ہے نہ کہ اس حصے کی طرف جو دوسرے آسمان کے مدمقابل ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر کسی شخص کا سر ہماری طرف اور پاؤں دوسرے آسمان کی طرف ہوں تو زمین سے آسمان کی طرف بلند ہونے والی چیز اسے اوپر سے نیچے کی جانب آتی

ہوئی دکھائی دے گی۔ مزید براں خواب کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ خواب دیکھنے والے کو کسی چیز کا علم ہو جائے کیونکہ اگر اسلام کے بادل کو زمین میں ہمارے سروں کے اوپر رکھا جاتا تو خواب دیکھنے والے شخص کو اوپر کی جانب جانے والے اعمال دکھائی نہ دیتے اسی لیے خواب میں اوپر کی طرف جانے والی اشیاء کو زمین کی طرف آتے ہوئے دکھایا گیا نیز باقی خواب کی نزول (یعنی زمین کی طرف آنے) کی بھی مخصوص تعبیر ہو سکتی ہے۔ اس کے حقیقی معنی مراد نہیں ہوں گے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: آسمان اور زمین کے درمیان لٹکی ہوئی رسی سے مراد کامل ایمان ہے تاہم اس سے مراد ہر شخص کا کامل نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ان احکام کا کامل ایمان ہے جو اپنے اوپر اور ساری رعایا کے اوپر شریعت کے احکام کو مکمل طور پر نافذ کرتے ہیں کیونکہ یہ رسی بادل کے ساتھ ملی ہوئی ہے جو گھی اور شہد کی بارش کا بنیادی سبب ہے اور لوگ اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق' کم یا زیادہ اسے حاصل کر رہے ہیں اس لیے کسی بھی مسلمان حکمران کا کامل ایمان اس وقت تک اس کی تمام تر نیکیوں کی قبولیت کا باعث نہیں بن سکے گا جب تک وہ اپنی رعایا میں شریعت کے احکام کو نافذ نہیں کر دیتا اور تمام افراد کے حقوق اچھی طرح سے ادا نہیں کر دیتا۔ ایسی صورت میں مملکت اسلامیہ کے تمام افراد کے اندر نیکیوں پر عمل پیرا ہونے کا جذبہ غالب ہوگا' گناہوں کا صدور کم ہوگا۔ چوری' زنا' قتل نہ ہونے کے برابر رہ جائیں گے۔ امت کی اکثریت نیکی کی راہ پر گامزن ہوگی اور ان پر رحمتوں کی بارش نازل ہو رہی ہوگی۔ یہ کیفیت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ اقدس میں اپنے مرتبہ کمال پر موجود تھی۔

تین اشخاص سے مراد کون ہے؟

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: اب رہا یہ سوال کہ ان تینوں اشخاص سے مراد کون ہے؟ اس بارے میں اکابر صوفیاء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ اولیاء کرام کا ایک گروہ جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مخصوص نسبت کے باعث ''صدیقیہ'' کہلاتا ہے اور میرے مشائخ بھی اسی گروہ میں شامل ہیں' ان حضرات کے نزدیک ان تینوں اشخاص سے مراد خلفاء ثلاثہ یعنی حضرت ابوبکر صدیق' حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ہیں اور رسی کی ٹوٹ جانے سے مراد یہ ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا بعض لوگ انکار کریں گے اور رسی کے دوبارہ جڑ جانے سے مراد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت ہے۔ اولیاء کرام کا ایک دوسرا گروہ جو امام حسین رضی اللہ عنہ کی نسبت سے ''حسینیہ'' کہلاتا ہے۔ ان حضرات کے نزدیک یہ تینوں افراد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسل پاک سے تعلق رکھتے ہیں جن میں سے دو افراد کی خلافت پر تمام امت کا اتفاق ہوگا پھر تیسرے فرد کی خلافت پر پہلے اتفاق' پھر اختلاف اور پھر دوبارہ اتفاق ہو جائے گا۔ رسی کے کٹ جانے اور دوبارہ جڑ جانے کا یہی مفہوم ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: اس دوسرے گروہ کی رائے درست ہے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ و

مقام بہت بلند و برتر ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر صرف وہی شخص پاؤں رکھ سکتا ہے جو خود نبی یا نبی کی اولاد ہو کیونکہ خواب میں ایک ہی رسی دکھائی گئی تھی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تینوں افراد ایک ہی طرح سے اس رسی پر چڑھے تھے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کوئی خاص تعلق موجود ہے۔ ہم پہلے اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ امت کا کوئی بھی شخص ایمان کامل کے اعتبار سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مانند نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے اب صرف نسبی تعلق باقی رہ جائے گا اس لئے یہ تینوں اشخاص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آل پاک سے تعلق رکھتے ہوں گے کیونکہ گھر میں انسان کے علاوہ صرف اس کی اولاد ہی داخل ہو سکتی ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: پھر یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ خواب دیکھنے والی شخصیت ایک صحابی ہیں' جو حضرت ابوبکر صدیق' حضرت عثمان اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بخوبی واقف ہیں۔ اگر خواب سے مراد یہی تینوں افراد تھے تو وہ صحابی یہ بیان کر دیتے کہ میں نے خواب میں پہلے ابوبکر پھر عمر اور پھر عثمان رضی اللہ عنہ کو اوپر چڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ حالانکہ اس صحابی نے ایسی کوئی بات بیان نہیں کی۔ گویا اس صحابی نے اوپر چڑھنے والے اصحاب کو پہچانا نہیں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے اس بارے میں سیّدی دباغ سے کئی مرتبہ تفصیلی بحث کی لیکن آپ نے ہر مرتبہ یہی بات ارشاد فرمائی' میری بیان کردہ تعبیر درست ہے اور خواب میں دکھائی دینے والے اشخاص سے مراد خلفاء ثلاثہ کی بجائے سادات عظام ہیں۔ اگر چہ میں خود صوفیاء کے اس گروہ سے تعلق رکھتا ہوں جو ''صدیقیہ'' کہلاتے ہیں لیکن حق بات کو آشکار کرنا ضروری ہے۔

حضرت صدیق اکبر اور سیّد دباغ کی تعبیر میں فرق کی وجہ

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: کیسے ممکن ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اس خواب کی صحیح تعبیر کا پتہ نہ چل سکے لیکن کسی اور شخص (یعنی سیّدی دباغ) کو صحیح تعبیر کا علم ہو جائے؟ اگر چہ ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کی بدولت جسے جو چاہے (بطور خاص علم) عطا فرما دے لیکن ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو مرتبہ و مقام حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حاصل ہے اسے کوئی اور حاصل نہیں کر سکتا اور کسی بھی شخص کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے زیادہ' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے باطن کی معرفت حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ آپ تمام اہل عرفان کے سردار اور تمام اہل محبت کے پیشوا ہیں؟

سیّدی دباغ نے جواب دیا: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی اس خواب کی صحیح تعبیر سے واقف تھے بلکہ ان کا علم اس سے کئی ہزار گنا زیادہ تھا لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی کے باعث اس خواب کی حقیقی تعبیر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی کیونکہ جس وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہوں اس وقت جملہ حاضرین کے علوی انوار غائب ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کا باطن مکمل طور پر نبی

اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور شوق میں مستغرق ہو جاتا ہے لہٰذا جب علوی انوار غائب ہوں اور محبت وشوق کے انوار روشن ہوں تو ایسی حالت میں گفتگو کرنے والے شخص کی مثال بالکل اسی طرح ہوگی جیسے کوئی لاعلم شخص گفتگو کر رہا ہو۔ کیونکہ جب انسان مکمل طور پر کسی ایک چیز کی طرف متوجہ ہو جائے تو دوسرے امور سے اس کی توجہ ہٹ جاتی ہے۔ چونکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تمام اہل معرفت کے پیشوا ہیں اس لئے ان کی تمام تر توجہات کا مرکز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس تھی اور ان کی توجہ کسی اور جانب مبذول نہیں ہو سکی کیونکہ علم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کا ایک نور ہے جب ذات سامنے موجود نہ ہو تو پھر اس نور کے ذریعے ذات تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے لیکن جب اصل ذات سامنے موجود ہو تو تمام وسائل نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور مکمل طور پر ذات کی طرف متوجہ ہونا واجب ہو جاتا ہے۔

ذات اقدس کی طرف کامل توجہ کیسے حاصل کی جا سکتی ہے؟

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کی طرف کامل توجہ کس طرح حاصل کی جا سکتی ہے؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: تین چیزوں کے ذریعے' ایک محبت دوسری تعظیم اور تیسری آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و کمالات کو پیش نظر رکھنا۔ اگر مصر کی عورتیں حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں یہ کہہ سکتی ہیں (جیسا کہ قرآن مجید نے ان کا قول نقل کیا ہے):

حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ (یوسف:۱۲:۳۱)

''خدا کی قسم یہ کوئی انسان نہیں بلکہ یہ کوئی معزز فرشتہ ہے''

تو پھر کوئی صاحب معرفت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کیا رائے رکھ سکتا ہے اور یہ تینوں نعمتیں اسی وقت حاصل ہو سکتی ہیں جب انسان کے وجود کے سات حصے مکمل طور پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ ہو جائیں۔

سوچ' غور و فکر' عقل' مثال (یعنی عقل کی مکمل توجہ' ذات' روح اور علم

جب یہ ساتوں انوار انسان کے وجود کا حصہ بن جائیں گے تو محبت' تعظیم اور حیرانگی تینوں نصیب ہو جائیں گی اور انسان کی توجہ دیگر تمام اشیاء سے ہٹ جائے گی یہاں تک کہ اگر ایسی کیفیت کے دوران کسی صاحب معرفت شخص سے یہ دریافت کیا جائے' تمہارے بیٹے کا رنگ کیا ہے؟ کیا وہ سفید ہے؟ یا کوئی اور رنگ ہے؟ تو وہ صاحب معرفت حیران اور ششدر رہ جائے گا۔ اور کوئی جواب نہیں دے سکے گا۔ اگر بالفرض ایسی حالت میں وہ کوئی جواب دے دیتا ہے تو یہ جواب اس کے ذاتی شعور کے باعث نہیں ہوگا اور ایسی حالت میں اگر وہ درست جواب دے دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر بات کا صحیح جواب دینا اس کی غیر شعوری عادت کا حصہ ہے اسی لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس خواب کی درست تعبیر بیان نہیں کر سکے تھے۔ بالفرض اگر وہی سائل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں حاضر ہو کر ان سے اس خواب کی تعبیر دریافت کرتا تو اس

کے جواب میں بہت سے حیران کن امور کا تذکرہ سنتا۔ خود مجھے اس کی تعبیر کا علم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے وسیلے اور برکت سے حاصل ہوا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ مجھے خواب کی تعبیر کا درست علم ہو لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو صحیح علم نہ ہو اس لئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے تعبیر بیان نہ کرنے کی وجہ وہی ہے جو میں نے ذکر کی ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) یہ تمام گفتگو میں نے اپنے ''اُمی شیخ'' کی زبانی سنی ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کی بدولت جسے جو چاہے عطا فرمادے۔ میں کئی برس تک اس خواب کی صحیح تعبیر تلاش کرتا رہا لیکن کسی کتاب میں یا کسی بھی انسان کی زبانی مجھے اس کی درست تعبیر معلوم نہ ہوسکی یہاں تک کہ سیّدی دباغ نے اس کی صحیح تعبیر بیان کی اور یہ بات واضح ہے کہ دیگر تمام علماء و محدثین کی بیان کردہ تعبیرات سے گوہرِ مقصود حاصل نہیں ہوتا۔

خواب کی حقیقت

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے سیّدی دباغ سے خواب کی حقیقت کے بارے میں دریافت کیا: یہ کیا ہے؟ کس طرح وقوع پذیر ہوتا ہے؟ کیونکہ اس بارے میں اہلِ علم کے درمیان شدید اختلاف پایا جاتا ہے؟ علم طب کے ماہرین کی رائے یہ ہے کہ انسانی جسم میں چار مادوں (بلغم، خون، صفراء، سوداء) کی کمی بیشی خوابوں پر اثر انداز ہوتی ہے جیسے بلغمی مزاج رکھنے والا شخص اکثر اوقات خواب میں پانی دیکھے گا کیونکہ پانی اور بلغم کے درمیان ظاہری مناسبت پائی جاتی ہے۔ صفراوی مزاج رکھنے والا اکثر اوقات خواب میں آگ، ہوا میں بلند ہونا اور اسی طرح کی پریشان کن صورتحال دیکھے گا۔ سوداوی مزاج رکھنے والا شخص خواب میں ترش چیزیں دیکھے گا اور جس شخص کا خون گاڑھا ہوگا وہ خواب میں میٹھی اور خوش کن چیزیں دیکھے گا کیونکہ فطری طور پر خون میٹھا اور فرحت بخش ہوتا ہے۔ امام مازری کہتے ہیں، یہ بالکل غلط ہے اگرچہ عقل اس کے امکان کو درست تسلیم کرتی ہے لیکن اس کی کوئی مضبوط دلیل موجود نہیں ہے اور عام طور پر ہمیشہ ایسا ہوتا بھی نہیں ہے اس لئے کسی امکانی چیز کو قطعی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

فلاسفہ کی رائے

فلاسفہ اس بات کے قائل ہیں کہ زمین پر پیش آنے والے تمام واقعات کی تصویریں نقوش کی صورت میں عالمِ بالا میں موجود ہوتی ہیں۔ ان میں سے جب کوئی ایک صورت سوچ کے مقابل آجائے تو اس کا نقش انسان کے ذہن پر منتقل ہوجاتا ہے۔ (اور یہی خواب کی حقیقت ہے) امام مازری کہتے ہیں یہ رائے بھی درست نہیں ہے کیونکہ اس کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے نیز کسی جسم ہی کا نقش منتقل ہوسکتا ہے جبکہ عالمِ بالا میں موجود تمام اشیاء ''عرض'' کی شکل میں موجود ہوتی ہیں اور ''عرض'' کا کوئی نقش نہیں بن سکتا۔

معتزلہ کی رائے

معتزلہ اس بات کے قائل ہیں کہ خواب درحقیقت ایسے خیالات ہوتے ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی گویا معتزلہ عذاب قبر کی طرح خواب کی حقیقت کا بھی انکار کرتے ہیں۔ شیخ ابن العربی تحریر کرتے ہیں معتزلہ نے اپنے بے بنیاد اصولوں کے باعث بہت سے شرعی احکام کا انکار کیا ہے مثلاً جنات' فرشتے' ان کا کلام کرنا سب کا انکار کیا ہے۔ یہاں تک کہ بعض معتزلہ اس بات کے قائل ہیں کہ اگر حضرت جبرائیل علیہ السلام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ آواز میں گفتگو کرتے تو تمام حاضرین بھی اس آواز کو سنتے۔ صالح معتزلی اس بات کا قائل تھا کہ خواب کا تعلق انسان کی جسمانی آنکھ سے دیکھی ہوئی چیز کے ساتھ ہوتا ہے۔ ابن العربی اس بات کو بھی درست تسلیم نہیں کرتے۔ بعض اہل علم اس بات کے قائل ہیں کہ ہر دل میں دو آنکھیں اور دو کان موجود ہوتے ہیں جن کی مدد سے دل خواب دیکھتا اور خواب میں گفتگو سنتا ہے۔

اہلسنّت کی رائے

اہلسنّت اس بات کے قائل ہیں کہ خواب ادراک کی ایک ایسی کیفیت ہے جسے اللہ تعالیٰ سونے والے شخص کے ذہن میں پیدا کر دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے بیدار شخص کی آنکھ دیکھتی اور ذہن سوچتا ہے۔ جب ادراک کی اس کیفیت کو پیدا کیا جاتا ہے تو اس کیلئے کوئی نشانی مقرر کر دی جاتی ہے جس کے نتیجے میں آئندہ آنے والی صورتحال کا پہلے سے اندازہ ہو جاتا ہے۔ ادراک کی اس کیفیت کی تخلیق کے وقت بعض اوقات کوئی فرشتہ موجود ہوتا ہے جس کے نتیجے میں انسان کو کوئی اچھا خواب دکھائی دیتا ہے اور بعض اوقات کوئی شیطان موجود ہوتا ہے جس کے نتیجے میں برا خواب دکھائی دیتا ہے۔ بعض اہل علم اس بات کے بھی قائل ہیں کہ خوابوں کیلئے ایک مخصوص فرشتہ مقرر ہے جو نیند کی حالت میں ان خوابوں کو انسان کے سامنے پیش کرتا ہے بعض اوقات یہ خواب ایسی صورت میں پیش کیے جاتے ہیں جو آئندہ ایام میں پیش آنے والی ہوتی ہے اور بعض اوقات خواب میں تمثیلی صورتیں پیش کر دی جاتی ہیں (جن کی تعبیر کیلئے ماہرین کی طرف رجوع کیا جاتا ہے) بعض اہل علم اس بات کے قائل ہیں کہ خواب میں دکھائی دینے والے مناظر کا تعلق' روح کے عرش کی طرف بلند ہونے کے ساتھ ہے۔ اگر روح کے عرش تک پہنچنے سے پہلے خواب دیکھنے والا شخص بیدار نہ ہو تو خواب سچا ہوگا اور اگر وہ اس سے پہلے بیدار ہو جائے تو خواب سچا نہیں ہوگا۔ ان حضرات نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول اس روایت سے استدلال کیا ہے جسے امام حاکم اور عقیلی نے نقل کیا ہے اور جس کے مطابق ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا: اے ابوالحسن (حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کنیت ہے) انسان جو خواب دیکھتا ہے ان میں سے بعض خواب سچ ثابت ہوتے ہیں اور بعض خواب جھوٹے ثابت ہوتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ہاں! میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی یہ بات سنی ہے۔

مامن عبد لا امة ينام فيمتلي نوماً الاعرج بروحه الى العرش' فالذى ولايستيقظ دون العرش ذٰلك الرؤيا التي تصدق ' والذى يستيقظ دون العرش فذٰلك الرؤيا التي تكذب.

''جو انسان سو جاتا ہے اور اس کی نیند جب گہری ہو جاتی ہے تو اس کی روح عرش کی طرف بلند ہونے لگتی ہے۔ اگر روح کے عرش تک پہنچنے سے پہلے وہ شخص بیدار نہ ہو تو خواب سچا ثابت ہوتا ہے اور اگر روح کے عرش تک پہنچنے سے پہلے وہ شخص بیدار ہو جائے تو اس کا خواب جھوٹا ثابت ہوتا ہے۔''

امام ذہبی تحریر کرتے ہیں' یہ روایت انتہائی غیر مستند ہے اور حاکم (جنہوں نے اس روایت کو نقل کیا ہے) بھی اس روایت کو مستند تسلیم نہیں کرتے کیونکہ اس کی سند میں عبداللہ خراسانی نام کا ایک غیر مستند راوی ہے پھر حاکم نے اس کی ایک اور سند نقل کر کے اسے بھی غیر مستند قرار دیا ہے نیز اس امر کی وضاحت کی ہے کہ اس روایت کے بارے میں یہ اختلاف پایا جاتا ہے کہ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اپنا قول ہے یا انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نقل کیا ہے؟

بعض اہل علم کی رائے

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) بعض اہل علم اس بات کے قائل ہیں کہ خواب کی شکل میں اللہ تعالیٰ بندے کے ساتھ کلام کرتا ہے۔ یہ حضرات' حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ سے منقول اس روایت سے استدلال کرتے ہیں۔

رويا المؤمن كلام يكلم به العبد ربه

''مومن کا خواب ایک کلام ہوتا ہے جو بندہ اپنے رب کے ساتھ کرتا ہے''

اس روایت کو حکیم ترمذی نے اپنی تصنیف ''نوادر الاصول'' میں نقل کیا ہے تاہم یہ روایت بھی مستند نہیں ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ (الشوریٰ ۴۲:۵۱)

''اور ہر بشر کی (یہ) مجال نہیں کہ اللہ اس سے براہِ راست کلام کرے مگر یہ کہ وحی کے ذریعے نبوت سے سرفراز فرما دے) یا پردے کے پیچھے سے (بات کرے جیسے موسیٰ علیہ السلام سے طورِ سینا پر کی)۔''

حکیم ترمذی فرماتے ہیں: بعض مفسرین کے نزدیک یہاں حجاب سے مراد خواب ہے۔

بعض اہل علم اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خواب کیلئے ایک فرشتہ مقرر کیا ہے جو لوح محفوظ میں

انسان کے احوال کا مشاہدہ کر کے' معلومات کو نقل کر لیتا ہے اور پھر ہر انسان کے مخصوص معاملات کو تمثیلی شکل میں' خواب میں پیش کر دیتا ہے تا کہ ہر انسان کسی خوشخبری' بری خبر' مشکلات سے پیشگی آگاہ ہو سکے۔ بعض اوقات شیطان انسان پر مسلط ہو کر ان خوابوں کو خلط ملط کر دیتا ہے یا یہ خواب بھلا دیتا ہے۔

سیّدی دباغ کا جواب

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں: بیداری کی مانند خواب کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک خیال اور دوسرا ادراک' بیداری کی حالت میں انسان کے ذہن میں طرح' طرح کے خیالات پیدا ہوتے ہیں اور عقل یا حواس کی مدد سے انسان بہت سے ادراکات حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح نیند کی حالت میں بعض اوقات صرف خیال دکھائی دیتا ہے اور بعض اوقات کوئی ادراک خواب کی شکل میں سامنے آ جاتا ہے لہٰذا ہم خواب کو دو حصوں میں تقسیم کریں گے ایک وہ جو صرف ادراک ہے اور دوسرا وہ خواب جو محض خیال ہے۔

خواب کی پہلی قسم ادراک

جہاں تک خواب کی پہلی قسم یعنی ادراک کا تعلق ہے تو اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ بعض اوقات ادراک کو روح کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور کوئی ادراک جسم کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ درحقیقت ہر چیز کا ادراک روح اپنی بصیرت کی مدد سے کرتی ہے اور ہم ''حرف روح'' کے اجزاء کی وضاحت میں ''بصیرت'' کے عنوان کے تحت اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں۔ لہٰذا بعض اوقات جب روح اپنی بصیرت کی مدد سے کسی چیز کا ادراک کرتی ہے تو یہ ادراک روح کی طرف منسوب ہوگا اور اگر انسان اپنی ظاہری آنکھ اور عقل کی مدد سے کسی چیز کا ادراک کرے تو یہ ادراک جسم کی طرف منسوب ہوگا جیسے گھر' مسجد یا باغ کو دیکھنا' اس نوعیت کے خواب جسم کے ادراک کی طرف منسوب ہوں گے۔

روح کی قوتِ سماعت

روح کی قوت سماعت کی دو قسمیں ہیں' ایک وہ قوت جو جسم میں محجوب ہونے سے پہلے روح کو حاصل تھی اور اس قوت کے ذریعے دنیا کے دور دراز کے حصے سے آنے والی آواز کو روح سن سکتی ہے۔ روح کی دوسری قوت وہ ہے جو جسم میں داخل ہو جانے کے بعد روح کو حاصل ہوتی ہے اور اس سماعت کا تعلق ''کان'' کے ساتھ ہے۔

روح کی بصارت

اسی طرح روح کی بصارت کی بھی دو قسمیں ہیں' پہلی قسم وہ ہے جو روح کے جسم میں محجوب ہونے سے پہلے اسے حاصل تھی اور اس اعتبار سے دنیا کا کوئی بھی گوشہ اس سے مخفی نہیں ہوگا۔ دوسری قوت بصارت وہ ہے جو جسم میں محجوب ہو جانے کے بعد روح کو حاصل ہوتی ہے اور اس کا تعلق ظاہری آنکھ کے ساتھ ہے۔

اسی طرح روح کے چلنے کی صلاحیت دو قسم کی ہوگی ایک روح کے جسم میں داخل ہونے سے پہلے اور اس حالت میں دنیا کا دور دراز کا گوشہ روح کیلئے صرف ایک قدم کی مسافت کے برابر ہے اور دوسری قسم کا تعلق روح کے جسم میں داخل ہو جانے کے بعد والے زمانے سے ہے۔ اس صورت میں روح کا چلنا انسان کے (ظاہری) قدموں کے تابع ہوگا۔

روح کا غور و فکر

اسی طرح روح کے غور و فکر کرنے کی صلاحیت بھی دو قسم کی ہے' ایک قسم کا تعلق روح کے جسم میں داخل ہونے سے پہلے والے وقت سے ہے اس وقت روح اپنی بصیرت کی مدد سے غور و فکر کرتی ہے اور یہ بصیرت روح کے تمام جواہر (یعنی اعضاء و اجزاء) کے اندر موجود ہوتی ہے اس صورت میں روح ایک لمحے کے اندر تمام تر معلومات کا احاطہ کر لیتی ہے اور اس کیلئے دور و نزدیک کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی یہاں تک کہ اس کیلئے اس کی اپنی ذات اور عرش ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں۔ دوسری قسم یہ ہے کہ جب روح جسم میں داخل ہو جائے تو اب اس کا غور و فکر ذہن کے تابع ہوگا۔

خواب روح کی صلاحیت کے مطابق ہوتا ہے

جب کوئی شخص نیند کی حالت میں کوئی خواب دیکھے تو بعض اوقات وہ خواب روح کی صلاحیت کے اعتبار سے ہوتا ہے اور بعض اوقات خواب کا تعلق ذہن کی صلاحیت کے ساتھ ہوتا ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ روح سے متعلق خواب صاف اور واضح ہوگا جبکہ ذہن سے متعلق خواب اس کے برعکس ہوگا۔ اس لیے روح سے متعلق خواب میں تعبیر حاصل کرنے کی ضرورت کم ہی پیش آتی ہے لیکن ذہن سے متعلق خواب بہت پیچیدہ اور مشکل ہوتا ہے اور اس کی تعبیر کوئی ماہر شخص بیان کر سکتا ہے۔ اس کی مثال ہم یوں بیان کر سکتے ہیں جیسے زید نامی ایک شخص کی تقدیر میں زخمی ہونا لکھا ہے اب اگر اس کی روح اس واقعے کا خواب کی حالت میں مشاہدہ کرتی ہے تو زخمی ہونے کا پورا منظر اسے خواب میں دکھائی دے جائے گا لیکن اگر اس کا ذہن اس واقعے کو خواب کی صورت میں پیش کرتا ہے تو (مثلاً) اسے یوں دکھائی دیگا کہ کہیں جاتے ہوئے راستے میں لکڑی لگنے سے وہ زخمی ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ روح اپنے نور کی مدد سے ہر چیز کو اس کی اصلی اور حقیقی شکل میں پیش کر دیتی ہے لیکن ذہن کے اندر باطل کا کچھ اثر موجود ہوتا ہے جس کی وجہ سے کسی چیز کی حقیقی شکل تبدیل ہو کر کوئی اور صورت اختیار کر جاتی ہے۔ انسان' لکڑی دکھائی دیتا ہے' پرندہ پتھر دکھائی دیتا ہے' بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ انسان کا ظاہری جسم ظلمت سے پاک ہو اور یہ حقیقت صرف انبیاء کرام کو حاصل ہے۔

ظلمت کے درجات

قوت اور ضعف کے اعتبار سے ظلمت کے دس درجے ہیں:

1-مکروہ فعل کا لاشعوری ارتکاب

ظلمت کا سب سے پہلا درجہ یہ ہے کہ جو لاشعوری طور پر کسی مکروہ فعل کے ارتکاب کے نتیجے میں انسان کی ذات پر اثر انداز ہوتی ہے جیسے کوئی شخص لاشعوری طور پر بائیں ہاتھ سے کوئی چیز کھالے یا اسی نوعیت کا کوئی اور مکروہ فعل سرانجام دے۔ ایسے کسی عمل کے نتیجے میں ایک ہلکی سی تاریکی انسان کے وجود میں داخل ہو جاتی ہے اور یہ تاریکی اس شخص کے خواب میں ہلکی سی تبدیلی پیدا کرے گی جیسے اگر وہ شخص خواب میں جنت دیکھے لیکن اس میں داخل ہونے کا ارادہ نہ کرے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے ایک ایسی نیکی کا ارادہ کر کے ترک کر دیا جو واجب نہیں تھی۔ اس تعبیر کی وجہ یہ ہے کہ نیکی جنت میں داخل ہونے کا بنیادی سبب ہے تو خواب میں دکھائی دینے والی جنت سے مراد نیکی ہوگی اور جنت میں داخل نہ ہونے کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس نے ایک نیک کام کا ارادہ کر لینے کے باوجود وہ نیک کام نہیں کیا لیکن اگر یہی چیز حقیقی طور پر خواب میں پیش کی جائے تو وہ شخص خواب میں بھی یہی دیکھے گا کہ اس نے ایک نیک کام کرنے کا ارادہ کر لینے کے باوجود وہ نیک کام نہیں کیا۔ بس اسی نوعیت کا فرق خواب پر اثر انداز ہوتا ہے۔

2-حرام کا لاشعوری ارتکاب

ظلمت کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ انسان لاشعوری طور پر کسی حرام فعل کا مرتکب ہو اور پھر اس کے نتیجے میں ایک مخصوص ظلمت اس کے وجود میں داخل ہو جائے جیسے کوئی شخص روزے کی حالت میں بھول کر کچھ کھا پی لے تو اس بھول کی وجہ سے اس شخص کو گنہگار قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن اس عمل کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ظلمت، پہلی قسم کی ظلمت سے زیادہ شدید ہوتی ہے اور یہ خواب کو زیادہ تبدیل کر دیتی ہے مثلاً ایسا شخص خواب میں جنت دیکھ کر اس میں داخل ہونے کا ارادہ کرتا ہے لیکن اسے جنت میں داخل نہیں ہونے دیا جاتا تو اس کی تعبیر یہ ہوگی کہ اس شخص نے فرض کفایہ کی ادائیگی کا ارادہ کرنے کے باوجود اسے ادا نہیں کیا۔ اس تعبیر کی وجہ یہ بھی ہے جو ہم سابقہ قسم میں بیان کر چکے ہیں لیکن ظلمت اس خواب پر اس قدر اثر انداز ہوئی کہ اسے یوں دکھائی دیا گویا اسے جنت میں داخل ہونے سے روک دیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ظلمت ایک حرام فعل کے لاشعوری طور پر انجام دینے کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے اور ایسی ظلمت انسان کو شعوری طور پر فرض کفایہ کی ادائیگی سے روک دیتی ہے۔

3-مکروہ فعل کا شعوری ارتکاب

انسان کے جسم میں داخل ہونے والی ظلمت کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ وہ ظلمت کسی مکروہ فعل کے شعوری طور پر سرانجام دینے کے نتیجے میں پیدا ہو جیسے کوئی شخص شعوری طور پر بائیں ہاتھ سے کچھ کھالے یا اسی طرح کا کوئی اور مکروہ کام کرے۔ یہ ظلمت ابتدائی دونوں قسموں کی ظلمتوں سے زیادہ شدید ہوتی ہے اس لئے یہ خواب کو زیادہ تبدیل کر دیتی ہے جیسے وہ شخص یہ خواب دیکھے کہ اس کے گھر میں شیاطین داخل ہو گئے ہیں تو اس کی تعبیر یہ ہوگی

کہ اس شخص کی بیوی زانیہ ہے اور اس کے کسی مرد (یا کئی مردوں) کے ساتھ ناجائز تعلقات ہیں۔ خواب میں شیاطین سے مراد زانی لوگ' گھر سے مراد بیوی اور داخل ہونے سے مراد زنا کرنا ہوگا۔ اگرچہ خواب اور تعبیر کے درمیان خاصا فرق پایا جاتا ہے لیکن خواب بہت زیادہ تبدیل نہیں ہوا لیکن اس تعبیر میں بہت زیادہ خباثت اور ظلمت پائی جاتی ہے کیونکہ یہ حقیقت باعث شرم' بے عزتی اور بے حمیتی ہے لہٰذا جس عورت کے بارے میں یہ تعبیر بیان کی گئی ہے اس میں بہت زیادہ ظلمت موجود ہے یعنی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بعض اوقات تعبیر میں ظلمت زیادہ ہوتی ہے اور بعض اوقات اس شخص میں ظلمت زیادہ ہوتی ہے جس سے متعلق تعبیر بیان کی گئی ہو۔

4-حرام کا شعوری ارتکاب

انسانی جسم میں داخل ہونے والی ظلمت کی چوتھی قسم وہ ہے جو کسی حرام فعل کے شعوری طور پر سرانجام دینے کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے جیسے کوئی شخص ارادتاً زنا کرے یا روزہ توڑ دے۔ یہ ظلمت سابقہ تمام ظلمتوں سے زیادہ شدید ہوتی ہے۔ ایسا شخص اگر یہ خواب دیکھے کہ وہ کسی بزرگ کے آگے چل رہا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہوگی کہ اس کا ایمان سلامت ہے لیکن وہ انتہائی گنہگار ہے کیونکہ بزرگ سے مراد ایمان ہوگا لیکن اس کے آگے چلنا بے ادبی ہوگی۔ اس لئے آگے چلنے کی تعبیر گناہ کی شکل میں کی گئی ہے۔ اس خواب کی تعبیر میں ظلمت بہت زیادہ ہے کیونکہ ایمان اور بزرگ کے درمیان بظاہر کوئی مناسبت موجود نہیں ہے اسی طرح آگے چلنے اور گناہ کے درمیان کوئی ظاہری مناسبت نہیں پائی جاتی اس لئے اس درجے میں ظلمت اور خواب کی پیچیدگی سابقہ درجات کی بہ نسبت زیادہ ہوتی ہے۔

5-خفیف عقیدے سے لاعلمی

انسانی جسم میں داخل ہونے والی ظلمت کا پانچواں مرتبہ یہ ہے کہ انسان ''خفیف عقیدے'' سے لاعلم ہو۔ عقیدے کی دو قسمیں ہیں: ''خفیف'' اور ''ثقیل''۔

خفیف عقیدے کی وضاحت

''خفیف'' سے مراد وہ عقیدہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس کا قائل نہ ہو تو اسے آخرت میں عتاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن ایسا شخص ہمیشہ جہنم میں نہیں رہے گا۔ اس عقیدے میں آخرت میں اللہ تعالیٰ کے دیدار کا حق ہونا' نیک یا برے اعمال کی جزاء دینا اللہ تعالیٰ پر واجب نہیں ہے بلکہ ہر نیکی کا ثواب اللہ تعالیٰ کا فضل اور ہر برائی کا عذاب اللہ تعالیٰ کا عدل ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے افعال میں کسی واسطے کا محتاج نہیں ہے تاہم ہر واسطہ اور اس سے متعلق تمام تر اشیاء اللہ تعالیٰ کے افعال میں شامل ہیں یہاں تک کہ آگ کا وجود اور آگ کا کسی چیز کو جلا دینا' کھانے کا وجود اور کھانے کا پیٹ کو بھر دینا' تلوار کا وجود اور تلوار کا کسی چیز کو کاٹ دینا یہ تمام امور اللہ تعالیٰ کے افعال میں شامل ہیں۔ جنت اور دوزخ اس وقت بھی موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا اور آخرت میں کسی پر کوئی ظلم

نہیں کیا اور نہ ہی کرے گا۔ یہ وہ عقائد ہیں جو "خفیف" عقائد کہلائیں گے اور ان کا قائل صحیح اور کامل مومن ہوگا۔ اور اگر کوئی شخص ان سے لاعلم ہو (یعنی اس کا قائل نہ ہو) تو ایسے شخص کو قیامت کے دن تمام غیر اعتقادی گناہوں کے عذاب سے زیادہ عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ثقیل عقیدے کی وضاحت

"ثقیل" عقیدہ وہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس سے لاعلم ہو (یا اس کا قائل نہ ہو) تو ایسا شخص ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ درج ذیل عقائد اس قسم کا حصہ شمار ہوں گے: اللہ تعالیٰ موجود ہے وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا' اس کا ہر فعل اس کے اختیار کے نتیجے میں صادر ہوتا ہے' اس کا کوئی بھی فعل فطری طور پر یا کسی علت اور سبب کے باعث (غیر اختیاری طور پر) صادر نہیں ہوتا۔ وہ ہمارے تمام افعال کا خالق ہے ہمیں اپنے افعال میں کوئی اختیار نہیں ہے۔ دنیا کا سب سے زیادہ طاقتور انسان جیسے کوئی بادشاہ یا وزیر اور آسمان میں موجود کوئی بھی چیز جیسے سورج' چاند' ستارے' تمام فرشتے (غرضیکہ کوئی ایک بھی) اس کا شریک نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ سمیع و بصیر و علیم ہے۔ یہ تمام عقائد "ثقیل" ہیں۔ اگر کوئی شخص "خفیف" عقائد کے ہمراہ ان سب امور پر اعتقاد رکھتا ہو تو اس کا ایمان کامل ہوگا اور اگر کوئی شخص ان تمام امور میں سے کسی ایک نکتے سے لاعلم ہو (یا اس کا قائل نہ ہو) تو ایسا شخص ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔

جب یہ اصول آپ کے سامنے واضح ہو گیا تو اب ہم دوبارہ اپنے اصل مضمون یعنی "خفیف" عقیدے کے بارے میں لاعلمی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں انسان کے وجود پر اس قدر ظلمت طاری ہو جاتی ہے جو سابقہ ذکر شدہ تمام ظلمتوں سے زیادہ شدید ہوتی ہے اور اس کے نتیجے میں خواب میں تبدیلی بھی زیادہ ہو جاتی ہے جیسے ایک شخص کسی دوسرے مرحوم شخص سے واقف ہے اور اسی مرحوم کو خواب میں دیکھ کر یہ دریافت کرے' اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ اور مرحوم جواب میں اپنی بداعمالیوں اور بری حالت کا تذکرہ کرے تو اس خواب کی تعبیر یہ ہے کہ خواب دیکھنے والے شخص کا انجام بالخیر ہوگا اور یہ اپنی تمام گناہوں اور خامیوں سے توبہ کرے گا۔ اس تعبیر کی وجہ یہ ہے کہ خواب کی حالت میں دکھائی جانے والی نصیحت انسان پر ضرور اثر انداز ہوتی ہے اور یہ نصیحت ظاہری تنبیہ کے قائم مقام ہوگی کیونکہ یہ نصیحت اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اس لئے اس کا اثر ضرور ظاہر ہوتا ہے انسان کسی میت سے ملاقات کر کے اس کی حالت دریافت نہیں کر سکتا لیکن اللہ تعالیٰ نے خواب کی شکل میں ایسی صورتحال پیدا کر دی تاکہ خواب دیکھنے والا شخص توبہ کر کے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مستحق قرار پا سکے۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دیتا اور وہ شخص گمراہی کی دلدل میں دھنستا چلا جاتا۔ کیونکہ اس خواب میں بہت باریک اشارہ موجود ہے اس لئے اس میں ظلمت بھی زیادہ پائی جاتی ہے۔

6-خفیف عقیدے کا قائل نہ ہونا

انسانی جسم میں داخل ہونے والی ظلمت کا چھٹا درجہ یہ ہے کہ انسان ''خفیف'' عقیدے سے واقف ہونے کے باوجود اس کا قائل نہ ہو جیسے کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار نہیں ہو سکتا یا جزا و سزا اللہ تعالیٰ کے ذمہ واجب ہے تو ایسے شخص کے وجود میں داخل ہونے والی ظلمت سابقہ ذکر شدہ تمام ظلمتوں سے زیادہ قوی ہوگی۔ ایسا شخص اگر خواب میں یہ دیکھے کہ وہ جہنم کی پیپ کھا رہا ہے یا گرم پانی پی رہا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہوگی کہ ایسا شخص حرام کاموں میں مبتلا ہے جیسے وہ حرام طریقے سے دنیا جمع کر رہا ہو یا اپنی دولت کو صحیح طریقے سے خرچ نہیں کر رہا۔ اس تعبیر کی وجہ یہ ہے کہ حرام کا ارتکاب دوزخ میں داخلے کا سبب بنتا ہے اور اس کی تعبیر میں یہ ظلمت موجود ہے کہ انسان فطری طور پر پیپ کھانے یا کھولتے ہوئے پانی کو پینے کو ناپسند کرتا ہے لیکن انسان فطری طور پر مال و دولت کو پسند کرتا ہے اب خواب اور تعبیر دونوں ایک دوسرے کے برعکس ہیں اور تعبیر' خواب سے بالکل متضاد ہے۔ عام طور پر ایسی تعبیر کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب خواب کا تعلق دنیا کے ساتھ اور تعبیر کا تعلق آخرت کے ساتھ ہو یا خواب کا تعلق آخرت کے ساتھ اور تعبیر کا تعلق دنیا کے ساتھ ہو کیونکہ دنیا اور آخرت ایک دوسرے کی متضاد ہیں۔ نیز دنیا اور آخرت کی جن چیزوں کے ساتھ خواب اور تعبیر متعلق ہیں ان کے درمیان میں بھی تضاد پایا جاتا ہے لہٰذا اس مرتبے کی ظلمت سابقہ تمام ظلمتوں سے زیادہ شدید ہوگی۔

7-ثقیل عقیدے سے لاعلمی

وہ ظلمت جو ''ثقیل'' عقیدے سے لاعلمی کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے جیسے کوئی شخص (لاعلمی میں) کسی ''ثقیل'' عقیدے کے برعکس عقیدہ رکھتا ہو اور پھر تنبیہہ کرنے پر اپنی بدعقیدگی سے باز آ جائے لیکن لاعلمی کی حالت میں غلط عقیدے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ظلمت سابقہ ذکر شدہ تمام ظلمتوں سے زیادہ شدید ہوتی ہے۔ اگر وہ شخص یہ خواب دیکھے کہ وہ جہنم میں داخل ہو گیا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہوگی کہ وہ والدین کی نافرمانی یا اسی نوعیت کے کسی کبیرہ گناہ کا مرتکب ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ واضح ہے کیونکہ دنیا اور آخرت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ خواب کا تعلق آخرت کے ساتھ ہے اور تعبیر دنیا سے متعلق ہے لیکن جہنم میں داخل ہونا اور والدین کی نافرمانی دونوں ناپسندیدہ امر ہیں اس لئے اس خواب میں ظلمت سابقہ ذکر شدہ ظلمتوں سے زیادہ ہوگی۔

8-ثقیل عقیدے کا قائل نہ ہونا

وہ ظلمت جو ''ثقیل'' عقیدے کے برعکس عقیدے پر (علم ہونے کے باوجود) ثابت قدم رہنے کے نتیجے میں انسان کے وجود پر وارد ہوتی ہے۔ مثلاً کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ انسان خود اپنے افعال کا خالق ہے اور پھر اپنے اس عقیدے کو درست تصور کرے۔ یہ ظلمت سابقہ ذکر شدہ تمام ظلمتوں سے زیادہ شدید ہے اس لئے خواب بھی زیادہ تبدیل شدہ حالت میں دکھائی دے گا۔ اگر ایسا شخص یہ خواب دیکھے کہ فرشتے نے اسے پکڑ کر جہنم میں

ڈال دیا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہوگی کہ وہ اپنی تقدیر کے مطابق معصیت کے راستے پر گامزن ہوگا۔ یہاں فرشتے سے مراد تقدیر ہوگی اور جہنم سے مراد معصیت ہوگی۔ اس میں ظلمت کی وجہ یہ ہے کہ بظاہر فرشتے اور تقدیر کے درمیان کوئی مناسبت نہیں پائی جاتی پھر خواب کا سب سے زیادہ حیرت انگیز پہلو یہ ہے کہ فرشتہ اسے زبردستی جہنم میں ڈال رہا ہے لیکن اگر کوئی شخص یہ دیکھے کہ وہ خود جہنم میں داخل ہو رہا ہے یا پیپ کھا رہا ہے یا کھولتا ہوا پانی پی رہا ہے تو کیونکہ ان امور میں کوئی زبردستی شامل نہیں ہے اس لئے ان کے اندر ظلمت کم ہوگی لیکن زبردستی والے خواب میں ظلمت زیادہ ہوگی۔

9- صفاتِ نبوی سے لاعلمی

اس سے مراد وہ ظلمت ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کے بارے میں لاعلمی کے نتیجے میں انسان پر وارد ہوتی ہے یعنی کوئی شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں ایسی صفات کی موجودگی کا عقیدہ رکھے جو درحقیقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں موجود نہیں ہیں لیکن پھر جب اس شخص کو تنبیہہ کردی جائے تو یہ اپنی بدعقیدگی سے باز آ جائے۔ ظلمت کی یہ قسم سابقہ تمام ظلمتوں سے زیادہ قوی ہے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس' اللہ تعالیٰ کی بارگاہ تک رسائی کا ذریعہ ہے اور جو شخص دروازے سے ناواقف ہو' وہ کبھی بھی گھر میں داخل نہیں ہوسکتا۔ اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کا واسطہ موجود نہ ہوتا تو ہمیں کبھی بھی ایمان باللہ کی توفیق نصیب نہ ہوتی اور نہ ہی ہمیں دنیا یا آخرت کی کوئی بھلائی حاصل ہوتی۔ ایسا شخص اگر عمر رسیدہ ہو اور پھر خواب میں یہ دیکھے کہ وہ جوان ہوگیا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہوگی کہ اسے دنیا وافر مقدار میں حاصل ہوگی لیکن وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا رہے گا۔ یہاں بڑھاپے سے مراد غربت اور جوانی سے مراد امارت ہے جو ایک نادر تشبیہہ ہے اس لئے اس خواب میں زیادہ ظلمت پائی جاتی ہے۔ مزید برآں تمام گناہوں کی جڑ دنیا ہے اور جب اس کی کثرت ہو تو یہ مزید بربادی کا باعث بنتی ہے جیسا کہ اس شخص نے خواب میں دیکھا ہے۔

10- نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں منفی عقیدہ رکھنا

ظلمت کا دسواں درجہ یہ ہے کہ کوئی شخص شعوری طور پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں منفی عقائد رکھتا ہو اور اپنی اس بدعقیدگی کو درست سمجھتا ہو۔ یہ شدید ترین ظلمت ہے' ایسا شخص اگر یہ خواب دیکھے کہ وہ کسی نوجوان کے پیچھے چل رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اغلام بازی میں مبتلا ہے۔ تعبیر کی وجہ ظاہر ہے اور نفس خواب میں ہی ظلمت کی شدت کی طرف اشارہ موجود ہے کیونکہ اغلام بازی بہت بڑا گناہ ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل وکرم کی بدولت سلامتی کے طلبگار ہیں۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: ظلمت کے یہ دس درجات انسان کے (ظاہری) وجود سے متعلق ہیں۔

طہارت کے درجات

روح سے متعلق طہارت کے درجات کی تعداد بھی دس ہے اور یہ ظلمت کے درجات کے بالکل برعکس ہیں۔ یہاں تک کہ ظلمت کے آخری مرتبے کی متضاد کیفیت طہارت کا پہلا مرتبہ ہوگی اور طہارت کے آخری مرتبے کی متضاد کیفیت ظلمت کا ابتدائی مرتبہ شمار ہوگی۔ اس کی تفصیل ہم آئندہ سطور میں بیان کریں گے۔

جب روح اپنی بصیرت کی مدد سے کوئی خواب دیکھتی ہے تو اسے وہ خواب بالکل واضح اور حقیقت کے مطابق دکھائی دیتا ہے اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی پھر جب روح اس خواب کو ظاہری جسم (یعنی ذہن) کی طرف منتقل کرتی ہے تو سب سے پہلے انسان کی کیفیت کا جائزہ لیتی ہے۔ اگر انسان کا وجود ہر طرح کی ظلمت سے پاک ہو تو وہ خواب من وعن ذہن کی طرف منتقل ہو جاتا ہے لیکن اگر انسان کے وجود میں ظلمت موجود ہو تو اسی ظلمت کے مطابق خواب میں تغیر اور تبدیلی کا عمل رونما ہو جاتا ہے اور پھر انسانی وجود کی ظلمت کو سامنے رکھتے ہوئے خواب کی تعبیر بیان کی جاتی ہے۔ لہٰذا روح کی طرف سے جسم کو خواب کی منتقلی کی یہی دو صورتیں ہوں گی اس لیے اگر انسان کا وجود پاک ہو تو خواب میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی لیکن اگر انسان کا وجود ظلمت کا شکار ہو تو یہی ظلمت خواب میں تبدیلی کا باعث بنتی ہے۔ لہٰذا انسان کے وجود کی پاکیزگی کی دو صورتیں ممکن ہیں: پہلی صورت یہ ہے کہ انسان کا وجود مکمل طور پر ہر طرح کی ظلمت سے پاک ہو' یہ خصوصیت صرف انبیاء کرام کو حاصل ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ انسان کا وجود بعض اقسام کی ظلمت سے پاک ہو اور بعض اقسام کی ظلمت اس میں موجود ہو تو اس اعتبار سے طہارت کے دس درجات ہوں گے جو ظلمت کے دس درجات سے بالکل متضاد ہوں گے۔ (یہ درجات درج ذیل ہیں):

1- نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مثبت عقیدہ

طہارت کا سب سے پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں شعوری طور پر کسی قسم کا کوئی منفی عقیدہ نہ رکھتا ہو اور یہ صفائی کا سب سے بلند مرتبہ ہے اس لئے ایسی کیفیت میں عام طور پر تعبیر کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی جیسے کوئی شخص یہ خواب دیکھے کہ اللہ تعالیٰ اس سے خوش اور راضی ہے تو اس کی تعبیر یہی ہوگی کہ اس شخص کو اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہے اور اس کے اعمال اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہیں۔

2- نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں لاشعوری طور پر بھی منفی عقیدہ نہ رکھنا

طہارت کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ انسان نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں' لاشعوری طور پر بھی کوئی منفی عقیدہ نہ رکھے' صفائی کے اعتبار سے یہ درجہ پہلے درجے سے کچھ کم ہے اس لئے اس میں تعبیر کی ہلکی سی ضرورت پیش آتی ہے۔ جیسے کوئی شخص یہ خواب دیکھے کہ وہ فرشتوں سے جھگڑا کر رہا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہوگی کہ وہ شخص کسی بیماری کا شکار ہوگا اس نے خواب میں جن فرشتوں کو دیکھا تھا وہ اس کی ذات کے محافظ فرشتے تھے اور ان سے

جھگڑا کرنے والی شخصیت اس کی اپنی روح تھی۔ جب روح نے یہ دیکھا کہ عنقریب میرا جسم کسی بیماری کا شکا
ہونے والا ہے تو اس نے فرشتوں سے جھگڑا شروع کر دیا۔ گویا روح فرشتوں سے یہ کہہ رہی ہے کہ تمہار
حفاظت کی کمزوری کے باعث میرا جسم بیماری کا شکار ہوا ہے۔ گویا اس خواب کی مثال یوں ہے جیسے اس میں
کچھ کلام کو حذف کر دیا گیا ہو اگر یہ کلام بھی خواب میں موجود ہوتا تو تعبیر کی کوئی ضرورت پیش نہ آتی۔

3-ثقیل عقیدے کے برعکس عقیدے سے بچنا

طہارت کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ انسان شعوری طور پر ''ثقیل'' عقیدے کے برعکس کوئی عقیدہ نہ رکھتا ہو کیونکہ
صفائی کے اعتبار سے یہ درجہ سابقہ درجے سے کم ہے اس لئے اس درجے میں خواب کی تعبیر کی ضرورت پیش آتی
ہے جیسے کوئی شخص یہ خواب دیکھے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں خوف اور رعب کا شکار ہو کر کھڑا ہوا ہے تو اس کی تعبیر
یہ ہوگی کہ وہ شخص عنقریب کسی مصیبت میں گرفتار ہوگا پھر اللہ تعالیٰ اسے اس مصیبت سے نجات عطا فرمائے گا او
اجر و ثواب عنایت فرمائے گا۔ خواب اور تعبیر کے درمیان مناسبت یہ ہے کہ انسان قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی
بارگاہ میں کھڑا ہوگا اور اس دن بھی صرف اہل ایمان اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔ اگر خواب دیکھنے والا
شخص کسی ظلمت کا شکار ہوتا تو اسے خواب میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی تنبیہہ ضرور دکھائی جاتی لیکن ایسا نہیں
ہوا جس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری ذکر کردہ تعبیر درست ہے۔ درحقیقت یہ خواب روح نے دیکھا تھا اور پھر جب
اسے ذہن کی طرف منتقل کیا گیا تو تعبیر میں فرق آ گیا اگر یہی خواب کسی نبی یا کامل ولی نے دیکھا ہوتا تو اس کی
تعبیر بالکل مختلف ہوتی۔

4-لاشعوری طور پر بھی ثقیل عقیدے کی مخالفت سے بچنا

طہارت کا چوتھا درجہ یہ ہے کہ انسان لاشعوری طور پر بھی کسی ''ثقیل'' عقیدے کے برعکس عقیدہ نہ رکھتا ہو۔
صفائی کا یہ مرتبہ سابقہ مرتبے سے کچھ کم ہے ایسا شخص اگر خواب میں حضرت عزرائیل علیہ السلام کو اپنی طرف متوجہ
پا کر ہنستا ہوا دیکھے تو اس کی تعبیر یہ ہوگی کہ خواب دیکھنے والے شخص کی عمر خاصی طویل ہوگی۔ چونکہ اتنا بزرگ فرشتہ
اس شخص کی صرف اسی بات پر خوش ہو سکتا ہے لیکن ہنسی سے درازی عمر مراد لینا ایک خفیف اشارہ ہے اور روح کی
طرف سے ذہن کو یہ خواب منتقل کرتے وقت اس میں پیچیدگی پیدا ہوئی ہے۔

5-خفیف عقیدے کے برعکس عقیدہ نہ رکھنا

طہارت کا پانچواں مرتبہ یہ ہے کہ انسان شعوری طور پر ''خفیف'' عقیدے کے برعکس کوئی عقیدہ نہ
رکھے۔ یہ مرتبہ صفائی کے اعتبار سے سابقہ درجے سے کچھ کم ہے مثلاً اگر کوئی شخص خواب میں حضرت ابوبکر صدیق
رضی اللہ عنہ کی زیارت کرے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھتا ہے اور
خواب میں دقت یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زیارت سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مراد

لی گئی ہے حالانکہ یہ دونوں ایک دوسرے کیلئے لازم وملزوم نہیں ہیں اس لئے اس خواب میں زیادہ پیچیدگی پائی جاتی ہے۔

۶-لاشعوری طور پر خفیف عقیدے کی مخالفت سے بچنا

طہارت کا چھٹا درجہ یہ ہے کہ انسان لاشعوری طور پر کسی ''خفیف'' عقیدے کے برعکس کوئی عقیدہ نہ رکھتا ہو۔ یہ مرتبہ سابقہ درجے سے کم حیثیت رکھتا ہے جیسے کوئی شخص خواب میں فرشتوں کو ایک مخصوص مقام پر جمع دیکھ لے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مخصوص مقام پر کوئی مسجد تعمیر ہوگی جس میں لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں گے۔ تعبیر کی وجہ ظاہر ہے لیکن پیچیدگی یہ ہے کہ فرشتوں کا تعلق ''عالم علوی'' کے ساتھ ہے اور مسجد ''عالم سفلی'' میں موجود ہے اور یہ دونوں عالم ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس کے برعکس سابقہ مثال میں اگرچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کوئی لزوم موجود نہیں تھا لیکن دونوں کا تعلق ایک ہی جہان کے ساتھ تھا اس لئے وہاں اس خواب کی بہ نسبت پیچیدگی کم تھی۔

7-شعوری طور پر حرام سے بچنا

طہارت کا ساتواں مرتبہ یہ ہے کہ انسان شعوری طور پر کسی حرام کے ارتکاب سے پرہیز کرے۔ ایسا شخص اگر خواب میں حضرت اسرافیل علیہ السلام کو کسی مخصوص مقام پر موجود دیکھ لے تو اس کی تعبیر یہ ہوگی کہ اس مخصوص مقام پر یا تو کوئی زبردست فتنہ پیدا ہوگا یا کوئی بہت بڑی تبدیلی رونما ہوگی۔ اس تعبیر کی وجہ یہ ہے کہ فتنہ وفساد اور بہتری کے امور کے نگران حضرت اسرافیل علیہ السلام ہیں۔ اس خواب میں پیچیدگی یہ ہے کہ حضرت اسرافیل علیہ السلام کی یہ ذمہ داری مشہور ومعروف نہیں ہے جبکہ حضرت عزرائیل علیہ السلام کے موت پر متعین ہونے سے ہر کوئی آگاہ ہے اس لیے یہاں سابقہ خواب کی بہ نسبت زیادہ پیچیدگی پائی جاتی ہے۔ نیز خواب کا تعلق عالم ملکوت کے ساتھ ہے اور تعبیر کا تعلق دنیا کے ساتھ ہے اس لئے پیچیدگی مزید نمایاں ہو جاتی ہے۔

8-شعوری طور پر مکروہ سے بچنا

طہارت کا آٹھواں درجہ یہ ہے کہ انسان شعوری طور پر کسی مکروہ فعل کا مرتکب نہ ہو' ایسا شخص اگر یہ خواب دیکھے کہ شیاطین نے اسے گھیرے میں لے لیا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہوگی کہ اس کے ہاں چوری ہوگی یا لوگ اسکی غیبت کریں گے۔ تعبیر کی وجہ واضح ہے لیکن اس خواب میں پیچیدگی یہ ہے کہ تعبیر کے ساتھ نفس خواب میں بھی پریشان کن صورتحال دکھائی دی ہے اور یہ کیفیت مذکورہ بالا اقسام میں موجود نہیں تھی۔

9-لاشعوری طور پر بھی حرام سے بچنا

طہارت کا نواں مرتبہ یہ ہے کہ انسان لاشعوری طور پر بھی کسی حرام فعل کا مرتکب نہ ہو۔ ایسا شخص اگر یہ

خواب دیکھے کہ فلاں مقام پر قیامت قائم ہوگئی ہے تو اس کی تعبیر یہ ہوگی کہ اس مخصوص جگہ کے حالات تبدیل ہو جائیں گے۔ اگر وہاں عدل کا دور دورہ تھا تو اب وہاں ظلم کی حکمرانی ہوگی یا اس کی برعکس ہوگا۔ اس میں پیچیدگی یہ ہے کہ قیامت اور کسی جگہ کے حالات میں تبدیلی میں بظاہر کوئی مناسبت نہیں پائی جاتی۔ اگر بالفرض اس جگہ پر پہلے عدل ہو رہا تھا تو قیامت دیکھ کر یہ تعبیر دینا کہ اب وہاں ظلم کی حکمرانی ہوگی نہایت حیران کن ہے کیونکہ قیامت کے دن کسی پر کوئی ظلم نہیں ہوگا اور یہ خواب حضرت اسرافیل علیہ السلام والے خواب سے زیادہ پیچیدہ ہے کیونکہ حضرت اسرافیل علیہ السلام' فتنہ وفساد اور مثبت تبدیلی دونوں پر مامور ہیں لیکن قیامت کا تعلق صرف عدل کے ساتھ ہے۔ ظلمت کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

10-لاشعوری طور پر بھی مکروہ سے بچنا

طہارت کا دسواں مرتبہ یہ ہے کہ انسان لاشعوری طور پر کسی مکروہ فعل کے ارتکاب سے پرہیز کرے۔ اس مرتبے میں خواب کی روح سے ذہن کی طرف منتقلی کے دوران سب سے زیادہ تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص یہ خواب دیکھے کہ وہ شیاطین کا دوست ہے تو اس کی تعبیر یہ ہوگی کہ اس کے ذاتی دوستوں میں کوئی بھلائی موجود نہیں ہے۔ اب آپ اس خواب کی پیچیدگی ملاحظہ کریں کیونکہ انسان کا اپنا طرز عمل اس کے دوستوں کی مانند ہوتا ہے۔ گویا خواب میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اس شخص کے اپنے وجود کے اندر کوئی بھلائی موجود نہیں ہے۔ لہٰذا اس خواب میں موجود ظلمتیں بالکل اسی طرح ہیں جیسے ذات سے منسوب ظلمت کی دس قسمیں ہیں کہ ان میں سے ہر ایک قسم ذات میں موجود کسی خباثت پر دلالت کرتی ہے اور ہم پہلے اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ ان ظلمتوں کے مراتب مختلف ہیں۔

دباغ کے جواب پر ایک اشکال

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے یہ اشکال پیش کیا: آپ کی گفتگو سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خواب کی تعبیر کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب انسان کی ذات میں ظلمت موجود ہو اگرچہ تعبیر کی ضرورت کا موقع ومحل مختلف ہوتا ہے۔ یعنی اگر خواب کا تعلق روح کے ساتھ تھا تو روح سے ذہن کی طرف منتقلی کو تعبیر کے وقت پیش نظر رکھا جائے گا۔ اور اگر خواب کا تعلق جسم کے ساتھ تھا تو پھر خواب کے اندر ہی تعبیر موجود ہوگی۔ اگر اس قاعدے کو درست تسلیم کر لیا جائے تو جن حضرات کے اندر ظلمت کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا' یعنی انبیاء کرام علیہم السلام' ان حضرات کو دکھائی دینے والے خوابوں میں تعبیر کی ضرورت بالکل موجود نہیں ہونی چاہئے حالانکہ کتاب وسنت سے یہ بات ثابت ہے کہ انبیاء کرام کو دکھائی دینے والے خواب میں بھی تعبیر کی ضرورت موجود ہوتی ہے۔ جیسے قرآن حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ قول نقل کرتا ہے:

اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَیْتُهُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ۔

''میں نے یہ خواب دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے' سورج اور چاند مجھے سجدہ کر رہے ہیں''

حالانکہ اس خواب میں ستاروں سے مراد حضرت یوسف علیہ السلام کے گیارہ بھائی اور چاند' سورج سے مراد آپ کے والدین ہیں۔ جس کی دلیل قرآن کی یہ آیت ہے:

وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا وَقَالَ يٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا

''اور جب ان سب نے یوسف کو سجدہ کیا تو یوسف نے کہا' ابا جان! یہ میرے خواب کی تعبیر ہے جسے میرے پروردگار نے حقیقت کی شکل میں ظاہر کیا ہے''

اسی طرح قرآن نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول نقل کیا ہے۔

يٰبُنَيَّ اِنِّيْۤ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْۤ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى (الصافات'۳۷:۱۰۲)

''بیٹے! میں نے یہ خواب دیکھا ہے کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں' تمہاری کیا رائے ہے؟''

اس کی دلیل قرآن کی یہ آیت ہے:

وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (الصافات'۳۷:۱۰۷)

''اور ہم نے ایک بہت بڑی قربانی کے ساتھ اس کا فدیہ کر دیا۔''

اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں گائے کو قربان ہوتے دیکھا' اپنی تلوار مبارک کی دھار ٹوٹتے ہوئے دیکھا اور مضبوط زرہ کو دیکھا تو گائے کی قربانی سے یہ تعبیر اخذ کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض صحابہ شہید ہوں گے' تلوار کی دھار ٹوٹنے کی یہ تعبیر اخذ کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت میں سے ایک فرد انتقال کر جائے گا۔ اور مضبوط زرہ کی تعبیر مدینہ منورہ اخذ کی کہ جب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں قیام پذیر رہیں گے اس وقت تک کسی ناپسندیدہ صورتحال کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ اسی طرح ایک اور روایت کے مطابق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں چند حضرات کو دیکھا جنہوں نے مختلف سائز کی قمیصیں پہن رکھی تھیں اور ان میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی قمیص سب سے لمبی تھی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعبیر دین (ایمان کی کیفیت) کے ساتھ کی' اس کے علاوہ اور بھی روایات موجود ہیں (ان کے بارے میں آپ کا بیان کردہ قاعدہ درست معلوم نہیں ہوتا؟)

انبیاء کے خوابوں کی اقسام

سیّدی دباغ نے جواب دیا: انبیاء کرام علیہم السلام کی نیند عام لوگوں کی نیند سے مختلف ہوتی ہے کیونکہ یہ حضرات نیند کی حالت میں بھی مشاہدہ حق میں مشغول رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بظاہر ان کی آنکھیں سوئی محسوس ہوتی ہیں حالانکہ درحقیقت ان کا ذہن بیدار ہوتا ہے۔ اس لیے ان کے خواب دو طرح کے ہوں گے: عام خواب اور وحی' عام خواب سے مراد یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں کوئی چیز دیکھیں اور پھر وہ خواب عملی شکل میں کسی کمی یا اضافے کے بغیر پورا ہو جائے جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خواب دیکھا کہ آپ

اپنے اصحاب کے ہمراہ مسجد حرام میں داخل ہوئے ہیں ان میں سے بعض حضرات کے سر منڈے ہوئے اور بعض نے بال کٹوائے ہوئے تھے۔قرآن نے اس خواب کے بارے میں یہ الفاظ ذکر کیے ہیں:

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ (الفتح ۴۸:۲۷)

''بے شک اللہ نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو حقیقت کے عین مطابق سچا خواب دکھایا تھا۔''

اب اس مقام پر خواب کو صرف روح یا صرف ذات کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا کیونکہ طہارت اور پاکیزگی کے اعتبار سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس اور روح مبارکہ کے درمیان کوئی فرق موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی رات جو کچھ بھی دیکھا تھا وہ پہلے خواب کی شکل میں دکھائی دیا اور پھر آپ نے بیداری کی حالت میں بنفس نفیس مشاہدہ کیا۔گویا پہلی مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نیند کی حالت میں روحانی معراج کرائی گئی اور دوسری مرتبہ بیداری کی حالت میں جسمانی معراج کروائی گئی اور نیند کی حالت میں دکھائی دینے والا خواب کسی کمی بیشی کے بغیر بیداری کی حالت میں سچ ثابت ہوا اس لیے انبیاء کرام کو دکھائے جانے والے اس نوعیت کے خواب ظاہری آنکھ کے ساتھ دیکھی جانے والی چیز کی مانند ہوتے ہیں۔جیسے ظاہری طور پر دیکھی ہوئی کسی چیز میں تبدیلی نہیں ہوتی اسی طرح ان خوابوں میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

انبیاء کرام کو دکھائی دینے والے دوسری قسم کے خواب وحی پر مشتمل ہوتے ہیں اور اس وحی میں تعبیر کا امکان موجود ہوتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں نبی کسی خارجی چیز کا مشاہدہ نہیں کرتا اور نہ ہی ذاتی یا روحانی طور پر کسی چیز کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ امر' نہی یا اطلاع کے طور پر کلام نازل کرنے کی بجائے کوئی چیز تخلیق کر کے خواب کی صورت میں نبی کو دکھا دیتا ہے۔وحی کی یہ قسم اشارے کی شکل میں ہوتی ہے۔ایسے خواب میں دکھائی جانے والی اشیاء اللہ تعالیٰ اور انبیاء کرام کے درمیان ایک مخصوص راز ہوتی ہیں جن کے معنی و مفہوم سے انبیاء واقف ہوتے ہیں جیسے ہم اپنے عام محاورے اور رواج کے مطابق بعض اشاروں کا مفہوم سمجھ لیتے ہیں اس لئے نیند کی حالت میں دکھائے جانے والے یہ خواب بیداری کی حالت میں نازل ہونے والی وحی کی مانند ہوتے ہیں۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں:اس نوعیت کے خوابوں میں دکھائی جانے والی اشیاء میں یہ راز پوشیدہ ہوتا ہے کہ کوئی بھی حکم یا خطاب کسی ایسی چیز کے بارے میں نازل ہوگا جس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے جبکہ انبیاء کرام علیہم السلام ہر وقت حتیٰ کہ نیند کی حالت میں بھی مشاہدہ حق میں مشغول رہتے ہیں۔یہ مشاہدہ ان کی فطرت میں اس طرح رچ بس جاتا ہے جیسے کوئی پرندہ کسی ایک مقام پر نہیں ٹھہرتا بلکہ ایک ٹہنی سے دوسری ٹہنی پر منتقل ہوتا رہتا ہے۔کبھی ایک درخت سے دوسرے درخت پر منتقل ہوتا ہے کبھی زمین پر اتر جاتا ہے اور کبھی آسمان میں پرواز شروع کر دیتا ہے بالکل اسی طرح انبیاء کرام علیہم السلام کو کسی وقت زمین اور آسمان میں مشاہدہ نصیب ہوتا ہے کبھی سورج' چاند یا ستاروں میں مشاہدہ نصیب ہوتا ہے جب وہ ان مظاہر کی طرف دیکھتے ہیں تو انہیں ان کے

خالق کی عظمت شان کا مشاہدہ نصیب ہوتا ہے جس کی کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی۔ جب اسی مشاہدے کے دوران اللہ تعالیٰ انہیں کسی نامانوس حکم کی اطلاع دینا چاہتا ہے تو وہی چیز انہیں ان مظاہر میں دکھادی جاتی ہے جن میں وہ اللہ تعالیٰ کے افعال کا مشاہدہ کر رہے ہوتے ہیں۔ بالکل یہی معاملہ حضرت یوسف علیہ السلام کے خواب کے ساتھ پیش آیا کہ نیند کی حالت میں وہ سورج' چاند اور گیارہ ستاروں میں اللہ تعالیٰ کے افعال کا مشاہدہ کر رہے تھے کیونکہ اس وقت ان کی روح آسمان کی طرف بلند ہوئی تھی اور اسی دوران انہیں یہ مشاہدہ نصیب ہوا تھا کہ اسی دوران اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ فرمایا کہ انہیں ان کے والدین اور بھائیوں کے سجدے کی اطلاع دے تو یہ سجدہ انہیں ان مظاہر کی شکل میں دکھادیا گیا جن کے مشاہدے میں وہ مشغول تھے تاکہ حضرت یوسف علیہ السلام کا باطن اپنے مشاہدے میں مشغول رہے اور ان کی توجہ کسی اور چیز کی جانب مبذول نہ ہو سکے۔ کچھ اسی طرح کی صورتحال حضرت ابراہیم علیہ السلام کو در پیش ہوئی۔ جب انہوں نے بیٹے کی شکل میں حاصل ہونے والی اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت پر غور شروع کیا تو اسی دوران اللہ تعالیٰ نے انہیں دنبے کی قربانی کی اطلاع دی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے مشاہدے کے مظہر یعنی اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اسی نوعیت کی صورتحال دیگر انبیاء کے خوابوں میں پیش آئی ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب

عام خواب کی دوسری قسم

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) خواب کی اس قسم کا تعلق ادراک کے ساتھ تھا جبکہ خواب کی دوسری قسم وہ ہے جو محض خیال کی حیثیت رکھتے ہیں' ایک مرتبہ میں نے سیّدی دباغ سے اس کے بارے میں دریافت کیا: تو آپ نے جواب دیا: خواب میں انتشار کا بنیادی سبب خیالات کا انتشار ہوتا ہے اور خیالات کے انتشار کا بنیادی سبب ایک غیبی امر ہے۔ میں نے دریافت کیا: وہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ انسان کے ذہن میں اللہ تعالیٰ کا فعل ہے چونکہ موت کے آنے تک' خواب یا بیداری' ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کے فعل کا تعلق انسان کے ذہن کے ساتھ باقی رہتا ہے۔ انسان کے ذہن میں پیدا ہونے والی ہر سوچ اللہ تعالیٰ کے فعل کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کوئی خاص کام پورا کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا انسان کے ذہن میں کبھی ایک خیال پیدا ہوتا ہے اور کبھی دوسرا خیال پیدا ہوتا ہے اور کبھی تیسرا خیال پیدا ہوتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرما لے یا کسی بندے کو بھلائی کی تعلیم دینا چاہے تو اس کے ذہن میں مثبت خیالات پیدا ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کی برائی منظور ہو تو اس کے ذہن میں منفی خیالات پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس پر فضل کرنا چاہے تو اس کے ذہن میں دوبارہ مثبت خیالات پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں اور انسان بھلائی کے راستے پر گامزن ہو جاتا ہے۔ لہٰذا انسان کا ہر عمل اس کی سوچ کے تابع ہے اور سوچ ذہن کے تابع ہے اور ذہن اللہ تعالیٰ کے فعل کے تابع ہے۔

انسانی سوچ مشیت الٰہی کی تابع ہے

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: کیا اس حدیث کا یہی مفہوم ہوگا کہ انسان کا دل اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں (دست قدرت) کے درمیان موجود ہے' اللہ تعالیٰ اسے جس طرف چاہے پھیر سکتا ہے؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: ہاں! یہ سن کر مجھ پر شدید ہیبت طاری ہوگئی اور مجھے اندازہ ہوگیا کہ سوچ کی تبدیلی انتہائی موثر حیثیت رکھتی ہے نیز انسان کی خوش بختی یا بدبختی کا مدار بھی اس کی سوچ پر ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ ہماری سوچ کو اپنی رضا کے مطابق ڈھلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کے فعل کا اثر زیادہ سے زیادہ سات دن تک ظاہر ہو جاتا ہے خواہ وہ مثبت ہو یا منفی۔ کبھی اثر فوراً ظاہر ہوتا ہے اور کبھی ذرا تاخیر سے، لیکن اس کی زیادہ سے زیادہ مدت سات دن ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی پودے کا بیج ایک ہوتا ہے لیکن اس کا کچھ حصہ جلدی ظاہر ہو جاتا ہے اور کچھ حصہ ذرا تاخیر سے ظاہر ہوتا ہے۔ (قرآن کہتا ہے:)

فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ (المومنون ۲۳:۱۴)

''اللہ کی ذات بابرکت ہے جو سب سے بہترین خالق ہے۔''

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: جب یہ بات واضح ہوگئی کہ انسان کے تمام تر خیالات کی بنیاد ذہن میں موجود اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہے تو اب یہ بات سمجھ لیں کہ انسان کی دو حالتیں ہیں: نیند اور بیداری۔ بیداری کی حالت میں انسان پر جسمانی اثرات غالب ہوتے ہیں اور روح جسم کے تابع ہوتی ہے۔ اور جسمانی غلبے کا تقاضا یہ ہے کہ حقائق اشیاء سے جسم واقف نہیں ہوتا لہٰذا اگر بیداری کی حالت میں انسان کو حج کا خیال آئے تو اس خیال میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر آسمان، جنت یا دوزخ میں سے کسی ایک چیز کا خیال آئے تو اس کی پوری توجہ اسی چیز کی طرف مبذول ہو جائے گی۔ لیکن نیند کی حالت میں حواس معطل ہو جاتے ہیں۔ اعضاء پرسکون ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا فعل انسان کی نیند کی حالت میں بھی جاری رہتا ہے۔ لہٰذا ایسی حالت میں جب انسان کے ذہن میں کسی چیز کا خیال آتا ہے اور روح اس کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو ایسی حالت میں کیونکہ جسم کا حکم منقطع ہو چکا ہوتا ہے اور روح پیدائشی طور پر ہر چیز سے واقف ہوتی ہے تو جب روح خیال کے تحت کسی چیز کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو اس چیز کا اسی طرح ادراک کر لیتی ہے جیسے انسان آنکھ کی مدد سے کوئی چیز دیکھتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص نیند کی حالت میں اپنے آپ کو آسمان پر یا حج میں مصروف یا کسی مخصوص مقام پر موجود دیکھے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کے ذہن میں پہلے یہ خیال پیدا ہوا اور پھر روح نے اس خیال کا پیچھا کرتے ہوئے اس مخصوص مقام تک پہنچ کر اس کا ادراک کر لیا۔ جیسے انسان اگر ظاہری طور پر اس مخصوص مقام تک پہنچ جائے تو اس مقام کو دیکھ سکتا ہے۔

ادراک اور خیال کے درمیان فرق

خواب کی ان دونوں قسموں کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ اگر ادراک سے پہلے کسی چیز کا خیال ذہن میں آ جائے تو ایسے خواب کی کوئی تعبیر نہیں ہوگی' یہ صرف منتشر خیالات کا مجموعہ ہوگا۔ البتہ اگر ادراک سے پہلے کوئی خیال پیدا نہیں ہوتا بلکہ ذات یا روح کی توجہ کسی چیز کی طرف مبذول ہوتی ہے تو یہ خواب درست ہوگا اور اس کی تعبیر ممکن ہوگی۔ اس کی 20 قسمیں ہیں: جنہیں ہم سابقہ صفحات میں بیان کر چکے ہیں۔

خواب اور زیارت نبوی

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: اگر کوئی شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھ لے تو اس کی دو صورتیں ہوں گی۔ پہلی صورت یہ ہوگی کہ خواب کی کوئی تعبیر نہ ہو اور یہ اس وقت ممکن ہوگا جب وہ شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی ظاہری حلیے کی زیارت کرے جس میں صحابہ کرام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف حاصل کیا کرتے تھے۔ اور اگر خواب دیکھنے والا صاحب فتح وکشف ہو تو اس کا خواب مبنی برحقیقت ہوگا۔ لیکن اگر وہ صاحب فتح وکشف نہیں ہے تو بہت کم ایسا ہوتا ہے۔ کبھی انسان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کی صورت دکھائی جاتی ہے' ذات اقدس نہیں دکھائی جاتی، عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کی بہت سی صورتیں (شاید سیّدی دباغ کی مراد جسم مثالی ہے، مترجم) ہیں جو مختلف مقامات پر نیند یا بیداری کی حالت میں دکھائی دیتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نور مبارک کائنات میں ہر جگہ موجود ہے اور کائنات کا کوئی ایک گوشہ بھی اس سے خالی نہیں ہے۔ اور اسی نور میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ظاہر ہوتی ہے بالکل اسی طرح جیسے آئینے میں کسی چہرے کی شبیہہ ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نور مبارک آئینے کی مانند ہے جو کائنات کے ہر حصے میں موجود ہے۔ اور اسی آئینے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شبیہیں دکھائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی وقت میں بیسیوں لوگ دنیا کے مختلف کونوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے فیضیاب ہوتے ہیں اور ہر ایک کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود اپنے قریب محسوس ہوتا ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نور مبارک ہر جگہ موجود ہے۔ جب کوئی صاحب فتح ولی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شبیہہ کی زیارت کرتا ہے تو اپنی باطنی بصیرت کی بدولت اس شبیہہ کی وساطت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس تک رسائی حاصل کر لیتا ہے بعض اوقات یہ نعمت کسی ایسے شخص کو بھی نصیب ہو جاتی ہے جو صاحب فتح نہ ہو۔ اس کی صورت یوں پیش آتی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کسی محب اور سچے عاشق کی دلجوئی کیلئے بنفس نفیس اس کے پاس تشریف لے آتے ہیں۔ گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا صوابدیدی اختیار ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جس پر چاہیں خاص شفقت فرمادیں۔

غیر معروف زیارت کا حکم

بعض اوقات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دوسری صورتوں میں بھی ظاہر ہوتے ہیں اور ان صورتوں کی تعداد انبیاء کرام کی تعداد کے برابر ہے بلکہ ان میں وہ صورتیں بھی شامل ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں قیامت تک آنے والے اولیاء کو عطا کی جائیں گی۔ اس لئے ان صورتوں کی صحیح تعداد کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ تاہم اس بارے میں مختلف اقوال منقول ہیں کیونکہ یہ تمام حضرات آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے فیض حاصل کرتے ہیں اس لئے بعض اوقات مریدین کو ان کے شیخ کی شکل میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوتی ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) ایک مرتبہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سیّدی عبدالعزیز دباغ کی شکل میں دیکھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھینچ کر اپنے باطن کا حصہ بنانا چاہا تو سیّدی دباغ نے فرمایا: یہ ایک ہی مرتبہ میں ممکن نہیں ہے بلکہ بتدریج ایسا ہوگا یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض بتدریج باطن کا حصہ بنے گا۔ (اگرچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس وقت سیّدی دباغ کی شکل میں موجود تھے) لیکن میں نے یہ الفاظ اس لئے سیّدی دباغ سے منسوب کئے ہیں کیونکہ وہ اس وقت ایک طرف موجود تھے اور جو شخصیت میرے بازوؤں کے حلقے میں تھی اس نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا اور میری طرف پسندیدہ انداز میں دیکھا۔ یہ میرا اپنا ذاتی تجربہ ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) خواب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی دوسری صورت وہ ہے جس میں تعبیر کی گنجائش موجود ہوتی ہے اور اس تعبیر کا تعلق خواب دیکھنے والے کے وجود میں موجود ظلمت کے ساتھ ہوتا ہے۔ نفس خواب کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا کیونکہ نفس خواب کی کوئی تعبیر نہیں ہوسکتی۔ اس لئے کہ یہ ایک طے شدہ اصول ہے کہ جس نے خواب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی زیارت کی۔ لہٰذا ہم اس شخص میں موجود ظلمت کے درجات کی طرف مختصراً اشارہ کریں گے۔

اگر کوئی شخص یہ خواب دیکھے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسے دنیا کے حصول کی ترغیب دے رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کے وجود کے اندر پہلے درجے کی ظلمت موجود ہے یعنی وہ لاشعوری طور پر مکروہ فعل کا مرتکب ہوتا ہے۔

اگر کوئی شخص یہ خواب دیکھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کچھ مال عطا کیا ہے تو اس شخص کی ظلمت دوسرے درجے کی ہوگی یعنی وہ لاشعوری طور پر کسی حرام فعل کا مرتکب ہوتا ہوگا۔ یہ ظلمت اس لئے زیادہ شدید ہے کیونکہ کسی فانی چیز کا عطا کرنا اس کی طرف رہنمائی کرنے کی بہ نسبت زیادہ شدید ہے۔

اگر کوئی شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی غیر صاف جگہ پر دیکھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کی ظلمت تیسرے درجے کی ہے یعنی وہ شعوری طور پر مکروہ فعل کا مرتکب ہوتا ہے۔

اگر کوئی شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کمسنی کی حالت میں دیکھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کی

ظلمت چوتھے درجے کی ہے یعنی وہ شعوری طور پر حرام فعل کا مرتکب ہوتا ہے۔

اگر کوئی شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے بزرگ شخص کی حالت میں دیکھے جس کی داڑھی موجود نہیں ہے تو خواب دیکھنے والے شخص کی ظلمت پانچویں درجے کی ہوگی یعنی وہ لاشعوری طور پر ''خفیف'' عقیدے کے برعکس عقیدے کا مالک ہوگا۔

اگر کوئی شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی حالت میں دیکھے کہ گویا رنگت سیاہ محسوس ہو تو ایسا شخص ظلمت کے چھٹے درجے پر فائز ہوگا یعنی وہ شعوری طور پر خفیف عقیدے کے برعکس عقیدے کا مالک ہوگا۔

تعبیر کے بنیادی اصول

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ خواب اور اس کے تمام تر عجائبات کا تعلق علم تعبیر کے ساتھ ہے یہ علم وہبی طور پر کسی شخص کو نصیب ہوجاتا ہے اور اس علم کو چھپانا واجب ہے۔ میں نے خود کئی مرتبہ سیّدی دباغ سے اپنے کسی خواب کی تعبیر دریافت کی تو آپ نے یہی جواب دیا کہ تم خواب کی تعبیر کے علاوہ ہر قسم کا سوال کرسکتے ہو۔ میں بھی عرصہ دراز تک اپنے سوال کو دہراتا رہا اور آپ ہر بار یہی جواب دیتے رہے۔ یہاں تک کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خواب کی تعبیر بیان کرنے والے واقعے کی وضاحت کرتے ہوئے آپ نے مذکورہ بالا تمام نکات بیان کئے جنہیں میں نے تحریری شکل میں محفوظ کرلیا۔ سیّدی دباغ نے اس مسئلے پر بھی بادل نخواستہ اظہار خیال کیا تھا آخر میں آپ نے فرمایا کہ خواب کیلئے تعبیر ضروری ہے اور آپ تعبیر کا فن سیکھ کر حاصل نہیں کرسکتے کیونکہ خواب کی تعبیر کا تعلق خواب دیکھنے والے شخص کی حالت کے ساتھ ہوتا ہے کہ وہ شہر میں رہتا ہے یا گاؤں کا رہنے والا ہے؟ صاحب علم ہے یا عام آدمی ہے؟ اس کا پیشہ کیا ہے؟ تجارت، صنعت وحرفت، سبزی فروشی؟ کیا وہ خوش حال ہے یا تنگ دست ہے؟ اور بھی بہت سے احوال ہیں جنہیں پیش نظر رکھنا ضروری ہے پھر اس بات کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے کہ خواب دیکھنے والے شخص کی باطنی کیفیت ہے؟ کیا اس کی روح اپنے تمام اجزاء یعنی 366 اجزاء کے ہمراہ اس کی ذات کو سیراب کرتی ہے؟ یا بعض اجزاء کے ذریعے اس کی ذات کو سیراب کرتی ہے؟ خواب دیکھنے والے شخص کی عقل کا معیار کیا ہے؟ اس کی عام سوچ اور خیالات کس قسم کے ہیں؟ یہاں تک کہ اگر علم تعبیر کے کسی ماہر کے پاس 100 افراد آکر یہ بات بیان کریں کہ ہم نے خواب میں شہد پیا ہے تو علم تعبیر کا وہ ماہر ہر شخص کو مختلف تعبیر بیان کرے گا کیونکہ تعبیر کا دارومدار ہر شخص کی ظاہری اور باطنی حالت پر ہوتا ہے اور کوئی سے دو افراد کی بھی ظاہری وباطنی حالت ایک جیسی نہیں ہوتی:

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے سیّدی دباغ سے احسان کا مفہوم دریافت کیا: جس کی تعریف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان کی ہے:

ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ۔ (صحیح بخاری، ۱:۲۷، رقم الحدیث: ۵۰)

''تم اللہ کی اس طرح عبادت کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو۔''

سیّدی دباغ نے احسان کے مفہوم کی وضاحت کے لئے ایک مثال بیان کی۔ فرض کرو ایک شخص کسی ویران مقام پر جا کر کسی ایسے مالدار شخص سے مدد مانگنا شروع کر دے جو وہاں موجود ہی نہیں اور یہ کہے: جناب! مجھے فلاں چیز عنایت کر دیجئے، مجھے فلاں چیز کی ضرورت ہے، میرا یہ کام کر دیجئے۔ تو اس عمل کو ہم سوال کی بجائے مسخرہ پن قرار دیں گے جسے دیکھ کر ہر شخص مسکرا دے گا۔ اب اگر وہ شخص یہ گمان کرے کہ یہی مسخرہ پن مدد مانگنے کی حقیقت ہے اور وہ (خیالی طور پر) اس مالدار شخص کے دروازے پر کھڑا اسے پکار رہا ہو تو اس کا یہ گمان صرف گمراہی ہوگی۔ لیکن اگر کوئی شخص براہ راست کسی غنی کے دروازے پر کھڑا ہو کر دست سوال دراز کرے تو اس کے ہر عضو اور حرکت سے عاجزی وانکساری کا اظہار ہوگا جس کے نتیجے میں وہ غنی شخص فوراً اس کی طرف متوجہ ہوگا اور اس کا سوال پورا کر دے گا۔ دیکھنے والا بظاہر یہ سمجھے گا کہ شاید غنی نے اس کے زبانی سوال کا لحاظ کرتے ہوئے اس کی مدد کی ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس غنی نے اس کی عاجزی وانکساری کے پیش نظر اس کی مدد کی ہے۔ ویسے بھی غنی کے سامنے موجود ہونے کی صورت میں اس سائل کی پوری توجہ غنی ہی کی طرف مبذول رہ سکتی ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے احسان کے جو دو مراتب بیان کئے ہیں ان کو اس مثال کے ذریعے با آسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری کے تصور سے عبادت کرے گا اس کی عبادت بہترین شمار ہوگی ورنہ دوسری صورت میں وہ صرف ایک رسم ادا کرے گا۔ کسی بھی عبادت کی خوبی کا اندازہ لگانے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اس عبادت کے دوران عبادت گزار کی باطنی کیفیت کا جائزہ لیا جائے۔ اگر اس کی توجہ دنیاوی امور کی طرف مبذول ہوگی تو اس کی مثال پہلے شخص کی مانند ہوگی اور اگر اس کا باطن مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو تو اس کی مثال دوسرے شخص کی مانند ہوگی۔

اسلام اور ایمان میں تقدیم و تاخیر

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے عرض کی: اس روایت کو نقل کرتے ہوئے امام بخاری اور مسلم نے تھوڑا سا اختلاف کیا ہے۔ بخاری نے پہلے ایمان، پھر اسلام اور پھر احسان کا تذکرہ کیا ہے جبکہ مسلم نے پہلے اسلام پھر ایمان اور پھر احسان کا ذکر کیا ہے؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: میرے نزدیک بخاری کی نقل کردہ روایت درست ہے کیونکہ اسلام، ایمان کا غلاف ہے۔ ایمان پہلے ہے اور اسلام بعد میں۔ میں نے عرض کی: لیکن قرآن کی درج ذیل آیت میں اسلام کو ایمان پر مقدم کیا گیا ہے۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ

(الحجرات ۴۹:۱۴)

اعرابی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں تم کہہ دو تم ایمان نہیں لائے تمہیں یہ کہنا چاہئے کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں کیونکہ ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔"

سیّدی دباغ نے جواب دیا: ہم اسلام کے حقیقی مفہوم کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں جس کا ذکر حدیث

جبریل میں کیا گیا ہے اور یہ اسلام، ایمان کے لئے غلاف کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور امام بخاری و امام مسلم کے درمیان اصطلاحی اعتبار سے اختلاف بھی اسی کے بارے میں ہے۔ جو شخص صرف زبانی طور پر ظاہری اعتبار سے اسلام کا دعویٰ کرتا ہے اسے کچھ بھی نصیب نہیں ہوتا۔ اس کی مثال بالکل اسی طرح ہے جیسے کوئی شخص کچھ لوگوں کو حقیقی نشانہ بازی کی مشق کرتا دیکھ کر خود بھی ان کی نقل کرنے لگے سب لوگوں کی گولیاں نشانوں پر لگیں گی لیکن اس کی خیالی بندوق، خیالی گولی اور خیالی نشانہ کا کچھ بھی نہیں بگڑے گا۔ یہ اس شخص کی مثال ہے جو صرف زبانی طور پر اسلام کا دعویٰ کرتا ہے ظاہری طور پر نمازیں ادا کرتا ہے، روزے رکھتا ہے، حج کرتا ہے، جہاد کرتا ہے لیکن اس کا باطن اس کے ہر عمل کی نفی کرتا ہے۔ اس کا ظاہر کہیں اور ہوتا ہے اور باطن کہیں اور ہوتا ہے۔ گویا یہ شخص جان بوجھ کر مسخری کر رہا ہے۔ بالکل یہی کیفیت منافقین کی ہوتی ہے وہ یہ جانتے ہیں کہ وہ درحقیقت مسلمان نہیں ہیں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) سیّدی دباغ نے سچ فرمایا ہے، قرآن منافقین کی دوغلی پالیسی کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے:

وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ (البقرۃ ۲:۱۴)

''اور جب وہ شیاطین کے پاس تنہا ہوتے ہیں تو انہیں یہ دلاسہ دیتے ہیں کہ ہم درحقیقت تمہارے ساتھ ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ تو ہم صرف مسخری کر رہے ہیں۔''

لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان منافقین کے ناپاک ارادوں اور منفی خواہشات کا راز فاش کر کے انہیں ذلت و رسوائی کا شکار کر دیا۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) پہلے میں یہ سمجھتا تھا کہ شاید منافقین نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد وغیرہ پوری نیک نیتی سے ادا کرتے تھے اور انہیں صرف ان کے باطنی کفر کی وجہ سے مردود قرار دیا گیا ہے۔ لیکن پھر سیّدی دباغ کی بیان کردہ (خیالی نشانہ بازی والی) مثال سن کر مجھے پتہ چل گیا کہ انہیں بدترین کافر کیوں قرار دیا گیا ہے؟

قرآن بھولنے سے مراد کیا ہے؟

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے سیّدی دباغ سے اس حدیث کا مفہوم دریافت کیا جو حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے حوالے سے منقول ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

نظرت فی ذنوب امتی فلم ار ذنبا اعظم من آیة اوتیها رجل فنسیها۔

''جب میں نے اپنی امت کے گناہوں کی طرف دیکھا تو ان میں سب سے بڑا گناہ یہ تھا کہ کوئی شخص قرآن کی ایک آیت کو یاد کرنے کے بعد اسے بھول جائے۔''

میں نے عرض کیا: امام ترمذی نے امام بخاری کے حوالے سے اس حدیث کو غیر مستند قرار دیا ہے اور امام احمد بن حنبل بھی اس روایت کے بارے میں یہی رائے رکھتے ہیں۔ ان تینوں ائمہ کرام کی آراء کو امام ابو محمد بن عبدالحق نے ''الاحکام الکبریٰ'' میں۔ حافظ ابن حجر نے ''فتح الباری'' میں اور شیخ عبدالرؤف المناوی نے ''شرح الجامع

الصغیر'' میں نقل کیا ہے۔ سیّدی دباغ نے جواب دیا: یہ حدیث درست ہے اور اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نور مبارک موجود ہے لیکن اس سے مراد وہ لوگ نہیں ہیں جو قرآن کی کسی ایک آیت کو یاد کرنے کے بعد اس کے الفاظ بھول جائیں اگرچہ وہ آیت میں موجود حکم پر عمل پیرا ہوں۔ یہ روایت ان لوگوں کے بارے میں ہے جن کے سامنے قرآن کا پیغام پیش کیا جائے اور وہ اسے کوئی اہمیت نہ دیں اور اس سے منہ موڑ لیں۔ قرآن کے نور کی بجائے کفر کی تاریکی کو اختیار کر لیں۔ حق کو چھوڑ کر گمراہی کی پیروی شروع کر دیں اور دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے دور ہو جائیں۔ عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ کیفیت منافقین کی تھی۔ لہٰذا اس روایت کے مصداق منافقین ہیں کیونکہ ان کا شمار امت محمدیہ کے اس خاص طبقے میں ہوتا تھا جس نے (ظاہری طور پر) اسلام قبول کر لیا تھا اور ایسے افراد کے لئے نفاق سب سے بڑا گناہ ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: قرآن کے جس نور کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے، اس سے مراد کون سا نور ہے؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: اس میں تین طریقے کے انوار پائے جاتے ہیں: پہلا نور اللہ تعالیٰ کی ذات (پر ایمان) کی طرف رہنمائی کرتا ہے، دوسرا نور ان آیات پر عمل کرنے کی ترغیب دیتا ہے جن میں کوئی کام کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور تیسرا نور ان کاموں سے باز رہنے کی ترغیب دیتا ہے جنہیں ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا جب کوئی شخص اپنے باطن میں ان انوار کو داخل نہ ہونے دے حالانکہ ظاہری طور پر وہ قرآن کی تلاوت سنتا بھی ہو تو ایسا شخص ہی اس حدیث کا مصداق ہوگا۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: یہ روایت قرآن کے ظاہری الفاظ کو یاد کر کے بھلا دینے پر بھی صادق آتی ہے اور قرآن کے معانی و احکام پر عمل پیرا ہونے پر بھی صادق آتی ہے۔ اس دوسری قسم میں تین طرح کے انوار پائے جاتے ہیں اور اس حدیث کا مصداق یہی دوسری قسم ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: مومن کیلئے قرآن کی آیت ایک ایسی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے جس میں اس کے لئے حق موجود ہے اور کوئی بھی حقدار اپنے حق سے متعلق دستاویز کو ضائع نہیں ہونے دیتا کیونکہ اگر وہ اسے ضائع کر دے گا تو اس کا حق بھی ضائع ہو جائے گا۔ اسی لئے ہر مومن قرآن کی آیات کو یاد کرتا ہے ان پر عمل کرتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کا حق محفوظ ہو جائے جس کے نتیجے میں اسے جنت میں داخل ہونے کی اجازت مل جائے لیکن اگر کوئی شخص قرآن کی آیات پر عمل نہیں کرتا یا انہیں بیکار سمجھتے ہوئے استہزاء کے طور پر ان سے منہ موڑ لیتا ہے تو ایسا شخص نہایت گنہگار ہوگا اور مذکورہ بالا حدیث میں ایسے ہی شخص کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

جنت اور دوزخ کا مکالمہ

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے سیّدی دباغ سے درج ذیل حدیث کا مفہوم دریافت کیا

تحاجت الجنة والنار فقالت النار امرت بالتكبرين وقالت الجنة مالي لا يد خلني

الاضعفاء الناس و سقطهم

''جنت اور دوزخ کے درمیان یہ گفتگو ہوئی، دوزخ نے کہا مجھے متکبر لوگوں پر مامور کیا گیا ہے، جنت کہنے لگی، جبکہ میرے اندر صرف کمزور اور بظاہر نچلے طبقے کے لوگ داخل ہوں گے۔''

میں نے عرض کیا: اس طرح گویا جنت نے دوزخ کے غالب ہونے کا اعتراف کر لیا ہے کیونکہ اسے متکبرین کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے جبکہ جنت کے حصے میں کمزور اور نادار لوگ آئیں گے؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: آخرت میں مکان ہی مکینوں کا اثر قبول کریں گے کیونکہ جہنم میں اکثریت متکبرین کی ہوگی اس لئے جہنم میں بھی تھوڑے سے تکبر کے آثار پیدا ہو جائیں گے اور جنت میں اکثریت متواضع اور منکسر المزاج لوگوں کی ہوگی اس لئے اس کا اثر جنت پر بھی پڑے گا۔ لہٰذا بظاہر جنت اور دوزخ کی تکرار کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ ان کے اندر رہنے والوں کا طبعی رجحان کیا ہوگا۔ اگر باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو جنت غالب آ گئی کیونکہ جنت کے کلام کا مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عاجزی و انکساری کرتے ہیں وہ اس میں داخل ہوں گے، جبکہ جہنم کے کلام کا مفہوم یہ تھا کہ میرے اندر صرف متکبر، جابر، اپنے پروردگار سے جاہل، اپنے پروردگار کی بارگاہ سے مردود شدہ لوگ داخل ہوں گے۔ گویا جنت کے کلام کا مفہوم یہ ہے کہ میرے اندر اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ لوگ داخل ہوں گے اور دوزخ کے کلام کا مفہوم یہ ہے کہ میرے اندر وہ لوگ داخل ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کے دشمن ہیں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: پہاڑ سے چھلانگ لگانے کا مطلب صریح خودکشی ہے جو ایک کبیرہ گناہ ہے اور خودکشی کا پختہ ارادہ کر لینا بھی گناہ ہے جبکہ تمام انبیاء کرام بالخصوص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بعثت سے پہلے بھی اور بعد میں بھی گناہ کے صدور سے معصوم ہوتے ہیں؟

سیّدی دباغ نے جواب دیا: میں ایک ایسے شخص سے واقف ہوں جس نے سلوک کے ابتدائی ایام میں ایک مرتبہ اپنے گھر کی چھت سے، ایک ہی دن میں 90 مرتبہ چھلانگ لگائی اور اس کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ بستر پر آرام سے لیٹا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتدائی کیفیت میں جسم پر روح کا غلبہ ہوتا ہے اور روح کے لئے ساری کائنات یکساں حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں تک کہ روح ہوا میں اسی طرح بیٹھ یا لیٹ سکتی ہے جیسے جسم زمین پر بیٹھ یا لیٹ سکتا ہے۔ روح کے لئے پتھر، ریشم، اون اور پانی کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے لہٰذا اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پہاڑ سے نیچے چھلانگ لگا بھی دیتے تو ہلاک ہونا تو بہت دور کی بات ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہلکی سی بھی خراش نہ آتی۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارادے پر کوئی حرف لازم نہیں آتا۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے خود صاحب حال لوگوں کو دیکھا ہے کہ وجد کے عالم میں وہ اپنا سر دیوار سے ٹکراتے ہیں لیکن انہیں کوئی خراش نہیں آتی۔ میں نے بھی اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنے آپ کو 90 مرتبہ گھر کی چھت سے نیچے گرایا تھا کیونکہ وہ سیّدی دباغ ہی تھے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: صاحبانِ حال یہ بات جانتے ہیں کہ ایسے کسی عمل کے نتیجے میں انہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی اور نہ ہی ان کا اضطراب دور ہوگا لیکن وہ لاشعوری طور پر یہ عمل کر گزرتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے کوئی سخت کام کرتے وقت انسان کے منہ سے ہلکی سی کراہ برآمد ہوتی ہے۔ انسان جانتا ہے کہ اس کراہ کا کوئی فائدہ نقصان نہیں ہے پھر بھی فطری تقاضے کے مطابق یہ اس کے منہ سے خارج ہو جاتی ہے۔

دیدارِ الٰہی

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے درج ذیل حدیث کا مفہوم دریافت کیا:

ان الله تعالٰی یاتی للمومنین فی الموقف فی صورة لا یعرفونها فیستعیذون بالله منه ویقولون هذا مکاننا حتی یاتینا ربنا فاذا جاء نا عرفناه فیاتیهم ربهم فی صورة یعرفونها فیخرون له سجدا

''قیامت کے دن اللہ تعالٰی اہل ایمان کے سامنے ایک نامانوس صورت میں جلوہ گر ہوگا تو وہ اس صورت سے اللہ تعالٰی کی پناہ طلب کریں گے اور یہ کہیں گے کہ ہم اس وقت تک اپنی جگہ سے نہیں ہلیں گے جب تک ہمیں اپنے پروردگار کا دیدار نصیب نہیں ہو جاتا۔ پھر اللہ تعالٰی ان کے سامنے مانوس صورت میں اپنا جلوہ ظاہر فرمائے گا تو وہ سجدے میں گر جائیں گے۔''

(احمد بن مبارک نے دریافت کیا) پہلی اور دوسری صورت سے مراد کیا ہے کیونکہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے امام فخر الدین رازی کو یہ تحریر کیا تھا کہ اس بات سے صرف اولیاء کرام ہی واقف ہو سکتے ہیں؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: صورت سے مراد حالت ہے اور دونوں صورتوں سے مراد اللہ تعالٰی (کی تجلی) کی دو حالتیں ہیں۔ پہلی حالت سے مومنین مانوس نہیں ہوں گے اور دوسری حالت سے مومنین اللہ تعالٰی کو پہچان جائیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنے دوست کے ساتھ کلام کرتا ہے تو فطری طور پر اس کے لہجے میں نرمی اور گداز موجود ہوتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنے دشمن سے مخاطب ہو تو اس کے لہجے سے نرمی رخصت ہو جاتی ہے اور خشونت ٹپکنے لگتی ہے۔ پہلی حالت میں اللہ تعالٰی ساری مخلوق کو خطاب کرے گا جس میں اہل ایمان، کفار، منافقین سب شامل ہوں گے اس لئے اس کلام میں نرمی اور مہربانی کے انوار موجود نہیں ہوں گے کیونکہ اہل ایمان کی ارواح نرمی کے اس نور سے واقف ہیں اس لئے وہ سخت کلام سے مانوس نہیں ہو سکیں گے اور اس سختی سے اللہ تعالٰی کی پناہ طلب کریں گے کیونکہ اہل ایمان کی ارواح اللہ تعالٰی کی شان رحمت سے واقف اور مانوس ہوتی ہیں پھر اللہ تعالٰی صرف اہل ایمان سے خطاب کرے گا جس میں رحمت اور نرمی کے انوار موجود ہوں گے اور چونکہ اہل ایمان کی ارواح ان انوار سے مانوس ہوں گی اس لئے وہ اپنے پروردگار کو پہچان کر سر بسجود ہو جائیں گے۔ لہٰذا دونوں حالتوں کے درمیان فرق صرف رحمتِ خصوصی کے انوار کی موجودگی یا عدم موجودگی کا ہوگا کیونکہ پہلی حالت میں ساری مخلوق سے خطاب کے باعث غضب کا رنگ غالب ہوگا اور دوسرا خطاب اہل ایمان کے ساتھ مخصوص

ہونے کے باعث خاص رحمت کی شکل میں ہوگا اور اہل ایمان اس خاص رنگ کی بدولت اپنے پروردگار کو پہچان جائیں گے کیونکہ وہ اس رحمت کے انوار کو اپنے ظاہر اور باطن میں ضوفگن دیکھنے کے عادی ہوں گے۔

(احمد بن مبارک نے دریافت کیا) پہلی حالت میں جو اہل ایمان اللہ تعالیٰ کو نہیں پہچان سکیں گے ان سے مراد کون لوگ ہیں؟ تمام اہل ایمان یا صرف عام اہل ایمان؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: اس سے مراد عام اہل ایمان ہیں کیونکہ صاحب معرفت لوگ اپنے پروردگار کو ہر حالت میں پہچان جاتے ہیں۔ میں نے دریافت کیا: کیا پہلا خطاب سب لوگوں سے ہوگا یا اس کا مخاطب صرف عام لوگ ہوں گے؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: اس کا مخاطب عام لوگ ہوں گے، کیونکہ قیامت کے دن کے احوال و کیفیات مختلف ہوں گی یہاں تک کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی گود میں سر رکھ کر لیٹا ہوا ہو اور اللہ تعالیٰ اس سے کوئی خطاب کرے تو صرف وہی اس خطاب کو سن سکے گا۔ دوسرا شخص اس سے واقف نہیں ہو سکے گا یعنی قیامت کے دن جس شخص کو مخاطب کیا جائے گا صرف وہی خطاب کو سن سکے گا کوئی دوسرا شخص خواہ کتنا ہی نزدیک کیوں نہ کھڑا ہو اس خطاب کو سن نہیں سکے گا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) شیخ اکبر ابن عربی نے بھی اپنے مذکورہ بالا خط میں یہی بات تحریر کی ہے کہ قیامت کے دن عام لوگ پہلی حالت میں اللہ تعالیٰ کو نہیں پہچان سکیں گے جبکہ صاحبان معرفت اپنے پروردگار کو پہچان لیں گے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) سیّدی دباغ نے نہایت خوبصورت جواب عنایت کیا ہے جس پر کوئی اعتراض بھی وارد نہیں ہو سکتا اور یہ اللہ تعالیٰ کی شان کے بھی لائق ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ آنے جانے سے پاک ہے۔ امام شعرانی نے اپنی تصنیف ''کشف الران'' میں اس حدیث کی جو تشریح بیان کی ہے اس پر کچھ اشکالات وارد ہو سکتے ہیں اس لئے قارئین کو اس کے مطالعے سے پرہیز کرنا چاہئے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے حافظ شیخ ابن فورک کے حوالے سے اس روایت کا تقریباً وہی مفہوم بیان کیا ہے جو سیّدی دباغ نے بیان کیا ہے۔ اگر آپ شیخ ابن فورک کے کلام کا مطالعہ کریں تو سیّدی دباغ کی عظمت شان کا اندازہ کر سکیں گے۔

انسانی سوچ مشیت الٰہی کی تابع ہے

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے درج ذیل حدیث کا مفہوم دریافت کیا:

ان قلب العبد بين اصبعين من اصابع الرحمان

''انسان کا دل، اللہ کی دو انگلیوں کے درمیان ہے (یعنی اس کی مشیت کے تابع ہے)۔''

سیّدی دباغ نے جواب دیا: یہاں انگلی سے مراد معنوی انگلی یعنی تصرف کی صلاحیت ہے۔ اور روایت کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کا ذہن اللہ تعالیٰ کے دو قسم کے تصرفات کے تابع ہے۔ میں نے دریافت کیا: ان دو تصرفات سے کیا مراد ہے؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: ایک وہ جو جسم کے لئے ہے اور دوسرا وہ جو روح کے لئے ہے۔ کیونکہ جسم مٹی سے بنا ہے اس لئے یہ فطری طور پر خواہشات کی طرف مائل ہوتا ہے جبکہ روح کو نور سے پیدا کیا گیا ہے اور یہ فطری طور پر معرفت کی طرف مائل ہوتی ہے اس لئے ان دونوں کے درمیان ہمیشہ مقابلہ جاری

رہتا ہے۔ میں نے دریافت کیا: ان دونوں میں سے غلبہ کسے حاصل ہے؟ آپ نے فرمایا: روح کا تصرف حرکات سے متعلق ہے اور ذات کا تصرف اسرار سے متعلق ہے۔ لہٰذا حرکت کے اعتبار سے روح غالب رہتی ہے اور خبیث "سِرّ" کے اعتبار سے جسم غالب رہتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے بہت کم لوگ شکرگزار ہوتے ہیں۔ ان دونوں کی مثال چکی کے پاٹ کی مانند ہے۔ روح اس پاٹ کا اوپری حصہ ہے اور جسم اس پاٹ کا نچلا حصہ ہے۔ چکی میں حرکت اوپر والے حصے کے باعث پیدا ہوتی ہے اور نچلا حصہ اپنا کام سرانجام دیتا ہے۔ ان کی مثال دیگچی کی شکل میں بھی دی جاسکتی ہے جس کا ظاہری اور باطنی ہر ایک حصہ دوسرے کی مدد کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہر قسم کی بدبختی سے محفوظ رکھے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) علماء کرام نے اس حدیث کا یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ دو قسم کے تصرف سے مراد شیطان اور فرشتے کا برائی یا نیکی کی ترغیب دینا ہے۔ سیّدی دباغ نے جواب دیا: شیطان یا فرشتہ عارضی و ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ ہر پاک یا ناپاک وجود میں خیالات پائے جاتے ہیں اور انہی خیالات کے نتیجے میں انسان کامیاب یا ناکام ہوتا ہے۔ شیطان اور فرشتہ انہی خیالات کے تابع ہیں۔ اگر انسان کے خیالات مثبت ہوں گے تو یہ فرشتہ اس کی مدد کرے گا اور اس کی خواہشات کو پورا کرے گا لیکن اگر خیالات منفی ہوں گے تو اس شخص پر شیطان کا اثر غالب ہوگا اور وہ گناہوں کی طرف مائل ہو جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سوچ وجود کا "سِرّ" ہوتی ہے اگر وہ پاک ہوگی تو وجود بھی پاک ہوگا۔ ہم اس بات کو ایک عام فہم مثال کے ذریعے یوں بیان کر سکتے ہیں کہ آپ جو، چنا اور لوبیا لے کر انہیں پیس کر پکالیں تینوں کی بھاپ (خوشبو) ایک دوسرے سے مختلف ہوگی۔ یہی حال سوچ اور جسم کا ہے کہ انسان کی نجات اور تباہی کا دارومدار اس کی سوچ پر ہے اور فرشتہ یا شیطان اس کی سوچ کے تابع ہیں یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات انسان کی سوچ اسے اعلیٰ علیین تک پہنچا دیتی ہے اور کبھی اسفل سافلین میں پھینک دیتی ہے۔ اچھی سوچ روح کا مقتضاء ہے جس کے نتیجے میں انسان پر پاکیزگی کا غلبہ ہو جاتا ہے اور منفی سوچ جسم کا مقتضاء ہے جس کے نتیجے میں انسان نفسانی خواہشات کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

حجر اسود دستِ الٰہی ہے

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے سیّدی دباغ سے درج ذیل حدیث کا مفہوم دریافت کیا:

الحجر الاسود یمین اللّٰہ فی الارض ۔(الدر المنثور ۱: ۳۲۴)

"حجر اسود زمین پر اللہ کا دایاں ہاتھ ہے۔"

سیّدی دباغ نے جواب دیا: یہاں ایک تشبیہ بیان کی گئی ہے جو شخص کسی بادشاہ کی پناہ حاصل کرنا چاہے وہ اس کے دائیں ہاتھ کو بوسہ دیتا ہے اسی طرح جو شخص اللہ کی پناہ لینا چاہے اسے حجر اسود کو بوسہ دینا چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حجر اسود کی وہی حیثیت ہے جو بادشاہ کے دائیں ہاتھ کو حاصل ہوتی ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) بالکل یہی تاویل امام غزالی نے اپنی تصنیف "التفرقہ" میں تحریر کی ہے۔

موت کو ذبح کر دیا جائے گا

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے درج ذیل حدیث کا مفہوم دریافت کیا:

یوتی بالموت فی صورۃ کبش ثم یذبح ۔(السنن الکبریٰ للنسائی ۶:۲۹۳)

''موت کو ایک دنبے کی شکل میں لا کر ذبح کر دیا جائے گا۔''

سیّدی دباغ نے جواب دیا: یہ روایت درست ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی ارشاد فرمایا تھا: اس سے مراد ایک فرشتہ ہے جسے دنبے کی شکل میں ذبح کر دیا جائے گا تا کہ اہل جنت کی نعمتوں اور اہل دوزخ کے عذاب میں اضافہ کیا جا سکے۔ اور فرشتوں کے لئے یہ بات ایک بہت بڑی نعمت کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ وہ اکثر سجدے کی حالت میں یہ دعا کرتے رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے نیک بندوں کے لئے نعمت کے حصول کا سبب بنائے اور کوئی فرشتہ ہی کسی بندہ مومن کی عظمت سے واقف ہو سکتا ہے۔ ہم نے اس حدیث کی تشریح اس لئے بیان کی ہے کہ موت کا مطلب دو دوستوں کا جدا ہو جانا ہے۔ اس کے بعد جسم مٹی میں مل جاتا ہے اور روح عالم برزخ کی طرف پرواز کر جاتی ہے۔ لہٰذا حدیث کا مفہوم یہ ہو گا اس واقعے کے بعد جسم اور روح کبھی جدا نہیں ہو سکیں گے کیونکہ فرشتے کا دنبے کی شکل میں ذبح ہونا روحانی بصیرت کے اعتبار سے دکھائی دے رہا ہے۔ اس لئے حدیث کا یہی مفہوم مراد ہو گا اس کی وجہ یہ ہے کہ جنت میں داخل ہونے کے بعد اہل جنت دنیاوی تکالیف کا ذکر کریں گے جن میں موت کی تکلیف کا ذکر غالب ہو گا اس لئے اللہ تعالیٰ انہیں خوش کرنے کے لئے موت کو دنبے کی شکل میں ذبح کر دے گا۔

نباتات و جمادات کی تسبیح

ایک مرتبہ سیّدی دباغ نے ان روایات کی تشریح کی جن میں کنکریوں کا تسبیح کرنا، کھجور کے تنے کا رونا، پتھروں کا سلام کرنا، درختوں کا سجدے کرنا، اور اسی طرح کے دیگر معجزات کا بیان ہے۔ آپ نے فرمایا: یہ معمولات ان سب میں ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پروردگار سے صرف یہ دعا کی تھی کہ حاضرین کے سامنے سے پردہ ہٹا دیا جائے تا کہ وہ ان کی تسبیح اور کلام کو سن لیں۔ میں نے دریافت کیا: کیا ان کے اندر بھی زندگی اور روح موجود ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں، لیکن اگر کسی بھی جاندار یا بے جان مخلوق سے اس کے خالق کے بارے میں دریافت کیا جائے تو وہ واضح طور پر بیان کرے گی کہ ہمارا خالق اللہ ہے۔ جاندار اور بے جان کی نسبت مخلوق کے اعتبار سے ہے ورنہ خالق کے اعتبار سے کائنات کا ذرّہ ذرّہ اپنے پروردگار سے واقف ہے۔ اس کی عبادت کرتا ہے اور اس کے لئے خشوع و خضوع کا احساس رکھتا ہے۔ یاد رکھو! جمادات کے دو پہلو ہیں ایک کا تعلق خالق کی ذات سے ہے اور اس اعتبار سے تمام جمادات اپنے خالق سے آگاہ ہیں اس کے مطیع و عبادت گزار ہیں۔ جبکہ دوسرے پہلو کا تعلق مخلوق کے ساتھ ہے اس اعتبار سے انہیں کوئی علم یا شعور حاصل

نہیں ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی دعا کی تھی کہ حاضرین کے سامنے جمادات کا وہ پہلو ظاہر ہو جائے جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہے۔ اسی لئے قرآن کہتا ہے:

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ۔ (بنی اسرائیل ۱۷:۴۴)

''ہر چیز اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہے۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے سیّدی دباغ سے اس واقعے کے بارے میں دریافت کیا تھا جس کے مطابق ایک مرتبہ حضرت سیدنا داؤد علیہ السلام کو خیال آیا کہ وہ کثرت سے تسبیح پڑھتے ہیں۔ اس کے کچھ عرصے بعد آپ علیہ السلام نے ایک مینڈک کو دیکھا جو ساری زندگی تسبیح پڑھتا رہا تھا اور کبھی بھی خاموش نہیں ہوا تھا تو حضرت داؤد علیہ السلام کو احساس ہوا کہ اپنے جس عمل کو وہ بہت زیادہ تصور کر رہے تھے وہ درحقیقت بہت ہی کم ہے۔ سیّدی دباغ نے جواب دیا: سیدنا داؤد علیہ السلام نے مینڈک کے اس رخ کا مشاہدہ کیا تھا جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہے اور اس رخ میں (حیوانات و جمادات کی تسبیح) ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ اس میں کوئی انقطاع نہیں آتا۔

سیّدی دباغ کا ذاتی تجربہ

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اسی نوعیت کا ایک واقعہ سیّدی محمد لہواج، جو سیّدی دباغ کے شیوخ میں سے ہیں، کی معیت میں سیّدی دباغ کے ساتھ پیش آیا۔ آپ نے یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے اپنی عادت کے مطابق پہلے چند تمہیدی کلمات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: زمین کو ایک مخصوص علم عطا کیا گیا ہے جس سے زمین آگاہ ہے بالکل اسی طرح جیسے حافظ قرآن تمام آیات قرآنی سے آگاہ ہوتا ہے اسی طرح ہر ایک قسم کے جمادات نباتات وحیوانات) کو الگ الگ مخصوص علم عطا کیا گیا ہے اور ان میں سے ہر ایک اپنے مخصوص علم سے آگاہ ہے۔ میں نے دریافت کیا: اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ ان میں سے ہر ایک کو عقل اور علم حاصل ہے لیکن جمادات کو کس طرح عقل حاصل ہو سکتی ہے؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: جمادات ہمیں ساکن دکھائی دیتے ہیں ورنہ اپنے خالق کے ساتھ نسبت کے اعتبار سے ان میں سے ہر ایک عارف ہے۔ ہر قسم کی مخلوق ہر وقت اسی بات کے اعتراف میں مشغول رہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہمارا پروردگار ہے۔ ہر قسم کی مخلوق پر ہر وقت اللہ تعالیٰ کی ہیبت اور خوف کا غلبہ رہتا ہے۔ لیکن کیونکہ بیشتر انسان اس حقیقت سے واقف نہیں ہیں اس لئے وہ جمادات کو ایک بے جان چیز سمجھتے ہیں اور اسی لاعلمی نے انہیں تباہ کر دیا ہے۔ اگر لوگوں کو زمین کی حقیقت کا پتہ چل جائے تو کوئی بھی شخص کبھی بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی جرأت نہ کرے۔

ایک مرتبہ میں سیّدی محمد لہواج کے ہمراہ کہیں جا رہا تھا اس وقت مجھے فتح نصیب نہیں ہوئی تھی لیکن سیدی لہواج صاحبِ فتح بزرگ تھے۔ ہمارا ارادہ یہ تھا کہ ہم سیدی علی بن حرزہم کی درگاہ کے لئے وقف باغ میں سے کچھ کھجوریں حاصل کریں گے۔ جب ہم شہر فاس کے دروازے (باب الفتوح) سے باہر نکلے تو پاس ہی ایک

چشمہ موجود تھا۔ میں نے وہاں سے ایک کانٹا لے کر مچھلی کے شکار کے لئے چشمے میں ڈال دیا۔ سیّدی لہواج نے مجھے منع کیا لیکن میں اپنی بات پر مصر رہا۔ چنانچہ وہ بھی میرے ہمراہ چشمے کے کنارے تک آ گئے۔ اچانک چشمے کے پاس موجود ایک بڑے سے پتھر سے اللہ، اللہ کی آواز آنے لگی۔ ابھی میری توجہ اس پتھر کی طرف مبذول ہوئی تھی کہ ہر ایک پتھر سے اللہ، اللہ کی آواز آنے لگ پڑی پھر کانٹے میں پھنسی ہوئی مچھلی کے علاوہ وہاں موجود ہر چیز نے اللہ کا ذکر شروع کر دیا۔ اس کا بالواسطہ مفہوم یہی تھا کہ اے شکاری! کیا تو اللہ سے نہیں ڈرتا۔ (سیّدی دباغ فرماتے ہیں:) اس وقت مجھ پر اتنا شدید رعب طاری ہوا کہ میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اے کاش! مجھے رسی کے ساتھ باندھ کر کسی بلند مقام کی کنڈی کے ساتھ لٹکا دیا جائے لیکن اس خوف سے نجات مل جائے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: اس کی کیا وجہ تھی؟ آپ نے فرمایا: تم اس کی مثال یوں سمجھ سکتے ہو جیسے کسی شخص نے کبھی بیل نہ دیکھا ہو اور ایک دن اچانک اس کی آنکھ کھلے تو اسے اپنے سامنے بے شمار بیل موجود دکھائی دیں تو تم خود اندازہ کر سکتے ہو کہ اس شخص کی کیا کیفیت ہو گی؟ میں نے عرض کیا: اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک خرق عادت امر کے مشاہدے کے نتیجے میں یہ خوف طاری ہوا؟ آپ نے فرمایا: ہاں! ایسا ہی ہے۔ میں نے عرض کیا: آپ نے یہ خرق عادت کلام عربی زبان میں سنا تھا یا جمادات کی آواز میں سنا تھا؟ آپ نے فرمایا: جمادات کی زبان میں کیونکہ ابتدائی منازل میں اس نوعیت کا مشاہدہ کروایا جاتا ہے ورنہ بعد میں ہر ولی ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کے فعل کو جلوہ گر دیکھتا ہے تو اس وقت اس کے سامنے ساری مخلوق کی حیثیت، اس کے اپنے وجود سمیت، ایک برتن یا تصویر کی مانند ہوتی ہے۔ میں نے عرض کیا: اس مشاہدے کو صرف جمادات کے ساتھ مخصوص نہیں ہونا چاہئے بلکہ ساری مخلوق یہاں تک کہ اولاد آدم میں بھی یہ مشاہدہ دکھائی دینا چاہئے؟ آپ نے فرمایا: یہ مشاہدہ ہر ایک مخلوق میں دکھائی دیتا ہے۔ میں نے جو یہ کہا ہے کہ جمادات اپنے خالق کو پہچانتے ہیں اس حقیقت سے صرف وہی شخص واقف ہو سکتا ہے جو زمین و آسمان کی حدود سے اتنی دور چلا جائے کہ اسے روئے زمین ایک گیند کی مانند دکھائی دے پھر جب وہ اپنی روحانی نگاہ سے اس کی طرف دیکھے گا تو اسے ہر چیز کی حقیقت دکھائی دے گی۔ آج کل یہ صلاحیت، میرے اندازے کے مطابق، صرف تین حضرات کو حاصل ہے۔ ایسا شخص ہر قسم کی جمادات کو سجدے، قیام، یا رکوع کی حالت میں دیکھتا ہے۔ یہاں تک کہ سب سے پہلے اسے زمین ہی رکوع کی حالت میں جھکی ہوئی دکھائی دے گی۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: ایک دن میں سیّدی احمد الیمنی کی درگاہ کے قریب بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہاں موجود تمام پتھر اور درخت، اپنی ٹہنیوں اور پتوں سمیت اللہ کی تسبیح میں، اپنی اپنی زبان میں، مشغول ہیں۔ میرا جی چاہا کہ میں یہاں سے اٹھ کر بھاگ جاؤں اچانک مجھے ایک پتھر سے مختلف آوازیں آتی ہوئی سنائی دیں۔ میں نے غور سے دیکھا تو یہ پتھر مختلف پتھروں کا مجموعہ تھا اسی لئے اس میں سے مختلف آوازیں آ رہی تھیں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) یہ اس زمانے کے واقعات ہیں جب سیّدی عبدالعزیز دباغ کو ''فتح'' نصیب ہوئے زیادہ مدت نہیں گزری تھی۔ ایک مرتبہ آپ نے یہ بتایا کہ ایک بیل جب دوسرے بیل سے ملاقات کرتا ہے تو اسے سارے دن کی کارگزاری سناتا ہے کہ میں نے فلاں جگہ سے گھاس کھائی، فلاں مقام سے پانی پیا وغیرہ۔ غرضیکہ یہ ہماری ہی مانند، اپنی مخصوص زبان میں گفتگو کرتے ہیں لیکن ہمیں ان کی گفتگو سمجھ نہیں آتی۔ اسی طرح تمام حیوانات، جمادات، نباتات کی گفتگو ہم نہیں سمجھ سکتے لیکن جس شخص کو ''فتح'' نصیب ہو جائے وہ با آسانی ان کی گفتگو سن اور سمجھ سکتا ہے۔ صاحب فتح کو یہ علم روح کی مدد سے حاصل ہوتا ہے کیونکہ ہر روح کسی بھی کلام کی ادائیگی سے پہلے ہی اس کے تمام مقاصد واغراض کو جان جاتی ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک صاحب ''فتح'' عرب اور دوسرا عجمی ہوتا ہے اور دونوں اپنی اپنی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ (دباغ فرماتے ہیں) بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ میں رفع حاجت کے لئے بیت الخلا کی طرف جاتا ہوں اور پھر پانی کی تسبیح سن کر رفع حاجت کئے بغیر واپس آ جاتا ہوں۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) حرف علم کے اجزاء میں لغات کی معرفت اور حرف نبوت کے اجزاء میں ''خوف تام'' کے تحت ہم اس موضوع پر کچھ تحریر کر چکے ہیں۔

کلام الٰہی کی ہیبت وجلال

ایک مرتبہ میں نے سیّدی دباغ سے درج ذیل روایت کا مفہوم دریافت کیا: جو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے:

قالت بنو اسرائیل لموسی صف لنا كلام رب العزة و كيف سمعته ؟ قال ارايتم صوت الرعود و الصواعق القائلة لحينها في احلى حلاوة سمعت فذلك هو كلامه و قال موسى يا ربّ هل كلمتني بجميع كلامك ؟ فقال يا موسى انما كلمتك بقوة عشرة الآف لسان ولو كلمتك لجميع كلامي لذبت من حينك.

''بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں درخواست کی: اللہ کے کلام کی کیفیت کے بارے میں ہمیں بتائیں کہ آپ نے اسے کس طرح سنا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا: جیسے آسمانی بجلی کی گرجدار اور کڑکدار آواز انتہائی شیریں انداز میں سنائی دے۔ کچھ اسی کی مانند مجھے وہ کلام محسوس ہوا۔ (راوی کہتے ہیں) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا: کیا تو نے میرے ساتھ مکمل کلام کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: میں نے تمہارے ساتھ صرف 10,000 زبانوں کی قوت کے برابر کلام کیا ہے اگر میں مکمل قوت کے ہمراہ کلام کرتا تو تم فوت ہو جاتے۔''

سیّدی دباغ نے ارشاد فرمایا: بجلی کی گرج اور کڑک سے مراد خوف ہے جو انسان کو اس آواز کے سننے کے بعد لاحق ہوتا ہے اور اس خوف کی کیفیت کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ بالکل اسی طرح جو شخص اللہ تعالیٰ کا کلام سنتا ہے

اس کے سارے جسم بلکہ جسم کی ہر ایک رگ و ریشے میں یہ خوف سرایت کر جاتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال نہ ہو تو عین ممکن ہے کہ اس خوف کے باعث انسان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر جائے۔ اسی طرح اس کلام کی شیرینی کا مفہوم یہ ہے کہ یہ کلام سنتے وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بے شمار انعامات اور رحمتیں حاصل ہوئیں۔ یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جسم کے ہر ایک جز نے اس کلام کی لذت کو محسوس کیا۔ تاہم یہ بات یاد رکھو کہ یہاں آواز سے مراد وہ مفہوم نہیں ہے جو ہم اپنے عام محاورے میں مراد لیتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے پاک ہے اور 10,000 آوازوں کے سننے کا مفہوم یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک آواز کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے الگ الگ سنا۔ آئندہ صفحات میں ہم اس بات کا تذکرہ کریں گے کہ کسی بھی صاحب فتح ولی کے سامنے بے شمار آوازیں ایک دوسرے پر اثر انداز نہیں ہوتیں اور وہ ہر آواز کو الگ سے سن کر اس کا مفہوم اخذ کر لیتا ہے۔ اس لئے اگر بیک وقت 10,000 زبانیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوئی تھیں تو انہوں نے ان میں سے ہر ایک آواز کو کسی ترتیب، تقدیم یا تاخیر کے بغیر الگ الگ سن کر ان کا مفہوم سمجھ لیا۔ تاہم اس ساعت کا تعلق جسم کی بجائے روح کے ساتھ تھا کیونکہ روح کے علم میں کوئی ترتیب نہیں ہوتی یہی وجہ ہے کہ اگر روح کسی علم مثلاً نحو یا فقہ کی طرف متوجہ ہو تو اس کے تمام تر مسائل ایک ہی لمحے میں روح کے سامنے حاضر ہو جائیں گے۔ اسی طرح اگر روح قرآن کی تلاوت کا ارادہ کرے تو وہ ایک ہی لمحے میں قرآن کے تمام الفاظ، قرأت کے قوانین کے مطابق مخارج اور صفات کی درست ادائیگی کے ہمراہ تلاوت کرے گی۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے سیدی دباغ کا یہ جواب ان سے واقفیت کے بالکل ابتدائی زمانے میں سنا تھا، ایک مرتبہ میں عین علون کی مسجد میں بیٹھا ہوا تھا اور میرے سامنے تفسیر ''الدر المنثور'' موجود تھی۔ جب میری نگاہ اس روایت پر پڑی تو میں نے سوچا، کاش! اس وقت حضرت یہاں موجود ہوتے تو میں آپ سے اس روایت کا مفہوم دریافت کر لیتا۔ سیدی دباغ اسی وقت وہاں میرے سامنے تشریف لے آئے۔ میں نے کتاب کھول کر عرض کی: میں اس روایت کا مفہوم سمجھنا چاہ رہا تھا۔ سیّدی دباغ نے جواب دیا: میں تمہیں اسی سوال کا جواب دینے کے لئے یہاں آیا ہوں۔ پوچھو! پھر آپ نے مذکورہ بالا تشریح بیان کی۔

حدیث جبریل اور عظمتِ مصطفیٰ

امام مسلم حدیث جبریل کے آخر میں یہ بات نقل کرتے ہیں کہ جب وہ تمام سوالات کے جوابات حاصل کر کے واپس چلے گئے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس سائل کو واپس بلا کر لاؤ۔ صحابہ نے انہیں ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن کوئی سراغ نہیں مل سکا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یہ جبرائیل (علیہ السلام) تھے۔ آج میں انہیں نہیں پہچان سکا؟

سیّدی دباغ نے فرمایا: اس واقعے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو عظمت و بزرگی پوشیدہ ہے اس سے صرف وہی شخص واقف ہو سکتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ہو، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بعض اوقات

مشاہدہ حق میں اس قدر مستغرق ہو جایا کرتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جملہ وجود اپنے تمام تر اجزاء سمیت اس دنیا سے لاتعلق ہو جاتا تھا اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ کسی ایک مخلوق کی طرف بھی مبذول نہیں ہوتی تھی۔ جب فرشتے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس مخصوص کیفیت کو دیکھتے تو برکت کے حصول کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے کیونکہ وہ یہ بات جانتے تھے کہ ساری مخلوق میں یہ کیفیت صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی نصیب ہو سکتی ہے۔ اس لئے ایک ایسے ہی موقع پر حضرت جبرائیل علیہ السلام اخذ فیض کیلئے بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جوابات عنایت کئے۔

بارگاہِ نبوی سے فرشتوں کا اخذ فیض

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: فرشتے اللہ تعالیٰ کی مقرب اور برگزیدہ مخلوق ہیں انہیں ایمان کی تعلیم حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان بے شمار ہے جو شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان کو حاصل کرے اور پھر اس میں کوئی تبدیلی نہ کرے تو ایسے شخص کو کبھی بھی پل صراط یا جہنم کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ اس لئے فرشتے ایسے لمحات کو غنیمت سمجھتے ہوئے حاضر خدمت ہو جایا کرتے تھے۔ میں نے دریافت کیا: فرشتے دوسرے اوقات میں حاضر کیوں نہیں ہوا کرتے تھے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کامل استغراق کی کیفیت طاری نہ ہوتی اس وقت فرشتے دیہاتیوں کے روپ میں حاضر نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں فوراً پہچان جاتے۔ اس کے برعکس جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل استغراق کی کیفیت طاری ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرف ان کی آواز یا سوال کی طرف متوجہ ہوتے۔ سائل کی ذات کی طرف توجہ نہ دیتے۔ اور فرشتوں کو گو ہر مقصود حاصل ہو جاتا۔ میں نے دریافت کیا: کیا فرشتوں کو اس بات کا علم ہو جاتا تھا کہ اس وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل استغراق کی کیفیت طاری نہیں ہے؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: یہ کیفیت فرشتوں اور صاحب فتح اولیاء سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔

قرآن معجزہ نبوی ہے

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

ما من نبی الا وقد اعطی ما مثله امن علیه البشر و ما کان الذی اوتیته الاوحیا یتلی

''ہر نبی کو، اس پر ایمان لانے والے لوگوں کی تعداد کے مطابق معجزات عطا کئے جاتے ہیں اور مجھے وہ وحی عطا کی گئی جس کی تلاوت کی جاتی ہے۔''

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے سیّدی دباغ نے ارشاد فرمایا: ہر نبی کا معجزہ اس کی ذات سے متعلق ہوتا ہے بعض انبیاء کرام کو بڑی عمر میں معجزات عطا کئے گئے اور بعض کو بچپن ہی میں معجزات عطا کر دیئے گئے لیکن نبی

اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا جانے والا مخصوص معجزہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی ذات کے ساتھ متعلق نہیں تھا۔ بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے تھا جس میں اللہ تعالیٰ کا نور، مشاہدہ اور ہم کلامی کا اثر موجود تھا۔ کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم، روح اور عقل میں اس قدر عظیم طاقت موجود ہے کہ اگر اسے تمام انبیاء پر تقسیم کر دیا جائے تو بھی تمام انبیاء اس کے متحمل نہیں ہو سکیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مخصوص معجزہ عطا کیا گیا جو دیگر انبیاء کے معجزات سے مختلف ہے۔ اگر چہ دیگر انبیاء کو عطا کیے جانے والے معجزات اس قدر عظیم ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کے ذریعے بھی سارے انسانوں کو مومن بنایا جا سکتا ہے لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ان سب پر فوقیت رکھتا ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔

اس کے بعد سیّدی دباغ نے اس حقیقت کو ایک مثال کے ذریعے بیان کیا، ایک بادشاہ کے ہاں جب بھی کسی بیٹے کی ولادت ہوتی تو وہ اس کی صحیح پرورش کے لئے اسے کسی مخصوص مقام پر بھجوا دیتا اور نشانی کے طور پر کوئی قیمتی لعل و جواہر اس کے ہمراہ کر دیتا تا کہ لوگ یہ بات سمجھ جائیں کہ یہ کوئی شہزادہ ہے۔ (کئی شہزادوں کے بعد) ایک شہزادہ پیدا ہوا جسے بادشاہ نے اپنے پاس رکھا اور اس کی تعلیم و تربیت اپنے ذمہ لی، عام فہم سی بات ہے کہ اس آخری شہزادے کو اپنے والد اور امور مملکت کی جو معرفت نصیب ہو گی وہ دوسرے بھائیوں کو حاصل نہیں ہو سکتی۔

بعض صحابہ کرام کی یہ خواہش تھی کہ دیگر انبیاء کرام کی مانند نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مختلف نوعیت کے معجزات کا ظہور ہو۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب ایک طرف ان کی اس خواہش کو دیکھتے اور دوسری طرف ان عنایات کو دیکھتے جو اللہ تعالیٰ نے صرف آپ کو عطا کی ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر حیا غالب آ جاتی۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس کے بعد سیّدی دباغ نے اس خواہش کو ایک مثال کی شکل میں یوں بیان کیا جیسے کوئی بادشاہ اپنے کسی مصاحب کو پوری مملکت میں ہر قسم کے تصرف کا اختیار عطا کر دے اور اس مصاحب کے دوست اس بات پر مصر ہوں کہ تم نے صرف فلاں گاؤں میں اپنے تصرف کا مظاہرہ کرنا ہے۔

قرآنی انوار کی مثال

ایک مرتبہ سیّدی دباغ نے ارشاد فرمایا: قرآن مجید میں جو اسرار اور انوار موجود ہیں اس کی مثال یوں بیان کی جا سکتی ہے جیسے کوئی شخص عمدہ کپڑے کو کاٹ کر ٹوپی، عمامہ اور بقیہ لباس تیار کرے اور پھر ساری مخلوق کا جائزہ لے کر یہ سوچے کہ ساری مخلوق میں سے صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی اس لباس کو پہننے کے صحیح حقدار ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخصوص مرتبہ و مقام اور قوت اور صلاحیت عطا کی ہے۔ ایک مرتبہ سیّدی دباغ نے ارشاد فرمایا: جو مشاہدہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے اس کی طاقت کسی اور میں نہیں ہے پھر اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا: مشاہدے کا تعلق معرفت کے ساتھ ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت معرفت نصیب ہوئی تھی جب اللہ تعالیٰ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی اور موجود نہیں تھا کیونکہ نبی

اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ساری مخلوق سے پہلے پیدا کیا گیا تھا۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات نور اور ضیاء کے ہر ایک طلبگار کے لئے مرجع وماویٰ کی حیثیت رکھتی ہے پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جسمانی پیدائش کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارکہ پوری محبت اور رضامندی کے ہمراہ جسم میں داخل ہوئی تو جسم بھی روح کی معرفت سے فیض حاصل کرنے لگا۔ یہاں تک کہ 40 برس کی عمر میں روح اور جسم کے درمیان موجود تمام حجابات اٹھا لئے گئے۔ اور اس وقت جسم مبارک کو بھی وہ مشاہدہ حاصل ہوا جسے کوئی اور برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ مشاہدہ بالکل اسی طرح تھا جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ظاہری آنکھ کے ہمراہ یہ بات ملاحظہ کر رہے ہوں کہ ساری مخلوق کے اندر اللہ تعالیٰ ہی کا فعل کارفرما ہے اور ساری مخلوق کی مثال صرف کٹھ پتلی کی مانند ہے جو اپنے کسی نفع یا نقصان کی مالک نہیں ہوتی۔ یہ مشاہدہ اس لئے عطا کیا گیا تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ساری کائنات کے لئے رحمت بن جائیں۔ اس سے پہلے چند سابقہ انبیاء نے دعا کرنے میں عجلت کا مظاہرہ کیا۔ لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعا کو، گناہگاروں کی شفاعت کے لئے، قیامت کے دن تک موخر کر دیا ہے۔ گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا بھی ایک رحمت ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا حقیقی مصداق ہیں:

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبیاء۲۱:۱۰۷)

”اور (اے رسولِ محتشم!) ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر۔“

اس کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس حدیث مبارکہ کا بھی حقیقی مصداق ہیں۔

انما انا رحمة مهداة۔ (سنن داری ۱:۲۱)

”میں (ساری مخلوق کے لئے) رحمت اور ہدایت ہوں۔“

مشاہدہ نبوی کامل ترین ہے

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدے کے آغاز کی یہ کیفیت تھی کہ اس کے بعد لحہ بہ لحہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عروج اور ترقی نصیب ہوتی رہی جس کی کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی۔ بالفرض نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آج بھی ظاہری طور پر حیات ہوتے تو یہ ترقی جاری رہتی کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کمالات کی کوئی حد نہیں ہے۔ میں نے دریافت کیا: یہ مشاہدہ تو ہر نبی کو حاصل ہوگا کیونکہ اگر انبیاء کرام کو بھی اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے کا ایمان بالغیب ہوتا تو ان کے اور عام اہل ایمان کے درمیان کوئی فرق باقی نہ رہتا۔ سیّدی دباغ نے جواب دیا: دیگر انبیاء کو بھی یہ مشاہدہ نصیب ہوتا ہے لیکن سب سے زیادہ کامل مشاہدہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوا۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس کے بعد سیّدی دباغ نے کچھ ایسے کشفی حقائق بیان کئے، جنہیں تحریر نہیں کیا جا سکتا۔ (پھر آپ نے فرمایا) قرآن مجید میں اس قدر علوم و معارف موجود ہیں کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام، جن پر تورات نازل ہوئی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام جن پر انجیل نازل ہوئی، حضرت داؤد علیہ السلام، جن پر زبور نازل ہوئی، یہ تینوں حضرات اگر قرآن کے نزول کے زمانے تک دنیا میں موجود رہتے تو اپنے اوپر نازل ہونے والی کتابوں کی

بجائے قرآن مجید اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) ایک حدیث میں بھی یہی مضمون ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

لو کانا موسیٰ و عیسیٰ حیین لا تبعانی۔ (تفسیر ابن کثیر ۱: ۳۷۹)

''اگر آج موسیٰ اور عیسیٰ دنیا میں موجود ہوتے تو وہ میری ہی پیروی کرتے۔''

حافظ ابن حجر نے ''کتاب التوحید'' کے آخر میں اس روایت کے مختلف طرق بیان کئے ہیں۔ اگر یہ اس کتاب کے مضمون سے مختلف نہ ہوتے تو میں وہ سب یہاں ذکر کرتا۔

کلام نبوی کی مختلف کیفیات

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) ایک روایت کے مطابق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو اشعر کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

واللہ لا احملکم علیہ ولا عندی ما احملکم علیہ

''اللہ کی قسم میں تمہیں سواری کے لئے جانور نہیں دوں گا اور میرے پاس تمہیں دینے کے لئے کوئی جانور نہیں ہے۔''

لیکن اس کے باوجود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اونٹ عطا کر دیئے۔ میں نے سیّدی دباغ سے دریافت کیا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اقدس سے حق اور سچ کے علاوہ اور کچھ نہیں نکل سکتا (پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیوں کیا؟) سیّدی دباغ نے جواب دیا: بلاشبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ حق اور سچ بات بیان فرماتے ہیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام آپ کی باطنی کیفیت اور مشاہدے کے اعتبار سے صادر ہوتا تھا۔ اس لئے بعض اوقات مشاہدہ حق کے غلبے کے تحت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ مخلوق سے ہٹ جاتی جیسا کہ ہم سابقہ صفحات میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کو نہ پہچاننے سے متعلق حدیث کی شرح میں بیان کر چکے ہیں۔ کسی وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم' اللہ تعالیٰ کی قدرت کو سارے جہان میں مشاہدہ کرتے۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے باطن سے مشاہدہ حق کے اثرات ختم ہو جاتے اور صرف افعال باری تعالیٰ کا مشاہدہ باقی رہ جاتا۔ اس کیفیت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ دین کا فریضہ سرانجام دیتے تھے۔ اس لئے کسی بھی کلام کے صدور کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مذکورہ بالا تین اقسام میں سے کسی ایک قسم کا مشاہدہ نصیب ہوتا۔ جس قول کا تم نے ذکر کیا ہے اس کے صدور کے وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آپ اور ساری مخلوق سے غافل ہو کر مشاہدہ حق میں مستغرق تھے۔ اس لئے آپ نے فرمایا: میرے پاس تمہیں دینے کے لئے اونٹ نہیں ہیں۔ لیکن پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تیسری قسم کا مشاہدہ نصیب ہوا اور آپ کی توجہ مخلوق کی طرف مبذول ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: اشعری کہاں ہیں؟ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بلوا کر اونٹ عطا کئے تو انہوں نے عرض کی: آپ نے تو یہ قسم کھائی تھی کہ آپ ہمیں اونٹ عطا نہیں کریں گے پھر اب کیوں عنایت کر رہے ہیں تو

آپ نے ارشاد فرمایا: ''یہ اونٹ میں نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ تمہیں دے رہا ہے۔'' (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کا کفارہ کیوں ادا کیا؟ جبکہ خود آپ ہی کا فرمان ہے:

انی لا حلف علی یمین فاری غیرھا خیر منھا الا کفرت عن یمینی واتیت الذی ھو خیر

''اگر میں کوئی قسم اٹھالوں اور پھر اس کے برعکس کام کو بہتر سمجھوں تو قسم کا کفارہ ادا کر کے دوسرے کام کو اختیار کرلوں گا۔''

سیّدی دباغ نے جواب دیا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سابقہ قسم کا کفارہ ادا نہیں کیا بلکہ آئندہ کیلئے ایک اصول اور قانون مقرر کر دیا۔ مذکورہ قسم کے کفارے کی ادائیگی کے بارے میں کوئی روایت موجود نہیں ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اکابر اہل علم مثلاً خواجہ حسن بصری کی بھی یہی رائے ہے۔

مشاہدے کی مثال

(سیّدی دباغ فرماتے ہیں:) پہلے مشاہدے کے بارے میں جو میں نے بیان کیا ہے اس کی لذت اہل جنت کی لذت کی مانند ہے۔ اس کی مثال ہم یوں بیان کر سکتے ہیں جیسے ایک شخص کسی بارعب اور باہیبت بادشاہ سے ملاقات کرے اور بادشاہ کے پاس تمام آلات حرب موجود ہوں لیکن وہ بادشاہ ان سب کو الگ کر کے گھوڑے سے اتر کر اس شخص سے تکلف ہو جائے۔ یہاں تک کہ اسے اپنی پوشاک بھی عطا کر دے تو اس شخص کی خوشی و مسرت کا کیا اندازہ لگایا جا سکتا ہے؟ ہم نے صرف تمثیلی اعتبار سے یہ مثال بیان کی ہے ورنہ حقیقت اس سے بہت ماوراء ہے۔ جس شخص کو مشاہدہ نصیب ہو جاتا ہے اسے سکون، آرام، راحت اور شرح صدر نصیب ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ مشاہدے کی لذت اس کے گوشت، خون، ہڈیوں اور رونگٹوں میں بھی سرایت کر جاتی ہے یہاں تک کہ اس کے جسم کے کسی ایک بال کو بھی وہی لذت نصیب ہو گی جو اس شخص کی عقل یا دل کو حاصل ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ اس لذت کو دنیا کی کسی بھی لذت سے کروڑوں یا اربوں گنا زیادہ بھی قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ یہ اس سے بھی زیادہ ہو گی۔

دوسری قسم کے مشاہدے کی مثال اس طرح ہے جیسے کوئی شخص بادشاہ سے ملنے جائے اور بادشاہ رعب و دبدبے کے ہمراہ اس سے ملاقات کرے تو اگرچہ ملاقات کی لذت موجود ہے لیکن رعب اور دبدبے کی دہشت بھی موجود ہے کیونکہ طیش کی حالت میں بادشاہ کا سامنا کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ پہلے مشاہدے میں کچھ خواب کی سی کیفیت پائی جاتی ہے اور دوسرے کی کیفیت بیداری کی مانند ہے۔ اس لئے اس میں رعب خداوندی کے باعث اضطراب پایا جاتا ہے۔

تیسری قسم کے مشاہدے کی مثال نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

انہ لیغان علی قلبی فاستغفر اللّٰہ۔ (السنن الکبریٰ للنسائی ۶:۱۱۶)

''بعض اوقات میرے دل پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے تو میں اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرتا ہوں۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس روایت کو امام مسلم نے ''صحیح مسلم'' میں نقل کیا ہے۔ اور قاضی عیاض و امام نووی و شیخ عراقی جیسے جلیل القدر ائمہ نے اس حدیث کی تشریح بیان کی ہے۔ جو سیّدی دباغ کی بیان کردہ تشریح سے خاصی قریب ہے۔ تاہم سیّدی دباغ کی بیان کردہ تشریح کا تعلق ان کے مشاہدے اور کشف کے ساتھ ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: کوئی بھی مخلوق مستقل طور پر پہلی یا دوسری قسم کا مشاہدہ نہیں کر سکتی۔ اس لئے اسے مشاہدے کی تیسری قسم کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مشاہدے کی اس تیسری منزل کی طرف نزول کرتے تو اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتے۔ اس کے بعد سیّدی دباغ نے اس مقام کے کچھ اسرار بیان کئے جنہیں ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) جب میں نے سیّدی دباغ کی زبانی یہ تشریح سنی، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی بھی کلام مشاہدات کی ان تین کیفیات سے باہر نہیں ہوگا تو مجھے یہ اندازہ ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کو سمجھنا انہی لوگوں کے لئے مشکل ہوگا جو اس اصول سے واقف نہیں ہوں گے نیز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر حال میں، ہر کام میں، ہر شخص کے ساتھ ہمیشہ سچی بات کرتے ہیں۔

انتم اعلم بدنیاکم کا مفہوم

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) امام مسلم نے یہ روایت نقل کی ہے ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کچھ صحابہ کرام کے پاس سے گزرے جو کھجوروں کو پیوند لگانے میں مصروف تھے۔ آپ علیہ السلام نے دریافت فرمایا:

ماھذا؟ فقالوا بھذا تصلح یارسول اللّٰہ فقال لو لم تفعلوا لصلحت فلم یوبروھا فجاء ت شیصا غیر صالحۃ فلما راھا علیہ الصلاۃ والسلام بعد ذالک قال ما بال التمر ھکذا قالوا یا رسول اللّٰہ قلت لنا کذا وکذا فقال انتم اعلم بدنیاکم۔

(صحیح مسلم، ۴: ۱۸۳۶، رقم الحدیث: ۲۳۶۳)

''یہ کیا کر رہے ہو؟ صحابہ نے عرض کی: یہ عمل پیداوار کے لئے بہترین ہے۔ آپ نے فرمایا: اگر تم ایسا نہ کرو تو یہ زیادہ بہتر ہے۔ صحابہ نے اس مشورے پر عمل کیا تو آئندہ پیداوار بہتر نہ ہوئی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خرابی کا سبب دریافت کیا: تو صحابہ نے عرض کی: ہم نے پہلے آپ کو اس بارے میں مطلع کر دیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اپنے دنیاوی امور سے متعلق زیادہ بہتر جانتے ہو۔''

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بالکل سچ تھا کہ اگر تم ایسا نہ کرو تو پیداوار بہتر ہو گی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے جزم اور یقین کے ساتھ یہ بات ارشاد فرمائی تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسا کر سکتا

ہے اور اس یقین کا بنیادی سبب یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ساری کائنات میں اللہ تعالیٰ کے اس فعل کا مشاہدہ کرتے تھے جو کائنات کے ہر گوشے میں ہر وقت کسی واسطے کے بغیر جاری وساری ہے۔ ہر ذرے کا سکون، بال کی حرکت، دل کا اضطراب، کسی رگ کا پھڑکنا، پلک کا جھپکنا، ابرو کا اشارہ، غرضیکہ ہر چیز اور ہر عمل میں اللہ تعالیٰ کا فعل موجود ہے۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس فعل کو اسی طرح دیکھا کرتے تھے جیسے کوئی شخص اپنے سامنے موجود چیز کو دیکھ سکتا ہے۔ نیند یا بیداری کسی بھی حالت میں یہ مشاہدہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتا تھا کیونکہ اس مشاہدے کا مرکز قلب اطہر تھا جو کبھی غافل نہیں ہوتا اور جس ذات کو مشاہدے کی یہ کیفیت حاصل ہو اس کے سامنے سے تمام اسباب ہٹ جاتے ہیں اور ہر غیب (پوشیدہ) شے اس کے لئے ظاہر ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس ذات کے لئے اللہ تعالیٰ کا درج ذیل فرمان محض ایک غیبی امر کی بجائے مشاہداتی حقیقت ہوگا:

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ (الصافات ۳۷:۹۶)

''حالانکہ اللہ نے تمہیں اور تمہارے سب کاموں کو خلق فرمایا ہے۔''

اس لئے ایسے مشاہدے کی مالک ذات کو اپنے مشاہدے کے مطابق یقین نصیب ہوگا اور مذکورہ آیت پر اس کا اعتقاد اس قدر مضبوط ہوگا کہ وہ کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکے گا کہ مخلوق کے کسی ایک فعل کو اللہ تعالیٰ کی بجائے کسی اور کی طرف بھی منسوب کیا جا سکتا ہے اور جس کے یقین کی یہ کیفیت ہو اس کی ذات سے معجزات کا ظہور ہوتا ہے کیونکہ تمام اشیاء اس سے متاثر ہو جاتی ہیں یہ ایک ایسا راز ہے جس کی موجودگی میں ہر واسطہ اور سبب درمیان سے ہٹ جاتا ہے لہٰذا جب اس حیثیت کی مالک ذات اسباب کو ساقط کر کے کسی فعل کو پروردگار عالم کی طرف منسوب کر دے تو اس کی بات بالکل درست اور حقیقت کے مطابق ہوگی۔ لیکن جس شخص کو یہ مشاہدہ نصیب نہیں ہوگا اس کا مذکورہ بالا آیت پر ایمان بالغیب ہوگا۔ اس لئے وہ افعال کو انہی لوگوں کی طرف منسوب کرے گا جن سے افعال صادر ہوئے ہیں۔ لہٰذا کبھی اس شخص کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان اپنی طرف کھینچے گا اور کبھی اس کی فطرت یعنی حواس کے ذریعے حاصل ہونے والی عام معلومات اسے اپنی طرف کھینچے گی۔ اور یہ ہمیشہ انہی دونوں امور کے درمیان الجھا رہے گا۔ ایسے شخص کو کبھی لحاتی طور پر یہ کیفیت نصیب ہوگی کہ کائنات کے ہر گوشے میں اللہ تعالیٰ کا فعل موجود ہے لیکن پھر وہ اپنی فطرت کے مطابق اس بات سے غافل ہو جائے گا۔ جس کے نتیجے میں خرق عادت کا ظہور نہیں ہو سکے گا۔ مذکورہ بالا واقعے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان عملی طور پر اس لئے ثابت نہیں ہو سکا کہ ان صحابہ کے باطن کی وہ کیفیت نہیں تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھی۔ اسی لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کی باطنی کیفیت کو سامنے رکھتے ہوئے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) معزز قارئین! کیا آپ نے کبھی ایسا عمدہ اور نفیس جواب کہیں پڑھا یا سنا ہے؟ یہ وہ حدیث ہے جس کی شرح کرتے ہوئے شیخ جمال الدین ابن حاجب، شیخ سیف الدین آمدی، شیخ فصیح الدین ہندی اور شیخ ابو حامد الغزالی جیسے جلیل القدر ائمہ بھی حیرانگی کا شکار رہے۔

جنات کو سرد عذاب دیا جائے گا

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے سیّدی دباغ سے درج ذیل روایت کا مفہوم دریافت کیا:

اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ ادبر الشیطان ولہ ضراط۔ (صحیح بخاری ۱: ۲۲۰، رقم الحدیث: ۵۸۳)

"جب نماز کے لئے اذان دی جاتی ہے تو شیطان یوں بھاگتا ہے کہ اس کی ہوا خارج ہو رہی ہوتی ہے۔

سیّدی دباغ نے جواب دیا: شیطان اس لئے بھاگتا ہے کیونکہ جہاں تک اذان کی آواز جاتی ہے وہاں تک ساری فضا نور سے لبریز ہو جاتی ہے۔ نور کی فطرت ٹھنڈک ہے اور شیطان کو آگ سے پیدا کیا گیا ہے۔ آگ اور ٹھنڈک ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) ایک مرتبہ سیّدی دباغ نے اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا: جنات کو جہنم میں آگ کا عذاب نہیں دیا جائے گا کیونکہ آگ ان کی طبیعت کا حصہ ہے اور یہ آگ انہیں زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ جنات کو سردی کا عذاب دیا جائے گا، دنیا میں بھی جنات سردی سے خوفزدہ رہتے ہیں اور ٹھنڈی ہواؤں سے بدک کر یوں بھاگتے ہیں جیسے وحشی گدھے بھاگتے ہیں۔ اسی طرح جنات پانی میں بھی داخل نہیں ہوتے، اگر شومئی قسمت سے کوئی جن پانی میں داخل ہو جائے تو وہ اسی وقت ہلاک ہو جاتا ہے جیسے کوئی انسان آگ میں جل کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اگر آپ جن کی کیفیت کا اندازہ لگانا چاہیں تو کسی گاڑھے دھوئیں کو کوئی شکل دیدیں، جن تقریباً اسی کی مانند ہوگا۔

میرا پروردگار مجھے کھلاتا پلاتا ہے

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے درج ذیل حدیث کا مفہوم دریافت کیا:

انی ابیت عند ربی یطعمنی و یسقینی (مسند اسحاق بن راہویہ ۲: ۴۶۳)

"میں اپنے پروردگار کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہوں اور وہی مجھے کھلاتا، پلاتا ہے۔"

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: اس روایت میں "عند"، معیت کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور کھلانے پلانے کا مطلب قوت عطا کرنا ہے، میں نے دریافت کیا: نبی کا جسم مٹی سے پیدا کیا جاتا ہے کیا انوار کی موجودگی میں اسے ظاہری غذا کی ضرورت نہیں رہتی؟ سیّدی دباغ نے فرمایا: (بھوک یا پیاس ختم کرنے کیلئے) انوار کافی نہیں ہیں یہاں تک کہ اگر کوئی شخص (نعوذ باللہ) کسی نبی کو قید کر کے اس کا کھانا پینا بند کر دے تو غذا کے عدم حصول کے باعث نبی کا انتقال ہو جائے گا کیونکہ نبی کا ظاہری جسم بھی خوراک حاصل کرتا ہے اسی لئے انبیاء کرام کھاتے پیتے ہیں اور انہیں بھوک اور پیاس کا احساس ہوتا ہے۔

ولادت نبوی کا وقت اور اس کی برکات

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت پیدا ہوئے تھے کیونکہ بعض سیرت نگار اسی بات کے قائل ہیں اور ان کی دلیل امام بیہقی اور ابن السکن کی نقل کردہ وہ روایت

ہے جو سیّدہ فاطمہ بنت عبداللہ ثقفیہ کا بیان ہے۔ آپ فرماتی ہیں:

شهرت ولادة النبي عليه السلام فرأيت البيت حين وضع قد امتلأ نور اور أيت النجوم تدنو حتي ظننت انها ستقع علي۔

''جس رات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی میں وہاں موجود تھی آپ کی ولادت کے وقت سارا گھر نور سے بھر گیا اور ستارے اتنے قریب محسوس ہوئے کہ میں نے یہ خیال کیا یہ ابھی مجھ پر گر پڑیں گے۔''

کیونکہ ستارے، رات کے وقت دکھائی دیتے ہیں اس لئے اس روایت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت پیدا ہوئے تھے۔ سیرت نگاروں کا دوسرا گروہ اس بات کا قائل ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دن کے وقت پیدا ہوئے تھے اور یہ اپنے موقف کی تائید میں اس روایت سے استدلال کرتے ہیں جسے امام مسلم اور دیگر محدثین نے روایت کیا ہے۔ یہ روایت اگرچہ ضعیف ہے لیکن فضائل و مناقب میں ضعیف روایت بھی قابل اعتماد ہوتی ہے۔ یہ حضرات سیّدہ فاطمہ والی روایت کا یہ جواب دیتے ہیں کہ ستارے صبح صادق کے بعد بھی دکھائی دیتے ہیں اور امام مسلم کی روایت میں صبح صادق کے وقت پیدائش کا ذکر ہے۔

سیّدی دباغ نے جواب دیا: حقیقت یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کا آغاز صبح صادق سے پہلے ہو گیا تھا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم والدہ ماجدہ صبح صادق کے وقت فارغ ہوئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش اور والدہ کی فراغت کی درمیانی گھڑیاں ہی وہ خاص وقت ہیں جن میں دعا کی قبولیت کا ذکر احادیث میں موجود ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کے باعث قیامت تک کے لئے ان ساعتوں کو یہ فضیلت عطا کر دی گئی۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: یہی وہ وقت ہے جس میں ''دیوان الصالحین'' کا اجلاس مکہ مکرمہ سے باہر غار حرا میں منعقد ہوتا ہے اور اس میں غوث، ساتوں اقطاب اور دیوان کے دیگر اراکین شریک ہوتے ہیں جو اسلام کے نور کے لئے ستون کی حیثیت رکھتے ہیں اور ساری امت انہی سے فیض حاصل کرتی ہے لہٰذا جس شخص کی دعا، ان صالحین کی دعا کے مطابق ہو جائے اس کی دعا ضرور قبول ہوتی ہے اور اس کی حاجت ضرور پوری ہوتی ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) سیّدی دباغ اکثر ہمیں اس مخصوص ساعت کا خیال رکھنے کی تلقین کرتے تھے۔ اور یہ فرمایا کرتے تھے کہ مکہ مکرمہ میں صبح صادق، فاس سے پہلے طلوع ہو جاتی ہے۔ اس لئے تم اپنی شب بیداری میں مکہ مکرمہ میں طلوع فجر کے وقت کا خیال رکھا کرو اور پھر سیّدی دباغ نے مکہ مکرمہ اور شہر فاس کے درمیان وقت کے فرق کا اندازہ لگانے کا طریقہ مجھے سکھایا۔ سیّدی دباغ سے ملاقات سے پہلے میں رات سونے سے پہلے سورہ کہف کی آخری چار آیات پڑھا کرتا تھا تاکہ مجھے وہ مخصوص ساعت نصیب ہو جائے جس میں دعا کی قبولیت کا ذکر احادیث میں موجود ہے۔ اور میرا یہ معمول تقریباً 16 برس تک جاری رہا۔ بعد میں جب میں نے موازنہ کیا تو

یہ سیدی دباغ کے تعلیم کردہ طریقے کے عین مطابق تھا۔ اسی طرح بعض دوسرے شہروں کے رہنے والے حضرات بھی اس مبارک گھڑی کا خاص خیال رکھا کرتے تھے۔ لیکن وہ اپنے علاقے کی صبح صادق کے وقت کی رعایت کرتے ہوئے صبح صادق سے کچھ پہلے بیدار ہوا کرتے تھے۔

ولادت نبوی کا مہینہ' تاریخ اور برس

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کس مہینے میں ہوئی تھی؟ علماء کا اس بارے میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے اور صفر، ربیع الثانی، رجب، رمضان اور بعض نے 10 محرم الحرام کا قول نقل کیا ہے؟ بعض اس بات کے قائل ہیں کہ معین مہینے کے بارے میں کوئی روایت موجود نہیں ہے؟ سیدی دباغ نے فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش ربیع الاول کے مہینے میں ہوئی تھی۔

پھر میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ پیدائش کے بارے میں دریافت کیا؟ کیونکہ اس بارے میں بھی 2' 8' 9' 12 اور 7 تاریخ کے اقوال ملتے ہیں۔ اکثریت 7 تاریخ کو معتبر سمجھتی ہے؟ سیدی دباغ نے بھی اس کی تائید کی اور فرمایا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ربیع الاول کی ساتویں رات میں صبح صادق سے کچھ پہلے پیدا ہوئے تھے۔

پھر میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سن مبارک کے بارے میں دریافت کیا؟ کیونکہ عام الفیل کے بعد کی مدت کے بارے میں مختلف اقوال منقول ہیں جس میں 50 دن، 55 ماہ، 40 مہینے، 10 سال اور 15 سال کے اقوال ملتے ہیں؟ سیدی دباغ نے جواب دیا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت عام الفیل کے برس میں ہاتھیوں کے واقعے سے کچھ پہلے ہوئی تھی اور اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی برکت سے مکہ مکرمہ کو محفوظ رکھا۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اگر میں سوال کرتا تو آپ متعین وقت بھی بتا دیتے۔

شمائل نبوی

میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رحم مادر میں قیام کے عرصے کے بارے میں دریافت کیا: تو آپ نے فرمایا: 10 مہینے۔ میں نے دریافت کیا: علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بغل مبارک میں بال موجود تھے یا نہیں؟ تو آپ نے فرمایا: کچھ بال موجود تھے۔ مگر اتنے زیادہ نہیں تھے کہ انہیں نوچا جا سکے۔ بغل مبارک کا رنگ سفید تھا جس میں سیاہ بالوں کی ہلکی سی لکیر موجود تھی جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک کے اوپری حصے اور کندھوں پر بال زیادہ تھے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) بہت سی روایات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کندھوں پر بالوں کی کثرت کا ذکر ملتا ہے۔ میں نے دریافت کیا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں ابرو ملے ہوئے تھے یا ان کے درمیان فاصلہ موجود تھا؟ ارشاد فرمایا: ان کے درمیان فاصلہ موجود تھا۔ میں نے دریافت کیا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم دائیں یا بائیں طرف جھک کر چلتے تھے یا آگے کی جانب جھک کے چلتے تھے؟ جیسے ایک روایت میں یہ بات موجود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یوں چلا کرتے تھے جیسے بلندی سے نیچے کی

طرف اتر رہے ہوں؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دائیں، بائیں جھک کے چلا کرتے تھے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) ایک مرتبہ جب صرف میں سیّدی دباغ کے پاس موجود تھا تو سیّدی دباغ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مانند چل کے مجھے دکھایا تو میں اس چال کی دلکشی پر حیران وششدر رہ گیا۔

کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک کے بارے میں بھی مختلف روایات منقول ہیں اس لئے میں نے اس بارے میں بھی دریافت کیا: تو سیّدی دباغ نے فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک گھنی تھی۔ ذقن مبارک (ٹھوڑی) متوسط طور پر لمبی تھی اور ذقن اور رخسار کے درمیانی حصے میں ریش مبارک ہلکی تھی۔ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سر کے بالوں کے بارے میں دریافت کیا: نیز یہ بھی پوچھا: کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی خضاب استعمال کیا ہے؟ تو سیّدی دباغ نے جواب دیا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بال کبھی طویل ہوتے تھے اور کبھی ان کی لمبائی کم ہوتی تھی۔ حج کے سوا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی سر نہیں منڈوایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ٹھوڑی اور نچلے لب کے درمیان پانچ بال سفید تھے۔ جبکہ کنپٹیوں اور ٹھوڑی کے نیچے کچھ بال سفید تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چند مرتبہ مدینہ منورہ میں بالوں میں مہندی لگائی۔ اسی طرح جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہوئے تو اس وقت بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بالوں کو مہندی لگا رکھی تھی۔

شق صدر کی تعداد

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ''شق صدر'' کتنی مرتبہ ہوا؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: تین مرتبہ، پہلی مرتبہ اس وقت جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیّدہ حلیمہ سعدیہ کے ہاں بچپن میں قیام پذیر تھے۔ دوسری مرتبہ اس وقت جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک 10 برس تھی اور تیسری مرتبہ اس وقت جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوئی۔ میں نے عرض کی: بہت سی روایات میں یہ بات موجود ہے کہ معراج کی رات بھی ''شق صدر'' کا واقعہ پیش آیا تھا؟ سیّدی دباغ نے فرمایا: یہ روایت درست نہیں، پھر فرمایا: اس ''شق صدر'' کے لئے کوئی آلہ استعمال نہیں کیا گیا، کوئی خون نہیں نکلا اور نہ ہی جسم مبارک کو سیا گیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوئی کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا فعل تھا۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) سیّدہ حلیمہ سعدیہ کے ہاں ''شق صدر'' کا واقعہ متفق علیہ ہے البتہ 10 برس کی عمر والے واقعے سے متعلق صرف ایک روایت موجود ہے۔ جسے امام احمد کے صاحبزادے عبداللہ نے ''مسند احمد'' کی ''زوائد'' میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ جبکہ اعلان نبوت کے قریب ''شق صدر'' کے واقعہ کی روایت، امام ابوداؤد طیالسی نے اپنی ''مسند'' اور امام بیہقی نے ''دلائل النبوۃ'' میں نقل کی ہے، شب معراج کی رات ''شق صدر'' کا بعض اہل علم نے انکار کیا ہے اور اس بارے میں منقول روایات کو غیر مستند قرار دیا ہے۔ تاہم حافظ ابن حجر عسقلانی نے انہیں مستند قرار دیا ہے۔ جس کی تفصیل ''کتاب التوحید'' کے آخر میں درج ہے۔ لیکن سیّدی دباغ کیونکہ ''امی ولی'' ہیں۔ اس لئے

آپ کا مشاہدہ یقیناً درست ہوگا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: کہا جاتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انگشت شہادت، درمیانی انگلی سے بڑی تھی؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں کی انگشت شہادت، پاؤں کی درمیانی انگلی سے بڑی تھی لیکن ہاتھ کی شہادت کی انگلیاں، درمیانی انگلیوں کے برابر تھیں۔

پہلی وحی کا نزول

میں نے دریافت کیا: پہلی وحی کے نزول کے وقت، حضرت جبرائیل نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تین مرتبہ کیوں بھینچا تھا؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: پہلی مرتبہ اس لئے تا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ابدی رضا کے حصول کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کریں۔ دوسری مرتبہ اس لئے بھینچا تا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان کی پناہ میں آجائیں۔ اور تیسری مرتبہ اس لئے تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں شامل ہو جائیں پھر سیّدی دباغ نے فرمایا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب جبرائیل علیہ السلام نے قرأت کی درخواست کی تو اس کا مطلب یہ تھا کہ اسی وقت اللہ تعالیٰ کا کلام قدیم یعنی پورا قرآن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہو گیا۔ اور جبرائیل علیہ السلام کی درخواست کا مطلب یہ تھا کہ ''حادث'' کے ذریعے ''قدیم'' کی تبلیغ کریں۔ قرآن کی درج ذیل آیت میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ

(البقرۃ ۲:۱۸۵)

''رمضان وہ بابرکت مہینہ ہے جس میں وہ قرآن نازل ہوا جس میں لوگوں کیلئے ہدایت، اور ہدایت کے دلائل موجود ہیں اور یہ قرآن حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والا ہے۔''

کیونکہ جبرائیل علیہ السلام نے یہ درخواست پیش کی تھی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ''حادث'' زبان کے ذریعے اس ''قدیم'' کلام کو مخلوق تک منتقل نہیں کر سکتے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا کہ آپ کس طرح تبلیغ کا فریضہ سرانجام دیں گے۔ اس کے بعد سیّدی دباغ نے اس موضوع پر ایسے معارف بیان کئے جو عقل سے ماوراء ہیں اور انہیں تحریر نہیں کیا جا سکتا۔

صحابہ کرام کی تعداد

میں نے سیّدی دباغ سے اس روایت کے بارے میں دریافت کیا جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی پیشگوئی فرمائی تھی کہ ایک سو سال گزرنے تک روئے زمین پر اس وقت موجود کوئی بھی شخص زندہ نہیں رہے گا؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: یہ بات آپ نے اس وقت ارشاد فرمائی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کا زمانہ قریب تھا۔ یہ درحقیقت روح مبارکہ کا کلام تھا جو جسم مبارک کو تسلی دے رہی تھی۔ جب آپ صلی اللہ

علیہ وسلم کو وفات کا علم ہوا تو روح نے اس انداز میں جسم کو تسلی دی۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) سیدی دباغ کی بات درست ہے کیونکہ احادیث میں یہ بات موجود ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وصال سے کچھ عرصہ پہلے یہ بات ارشاد فرمائی تھی، امام مسلم نے، حضرت جابر بن عبداللہ انصاری کے حوالے سے، تقریباً ایک ماہ پہلے کی روایت نقل کی ہے۔ اللہ تعالیٰ سیّدی دباغ کو عمر دراز عطا فرمائے کہ ایک ''اُمی'' ہونے کے باوجود آپ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل سے متعلق کس قدر معلومات حاصل ہیں۔

پھر میں نے اپنے سوال کا اصل مقصد دریافت کیا: کیا اس روایت سے استدلال کرتے ہوئے کوئی شخص یہ بات کہہ سکتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے ٹھیک ایک سو سال بعد کوئی صحابی زندہ نہیں رہے گا اور جن لوگوں نے دوسری، چھٹی یا آٹھویں صدی ہجری میں صحابیت کا دعویٰ کیا ہے ان کا دعویٰ درست نہیں ہوگا؟ جیسے عکراش، معمر المغربی اور رتن ہندی۔ حافظ ابن حجر نے ان تینوں حضرات کے حالات کے ضمن میں اپنی تصنیف ''الاصابہ فی تمیز الصحابہ'' میں بڑی تفصیل سے اس موضوع پر بحث کی ہے۔ اسی طرح امام شمس الدین سخاوی نے ''شرح الفیہ'' اور امام سیوطی نے ''الحاوی للفتاویٰ'' میں اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔

سیّدی دِباغ نے جواب دیا: صحابہ کرام کی مکمل تعداد کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال مبارک سے پہلے بھی اور بعد میں بھی، بہت سے صحابہ کرام دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیل گئے تھے۔ اس لئے تمہاری ذکر کردہ روایت میں اگرچہ عمومی الفاظ موجود ہیں لیکن اس سے مراد مخصوص مفہوم ہے یعنی وہ حضرات جن کی صحابیت مشہور و معروف ہے۔ کشف کے ذریعے تو یہی محسوس ہوتا ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: ''رجراجہ'' کے بعض افراد کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ ان کا ایک وفد بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا تھا۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بربری زبان میں گفتگو بھی کی تھی۔ یہ روایت اگرچہ غیر مستند ہے لیکن شیخ شہاب الدین خفاجی نے ''شرح الشفاء'' میں اسے نقل کیا ہے؟ سیدی دباغ نے جواب دیا: یہ حضرات صحابی نہیں تھے۔ اور مغرب (مراکش) میں کوئی ایک صحابی بھی موجود نہیں ہے کیونکہ صحابہ کا نور ارباب بصیرت سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) بعض مشکل احادیث کے بارے میں سیدی دباغ کے یہ چند تشریحی ملفوظات ہم نے یہاں نقل کیے ہیں اور ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

دوسرا باب

تفسیر آیات قرآن

اس باب میں قرآن کریم کی بعض آیات کی تفسیر بیان کی جائے گی، قرآن میں موجود سریانی زبان کے الفاظ کی وضاحت کی جائے گی اور حروف مقطعات کے اسرار بیان کئے جائیں گے۔

حضرت آدم و حوا کے کلام کا مفہوم

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے سیّدی دباغ سے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا رضی اللہ عنہا کے بارے میں نازل ہونے والی قرآن کی درج ذیل آیت کے بارے میں دریافت کیا:

فَلَمَّآ اٰتٰهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ

(الاعراف ۷:۱۹۰)

''اور جب اللہ نے ان دونوں کو صالح (اولاد) عطا کر دی تو وہ دونوں اس عطا میں اللہ کا شریک (کسی اور کو) ٹھہرانے لگے حالانکہ اللہ کی ذات ان کے شرک سے ماورا ہے۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: حضرت آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں۔ وہ کسی اور کو اللہ تعالیٰ کا شریک کیسے ٹھہرا سکتے ہیں؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: یہاں اولاد کی وجہ سے باپ پر گرفت کی گئی ہے جیسے کسی شخص کے باغ میں پھل موجود ہیں اور زید کے بچے آ کر پھل توڑ کر لے جاتے ہیں تو باغ کا مالک بچوں کی بجائے زید کے ساتھ جھگڑا کرے گا۔ مذکورہ بالا آیت کا بھی یہی مفہوم ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے یہ جواب اس وقت سنا تھا جب میں نیا، نیا آپ کے حلقے سے وابستہ ہوا تھا۔ ویسے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی اس آیت کی یہی تفسیر بیان کی ہے جسے امام جلال الدین سیوطی شافعی نے اپنی تفسیر ''الدر المنثور'' میں نقل کیا ہے۔ میر سیّد شریف جرجانی نے اپنی تصنیف ''شرح مواقف'' میں اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سیّدی دباغ سے راضی ہو کہ انہیں کس قدر علم و معرفت حاصل ہے۔ اس تفسیر کی دلیل یہ ہے کہ اس آیت مبارکہ کے آخر میں صرف کفار کا ذکر ہے۔ اور ایک اور قرأت کی رو سے بھی یہی تفسیر مناسبت رکھتی ہے۔

فرشتوں کے سوال کا مفہوم

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَتَجۡعَلُ فِیۡہَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡہَا وَیَسۡفِکُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ ؕ

''(اے اللہ!) کیا تو اسے زمین میں اپنا خلیفہ بنائے گا؟ جو زمین میں فساد کرے گا وہاں خون بہائے گا جبکہ ہم تیری حمد اور پاکیزگی بیان کرتے ہیں۔'' (البقرۃ ۲:۳۰)

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: فرشتے گناہ سے معصوم ہوتے ہیں جبکہ اس آیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے بنی نوع انسان کی غیبت کی ہے؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: فرشتوں سے غیبت سرزد نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ اور اس آیت میں بھی کوئی غیبت موجود نہیں ہے۔ فرشتوں کے اس قول کا مرکزی مفہوم یہ ہے کہ اے اللہ! کیا تو ایسی مخلوق کو اپنا خلیفہ بنانا چاہتا ہے جو محجوب ہے حالانکہ ہم فرشتے محجوب نہیں ہیں۔ اس لئے بظاہر ہم اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ ہمیں خلیفہ بنایا جائے کیونکہ ہم تیرا مشاہدہ کرتے ہیں۔ تیری عظمت شان سے واقف ہیں، تیری حکم عدولی نہیں کرتے، لیکن یہ محجوب مخلوق تیری شان سے واقف نہیں ہو گی اس لئے یہ تیری نافرمانی کرے گی۔ گویا فرشتے یہ کہنا چاہتے تھے کہ اے اللہ! کیا تو اس مخلوق کو اپنا خلیفہ بنانا چاہتا ہے جسے تیری معرفت ہی حاصل نہیں ہے جبکہ ہمیں تیری معرفت حاصل ہے۔ فرشتے وہی عرض کر رہے تھے جو ان کی معلومات کے دائرے میں شامل تھا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ''جو چیز میرے علم میں ہے وہ تمہیں معلوم نہیں۔'' (البقرۃ ۲:۳۱)

یعنی تم یہ گمان کرتے ہو کہ محجوب شخص میری معرفت حاصل نہیں کر سکتا یا میری معرفت صرف اسی شخص کو حاصل ہے جو میرا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ تمہارے علم کی انتہا یہی ہے لیکن میرا علم اس سے زیادہ ہے کیونکہ میں اپنے اور محجوب شخص کے درمیان موجود پردے کو ہٹا کر اسے یہ قوت عطا کر سکتا ہوں کہ اسے میری معرفت حاصل ہو جائے اور اسے اس قدر علم حاصل ہو جائے جو تمہیں بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے قرآن نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نقل کیا ہے:

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّہَا ''اللہ نے آدم کو تمام اسماء کا علم عطا کر دیا۔'' (البقرۃ ۲:۳۱)

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: اس آیت مبارکہ میں صرف زمینی فرشتوں سے خطاب کیا گیا ہے یا تمام فرشتے اس کا مخاطب ہیں؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: یہ خطاب صرف زمینی فرشتوں کو کیا گیا ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) بعض مفسرین بھی اسی بات کے قائل ہیں، جن میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی شامل ہیں۔ حوالے کے لئے ''تفسیر الثعلبی'' ملاحظہ کر لیں۔

سیّدی دباغ نے فرشتوں، ابلیس اور اسی واقعے پر گفتگو کرتے ہوئے مزید ایسے نکات بیان کئے جو انسانی عقل سے ماورا ہیں۔ ایک مرتبہ فرمایا: فرشتے یہ سمجھتے تھے کہ شاید اولاد آدم اپنے پروردگار سے محجوب ہو گی۔ اپنی

مرضی اور پسند کی مالک ہوگی۔ یہاں تک کہ انہوں نے ان الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کیا:

اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا ''کیا تو اسے زمین میں اپنا خلیفہ بنائے گا جو وہاں فساد کرے گا۔''

فرشتوں نے یہ رائے لفظ ''خلیفہ'' سن کر قائم کی تھی کیونکہ خلیفہ کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ مستقل مزاج ہو، خود کسی کا پابند نہ ہو اور دوسروں کو اپنا پابند کر سکتا ہو۔ لہٰذا وہ تدبیر کو اپنی طرف منسوب کرے گا۔ انجام سے واقف ہو گا اور مصلحت کو پیش نظر رکھے گا اور اس طرح اپنے آپ کو لاتعلق کر لے گا۔ جس کے نتیجے میں ہلاکت اور بربادی اس کا مقدر ہوگی گویا ''خلیفہ'' کا لفظ سن کر فرشتوں نے یہ مسئلہ اخذ کیا کہ انسان اللہ تعالیٰ سے محجوب ہوگا۔

احسن سے مراد کیا ہے؟

وَاتَّبِعُوْا اَحْسَنَ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۔(الزمر ۳۹:۵۵)

''جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے اس کے احسن حصے کی پیروی کرو۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے اس آیت کے بارے میں سیّدی دباغ سے دریافت کیا: اس آیت سے بالواسطہ طور پر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قرآن کا بعض حصہ احسن (خوبصورت) نہیں ہے حالانکہ پورا قرآن احسن ہے؟ پھر میں نے سیّدی دباغ کے سامنے علماء کے بعض جوابات بھی نقل کئے۔ جن میں سے ایک جواب یہ بھی ہے۔

فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۔(البقرہ ۲:۱۹۴)

''جو زیادتی انہوں نے تمہارے ساتھ کی تم بھی اسی کی مانند انہیں جواب دو۔''

کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ''اگر تم صبر کرو تو صبر، صابر لوگوں کیلئے بہتر ہے۔'' (النحل ۱۶:۱۲۶)

اس لئے مظلوم کیلئے انتقام لینا جائز ہے تاہم اس کے لئے احسن یہ ہے کہ وہ صبر کرے۔ گویا انتقام لینا بھی ایک نیکی ہے لیکن معاف کر دینا زیادہ بہتر نیکی ہے علماء نے اس کا دوسرا جواب یہ دیا ہے کہ یہاں احسن سے مراد قرآن کی ناسخ آیات ہیں اور حسن سے مراد منسوخ آیات ہیں۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں بعض لوگ نیک ہیں اور بعض گناہگار ہیں۔ اس آیت میں احسن کی پیروی سے مراد انہی نیک لوگوں کی پیروی ہے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے انہیں پورا کرو اور جن کاموں سے منع کیا ہے ان سے بچو۔ ایک تفسیر یہ ہے کہ رخصت کو ترک کر کے عزیمت کو اختیار کرو کیونکہ رخصت حسن ہے اور عزیمت احسن ہے۔

پھر میں نے عرض کی: کہ یہ تمام اقوال اس آیت سے مناسبت نہیں رکھتے کیونکہ آیت کا سیاق اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ جو شخص احسن کی پیروی نہیں کرے گا اس کے بارے میں یہ اندیشہ ہے کہ وہ اللہ کے عذاب کا شکار ہو کر خسارہ پانے والوں میں شامل ہو جائے گا لہٰذا علماء کی بیان کردہ پہلی تفسیر درست نہیں ہوگی کیونکہ اگر کوئی

مظلوم زیادتی کا بدلہ لے اور ظالم کو معاف نہ کرے تو اس کا یہ حکم نہیں ہو سکتا۔ ناسخ و منسوخ سے متعلق دوسری تفسیر بھی درست نہیں ہے کیونکہ منسوخ کی پیروی نہیں کی جاسکتی اگر منسوخ سے مراد منسوخ عملی ہو۔ لیکن اگر منسوخ سے منسوخ التلاوہ ہو تو ناسخ اور منسوخ دونوں احسن ہوں گے۔ تیسری توجیہہ اس لئے درست نہیں ہے کہ کسی گنہگار کی پیروی کرنا سرے سے جائز نہیں ہے۔ عزیمت اور رخصت کی تفسیر اس لئے درست نہیں ہے کیونکہ رخصت بہر حال حسن تو ہے لیکن رخصت کا ارتکاب کرنے والا شخص اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مستحق قرار نہیں پاتا جیسا کہ اس آیت کے آخر میں بیان کیا گیا ہے۔ غرضیکہ ان تمام تفسیروں میں کوئی نہ کوئی اشکال پایا جاتا ہے۔

سیّدی دباغ نے جواب دیا: ان تمام جوابات میں سے کسی ایک جواب میں بھی آیت کا ''سر'' یا ''نور'' نہیں پایا جاتا۔ آیت کا ''سرّ'' اور ''نور'' یہ ہے کہ اے لوگو! اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کئے گئے رسول اور قرآن کی پیروی کرو کیونکہ یہ دونوں احسن (سب سے زیادہ عمدہ) ہیں۔ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کی جانے والی تمام کتابوں سے زیادہ عمدہ ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے مبعوث کردہ تمام انبیاء سے زیادہ بہترین ہیں۔ گویا دیگر انبیاء اور آسمانی کتابیں ''حسن'' ہوں گی۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے عرض کی: اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کی جانے والی کتابوں میں تورات اور انجیل بھی شامل ہیں۔ اس آیت میں لفظ ''الیکم'' (تمہاری طرف) کا مطلب یہ ہے کہ یہ تمام کتابیں ہماری (مسلمانوں کی) طرف نازل کی گئی ہیں حالانکہ تورات، یہودیوں پر نازل کی گئی اور انجیل، عیسائیوں اور یہودیوں دونوں کی طرف نازل کی گئی۔ سیّدی دباغ نے جواب دیا: ہمارے نبی علیہ السلام کو یہودیوں' عیسائیوں' عربوں بلکہ تمام اہل زمین کی طرف مبعوث کیا گیا ہے لہٰذا ''احسن'' جو درحقیقت قرآن ہے اسے ان سب کی طرف نازل کیا گیا جبکہ ''حسن'' یعنی دیگر آسمانی کتابوں کو، ان میں سے کسی ایک قوم کی طرف نازل کیا گیا، جیسے اہل عرب پر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی شریعت کے احکام نازل کئے گئے۔ یہودیوں پر تورات نازل کی گئی اور عیسائیوں پر انجیل نازل کی گئی۔ گویا مجموعی طور پر ان پر ''حسن'' (دیگر آسمانی کتابوں) کو نازل کیا گیا۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں.) بعض مفسرین نے بھی یہ بات بیان کی ہے کہ احسن سے مراد قرآن کریم ہے لیکن حضرت کی یہ تقریر زیادہ جامع و مانع ہے اور یہ آیت کے آخری حصے کے ساتھ بھی مطابقت رکھتی ہے۔ کیونکہ جو شخص بھی قرآن کریم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی نہیں کرے گا، ان کا انکار کرے گا وہ ان اوصاف کا مستحق قرار پائے گا جو اس آیت کے آخر میں بیان کئے گئے ہیں۔

سمع و بصر کی تقدیم و تاخیر

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۔(النحل ۱۶،۷۸)

''اور اس نے تمہیں سماعت، بصارت اور دل عطا کیا ہے تاکہ تم شکر ادا کرو۔''

میں نے سیّدی دباغ سے دریافت کیا: اس آیت کریمہ میں سماعت کو بصارت پر کیوں مقدم کیا گیا ہے؟ بلکہ بعض دیگر آیات میں بھی اسی طرح مذکور ہے جیسے:

اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ "اس نے تمہارے لئے سماعت اور بصارت کو پیدا کیا ہے۔"

(المؤمنون ۲۳، ۷۸)

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا (بنی اسرائیل ۱۷، ۳۶)

"بے شک سماعت، بصارت اور دل میں سے ہر ایک کے بارے میں حساب لیا جائے گا۔"

ان کے علاوہ بعض دیگر آیات میں بھی سماعت کو بصارت پر مقدم کیا گیا ہے حالانکہ بظاہر بصارت زیادہ مفید حس ہے کیونکہ اسی کی مدد سے ہم دن اور رات میں تمیز کر سکتے ہیں، جس شخص کی بینائی زائل ہو چکی ہو اور وہ سننے کی صلاحیت رکھتا ہو اس کے لئے رات اور دن، روشنی اور تاریکی، سورج اور چاند کے درمیان کوئی فرق نہیں ہو گا ایسا شخص ان کی روشنی سے کوئی رہنمائی حاصل نہیں کر سکے گا۔ اللہ تعالیٰ کی بہت سی مخلوق میں موجود بہت سے عجائبات کو صرف بصارت کی مدد سے دیکھا جا سکتا ہے جیسے بنی نوع انسان کی تخلیق، حیوانات اور نباتات کی مختلف اقسام سے بصارت کے ذریعے آگاہی حاصل کی جا سکتی ہے آسمان کا ستونوں کے بغیر کھڑے ہونا اور اس میں ستاروں کا چمکنا اور اس کے علاوہ بے شمار مظاہر بصارت کے محتاج ہیں۔ کیونکہ بصارت کا دائرہ کار زیادہ ہے اس لئے سماعت سے پہلے بصارت کو ذکر کرنا چاہئے تھا؟

سماعت کا بنیادی فائدہ

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے اس کا جواب ارشاد فرمایا: بصارت کے بارے میں جو کچھ تم نے بیان کیا وہ سب ٹھیک ہے۔ لیکن سماعت کے اندر ایک ایسا فائدہ موجود ہے جو ان تمام فوائد کے برابر ہے بلکہ یہ بصارت پر بھی فوقیت رکھتا ہے اور وہ فائدہ یہ ہے کہ رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور انہیں بھیجنے والی ذات یعنی اللہ تعالیٰ اور جن غیبی امور پر ایمان لانا ضروری ہے ان سب کا علم صرف سماعت کے ذریعے ہو سکتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ تمام شریعتوں کے احکام کا علم سماعت پر موقوف ہے اس کی وضاحت ہم یوں کر سکتے ہیں کہ اگر بالفرض تمام بنی نوع انسان کی قوت سماعت مفقود ہو جائے اور پھر اللہ تعالیٰ کا پیغمبر ان کے پاس آ کر یہ کہے

اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ "بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔" (الاعراف ۷، ۱۵۸)

تو پیغمبر کا یہ قول ایک آواز ہے جسے دیکھا نہیں جا سکتا اور سماعت سے عاری ہونے کی وجہ سے تمام بنی نوع انسان پیغمبر کی بات نہیں سمجھ سکتے تو لازمی طور پر پیغمبر کی آمد کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر وہ پیغمبر انہیں یہ بتائے کہ میرے دعوئ نبوت کی دلیل فلاں معجزہ ہے تو بھی وہ پیغمبر کی بات نہیں سمجھ سکیں گے اسی طرح اگر پیغمبر انہیں بتائے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے کہ تم اس کی توحید کا اقرار کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ تو بھی لوگ کچھ نہیں سمجھ سکیں گے۔ پیغمبر ان سے یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے کہ تم اللہ پر، اس کے تمام رسولوں پر، تمام فرشتوں پر، اس کی نازل کردہ تمام کتابوں پر اور قیامت کے دن پر ایمان لاؤ تو بھی لوگ اس کی بات نہیں سمجھ سکیں گے۔ اگر پیغمبر ان سے یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں فلاں کام تمہارے لئے واجب قرار دیئے ہیں اور

فلاں کام حرام قرار دیئے ہیں تو کوئی بھی شخص پیغمبر کی بات نہیں سن سکے گا۔ جس کے نتیجے میں پیغمبر کی بعثت کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سماعت کے بغیر کسی رسول کی رسالت پر ایمان لانا ممکن نہیں ہے۔ غیب یا شہادت پر ایمان لانا، یا شریعت کے احکام کی پیروی کرنا ممکن نہیں ہے اس کا بالواسطہ نتیجہ یہ نکلے گا کہ کوئی سزا یا جزا موجود نہیں ہے لہٰذا جنت اور اس کی نعمتیں، دوزخ اور اس کا عذاب، سب کچھ ختم ہو جائے گا کیونکہ کوئی بھی سزا یا جزا اس وقت تک نہیں دی جا سکتی جب تک کسی رسول کو مبعوث نہ کیا جائے (جیسا کہ خود قرآن کہتا ہے)

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (بنی اسرائیل، ۱۷:۱۵)

''اور ہم اس وقت تک کسی قوم پر عذاب نازل نہیں کرتے جب تک اس کی طرف رسول کو مبعوث نہ کر دیں۔''

اگر سماعت موجود نہ ہو تو بعثت کا مقصد فوت ہو جاتا ہے مختصر یہ کہ اولاد آدم کو سماعت کی حس نصیب نہ ہوتی تو وہ شرعی احکام کے پابند نہ ہوتے اور ان کی مثال جانوروں کی مانند ہوتی۔ قوت سماعت کے نتیجے میں انہیں یہ مرتبہ نصیب ہوا ہے کہ اب وہ ملاء اعلیٰ سے مل سکتے ہیں۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ سماعت، بصارت سے زیادہ مفید ہے۔ کیونکہ اسی کی بدولت اللہ تعالیٰ کے اسرار کا علم حاصل ہوتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے ان آیات میں سماعت کو بصارت سے پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ سماعت، بصارت سے بڑی نعمت ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) آپ نے ملاحظہ کیا، حضرت نے کتنا خوبصورت جواب عنایت کیا ہے۔ میں نے جب یہ جواب سنا تو مجھے حیرت ہوئی کہ یہ جواب میرے ذہن میں کیوں نہیں آیا حالانکہ یہ بالکل عام فہم سی بات ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی بھی (کسی کو بھی) ہدایت نہیں دے سکتا۔

ظلم اور فاحشہ میں فرق

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ

(آل عمران ۳: ۱۳۵)

''جو لوگ فحش کام کرتے ہیں یا اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں وہ اللہ کا ذکر کریں اور اپنے گناہ کی بخشش طلب کریں۔''

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا. (النساء ۴: ۱۱۰)

''جو شخص برائی کرے گا یا اپنے اوپر ظلم کرے گا اور پھر اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرے گا تو اللہ تعالیٰ کو وہ بخشش عطا کرنے والا اور رحم کرنے والا پائے گا۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے سیدی دباغ سے دریافت کیا: اپنے آپ پر ظلم کرنے کا مطلب کیا ہے؟ کیونکہ دوسری آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ وہ برا کام کریں یا اپنے آپ پر ظلم کریں۔ اپنے آپ پر ظلم کرنا بھی ایک برا کام ہے، اسی طرح پہلی آیت میں پہلے فحش کام کرنے اور پھر اپنے اوپر ظلم کرنے کا ذکر ہے حالانکہ

اپنے آپ پر ظلم کرنا بھی ایک فحش کام ہے۔ ظلم کا مفہوم برے یا فحش کام کی بہ نسبت عام ہے اور اس کے لئے عطف کے طور پر "او" (یا) لانا مناسب نہیں ہے۔ مفسرین نے اس کے مختلف جوابات بیان کئے ہیں۔ بعض مفسرین کے نزدیک ان آیات میں برے یا فحش کام سے مراد کبیرہ گناہ اور اپنے آپ پر ظلم سے مراد صغیرہ گناہ ہیں۔ جبکہ میرا یہ خیال ہے کہ برے یا فحش کام کو مطلق طور پر معصیت (گناہ) قرار دیا جائے گا۔ (خواہ وہ صغیرہ ہو یا کبیرہ ہو) جبکہ اپنے اوپر ظلم سے مراد یہ ہوگا کہ انسان معصیت کے ارتکاب پر اصرار کرے کیونکہ بظاہر یہ ایک مستقل فعل کی حیثیت نہیں رکھتا مثلاً اگر کوئی شخص زنا کے ارتکاب پر مصر ہو تو ہم اسے زانی نہیں کہہ سکتے بلکہ ہم یہ کہیں گے کہ یہ شخص زنا کرنے کا پختہ ارادہ کر چکا ہے اور اس ارادے کے ذریعے اپنے آپ پر زیادتی کا مرتکب ہو رہا ہے کیونکہ اس طرح یہ اپنے آپ کو عذاب کا مستحق قرار دلوا رہا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) ہم نے اس آیت پر تفصیلی گفتگو کی، سیّدی دباغ نے اس کے تین جوابات عنایت کئے۔ ہم نے ان جوابات پر بھی بحث کی پھر سیّدی دباغ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہوئے اور پھر ارشاد فرمایا: سیّدی محمد بن عبدالکریم البصری (جو اس وقت کے قطب ہیں) ارشاد فرماتے ہیں: اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عربوں کی عادت یہ تھی کہ وہ طاقتور ظالموں سے چشم پوشی کیا کرتے تھے اگرچہ وہ اس بات سے واقف ہوں کہ اس شخص نے واقعی یہ زیادتی کی ہے۔ مثلاً کسی ایک قبیلے کے ایک شخص نے چوری کر لی اور پورا قبیلہ اس بات سے واقف بھی ہے لیکن اس کے باوجود پورا قبیلہ اس بات سے انکار کرے گا کہ اس نے چوری کی ہے۔ لہٰذا چوری کرنے والا شخص برے یا فحش کام کا مرتکب ہوگا اور جو لوگ اس کی جھوٹی حمایت کر رہے ہیں وہ جھوٹی گواہی کے ذریعے اپنے اوپر ظلم کریں گے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: سیّدی محمد بن عبدالکریم گفتگو کے فن سے آشنا ہیں۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) مجھے یہ تفسیر بہت پسند آئی کیونکہ یہ آیت کے سیاق وسباق سے مطابقت رکھتی ہے۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ۔(النساء ۴:۱۱۰)

"جو شخص برا کام کرے یا اپنے اوپر ظلم کرے۔"

وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۔(النساء ۴:۱۰۷)

"تم ان لوگوں کے ساتھ بحث نہ کرو جو اپنے آپ کے ساتھ خیانت کرتے ہیں۔"

هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

"یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں تم دنیا میں بحث کرتے ہو لیکن قیامت کے دن ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کون بحث کرے گا۔"

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) جس وقت میں سیّدی دباغ کے ساتھ اس آیت پر بحث میں مصروف تھا اس وقت ہم شہر "فاس" کے دروازے "باب الحدید" کے باہر موجود تھے جبکہ سیّدی محمد بن عبدالکریم اس وقت بصرہ

میں موجود تھے۔لیکن انہوں نے ہماری گفتگو سنی اور ہمیں اس کا جواب عنایت کیا۔ حالانکہ وہ اپنے مخصوص مقام پر موجود تھے۔ اللہ تعالیٰ ان اولیاء کرام سے ہمیشہ راضی رہے۔عنقریب ہم اس موضوع کے بارے میں کچھ تحریر کریں گے کہ اولیاء کرام ظاہری دوری کے باوجود کس طرح ایک دوسرے کا کلام سن لیتے ہیں؟

حق اور اہلیت کا مفہوم

ارشاد باری تعالیٰ ہے،

وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْا اَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا ۔(الفتح ۴۸:۲۶)

''اور اللہ نے ان کے لئے تقویٰ کو لازم کر دیا ہے اور وہ اس کے اہل اور حقدار بھی ہیں۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے سیّدی دباغ سے دریافت کیا: کہ اس آیت میں صحابہ کرام کے بارے میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ وہ اسلام لانے سے پہلے تقویٰ کے زیادہ حقدار اور اہل تھے حالانکہ اسلام لانے سے پہلے تو کوئی حق یا اہلیت موجود نہیں ہو سکتی۔سیّدی دباغ نے جواب دیا: یہاں حق اور اہلیت سے مراد وہ خصوصیت ہے جو مخلوقات کی تخلیق سے پہلے ازل میں ان کی تقدیر میں لکھ دی گئی تھی۔

''قوم عاد'' سے کون سی قوم مراد ہے؟

ارشاد باری تعالیٰ ہے،

وَاَنَّهٗ اَهْلَكَ عَادَا الْاُوْلٰى ''اور بے شک اللہ نے پہلی عاد قوم کو ہلاک کر دیا۔'' (النجم ۵۳:۵۰)

میں نے سیّدی دباغ سے دریافت کیا: کیا ''عاد'' نام کی کوئی اور قوم بھی موجود تھی کیونکہ اس بارے میں مفسرین کے کلام میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔بعض مفسرین یہ بات بیان کرتے ہیں کہ قوم ''عاد'' کی طرف حضرت ہود علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا۔ جبکہ حضرت ہود علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بہت پہلے تشریف لائے تھے۔دوسری طرف اس قوم کی ہلاکت کا ذکر کرتے ہوئے مفسرین نے یہ بات بھی بیان کی ہے کہ قوم ''عاد'' کا ایک وفد دعا کی درخواست لے کر مکہ مکرمہ آیا تھا۔ جبکہ مکہ مکرمہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے آباد کیا تھا۔اس لئے یہ بات مفسرین کے نزدیک بھی خاصی الجھن کا باعث ہے بعض مفسرین نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ''قوم عاد'' صرف ایک قوم تھی اور انہیں ''ثمود'' کی نسبت سے ''پہلی'' کہا گیا ہے۔اور دوسری قوم ''ثمود'' ہے۔بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ ''عاد'' نام کی دو قومیں تھیں۔''پہلی عاد'' قوم کی طرف حضرت ہود علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا اور اس پر شدید آندھی کا عذاب مسلط کیا گیا۔''دوسری عاد'' قوم کی طرف کسی اور نبی کو مبعوث کیا گیا اور انہیں آندھی کی بجائے کسی اور عذاب کے ذریعے ہلاک کیا گیا، ''دوسری عاد'' قوم کے بعض افراد ہی کا وفد مکہ مکرمہ آیا تھا تاہم مفسرین نے اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ ان کی طرف کون سے نبی کو مبعوث کیا گیا اور انہیں کون سے عذاب کے ذریعے ہلاک کیا گیا۔

اس کے بعد ''سورۃ احقاف'' کو سامنے رکھ لیں تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسی قوم کا وفد تھا اور انہیں آدمی کے ذریعے ہلاک کیا گیا۔ اور ان کی طرف حضرت ہود علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا جیسا کہ قرآن کہتا ہے۔

وَاذْكُرْ أَخَا عَادٍ (الاحقاف ۲۱:۴۶)

''عاد قوم کے بھائی کو یاد کرو۔''

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا ۔ (الاعراف ۶۵:۷)

''اور ہم نے عاد کی طرف ان کے بھائی ہود (کو مبعوث کیا)۔''

احادیث میں ''قوم عاد'' کا تذکرہ

''سورۃ احقاف'' میں جس قوم کے وفد کا ذکر ہے وہ قوم عاد ہی ہے۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے جسے امام احمد بن حنبل نے حضرت حارث بن حسان رضی اللہ عنہ البکری کے حوالے سے روایت کیا ہے۔

(حضرت حارث فرماتے ہیں) ایک دن میں علاء بن الحضرمی کے ہمراہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا، (اور پھر آگے چل کے فرماتے ہیں) میں نے کہا، میں اس بات سے اللہ اور اس کے رسول کی پناہ مانگتا ہوں کہ میرا حشر بھی قوم عاد کے وفد جیسا ہو۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا: قوم عاد کا کون سا وفد؟ حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حقیقت سے واقف تھے لیکن محض لطف لینے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تذکرہ چھیڑ دیا۔ میں نے عرض کی: جب قوم عاد قحط کا شکار ہوئی تو انہوں نے قیل بن عنز کو بارش کی دعا کی درخواست کے ہمراہ معاویہ بن بکر کے پاس مکہ بھیجا۔ قیل ایک ماہ تک معاویہ کے مہمان کی حیثیت سے وہاں قیام پذیر رہا۔ پورے ایک مہینے کے بعد معاویہ نے قوم عاد کے لئے بارش کی دعا کی۔ اسی وقت بادل کے دو ٹکڑے آسمان پر آ گئے اس نے زیادہ سیاہ ٹکڑے کو منتخب کر لیا، تو غیب سے آواز آئی، یہ راکھ ہے اسے لے لو اب قوم عاد میں کوئی زندہ نہیں رہے گا۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس روایت کے بعض حصوں کو امام ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔ جس کی تفصیل علامہ ابن حجر نے (اپنی تصنیف ''فتح الباری'' میں) سورۃ احقاف کی تفسیر کے ضمن میں تحریر کی ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) ایک اور روایت کے مطابق قیل بن عنز اور مرثد بن سعد اپنی قوم کے 70 معززین کے ہمراہ مکہ مکرمہ آئے اس وقت مکہ میں قوم عمالقہ آباد تھی۔ جن کا سردار معاویہ بن بکر تھا۔ اس کے بعد مذکورہ بالا پورا قصہ ہے جس کے آخر میں یہ بات تحریر ہے کہ مرثد بن سعد نے اپنی قوم کے عمائدین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تم پر اس وقت تک بارش نہیں ہوگی جب تک تم اپنے رسول کی اطاعت نہیں کر لیتے۔ یہ سن کر قیل بن عنز نے معاویہ بن بکر سے درخواست کی کہ اسے (یعنی مرثد بن سعد کو) اپنے پاس قید کر لو۔ یہ ہمارے ساتھ نہ جا سکے کیونکہ یہ ہود (علیہ السلام) پر ایمان لا چکا ہے اور ان کی تصدیق کرتا ہے۔

سیدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا: ''دوسری عاد'' قوم کی طرف حضرت ہود علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا

تا کہ وہ سابقہ انبیاء کی شریعت کی تجدید کر سکیں اور انہی حضرت ہود علیہ السلام کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے۔ انہی کی قوم کا وفد مکہ گیا تھا۔ اور ان پر شدید آندھی کا عذاب نازل کیا گیا یہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے اور ان کا نسب یہ ہے۔

ہود بن عابر بن شیاع بن حارث بن کلاب بن قیدار بن سیدنا اسماعیل علیہ السلام

''دوسری عاد'' قوم، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد نہیں تھے۔ بلکہ صرف حضرت ہود علیہ السلام اور ان کا خاندان، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل میں سے تھا۔ قرآن کا یہ کہنا:

وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ''اور ہم نے قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو مبعوث کیا۔'' (هود ۱۱: ۵۰)

اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام کا خاندان، قوم عاد کے ہمراہ ہی سکونت پذیر تھا اور انہی کے ساتھ سفر کرتا تھا، اسی قوم عاد میں شداد بن عاد (نامی شخص بھی شامل) تھا جو بہت سے ستونوں والے ایک بڑے سے خیمے کا مالک تھا۔

شہر ارم

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: علماء یہ سمجھتے ہیں کہ شاید ''ارم ذات العماد'' ایک شہر تھا جسے سونے پر قائم کیا گیا تھا اور دنیا میں اس کی حیثیت جنت کی مانند تھی اور اس طرح کی اور بھی بہت سی باتیں بیان کی گئی ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ قبیلہ عاد کا نام ''ارم'' تھا اور ''ذات العماد'' (ستونوں والا) اس قبیلے کی صفت ہے یہ نام ان کے سردار کے خیمے کی وجہ سے مشہور ہوا۔ چونکہ وہ خیمہ بہت بڑا تھا اور اس کے بہت سے ستون تھے۔ میں نے ان کے مسکن کو (روحانی طور پر) دیکھا ہے یہ لوگ ستونوں پر خیمے قائم کیا کرتے تھے اسی لئے انہیں ''ستونوں والے'' کہا گیا ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس کے بعد سیّدی دباغ نے ان کے خیموں کا حلیہ بیان کرنا شروع کیا جو علماء کے بیان کردہ نکات کے مطابق تھا۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: یہ شہر 9 ایام کی مسافت کے برابر رقبے پر مشتمل تھا۔ ان کا سردار شہر کے وسط میں قیام پذیر تھا۔ اس سے ملنے کے لئے آنے والا ہر شخص ننگے سر اور ننگے پاؤں آیا کرتا تھا اور اسے ساڑھے چار دن کی مسافت کے برابر سفر طے کر کے (شہر کے وسط میں) سردار کے گھر تک پہنچنا پڑتا۔ یہاں کی آبادی بہت زیادہ تھی اور جگہ بہت تنگ تھی اللہ تعالیٰ نے انہیں پانی کی نعمت وافر مقدار میں عطا کی تھی کیونکہ آس پاس پہاڑوں میں موجود چشموں سے پانی نکل کر وہاں تک آتا تھا۔ جس کی مدد سے وہ لوگ کھیتی باڑی کیا کرتے تھے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: بادشاہ کا خیمہ اتنا بڑا تھا کہ اگر اس کے ایک سرے پر کھڑے ہو کر، پوری قوت سے تیر کو پھینکا جائے تو وہ دوسرے سرے پر جا کر گرے گا۔ اس خیمے کے ستونوں پر سونے کے خول چڑھے ہوئے تھے جبکہ اس کی رسیاں ریشم کی بنی ہوئی تھیں۔ (سیّدی دباغ فرماتے ہیں:) میں نے اس سونے کا ایک ٹکڑا دیکھا ہے جو وہاں زمین میں دفن پڑا ہوا ہے، اس بستی کے تمام خیموں میں سونے کا کام موجود تھا۔ ان کا کوئی بھی رہائشی

خیمہ سفید (چاندی کے کام پر مشتمل) نہیں تھا۔ اسی قوم کی طرف اللہ تعالیٰ نے حضرت ہود علیہ السلام کو مبعوث کیا جن کا نسب میں بیان کر چکا ہوں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) شہر ''ارم'' کے بارے میں سیّدی دباغ نے جو بیان کیا ہے علامہ ابن حجر نے شرح بخاری میں اسی طرح تحریر کیا ہے اور اس سلسلے میں مختلف روایات نقل کی ہیں۔ سیّدی دباغ حضرت ہود علیہ السلام کا جو نسب بیان کیا ہے وہ بھی کشف کا نتیجہ ہے کیونکہ سیّدی دباغ نے کسی درسگاہ میں تعلیم حاصل نہیں کی اور آپ علم تاریخ سے رسمی طور پر آگاہ نہیں تھے اس لئے کوئی بھی شخص مروجہ تاریخ کی کتابوں کے ذریعے سیّدی دباغ کی بات کا انکار نہیں کر سکتا کیونکہ مورخین کا ذکر کردہ نسب نامہ بھی خبر واحد پر مشتمل ہے اور اس خبر واحد میں بھی اضطراب پایا جاتا ہے بعض مورخین نے حضرت ہود علیہ السلام کا نسب یوں بیان کیا ہے:

ہود بن عبداللہ بن رباح بن الجارود بن عاد بن عوص بن ارم بن سام بن نوح علیہ السلام

بعض مورخین نے سیدنا ہود علیہ السلام کے نسب نامے کا تذکرہ یوں کیا ہے:

ہود بن شارح بن ارفخ بن سام بن نوح علیہ السلام

اس صورت میں حضرت ہود علیہ السلام اور قوم عاد ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ بعض مورخین یہ کہتے ہیں کہ حضرت ہود علیہ السلام کا قوم عاد کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا لیکن آپ کو قوم عاد کا بھائی اس لئے قرار دیا گیا ہے کیونکہ عاد کے لوگ حضرت ہود علیہ السلام کی بات فوراً مان لیتے تھے وہ حضرت ہود علیہ السلام کے حالات سے آگاہ تھے اور حضرت ہود علیہ السلام کی تابعداری کرنا پسند کرتے تھے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: ''پہلی عاد'' قوم، حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے موجود تھی اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف جس نبی کو مبعوث کیا تھا ان کا نام ''ھوید'' تھا۔ یہ صاحب شریعت رسول تھے جبکہ سیدنا ہود علیہ السلام صاحب شریعت نہیں تھے بلکہ انہوں نے سابقہ انبیاء کی شریعت کی تجدید کی تھی۔

غوث تمام آسمانی کتابوں سے واقف ہوتا ہے

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: ہر رسول پر ایک کتاب نازل ہوتی ہے اور حضرت ھوید علیہ السلام پر بھی ایک کتاب نازل ہوئی تھی اور وہ کتاب مجھے زبانی یاد ہے۔ اسی طرح میں تمام رسولوں پر نازل ہونے والی تمام کتابوں کا حافظ ہوں۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: کیا آپ ان کتابوں کی گنتی کر سکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: اگر وہ مجھے حفظ ہیں تو میں ان کی گنتی بھی کر سکتا ہوں، سنو! (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) پھر آپ نے ایک ایک کر کے ان کتابوں کے نام گنوانا شروع کر دیئے۔ اور ارشاد فرمایا: کوئی بھی ولی اس وقت تک ولی نہیں ہو سکتا جب تک ان تمام کتابوں پر تفصیلی ایمان نہ لے آئے۔ کیونکہ ان کتابوں پر اجمالی ایمان کافی نہیں ہے۔ میں نے دریافت کیا: یہ قانون تمام اولیاء کے لئے ہے یا صرف اس ولی کے لئے ہے جسے فتح نصیب ہو چکی ہو؟ سیّدی دباغ نے فرمایا: یہ قانون صرف ایک ولی کے لئے ہے، یعنی غوث کیلئے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس وقت مجھے پتہ چلا کہ سیدی عبدالعزیز دباغ اس عہد کے غوث ہیں اور آپ کے علوم بھی اسی بات پر دلالت کرتے ہیں۔ اگر میں آپ کی جملہ ملفوظات کو قلمبند کروں تو یہ کئی جلدوں پر مشتمل ہوں گے۔ آپ اکثر فرمایا کرتے ہیں کہ میں تمہارے ساتھ صرف ان معاملات پر گفتگو کرتا ہوں جنہیں تمہاری عقل برداشت کر سکے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: ''پہلی عاد'' قوم، جو حضرت ھوید علیہ السلام کی امت تھی۔ اس قوم کو اللہ تعالیٰ نے آگ اور پتھروں کے ذریعے ہلاک کر دیا۔ پہلے ان پر پتھر نازل ہوئے جب یہ بھاگنے لگے تو ان پر آگ نازل کی گئی جس کی وجہ سے یہ جل کر راکھ ہو گئے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے 700 رسول تشریف لائے تھے۔ جن کے حالات نہایت حیرت انگیز ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان کا تذکرہ اس لئے نہیں کیا کیونکہ لوگ ان حضرات سے واقف نہیں تھے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے سوال کیا، حدیث شفاعت میں حضرت نوح علیہ السلام کو سب سے پہلا رسول قرار دیا گیا ہے (اس کا کیا مطلب ہوگا؟) سیّدی دباغ نے جواب دیا: حضرت نوح علیہ السلام وہ سب سے پہلے رسول ہیں جنہیں کفار کی طرف مبعوث کیا گیا۔ ان سے پہلے تشریف لانے والے تمام رسولوں کو مومنین کی طرف مبعوث کیا گیا تھا۔ میں نے عرض کی: اگر حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے آنے والے تمام رسول اہل ایمان کی طرف مبعوث کئے جاتے تھے تو پھر حضرت ھوید علیہ السلام کی قوم بھی مسلمان ہوگی؟ ان پر آگ اور پتھروں کا عذاب کیوں نازل کیا گیا؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے آنے والے رسولوں کی اقوام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی سنت یہ تھی کہ اگر کوئی قوم شریعت کے اکثر قواعد ترک کر دیتی تو ان پر عذاب نازل ہوتا اگرچہ ان کا عقیدہ درست ہوتا۔

اجتہاد میں خطا و ثواب

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَ دَاوٗدَ وَ سُلَیْمٰنَ اِذْ یَحْكُمٰنِ فِی الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِیْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ وَ كُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِیْنَ ۝ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَیْمٰنَ وَ كُلًّا اٰتَیْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا وَّ سَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ یُسَبِّحْنَ وَ الطَّیْرَ وَ كُنَّا فٰعِلِیْنَ ۝ (الانبیاء ۲۱: ۷۸، ۷۹)

''اور جب داؤد اور سلیمان اس کھیت کے بارے میں فیصلہ کر رہے تھے جس میں کسی کی بکریاں (کھیت کے مالک کی اجازت کے بغیر) چرنے لگ گئی تھیں۔ اور ہم ان دونوں کے فیصلے کو دیکھ رہے تھے۔ پس ہم نے (اس مسئلے میں زیادہ مناسب) فیصلے کا فہم سلیمان کو عطا کیا، (حالانکہ حقیقت میں) ہم نے دونوں کو علم و حکمت سے نوازا تھا۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے عرض کی: اس آیت مبارکہ سے علماء نے یہ استدلال کیا ہے کہ کسی مسئلے میں اجتہاد کرنے کے بعد کوئی ایک مجتہد ہی درست نتیجے پر پہنچ سکتا ہے۔ جبکہ اس کے مخالف مجتہد کا اجتہاد غلطی پر مبنی ہوگا، لیکن اس کے باوجود اس دوسرے مجتہد کو معذور سمجھا جائے گا۔ اور اسے اس کے اجتہاد کا ثواب ملے گا کیونکہ اس نے اپنی بساط کے مطابق صحیح نتیجہ اخذ کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ اس مسئلے میں حضرت داؤد علیہ السلام نے یہ فیصلہ دیا تھا کہ کھیت کے مالک کا نقصان پورا کرنے کے لئے یہ بکریاں معاوضے کے طور پر کھیت کے مالک کے حوالے کر دی جائیں۔ جبکہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ فیصلہ دیا کہ بکریاں کھیت کے مالک کے حوالے کر دی جائیں اور ان بکریوں سے نفع حاصل کرے۔ جبکہ کھیت بکریوں کے مالک کے حوالے کیا جائے تاکہ وہ اس وقت تک کھیت کی دیکھ بھال کرتا رہے جب تک وہ دوبارہ اپنی اصل حالت پر واپس نہیں آ جاتا پھر اس کے بعد کھیت اور بکریاں اپنے، اپنے مالکان کے حوالے کر دی جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے فیصلے کو درست قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ ''اور ہم نے سلیمان کو (زیادہ بہتر) حل سمجھا دیا۔''

دوسرا واقعہ

اسی طرح ان دونوں حضرات کے درمیان ایک اور واقعہ بھی رونما ہوا تھا۔ دو عورتوں میں سے بڑی کے بچے کو بھیڑیا اٹھا کے لے گیا تو اس نے چھوٹی کے بچے پر قبضہ کر کے یہ دعویٰ کر دیا کہ یہ میرا بچہ ہے۔ جب یہ مقدمہ حضرت داؤد علیہ السلام کی خدمت میں پیش ہوا تو آپ نے بڑی کے حق میں فیصلہ دے دیا کیونکہ وہ بچہ بڑی کے پاس موجود تھا۔ مگر حضرت سلیمان علیہ السلام کا فیصلہ یہ تھا کہ اس بچے کو دونوں عورتوں کی تحویل میں دے دیا جائے۔ جب چھوٹی عورت نے یہ سنا کہ بچے کو حصوں میں تقسیم کرنے کا فیصلہ سنایا گیا ہے تو وہ اپنے دعویٰ سے دستبردار ہوگئی جبکہ بڑی عورت بدستور اپنے دعوے پر قائم رہی، یہ دیکھ کر حضرت سلیمان علیہ السلام نے چھوٹی کے حق میں فیصلہ دیتے ہوئے بڑی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، اگر یہ تمہارا بچہ ہوتا تو تم اس کی تقسیم کے فیصلے کو کبھی قبول نہیں کرتی۔

تیسرا واقعہ

ان دونوں حضرات کے درمیان ایک اور واقعہ اس طرح رونما ہوا کہ ایک عورت پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ اس نے کتے کے ساتھ بدفعلی کی ہے اور گواہوں نے اس بات کی گواہی بھی دیدی۔ گواہوں کی گواہی کے پیش نظر حضرت داؤد علیہ السلام نے اس عورت کو سنگسار کرنے کا فیصلہ سنایا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اس وقت کمسن بچے تھے۔ اور دوسرے بچوں کے ہمراہ کھیل رہے تھے۔ آپ نے حکم دیا، تمام گواہوں سے الگ الگ گواہی لی جائے، جب الگ الگ گواہی لی گئی تو گواہوں کے بیان کے درمیان فرق آ گیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے بعد

میں اسی طریقے کو اختیار کیا۔

چوتھا واقعہ

ایک اور واقعہ اس طرح نقل کیا گیا ہے کہ ایک عورت کی شرمگاہ میں نطفہ پایا گیا۔ اس پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ یہ کسی مرد کا مادہ تولید ہے اور یہ عورت زنا کی مرتکب ہوئی ہے چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اسے سنگسار کرنے کا فیصلہ کر دیا جبکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا فیصلہ یہ تھا کہ اس نطفے کو لے کر پکایا جائے اگر پکنے کے بعد وہ جم گیا تو انڈے کا پانی ہوگا۔ اور اگر نہ جما تو مرد کا نطفہ ہوگا۔ جب اسے پکایا گیا تو وہ جم گیا۔ جس سے واضح ہو گیا کہ اس عورت پر جھوٹا الزام عائد کیا گیا تھا۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) یہ تمام واقعات علامہ ابن حجر نے ''کتاب الاحکام'' میں تحریر کیے ہیں۔

سیّدی دباغ نے فرمایا: گویا علماء یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ان مسائل میں حضرت داؤد علیہ السلام کا فیصلہ غلط تھا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا فیصلہ درست تھا۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے بارے میں اس نوعیت کا عقیدہ فقہاء ہی رکھ سکتے ہیں حالانکہ یہ حضرات اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سب سے زیادہ برگزیدہ ہوتے ہیں اور ان کا مرتبہ فرشتوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ اگر ان سے غلطی کے صدور کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر ان سے منقول دیگر احکام کی کیا حیثیت باقی رہ جائے گی۔ کیونکہ پھر تو وہ ہماری ہی طرح ہو جائیں گے۔ ہم اس عقیدے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام سے غلطی کا صدور ہوا تھا۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے فیصلوں کی توجیہات

پہلے قصے میں حضرت داؤد علیہ السلام نے بالکل درست فیصلہ دیا تھا کیونکہ کھیت کا مالک اپنے نقصان کے معاوضے کا حق دار تھا اور معاوضے میں بکریاں دینے کا فیصلہ اس لئے کیا گیا تھا کہ اس زمانے میں نقدی کا رواج نہیں تھا اور تھا بھی تو بہت کم، زیادہ تر لین دین اشیاء کے تبادلے کی صورت میں ہوتا تھا اور ان اشیاء میں بھی اکثریت جانوروں کی تھی کیونکہ وہاں بہت سے مویشی پائے جاتے تھے۔ اسی لئے حضرت داؤد علیہ السلام نے نقدی کی بجائے بکریوں کو معاوضہ قرار دیا تھا۔ جبکہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے مصالحت کی ایک اور راہ پیدا کرتے ہوئے یہ فیصلہ دیا کہ کھیت کے نقصان کا معاوضہ بکریوں کی شکل میں دینے کی بجائے بکریوں کے منافع یعنی دودھ کی شکل میں دیا جائے تاکہ بکریوں کے مالک کو بھی زیادہ نقصان کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ لیکن یہ مصالحت صرف اس وقت ممکن تھی جب فریقین اس پر راضی ہو جائیں اس لئے اس مسئلے میں حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام، دونوں کے فیصلے درست تھے۔

جہاں تک دیگر واقعات کا تعلق ہے ان میں، اصولی طور پر، حضرت داؤد علیہ السلام نے ظاہر کے حکم کے مطابق فیصلہ دیا۔ کیونکہ ہر قاضی ظاہر کے مطابق فیصلہ دینے کا پابند ہے مگر حضرت سلیمان علیہ السلام نے حیلے کے

ذریعے باطن کو ظاہر کر دیا اور پھر اس ظاہر کے مطابق فیصلہ دیا۔ اس لئے دونوں حضرات کے فیصلے درست تھے جب باطن ظاہر ہو گیا تو اب سابقہ ظاہری فیصلہ منسوخ ہو جائے گا لیکن آپ اسے غلط قرار نہیں دے سکتے۔ اس کی مثال ہم یوں بیان کر سکتے ہیں کہ چند عادل گواہوں نے قاضی کے سامنے جھوٹی گواہی دی اور قاضی نے ان کی گواہی کے مطابق فیصلہ سنا دیا کیونکہ قاضی کی ذمہ داری یہی تھی۔ بعد میں ان گواہوں نے توبہ کرتے ہوئے اپنی گواہی کے جھوٹ ہونے کا اقرار کیا تو اب قاضی اس بات کا پابند ہے کہ سابقہ مقدمے میں گواہوں کے موجودہ اعتراف کے مطابق فیصلہ سنائے۔ ہم اس کے سابقہ فیصلے کو غلط قرار نہیں دے سکتے۔

باطن کو ظاہر کرنا

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: میں "فاس" میں رہنے والے ایک شخص سے واقف ہوں (یعنی خود سیّدی عبدالعزیز دباغ) جو اپنے ایک دینی بھائی سے ملنے بصرہ گیا۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس سے مراد سیّدی محمد بن عبدالکریم البصری ہیں۔ جن کا مختصر تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ آپ بصرہ کے قاضی تھے، جب وہ شخص قاضی صاحب کے پاس بیٹھا ہوا تھا اس وقت ایک مقدمہ زیر سماعت تھا۔ ایک شخص نے اپنے ساتھی پر یہ الزام عائد کیا تھا کہ اس نے مجھ سے ایک نہایت قیمتی یاقوت ہتھیا لیا ہے۔ جس شخص کے خلاف دعویٰ کیا گیا تھا اس نے قسم کھا کر کہا کہ میرے پاس یاقوت نہیں ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میری تلاشی لے سکتے ہیں۔ قاضی نے اس کی قسم کے مطابق فیصلہ سنانا چاہا تو اس کے دینی بھائی (سیّدی دباغ) نے مشورہ دیا، فیصلے کو کچھ دیر کے لئے موخر کر دیا جائے پھر فریقین سے مخاطب ہو کر کہا، قاضی صاحب میرے دینی بھائی ہیں انہوں نے میری دعوت کی ہے۔ ہماری یہ خواہش ہے کہ آپ دونوں بھی اس دعوت میں شریک ہوں۔ کھانے کے بعد قاضی صاحب تمہارے مقدمے کا جائزہ لیں گے۔ سب حضرات اٹھ کر قاضی کے ہاں چل دیئے۔ جب کھانا سامنے آیا تو قاضی اور اس کے دینی بھائی دونوں نے اس شخص کی طرف دیکھنا شروع کر دیا جس کے خلاف دعویٰ کیا گیا تھا۔ اچانک اس شخص کو چھینک آئی اور اس نے رومال کے ذریعے ناک صاف کیا، تو قاضی کے دینی بھائی نے آگے بڑھ کر وہ رومال چھین لیا، اس میں وہ قیمتی پتھر موجود تھا۔ جو مدعا علیہ نے اپنی ناک میں چھپا رکھا تھا۔ لہٰذا وہ پتھر مدعی کو واپس کر دیا گیا۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: یہاں بھی حیلے کے ذریعے باطن کو ظاہر کیا گیا ہے۔ اگرچہ قاضی صاحب کو بھی کشف کے ذریعے یہ بات معلوم تھی کہ یاقوت مدعیٰ علیہ کے پاس موجود ہے لیکن وہ عدالتی امور میں اپنے کشف کو استعمال کرنے کے پابند نہیں ہیں۔ جبکہ ان کے دینی بھائی نے حیلے کے ذریعے باطن کو ظاہر کر دیا۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: کیا قاضی صاحب کو کشف کے ذریعے یہ بات معلوم تھی کہ وہ پتھر مدعیٰ علیہ کے پاس موجود ہے۔ سیّدی دباغ نے جواب دیا: ہاں! قاضی صاحب اور ان کے ساتھی دونوں کو کشف کے ذریعے اصل حقیقت کا پتہ تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں منقول

واقعات کی حقیقت بھی یہی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے قبضہ، گواہی علامت کے پیش نظر فیصلہ دیا اور حضرت سلیمان نے ان تینوں مقدمات میں حیلے کے ذریعے باطن کو ظاہر کر دیا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اللہ تعالیٰ حضرت سے راضی ہو، ان کا علم کتنا وسیع ہے؟ علامہ ابن حجر لکھتے ہیں، شیخ ابن منیر فرماتے ہیں: صحیح قول یہ ہے کہ کھیت کے معاملے میں حضرت داؤد علیہ السلام کا فیصلہ بالکل درست تھا جبکہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے مصالحت کا مشورہ دیا تھا، اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان

وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ''اور ان دونوں کو ہم نے علم و حکمت عطا کی ہے۔''

یہ حکم عام بھی ہو سکتا ہے اور خاص بھی، لیکن بہر صورت اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی علم و حکمت کی تعریف کی ہے لہٰذا آپ اس کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ حضرت داؤد علیہ السلام سے اجتہادی خطا سرزد ہوئی کیونکہ اجتہادی خطا کو علم و حکمت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ (یہاں تک ابن حجر کا کلام ختم ہوا)

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) ابن حجر کے بیان سے بھی وہی بات ظاہر ہوتی ہے جو سیّدی عبدالعزیز دباغ بیان فرما چکے ہیں نیز بقیہ تینوں واقعات کی جو توجیہہ سیّدی دباغ نے بیان کی ہے وہ بالکل درست ہے اور اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔ امام شافعی اور شیخ ابوعبداللہ بلخی اور بعض دیگر اکابر نے ایک اور واقعے کے حوالے سے اسی مفہوم کی طرف اشارہ کیا ہے۔

''ساق'' کا مطلب

ارشاد باری تعالیٰ ہے،

يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ ''(قیامت کے دن) جب ساق سے پردہ ہٹا جائے گا۔'' (القلم ۶۸:۴۲)

میں نے سیّدی دباغ سے دریافت کیا: اس آیت میں موجود لفظ ''ساق'' کا معنی کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: سریانی زبان میں یہ لفظ ''حقیقی و یقینی'' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ میں نے عرض کی: عربی زبان میں بھی اس کا یہی مطلب ہے جیسے عرب کہتے ہیں، انکشف الحرب عن ساق (جنگ یقینی ہو گئی ہے)

سیّدی دباغ نے فرمایا: اس کا مطلب ہے دونوں زبانوں میں یہ لفظ ایک ہی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ''مشیحا'' (ح کے ہمراہ) تھا۔ یا ''مشیخا'' (خ کے ہمراہ تھا)

سیّدی دباغ نے جواب دیا: آپ کا نام مشیخا (خ کے ہمراہ) تھا اور سریانی زبان میں اس کا مطلب ''بہت بڑا آدمی'' ہے۔

''تورات'' اور ''انجیل'' کا مطلب

میں نے لفظ ''انجیل'' کا معنی دریافت کیا: تو آپ نے فرمایا یہ بھی سریانی زبان کا لفظ ہے اور اس کا معنی

''نورالعین'' (آنکھ کا نور یا سورج کی روشنی) ہے۔

میں نے تورات کا معنی دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے اور اس کا معنی ''شریعت'' یا ''حق کلام'' ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صفاتی نام

میں نے عرض کی: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک نام ''مشفح'' ہے۔ علماء میں اس بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ اس لفظ میں ''ش'' کے بعد ''ف'' استعمال ہوگا یا ''ق''؟ آپ نے جواب دیا: یہ بھی سریانی زبان کا لفظ ہے اور یہاں ''ش'' کے بعد ''ف'' ہی استعمال ہوگا۔ اس کا مطلب ''حمد کرنے والا'' ہے۔

میں نے دریافت کیا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور نام ''المنحمنا'' ہے اس کے تلفظ میں علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک اس کی پہلی ''م'' پر پیش اور دوسری ''م'' پر زیر پڑھی جائے گی۔ جبکہ بعض اہل علم کے نزدیک پہلی ''م'' پر زبر اور دوسری ''م'' پر زیر پڑھی جائے گی۔ اصل تلفظ کیا ہے؟

سیّدی دباغ نے جواب دیا: دونوں مرتبہ ''م'' پر زبر پڑھی جائے گی۔ یہ دو الفاظ کا مجموعہ ہے۔ پہلا لفظ ''مَن'' ہے اور دوسرا ''حَـمَنّا'' ہے۔ پہلے لفظ کا مطلب یہ ہے کہ ایسی نعمت جو ظاہری اور باطنی دونوں طرح کے نفع کی حامل ہو۔ ظاہری نفع کا تعلق موجودہ جہان کے ساتھ ہے اور باطنی نفع عالم ارواح میں ارواح کو نصیب ہو گا۔ گویا یہ ایک ایسی نعمت ہے جس سے ہر مخلوق ہر جہان میں فیض حاصل کرتی ہے اور بلاشبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان بھی یہی ہے۔ جبکہ دوسرا لفظ پہلے لفظ کی صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ پہلا لفظ اپنے معنی میں انتہا تک پہنچ چکا ہے۔ گویا دونوں الفاظ کے مجموعے کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ ایک ایسی نعمت ہے جس کا فائدہ ہر ایک کو حاصل ہوتا ہے اور یہ نعمت اپنی انتہا تک پہنچ چکی ہے اور اب کوئی اس کے برابر نہیں ہو سکتا۔ یہ لفظ بھی سریانی زبان سے تعلق رکھتا ہے۔

سیدی ابراہیم دسوقی کی تعلیم کردہ دعا

ایک مرتبہ تلمسان کا رہنے والا ایک نیک شخص سیّدی دباغ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے بتایا کہ اس کا ایک دوست حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے کے بعد سیّدی ابراہیم الدسوقی کے مزار پر حاضر ہوا، سیّدی ابراہیم الدسوقی اس کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے اور اسے یہ دعا سکھائی:

بسم الا له الخالق الاكبر، وهو حرز مانع مما اخاف منه واحذر، لا قدرة لمخلوق مع قدرة الخالق، يلجمه بلجام قدرته، احمی حميثا اطمی طميثا، وكان الله قويا عزيزا حمٓ عسٓقٓ حمايتنا كهيعصٓ كفايتنا، فسيكفيكهم الله وهو السميع العليم، ولا حول ولا قوة الا بالله العلي العظيم

''اللہ کے نام سے آغاز کرتا ہوں جو پیدا کرنے والا ہے، سب سے بڑا ہے، مجھے جس چیز کا ڈر یا خوف ہو اسی کی ذات اس ڈر یا خوف سے بچنے میں میرا سہارا ہے اس کی قدرت کے سامنے کسی بھی مخلوق کو کوئی قدرت حاصل نہیں، وہ اپنی قدرت کے تحت مخلوق کا نظام چلا رہا ہے۔ احمی حمیثا اطمی طمیثا اللہ تعالیٰ طاقت ور اور زبردست ہے حٰمٓ ۔عٓسٓقٓ میری حمایت ہے اور کٓھٰیٰعٓصٓ میرے لئے کافی ہے اور سب کے مقابلے میں تمہارے (یعنی میرے) لئے اللہ ہی کافی ہے اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اللہ کے سوا اور کسی کو کوئی قوت یا طاقت حاصل نہیں ہے اور اللہ بلند و بالا اور عظمت والا ہے۔''

پھر سیّدی دسوقی نے اس شخص کو حکم دیا کہ یہ دعا پڑھا کرو اور ہر قسم کے خوف کو جھٹک دو۔ وہ شخص کہتا ہے کہ میرا تلمسانی دوست، جس کا نام عبدالرحمان بن ابراہیم ہے، وہ ایک تاجر ہے اور شیخ ابن ابراہیم کی اس اولاد میں سے ہے جو تلمسان میں آ کر آباد ہوئی، اب کیونکہ حاجی عبدالرحمان صاحب کو احمی حمیثا و اطمی طمیثا کا مطلب معلوم نہیں ہے اس لئے انہوں نے یہ دعا نہیں پڑھی کیونکہ ممکن ہے کہ ان الفاظ کا معنی ایسا ہو جو انہیں ناپسند ہو اس لئے میں آپ (احمد بن مبارک) سے اس کا مطلب دریافت کر رہا ہوں۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے سیّدی عبدالعزیز دباغ سے ان کلمات کا مطلب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: آج کل کوئی بھی یہ الفاظ نہیں بولتا، تم نے یہ الفاظ کہاں سے سنے ہیں؟ میں نے سارا واقعہ گوش گزار کیا تو فرمانے لگے، ہاں! سیّدی ابراہیم الدسوقی اکابر اولیاء کرام میں سے ہیں اور آپ کو ''فتح کبیر'' عطا کی گئی تھی آپ جیسے مشائخ ہی یہ الفاظ استعمال کر سکتے ہیں پھر فرمایا: یہ سریانی زبان کے الفاظ ہیں:

''احمٰی'' کا مطلب ''**یا مالک**'' ہے اور اس کے اسرار میں ''**یا مالک الملک العظیم الاعظم الحی القیوم**'' (اے تمام جہانوں کے بادشاہ، عظمت والے، سب سے زیادہ عظیم، زندہ، بذات خود موجود، دوسروں کا وجود جس کے وجود کا محتاج ہے) شامل ہوں گے۔

''حمیثا'' میں، اللہ تعالیٰ کی سلطنت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اب گویا ''احمٰی حمیثا'' کا مطلب ہوگا:

یا مالك الاسرار یا مالك الانوار یا مالك اللیل والنهار یا مالك الحساب المدار، یا مالك الشموس و الاقمار، یا مالك العطاء والمنع، یا مالك الخفض والرفع یا مالك كل حي یا مالك كل شئي

''اے اسرار کے مالک، اے انوار کے مالک اے دن اور رات کے مالک، اے برستے ہوئے بادلوں کے مالک، اے سورج چاند ستاروں کے مالک، اے عطا اور بندش کے مالک، اے بلندی و پستی کے مالک، اے ہر زندہ چیز کے مالک اور اے ہر شے کے مالک!''

(سیّدی دباغ فرماتے ہیں:) اس اسم میں ایسا عجیب ''سر'' پوشیدہ ہے جسے تحریر نہیں کیا جا سکتا۔

''الٰمٓ'' کا مفہوم یہ ہے کہ سائل اللہ تعالیٰ کی ذات کو عظمت، کبریائی، قہر، غلبہ، عزت اور یکتائی کی صفات سے متصف کر رہا ہے گویا وہ زبان حال سے یہ کہہ رہا ہے:

یا عالم کل شيء، یا قادر علیٰ کل شيء یا مرید کل شيء و یا مدبر کل شيء و یا قاھر کل شيء و یا من لا یتطرق الیه عجز ولا یتوھم في تطرقه نقص

''اے ہر شے کے جاننے والے، اے ہر شے پر قدرت رکھنے والے، اے ہر شے کا ارادہ کرنے والے، اے ہر شے کی تدبیر کرنے والے، اے ہر شے پر غالب، اے وہ ذات جس پر عجز طاری نہیں ہوسکتا اور جس کے کسی کام میں نقص کا وہم بھی پیدا نہیں ہوسکتا۔''

''طٰمیٓثٓ'' میں کائنات کی طرف اشارہ ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کا تصرف جاری وساری ہے۔

(سیّدی دباغ فرماتے ہیں:) اس اسم میں بھی ایسا 'سِرّ' موجود ہے، جس کی وضاحت نہیں کی جاسکتی۔

سریانی زبان کی خصوصیات

سیّدی عبدالعزیز دباغ ارشاد فرماتے ہیں: ارواح کی زبان سریانی ہے۔ دیوان الصالحین کے اراکین بھی اسی زبان میں گفتگو کرتے ہیں کیونکہ لفظی اعتبار سے یہ نہایت مختصر اور معنوی اعتبار سے انتہائی وسیع زبان ہے۔ اور دوسری کوئی زبان اس خوبی میں اس کی ہم پلہ نہیں ہوسکتی۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: کیا عربی زبان بھی؟ آپ نے فرمایا: عربی زبان بھی اس کی ہم پلہ نہیں ہوسکتی البتہ قرآن میں موجود الفاظ کا حکم مختلف ہے۔ اگر عربی زبان میں سریانی کے معانی کو اکٹھا کرلیا جائے اور الفاظ عربی زبان کے ہوں تو یہ سریانی سے بھی زیادہ شیریں اور خوبصورت زبان ہوگی۔

سریانی کے سوا، دنیا کی تمام زبانوں میں اطناب (پھیلاؤ) پایا جاتا ہے۔ کیونکہ سریانی کے علاوہ ہر زبان میں الفاظ کی ترکیب کے ذریعے جملہ بنتا ہے۔ لیکن سریانی زبان میں حروف کے ذریعے جملہ بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سریانی زبان کے ہر حرف تہجی کا ایک مخصوص معنی ہے اور جب ایک حرف کو دوسرے حرف سے ملا دیا جائے تو جملہ مکمل ہوجاتا ہے۔ جس شخص کو سریانی کے حروف کا علم ہوجائے وہ آسانی کے ساتھ سریانی زبان بول یا سمجھ سکتا ہے۔ اور آگے چل کر وہ حروف کے اسرار کی معرفت حاصل کرسکتا ہے۔ یہ ایک زبردست علم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر رحمت کرتے ہوئے انہیں اس علم سے محجوب رکھا ہے کیونکہ اگر وہ اس علم سے آگاہ ہوجائیں تو ان کی ذات میں موجود ظلمت ان کی تباہی کا باعث بن جائے (کیونکہ وہ اس علم کو منفی طور پر استعمال کریں گے)۔ ہم اللہ تعالیٰ سے سلامتی کے طلبگار ہیں۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: جس طرح ''عود'' (کی لکڑی میں رس یعنی) پانی موجود ہوتا ہے۔ اسی طرح سریانی زبان دنیا کی ہر زبان میں موجود ہے کیونکہ دنیا کی ہر زبان حروف تہجی پر مشتمل ہوتی ہے اور ان حروف تہجی کی وضاحت سریانی زبان میں کی گئی ہے کہ کون سا حرف کس مخصوص مفہوم کی ادائیگی کے لئے مخصوص ہے؟ جیسے

عربی زبان میں لفظ ''احمد'' ہے۔ سریانی زبان کے اعتبار اس لفظ کے پہلے حرف ''ا'' کا اپنا ایک مخصوص معنی ہے۔ اسی طرح جب آپ ''ح'' کو ساکن پڑھیں گے تو اس کا اپنا مخصوص معنی ہوگا۔ ''م'' پر زبر اور ''د'' پر پیش پڑھیں گے تو دونوں الگ الگ مفہوم پر دلالت کریں گے۔ اسی طرح عربی زبان میں لفظ ''محمد'' ہے۔ یہ کسی شخصیت کا نام ہوسکتا ہے لیکن سریانی زبان میں اس کا ہر حرف ایک مخصوص مفہوم پر دلالت کرے گا۔ جیسے عبرانی زبان میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی ''بارقلیط'' ہے اس لفظ کا ہر حرف ایک مخصوص معنی پر دلالت کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ دنیا کی تمام زبانیں سریانی زبان سے نکلی ہیں اور سریانی دیگر تمام زبانوں کی اصل ہے۔ دیگر زبانوں کے وجود میں آنے کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں میں جہالت عام ہوگئی جبکہ سریانی میں گفتگو کرنے کے لئے معرفت پہلی شرط ہے تاکہ سامع کو آپ کے ہر حرف کے ذریعے اس کے مخصوص مفہوم کا پتہ چل جائے۔ لہٰذا سریانی زبان ایجاد کرنے والوں نے اس بات کا اہتمام کیا کہ مختصر طور پر ایسی زبان وضع کی جائے جس کے حروف تہجی وسیع معنی پر دلالت کر سکیں۔ کیونکہ مخاطب کو فائدہ اس وقت حاصل ہوگا جب اس کا ذہن آپ کے مطلوبہ معنی کی طرف منتقل ہوگا۔ کیونکہ بیشتر امور معنی سے متعلق ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ بالفرض اگر یہ ممکن ہوتا کہ آپ الفاظ وحروف کا سہارا لئے بغیر اپنا معنی مخاطب کو منتقل کر سکیں تو کبھی بھی کسی زبان کو ایجاد کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ یہی وجہ ہے کہ صرف اکابر اہل کشف یا ارواح یا فرشتے اس زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ اگر آپ انہیں یہ زبان بولتے ہوئے سن لیں تو یوں محسوس ہوگا جیسے وہ ایک یا دو حروف میں اپنا مدعا واضح کر دیتے ہیں یا چند الفاظ میں اتنا کچھ بیان کر دیتے ہیں جسے بیان کرنے کے لئے دوسری زبانوں میں کئی رجسٹر درکار ہوں گے۔

اب آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ جب بنی نوع انسان میں جہالت عام ہوگئی تو ان حروف کو دیگر معنی کی طرف منتقل کر دیا گیا اور ان حروف کی حیثیت مہمل الفاظ کی مانند ہوگئی اور یہ دستور چل نکلا کہ مختلف حروف کو ملا کر، لفظ کی شکل دے کر، مفہوم کی وضاحت کی جائے اور پھر ان الفاظ کو جملوں کی شکل میں استعمال کیا جانے لگا۔ اس طرح ایک بہت عظیم علم مفقود ہوگیا لیکن اس کے باوجود آپ دنیا کی کسی بھی زبان کا کوئی بھی لفظ لے لیں اس کا کوئی ایک حرف، سریانی زبان کے محاورے سے ضرور مطابقت رکھتا ہوگا یعنی جو لفظ کسی مخصوص معنی کیلئے ایجاد کیا گیا ہے۔ اسی لفظ کا ایک حرف سریانی زبان میں اسی معنی کی وضاحت کیلئے استعمال ہوتا ہوگا۔ جیسے عربی زبان میں لفظ ''حائط'' دیوار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن سریانی زبان میں اسکا پہلا حرف ''ح'' اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ عربی زبان میں پانی کیلئے لفظ ''ماء'' استعمال ہوتا ہے جبکہ سریانی زبان میں اس کے آخر میں آنے والا ''ء'' پانی کیلئے ایجاد کیا گیا ہے۔ عربی زبان میں آسمان کے لئے لفظ ''سماء'' موجود ہے اور سریانی میں اس کے معنی کے لئے صرف ''س'' استعمال ہوتا ہے۔ غرضیکہ اگر آپ تحقیق کریں تو آپ کو پتہ چل جائے گا کہ ہر لفظ کا کوئی ایک حرف مخصوص فہم کی ادائیگی کے لئے کافی ہوتا ہے اور بقیہ حروف خوامخواہ استعمال کیے جاتے ہیں۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: سیدنا آدم علیہ السلام جب زمین پر تشریف لائے تو اپنی زوجہ محترمہ اور بچوں کے

ساتھ سریانی میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ حضرت ادریس علیہ السلام کے زمانے تک اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی لیکن اس کے بعد تبدیلی کا عمل شروع ہو گیا اور دیگر بہت سی زبانیں وجود میں آ گئیں۔ اس میں سب سے پہلے ہندی (سنسکرت) زبان وجود میں آئی۔ اور یہ سریانی زبان سے خاصی قریب ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سریانی میں اس لئے گفتگو کیا کرتے تھے کیونکہ اہل جنت کی زبان سریانی ہے اور حضرت آدم علیہ السلام بھی جنت میں یہی زبان بولا کرتے تھے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) ارشار باری تعالیٰ ہے:

خَلَقَ الْإِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ''اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور اسے گفتگو کا سلیقہ عطا کیا۔''

(الرحمٰن ۵۵:۴-۳)

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے یہ بات بیان کی ہے کہ یہاں ''انسان'' سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور ''بیان'' کی تعلیم سے مراد 700 زبانوں کا علم ہے جن میں سب سے افضل عربی زبان ہے۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا: یہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو 700 زبانوں کا علم عطا کیا اور حضرت آدم علیہ السلام ان تمام زبانوں سے واقف تھے بلکہ ان سے نہایت کم درجے کے مالک، بہت سے اولیاء بھی ان زبانوں کا علم رکھتے ہیں لیکن وہ صرف اپنی مادری زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کی نشو و نما کیونکہ جنت میں ہوئی تھی اسی لئے وہ اہل جنت کی زبان میں گفتگو کیا کرتے تھے جو ''سریانی'' زبان تھی۔

ایک موضوع روایت

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) یہ بہترین جواب ہے اور اس جواب پر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول اس حدیث کے ذریعے اعتراض نہیں کیا جا سکتا:

احبوا العرب لثلاث : فانی عربی والقرآن عربی و کلام اهل الجنة عربی

''تین خصوصیات کی وجہ سے عربوں سے محبت کرو، میں عربی ہوں، قرآن عربی میں ہے اور اہل جنت کی زبان بھی عربی ہوگی۔''

کیونکہ شیخ عقیل فرماتے ہیں کہ اس روایت کی کوئی بنیاد نہیں ہے، علامہ ابن جوزی نے اسے من گھڑت قرار دیا ہے۔ میں نے سیّدی دباغ سے اس روایت کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نہیں ہے۔

کم سن بچوں میں سریانی کے اثرات

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: جو شخص کمسن بچوں کی باتوں کو غور سے سنے گا اسے ان کے الفاظ میں سریانی

زبان کے اثرات نظر آئیں گے۔ کیونکہ بچپن میں جو بات بچے کے ذہن میں ڈال دی جائے وہ پتھر پر لکیر کی مانند ہوتی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے بچوں کو سریانی زبان کی تعلیم دی اور ان کی اولاد میں ایک طویل عرصے تک سریانی زبان ہی محاورے میں استعمال ہوتی رہی۔ لیکن پھر جب اس میں تبدیلی کا عمل شروع ہوا تو سب بڑے اس زبان سے ناواقف ہوتے چلے گئے صرف کمسن بچوں کی زبان پر کبھی کبھار سریانی کے حروف جاری ہو جاتے ہیں، اس کی ایک اور حکمت یہ ہے کہ جب تک بچہ ماں کا دودھ پیتا رہتا ہے اس وقت تک اس کی روح کا تعلق ملاء اعلیٰ کے ساتھ قائم رہتا ہے۔ اس زمانے میں، وہ شیر خوار بچہ ایسے خواب دیکھتا ہے، اگر کوئی بڑا وہ خواب دیکھ لے، تو انتقال کر جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیر خوار بچے پر روح کے حکم کا غلبہ ہوتا ہے جبکہ بڑے شخص پر جسم کے اثرات غالب ہوتے ہیں۔ اور یہ بات ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ ارواح سریانی زبان میں گفتگو کرتی ہیں۔ جس طرح شیر خوار بچے کو حیرت انگیز خواب دکھائی دیتے ہیں اسی طرح اس کی زبان پر سریانی کے الفاظ بھی جاری ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اس کے جسم پر روح کا غلبہ ہوتا ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: عام طور پر شیر خوار بچے کے منہ سے ایک خاص آواز نکلتی ہے جس کا تلفظ ہم ''اغ'' کی شکل میں کر سکتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اسم صفت ہے اور رفعت، بلندی، لطف اور مہربانی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ گویا: وہ بچہ یہ کہہ رہا ہوتا ہے یا علی یا رافع یا حنان یا لطیف، اسی طرح آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ جب بچے کا دودھ چھڑوایا جاتا ہے تو اسے کھانے کے لئے کوئی ہلکی پھلکی چیز دی جاتی ہے جسے (مراکش کے محاورے کے مطابق) ''بوبو'' کہا جاتا ہے، سریانی زبان میں یہ لفظ کھانے کی میٹھی چیز کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ عام طور پر بچہ جس چھاتی سے دودھ پیتا ہے اسے بھی ''بوبو'' کہا جاتا ہے۔ اسی طرح جب بچے نے پاخانہ کرنا ہو تو وہ ''ءُ ءُ'' کی آواز نکالتا ہے، سریانی زبان میں یہ حرف کسی وجود میں سے خباثت کو باہر نکالنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح جب بچہ کسی اور چھوٹے بچے کو دیکھے تو زبان سے ''مومو'' کی آواز نکالتا ہے، سریانی زبان میں یہ لفظ کسی چھوٹے سے وجود کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عربی زبان میں آنکھ کی پتلی کو ''مومو العین'' کہتے ہیں۔ اگر آپ مشاہدہ جاری رکھیں تو اور بھی بہت سے الفاظ سے واقف ہو سکتے ہیں۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: آج کل مراکش میں کوئی بھی شخص سریانی زبان میں گفتگو نہیں کرتا۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) یہ بات آپ نے 9 ذوالحج 1129ھ کے دن ارشاد فرمائی، میں نے دریافت کیا: سیدی منصور، ان کا اس وقت انتقال ہو چکا تھا، یہ زبان بول سکتے تھے؟ آپ نے فرمایا: ہاں! مگر سیدی عبداللہ البرناوی زیادہ بہتر طور پر یہ زبان بول سکتے تھے۔ اہلِ دیوان عام طور پر اسی زبان میں گفتگو کرتے ہیں کیونکہ معنوی اعتبار سے اس میں بہت وسعت پائی جاتی ہے۔ اہل دیوان صرف اس وقت عربی زبان میں گفتگو کرتے ہیں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف فرما ہوں۔ کیونکہ ظاہری دنیاوی زندگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم عربی زبان میں گفتگو

فرماتے تھے۔اس لئے احترام کے طور پر،آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں عربی زبان میں گفتگو کی جاتی ہے۔ میں نے دریافت کیا: کیا سیّدی عمر الھواری اور سیّدی محمد لہواج بھی اس زبان سے واقف تھے؟ آپ نے فرمایا:نہیں۔

سوال قبر سریانی میں ہوگا

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: کیا قبر میں،سریانی زبان میں سوال جواب ہوگا؟ کیونکہ امام جلال الدین سیوطی کی ایک نظم میں یہ شعر موجود ہے:

ومن غريب ماترى العينان ان سؤال القبر بالسرياني

"انسان کے لئے حیرانگی کی بات یہ ہے کہ قبر میں،سریانی زبان میں،میت سے سوال و جواب سریانی زبان میں ہوں گے۔"

اس نظم کے شارح بیان کرتے ہیں،امام سیوطی نے اپنی تصنیف "شرح الصدور" میں شیخ الاسلام علم الدین البلقینی کے فتاویٰ کے حوالے سے یہ بات نقل کی ہے کہ قبر میں،سریانی زبان میں،میت سے سوال جواب ہوگا۔ سیوطی فرماتے ہیں: تاہم مجھے کسی حدیث میں یہ بات نہیں مل سکی۔علامہ ابن حجر سے یہی سوال کیا گیا،تو انہوں نے جواب دیا: حدیث کے الفاظ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاید قبر میں،سوال جواب،عربی زبان میں ہوگا۔تاہم یہ ممکن ہے کہ ہر شخص سے اس کی مخصوص زبان میں سوال جواب کیا جائے گا اور یہ بات زیادہ معقول محسوس ہوتی ہے۔

سیّدی دباغ نے جواب دیا: قبر میں سوال جواب سریانی زبان میں ہوگا۔کیونکہ فرشتے اور ارواح یہی زبان بولتے ہیں۔سوال فرشتے کریں گے اور جواب روح دے گی کیونکہ جب روح جسم سے نکل جائے تو اپنی اصل کی طرف لوٹ جاتی ہے۔اللہ تعالیٰ جب کسی ولی کو "فتح کبیر" عطا فرما دے تو وہ باقاعدہ سیکھے بغیر ہی سریانی زبان میں گفتگو کرنے کی صلاحیت حاصل کر لیتا ہے کیونکہ اس وقت اس پر روح کا حکم غالب ہو جاتا ہے۔اس لئے (روح کے غلبے کے باعث ہی) مردے کو سریانی زبان میں گفتگو کرتے ہوئے کوئی الجھن درپیش نہیں ہوگی۔

سوالِ قبر کے الفاظ

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے عرض کی: قبر میں سوال جواب کی جو کیفیت ہوگی اسے بیان کریں؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: منکر اور نکیر سریانی زبان میں میت کو مخاطب ہوتے ہوئے دریافت کریں گے،"مراز ہو۔"

"م" پر زبر پڑھی جائے گی اور اس سے مراد ساری کائنات میں موجود جملہ مخلوقات ہیں۔

"ز" پر بھی زبر پڑھی جائے گی اور اس سے مراد کائنات میں موجود تمام تر خوبیاں ہیں۔

''ز'' کو ساکن پڑھا جائے گا۔ اور اس سے مراد کائنات میں موجود تمام تر برائیاں ہیں۔

''ہ'' کو ساکن بھی پڑھا جا سکتا ہے اور اس پر ہلکی سی پیش بھی پڑھی جا سکتی ہے۔ جس سے یوں محسوس ہو کہ شاید اس کے بعد ''واؤ'' بھی موجود ہے۔ یہ حرف اس ذات پر دلالت کرتا ہے جو اس ساری کائنات کی خالق ہے۔

لہٰذا پہلے حرف کے ذریعے پوری کائنات کی طرف اشارہ ہوگا اور دوسرے حرف کے ذریعے کائنات میں موجود تمام تر خوبیوں کی طرف اشارہ ہوگا۔ جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، جملہ انبیاء کرام علیہم السلام، تمام فرشتے، آسمانی کتابیں، جنت، لوح، قلم، زمین اور آسمان میں موجود تمام تر انوار، عرش کے اوپر اور نیچے موجود سب کچھ، اور اس کے علاوہ تمام اشیاء جو باعث خیر ہیں۔ تیسرے حرف کے ذریعے کائنات میں موجود ان تمام اشیاء کی طرف اشارہ ہوگا جن کا وجود برائی کی حیثیت رکھتا ہے، اس میں دوزخ، ہر خبیث وجود مثلاً شیطان اور ہر وہ وجود جو شر کا باعث ہو شامل ہوگا اور آخری حرف کے ذریعے اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات مراد ہوگی۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: سریانی زبان کا اصول یہ ہے کہ بعض معانی کی وضاحت کے لئے صرف کلام کے سیاق وسباق کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ ان کے لئے مخصوص الفاظ ایجاد نہیں کیے گئے ان معانی میں قسم، استفہام، تمنا وغیرہ شامل ہیں۔ چنانچہ مذکورہ بالا لفظ میں اگرچہ استفہام کی وضاحت کے لئے باقاعدہ کوئی حرف نہیں ہے لیکن قرینہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ مخاطب سے کوئی بات دریافت کی گئی ہے گویا یہ پوچھا جا رہا ہے کہ ساری کائنات، انبیاء کرام، فرشتوں، آسمانی کتابوں، جنت، تمام باعث خیر اشیاء، جہنم، شیاطین اور تمام باعث شر اشیاء کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے؟

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: مردہ اگر مومن ہو تو اس کے جواب میں کہے گا: ''مرادازیرہو۔''

''م'' پر زبر پڑھی جائے گی اور اس سے مراد ساری کائنات ہوگی۔

''ر'' پر زبر پڑھی جائے گی اور اس سے مراد نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم اور اس سے نکلنے والے تمام تر انوار ہوں گے جن میں انبیاء و مرسلین، فرشتوں، لوح، قلم، برزخ اور ان تمام اشیاء کے انوار ہوں گے جنہیں نور سے پیدا کیا گیا ہے۔

میت کے جواب میں ''ر'' سے مراد نور محمدی اس لئے لیا گیا ہے کہ میت کا تعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے ساتھ ہے اس لئے میت کی یہ خواہش ہوگی کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن سے وابستہ ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے کے نیچے آ جائے۔ البتہ سوال میں اس سے مراد تمام باعث خیر اشیاء ہیں۔ ''ر'' کے معنی کی وضاحت کے لئے سوال اور جواب کی تشریح میں کوئی تفاوت موجود نہیں ہے کیونکہ ہر خیر کا ماخذ نور محمدی ہے۔

''د'' کو ساکن پڑھا جائے گا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ سابقہ حرف کے مفہوم میں شامل تمام اشیاء حق ہیں۔

گویا میت یہ کہنا چاہتی ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم، نبی برحق ہیں، تمام انبیاء برحق ہیں، تمام فرشتے برحق ہیں اور سابقہ حرف کے مفہوم میں شامل تمام اشیاء برحق ہیں۔ اور ان کے حق ہونے میں کسی شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

''ا'' پر زبر پڑھی جائے گی اس حرف کے ذریعے بعد میں آنے والے حرف کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے گویا یہ سریانی زبان کے حروف اشارہ میں شامل ہے جیسے عربی زبان میں ھذا وھذہٖ (یہ) استعمال ہوتے ہیں۔

''ز'' پر زیر پڑھی جائے گی اور یہ ہر اس چیز کے لئے وضع کیا گیا ہے جو شر اور برائی کا حصہ ہے۔ چنانچہ ظلمت حقیقی اور اس کے ذریعے پیدا ہونے والی تمام ظلمتیں شامل ہو جائیں گی جس میں شیاطین اور دوزخ بھی شامل ہیں۔

''ر'' کو ساکن پڑھا جائے گا۔ اور اس سے مراد یہ ہے کہ سابقہ حرف کے تحت جو چیز بھی شامل ہے وہ تمام برحق ہے۔

''ہ'' پر پیش پڑھی جائے گی اور اس کے ذریعے وہی ذات مراد ہے جو ان تمام اشیاء کی خالق ہے اور وہ ان کا مالک و متصرف ہے، غلبے کا مالک ہے اور اختیار کا مالک ہے۔ گویا میت کا جواب یہ ہے کہ ساری کائنات، ہمارے برحق نبی صلی اللہ علیہ وسلم، تمام برحق انبیاء، تمام برحق فرشتوں، تمام باعث خیر اشیاء، جہنم، تمام باعث شر اشیاء کا خالق، مالک، ان میں تصرف کرنے والا، ان کا مالک و مختار صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ ایک ہے اس کا کوئی مقابل، کوئی شریک نہیں ہے اور اس کے حکم کو ٹالنے کی جرأت یا طاقت کسی میں بھی نہیں ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: جب میت یہ جواب دیدے تو فرشتے اسے مخاطب کر کے کہتے ہیں: ''ناصر۔''

''ن'' پر زبر پڑھی جائے گی اور اس کے بعد ''ا'' ساکن ہوگا۔ اس سے مراد انسان کے وجود میں موجود نور ہے۔

''ص'' پر زیر پڑھی جائے گی اور اس کا مطلب ''مٹی'' ہے۔

''ر'' ساکن ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ سابقہ مضمون درست ہے۔

فرشتوں کے اس قول کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے مرحوم تیرا وجود مٹی پر مشتمل ہے لیکن تیرے وجود کے اندر ایمان کا نور موجود ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) یہ مفہوم اس حدیث سے مطابقت رکھتا ہے جس کے مطابق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: (قبر میں سوال جواب کے بعد، فرشتے مسلمان کی میت سے یہ کہتے ہیں):

نم صالحا قد علمنا ان کنت لموقنا ''آرام سے سو جاؤ! ہمیں معلوم تھا کہ تم مومن ہو۔''

قرآن میں سریانی الفاظ

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے سیّدی دباغ سے قرآن مجید کے بعض ان الفاظ کے معانی بھی

دریافت کئے ہیں جن کے بارے میں علماء کے درمیان یہ اختلاف پایا جاتا ہے کہ وہ سریانی زبان کے الفاظ ہیں یا کسی اور زبان سے تعلق رکھتے ہیں؟

ان میں سے ایک لفظ ''اسفارا'' ہے۔ شیخ واسطی اپنی تصنیف ''الارشاد'' میں تحریر کرتے ہیں کہ یہ سریانی زبان کا لفظ ہے اور اس کا مطلب ''کتاب'' ہے جبکہ شیخ ابن ابی حاتم نے شیخ ضحاک کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ قبطی زبان کا لفظ ہے اور اس کا مطلب ''کتاب'' ہے یہ تشریح امام سیوطی نے اپنی کتاب ''الاتقان'' میں تحریر کی ہے۔

سیّدی دباغ نے ارشاد فرمایا: واسطی کا قول درست ہے یہ سریانی زبان کا لفظ ہے اور اس کا مطلب ''کتاب'' ہے۔ لیکن اس لفظ میں اس قدر عظیم معانی کا ذخیرہ ہے کہ عام انسان ان کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔

''ا'' اسم اشارہ کے طور پر استعمال ہوا ہے جس کا مطلب ''یہ'' ہے۔

''س'' سے مراد قابل تعریف اشیاء ہیں۔

''ف'' سے مراد وہ اشیاء ہیں جو انسانی طاقت سے ماوراء ہیں۔

''ر'' بھی اسی نوعیت کے مفہوم پر دلالت کرتی ہے۔

گویا اس لفظ کا مطلب یہ ہوا کہ ان کتابوں میں ایسی خوبیاں پائی جاتی ہیں جو انسانی طاقت سے ماوراء ہیں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) دوسرا لفظ ''ربانیون'' ہے۔ شیخ جوالیقی تحریر کرتے ہیں، شیخ ابوعبیدہ فرماتے ہیں کہ عرب اس لفظ سے واقف نہیں ہیں۔ میرے خیال کے مطابق یہ لفظ عبرانی یا سریانی زبان سے تعلق رکھتا ہے تاہم شیخ ابوالقاسم نے اسے یقینی طور پر سریانی زبان کا لفظ قرار دیا ہے۔ یہ بھی ''الاتقان'' میں تحریر ہے۔

سیّدی دباغ نے ارشاد فرمایا: یہ سریانی زبان کا لفظ ہے اور اس سے مراد وہ حضرات ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے کسی رسمی تعلیم و تربیت کے بغیر ''فتح'' عطا کی ہو۔ یہ لفظ تین الفاظ کا مجموعہ ہے:

(1) ربا (2) نی (3) یون

''ر'' سے مراد خیر کثیر ہے اور ''ب'' بھی اسی معنی سے متعلق ہے۔

''ن'' سے مراد قرب ہے۔

''ی'' سے مراد وہ چیز ہے جو کسی ایک حالت پر قائم نہ رہتی ہو، جیسے نور

''ن'' اس سے مراد وہ خیر ہے جو انسان کی ذات میں موجود ہوتی ہے۔

گویا اس لفظ کا یہ مطلب ہوا کہ اہل فتح میں پائی جانے والی یہ خوبی اللہ تعالیٰ کے انوار میں سے ایک نور ہے جو اس کی ذات میں موجود ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) ایک لفظ ''ھیت لک'' ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ایک روایت کے مطابق یہ قبطی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ''آؤ'' ہیں۔ شیخ حسن بصری نے اسے سریانی زبان کا لفظ قرار دیا ہے۔ ابن جریر نے بھی یہی روایت نقل کی ہے۔ جبکہ شیخ عکرمہ کے نزدیک یہ حورانی زبان کا لفظ ہے شیخ

ابوزید انصاری نے اسے عبرانی زبان کا لفظ قرار دیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ یہ لفظ اصل میں حیت لہ ہے۔ (یہ تمام تفصیل بھی ''الاتقان'' میں موجود ہے) سیّدی دباغ نے ارشاد فرمایا: یہ سریانی زبان کا لفظ نہیں ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اسی طرح لفظ ''عدن'' کے بارے میں منقول ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت کعب الاحبار سے اس لفظ کا مطلب دریافت کیا: تو انہوں نے فرمایا: سریانی زبان میں انگوروں کے باغات کو ''عدن'' کہا جاتا ہے۔ تاہم ابن جریر نے اسے رومی زبان کا لفظ قرار دیا ہے۔ (یہ تفصیل بھی ''الاتقان'' سے ماخوذ ہے) سیّدی دباغ نے جواب دیا: یہ سریانی زبان کا لفظ ہے اور پھر اس کی مفصل تشریح بیان کی۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) ''رھوا'' کے بارے میں واسطی کہتے ہیں کہ یہ سریانی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ''ساکن'' ہیں۔ شیخ ابوالقاسم نے اسے قبطی زبان کا لفظ قرار دیا ہے جس کا معنی ''آسان'' ہے۔ سیّدی دباغ نے فرمایا: یہ سریانی زبان کا لفظ ہے اور اس سے مراد وہ قوت ہے جو عام انسانی طاقت سے باہر ہو۔ لہٰذا اگر ہم کسی شخص کے بارے میں یہ کہیں کہ وہ ''رھو'' ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس جیسا طاقتور شخص اور کوئی نہیں ہے۔ اگر کسی قبیلے کو ''رھو'' کہا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کوئی بھی قبیلہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس بیان سے اس لفظ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے اگر آپ تفصیلی طور پر اس لفظ کے معنی میں غور کریں تو شیخ کا بیان درست معلوم ہوگا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) ان کے علاوہ اور بھی بہت سے سریانی الفاظ کے معانی، میں نے حضرت سے دریافت کئے تھے لیکن طوالت کے خوف سے انہیں یہاں ترک کر رہا ہوں۔

غوث اور اقطاب سریانی سے واقف ہوتے ہیں

سیّدی دباغ ارشاد فرماتے ہیں: صرف غوث اور اس کے ماتحت سات اقطاب، سریانی زبان سے واقف ہوتے ہیں۔ 1125ھ میں سیّدی احمد بن عبداللہ نے تقریباً ایک ماہ کے عرصے میں مجھے یہ زبان سکھائی تھی۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) سیّدی دباغ نے یہ بات 4 ذوالحج 1129ھ کے دن ارشاد فرمائی۔ سیّدی احمد بن عبداللہ سے مراد وہ بزرگ ہیں جو سیّدی دباغ سے پہلے غوثیت کے مرتبے پر فائز تھے اور ان کے وصال کے بعد ان کی روحانی وراثت سیّدی دباغ کو نصیب ہوئی تھی۔ سیّدی دباغ نے سریانی زبان اس وقت سیکھی جب ''فتح'' کے حصول کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ سیّدی احمد بن عبداللہ نے آپ کو یہ زبان اس لئے سکھائی کیونکہ وہ اس بات سے واقف تھے کہ آپ عنقریب قطبیت کے مرتبے پر فائز ہوں گے اور واقعی کچھ عرصے بعد سیّدی دباغ قطبیت کے مرتبہ پر فائز ہوئے۔

سیّدی دباغ کا یہ کہنا کہ اکابر اولیاء کے علاوہ اور کوئی بھی شخص اس زبان سے واقف نہیں ہو سکتا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حروف مقطعات کی تفسیر اکابر اولیاء ہی سے منقول ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) 9ذوالحج 1129ھ کے دن سیّدی دباغ نے مجھے سریانی زبان کے قواعد سکھائے اور الحمد للہ! میں نے ایک ہی دن میں یہ تمام قواعد سیکھ لئے تو سیّدی دباغ نے ارشاد فرمایا: میں نے ایک ماہ میں یہ زبان سیکھی تھی اور تم نے ایک ہی دن میں یہ زبان سیکھ لی ہے؟ میں نے آپ کی دست بوسی کرتے ہوئے عرض کی: یہ آپ ہی کی برکت۔ اور آپ کے انداز تدریس کا اعجاز ہے۔

قرآن کی باطنی تفسیر

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) 1129ھ میں ماہ رمضان کی آخری تاریخ تھی جب میں نے آپ سے قرآن کی اس آیت کی تفسیر دریافت کی:

اِذَا الشَّمۡسُ كُوِّرَتۡ ''جب سورج کو لپیٹ دیا جائے گا۔'' (التکویر ۸۱:۱)

میں نے دریافت کیا: عام طور پر کہا جاتا ہے کہ قرآن کے ہر لفظ کا ایک ظاہری معنی ہوتا ہے اور ایک باطنی معنی ہوتا ہے؟

سیّدی دباغ نے ارشاد فرمایا: یہ بات درست ہے۔ میں نے عرض کی: کیا قرآن کی اس (مذکورہ بالا) آیت کا بھی کوئی باطنی معنی ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں، اس کا ظاہری معنی اس کے آخری حصے کی تائید کرتا ہے اور اس کا باطنی معنی اس کے پہلے حصے کی تائید کرتا ہے۔ میں نے دریافت کیا: اس کے آخری معنی سے مراد کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: اس کے آخری حصے سے مراد وہ امور ہیں جو قیامت کے دن میدان محشر میں وقوع پذیر ہوں گے۔ اور اس کے پہلے حصے سے مراد وہ امور ہیں جن کا تعلق عالم ارواح کے ساتھ ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) پھر آپ نے عالم ارواح سے متعلق حصے کی تشریح بیان کی، جس میں بہت سی حیرت انگیز باتیں موجود تھیں اور ان کا تعلق اللہ تعالیٰ کے اسرار کے ساتھ تھا جنہیں تحریر نہیں کیا جا سکتا۔

پھر اس کے بعد میں نے قرآن کی اس آیت کی تفسیر دریافت کی، جس کا ظاہری مضمون عالم ارواح سے متعلق تھا:

وَاِذۡ اَخَذَ رَبُّكَ مِنۡۢ بَنِىۡۤ اٰدَمَ مِنۡ ظُهُوۡرِهِمۡ ذُرِّيَّتَهُمۡ (الاعراف ۷:۱۷۲)

''اور یاد کرو اس وقت کو جب تمہارے پروردگار نے اولادِ آدم کی پشت سے ان کی نسل کو نکالا۔''

میں نے دریافت کیا: اس کا باطنی مفہوم کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: اس کا باطنی مفہوم وہ ہے جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ازلی علم اور (اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ) ازلی تقدیر کے ساتھ ہے۔

میں نے سیّدی دباغ سے اس آیت کا مفہوم دریافت کیا کہ اس کا باطنی معنی کیا ہے:

اِنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ فِى الدَّرۡكِ الۡاَسۡفَلِ مِنَ النَّارِ (النساء ۴:۱۴۵)

''بے شک منافقین جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں رکھے جائیں گے۔''

آپ نے فرمایا: اس سے مراد وہ ظلمت ہے جو عالم ارواح میں موجود ہے۔ جس کے ذریعے جہنم کو پیدا کیا

گیا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے اور منافقین کی ارواح کے لئے اس ظلمت میں ویسا ہی تاریک مقام موجود ہے جیسا ان کے اجسام کے لئے جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں مخصوص مقام موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: کیا ان باطنی معانی کا علم حاصل کرنے کا کوئی مخصوص طریقہ ہے؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: قرآن کے باطنی معنیٰ کا علم صرف کشف کے ذریعے حاصل ہوسکتا ہے تاہم اگر کوئی شخص سریانی زبان سے واقفیت حاصل کر لے تو کسی حد تک باطنی معنیٰ سے واقفیت حاصل کرسکتا ہےاور اسے پتہ چل جائے گا کہ دنیا، آخرت، عالم ارواح، آسمانوں، زمینوں، عرش پر کیا کچھ موجود ہے۔ اسی طرح قرآن میں جن بے انتہا معانی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان میں سے بعض معانی کا علم بھی اسے حاصل ہو جائے گا۔ اور اس وقت اسے صحیح معنیٰ میں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا مطلب سمجھ میں آئے گا:

مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ

''ہم نے اس کتاب میں سب کچھ بیان کر دیا۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: کیا قرآن لوح محفوظ میں عربی زبان میں موجود ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں! البتہ اس کا بعض حصہ سریانی زبان میں بھی تحریر ہے۔ میں نے دریافت کیا: قرآن کا کون سا حصہ سریانی زبان میں تحریر ہے؟ آپ نے فرمایا: حروف مقطعات۔ میں نے عرض کی: اس جواب کی مجھے کئی برس سے تلاش تھی اور میری تلاش آج ختم ہوگئی۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) 1125ھ میں رجب کے مہینے میں مجھے پہلی مرتبہ سیّدی دباغ کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ آپ کی زبانی بہت سی ایسی باتیں سنیں، جو میرے لئے حیرانگی کا باعث بن گئیں۔ آپ نے میری حیرانگی کو محسوس کرتے ہوئے فراخدلی سے ارشاد فرمایا: تم کوئی بھی سوال کر سکتے ہو، میں نے عرض کی: حروف مقطعات میں ایک حرف ''ص'' بھی ہے اس کا مفہوم کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا: اگر لوگوں کو اس کے مفہوم کا پتہ چل جائے تو کبھی بھی، کوئی بھی شخص اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی جرأت نہ کر سکے۔ (تاہم آپ نے اس حرف کی تفصیل بیان نہیں کی۔)

حروفِ مقطعات کے اسرار

پھر میں نے کٓھٰیٰعٓصٓ کا مطلب دریافت کیا: تو آپ نے فرمایا: ان حروف میں سورۃ مریم کے تمام مضامین کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے جس میں حضرت زکریا، حضرت یحییٰ، حضرت مریم، حضرت عیسیٰ، حضرت ابراہیم، حضرت اسمٰعیل، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت موسیٰ، حضرت ہارون، حضرت ادریس، حضرت آدم اور حضرت نوح علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام کا تذکرہ شامل ہے۔ اور اس کے علاوہ مزید مضامین بھی موجود ہیں۔ سیّدی دباغ فرماتے ہیں: یہ تمام رموز لوح محفوظ میں تحریر ہیں اور ہر رمز کے ساتھ اسکی تشریح بھی موجود

ہے۔ رمز کے لئے مخصوص حرف کو بڑی سی شکل میں لکھا جاتا ہے اور اس کی تشریح اوپر، نیچے یا درمیان میں تحریر کی جاتی ہے۔ جیسے اگر تحریر کے دوران کوئی لفظ رہ جائے تو اسے درمیان میں، ذرا اوپر یا نیچے کر کے تحریر کر دیا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح سورتوں کے آغاز میں آنے والے حروف مقطعات میں بھی سورۃ کے بغیر مضامین کی طرف اشارہ موجود ہوتا ہے اور لوح محفوظ میں اس کی پوری تفسیر درج ہوتی ہے۔ مثلاً لوح محفوظ میں ''ص'' اس قدر بڑا لکھا ہوا ہے کہ اگر اس کے دو کناروں کے درمیان کوئی شخص چلنا شروع کرے تو ایک دن میں اس مسافت کو طے کر سکے گا۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: حروف مقطعات کا علم صرف اس شخص کو ہو سکتا ہے جو لوح محفوظ کو پڑھنے کی صلاحیت رکھتا ہو یا دیوان الصالحین کے اراکین کے ساتھ میل جول رکھتا ہو۔ اس کے علاوہ کسی بھی شخص کو حروف مقطعات کا معنی سمجھنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران، دونوں کے آغاز میں ''الم'' موجود ہے۔ کیا دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے یا ان کے درمیان کوئی فرق پایا جاتا ہے؟ آپ نے جواب دیا: دونوں کے معنی مختلف ہیں اور ہر ایک کے معنی کا تعلق اس سورۃ کے مخصوص مضامین کے ساتھ ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے یہ جواب اس وقت حاصل کیا جب حضرت کے ساتھ شناسائی کا بالکل ابتدائی مرحلہ تھا۔

آپ کا جواب سن کر مجھے اندازہ ہوا کہ آپ اکابر اولیاء میں سے ہیں کیونکہ اکابر اولیاء حروف مقطعات کی تفسیر بیان کرتے ہوئے اس بات کی وضاحت کر دیتے ہیں کہ ان حروف کی تفسیر سے صرف وہی شخص واقف ہو سکتا ہے جس کا تعلق ''اوتاد الارض'' کے ساتھ ہو۔ لہٰذا سیّدی دباغ کی بیان کردہ تفسیر میرے لئے اس بات کی بھرپور شہادت تھی کہ آپ ولایت کے عظیم مرتبے پر فائز ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں آپ کی محبت عطا کرے اور آپ کے علوم و معارف سے فیض یاب ہونے کی توفیق عطا کرے۔ حالانکہ آپ نے رسمی طور پر ان علوم کی تعلیم حاصل نہیں کی۔ بلکہ آپ نے رسمی طور پر پورا قرآن مجید بھی نہیں پڑھا۔ آپ کو قرآن مجید کی صرف چند سورتیں زبانی یاد تھیں۔ لیکن اگر کوئی شخص آپ کو قرآن کی تفسیر بیان کرتے ہوئے سن لے تو وہ یقینی طور پر حیرانگی کا شکار ہو جائے گا۔ لہٰذا اکابر صوفیاء کی تصریحات اس بات کی گواہ ہیں کہ سیّدی عبدالعزیز دباغ اکابر صوفیاء میں سے ایک ہیں۔

حکیم ترمذی، اپنی کتاب ''نوادر الاصول'' میں تحریر کرتے ہیں: حروف مقطعات میں، متعلقہ سورۃ کے تمام مضامین کی طرف اشارہ موجود ہوتا ہے اور اس اشارے کو صرف وہی حضرات سمجھ سکتے ہیں جو (کم از کم) اوتاد کے مرتبہ پر فائز ہوں، اللہ تعالیٰ اپنے خاص فضل و کرم کی بدولت انہیں حروف مقطعات کا علم عطا فرما دیتا ہے۔ یہ علم دراصل معجم حروف کا علم ہے۔ جس کی مدد سے تمام علوم کی تعبیر کی جاتی ہے۔ انہی حروف کے ذریعے اسماء خداوندی کا ظہور ہوتا ہے جو لوگوں کی زبان پر جاری ہوتے ہیں۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) حکیم ترمذی کی اس

عبارت کو عارف باللہ سیّدی ابوزید عبدالرحمان الفاسی نے، سیّدی ابوالحسن الشاذلی کی ''حزب کبیر'' کے حاشیے میں نقل کیا ہے۔ سیّدی ابوزید الفاسی مزید لکھتے ہیں:

''کسی صوفی بزرگ کا قول ہے، اسماء اور حروف کی معرفت کا تعلق انبیاء کرام کے ان علوم کے ساتھ ہے جو ان کی ''شان ولایت'' سے متعلق ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان علوم میں سے بعض علوم عام اولیاء کرام کو بھی عطا کر دیئے جاتے ہیں ان علوم کا تعلق کشف کے ساتھ ہوتا ہے لہٰذا انہیں عقل کے ذریعے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ جو شخص ان علوم سے ناواقف ہو وہ پوری رسمی کوشش کے باوجود ان سے واقفیت حاصل نہیں کر سکتا اور جنہیں یہ علوم نصیب ہو جائیں وہ کبھی ان سے محروم نہیں ہو سکتا۔ ہر شخص کو اپنے مرتبہ ولایت کے مطابق ان علوم سے نوازا جاتا ہے کیونکہ مختلف اولیاء کی ولایت کے مراتب مختلف ہوتے ہیں اس لئے ان حضرات کے تفسیری اقوال کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔'' (گویا قرآن کے الفاظ میں حقیقت یوں ہے)

يُسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَّ نُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِى الْاُكُلِ۔ (الرعد ۱۳:۴)

''ان سب کو ایک ہی پانی سے سیراب کیا جاتا ہے لیکن کسی ایک کا پھل دوسرے سے بہتر ہوتا ہے۔''

شیخ ابوزید الفاسی لکھتے ہیں۔ ''شیخ وذحی نے اپنی تفسیر میں یہ بات تحریر کی ہے: حروف مقطعات قرآن کی سورتوں کے مضامین کے رموز پر مشتمل ہیں اور ان کا مفہوم اولیاء کاملین کے سوا اور کوئی نہیں جان سکتا۔'' شیخ ابوزید فرماتے ہیں: ''اگر یہاں کوئی شخص یہ اعتراض کر دے کہ مختلف سورتوں کے مضامین مختلف ہوتے ہیں لیکن بعض اوقات ایک طرح کے حروف مقطعات دو مختلف سورتوں کے آغاز میں آ جاتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے ان رموز کی حیثیت ان الفاظ کی مانند ہو گی جو مختلف معانی پر مشتمل ہوتے ہیں۔'' (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) سیّدی ابوزید الفاسی نے اس حاشیے میں دیگر صوفیاء کے اقوال بھی نقل کئے ہیں۔ جن میں سیّدی عبدالغفور، سیّدی محمد بن سلطان اور سیّدی داؤد الباغلی شامل ہیں۔ اگر آپ ان حضرات کے بیانات کا مطالعہ کر لیں تو آپ بخوبی سیّدی عبدالعزیز دباغ کی عظمت شان سے واقف ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں آپ کی محبت سے مالا مال فرمائے۔

حروفِ مقطعات

9 ذوالحج 1129ھ تک میں نے حروف مقطعات کے بارے میں سیّدی دباغ کے جو ملفوظات سنے ان کے صحیح معنی سے مستفید نہیں ہو سکا۔ یہاں تک کہ 9 ذوالحج کو آپ نے یہ بات بیان کی، حروف مقطعات لوح محفوظ میں سریانی زبان میں تحریر ہیں۔ اسی پر میں نے درخواست کی آپ ان تمام حروف کی الگ الگ تشریح بیان کریں اور حروف مقطعات کے رموز کی وضاحت فرمائیں۔ آپ نے میری اس درخواست کو قبول کیا اور مکمل تشریح عنایت فرمائی جس کا خلاصہ میں اپنے الفاظ میں یہاں نقل کروں گا۔ کیونکہ مکمل تشریح کو نقل کرنے کے لئے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہو گی۔

''ص'' کی تشریح

(احمد بن مبارک کہتے ہیں: حروف مقطعات میں سے) ''ص'' کی تشریح کرتے ہوئے سیّدی دباغ نے ارشاد فرمایا: اس سے مراد وہ خلا ہے جہاں قیامت کے دن ساری مخلوق کو جمع کیا جائے گا۔ اور اسے وعید کے طور پر سورۃ کے شروع میں ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی ''ص'' وہ خوشنما منظر ہے جس کی اے اہل ایمان! تم کو بشارت دی جاتی ہے۔ یا وہ خوفناک منظر ہے جس سے (اے کفار!) تمہیں ڈرایا جاتا ہے۔ ''ص'' حشر کا وہ میدان ہے جس کا خلا ہر انسان کی حیثیت کے مطابق مختلف شکلیں اختیار کر لے گا۔ کافر کے لئے وہ ایک عذاب ہوگا اور مومن کے لئے باعث رحمت ہوگا۔ اس مومن کے پہلو میں ایک دوسرا کافر کھڑا ہوگا۔ لیکن اس کے لئے مخصوص عذاب پہلے کافر سے مختلف ہوگا جبکہ کسی دوسرے مومن کے لئے مخصوص رحمت اس مومن کے لئے مخصوص رحمت سے مختلف ہوگی جو اس دوسرے مومن کے اعمال کے مطابق ہوگی۔ یہاں تک کہ میدان محشر میں موجود ہر شخص کے لئے اس خلا کی حیثیت مختلف ہوگی۔ بظاہر دیکھنے میں ایک ہی خلا موجود ہوگا۔ جس شخص کو ''فتح'' نصیب ہو چکی ہو وہ با آسانی دیکھ سکتا ہے کہ زید اپنے مقدر کے مطابق خلا میں موجود ہے اور عمرو اپنے نصیب کے مطابق خلا میں موجود ہے اور وہ سب لوگ یوں محسوس کریں گے جیسے براہ راست بارگاہ خداوندی میں حاضر ہیں۔ اسی لئے ہم نے پہلے بیان کیا تھا کہ اگر لوگوں کو ''ص'' کی تفسیر کا پتہ چل جائے تو کوئی بھی شخص، کبھی بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی جرأت نہ کرے۔ کیونکہ اگر ہر شخص کو اس کا مخصوص مقام دکھا دیا جائے تو مطیع و فرمانبردار شخص کی یہ خواہش ہوگی کہ اے کاش! میں مزید نیک اعمال کرتا اور اس سے بہتر مقام کا مستحق قرار پاتا اور گنہگار شخص کی یہ خواہش ہوگی کہ اے کاش! میرا وجود مکمل طور پر فنا کا شکار ہو جائے۔

کیونکہ میدان محشر میں کفار بھی ہوں گے اس لئے سورۃ کے آغاز میں کفار کا تذکرہ کیا گیا پھر انبیاء کا تذکرہ کیا گیا، پھر مومنین کی طرف اشارہ کیا گیا اور آخر میں جنات اور شیاطین کا ذکر کر کے ان کے دنیاوی حالات کی طرف اشارہ کیا گیا۔ اگرچہ قیامت کے دن، دنیاوی معاملات جیسا معاملہ نہیں ہوگا لیکن اس دن ہر شخص کو اپنے دنیاوی معاملات کے مطابق ہی انجام کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لئے دنیاوی امور کا بھی ذکر کیا گیا۔ نیز اس کے علاوہ بھی اس سورۃ میں اور بہت سے مضامین موجود ہیں جن کی تفصیل بیان کرنا مناسب نہیں ہے۔

''کھیٰعص'' کی تشریح

''کھیعص'' کا مفہوم اس وقت تک واضح نہیں ہو سکتا جب تک تمام حروف کی الگ الگ تشریح نہ کر دی جائے۔

''ک'' کا مطلب ہے اے بندے!

''ہ'' پاک وصاف رحمت پر دلالت کرتی ہے جس میں کوئی کدورت نہ ہو۔

''ی'' حرف ندا کے طور پر استعمال ہوئی ہے۔

''ع'' ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقلی کے معنی میں استعمال ہوئی ہے۔

''ی'' اختلاط کے معنی پر دلالت کرتی ہے۔

''ن'' سے مراد، ذات میں موجود بھلائی ہے۔

''ص'' اس سے مراد خلا ہے۔

گویا اللہ تعالیٰ اس لفظ کے ذریعے ساری مخلوق کو یہ اطلاع دے رہا ہے کہ میری بارگاہ میں، میرے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ و مقام کیا ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے ساری مخلوق پر یہ بڑا فضل کیا ہے کہ ساری مخلوق، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نور مبارک سے فیض حاصل کر رہی ہے۔ مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں

''ک'' سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ خاص بندہ ہے جس کے مقام عبدیت تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ اور وہ ہمارے آقا و مولا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

''ہ'' سے مراد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ساری مخلوق کے لئے پاک وصاف رحمت ہیں جیسا کہ قرآن نے کہا:

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبیاء ۲۱:۱۰۷)

''اور ہم نے تمہیں تمام جہانوں کیلئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

اور خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

انما انا رحمة مهداة۔ (سنن دارمی ۱:۳۱)

''بے شک میں رحمت ہوں اور (ساری مخلوق کے لئے) باعث ہدایت ہوں۔''

''ی'' حرف ندا ہے اور اس کا مخاطب وہی خاص بندہ ہے جس کی صفت سابقہ حروف میں بیان کی گئی ہے اور اس بندے کو اس لئے مخاطب کیا گیا ہے تاکہ وہ ایک حالت سے دوسری کی طرف منتقل ہو سکے۔ یہ وہی منتقلی ہے جس پر ''ع'' دلالت کرتا ہے اور حرف ''ی'' اس منتقلی کی تاکید کے لئے یہاں آیا ہے کیونکہ ہم پہلے بھی یہ قاعدہ بیان کر چکے ہیں کہ سریانی زبان میں حروف اشارہ تاکید پیدا کرنے کے لئے بھی استعمال ہوتے ہیں۔

نور محمدی ہر شے کی اصل ہے

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: ہم نے ان رموز کے جو معانی بیان کئے ہیں۔ ارباب کشف ان سے بخوبی واقف ہیں کیونکہ یہ حضرات ہر وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدے میں مصروف رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم پر جو عنایات کی ہیں ان کے مشاہدے میں مصروف رہتے ہیں۔ کیونکہ یہ وہ عنایات ہیں جو صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اور کوئی بھی انہیں برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ یہ ارباب کشف دیگر انبیاء کرام، فرشتوں اور

بقیہ ساری مخلوق کا بھی مشاہدہ کرتے ہیں۔ نیز اللہ تعالیٰ نے جس مخلوق کو جو کچھ عطا کیا ہے یہ اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ انہیں یہ مشاہدہ بھی نصیب ہوتا ہے کہ کس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نور مبارک ساری مخلوق کو سیراب کر رہا ہے۔ جس میں انبیاء کرام اور فرشتے بھی شامل ہیں۔ لہٰذا یہ ارباب کشف مخلوقات کے نور محمدی سے فیض حاصل کرنے سے متعلق بہت سے عجائبات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ ایک صاحب کشف بزرگ روٹی کھانے لگے تو اچانک ان کی توجہ روٹی کی حقیقت کی طرف مبذول ہوئی اور انہیں روٹی میں نور کا ایک ڈورا دکھائی دیا۔ جب انہوں نے اس نور کا تعاقب کیا تو یہ نور کے اس ڈورے سے ملا جو سیدھا نور محمدی سے جا ملتا ہے پھر انہوں نے دیکھا کہ نور کے اس ڈورے کی بہت سی شاخیں ہیں اور ہر شاخ کا اختتام کسی نہ کسی نعمت پر ہوتا ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) یہ صاحب کشف بزرگ خود سیّدی عبدالعزیز دباغ تھے۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو اور ہمیں ان کے گروہ میں شامل رکھے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ ایک بدبخت نے یہ بات کہہ دی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کی طرف صرف میری رہنمائی کی ہے لیکن ایمان کا نور مجھے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بجائے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے نصیب ہوا ہے۔ ایک بزرگ نے اس سے کہا، اگر میں تمہارے اور نور محمدی کے درمیان موجود تعلق کو قطع کر دوں اور جس ہدایت کا تم نے ذکر کیا ہے صرف اسے باقی رہنے دوں تو کیا یہ تمہیں منظور ہوگا؟ اس نے کہا: جی ہاں۔ (سیّدی دباغ فرماتے ہیں:) اس نے ابھی یہ کہا ہی تھا کہ فوراً وہ اٹھا اور جا کر صلیب کو سجدہ کیا۔ اللہ اور اس کے رسول کا انکار کیا اور کفر کی حالت میں مر گیا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کی بدولت ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔

مختصر یہ کہ جن اولیاء کرام کو اللہ تعالیٰ اور اس کے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت حاصل ہوتی ہے وہ ان تمام امور کا اسی طرح مشاہدہ کرتے ہیں جیسے ہم اپنے حواس کے ذریعے کسی چیز کو دیکھتے ہیں بلکہ ان کا مشاہدہ زیادہ قوی اور یقینی ہوتا ہے۔ اس دوران وہ دیکھتے ہیں کہ حضرت زکریا علیہ السلام کو جو عظمت شان اور مرتبہ و مقام حاصل ہے وہ سب نور محمدی سے فیض کے حصول کے باعث ہے۔ اسی طرح سورۃ مریم میں جن حضرات کا ذکر آیا، مثلاً حضرت یحییٰ، سیّدہ مریم، حضرت ابراہیم، حضرت اسمٰعیل، حضرت موسیٰ، حضرت ہارون، حضرت ادریس، حضرت آدم، حضرت نوح بلکہ ہر نبی علیہم السلام کو جو بھی مرتبہ و مقام نصیب ہوا ہے وہ سب نور محمدی کے واسطے اور برکت سے نصیب ہوا ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: (سورۃ مریم کے آغاز میں آنے والے مذکورہ بالا) حروف مقطعات کی میں نے مختصر تفسیر کی ہے ورنہ ان حروف میں معانی کا جہان آباد ہے۔ ہم پہلے یہ بیان کر چکے ہیں کہ سورۃ کے مرکزی مضامین کو رموز کی شکل میں ان حروف مقطعات میں بیان کر دیا جاتا ہے بلکہ تمام مخلوقات، خواہ وہ ...وں یا صامت، عاقل ہوں یا غیر عاقل، ان میں روح موجود ہو یا نہ ہو، ان سب کا ذکر ان رموز میں ہے۔

سیدی ابوعبداللہ کی تفسیر

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) ان حروف مقطعات کی یہ خوبصورت تفسیر سننے کے بعد میں نے دریافت کیا: سیدی ابوزید الفاسی نے ''حزب التحریر'' کے حاشیے میں، سیّدی ابوالحسن الشاذلی کے خاص مرید، سیّدی ابوعبداللہ محمد بن سلطان کا یہ بیان نقل کیا ہے۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں کھیعص اور حمعسق کی تفسیر کے بارے میں علماء کرام سے بحث کر رہا ہوں۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان حروف کی تفسیر میری زبان پر جاری کر دی۔ میں نے کہا، یہ تفسیر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے درمیان موجود اسرار میں سے ایک ہے۔ (کھیعص کی تفسیر یہ ہے:)

''ک'' سے مراد یہ ہے کہ اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) تم کہف الوجود ہو، کیونکہ ساری مخلوق تمہاری پناہ میں آتی ہے۔ (یا پھر) تم ''کل وجود'' ہو۔

''ہ'' سے مراد یہ ہے کہ ھبنالك الملك (ہم نے تمہیں بادشاہی عطا کی ہے)، (یا پھر) ھیأنالك الملکوت (ہم نے تمہیں ملکوت کا فرمانروا بنایا ہے)

''عین'' سے مراد ''عین العیون'' (تمام بنیادوں کی مرکزی بنیاد) ہے۔

''ص'' سے مراد یہ ہے کہ صفاتی انت (تم میری صفات کا مظہر ہو)

(ابوعبداللہ کہتے ہیں) جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۔ (النساء ۴:۸۰)

''جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے گویا اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔''

(حمعسق کی تفسیر یہ ہے)

''ح'' یعنی حمیناك (ہم تمہارے حامی و مددگار ہیں)

''م'' یعنی ملکناك (ہم نے تمہیں مالک بنایا ہے)

''ع'' یعنی علمناك (ہم نے تمہیں علم عطا کیا ہے)

''سین'' یعنی سارزناك (ہم نے تمہیں اسرار سے نوازا ہے)

''ق'' یعنی قربناك (ہم نے تمہیں اپنے قرب سے نوازا ہے)

(سیّدی ابوعبداللہ محمد بن سلطان فرماتے ہیں) میری یہ تفسیر سن کر ان علماء نے اس کا انکار کیا اور میرے ساتھ بحث شروع کر دی۔ میں نے ان سے کہا، آؤ! ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان فیصلہ کر دیں۔ ہم بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے۔ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارا مقدمہ سماعت فرمایا) اور ارشاد فرمایا: (ابوعبداللہ) محمد بن سلطان کا بیان درست ہے۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ و مقام کے حوالے سے، سیّدی

محمد بن سلطان کا بیان درست ہے۔ لیکن ان حروف کی اصل وضع اور اقتضاء کے حوالے سے وہی تفسیر درست ہے جو میں نے بیان کی ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) یہ بات واضح ہے کہ سیّدی دباغ کی بیان کردہ تفسیر زیادہ جامع اور بہتر ہے کیونکہ اگر ہم یہ کہیں کہ (سیّدی ابوعبداللہ کی بیان کردہ تفسیر کے مطابق) اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام کائنات کی بادشاہی عطا کی ہے تو اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہو سکتا کہ یہ ساری کائنات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے اور برکت سے وجود میں آئی ہے۔ اس کے برعکس (سیّدی دباغ کی بیان کردہ تفسیر کے مطابق) ساری کائنات حرف ''ص'' کے تحت داخل ہوگی۔ اور حرف ''ع'' کے ذریعے یہ ثابت ہوگا کہ یہ ساری کائنات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے اور برکت سے وجود میں آئی ہے جس کا بالواسطہ مطلب یہ ہوگا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ''کہف الوجود'' (ساری کائنات کی پناہ گاہ) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے سیّدی محمد بن سلطان کی بیان کردہ ساری تفسیر، سیّدی عبدالعزیز دباغ کی بیان کردہ تفسیر میں ''ع، ص'' کی تفسیر میں شامل ہو گی۔

''ق'' کی تشریح

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس کے بعد میں نے سیّدی دباغ کی زبانی تمام حروف مقطعات کی تفصیلی تفسیر کو سننے کا شرف حاصل کیا لیکن طوالت کے خوف سے میں اسے یہاں نقل نہیں کر رہا البتہ اس موضوع پر میں سیّدی دباغ کے دو جوابات یہاں نقل کرنا چاہوں گا۔ جن میں سے ایک سوال ایک فقیہہ نے پیش کیا تھا جو خود کو صوفیاء کے معتقدین میں شمار کرتے تھے مگر انہوں نے سیّدی دباغ کا امتحان لینے کے لئے چند سوالات آپ سے دریافت کئے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ سیّدی دباغ کو واقعی علم لدنی حاصل ہے؟ انہوں نے علامہ حاتمی (شیخ اکبر ابن عربی) کی تفسیر میں سے چند سوالات جمع کر کے سیّدی دباغ کی خدمت میں پیش کئے تھے ان کا یہ خیال تھا کہ شاید کوئی بھی شخص ان سوالات کے جوابات نہیں دے سکے گا۔ مگر سیّدی دباغ نے فوراً ان کے جوابات عنایت کئے، ان میں سے ایک سوال یہ بھی تھا۔

حروف مقطعات میں سے ایک حرف ''ق'' میں کون سا ''سر'' موجود ہے؟ بعض صوفیاء یہ بیان کرتے ہیں کہ اس میں ''قدیم'' اور ''حادث'' کا ''سر'' جمع کر دیا گیا ہے؟ براہ کرم اس کی وضاحت فرمائیں؟

سیّدی دباغ نے ارشاد فرمایا: یہاں ''قدیم'' سے مراد وہ حادث انوار ہیں جو ارواح، زمین و آسمان وغیرہ کی پیدائش سے پہلے وجود میں آ چکے تھے۔ یہاں ''قدیم'' سے مراد اس کا حقیقی معنی نہیں ہے یعنی وہ وقت کہ جب اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا اور کچھ بھی موجود نہیں تھا جبکہ یہاں ''حادث'' سے مراد وہ انوار ہیں جو ارواح کی شکل میں وجود میں آئے۔ جب ارواح، جسم میں داخل ہو جاتی ہیں تو اس کے بعد بعض جنت کی مستحق قرار پاتی ہیں اور کچھ جہنم کا ایندھن بن جاتی ہیں۔ جنت اور دوزخ دونوں سے متعلق ارواح حادث کی قسمیں ہیں۔ گویا ''حادث'' کی

دو قسمیں ہو جائیں گی ایک وہ جن سے اللہ تعالیٰ راضی ہوگا اور دوسری قسم جس سے اللہ تعالیٰ راضی نہیں ہوگا۔

جب آپ کے سامنے یہ بات واضح ہوگئی تو اب آپ غور کریں اس حرف ''ق'' کے تلفظ میں تین حروف پائے جاتے ہیں۔ (قاف) ''ق، ا، ف'' جب ''ق'' کو ''ا'' کے ساتھ ملایا جائے تو سریانی زبان میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ''حادث'' اور ''قدیم'' دونوں میں خیر وشر اور فضل وعدل کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کا تصرف کرنا۔ سریانی زبان میں ساکن ''ف'' کا مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلے موجود چیز سے قباحت کو زائل کر دینا۔ ''قدیم'' اور ''حادث'' دونوں میں قبیح وہ ہے جسے شر کی وعید سنائی گئی ہے لہٰذا جب قبیح کو الگ کر دیا گیا تو اب صرف وہی باقی رہ جائے گا جس کے ساتھ خیر کا وعدہ کیا گیا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے ہیں۔ لہٰذا ''ق'' اللہ تعالیٰ کا ایک اسم ہوگا جسے اللہ تعالیٰ کی برگزیدہ مخلوق کی طرف منسوب کیا گیا ہے جیسے عربی زبان میں حکمران کو ''سلطان'' کہا جاتا ہے اور سلطان ساری رعایا کا حکمران ہوتا ہے۔ خواہ رعایا میں کفار اور مسلمان دونوں شامل ہوں۔ لیکن اب جس حکمران کی تعریف کی جائے گی تو اسے ''سلطان الاسلام'' کہا جائے گا۔ اور اس لفظ کے ذریعے رعایا کے غیر مسلم افراد خارج ہو جائیں گے لیکن صرف حکمران کی تعظیم وتکریم کے اعتبار سے، وگرنہ درحقیقت وہ بدستور اس کی رعایا میں داخل ہیں۔ لہٰذا اس حرف ''ق'' کا مطلب یہ ہوگا۔

''اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، تمام انبیاء، تمام فرشتوں، تمام اہل ایمان کے پروردگار!''

اب اس میں آپ تمام اہل ایمان، ان کے احوال، مقامات، جنت میں ان کے مراتب و درجات کو شامل کرتے چلے جائیں اور جب مکمل طور پر ان سب کا تذکرہ ہو جائے گا تو ''ق'' کے معنی مکمل ہوں گے۔ اس لئے اس حرف کے تحت رسالت، نبوت، ولایت، سعادت، جنت اور جملہ خیرات کے اسرار شامل ہوں گے جو تمام مخلوقات میں موجود ہیں۔ (قرآن کہتا ہے:)

وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ (اور تمہارے پروردگار کے لشکروں (مخلوق کی تعداد واقسام) کے بارے میں، خود اسی کے علاوہ اور کوئی بھی نہیں جانتا) (المدثر ۷۴:۳۱)

سریانی زبان کا قانون یہ ہے کہ جو ''ف'' کسی چیز کو زائل کرنے یا دور کرنے کے معنی میں استعمال ہوتی ہے اسے تحریر نہیں کیا جاتا۔ اسی لئے قرآن مجید میں ''ق'' (کے اوپر ''مد'' ڈال کر ''ا'' کی طرف اشارہ کر دیا گیا) لیکن ''ف'' کے لئے کوئی تحریری اشارہ موجود نہیں ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: ''قدیم'' کی ایک تعریف یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس سے مراد وہ تمام امور ہوں جو اللہ تعالیٰ کے ''ازلی علم'' میں موجود تھے۔ اس صورت میں قدیم سے مراد اس کا حقیقی معنی ہوگا جبکہ ''حدیث'' سے مراد یہ ہوگا کہ وہ معلومات جسے اللہ تعالیٰ نے ظاہر فرما دیا ہے۔ اس صورت میں وہی معنی مراد ہوں گے جو سابقہ تعریف میں بیان جا چکے ہیں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) آپ غور کریں، کتنا خوبصورت جواب ہے! بعد میں جب میری سائل

(فقیہہ) سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے دریافت کیا: حضرت نے کیسا جواب عنایت کیا؟ اس نے کہا۔ سیّدی زروق نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہاں ''قدیم'' سے مراد ''ق'' کا دائرہ ہے اور دائرے کا نچلا حصہ ''حدیث'' پر دلالت کرتا ہے جس کا بالواسطہ مفہوم یہ ہے کہ ہر ''حدیث''، ''قدیم'' سے فیض حاصل کرتا ہے گویا اس حرف میں دونوں کی طرف اشارہ موجود ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) سوال حرف ''ق'' کے بارے میں کیا گیا تھا، جو بات آپ بیان کر رہے ہیں اس کا تعلق ''ق'' کی تحریری شکل کے ساتھ ہے۔ حلقے اور دائرے کا تعلق ''ق'' کی تحریری شکل کے ساتھ ہے۔ صرف ''ق'' کے ساتھ نہیں ہے پھر آپ کا یہ کہنا کہ محض دائرے کی وجہ سے ''قدیم'' اور ''حدیث'' کے درمیان مناسبت ثابت ہوتی ہے تو یہ دائرے ''ص، ض، ع، غ'' میں بھی پائے جاتے ہیں۔ وہاں ان کا مفہوم کیا ہوگا؟ میرا یہ اعتراض سن کر وہ فقیہہ خاموش ہو گیا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میرا مقصد سیّدی زروق پر کوئی اعتراض وارد کرنا نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس برائی سے محفوظ رکھے کہ ہم اولیاء کرام پر کوئی اعتراض کر سکیں۔ نیز اللہ تعالیٰ ہمیں ان اولیاء کے علوم سے فیض یاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ میرا مقصد صرف یہ تھا کہ اس فقیہہ کو اس مسئلے کے دیگر پہلوؤں سے روشناس کروایا جائے نیز میں خود سیّدی زروق کی بیان کردہ تفسیر سے واقف نہیں ہوں۔ عین ممکن ہے کہ اس فقیہہ نے سیّدی زروق کے بیان کا مفہوم اپنے الفاظ میں بیان کیا ہو اور وہ خود سیّدی زروق کا بیان نہ سمجھ سکا ہو جس کی وجہ سے اس فقیہہ کے بیان پر اعتراض وارد ہو رہا ہو۔

سیّدی ابوزید الفاسی نے ''حزب الکبیر'' کے حاشیے میں ایک اعتراض نقل کیا ہے اگر یہ کہا جائے کہ حروف مقطعات میں متعلقہ سورۃ کے مضامین کی طرف اشارہ موجود ہوتا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ ایک جیسے حروف مختلف سورتوں کے آغاز میں آ گئے ہیں کیونکہ سورتوں کے مضامین کے اختلاف کے باعث حروف مقطعات بھی ایک دوسرے سے مختلف ہونا چاہئے تھے؟ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) سیّدی دباغ کے دوسرے جواب کا تعلق اسی سوال کے ساتھ ہے۔

آیاتِ قرآنی کے انوار کی تین اقسام

سیّدی دباغ ارشاد فرماتے ہیں: اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کی آیات کے انوار تین اقسام پر مشتمل ہیں۔ سفید، سبز اور زرد، سفید رنگ کا تعلق ان آیات کے ساتھ ہے جن کے قائل بندے ہوں۔ سبز رنگ کا تعلق ان آیات کے ساتھ ہے جن کا قائل اللہ تعالیٰ ہو اور زرد رنگ کا تعلق ان آیات کے ساتھ ہے جو کفار سے متعلق ہوں۔ جیسے اگر ہم سورۃ فاتحہ کا جائزہ لیں تو ''الحمد للہ'' میں سبز رنگ پایا جاتا ہے۔ ''العلمین'' سے لے کر ''غیر المغضوب'' سے پہلے تک سفید رنگ پایا جاتا ہے اور پھر ''المغضوب'' سے لے کر ''الضالین'' تک زرد رنگ پایا جاتا ہے گویا یہ تینوں انوار قرآن کی تمام سورتوں میں موجود ہیں اور البتہ بعض اوقات کوئی ایک رنگ کسی ایک سورۃ میں کم اور دوسری میں زیادہ ہوتا ہے۔

ان تینوں قسم کے انوار کے درمیان اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ لوح محفوظ کے تین حصے ہیں۔ایک حصے کا رخ دنیا کی طرف ہے جس میں دنیا سے متعلق تمام معلومات درج ہیں۔دوسرے حصے کا رخ جنت کی طرف ہے اور اس میں جنت سے متعلق تمام معلومات درج ہیں۔تیسرے حصے کا رخ جہنم کی طرف ہے اور اس میں جہنم سے متعلق تمام معلومات درج ہیں جس حصے کا رخ زمین کی طرف ہے اس کا رنگ سفید ہے جس حصے کا رخ جنت کی طرف ہے اس کا رنگ سبز ہے اور جس حصے کا رخ جہنم کی طرف ہے اس کا رنگ زرد ہے۔درحقیقت اس کا رنگ سیاہ ہے لیکن جب کوئی مومن اسے دیکھتا ہے اور اس مومن کا نورِ بصیرت اس سیاہی پر پڑتا ہے تو مومن کو اس کا رنگ زرد محسوس ہوتا ہے۔قیامت کے دن جب کسی مومن کو ایمان کا نور نصیب ہوگا اور اس سے کچھ فاصلے پر ایک کافر ظلمت و تاریکی میں گھرا ہوا کھڑا ہوگا تو مومن کو اس کافر کی تاریکی کا رنگ زرد نظر آئے گا جس سے اسے اندازہ ہوگا کہ یہ شخص کافر ہے یعنی کافر کو کچھ دکھائی نہیں دے سکے گا کیونکہ اس کے اردگرد پھیلی ہوئی تاریکی اس کے لئے حجاب بن جائے گی اور اس تاریکی کے سوا اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دے گا۔(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: اس صورت میں اس کافر کو صرف انہی لوگوں کی حالت کا اندازہ ہو سکے گا جو اس کی طرح اسی عذاب میں مبتلا ہوں گے۔اگر وہ اس وقت کسی مومن کو حاصل ہونے والی نعمتوں کو بھی دیکھ لیتا تو اس کے دل میں یہ احساس پیدا ہوتا کہ اے کاش! میں بھی اسی مومن کی طرح نیک کام کر کے آج کے دن ان نعمتوں کو حاصل کرتا؟ سیدی دباغ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس کے دل میں جنت اور اس کی نعمتوں سے متعلق مختصر اور ضروری علم پیدا فرما دے گا۔

جب یہ اصول آپ نے سمجھ لیا کہ ہر آیت میں مذکورہ بالا تین اقسام میں سے کوئی ایک قسم موجود ہوگی اور پھر ان تینوں اقسام میں سے ہر ایک قسم کی مزید کئی ضمنی اقسام ہوں گی جن سے صرف اللہ تعالیٰ ہی واقف ہے جو حروف مقطعات قرآن کی سورتوں کے آغاز میں موجود ہیں وہ لوح محفوظ میں بالکل اسی طرح درج ہیں جیسے قرآن مجید میں تحریر ہیں تاہم لوح محفوظ میں ہر حرف کے ساتھ اس کی تشریح سریانی زبان میں تحریر ہے۔

اس تشریح سے واقف ہو جانے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ اگر ایک جیسے حروف مقطعات دو مختلف سورتوں کے آغاز میں آ گئے ہوں تو ان کے درمیان بنیادی فرق کیا ہے؟ مثلاً ''الم'' سے مراد نور محمدی ہے جس سے ساری مخلوق فیض حاصل کرتی ہے اگر نور محمدی کا اس اعتبار سے جائزہ لیا جائے کہ مخلوق میں موجود ہر کافر و مسلمان (انسان، جنات، فرشتے اور دیگر تمام مخلوقات) نور محمدی سے فیض حاصل کرتے ہیں اور ان مومنین و کفار کے اکتساب فیض کا طریقہ اور ان کے احوال و مقامات کیا ہیں تو ''الم'' کی یہ تفسیر ''سورۃ البقرہ'' کے مضامین سے مناسبت رکھتی ہوگی اور اسی حوالے سے یہ حروف ''سورۃ البقرہ'' کے آغاز میں نازل کئے گئے ہیں اگر نور محمدی کا اس حوالے سے جائزہ لیا جائے کہ اس نور کے ذریعے مخلوق کو کس طرح سے کتنا فیض نصیب ہوتا ہے اور پھر بعض ان لوگوں کا بھی تذکرہ کر دیا جائے جنہیں نور محمدی سے خاص فیض نصیب ہوا ہے تو ''الم'' کی یہ تفسیر سورۃ آل

عمران کے مضامین سے مناسبت رکھے گی اور اسی حوالے سے ان حروف کو سورۃ آل عمران کے آغاز میں نازل کیا گیا ہے اور اگر اس حوالے سے جائزہ لیا جائے کہ اہل انتقام (کفار) کو کس طرح سے کون کون سے عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا تو یہ تفسیر ''سورۃ العنکبوت'' کے مضامین سے مناسبت رکھے گی غرضیکہ ہر سورۃ کے آغاز میں آنے والے حروف مقطعات میں سورۃ سے متعلق مضامین کی طرف اشارہ موجود ہوگا۔ ہماری بیان کردہ اس تفسیر کے حقیقی مفہوم سے وہی شخص صحیح معنی میں لطف اندوز ہوسکتا ہے جو لوح محفوظ کا مشاہدہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس کے بعد میں نے اسی مسئلے سے متعلق ایک سوال دریافت کیا تو سیّدی دباغ نے اس کا تفصیلی جواب مرحمت فرمایا: لیکن کیونکہ وہ انسانی عقل سے ماورا ہے اسی لئے میں نے اسے یہاں تحریر نہیں کیا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے سیّدی دباغ کے بیان کو مختصر الفاظ میں نقل کر دیا ہے لیکن ان امور کی تشریح سے بخوبی واقفیت کے حصول کے لئے ''فتح'' ضروری ہے۔ یا کوئی شخص براہِ راست حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی تفسیر سن سکتا ہے اور اپنے اعتراضات کے شافی جوابات حاصل کر کے ان حروف سے متعلق مختلف پہلوؤں سے آگاہی حاصل کر سکتا ہے۔ ایسے شخص کو اگرچہ ''فتح'' حاصل نہ بھی ہو پھر بھی وہ حروف مقطعات کی تفسیر سے واقفیت حاصل کر لے گا۔

سریانی میں حروف تہجی کا مطلب

اس مقام پر میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ سریانی زبان میں حروف تہجی کے معانی کی وضاحت کر دوں تاکہ بوقت ضرورت ان سے استفادہ کیا جا سکے۔

''ا'' اگر اس پر زبر ہو تو اس کے ذریعے تمام اشیاء کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات اس کے ذریعے متکلم اپنی ذات کی طرف بھی اشارہ کر دیتا ہے اگر اس پر پیش ہو تو اس کے ذریعے قریب موجود کسی شے کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جس کی تعداد کم ہو اور اگر اس پر زیر ہو تو اس کے ذریعے قریب موجود کسی ایسی شے کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جس کی تعداد مناسب ہو۔

''ب'' اگر اس پر زبر ہو تو اس سے مراد وہ چیز ہوگی جو عزت یا ذلت کے انتہائی درجے پر فائز ہو اگر اس پر زیر ہو تو اس سے مراد وہ چیز ہوگی جو ذات میں داخل ہونے والی ہو یا داخل ہو چکی ہو۔ اگر اس پر پیش ہو تو یہ ''اسم اشارہ'' کے طور پر استعمال ہوگی تاہم اس میں کچھ قبض (تنگی) پائی جائے گی۔

''ت'' اگر اس پر زبر ہو تو اس سے مراد کثیر اور عظیم بھلائی ہوگی اگر اس پر زیر ہو تو اس سے مراد کسی چیز کا ظاہری وجود ہوگا اور اگر اس پر پیش ہو تو یہ کسی ایسی ظاہر چیز کے لئے استعمال ہوگی جس کی تعداد کم ہو۔ بعض اوقات اس صورت میں دو متضاد چیزوں کے اجتماع کا مفہوم بھی مراد لیا جاتا ہے۔

''ث'' اگراس پر زبر ہو تو اس کے ذریعے نور یا ظلمت کی طرف اشارہ کیا جائے گا اگر اس پر پیش ہو تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ کوئی ایک چیز کسی دوسری چیز سے زائل ہوگئی ہے اور اگر اس پر زیر ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک چیز کو دوسری کے لئے لازم قرار دے دیا گیا ہے۔

''ج'' اگر اس پر زبر ہو اور اس سے پہلے کے کلام سے یوں اندازہ ہو کہ اس کا تعلق اولیاء یا انبیاء کے ساتھ ہے تو پھر اس صورت میں اس سے مراد نبوت یا ولایت ہوگی ورنہ اس سے مراد ایسی بھلائی ہوگی جو ہمیشہ باقی رہے اگر اس پر پیش ہو تو اس سے مراد وہ چیز ہوگی جسے لوگ کھا سکیں یا اس سے کوئی نفع حاصل کر سکیں اور اگر اس پر زیر ہو تو اس سے مراد انسان کے وجود میں موجود ایمان کے نور کی سب سے کمتر حالت ہوگی۔ بعض اوقات کم بھلائی کے معنی میں بھی استعمال ہوتی ہے۔

''ح'' اگر اس پر زبر ہو تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ تمام اشیاء اس کے تحت شامل ہیں اگر اس پر پیش ہو تو اس سے مراد اس قدر زیادہ تعداد ہوگی جو انسانی گنتی سے کہیں زیادہ ہوگی جیسے ستارے، اگر اس پر زیر ہو تو اس سے مراد وہ عدد ہوگا جو انسان کی ملکیت میں آسکے جیسے روپیہ، پیسہ اور غلام (ان کی تعداد مختلف ہوتی ہے)۔

''خ'' اگر اس پر زبر ہو تو اس سے مراد ایسی چیز ہوگی جو نرم اور انتہائی طویل ہو اگر اس پر پیش ہو تو اس سے مراد جانوروں کی کوئی مخصوص خوبی ہوگی اور اگر اس پر زیر ہو تو اس سے مراد جمادات میں موجود کوئی خوبی ہوگی۔

''د'' اگر اس پر زیر ہو تو اس سے مراد وہ چیز ہوگی جو وجود کے اندر موجود ہو یا جو چیز ذات میں داخل ہونے والی ہے یا جو چیز ذات کے قریب ہے اگر اس پر زبر ہو تو اس سے مراد وہ چیز ہوگی جو ذات سے خارج ہے اور اگر اس پر پیش ہو تو اس سے مراد ایسی چیز ہوگی جو تعداد میں کم ہو، بری ہو یا اس پر غضب نازل ہو سکتا ہو۔

''ذ'' اس سے مراد وجود کے اندر موجود کسی خوبی کی عظمت کا اظہار ہے اگر اس پر پیش ہو تو اس سے مراد ایسی چیز ہوگی جو فی نفسہ انتہائی سخت، عظیم یا قبیح ہوگی اور اگر اس پر زیر ہو تو اس سے مراد ایسی قبیح چیز ہوگی جس پر غضب نازل نہ ہو سکے۔

''ر'' اگر اس پر زبر ہو تو اس سے مراد تمام ظاہری و باطنی بھلائیاں ہوں گی اگر اس پر پیش ہو تو اس سے مراد کوئی ایک ظاہر چیز ہوگی اگر اس پر زیر ہو تو اس سے مراد روح یا انسانوں کے علاوہ کوئی اور ذی روح ہوگا۔

''ز'' اگر اس پر زبر ہو تو کبھی اس سے مراد ایسی چیز ہوگی جو کسی دوسرے کو نقصان پہنچا سکے یا جس سے بچنا ضروری ہو اگر اس پر پیش ہو تو اس کے ذریعے کسی نقصان دہ چیز کی طرف اشارہ کیا جائے گا جیسے کبیرہ گناہ، اگر اس پر زیر ہو تو اس کے ذریعے ایسی قبیح چیز کی طرف اشارہ کیا جائے گا جس میں (زیادہ) نقصان نہ ہو جیسے صغیرہ گناہ، شبہات اور نجاست (کہ انہیں آسانی سے زائل کیا جا سکتا ہے)۔

''ط'' اگر اس پر زبر ہو تو اس سے مراد ایسی چیز ہوگی جو اپنی حقیقت کے اعتبار سے انتہائی پاک وصاف ہو اگر اس پر پیش ہو تو اس کے ذریعے، پہلی سے برعکس، ایسی چیز ہوگی جو انتہائی خبیث ہو اور اگر اس پر زیر ہو تو اس

سے مراد ایسی چیز ہوگی جو طبعی طور پر ساکن ہو یا اس کے ذریعے سکون کا حکم دیا جائے گا۔

''ظ'' اگر اس پر زبر ہو تو اس کے ذریعے ایسی چیز کی طرف اشارہ کیا جائے گا جو فی نفسہ بہت زیادہ ہو لیکن اس کی موجودگی میں اسی کی متضاد موجود نہ ہو سکے جیسے سادات میں سخاوت اور یہودیوں میں فریب کاری کی صفت موجود ہوتی ہے اگر اس پر پیش ہو تو اس سے مراد وہ چیز ہوگی جو نفسانی خواہشات کی پیروی کرے اور انسان کو ہلاکت کا شکار کردے اگر اس پر زیر ہو تو اس سے مراد ایسی چیز ہوگی جس سے انسان کو ضرر لاحق ہو سکے یا وہ چیز فی نفسہ مضر ہو۔

''ع'' اگر اس پر زبر ہو تو اس کے ذریعے کامل بندگی کی حقیقت کی طرف اشارہ کیا جائے گا اگر اس پر پیش ہو تو اس کے ذریعے کسی بدصورت یا سیاہ رو غلام کی طرف اشارہ کیا جائے گا۔ اور اگر اس پر زیر ہو تو اس کے ذریعے محض طلب کی بندگی کی طرف اشارہ کیا جائے گا۔

''ل'' اگر اس پر زبر ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ متکلم کو کوئی بڑی چیز حاصل ہوئی ہے۔ بعض اوقات اس کے ذریعے کسی بڑی چیز کی طرف اشارہ بھی کیا جاتا ہے۔ اگر اس پر پیش ہو تو اس کے ذریعے کسی ایسی چیز کی طرف اشارہ کیا جائے گا جس کی کوئی انتہا نہ ہو اگر اس پر زیر ہو تو اس کے ذریعے متکلم کے وجود کی طرف اشارہ کیا جائے گا یا متکلم کے وجود کی موجودگی کی طرف اشارہ کیا جائے گا۔

''م'' اگر اس پر زبر ہو تو اس سے مراد ساری کائنات ہوگی اگر زیر ہو تو اس سے مراد وجود کا ظاہری نور یعنی آنکھ کا نور باطنی نور یعنی دل کا نور ہوگا اور اگر اس پر پیش ہو تو اس سے مراد کوئی چھوٹی سی معزز چیز ہوگی جیسے آنکھ کا پانی (آنسو) اسی سے لفظ ''موموُ'' (آنکھ کی پتلی) ماخوذ ہے۔

''ن'' اگر اس پر زبر ہو تو اس سے مراد انسان کے وجود کے اندر موجود روشن خوبیاں ہوں گی اگر اس پر پیش ہو تو اس سے مراد مکمل بھلائی یا چمکدار نور ہوگا اور اگر اس پر زیر ہو تو اس سے مراد کوئی ایسی چیز ہوگی جو متکلم کے پاس موجود ہو یا متکلم اسے حاصل کرلے۔

''ص'' اگر اس پر زبر ہو تو اس سے مراد وہ کرہ ارض ہوگا جو قیامت کے دن بارگاہ خداوندی میں حاضر ہوگا اگر اس پر زیر ہو تو اس سے مراد ساتوں زمینیں ہوں گی اور اگر اس پر پیش ہو تو اس سے مراد تمام نباتات ہوں گے۔ ایک مرتبہ سیّدی دباغ نے ارشاد فرمایا: اگر اس پر زبر ہو تو اس سے مراد ایک فرسخ کے فاصلے تک موجود روئے زمین اور اس پر موجود تمام اشیاء ہوں گی اگر اس پر پیش ہو تو اس سے مراد ساتوں زمینیں یا مٹی ہوگی اور اگر اس پر زیر ہو تو اس سے مراد زمین پر موجود تمام نباتات ہوں گے۔

''ض'' اگر اس پر زبر ہو تو اس سے مراد صحت ہوگی نیز ہر قسم کی آزمائش سے محفوظ رہنا ہوگا اگر پیش ہو تو اس کے ذریعے کسی ایسی چیز کی طرف اشارہ کیا جائے گا جس میں نور یا ظلمت موجود نہ ہو اور اگر اس پر زبر ہو تو اس سے مراد خشوع وخضوع ہوگا۔

''ع'' اگر اس پر زبر ہو تو اس سے مراد آمد و رفت ہو گی اگر پیش ہو تو اس سے مراد وہ خوبی ہو گی جس کی بدولت انسان کا وجود برقرار رہتا ہے اور اگر اس پر زیر ہو تو اس سے مراد وجود کی خباثت ہو گی۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) یہ تشریح سیّدی دباغ نے بیان کی تھی۔ البتہ میں نے آپ کی ایک تحریر میں اسی حرف کی یہ تشریح بھی دیکھی ہے کہ اگر ''ع'' پر زبر ہو تو اس سے مراد ایسی چیز ہو گی جو کچھ قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو اگر پیش ہو تو اس سے مراد ایسی چیز ہو گی جو اپنے ارادے کے مطابق کسی دوسرے کو کوئی نفع یا نقصان پہنچا سکے اور اگر زیر ہو تو اس سے مراد بندگی میں خباثت ہو گی۔ یہ دونوں تشریحات ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں کیونکہ اگر کوئی چیز کسی دوسری چیز کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے تو اس کا بالواسطہ مطلب یہی ہے کہ اس میں آمد و رفت کا امکان موجود ہے۔ اسی طرح وہ چیز جو مستقل طور پر انسان کے وجود میں موجود ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے ساتھ نفع اور نقصان بھی دے سکتی ہے اس کی مثال روح ہو گی جبکہ بندگی اور وجود کی خباثت کے درمیان کوئی نمایاں فرق موجود نہیں ہے۔

''غ'' اگر اس پر زبر ہو تو اس سے مراد وہ نظر ہو گی جو کسی شے کی حقیقت تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ اگر اس پر پیش ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کا ایک اسم ہے جو اللہ تعالیٰ کی مہربانی و رحمت پر دلالت کرتا ہے اگر اس پر زیر ہو تو اس سے مراد کسی نامعلوم چیز کے بارے میں واقفیت کے حصول کے لئے سوال کرنا ہو گا۔

(سیّدی دباغ کی) تحریر میں یہ بات موجود تھی، اگر اس پر زبر ہو تو اس سے مراد وہ چیز ہو گی جو اپنے قریب ہونے والی ہر شے کو طبعی طور پر دور کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ اگر اس پر پیش ہو تو اس سے مراد عظمت، مہربانی اور عزت ہو گی اور اگر اس پر زیر ہو تو اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کلمے کا مفہوم جانے بغیر اسے کہہ دے یعنی کسی نامعلوم چیز کے بارے میں کچھ بتا دے۔ دونوں طرح کے معانی میں مناسبت پائی جاتی ہے۔

''ف'' اگر اس پر زبر ہو تو اس سے مراد یہ ہو گی کہ کسی ایسے وجود سے گندگی دور کرنا جس کے بارے میں یہ یقین ہو کہ اس میں گندگی موجود ہو گی یعنی وہ چیز خود پاک ہے لیکن اس کی جنس ناپاک ہے اور یہاں ناپاکی سے مراد گناہ ہے اگر اس پر زیر ہو تو اس کے ذریعے کسی وجود کی طرف، یا ان اشیاء کی طرف، اشارہ کیا جائے گا جن پر وجود مشتمل ہوتا ہے اور اگر اس پر پیش ہو تو اس کا مطلب خباثت کو زائل کرنا ہو گا۔

''ق'' اگر اس پر زبر ہو تو اس سے مراد کسی بھلائی یا تمام انوار کی طرف اشارہ کرنا ہو گا اگر اس پر پیش ہو تو اس سے مراد کائنات کا نکتہ آغاز یا علم قدیم ہو گا اور اگر اس پر زیر ہو تو یہ ذلت کا مفہوم ادا کرے گا۔

''س'' اگر اس پر زبر ہو تو اس سے مراد ایسی ملیح چیز کی طرف اشارہ ہو گا جس میں طبعی طور پر رقت پائی جاتی ہو اگر اس پر پیش ہو تو اس کا معنی کسی سخت قبیح چیز کی طرف یا حسی طور پر سیاہ چیز کی طرف اشارہ کرنا ہو گا اور اگر اس پر زیر ہو تو اس کے ذریعے کسی فطری چیز کی طرف اشارہ مقصود ہو گا۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) یہ تشریح میں نے حضرت کی تحریر سے نقل کی ہے البتہ آپ نے زبانی طور پر یہ بیان کیا تھا کہ اگر ''س'' پر زبر ہو تو اس سے مراد کسی

چیز کی خوبیاں، اگر پیش ہو تو ظاہری اور معنوی سیاہی اور اگر زیر ہو تو اس سے مراد وجود کا مغز ہوگا اور اس کا "سر" کامل عقل اور عفو و درگزر کی صفات ہوں گی۔

"ش" اگر اس پر زبر ہو تو اس کے ذریعے ایسی رحمت کی طرف اشارہ مقصود ہوگا جس کے بعد کوئی عذاب نازل نہ ہو۔ یا اس کے ذریعے ایسے شخص کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچ کر اس کی پناہ میں آ جائے اور اگر اس پر پیش ہو تو اس سے مراد ایسا شخص ہوگا جو بلند مرتبہ و مقام کا مالک ہو اگر اس پر زیر ہو تو اس کے ذریعے ایسی شے کی طرف اشارہ کیا جائے گا جو طبعی طور پر پوشیدہ ہو۔ بعض اوقات اس کے ذریعے ایسی چیز کی طرف بھی اشارہ کیا جاتا ہے جو دل میں پوشیدہ ہو۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) یہ تفسیر میں نے حضرت کی تحریر سے نقل کی ہے البتہ زبانی طور پر آپ نے اس حرف کی یہ تفسیر بیان کی اگر اس پر زبر ہو تو اس سے مراد ایسی رحمت ہوگی جس کے بعد عذاب نازل نہیں ہو سکتا اور اگر اس پر پیش ہو تو اس سے مراد ایسی چیز ہوگی جس کے بارے میں جان کر انسان حیران رہ جائے۔ بعض اوقات یہ ایسی چیز کی طرف اشارے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جو آنکھ کی تکلیف کا باعث بنے جیسے تنکا، اگر اس پر زیر ہو تو اس سے مراد وہ چیز ہوگی جسے پاؤں یا کسی اور عضو کے ذریعے روند کر چھپا دیا گیا ہو یا اس سے مراد باطن میں پوشیدہ سوچ ہوگی جو ظاہر نہیں ہوتی۔

"ہ" اگر اس پر زبر ہو تو اس سے مراد بے انتہا رحمت ہوگی اگر اس پر پیش ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کا اسم صفت، اگر اس پر زیر ہو تو اس سے مراد وہ بھلائی ہے جو مخلوقات کے وجود سے خارج ہوتی ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) یہ تشریح میں نے حضرت کی تحریر سے نقل کی ہے زبانی طور پر آپ نے یہ بتایا تھا اگر زبر ہو تو اس سے مراد بے انتہا رحمت، اگر پیش ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کا اسم صفت ہے جس میں تمام کائنات کا مشاہدہ موجود ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا جیسے کوئی شخص یہ کہے، "رَب العلمین" (تمام جہانوں کے پروردگار) جس "ن" پر پیش ہو وہ بھی اللہ تعالیٰ کا اسم صفت ہوتا ہے لیکن اس سے مراد یہ ہوگی جیسے کوئی شخص یہ کہے "ربی" (اے میرے پروردگار)، اگر "ہ" پر زیر ہو تو اس سے مراد اہل ایمان کے اجسام سے نکلنے والا نور ہوگا۔

"و" اگر اس پر زبر ہو تو اس سے مراد انسان کے جسم میں پھیلی ہوئی اشیاء ہیں جیسے رگیں، اگر اس پر پیش ہو تو اس سے مراد وہ تمام اشیاء ہوں گی جو انسانوں سے مختلف ہیں جیسے آسمان، پہاڑ وغیرہ اگر اس پر زیر ہو تو اس سے مراد انسان کے جسم میں پھیلی ہوئی ناپاک اشیاء ہوں گی جیسے آنتیں۔

"ی" اگر اس پر زبر ہو تو یہ "ندا" یا "تاکید" کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ سیدی دباغ نے یہ بات زبانی بیان کی تھی۔ مگر ان کی تحریر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اگر "ی" پر زبر ہو تو یہ "ندا" کے لئے استعمال ہوگی اور بعض اوقات یہ ایسی خبر کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے جس میں حرف "ندا" پوشیدہ طور پر موجود ہو جیسے "لم یلد" (وہ ذات جس نے کسی کو جنم نہیں دیا) کیونکہ یہ اصل میں "یالم یلد" ہے (یعنی اے وہ ذات جس نے کسی کو جنم نہیں دیا) اگر "ی" پر پیش ہو تو اس سے مراد ایسی چیز ہوگی جو ایک جگہ ٹھہرتی نہ ہو جیسے آسمانی بجلی اور اگر اس پر زیر ہو تو اس سے

مراد ایسی چیز ہوگی جس کی وجہ سے حیا محسوس ہو جیسے شرمگاہ۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں یہ حروف کے اسرار تھے۔ ان میں سے ہر ایک حرف کے سات مزید اسرار ہیں اور پھران اسرار کے علاوہ اور بھی سات اسرار ہیں جو عربی کلام سے مناسبت رکھتے ہیں لیکن غیر عربی زبانوں سے مناسبت رکھنے والوں سے اسرار کی تعداد بھی سات ہے مگر یہ اسرار مختلف ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے علم کے حصول اور نیکی کی توفیق عطا فرمائے۔

یہ کلمات عبدالعزیز بن سیّد مسعود نے تحریر کئے ہیں جو دباغ کے نام سے مشہور ہیں۔

ایک سریانی کلمہ

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) معزز قارئین! آپ غور فرمائیں، کیا آپ نے کبھی کہیں ایسی گفتگو پڑھی یا سنی ہے؟ جب میری سیّدی عبدالعزیز دباغ سے پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی تو اس کے کچھ دن بعد آپ نے مجھے سریانی زبان کے تین کلمات سکھائے اور فرمایا: انہیں یاد کرلو! اور کبھی بھی بھولنا نہیں۔ وہ کلمات یہ تھے، ''سِنَــرْ سِذْ عُمَــازَرْ'' ''س'' پر زیر، ''ن'' پر زبر، ''ر'' ساکن، ''س'' پر زیر، ''ذ'' ساکن، ''ع'' پر پیش، ''م'' پر زبر، اس کے بعد ''ا''، ''ز'' پر زبر اور آخر میں ''ر'' ساکن ہوگی۔ میں نے دریافت کیا: یہ کون سی زبان ہے؟ آپ نے فرمایا: سریانی! آج کل دنیا میں صرف گنتی کے چند لوگ (اولیاء کرام) یہ زبان بولتے ہیں۔ میں نے دریافت کیا ان کلمات کا مطلب کیا ہے؟ تو آپ نے ان کلمات کا مطلب بیان نہیں کیا، لیکن پھر جب آپ نے مجھے سریانی زبان میں حروف کے الگ الگ معانی کا قاعدہ سکھایا تو اس وقت پتہ چلا کہ سیّدی دباغ مجھے مخاطب کر کے یہ اشارہ فرما رہے تھے۔

''میرے وجود میں موجود، چمکتے ہوئے نور کو غور سے دیکھو، جو میرے ظاہر اور باطن میں موجود ہے۔ اس عظیم بھلائی کی طرف دیکھو جو میری ذات کا حصہ ہے۔ جس کی بدولت میرا وجود قائم ہے کیونکہ اسی کی بدولت کائنات میں موجود جملہ اشیاء شر سے محفوظ رہتی ہیں اور زمین و آسمان میں موجود ہر ظاہری و باطنی چیز اسی نور سے فیض حاصل کرتی ہے جو میری ذات میں موجود ہے۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) گویا سیّدی دباغ مجھے مخاطب کر کے یہ ارشاد فرما رہے تھے کہ ان کا تصرف تمام جہانوں میں ہے۔

قرآن عام محاورے کے مطابق نازل ہوا

وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ يَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ۔ (آل عمران ۳:۱۴۰)

''تاکہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو ظاہر کر دے اور تم میں سے بعض افراد کو مرتبہ شہادت پر فائز کر دے''

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصَّابِرِيْنَ (محمد ۴۷:۳۱)

''اور ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے تاکہ ہم تم میں سے مجاہدین اور صبر کرنے والوں کو ظاہر کردیں''

ان آیات سے بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کو کسی واقعہ کے وقوع پذیر ہونے کے بعد اس کا علم ہوتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کا علم قدیم ہے اور کسی بھی قدیم چیز کی یہ کیفیت نہیں ہوتی۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا: قرآن لوگوں کے محاورے کے مطابق نازل ہوا ہے۔ فرض کریں ایک شخص بادشاہ کے سب سے زیادہ قریب ہے اور بادشاہ رعایا سے متعلق تمام امور اس کے سپرد کر کے خود چھپ جاتا ہے اور ساری رعایا کو اپنے اس مقرب شخص کی فرمانبرداری کا پابند کر دیتا ہے۔ اس مقرب شخص کے علاوہ اور کوئی بھی بادشاہ کی تنہائی میں حاضر نہیں ہوسکتا۔ اب وہ مقرب شخص جب رعایا کو کوئی حکم دے گا تو ان سے یہی کہے گا کہ بادشاہ تمہیں یہ حکم دے رہا ہے یا تم سے فلاں کام کا مطالبہ کر رہا ہے۔ یہاں تک کہ وہ مقرب شخص اپنی ہر گفتگو میں یہی کلام طرز اختیار کرلے گا یہاں تک کہ جو معاملات اس کی اپنی ذات کے ساتھ مخصوص ہوں ان میں بھی یہی طرزِ تخاطب اختیار کرے گا اور رعایا سے یہ کہے گا کہ تم بادشاہ (یعنی اس شخص) کے ساتھ فلاں جگہ جاؤ، فلاں کام کرو، اس کی وجہ یہ ہے کہ جو تعلق اس کا بادشاہ کے ساتھ ہے وہ کسی اور کا نہیں ہے اور عام محاورے کے اعتبار سے اس میں کوئی خاص بھی نہیں ہے۔ اسی طرح قرآن کی اس نوعیت کی آیات میں اگرچہ بظاہر علم کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے لیکن اس سے مراد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ اس کے بعد آپ نے قرآن کی درج ذیل آیت کی روشنی میں اللہ اور اس کے رسول کے درمیان تعلق کی وضاحت میں نفیس گفتگو کی:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (الفتح ۴۸: ۱۰)

''بے شک جن لوگوں نے تمہارے ساتھ بیعت کی ہے انہوں نے اللہ کے ساتھ بیعت کی ہے۔ اللہ کا دست قدرت ان کے ہاتھوں پر ہے۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کی اس نوعیت کی آیات میں لفظ ''رسول'' محذوف ہوتا ہے اور یہ جواب عام مفسرین کے نقل کردہ جوابات سے مختلف ہے۔

مسئلہ غرانیق

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے سیدی دباغ سے مسئلہ غرانیق کے بارے میں دریافت کرتے ہوئے عرض کی۔ قاضی عیاض مالکی اور ان کے بعض متبعین نے سرے سے اس واقعہ کے وجود کا انکار کیا ہے جبکہ حافظ ابن حجر نے اس واقعے کو درست قرار دیا ہے۔ دونوں میں سے کس کا موقف درست ہے؟ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ابن ابی حاتم، طبری اور ابن المنذر نے حضرت سعید بن جبیر کے حوالے سے یہ روایت نقل کی ہے:

قرا رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم افرايتم اللات والعزى و مناة الثالثة الاخرى فالقى الشيطان على لسانه تلك الغرانيق العلى و ان شفاعتان لترتجى فقال المشركون ماذكر آلهتنا بخير قبل اليوم فسجد و سجدوا۔ (تفسیر طبری ۱۷: ۱۸۷، ۱۸۸)

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت کی۔ افرایتم اللات والعزی و مناۃ الثالثۃ الاخری اس وقت شیطان نے یہ کلمات القاء کئے۔ تلك الغرانیق العلی و ان شفاعتھا لترتجی (یعنی ان معزز بتوں کی سفارش کی مقبولیت کی امید کی جاسکتی ہے) یہ سن کر مشرکین نے کہا اس سے پہلے تو انہوں نے کبھی بھی ہمارے خداؤں کی تعریف نہیں کی یہ کہہ کر ان مشرکین نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ سجدہ کیا۔''

اس کے بعد حافظ ابن حجر نے شیخ بزار کا حوالہ اور اس روایت پر ان کی بحث نقل کی ہے۔ اس کے بعد ابن حجر لکھتے ہیں۔

''شیخ ابوبکر ابن العربی نے اپنی عام عادت کے مطابق نہایت جرأت کے ساتھ اس واقعے کے وقوع پذیر ہونے کا انکار کرتے ہوئے یہ کہہ دیا ہے کہ طبری نے اس بارے میں جو روایات نقل کی ہیں وہ سب من گھڑت ہیں حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے نیز قاضی عیاض مالکی نے بھی یہ کہا ہے کہ اس واقعہ کی روایت مستند نہیں ہے۔ شیخ بزار اس روایت کی صرف ایک سند کو کسی حد تک درست مانتے ہیں۔ قاضی عیاض مالکی نے اس روایت کی سند پر مختلف طرح کے اعتراضات کرنے کے بعد عقلی طور پر اس کے من گھڑت ہونے کی یہ دلیل دی ہے کہ اگر یہ واقعہ ہوا ہوتا تو یقیناً کوئی نہ کوئی مسلمان (معاذ اللہ) مرتد ہو جاتا۔ (حافظ ابن حجر کہتے ہیں) اصولی طور پر قاضی عیاض کی کوئی بھی دلیل مضبوط نہیں ہے کیونکہ جب ایک روایت مختلف حوالوں اور مختلف افراد سے نقل ہو جائے تو اس سے بالواسطہ طور پر یہ ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ اس واقعہ کی کوئی نہ کوئی اصل موجود ہے جبکہ ہم پہلے تحقیق کے ساتھ یہ بات بیان کر چکے ہیں کہ یہ واقعہ تین مستند اسناد کے ہمراہ منقول ہے۔ یہ واقعہ مرسل حدیث کے طور پر نقل کیا گیا ہے تاہم بعض علماء مرسل حدیث کو مستند تصور نہیں کرتے لیکن ان کے جواب میں یہی بات کافی ہوگی کہ اس روایت کو مختلف حضرات نے نقل کیا ہے۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ یہ واقعہ رونما ہوا ہے تو اب اس واقعہ کے مشکوک حصے کے بارے میں ہم تاویل پیش کریں گے۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس کے بعد حافظ ابن حجر نے 6 تاویلات پیش کی ہیں۔ جو ان کی تصنیف (فتح الباری) میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ اس کے بعد حافظ ابن حجر نے اسی واقعہ کے مطابق اللہ تعالیٰ کے درج ذیل بیان کی تفسیر بیان کی ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّا اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ.

''اور تم سے پہلے ہر نبی اور رسول نے جب تلاوت شروع کی تو شیطان نے ان کی تلاوت میں کچھ اپنی طرف سے شامل کر دیا۔'' (الحج ۲۲: ۵۲)

اس کے بعد انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ایک قرأت کا حوالہ دے کر یہ

ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس آیت میں مسئلہ غرانیق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے پھر نحاس کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کی یہ تاویل نہایت بہتر ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے سیدی دباغ سے دریافت کیا: اس مسئلے میں صحیح رائے کیا ہے؟

ابن حجر کی رائے کی خامی

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا: اس مسئلے کے بارے میں ابن العربی، قاضی عیاض مالکی اور ان کے متبعین کا نکتہ نظر درست ہے جبکہ ابن حجر کا موقف درست نہیں ہے۔ غرانیق کا واقعہ سرے سے پیش ہی نہیں آیا۔ مجھے بعض اوقات بعض علماء کے بعض بیانات پر بہت حیرت ہوتی ہے جیسے حافظ ابن حجر نے مذکورہ بالا مسئلے کے بارے میں جو موقف اختیار کیا ہے وہ حیران کن ہے کیونکہ اگر اس طرح کا کوئی واقعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیش آ جاتا تو شریعت پر اعتماد ختم ہو جاتا اور انبیاء کی عصمت کا عقیدہ باقی نہ رہتا اور رسول کی بات کی اہمیت بھی کسی عام شخص کی بات کی مانند ہو جاتی کیونکہ (معاذ اللہ) شیطان اس پر اور اس کی گفتگو پر اثر انداز ہو سکتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں اپنی طرف سے اضافہ کر دیتا۔ اس کے جواب میں قرآن کی یہ آیت نہیں پیش کی جا سکتی۔

فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ۔ (الحج ۲۲:۵۲)

''بے شک اللہ تعالیٰ شیطان کی القاء کردہ شے کو مٹا دیتا ہے''

کیونکہ اس آیت میں بھی اس بات کا امکان موجود ہوگا کہ شاید اس میں (معاذ اللہ) شیطانی اثرات نہ ہوں کیونکہ جب آپ مسئلہ غرانیق میں شیطانی اضافے کو درست تسلیم کر لیں گے تو قرآن کی دیگر آیات میں بھی شیطانی اثرات کا امکان باقی رہے گا جس کے نتیجے میں پورا قرآن مشکوک ہو جائے گا اس لئے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس طرح کی روایات کو اٹھا کر پرے پھینک دے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عصمت اور عزت و عظمت کا عقیدہ دل میں رکھے۔ جہاں تک قرآن کی درج ذیل آیت کی تفسیر کا تعلق ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ۔ (الحج ۲۲:۵۲)

''ہم نے تم سے پہلے جو بھی نبی یا رسول مبعوث کیا''

تو اگر اس آیت کے بارے میں ابن حجر کی بیان کردہ تفسیر کو درست تسلیم کر لیا جائے تو اس کا بالواسطہ مطلب یہ ہوگا کہ شیطان (معاذ اللہ) ہر نبی اور ہر رسول پر نازل ہونے والی وحی پر اثر انداز ہوتا رہا ہے بلکہ دیگر انبیاء و مرسلین پر اس کا اثر قرآن کی بہ نسبت زیادہ ہوا ہے کیونکہ خود قرآن کہہ رہا ہے۔

مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّا اِذَا تَمَنّٰى اَلْقَى الشَّيْطَانُ فِيْ اُمْنِيَّتِهٖ۔ (الحج ۲۲:۵۲)

''ہر نبی اور رسول کی تلاوت میں شیطان نے مداخلت کی کوشش کی''

پس ابن حجر اور ان کے متبعین کی رائے کے مطابق تو شیطان کا یہ وطیرہ ہوگا کہ وہ انبیاء کرام علیہم السلام کو

اسی طرح اذیت دیتا ہوگا حالانکہ یہ نظریہ واضح طور پر باطل ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اللہ تعالیٰ حضرت شیخ سے راضی ہو، امی ہونے کے باوجود آپ مسائل پر کس قدر دقیق انداز میں اظہار خیال فرماتے ہیں۔ امام ناصر الدین بیضاوی فرماتے ہیں: بعض حضرات نے اگرچہ یہ بیان کیا ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں "تمنی"، قَرَءَ (اس نے پڑھا)، "امنیته" قرأتہ (اس نے پڑھا) کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی شیطان نے آپ علیہ السلام کی قرأت کے بعد چند الفاظ اپنی طرف سے ملا دیئے اور کفار نے یہ سمجھا کہ شاید یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت کے الفاظ ہیں۔ یہ قول مردود ہے کیونکہ اس صورت میں وحی پر اعتماد باقی نہیں رہے گا۔ یہاں درج ذیل آیت کو دلیل نہیں بنایا جا سکتا کیونکہ اس کے بارے میں بھی یہی احتمال موجود ہوگا کہ شاید یہ بھی شیطان کی کارستانی ہے۔ وہ آیت یہ ہے:

فَيَنسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ آيَاتِهِ. (الحج ۲۲:۵۲)

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس مسئلہ پر سیّدی دباغ کا جواب زیادہ واضح اور مضبوط ہے۔

ایک اور قوی اشکال

(احمد بن مبارک کہتے ہیں: ابن حجر کی بیان کردہ تفسیر پر) یہ اعتراض بھی وارد ہوگا کہ لفظ "تمنیٰ" میں ضمیر کا مرجع اس سے پہلے موجود الفاظ نبی اور رسول ہوں گے۔ اور یہ بات ناممکن ہے کہ شیطان نے ہر نبی اور ہر رسول کی قرأت میں مسئلہ غرانیق القاء کیا ہو۔ یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ انبیاء کی عصمت کا عقیدہ رکھنا ضروری ہے۔ لہٰذا ہر ایسی روایت جو اس عقیدے کے منافی ہو اسے مسترد کر دیا جائے گا۔ اصول حدیث کے ماہرین نے اس نوعیت کی تمام روایات کو جھوٹ کا پلندہ قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجر کا یہ کہنا غلط ہے کہ تین مختلف اسناد سے منقول ہونے کے باعث یہ روایت مستند شمار ہوگی کیونکہ ایسی روایت کو اس وقت مستند قرار دیا جا سکتا ہے جب اس میں صحت سے متعلق گمان کافی ہو اور یہ چیز عملی مسائل میں دلیل بن سکتی ہے لیکن علمی اعتقادی مسائل میں کسی خبر واحد کو دلیل بھی نہیں بنایا جا سکتا۔ چہ جائیکہ کسی خبر واحد کی بدولت کسی مسلمہ عقیدے کا انکار کر دیا جائے۔ اس لئے قاضی عیاض مالکی کی رائے اصولِ حدیث سے متصادم نہیں ہے۔

بلکہ ابن حجر کا اپنا عمل اصول حدیث کے خلاف جاتا ہے کیونکہ کسی بھی خبر واحد کے ذریعے کسی مسلمہ عقیدے کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔ حافظ ابن حجر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے اس آیت کی جس قرأت اور تفسیر کا ذکر کیا ہے وہ بذات خود مستند نہیں ہے کیونکہ اس کے راویوں میں بعض مشکوک افراد شامل ہیں۔

آیت کی صحیح تفسیر

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے سیّدی دباغ سے یہ دریافت کیا: اس آیت کی صحیح تفسیر کیا ہے؟ اور اس آیت میں کس نور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: جس نور کی طرف اس آیت میں

اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہر نبی اور ہر رسول کی شدید ترین خواہش یہ تھی کہ اس کی امت کو ایمان کی دولت نصیب ہو جائے۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی یہی خواہش تھی جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے آپ کا رب ارشاد فرماتا ہے۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰى آثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا۔ (الکہف ۶:۱۸)

''اگر یہ لوگ قرآن پر ایمان نہیں لاتے تو کیا ان کی نافرمانی کے باعث تم خود کو ہلاکت کا شکار کر دو گے۔''

وَمَا اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ۔ (یوسف ۱۲:۱۰۳)

''اور اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں اگر چہ آپ (کتنی ہی) خواہش کریں۔''

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ۔ (یونس ۱۰:۹۹)

''کیا تم لوگوں کو زبردستی مسلمان بناؤ گے۔''

لیکن امتوں کی حالت مختلف ہوتی ہے جیسے قرآن کہتا ہے۔

وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ

''لیکن انہوں نے اختلاف کیا بعض لوگ ایمان لے آئے اور بعض نے انکار کر دیا۔''

اب جو لوگ کفر پر جمے رہتے ہیں شیطان ان کے دل میں رسالت کے بارے میں ایسے وسوسے پیدا کر دیتا ہے جن کی وجہ سے وہ اپنے کفر میں مزید پختہ ہو جاتے ہیں۔ بعض مومنین کو بھی ان وسوسوں کا شکار ہونا پڑتا ہے کیونکہ ایمان بالغیب کے اندر وسوسے کا امکان موجود ہوتا ہے تاہم کوئی شخص زیادہ وسوسوں کا شکار ہوتا ہے اور کوئی کم وسوسوں کا شکار ہوتا ہے لہٰذا ثابت یہ ہوا کہ قرآن کی آیت میں ''تمنی'' کا مفہوم یہ ہے کہ ہر نبی اور ہر رسول کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کی امت کو ایمان کی دولت نصیب ہو جائے۔ ہر نبی اپنی امت کے لئے بھلائی، ہدایت، کامیابی اور بہتری کا خواہاں ہوتا ہے جبکہ شیطان عام لوگوں کے قلوب میں اس نبی یا رسول کی نبوت یا رسالت کے بارے میں طرح طرح کے وسوسے پیدا کر دیتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ بعض افراد پر رحم کرتے ہوئے ان کے قلوب سے ان وسوسوں کو ختم کر کے ان کے قلوب میں اپنی آیات کو مضبوط کر کے، انہیں ایمان کی دولت سے مالا مال کر دیتا ہے جبکہ بعض لوگوں کے قلوب میں وہ وسوسے باقی رہنے دیتا ہے جو ان کے لئے فتنے کا باعث بنتے ہیں یعنی کفار اور اہل ایمان دونوں وسوسوں کا شکار ہوتے ہیں لیکن اہل ایمان کے قلوب میں وسوسے باقی نہیں رہتے جبکہ کفار کے قلوب میں وسوسے باقی رہ جاتے ہیں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) یہ اس آیت کی سب سے بہتر تفسیر ہے اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے جب ہم دیگر حضرات کی تفاسیر سامنے رکھ کر اس تفسیر کے ساتھ ان کا تقابلی مطالعہ کریں۔

دیگر مفسرین کی آراء

ایک تفسیر ہم پہلے نقل کر چکے ہیں اور اس پر وارد ہونے والے اعتراضات بھی ذکر کر چکے ہیں۔ دوسری تفسیر کے مطابق طبری یہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں "تمنی" کا مطلب سوچنا ہے۔ اور شیطان (معاذ اللہ) ہر نبی اور رسول کی سوچ میں حیلے کے طور پر یہ خیال پیدا کرتا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ آپ کو اس قدر مال غنیمت عطا کرے کہ تمام اہل ایمان مالدار ہو جائیں۔ پس اللہ تعالیٰ شیطان کی داخل کردہ اس سوچ کو باطل کر دیتا ہے۔ "فراء" اور "کسائی" فرماتے ہیں۔ "تمنی" کا مطلب "سوچنا" ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) یہ تفسیر بالکل غلط ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ شیطان کسی نبی کو دھوکہ دے سکے کیونکہ نبی کا نور بصیرت اس قدر صاف ہوتا ہے کہ سارا جہان اس سے فیض حاصل کرتا ہے۔ مزید برآں یہ تفسیر اس آیت کے سیاق وسباق سے بھی مناسبت نہیں رکھتی۔

اس آیت کی تیسری تفسیر امام بیضاوی سے منقول ہے۔ وہ فرماتے ہیں اس آیت میں "تمنی" کا مفہوم یہ ہے کہ جب کوئی نبی کسی چیز کی خواہش محسوس کرتا ہے تو شیطان اس کے حصول کی مزید ترغیب دیتا ہے جس کے نتیجے میں نبی کی توجہ دنیا کی طرف مبذول ہو جاتی ہے جیسا کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

انه ليغان على قلبي واني لاستغفر اللّٰه في اليوم مائة مرة (صحیح مسلم ۴: ۲۰۷۵)

"میرے دل پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی ہے جس کے باعث میں روزانہ سو مرتبہ اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرتا ہوں۔"

لیکن اس تفسیر میں خامی یہ ہے کہ یہ آیت کے سیاق وسباق سے مطابقت نہیں رکھتی نیز اس میں بارگاہ رسالت کا ادب واحترام بھی ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس آیت کی صرف وہی تفسیر درست ہو سکتی ہے جس میں آیت کے سیاق وسباق اور بارگاہِ رسالت کے ادب واحترام کو پیش نظر رکھا گیا ہو اور یہ خصوصیت صرف سیّدی عبدالعزیز دباغ کی بیان کردہ تفسیر میں موجود ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) ہاروت اور ماروت کے قصے کے بارے میں بھی قاضی عیاض اور علامہ ابن حجر کا موقف ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ قاضی عیاض نے اس بارے میں منقول جملہ روایات کو من گھڑت قرار دیا ہے جبکہ علامہ ابن حجر کا موقف یہ ہے کہ یہ واقعہ مختلف حوالوں اور روایات سے منقول ہونے کی بناء پر یقیناً وقوع پذیر ہوا ہوگا۔ امام سیوطی نے بھی ابن حجر کے موقف کی تائید کی ہے اور اپنی تصنیف "الحبائك في اخبار الملائك" میں اس واقعہ کی مختلف اسناد نقل کی ہیں۔ ان دونوں میں کس کا موقف درست ہے؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: قاضی عیاض کا موقف درست ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس بارے میں آپ نے بہت سے محیر العقول نکات بیان کئے جنہیں یہاں تحریر کرنا ناممکن ہے۔

تکوینی حقائق

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْ بَرَدٍ۔ (النور۲۴:۴۳)

''اور وہ آسمان میں موجود پہاڑوں میں سے اولے نازل کرتا ہے۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: اس آیت کی تفسیر میں بعض مفسرین نے یہ بات نقل کی ہے کہ آسمان میں بھی پہاڑ موجود ہیں۔ کیا یہ بات درست ہے؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: نہیں! اس آیت میں لفظ ''السماء'' سے مراد ہر بلند چیز ہے۔ گویا قرآن یہ کہتا ہے کہ تم پر بلندی کی جانب سے سردی نازل ہوتی ہے اور برفانی پہاڑوں کی طرف سے سردی نازل ہوتی ہے کیونکہ ہوا ان کی ٹھنڈک کو ہر طرف پھیلا دیتی ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے اسی آیت سے متعلق اس لئے سوال کیا تھا کیونکہ مجھ سے کسی نے یہ دریافت کیا: برف کس طرح بنتی ہے؟ اس سوال کے ضمن میں مزید کئی سوالات تھے۔ مجھے اس کا جواب معلوم نہیں تھا۔ اس لئے میں نے یہ تمام سوالات سیّدی دباغ کی خدمت میں پیش کئے اور آپ نے مجھے ان کے شافی جوابات عنایت کئے۔ میں وہ سوالات اور ان کے جوابات یہاں نقل کر رہا ہوں۔

سوال یہ تھا، برف کی حقیقت کیا ہے؟ کیا یہ اپنے مقام سے منجمد شدہ حالت میں نازل ہوتی ہے یا یہ درحقیقت پانی ہوتا ہے؟ اور ہوا کی ٹھنڈک کے باعث منجمد ہو جاتا ہے؟ نیز برف کہاں سے نازل ہوتی ہے؟ یہ آسمان سے نازل ہوتی ہے یا بادلوں سے نازل ہوتی ہے؟ یا پھر آسمان میں کوئی سمندر موجود ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ وہیں سے بارش بھی نازل ہوتی ہے؟ کیا وجہ ہے کہ یہ صرف ٹھنڈے علاقوں میں نازل ہوتی ہے؟ نیز عام میدانی علاقوں کے بجائے صرف پہاڑی علاقوں میں نازل ہوتی ہے؟ اگر میدانی علاقے میں نازل ہو بھی جائے تو فوراً پگھل جاتی ہے حالانکہ پہاڑوں پر یہ ایک طویل عرصے تک موجود رہتی ہے؟ بعض اوقات یہ بارش کے ہمراہ (اولوں کی شکل میں) نازل ہوتی ہے اور کبھی صرف برف (اولے) ہی نازل ہوتی ہے؟ بعض اوقات کسی سرد اور گرم خطے کے درمیان بہت مختصر مثلاً 16 میل یا اس سے بھی کم فاصلہ ہوتا ہے اور دونوں کے درمیان کوئی بڑی رکاوٹ بھی نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود دونوں خطوں کا موسم ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے؟ کیا اس کی کوئی (سائنسی) توجیہہ بھی ہے یا نہیں؟ کیا وجہ ہے کہ اکثر میدانی علاقوں کی بجائے، پہاڑوں اور بلند و بالا علاقوں میں سردی زیادہ ہوتی ہے؟ نیز آسمانی بجلی اکثر انہی علاقوں میں گرتی ہے، جو ٹھنڈے ہوں، جہاں پہاڑ اور درخت کثرت سے ہوں جبکہ گرم میدانی یا صحرائی علاقوں میں ایسا نہیں ہوتا؟ بلکہ بعض صحرائی اور میدانی علاقوں کے باسی اس بات سے واقف ہی نہیں ہیں کہ کیا آسمانی بجلی بھی کسی پر گر سکتی ہے؟ دونوں خطوں کے احوال میں اس قدر نمایاں فرق کیوں ہے؟ براہ مہربانی اس راز کی عقدہ کشائی کریں؟

سیّدی دباغ نے جواب دیا: تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو یکتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہمارے آقا حضرت محمد

صلی اللہ علیہ وسلم ان کی آل اور اصحاب پر درود نازل فرمائے اور ہمیں درست جواب دینے کی توفیق عطا فرمائے۔

برف کی حقیقت

برف درحقیقت پانی ہوتا ہے جسے ہوا منجمد کر دیتی ہے۔ عام طور پر یہ پانی بحر محیط کا پانی ہوتا ہے۔ بحر محیط کے پانی میں تین خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ سورج سے دوری اور ہواؤں کی قربت کے باعث اس سمندر کا پانی جس قدر ٹھنڈا ہوتا ہے اتنا کسی اور جگہ پر نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ معمولی سی سردی کی وجہ سے یہ منجمد ہو جاتا ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کا پانی انتہائی صاف وشفاف ہوتا ہے۔ اس میں جواہر ارضی میں سے کوئی بھی چیز شامل نہیں ہوتی۔ یہ ایک ایسا سمندر ہے جو قدرت الٰہیہ کے تحت ایک خاص مقام پر موجود ہے۔ یہ روئے زمین پر موجود نہیں ہے اور زمین سے بہت دور ہے کیونکہ اس کے اور ہمارے درمیان بے شمار مسافت ہے۔ جب یہ واضح ہو گیا تو اب یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتو ہوائیں اس کے کچھ پانی کو اٹھا کر لے جاتی ہیں۔ کیونکہ ہواؤں میں ٹھنڈک موجود ہوتی ہے اس لئے یہ پانی فوراً منجمد ہو جاتا ہے۔ ہوائیں اسے اٹھا کر چلتی رہتی ہیں اور ایک طویل فاصلہ طے کرنے کے بعد یہ پانی غبار کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ اس پانی کے اجزاء ایک دوسرے سے جڑ جاتے ہیں اور پھر یہ کبھی نرم روئی (برف باری) کی شکل میں زمین پر نازل ہوتا ہے اور کبھی زیادہ باریک صورت میں نازل ہوتا ہے جبکہ اولے ان سمندروں کے پانی سے بنتے ہیں جو زمین میں موجود ہیں کیونکہ ان کے منجمد ہونے اور زمین پر نازل ہونے کے درمیان بہت مختصر وقفہ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے درمیان میں بعض اوقات زمین کے جواہر میں سے کوئی چیز موجود ہوتی ہے کیونکہ ان پر چاروں طرف سے ہوا حملہ آور ہوتی ہے۔ اس لئے ان کی شکل گوندھے ہوئے آٹے کے پیڑے کی مانند ہو جاتی ہے۔ اگر آپ ژالہ باری کے فوراً بعد اولوں کو دیکھیں گے تو ان کی یہی شکل ہوگی لیکن کچھ دیر بعد یہ ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔ برف کی حقیقت یہ ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ برف باری صرف ٹھنڈے علاقوں میں کیوں ہوتی ہے اور برف پہاڑوں پر دیر تک کیوں باقی رہتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب تک کوئی مانع درپیش نہ ہو اس وقت تک برف مسلسل منجمد رہتی ہے۔ جب مانع درپیش ہو تو یہ بارش کی شکل اختیار کر جاتی ہے۔ یہاں مانع سے مراد زمین سے اٹھنے والے وہ بخارات ہیں جو زمین سے آسمان کی طرف بلند ہوتے ہیں اور ان میں حرارت پائی جاتی ہے۔ جب یہ برف سے ٹکراتے ہیں تو برف کی ٹھنڈک کو کم کر کے اس میں گرمی پیدا کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے برف پگھلنے لگتی ہے کیونکہ میدانی علاقوں میں یہ بخارات زیادہ ہوتے ہیں اس لئے وہاں برف باری نہیں ہوتی اور اگر ہو بھی جائے تو برف زیادہ دیر تک نہیں جمی رہتی جبکہ پہاڑوں اور سرد ممالک میں برف کو منجمد رہنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آتی۔

بارش کے ساتھ یا بارش کے بغیر برف گرنے کے سوال کا جواب یہ ہے کہ بارش کے ساتھ عام طور پر دو میں سے کسی ایک سبب کے باعث برف گرتی ہے۔ ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس کا باعث وہ بخارات ہوتے ہیں جن

کے کچھ اجزاء پگھل کر بارش کی شکل میں نازل ہو جاتے ہیں اور کچھ بدستور منجمد حالت میں نازل ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے اولوں کے ہمراہ نازل ہونے والی بارش ہلکی، کمزور اور باریک بوندوں کی شکل میں نازل ہوتی ہے یا پھر ایسا ہوتا ہے کہ جب ہوائیں پانی کو اٹھا کر منجمد کرتی ہیں اور پھر اس سے ٹکراتی ہیں تو پہلا حصہ برف کی شکل میں اور دوسرا بارش کی شکل میں نازل ہوتا ہے۔

گرم اور سرد خطے کا اختلاف

جہاں تک گرم اور سرد خطوں کے درمیان کسی بڑی رکاوٹ کے بغیر موسم کے اختلاف کا تعلق ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ گرم خطوں میں مانع موجود ہوتا ہے جبکہ سرد خطوں میں کوئی مانع موجود نہیں ہوتا۔ اس لئے دونوں خطے مخصوص ماحول سے متعلق ہیں۔ پہاڑوں اور بلند مقامات میں ٹھنڈک اس لئے زیادہ ہوتی ہے کیونکہ وہ خلا کے اس حصے کے زیادہ قریب ہوتے ہیں جو انتہائی شدید سرد ہوتا ہے جبکہ خلا کا یہ حصہ میدانی علاقوں سے بہت دور ہوتا ہے جہاں تک آسمانی بجلی کا تعلق ہے تو یہ کہنا ہی غلط ہے کہ وہ گرم میدانی علاقوں میں نہیں گرتی۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) سلجماسہ ایک گرم میدانی بلکہ صحرائی علاقہ ہے اور میں نے خود وہاں کئی مرتبہ بجلی گرتی ہوئی دیکھی ہے۔ میر سیّد شریف جرجانی نے ''شرح مواقف'' میں یہ واقعہ درج کیا ہے کہ ایک مرتبہ صحرا میں، ایک بچے پر بجلی گر گئی تو اس کی دونوں پنڈلیاں کٹ کے علیحدہ ہو گئیں، لیکن کوئی خون نہیں نکلا۔ مفسرین نے بھی یہ بات نقل کی ہے کہ قرآن کی درج ذیل آیت صحرا کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔

وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَشَاءُ۔ (الرعد ۱۳:۱۳)

''اللہ تعالیٰ جس پر چاہے آسمانی بجلی گرا دیتا ہے''

علماء و فلاسفہ کی آراء

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) یہ تمام جوابات اس شخص نے بیان کئے ہیں جس نے اپنی بصیرت کی مدد سے ان امور کا مشاہدہ کیا ہے۔ میری مراد سیّدی عبدالعزیز دباغ ہیں لہٰذا یہ جواب صوفیاء کرام کا جواب شمار ہوگا۔ البتہ اس بارے میں علماء کرام کا کوئی جواب نہیں مل سکا۔ میں نے اس موضوع سے متعلق تفسیر، حدیث، علم کلام سے متعلق تمام ضروری مواد کھنگال ڈالا ہے یہاں تک کہ علم حدیث کے ایک بہت بڑے ماہر امام جلال الدین سیوطی نے اپنی مشہور تصنیف ''الهبة السنية فى الهيئة السنية'' میں بھی اس بارے میں کوئی بات نقل نہیں کی حالانکہ اس تصنیف کا بنیادی موضوع ہی علم ہیئت ہے۔ اسی طرح امام سیوطی نے تفسیر بیضاوی کے حاشیے میں بھی اس موضوع پر کچھ تحریر نہیں کیا حالانکہ سیوطی کی عادت ہے کہ جن مسائل میں بیضاوی فلسفیوں کی پیروی کرتے ہیں یہ ان مسائل میں سلف صالحین کے کلام کے ذریعے فلسفیوں کے کلام کو رد کرتے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے ''الدر المنثور'' میں بھی اس بارے میں کوئی روایت نقل نہیں کی ہے۔ سیوطی نے سائنسی موضوعات پر صرف مذکورہ بالا

تینوں کتابوں میں تفصیلی کلام کیا ہے جہاں انہوں نے آسمانی بجلی، اس کی کڑک، بارش، بادلوں پر کلام کیا ہے وہاں مناسب تھا کہ اولوں، برف باری اور اس کے اسباب پر بھی گفتگو کرتے۔ امام بیضاوی نے ان دونوں کے اسباب کے بارے میں حکماء (فلسفیوں) کی جو آراء نقل کی ہیں ان کی بنیاد یہی ہے کہ یہ سارا نظام خود بخود چل رہا ہے جیسا کہ فلسفیوں کی اسی سوچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ''شرح مواقف'' کے مصنف لکھتے ہیں۔

''یہ بات ذہن نشین کر لیں، سورج کی گرمی کے باعث کچھ اجزاء جو ہوا اور پانی پر مشتمل ہوتے ہیں فضا میں بلند ہوتے ہیں۔ انہیں بخارات کہا جاتا ہے۔ بخارات (ہوا کی بہ نسبت) کچھ ثقیل ہوتے ہیں۔ بعض اوقات زمین سے کچھ ایسے اجزاء بھی بلند ہوتے ہیں جن کا تعلق آگ اور زمین سے ہوتا ہے۔ انہیں دھواں کہا جاتا ہے اور یہ با آسانی بلند ہو جاتے ہیں۔ یاد رکھیں، دھواں صرف وہی نہیں ہوتا جو آگ میں جلنے والی اشیاء سے خارج ہوتا ہے اور اس کی شکل سیاہ ہوتی ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ بخارات اور دھواں الگ الگ بلند ہوں۔ عام طور پر یہ دونوں ایک ساتھ فضا میں بلند ہوتے ہیں جس کی وجہ سے خلا میں مختلف صورتیں وجود میں آتی ہیں مثلاً اگر دھواں کم ہو اور ہوا میں گرمی زیادہ ہو تو پانی کے اجزاء ہوا میں حل ہو جاتے ہیں لیکن اگر دھواں زیادہ ہو اور ہوا میں بھی اتنی گرمی نہ ہو کہ وہ اس پانی کو حل کر سکے، اس وقت یہ بخارات مزید بلند ہو کر خلا کے ٹھنڈے حصے تک پہنچ جاتے ہیں اور پھر اس ٹھنڈک کے باعث یہ منجمد ہو کر بادل کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔ پانی کے اجزاء اگر منجمد نہ ہوں اور ٹھنڈک بھی زیادہ نہ ہو تو یہ بارش کی شکل میں نازل ہوں گے اور اگر ٹھنڈک زیادہ ہو تو یہ منجمد شکل میں نازل ہوں گے اگر یہ منجمد شدہ اجزاء بڑے حصے کی شکل اختیار کرنے سے پہلے نازل ہوں تو یہ برف باری ہو گی اور اگر بڑے حصے کی شکل اختیار کرنے کے بعد نازل ہوں تو یہ ''اولوں'' کی شکل میں نازل ہوں گے۔ ''اولوں'' کی شکل گول اس لئے ہوتی ہے کیونکہ ہوا ہر طرف سے ان کو چھیدتی ہوئی آتی ہے، جس کی وجہ سے ان کے کنارے ختم ہو جاتے ہیں۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس کے بعد (میر سیّد شریف جرجانی نے) سایہ، کہر، دھند، کڑک، بجلی، ہوا اور دیگر آسمانی امور سے متعلق گفتگو کی ہے پھر اس موضوع پر تفصیلی کلام کرنے کے بعد کہتے ہیں، یہ تمام آراء فلسفیوں کی ہیں کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار کرتے ہیں۔ الخ

امام ناصر الدین البیضاوی نے یہ تمام گفتگو درج ذیل آیت کریمہ کی تفسیر میں نقل کی ہے جو فلسفیوں کی آراء کے مطابق ہے۔

وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيهَا مِنْ بَرَدٍ (النور ۲۴:۴۳)

''اور اللہ تعالیٰ آسمان میں موجود پہاڑوں سے اولے نازل کرتا ہے''

حیرانگی اس بات کی ہے کہ تفسیر بیضاوی کے حاشیے میں امام سیوطی اور شیخ الاسلام زکریا الانصاری نے اس پر

کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) سیّدی دباغ نے جو جواب عنایت کیا ہے اگر اس کی تشریح کی جائے تو یہ ایک مستقل کتاب کی شکل اختیار کر جائے گی۔ اس لئے ہم اس پر اکتفا کرتے ہیں واللہ تعالیٰ اعلم

زلزلے کی حقیقت

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے سیّدی دباغ سے ''زلزلے'' اور اس کے سبب کے بارے میں دریافت کیا: ایک مرتبہ میں آپ کے ہمراہ رصیف کے بازار سے گزر رہا تھا کہ اچانک ہلکا سا زلزلہ آیا۔ بعض لوگوں نے اس کے جھٹکے کو محسوس کیا اور بعض نے نہیں کیا۔ مجھے بھی اس کا احساس نہیں ہو سکا جب ہم آگے گئے اور کچھ دوسرے لوگوں سے ہماری ملاقات ہوئی تو انہوں نے ہم سے زلزلے کے بارے میں دریافت کیا: میں نے کہا، مجھے تو محسوس نہیں ہوا۔ سیّدی دباغ نے فرمایا: جب ہم رصیف کے بازار میں فلاں دکان پر کھڑے تھے اس وقت ہلکا سا زلزلہ آیا تھا۔ چنانچہ میں نے اس وقت سیّدی دباغ سے زلزلے کی حقیقت کے بارے میں دریافت کیا اور اس بارے میں سلف صالحین اور فلسفیوں کی آراء کا بھی تذکرہ کر دیا؟

سیّدی دباغ نے ارشاد فرمایا: جب اللہ تعالیٰ زمین پر تجلی فرماتا ہے تو اس وقت زلزلہ نازل ہوتا ہے۔ اس بات کے اندر ایک ''سر'' پوشیدہ ہے جو سیّدی دباغ کی زبانی میں نے سن لیا۔ (لیکن اسے یہاں نقل نہیں کر سکتا، سیّدی دباغ مزید ارشاد فرماتے ہیں) پہاڑوں کی پیدائش سے پہلے یہ تجلی کثرت سے زمین پر نازل ہوتی تھی اور زمین اکثر زلزلوں کا شکار رہتی تھی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو پیدا کیا جس کے نتیجے میں زمین میں ٹھہراؤ آ گیا۔ قیامت کے قریب یہ تجلی پھر کثرت سے نازل ہوگی اور زمین میں بکثرت زلزلے پیدا ہوں گے۔

احادیث میں زلزلے کا ذکر

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) امام جلال الدین سیوطی نے اپنی تصنیف ''**کشف الصلصله عن وصف الزلزلة**'' میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بعض فرامین نقل کئے ہیں۔ حضرت دباغ کا بیان بھی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بیان سے مطابقت رکھتا ہے۔ امام طبرانی نے اپنی تصنیف ''کتاب السنة'' میں ایک مستقل عنوان یوں قائم کیا ہے۔ ''یہ باب ان روایات کے بارے میں ہے جن کے مطابق جب اللہ تعالیٰ زمین پر اپنی تجلی نازل فرماتا ہے تو یہاں زلزلہ آتا ہے'' اور پھر طبرانی نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول نقل کیا ہے۔

اذا اراد اللّٰه ان یخوف عباده ابدی عن بعضه للارض فعند ذلك تزلزلت و اذا اراد اللّٰه ان یدمدم علی قوم تجلی لها

''جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو خوفزدہ کرنا چاہے تو اپنی ہلکی سی تجلی زمین پر ڈالتا ہے جس کے نتیجے میں زلزلہ آتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو برباد کرنا چاہے تو پوری تجلی زمین پر ڈال دیتا ہے۔''

دیلمی اپنی تصنیف ''مسند فردوس'' میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان نقل کرتے ہیں۔

واذا اراد اللّٰہ ان یخوف خلقه اظھر للارض منه شیئا فارتعدت و اذا أراد اللّٰہ ان یھلك خلقه تبدیٰ لھا

''جب اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو خوفزدہ کرنا چاہے تو اپنی ہلکی سی تجلی زمین پر ظاہر کرتا ہے جس کے نتیجے میں زمین لرز جاتی ہے اور جب اللہ تعالیٰ کسی مخلوق کو ہلاک کرنا چاہے تو پوری تجلی اس پر ڈال دیتا ہے۔''

سیوطی تحریر کرتے ہیں، ان تمام روایات سے فلسفیوں کے اس نظریے کی تردید ہو جاتی ہے کہ سورج کی شعاعوں کے باعث کچھ بخارات اکٹھے ہو کر ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور اس مقام پر ہوا اپنی ٹھنڈک کے باعث ان بخارات کو پانی کی شکل میں تبدیل نہیں کر سکتی نیز یہ بخارات اس قدر کثیر مقدار میں ہوتے ہیں کہ یہ حل بھی نہیں ہو سکتے اور جس مقام پر یہ موجود ہوتے ہیں وہاں زمین اس قدر سخت ہوتی ہے کہ ان بخارات کو باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔ انہی تجاوزات کی حرکت کی وجہ سے زمین میں زلزلہ آ جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے بخار کے شکار کسی شخص کے پیٹ میں جب بخارات جوش مارتے ہیں تو انسان مضطرب ہو جاتا ہے۔ اس قول کے باطل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس بات کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے جبکہ (مذکورہ بالا روایات میں) اس کے مخالف دلیل موجود ہے۔ (یہ ساری گفتگو امام سیوطی کی تھی۔)

زمین پھٹنے کی وجوہات

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے سیّدی دباغ سے، زمین کے پھٹنے اور اوپر موجود اشیاء کے زمین میں دھنس جانے کا سبب دریافت کیا: یہ واقعہ کبھی کبھار رونما ہوتا ہے لیکن قیامت کے قریب کثرت سے رونما ہو گا؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: زمین پانی پر موجود ہے، پانی ہوا پر موجود ہے اور ہوا اس بڑے میدان سے آتی ہے جو آسمان اور بحرمحیط کے درمیان موجود ہے مثلاً ایک شخص اگر چلنا شروع کر دے تو آخر کار وہ ایک ایسے مقام پر پہنچ جائے گا جہاں زمین ختم ہو جائے گی اور سامنے بحرمحیط نظر آئے گا پھر اگر وہ بحرمحیط پر بھی چلنا شروع کر دے تو ایک ایسا مقام آئے گا جہاں بحرمحیط بھی ختم ہو جائے گا۔ اور اب اس کے سامنے ایک خلا ہو گا جہاں سے ہوائیں نکل رہی ہوں گی۔ اس مقام کی کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی۔ یہ ہوائیں اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت پانی اور زمین کو اٹھا کر رکھتی ہیں اور آسمان کو انہوں نے تھام رکھا ہے۔ یہ ہوائیں ہر وقت خدمت میں مشغول رہتی ہیں۔ یہ آسمان کی طرف بلند ہوتی رہتی ہیں جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر بارش نازل کرنا چاہے تو کسی مخصوص ہوا کو یہ حکم دیتا ہے اور وہ ہوا بحرمحیط کے راستے زمین کی طرف آ جاتی ہے۔ بحرمحیط کے اوپر سے گزرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق یہ ہوا کچھ پانی اپنے ہمراہ لے آتی ہے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ غار سے واپس آتے ہوئے مجھے اس مقام پر

برف کے پہاڑ دکھائی دیئے جن کی عظمت سے اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی واقف نہیں ہے پھر جب اگلے دن میں وہاں سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ وہ پہاڑ اس پانی کی طرف منتقل ہو گئے ہیں جو کوہ قاف کے پاس موجود ہے۔ ان پہاڑوں کو ہواؤں نے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا تھا۔

جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو زمین میں دھنسانے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو یہ ہوائیں زمین میں موجود ان سوراخوں میں داخل ہو جاتی ہیں جو ان کے اور پانی کے درمیان موجود ہیں۔ جب یہ ہوائیں سوراخوں میں داخل ہو جائیں تو زمین پھٹ جاتی ہے اور اس پر موجود لوگ اندر دھنس جاتے ہیں۔ قرب قیامت کے دور میں زمین میں سوراخوں کی تعداد زیادہ ہو جائے گی اور ہوائیں بھی کثرت سے زمین کا رخ کریں گی جس کی وجہ سے اس قدر زمین دھنس جائے گی کہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تحت ہوگا اور پھر یہ ہوائیں مسلسل زمین کو تباہ و برباد کرتی رہیں گی یہاں تک کہ زمین کی شکل اس چھلنی کی مانند ہو جائے گی جس کے ذریعے گندم میں سے پتھروں کو الگ کر دیا جاتا ہے۔ زمین میں ریڑھ کی ہڈی کے (وہ مخصوص ذرات) باقی رہ جائیں گے جن کے ذریعے خاکی وجود تشکیل پاتا ہے اور یہ انسان کے جسم کے لئے بیج کی حیثیت رکھتے ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ انہیں سمندروں کی گہرائیوں، زمین کے عمیق ترین حصوں، غاروں کے درمیان اور پہاڑوں کے نیچے سے بلکہ جہاں بھی یہ ہوں گے وہاں سے انہیں برآمد کر کے ایک جگہ اکٹھا فرما دے گا یہی وہ دن ہوگا جب پہاڑ حرکت میں آ جائیں گے اور یہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائیں گے پھر آسمان سے بارش نازل ہوگی جس کے نتیجے میں ریڑھ کی ہڈی کے وہ ذرات نشو و نما پاتے ہوئے کدو یا تربوز کے برابر ہو کر زمین پر ظاہر ہو جائیں گے۔ سیّدی دباغ فرماتے ہیں: سیّدی عبدالوہاب برناوی فرمایا کرتے تھے: اس دن کو یاد رکھو جب زمین انڈے پیدا کرے گی اور ریڑھ کی ہڈی کے ذرات نشو و نما پانے لگیں گے اور جب ان کی نشو و نما مکمل ہو جائے گی تو ان (انڈوں کے) اندر سے بنی نوع انسان اس طرح باہر نکلیں گے جس طرح پرندے انڈوں سے باہر آتے ہیں۔ اس دن ناف، پیٹھ کی جانب ہوگی پیٹ میں نہیں ہوگی پھر اللہ تعالیٰ ارواح کو ان اجسام میں داخل ہونے کا حکم دے گا۔ جب ارواح ان اجسام میں داخل ہو جائیں گی تو یہ جسم اٹھ کھڑے ہوں گے اس وقت اللہ تعالیٰ اس نور کو، یعنی نور محمدی کو جنت کی طرف جانے کا حکم دے گا، جس نور کی برکت کی وجہ سے جہنم دنیا تک نہیں آ سکی (وہ نور وہاں سے رخصت ہوگا) اور جہنم دنیا پر حملہ آور ہو کر اسے اپنے گھیرے میں لے گی۔ اس وقت لوگوں کے دلوں میں جو خوف طاری ہوگا اس سے صرف اللہ تعالیٰ واقف ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: اس دن جب ارواح جسم میں داخل ہوں گی تو ان ارواح کو ہلکی سی جھنجھناہٹ، تڑپ اور آوازیں سنائی دیں گی جن کی وجہ سے انسان خوفزدہ اور دہشت زدہ ہو جائے گا۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس کے بعد سیّدی دباغ نے اس دن کی ہولناکیوں کے بارے میں اور بھی کچھ امور کا تذکرہ کیا جن میں سے چند ایک کو آئندہ صفحات میں نقل کیا جائے گا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

یرسل علیکما شواظٌ من نارو نحاس فلا تنتصران۔ (الرحمٰن ۵۵:۳۵)

''اور جب تمہاری طرف آگ کی لپٹیں اور دھوئیں کو بھیجا جائے گا تو تم کسی سے کوئی مدد حاصل نہیں کر سکو گے۔''

میں نے سیّدی دباغ سے دریافت کیا: یہ واقعہ میدانِ محشر میں رونما ہو گا یا جہنم میں داخل ہو جانے کے بعد پیش آئے گا؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: یہ واقعہ میدان محشر میں رونما ہو گا اور یہ وہی آگ ہو گی جو اہل محشر کو گھیر لے گی۔

''سجل'' کا مفہوم

ارشاد باری تعالیٰ ہے

یوم نطوی السماء کطی السجل للکتب۔ (الانبیاء ۲۱:۱۰۴)

''جس دن ہم آسمان کو یوں لپیٹیں گے جیسے ''سجل'' نامہ اعمال کو لپیٹے گا۔''

میں نے سیّدی دباغ سے دریافت کیا: اس آیت میں ''سجل'' سے مراد کیا ہے؟ بعض مفسرین نے اس کا مطلب ''صحیفہ'' بیان کیا ہے یعنی جس طرح صحیفے کو لپیٹ دیا جاتا ہے اسی طرح آسمانوں کو لپیٹ دیا جائے گا؟ سیّدی دباغ نے ارشاد فرمایا: ''سجل''، ''رحل'' کو کہتے ہیں جس پر کوئی چیز رکھ کر پڑھی جاتی ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) غالباً سیّدی دباغ نے یہ بھی بتایا تھا کہ یہ سریانی زبان کا لفظ ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہم آسمان کو اسی طرح لپیٹ دیں گے جیسے ''رحل'' کو لپیٹ دیا جاتا ہے کیونکہ جب کوئی شخص فارغ ہو جائے تو ''رحل'' کو لپیٹ کر رکھ دیتا ہے۔ اس آیت میں لفظ ''للکتب''، لفظ ''سجل'' کیلئے (گرائمر کے نکتہ نظر سے) حال واقع ہوا ہے یعنی اس سے مراد وہی ''رحل'' ہے جس پر کتاب رکھی جاتی ہے۔ کوئی دوسری رحل مراد نہیں ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) مجھے اس وقت یہ خیال نہیں رہا کہ سیّدی دباغ سے یہ دریافت کرتا کہ آسمانوں کے لپیٹے جانے کو ''رحل'' کے لپیٹنے سے کیوں تشبیہ دی گئی ہے؟ کیا ان دونوں کے درمیان کوئی ایسی خاص مناسبت پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے صرف ''رحل'' ہی سے تشبیہ دی گئی اور یہ مناسبت کسی اور چیز کے بارے میں نہیں پائی جاتی؟ کیا کتاب کے علاوہ کسی اور چیز کی بھی ''رحل'' ہوتی ہے؟ اگر میں سیّدی دباغ سے یہ سوالات پوچھ لیتا تو بہت سے غیبی امور سے واقفیت ہو جاتی کیونکہ سیّدی دباغ صرف وہی جوابات دیتے ہیں جو آپ مشاہدہ کرتے ہیں۔ کیونکہ سیّدی دباغ کا کلام موجود نہیں ہے اس لئے اس مسئلے کی مزید وضاحت کے لئے ہم علماء کرام کی آراء یہاں نقل کر دیتے ہیں۔

امام بخاری اپنی کتاب ''الصحیح'' میں تحریر کرتے ہیں: ''سجل'' صحیفے کو کہا جاتا ہے۔ اس کی شرح میں ابن حجر لکھتے ہیں: مجاہد اور فراء کی یہی رائے ہے۔ طبری نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے یہی

تفسیر نقل کی ہے۔طبری کہتے ہیں اس کا مفہوم یہ ہے کہ صحیفے میں موجود تحریر کی وجہ سے صحیفے کو لپیٹ دیا گیا۔امام نسائی، ابوداؤد اور طبری نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہی کے حوالے سے ایک اور تفسیر نقل کی ہے۔جس کے مطابق ''سجل'' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک کاتب کا نام تھا۔اس کی تائید ابن مردویہ کی نقل کردہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول اس روایت سے ہوتی ہے۔جس کے مطابق ''حبشی زبان'' میں آدمی کو ''سجل'' کہتے ہیں۔ایک اور روایت کے مطابق ''بادشاہ'' کو بھی ''سجل'' کہا جاتا ہے۔مشہور محدث ''سہیلی'' تحریر کرتے ہیں کہ ''سجل'' دوسرے آسمان پر موجود ایک فرشتے کا نام ہے۔جس کے سامنے ہر جمعرات و سوموار کے دن لوگوں کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں۔طبری نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے حوالے سے اسی نوعیت کی ایک روایت نقل کی ہے تاہم ''سہیلی'' اور ''ثعالبی'' نے اس بات کو مسترد کر دیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب یا کاتبین وحی میں ''سجل'' نامی کوئی صاحب موجود تھے۔''سہیلی'' کہتے ہیں یہ نام صرف اس روایت میں موجود ہے جبکہ حافظ ابن مندہ اور ابونعیم نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے حوالے سے یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک کاتب کا نام ''سجل'' تھا۔ابن مردویہ نے بھی یہی روایت نقل کی ہے (یہ ساری تحقیق حافظ ابن حجر کی ہے)

حضرت موسیٰ اور دیدارِ الٰہی

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قال رب ارني انظر اليك قال لن تراني ولكن انظر الى الجبل فان استقر مكانه فسوف تراني (الاعراف ۷:۱۴۳)

''(موسیٰ نے) کہا' اے میرے پروردگار تو اپنا جلوہ مجھے دکھا کیونکہ میں تجھے دیکھنا چاہتا ہوں۔رب نے کہا، تو مجھے نہیں دیکھ سکتا البتہ تو اس پہاڑ کی طرف دیکھ اگر وہ اپنے مقام پر ٹھہرا رہا تو مجھے دیکھ لے گا۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: سیدنا موسیٰ علیہ السلام اکابر عارفین میں سے ایک تھے اور کوئی شخص بھی اس وقت تک عارف نہیں ہو سکتا جب تک وہ مشاہدے کے سمندروں میں غوطہ زن نہ ہو لہٰذا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مشاہدہ باری تعالیٰ مستقل طور پر نصیب تھا تو انہوں نے دیدار کا مطالبہ کیوں کیا؟ کیا دیدار کے ذریعے مشاہدے میں اضافہ ہو جاتا ہے؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: کوئی بھی صاحب مشاہدہ جب ذات باری تعالیٰ کے مشاہدے میں مستغرق ہوتا ہے تو یہ مشاہدہ اللہ تعالیٰ کے افعال کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔افعال کے واسطے کے بغیر محض ذات کا مشاہدہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک اللہ تعالیٰ اس شخص سے اپنا فعل منقطع نہ فرما دے اور اگر کسی بھی چیز سے ایک لمحے کے لئے اللہ تعالیٰ کا فعل منقطع ہو جائے تو وہ چیز باقی نہیں رہے گی۔کائنات میں موجود ہر ایک چیز کے اندر اللہ تعالیٰ کا فعل پایا جاتا ہے اور اسی فعل کی بدولت

کائنات کا وجود باقی ہے اور یہی فعل اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق کے درمیان حجاب کی حیثیت رکھتا ہے اگر یہ حجاب موجود نہ ہو تو کائنات فنا ہو جائے۔ اس کا بالواسطہ نتیجہ یہ نکلا کہ ہر صاحب مشاہدہ افعال باری تعالیٰ کے آئینے میں ذات باری تعالیٰ کا مشاہدہ کرتا ہے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ درخواست کی تھی کہ جو فعل میرے لئے حجاب کی حیثیت رکھتا ہے اس کو درمیان سے ہٹا لے تا کہ میں تیری ذات کا مشاہدہ کر سکوں تو اللہ تعالیٰ نے جواب دیا: اگر میں کسی حادث وجود میں سے اپنے فعل کو نکال دوں تو اس حادث کا وجود باقی نہیں رہے گا۔ مثلاً تمہارے سامنے موجود پہاڑ ظاہری طاقت کے اعتبار سے تم سے زیادہ مضبوط ہے تم اس کی طرف دیکھو! جب میں اس سے اپنے فعل کو منقطع کر دوں گا تو (قرآن کہتا ہے)

فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ

''اگر وہ اپنے مقام پر ٹھہرا رہا''

اور اللہ تعالیٰ نے اس سے اپنے اس فعل کو قطع کر دیا جو اس کی ذات کی عظمت کے لئے حجاب کی حیثیت رکھتا تھا تو وہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا اور اس کے اجزاء اڑ کر بکھرنے لگے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو گئے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس کے بعد سیّدی دباغ نے اس واقعہ کے بارے میں کچھ مزید اسرار بیان کئے۔

مٹانے اور برقرار رکھنے کا مفہوم

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ ۔ (الرعد ۱۳:۳۹)

''اللہ تعالیٰ جس چیز کو چاہے مٹا دیتا یا برقرار رکھتا ہے''

اس آیت کی تفسیر میں بھی مفسرین کے درمیان خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ میں نے سیّدی دباغ کے سامنے چند مختلف اقوال کا تذکرہ بھی کر دیا تو سیّدی دباغ نے ارشاد فرمایا: میں اس آیت کی وہ تفسیر بیان کروں گا جو کل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے (اولیاء کرام کے) سامنے بیان کی تھی۔

انسان کے ذہن میں جتنے بھی خیالات پیدا ہوتے ہیں ان کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جو عملی شکل اختیار نہیں کر پاتے۔ ''یمحو اللہ ما یشآء'' (جسے اللہ تعالیٰ چاہے، اسے مٹا دیتا ہے) سے یہی خیالات مراد ہیں اور بعض دوسرے خیالات (خواہشات) عملی طور پر پوری ہو جاتی ہے۔ یثبت (اسے اللہ تعالیٰ باقی رکھتا ہے) سے انہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے مثلاً بارش کا نازل ہونا، کسی حادثے کا پیش آ جانا وغیرہ۔ (پھر قرآن نے کہا) وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبُ (کتاب کی اصل، اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے) یہاں ''ام الکتاب'' سے مراد اللہ تعالیٰ کا ''علم قدیم'' ہے جس میں غلطی کی کوئی گنجائش یا امکان نہیں ہوتا۔ (سیّدی دباغ فرماتے ہیں:) میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی تفسیر سنی ہے۔ اس لئے تم اس تفسیر کو اختیار کر لو اور دیگر تمام اختلافی اقوال ترک کر دو۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس سے پہلے ایک مرتبہ سیّدی دباغ نے میرے سامنے اس آیت کی تفسیر کرتے

ہوئے بہت سی معرفت کی باتیں بیان کی تھیں لیکن جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ تفسیر سامنے آ گئی تو سیّدی دباغ نے اپنی بیان کردہ سابقہ تفسیر بھی ترک کر دینے کی ہدایت کی۔

کیا خاتون نبی ہو سکتی ہے؟

واذ قالت الملائكة يا مريم ان الله اصطفاك و طهرك و اصطفاك على نساء العالمين يا مريم اقنتي لربك و اسجدي واركعي مع الراكعين۔ (آل عمران ۳: ۴۲، ۴۳)

''اور جب فرشتوں نے کہا، اے مریم! اللہ تعالیٰ نے تجھے منتخب کر لیا ہے، تجھے پاک کر دیا ہے اور تجھے تمام جہانوں کی خواتین پر فضیلت عطا کی ہے اس لئے تو اپنے پروردگار کی فرمانبرداری کر اور عبادت گزاروں کی طرح رکوع و سجود میں مصروف رہ۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: کیا یہ آیت سیّدہ مریم رضی اللہ عنہا کی نبوت کی دلیل بن سکتی ہے۔ اسی طرح بعض حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ سیّدہ مریم رضی اللہ عنہا کے علاوہ بعض دیگر خواتین کو بھی مرتبہ نبوت سے سرفراز کیا گیا جن میں فرعون کی اہلیہ سیّدہ آسیہ، (حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ازواج) سیّدہ سارہ اور سیّدہ ہاجرہ، (اور سیدنا آدم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ) سیّدہ حوا رضی اللہ عنہن شامل ہیں۔ کیا یہ نظریہ درست ہے؟ بلکہ بعض علماء نے تو سیّدہ مریم رضی اللہ عنہا کی نبوت کے بارے میں اجماع نقل کیا ہے؟ (اگر یہ بات درست ہے) تو دیگر خواتین (بظاہر) نبوت کی زیادہ حقدار ہیں۔

اہل سنت کے بعض اکابر اہل علم نے خواتین کی نبوت کے بارے میں سکوت اختیار کیا ہے جن میں امام ابوالحسن اشعری سرفہرست ہیں جو حضرات ان خواتین کی نبوت کے قائل ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ فرشتے صرف انبیاء پر نازل ہوتے ہیں اور اس آیت میں یہ بات صراحت کے ساتھ مذکور ہے کہ سیّدہ مریم پر فرشتہ نازل ہوا تھا (لہٰذا سیّدہ مریم اللہ تعالیٰ کی نبیہ ہیں) گویا اس فریق کے نزدیک نبوت اور ولایت کے درمیان بنیادی فرق فرشتے کا نزول ہے جس پر فرشتہ نازل ہو جائے وہ نبی ہے لیکن ولی کو صرف الہام ہوتا ہے۔ اس پر فرشتہ نازل نہیں ہوتا۔

سیّدی دباغ نے جواب دیا: ان حضرات کا موقف درست ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ کوئی بھی عورت نبی نہیں بن سکتی۔ سیّدہ مریم رضی اللہ عنہا نبی نہیں تھیں بلکہ ایک نیک خاتون تھیں۔ ولایت اور نبوت دونوں میں نور اور ''سر'' موجود ہوتا ہے لیکن دونوں کے نور کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے اور اس فرق کو صرف کشف کے ذریعے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ نبوت کا نور اصلی، ذاتی اور حقیقی ہوتا ہے جو نبی کی پیدائش کے وقت ہی اس کی فطرت میں موجود ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی ہر حال میں معصوم ہوتا ہے لیکن ولایت کا نور اس سے مختلف ہے مثلاً اگر کوئی صاحب ''فتح'' کسی ایسے شخص کو دیکھے جو آگے چل کر ولایت کے مرتبے پر فائز ہوگا تو صاحب ''فتح'' کو وہ بالکل عام شخص کی مانند دکھائی دے گا لیکن اگر کسی صاحب فتح کو کسی نبی کی زیارت کا اس وقت موقع نصیب

جب اس نبی نے اعلان نبوت نہیں کیا تو اس وقت وہ صاحب فتح اپنے کشف کے ذریعے نور نبوت کو پہچان لے گا کیونکہ ہر نبی میں فطری طور پر ساتوں اجزائے نبوت موجود ہوتے ہیں (جن کا تذکرہ اس سے پہلے درج ذیل حدیث کی تشریح میں کیا جا چکا ہے):

ان القرآن انزل علی سبعة احرف۔ (صحیح بخاری ۲:۸۵۱)

"بے شک قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے۔"

نبی اور ولی میں فرق

لہٰذا ہر نبی فطری طور پر ہمیشہ حق بات کہے گا خواہ وہ کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو۔ بغیر کسی الجھن کے صبر و رضا پر کاربند رہے گا انتہائی مہربان ہوگا، اللہ تعالیٰ کی معرفت اسے نصیب ہوگی۔ ظاہری و باطنی ہر اعتبار سے اللہ کا خوف اس کی فطرت میں موجود ہوگا۔ وہ ہر قسم کے باطل کو سخت ناپسند کرے گا اور بے انتہا بردبار طبیعت کا مالک ہو گا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص اسے نقصان پہنچائے تو یہ پھر بھی اسے نفع پہنچانے کی کوشش کرے گا اگر کوئی شخص اس سے لاتعلق ہو جائے تو یہ اسے تھامے رکھے گا۔ یہ سات خصوصیات ہیں جو ہر نبی میں فطری طور پر شامل ہوتی ہیں۔ لیکن "فتح" کے حصول سے پہلے ولی ایک عام شخص کی مانند ہوتا ہے۔ اس میں کوئی نمایاں خصوصیت نہیں ہوتی۔ "فتح" کے حصول کے بعد اسے بہت سے انوار نصیب ہوتے ہیں گویا اس کے انوار عارضی ہوتے ہیں۔ اسی لئے فتح کے حصول سے پہلے یا بعد میں ولی معصوم نہیں ہوتا۔ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ نبی اور ولی کے درمیان بنیادی فرق صرف فرشتے کا نزول ہے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کسی ولی کو "فتح" نصیب کرتا ہے تو وہ فرشتوں کو ان کی اصل شکل میں چلتے پھرتے، بول چال کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے جن لوگوں نے ولی کے لئے فرشتے کو دیکھنے کی صلاحیت کا انکار کیا ہے یہ وہ لوگ ہیں جنہیں خود "فتح" نصیب نہیں ہوئی۔

شیخ اکبر کا بیان

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) شیخ اکبر ابن عربی اپنی تصنیف "فتوحاتِ مکیہ" کے 364 ویں باب میں تحریر کرتے ہیں:

بعض حضرات، جن میں امام غزالی بھی شامل ہیں' نے یہ اصول غلط بیان کیا ہے کہ نبی اور ولی کے درمیان بنیادی فرق صرف فرشتے کا نزول ہے حالانکہ انبیاء کی طرح اولیاء پر بھی فرشتے نازل ہوتے ہیں تاہم فرشتے کے کلام میں فرق ہوتا ہے کیونکہ فرشتہ ولی کو نبی کی تابعداری کا حکم دیتا ہے یا کسی ایسی روایت کی صحت کی اطلاع دیتا ہے جسے علماء نے ضعیف قرار دیا ہو کبھی فرشتہ ولی کو کوئی بشارت بھی دیتا ہے جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ۔ (یونس ۱۰:۶۴)

"ان کے لئے دنیا اور آخرت کی زندگی میں خوشخبری ہے"

ان حضرات کی غلطی کا سبب یہ ہے کہ یہ حضرات اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو مقام ہمیں نصیب کیا ہے باقی ہر ایک کو بھی یہی مقام عطا فرمایا ہے کیونکہ ہم پر فرشتہ نازل نہیں ہوا اس لئے کسی بھی ولی پر فرشتہ نازل ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر کوئی معتبر ولی ان حضرات کو یہ اطلاع دے دیتا کہ مجھ پر فرشتہ نازل ہوا ہے تو یہ حضرات یقینی طور پر اپنے موقف سے رجوع کر لیتے کیونکہ یہ سب اولیاء کی کرامات کو حق سمجھتے تھے اور بعض حضرات نے میرے اس قول کی طرف رجوع بھی کیا ہے حالانکہ اس سے پہلے ان کا موقف مختلف تھا۔ (یہ شیخ اکبر کے کلام کی تلخیص تھی۔)

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اگر آپ سیّدی دباغ کے بیان کو غور سے پڑھیں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ نبی اور ولی کے درمیان بنیادی فرق کی وضاحت کرتے ہوئے شیخ اکبر ابن عربی سے تسامح سرزد ہوا ہے کیونکہ ان کے بیان کے مطابق فرشتہ ولی پر امر و نہی سے متعلق احکام نازل نہیں کرتا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ فرشتہ ولی پر بھی امر و نہی کے احکام لے کر نازل ہوتا ہے اور اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ ولی صاحب شریعت بن گیا ہے جیسا کہ سیّدہ مریم رضی اللہ عنہا کے واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کیونکہ سیّدہ مریم رضی اللہ عنہا، نبی نہیں تھیں لیکن فرشتہ ان کے سامنے ایک ''امر'' لے کر حاضر ہوا تھا۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اگر ہم اس بارے میں سیّدی دباغ کے ملفوظات ظاہر کر دیں تو یہ علم تصوف کے طالبین اور محققین کے لئے ایک بیش بہا نعمت ہوں گے لیکن انہیں افشا کرنا درست نہیں ہے تاہم میں یہاں سیّدی دباغ کے کلام میں سے دو باتوں کا تذکرہ کرنا چاہوں گا۔

صاحبِ فتح ولی کے مشاہدات

پہلی بات کا تعلق ان امور کے ساتھ ہے جن کا کوئی بھی ''صاحب فتح''، ''فتح'' کے حصول کے بعد مشاہدہ کرتا ہے۔ (سیّدی دباغ کے بیان کے مطابق) فتح کے حصول کے بعد کوئی بھی صاحب مشاہدہ سب سے پہلے ان امور کا مشاہدہ کرتا ہے: بندوں کے وہ افعال جو وہ خلوت میں انجام دیتے ہیں سات زمینیں سات آسمان پانچویں زمین میں موجود آگ، زمین اور آسمان میں موجود جملہ اشیاء (سیّدی دباغ فرماتے ہیں:) پانچویں زمین میں موجود آگ، برزخ کی آگ ہے کیونکہ برزخ ساتویں آسمان سے لے کر ساتویں زمین تک پھیلا ہوا ہے۔ تمام ارواح، جسم سے جدا ہونے کے بعد، برزخ میں اپنے مخصوص مقام پر آ کر ٹھہرتی ہیں۔ بدبخت لوگوں کی ارواح، برزخ کے آگ والے حصے میں رہتی ہیں۔ یہ حصہ تنگ مقامات، کنویں، غاریں، گھونسلوں وغیرہ کی مانند ہے اور اس حصے کے رہنے والے مسلسل اوپر چڑھنے اور پھر نیچے گرنے کے عذاب میں مبتلا رہتے ہیں۔ یہ آگ، جہنم کی آگ نہیں ہے کیونکہ جہنم اور جنت، سات زمینوں اور سات آسمانوں کے دائرے سے باہر موجود ہیں۔ (اس کے بعد صاحب مشاہدہ) زمینوں کے درمیان موجود فرق، آسمانوں کے درمیان موجود فرق اور ان پر آباد جملہ مخلوقات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ شیاطین' ان کے معمولات اور افزائش نسل کا مشاہدہ کرتا ہے۔ جنات اور ان سے متعلق امور کا مشاہدہ کرتا ہے، سورج، چاند، ستاروں، ان کی حرکات، خوفناک خلائی آوازوں

جیسے بجلی کی کڑک وغیرہ کا مشاہدہ کرتا ہے۔ صاحب فتح کو چاہئے کہ اس مشاہدے کو کمال نہ سمجھے ورنہ وہ یہیں تک محدود ہو جائے گا بلکہ یہاں سے دوبارہ واپسی کا سفر شروع کر دے گا کیونکہ "فتح" کے حصول کے بعد انسان کی بصیرت اس قدر تیز ہو جاتی ہے کو وہ جس چیز کو نظر بھر کے دیکھ لے اس کے تمام اسرار سے واقف ہو جاتی ہے۔ مذکورہ بالا جملہ اشیاء ظلمت کی حیثیت رکھتے ہیں اگر کوئی شخص ان پر اکتفا کر لے تو گویا اس نے تاریکیوں میں قیام کو پسند کر کے خود کو اللہ تعالیٰ سے لاتعلق کر لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ زیادہ محفوظ ہوتے ہیں جنہیں "فتح" نصیب نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کی حفاظت شامل حال نہ ہو تو صاحب "فتح" کے بھٹکنے کا امکان زیادہ ہوتا ہے کیونکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ فطری طور پر ایک عام انسان مال وزر اور عورتیں تو بہت دور کی بات ہے، بادام، مٹے اور چنے کے دانے پر ہی فریفتہ ہو جاتا ہے تو اگر کوئی صاحب فتح ان عجائبات کے مشاہدے کے دوران پھسل جائے تو یہ حیران کن بات نہیں ہوگی کیونکہ شیاطین ہر وقت اسے بہکانے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال نہ ہو تو کوئی بھی انسان بھٹکنے سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ جو صاحب فتح اسی مقام پر ٹھہر جائے شیاطین اسے بہکا کر جادوگر یا کاہن بنا دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے البتہ جس شخص پر اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ہو وہ ان عجائبات کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ جاتا ہے۔

مشاہدے کا دوسرا مقام

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: اس کے بعد دوسرے مقام پر صاحب فتح کو درج ذیل امور کا مشاہدہ نصیب ہوتا ہے: پہلے مشاہدے میں ظلمانی اور فانی امور کا مشاہدہ کروایا گیا تھا جبکہ دوسرے مشاہدے میں "انوار باقی" کا مشاہدہ کروایا جاتا ہے جس میں عام فرشتے، محافظ فرشتے، دیوان الصالحین کے اراکین وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقام پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام، پھر حضرت ادریس علیہ السلام پھر حضرت یوسف علیہ السلام اور پھر تین دیگر رسولوں، کے مقامات کا مشاہدہ نصیب ہوتا ہے۔ ان تین رسولوں کے اسماء غیر معروف ہیں۔ ان میں سے بعض حضرت ادریس علیہ السلام سے پہلے تشریف لائے اور بعض بعد میں۔ اگر میں یہ تشریح بیان کرنا شروع کروں کہ ان میں ہر ایک نبی کے مقام کی خصوصیت کیا ہے یا فرشتے کی اصل شکل کیسی ہوتی ہے تو آپ کو ایسی باتیں سننے کو ملیں گی جو آپ کے وہم و گمان سے بھی ماورا ہوں گی لیکن صاحب مشاہدہ کو اسی مقام پر نہیں ٹھہر جانا چاہئے کیونکہ وہ جس مقام پر بھی ٹھہرے گا وہاں کے تمام اسرار اپنے اندر جذب کر لے گا مثلاً اگر وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مخصوص مقام پر آ کر ٹھہر جاتا ہے تو وہ فوراً عیسائیت کو اختیار کر لے گا اور مسلمانوں کے گروہ سے خارج ہو جائے گا۔ اس لئے صاحب فتح ہر مقام پر خطرات سے دوچار رہتا ہے لیکن پھر جب اسے "مقام محمدی" کا مشاہدہ نصیب ہو جائے تو اب کوئی خطرہ باقی نہیں رہے۔ کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک خاص قوت عطا کی گئی ہے جو ساری مخلوق میں صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی عطا کی گئی ہے جس کی بدولت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی بھی شخص کو پکڑ کر بارگاہِ رب العزت تک پہنچا دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم

اللہ تعالیٰ کے نزدیک معزز اور فضیلت کے مالک ہیں۔کوئی بھی صاحب فتح جب ''مقام محمدی'' تک پہنچ جاتا ہے تو اب گویا وہ بارگاہِ رب العزت تک رسائی حاصل کر چکا ہے اور اب یہ امکان باقی نہیں رہا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے لاتعلق ہوسکتا ہے۔ یہاں کچھ مزید اسرار بھی ہیں جن سے ''صاحبانِ فتح'' بخوبی واقف ہیں۔اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے گروہ میں شامل کرے اور ہمیں ان کی برکتیں نصیب کرے۔اس کے بعد صاحب فتح کو ساری کائنات میں موجود تقدیر کے اسرار کا مشاہدہ نصیب ہوتا ہے۔اگلے مقام پر اس نور کا مشاہدہ نصیب ہوتا ہے جو فعل الٰہی میں اس طرح گھل مل گیا ہے جیسے زہر پانی میں حل ہو جاتا ہے۔فعل کی مثال زہر کی مانند ہے اور نور کی مثال پانی کی مانند ہے۔اس مقام پر پہنچ کر بہت سے افراد اس غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ شاید یہ نور ہی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بہت بلند و برتر ہے پھر جب صاحب فتح اگلے مقام پر فائز ہوتا ہے تو اس وقت اس نور اور اللہ تعالیٰ کے فعل کا الگ الگ مشاہدہ نصیب ہوتا ہے اور اسے پتہ چلتا ہے کہ میری سابقہ رائے درست نہیں تھی۔ (سیّدی دباغ فرماتے ہیں:) میں نے تمام مقامات کے اسماء ان کے معانی اور ہر مقام سے متعلق دیگر تفصیلات اس لئے بیان نہیں کی ہیں کیونکہ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ جس شخص کو فتح نصیب ہوتی ہے اسے خبردار کیا جا سکے اور یہ مقصد مذکورہ بالا بیان کے ذریعے ہی پورا ہو جاتا ہے۔تاہم اس سے متعلق دیگر تفصیلات سے کسی بھی صاحب مشاہدہ کو بالمشافہ طور پر آگاہ کیا جا سکتا ہے۔

نبی اور فرشتے میں فرق

نبی اور ولی کے درمیان بنیادی فرق کی وضاحت ہو چکی ہے اب ہم نبی اور فرشتے کے درمیان بنیادی فرق کی وضاحت کریں گے۔ ہر فرشتے کا وجود نورانی ہوتا ہے جس میں عقل اور حواس موجود ہوتے ہیں (سیّدی دباغ فرماتے ہیں:) ہر فرشتے کے پانچ سر ہوتے ہیں اور ہر ایک سر میں 63 منہ ہوتے ہیں۔گویا پانچوں سروں میں 315 منہ ہوتے ہیں۔ ہر منہ میں تین زبانیں ہوتی ہیں۔کسی فرشتے کے منہ میں پانچ یا سات زبانیں بھی ہوتی ہیں لیکن اگر ہم کم از کم مقدار یعنی تین ہی کو سامنے رکھیں تو ہر فرشتے کے منہ میں کم از کم 945 زبانیں ہوتی ہیں۔ پانچ زبانوں والے فرشتے کی 1575 زبانیں ہوتی ہیں اور سات زبانوں والے فرشتے کی 2205 زبانیں ہوتی ہیں۔ جب کوئی فرشتہ کوئی بات کہتا ہے تو ان تمام زبانوں سے بیک وقت آواز نکلتی ہے۔اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے جس نے انہیں پیدا کیا ہے اگر اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال نہ ہو تو کوئی بھی صاحب فتح صرف فرشتے کی آواز سن کر ہی انتقال کر جائے اگر اسے فرشتے کی اصل صورت دیکھنے کا موقع ملے تو پھر اس کی کیفیت کیا ہوگی اس کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں۔

فرشتے کا وجود نور پر مشتمل ہوتا ہے جس میں عقل اور حواس موجود ہوتے ہیں۔گویا یہ بھی روح کی مانند ہوتا ہے کیونکہ روح بھی نور سے پیدا ہوتی ہے اور اس کے اندر وہ تمام اجزاء موجود ہوتے ہیں جن کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں اور ہم اس بات کی بھی پہلے وضاحت کر چکے ہیں کہ روح کے تمام علوم اس کی فطرت میں موجود ہوتے

ہیں۔اسی طرح ہر فرشتے کو پیدائش کے ساتھ ہی ''فتح'' نصیب ہو جاتی ہے لیکن نبی کے بشری وجود کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے جس میں روح اپنے جملہ اسرار سمیت پوشیدہ ہوتی ہے۔اپنی اصل فطرت کے اعتبار سے بشری وجود محجوب ہوتا ہے لیکن کیونکہ نبی کے بشری وجود میں اس کی تخلیق کے وقت ہی نور نبوت ڈال دیا جاتا ہے اس لئے بشری تقاضوں سے متعلق حجاب کمزور ہو جاتا ہے اور وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر رہتا ہے۔ نبی کا ہر قول ہر عمل حق کا تابع ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ بالفرض اگر کوئی نبی کسی ایسی قوم میں پیدا ہو جو سراسر گمراہی میں ڈوبی ہوئی ہو اور اس نبی پر کوئی شریعت یا وحی نازل نہ ہو پھر بھی وہ نبی اس قوم کے عقائد و نظریات کی مخالفت کرے گا۔ اپنی اصل فطرت کے اعتبار سے ''فتح'' کے حصول سے پہلے نبی کی یہ کیفیت ہوتی ہے لیکن جب اسے فتح نصیب ہو جائے اور بشری حجاب مکمل طور پر زائل ہو جائے اور وہ پوری طرح بارگاہ رب العزت میں حاضر ہو جائے تو اس وقت نبی کی معرفت کے سمندر کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا اور یہ کیفیت کسی بھی فرشتے یا کسی اور مخلوق کو نصیب نہیں ہو سکتی۔

آیت کریمہ کی تفسیر

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ (الانبیاء۲۱:۸۷)

''اور جب ذوالنون (یونس اپنی قوم سے) ناراض ہو کر چل دیا اور اس نے یہ گمان کیا کہ ہم اسے تنگی کا شکار نہیں کریں گے۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: حضرت یونس علیہ السلام کس طرح اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ گمان رکھ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان پر قادر نہیں ہو سکتا یا وہ اللہ تعالیٰ کی گرفت سے باہر آ سکتے ہیں کیونکہ یہ عقیدہ تو ضعیف ترین عقیدے کے مالک مسلمان کا بھی نہیں ہو سکتا۔ چہ جائیکہ ایک جلیل القدر نبی یہ سوچ رکھتا ہو؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: اس آیت میں حضرت یونس علیہ السلام کی جس ناراضگی کا ذکر ہے اس کا تعلق کفار کے ساتھ ہے کیونکہ ان کفار نے حضرت یونس علیہ السلام کی دعوت کو مسترد کرتے ہوئے ایمان اور ہدایت کا راستہ اختیار نہیں کیا۔ یہاں تک کہ عذاب کے آثار بالکل واضح طور پر دکھائی دینے لگے۔ اللہ تعالیٰ کا عذاب ان کفار کے سروں پر پہنچ چکا تھا جب حضرت یونس علیہ السلام نے عذاب کے نمایاں آثار دیکھے تو اپنی قوم سے ناراض ہو کر وہاں سے چل دیئے۔ قرآن کا یہ کہنا کہ

فظن ان لن نقدر علیه

''اور اس نے یہ گمان کیا کہ ہم اسے تنگی کا شکار نہیں کریں گے''

اس کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام نے یہ گمان کیا تھا کہ شاید قوم سے الگ ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ انہیں کسی آزمائش کا شکار نہیں کرے گا۔ یہی سوچ کر آپ اس آفت زدہ علاقے سے دور ہو گئے۔ ان کی

مثال بالکل اسی شخص کی مانند تھی جو کسی بھڑکتی ہوئی آگ یا سیلاب کے ریلے کو اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھے اور یہ بھی دیکھے کہ اس کے راستے میں آنے والی ہر چیز تہس نہس ہو رہی ہے اور پھر وہ یہ سوچ کر بھاگ کھڑا ہوا کہ اگر میں فلاں مقام تک پہنچ گیا تو اس آفت سے محفوظ رہوں گا۔ حضرت یونس علیہ السلام نے بھی یہی خیال کیا تھا اگر وہ اپنی قوم کے ساتھ ٹھہرے رہے تو خود بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہو جائیں گے اور اگر اپنی بستی سے دور چلے گئے تو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ یہی سوچ کر وہ اپنی بستی کو چھوڑ کر چلے گئے لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک اور حوالے سے اپنی قدرت کی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ جب انہوں نے ان نشانیوں کو دیکھا تو (قرآن کہتا ہے)

نَادٰی فِی الظُّلُمَاتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ (الانبیاء۲۱:۸۷)

''تو اس نے تاریکیوں میں اپنے پروردگار کو پکارا کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے بے شک میں ہی ظالموں میں سے ہوں۔''

پس اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور انہیں نجات عطا کی۔ اس کے بعد یہ واقعہ نصیحت حاصل کرنے والوں کے لئے ایک نشانی اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والوں کے لئے مشعل راہ بن گیا۔ پریشانیوں کے شکار لوگ اس سے تسلی حاصل کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دست سوال دراز کرنے والے اس سے سبق حاصل کرتے ہیں۔ (قرآن کہتا ہے)

وَ نَجَّیْنَاهُ مِنَ الْغَمِّ وَ كَذٰلِكَ نُنْجِی الْمُؤْمِنِیْنَ (الانبیاء۲۱:۸۸)

''تو ہم نے اسے غم سے نجات عطا کی بے شک ہم اسی طرح اہل ایمان کو نجات عطا کرتے ہیں۔''

لٰہذا حضرت یونس علیہ السلام کے بستی چھوڑنے کا بنیادی مقصد صرف عذاب سے بچنا تھا۔ ان کا ہرگز یہ گمان نہیں تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کو عاجز کر دیں گے یا اللہ تعالیٰ ان پر گرفت نہیں کر سکے گا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) یہ اس آیت کی سب سے بہترین تفسیر ہے جو شخص مفسرین کی مختلف تاویلات کو سامنے رکھے گا اسے اس تفسیر کی اہمیت کا اندازہ بخوبی ہو جائے گا۔

حضرت ایوب کی تکلیف

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَیُّوْبَ اِذْ نَادٰی رَبَّهٗ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ (الانبیاء۲۱:۸۳)

''جب ایوب نے اپنے پروردگار سے دعا کی، مجھے پریشانی لاحق ہو گئی ہے بے شک تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے سیّدی دباغ سے دریافت کیا: اس آیت میں حضرت ایوب علیہ السلام کو پہنچنے والی جس تکلیف کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد کیا ہے؟ مفسرین نے حضرت ایوب علیہ السلام کو لاحق ہونے والی بیماری اور اس کی مدت کے بارے میں جو اقوال نقل کئے ہیں کیا وہ درست ہیں؟ اس کے بعد میں نے

حافظ ابن حجر کی تصنیف "فتح الباری" میں سے چند روایات بھی ذکر کر دیں۔ قارئین ان کے مطالعے کے لئے "فتح الباری" کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا: حضرت ایوب علیہ السلام کو جو تکلیف لاحق ہوئی تھی وہ غیر اللہ کی طرف توجہ کا مبذول ہو جانا ہے اور انبیاء کرام کے نزدیک یہ ایک بہت بڑی تکلیف ہے اور اسی تکلیف کے بارے میں حضرت ایوب علیہ السلام نے بارگاہِ رب العزت میں یہ دعا کی تھی کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس سے نجات عطا فرمائے۔ اس تکلیف کا تعلق کسی جسمانی بیماری کے ساتھ نہیں تھا کیونکہ جسمانی تکلیف انسان کو اللہ تعالیٰ سے لاتعلق کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ سے مزید قریب کر دیتی ہے اور جو چیز انسان کو اللہ تعالیٰ سے لاتعلق کر دیتی ہے وہ غیر اللہ کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ اگرچہ وہ ایک لمحے کے لئے ہی کیوں نہ ہو۔ مفسرین نے جس بیماری کا تذکرہ کیا ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ آپ کو ایک اور بیماری میں مبتلا کیا گیا تھا جس کی مدت دو ماہ اور چند دن تھی۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) سیّدی دباغ نے مجھے اس بیماری کے بارے میں بتایا تھا لیکن میں بھول گیا ہوں۔

زیست کی تنگی کا سبب

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَعْمٰى

"اور جو ہمارے ذکر سے روگردانی کرے گا اس کی زندگی تنگی کا شکار ہو جائے گی اور وہ قیامت کے دن اندھا ہو کر اٹھایا جائے گا۔" (طٰہٰ ۲۰:۱۲۴)

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا اس آیت میں زندگی کو تنگ کر دینے کا مفہوم کیا ہے؟ اگر اس سے مراد ظاہری تنگدستی ہو تو ہم یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ بہت سے کفار اچھے خاصے مالدار ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی زندگی تنگ نہیں بلکہ فراخ ہوتی ہے جبکہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اعراض کرے گا اس کی زندگی تنگ ہو جائے گی؟ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا: آخرت میں انسان کی جو حالت ہوگی اس کا کچھ اثر ذہنی طور پر دنیا میں ہی نصیب ہو جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے بارے میں یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ اس لئے ہر کافر، ہر لمحے اور ہر گھڑی میں ہمیشہ پریشان رہتا ہے۔ اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہوتے رہتے ہیں جن میں ایک وسوسہ یہ بھی ہوتا ہے کہ شاید میں جس دین پر کاربند ہوں وہ حق نہ ہو اور انہی وسوسوں اور پریشانیوں کے باعث کفار ہمیشہ پریشان رہتے ہیں۔ خواہ وہ ظاہری طور پر کتنے ہی صاحب ثروت وحکومت کیوں نہ ہو۔ لہٰذا یہاں تنگی سے مراد ان کی فکری تنگی ہے۔ مالی تنگدستی نہیں۔ جو شخص ظاہری طور پر خوشحال ہو اور پھر اسے یہ بھی پتہ چل جائے کہ آخر کار وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا شکار ہوگا تو اس شخص کے لئے زندگی تنگ ہو جاتی ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) سیّدی دباغ نے بہت عمدہ تفسیر

بیان کی ہے۔ اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام بیضاوی لکھتے ہیں: کافر کی پوری توجہ دنیا کی طرف مبذول ہوتی ہے۔ اسے ہر وقت یہی فکر ستاتی ہے کہ میں دنیا کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرلوں اور وہ ہر وقت اسی اندیشے کا شکار رہتا ہے کہ کہیں دنیا مجھ سے کھو نہ جائے۔ اس کے برعکس آخرت کے طلب گار بندہ مومن کو اس قسم کی پریشانیوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

کفار کا فکری انتشار

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) ایک مرتبہ ایک فقیہہ نے مجھے بتایا: مجھے کئی برس تک کفار کے ہاں قید رہنے کا اتفاق ہوا۔ اس تمام عرصے کے دوران میں کفار کے ساتھ بحث وتمحیص کرتا رہا اور یہ بات میرے سامنے واضح ہوئی کہ اکثر کفار اپنے مذہب کے بارے میں شک وشبہ کا شکار ہیں اور ان کی مثال ایک ایسے شخص کی مانند ہے جو خارش کا مریض ہو اور کسی خارش کرنے والے کی تلاش میں ہو جیسے ہی ان کفار کو کسی مسلمان کے بارے میں پتہ چلتا ہے تو یہ فوراً اس کے پاس پہنچ جاتے ہیں اور تھوڑی سی بحث کے بعد قائل ہو جاتے ہیں۔ یہ عام کفار کی حالت ہے۔ ان کے مذہبی پیشواؤں اور پادریوں سے بھی گفتگو کرنے کا مجھے موقع ملا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان میں سے ہر ایک کو اپنی گمراہی کا پورا یقین ہے۔

ایک مرتبہ مجھے کفار کے ایک بہت بڑے مذہبی پیشوا کے بارے میں پتہ چلا جو تورات، انجیل، زبور اور قرآن مجید کا حافظ تھا۔ اسے بہت سی احادیث زبانی یاد تھیں۔ (زمانہ جاہلیت کے مشہور عرب شاعر) امراؤ القیس الکندی کے کچھ اشعار بھی اسے یاد تھے۔ میں نے اس سے کہا، میں تم سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ اس سوال نے مجھے بہت پریشان کر رکھا ہے۔ اس نے دریافت کیا: کیا سوال ہے؟ میں نے کہا، جب میں مسلمان مملکت میں رہتا تھا تو وہاں مجھے ہر ایک یہی بتاتا تھا کہ دین اسلام حق اور عیسائیت باطل ہے اب جبکہ میں ایک عیسائی مملکت میں آ گیا ہوں یہاں کے لوگ عیسائیت کو حق اور اسلام کو باطل قرار دیتے ہیں۔ میں اس بارے میں بڑی الجھن کا شکار ہوں کہ دونوں میں سے کون سا مذہب حق ہے؟ میں نے عیسائیت کے بڑے بڑے ماہرین سے دریافت کیا تو سب کی متفقہ رائے ہے کہ آپ عیسائیت کے سب سے بڑے عالم اور مذہبی پیشوا ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر جاہل پر یہ بات فرض کی ہے کہ وہ عالم سے صحیح جواب حاصل کرلے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے بتائیں کہ دونوں مذاہب میں سے کون سا مذہب حق ہے؟ تاکہ میں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے آپ کے جواب کو دلیل کے طور پر پیش کرسکوں کیونکہ میں جاہل ہوں اور آپ عالم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر جاہل پر یہ بات فرض کی ہے کہ وہ عالم سے مسئلہ دریافت کرے اور ہر عالم کا یہ فرض ہے کہ وہ سائل کو صحیح جواب دے؟ یہ سوال اس سے بڑے موقع پر کیا گیا تھا۔ اس نے اپنا سر تھام لیا اور کافی دیر خاموش رہنے کے بعد میرے کان میں آہستہ سے کہا، صرف دین اسلام حق ہے اور اس کے سوا کوئی بھی دوسرا دین اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول نہیں ہو گا۔ اب تم فوراً میرے پاس سے اٹھ جاؤ، اس سے پہلے کہ دوسرے لوگوں کو میرے اس جواب کے بارے میں

پتہ چلے۔اس وقت اس عیسائی عالم کے پاس اور بھی بہت سے عیسائی موجود تھے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس کے بعد اس فقیہہ نے علماء عیسائیت کے ساتھ ہونے والے بہت سے مناظروں کا تذکرہ کیا لیکن میرا مقصد صرف شیخ کے بیان کی وضاحت کرنا تھا۔ جو شخص بھی کسی یہودی یا نصرانی کے ساتھ بحث کرے گا وہ با آسانی یہ نتیجہ اخذ کر لے گا۔ خود مجھے (احمد بن مبارک کو) علماء یہود کے ساتھ مناظرہ کرنے کا اتفاق ہوا اور میں بھی آخر کار اس نتیجے پر پہنچا کہ انہیں اپنے غلط ہونے کا پورا یقین ہے اور وہ صرف دنیاوی فوائد کے حصول اور اپنے بغض وعناد کی وجہ سے اسلام کی حقانیت کے قائل نہیں ہوتے۔ یہ ایک طویل مناظرہ تھا جس میں مسلمانوں کی طرف سے بہت سے علماء اور یہودیوں کی طرف سے چند یہودی بھی موجود تھے۔ اسی طرح مجھے عیسائی علماء سے بھی بحث وتمحیص کا اتفاق ہوا۔ ان کی بھی یہی کیفیت تھی اگر کوئی شخص عیسائیوں کے ساتھ مناظروں کی تفصیلات سے آگاہ ہونا چاہے تو اسے شیخ عبداللہ میورتی کی تصنیف،"تحفۃ الادیب فی الرد علی اہل الصلیب" کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ شیخ عبداللہ میورتی پہلے ایک عیسائی عالم تھے۔ بعد میں آپ کو اسلام قبول کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ اسی طرح شیخ عبدالحق الاسلامی کی تصنیفات بھی نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ شیخ عبدالحق پہلے ایک یہودی عالم تھے پھر آپ کو بھی اسلام قبول کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ ان کے علاوہ شیخ ابوالعباس القرطبی کی تصنیف بھی ہے جس میں عیسائیوں کی تردید میں بہت سی حیران کن معلومات درج ہیں اور یہ تصنیف 20 جلدوں پر مشتمل ہے۔ اگر کوئی شخص ان تینوں کتابوں کا مطالعہ کر لے اور پھر اسے عیسائیوں اور یہودیوں سے گفتگو کا موقع ملے تو وہ یہ بات بخوبی جان لے گا کہ اکثر عیسائی اور یہودی اپنے مذہب کے بارے میں مشکوک عقیدہ رکھتے ہیں۔ بلکہ بعض کو تو یہ یقین ہے کہ ان کا مذہب گمراہی ہے۔

عصمتِ انبیاء

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَنْ رَّاٰى بُرْهَانَ رَبِّهٖ۔ (یوسف ۱۲:۲۴)

"اور شاید وہ بھی اس (زلیخا) کا قصد کر لیتے گر انہوں نے اپنے رب کی روشن دلیل کو نہ دیکھا ہوتا۔"

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: حضرت یوسف علیہ السلام نے کس بات کا ارادہ کیا تھا؟ آپ نے فرمایا: زلیخا کی پٹائی کرنے کا، میں نے آپ کے سامنے مفسرین کے مختلف اقوال نقل کئے تو آپ نے ان سب کو سختی سے مسترد کر دیا اور فرمایا: اگر (مفسرین کے بیان کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام نے، کسی گناہ کا ارادہ) کیا ہوتا تو پھر عصمت کہاں جائے گی؟ جب اللہ تعالیٰ کسی ولی کو "فتح" عطا کرتا ہے تو اس کی رگوں میں سے ظلمت کی 72 رگیں نکال دیتا ہے جن کا تعلق، جھوٹ، خود پسندی، ریاکاری، دنیا کی محبت، شہوت، زنا کو پسندی سے ہوتا ہے۔ اگر ولی ان ساری خرابیوں سے محفوظ رہتا ہے تو نبی تو فطری طور پر معصوم ہوتا ہے۔ (وہ کسی گناہ کے ارتکاب کے بارے میں کیسے سوچ سکتا ہے؟) سیّدی دباغ فرماتے ہیں: ولی کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے

کہ عورت کی شرمگاہ اس کے نزدیک ایک عام پتھر کی مانند بے حیثیت چیز ہوتی ہے اور ایسا ہونا بھی چاہئے کیونکہ صاحب فتح کو عورت کے رحم کے اندر ہونے والی تبدیلیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صاحب فتح ولی اللہ تعالیٰ کے نور کی مدد سے دیکھتا ہے اور اس نور پر شیطان حملہ نہیں کر سکتا اور نہ ہی کوئی تاریکی اس پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ اگر ولی کی یہ کیفیت ہے تو نبی کے مرتبہ و مقام کا اندازہ آپ بخوبی کر سکتے ہیں کیونکہ نبی تو معصوم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں مقام نبوت کا مرتبہ سمجھنے اور اس کا احترام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا۔ (النساء ۴:۱۶۴)

''اور اللہ نے موسیٰ کے ساتھ کلام کیا۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمکلامی کا شرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ خاص ہے؟ بعض اکابر صوفیاء نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ مکالمے کا ذکر کیا ہے، جیسے ابوالحسن الشاذلی ''حزب کبیر'' میں تحریر کرتے ہیں:

هب لنا مشاهدة تصحبها مكالمة

''اے اللہ! ہمیں ایسا مشاہدہ نصیب فرما جس کے ہمراہ مکالمہ بھی ہو۔''

سیّدی دباغ نے جواب دیا: اللہ تعالیٰ کے ساتھ مکالمے کے بارے میں صوفیاء کا بیان بالکل درست ہے اور اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں اور مذکورہ بالا آیت کو اس کے خلاف دلیل نہیں بنایا جا سکتا کیونکہ آیت میں کوئی حصر نہیں ہے۔ (سیّدی دباغ فرماتے ہیں:) اللہ تعالیٰ کا کلام حق ہے اور صاحب فتح بزرگ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق اس کو سنتا بھی ہے اور یہ سننا عام عادت سے مختلف ہوتا ہے کیونکہ اس کلام میں کوئی حرف یا آواز نہیں ہوتی کیونکہ اس کلام کو کسی ایک مخصوص جہت سے نہیں سنا جاتا بلکہ یہ ہر طرف سے سنائی دیتا ہے اور انسان کے جسم کا ہر حصہ اور عضو اس کلام کو سنتا ہے گویا اس کلام کو سنتے وقت پورا جسم، سراپا گوش بن جاتا ہے تاہم اہل فتح کے مراتب کے اختلاف کے مطابق سماعت کی کیفیت مختلف ہوتی ہے جسے یہاں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

اطلاق وتقیید

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ

''جب تم سفر پر نکلو تو نمازِ قصر ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' (النساء ۴:۱۰۱)

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس آیت میں خوف کی قید کیوں لگائی گئی ہے حالانکہ امن کی حالت میں بھی سفر کے دوران نماز کو قصر کیا جاتا ہے؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: اس آیت میں خوف کی قید اس لئے نہیں لگائی گئی ہے کہ اس کے ذریعہ مفہوم مخالف کو خارج کیا جا سکے بلکہ اس مسئلے کی وضاحت کی گئی ہے کہ بطور خاص خوف

کی حالت میں قصر نماز کی ادائیگی میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جب جہاد کے لئے روانہ ہوتے تھے تو اس خیال کے تحت عبادت میں اضافہ کر دیتے تھے کہ شاید دنیا سے رخصت کا وقت قریب آ چکا ہے۔ یہاں تک کہ بعض حضرات کا طریقہ کار یہ تھا کہ سارا دن جہاد میں مشغول رہتے تھے اور ساری رات عبادت و ریاضت میں بسر کر دیا کرتے تھے۔ اس عالم میں عبادت میں کوتاہی ان کے نزدیک سخت گناہ تھی کیونکہ یہ آخرت کی تیاری کے منافی حرکت ہوتی۔ اسی لئے وہ خاص جنگ کے مواقع پر کثرت سے عبادت کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اسی چیز سے باز رکھنے کے لئے یہ آیت نازل کی کہ اگر اس دوران تم فرائض میں بھی قصر کر دیتے ہو تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

سائمہ بکریاں کون سی ہیں؟

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے سیّدی دباغ سے درج ذیل حدیث کا مفہوم دریافت کیا:

في الغنم السائمة الزكاة. (السنن الکبریٰ للبیہقی ۴: ۹۹)

''سائمہ بکریوں پر بھی زکوٰۃ لازم ہوتی ہے۔''

سیّدی دباغ نے جواب دیا: اس سے مراد یہ ہے کہ وہ بیمار بکریاں جو چرنے کی صلاحیت نہ رکھتی ہوں ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی کیونکہ جب بکری کی یہ حالت ہو جائے تو اس پر سے زکوٰۃ ساقط ہو جاتی ہے کیونکہ زکوٰۃ اس وقت ہوتی ہے جب کسی شے کی ملکیت کا فائدہ بھی ہو اور جب بکری کی یہ حالت ہو جائے گی تو وہ مالک کے لئے بے فائدہ ہو جاتی ہے کیونکہ اب اس بات کا اندیشہ موجود ہے کہ شاید اس بکری کا آخری وقت قریب آ چکا ہو۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان مبارک سے یہی بکری مراد ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: امام شافعی کے نزدیک ''سائمہ'' سے مراد وہ بکری ہے جسے چارہ ڈالا جاتا ہو۔ (اور وہ کھلے میدانوں میں چرنے کے لئے نہ جاتی ہو) سیّدی دباغ نے فرمایا ایسی بکریاں حدیث کے حکم میں داخل ہوں گی کیونکہ فطری طور پر انہیں ''سائمہ'' ہی کہا جائے گا کیونکہ اگر انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ چرنے کے لئے کھلے میدان کا رخ کریں گی البتہ یہاں پر مالک نے ان کے چارے کو اپنے ذمے لے لیا ہے۔ اس لئے ملکیت کی نعمت ساقط ہو جائے گی۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس کے بعد میں نے ائمہ مجتہدین کی تعبیرات بیان کیں کیونکہ بعض آئمہ مطلقاً اس کا اعتبار کرتے ہیں اور بعض نے مطلقاً اسے لغو قرار دیا ہے جیسا کہ اصول فقہ کی کتابوں میں اس کی تفصیل درج ہے۔ سیّدی دباغ نے جواب دیا: کسی بھی حکم کے اصل مفہوم سے صرف وہی شخص آگاہ ہو سکتا ہے جسے حکم کے اسباب و اغراض کا علم ہو کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی خاص سبب کی بدولت کوئی حکم صادر کیا ہوگا اور اس سبب سے وہی شخص آگاہ ہو سکتا ہے جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے باطن کی معرفت نصیب ہو۔ اس کی مثال ہم یوں دے سکتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کچھ قیود کے ہمراہ ایک حکم صادر کر کے کہیں چلا جاتا ہے تو ان قیود کے

بارے میں یقینی علم اسی وقت حاصل ہو سکے گا جب قائل کی مرضی پتہ چل سکے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب قائل سے بالمشافہ طور پر اس کی مرضی کے بارے میں دریافت کیا جا سکے اگر وہ قائل زندہ ہوگا تو اپنے ارادے کی وضاحت کر دے گا لیکن اگر وہ انتقال کر چکا ہو تو پھر حکم کے اصل سبب سے واقفیت حاصل کرنا مشکل ہوگا۔

لہٰذا جن ائمہ نے حدیث کے مطلق مفہوم کو پیش نظر رکھا ہے یا جنہوں نے مطلق طور پر شرط کو لغو قرار دیا ہے ان دونوں کا نکتہ نظر درست نہیں ہے کیونکہ بعض اوقات کسی قید کے اضافے کا مقصد حکم کی موافقت کرنا اور بعض اوقات مخالفت کرنا ہوتا ہے۔

سیّدی دباغ اور علم اصولِ فقہ

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) قصہ مختصر یہ کہ شرعی قیود کی حقیقت سے صرف کوئی صاحب کشف ولی ہی آگاہ ہو سکتا ہے جیسے ہمارے شیخ سیّدی عبدالعزیز دباغ ہیں۔ میں نے خود سیّدی دباغ سے علم اصول فقہ کے بہت سے معرکہ آراء مسائل کا حل معلوم کیا ہے۔ جس میں امام الحرمین کی ''البرہان'' امام غزالی کی ''المستصفی'' امام ابوالولید الباجی کی ''الفصول'' امام ابیاری کی ''شرح برہان'' امام علی بن اسماعیل کی ''شرح برہان'' امام ابوعبداللہ العبدری کی ''شرح مستصفی'' امام تاج الدین سبکی کی ''جمع الجوامع'' اور پھر اس کی شروح وحواشی وغیرہ میں درج دیگر مسائل شامل ہیں۔ ان مسائل کے بارے میں' میں ایک طویل عرصے تک سیّدی دباغ سے اخذ واستفادہ کرتا رہا اور آپ کے جوابات سن کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے آپ مرتبہ اجتہاد پر فائز ہیں اور ایسا ہونا بھی چاہئے کیونکہ آپ کو مستقل طور پر مشاہدہ نبوی کی نعمت حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں آپ کی محبت اور عقیدت عطا فرمائے اور قیامت کے دن ہمارا حشر آپ کے مریدین ومخلصین کے ساتھ فرمائے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعے کی وضاحت

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ (الانعام ۶:۷۶)

''پھر جب ان پر رات نے اندھیرا کر دیا تو انہوں نے (ایک) ستارہ دیکھا (تو) کہا (کیا تمہارے خیال میں) یہ میرا ربّ ہے؟''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام اس بات کے ذریعے اپنے نفس کو دلیل دینا چاہتے تھے تاکہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں غور وفکر کے نتیجے میں وہ بارگاہ رب العزت تک رسائی حاصل کر سکیں؟ یا پھر وہ اپنی قوم کو ساکت اور لاجواب کرنا چاہتے تھے؟ یعنی آپ نے پہلے ان کے دعوے کو مفروضہ شکل میں پیش کیا اور پھر اس کی تردید کی؟ مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں بہت اختلاف کیا ہے؟

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا: سیدنا ابراہیم علیہ السلام اپنے آپ کو یہ دلیل دینا چاہتے تھے لیکن ان کا یہ

استدلال دوسرے لوگوں سے مختلف تھا کیونکہ انبیاء کرام کا استدلال عام لوگوں کی مانند نہیں ہوتا کیونکہ انہیں معرفت الٰہیہ کا انتہائی درجہ نصیب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا خوف انتہائی صورت میں ان کے اندر پایا جاتا ہے اور فطری طور پر یہ حضرات حق کی معرفت رکھتے ہیں اور اس کی طرف مائل رہتے ہیں۔ اس عمل کے ذریعے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی خواہش صرف یہ تھی کہ جس حقیقت کا انہوں نے روحانی بصیرت کے ذریعے مشاہدہ کیا ہے اسے ظاہری بصارت کے ذریعے بھی دیکھ لیں۔ روحانی بصیرت کے اعتبار سے انہیں اللہ تعالیٰ کی مکمل معرفت حاصل تھی اور ان کی یہ خواہش تھی کہ یہ بصیرت، بصارت پر بھی اثر انداز ہو لہٰذا انہوں نے بصیرت کے ذریعے حاصل ہونے والی معرفت کو بصارت کے ذریعے حاصل کرنا چاہا اور پھر آیت میں جن اجرام فلکی کا ذکر کیا گیا ہے ان کو دیکھتے ہوئے یہ سوچا کہ ان میں سے کوئی ایک بھی معبود بننے کا مستحق نہیں ہو سکتا لہٰذا وہ ان سب سے بری الذمہ ہو کر اس ذات کی طرف متوجہ ہو گئے جس کی معرفت انہیں اپنی بصیرت کے ذریعے نصیب ہوئی تھی اور جو اس ساری کائنات کی اصل خالق ہے۔

ایک مثال

اس بات کو ہم ایک عام فہم مثال کے ذریعے یوں بیان کر سکتے ہیں کہ ایک صاحب فتح ولی کو ''29 ویں'' رات کو کشف کے ذریعہ یہ پتہ چل جاتا ہے کہ آج چاند نظر آ جائے گا لیکن پھر وہ عام لوگوں کے ساتھ مل کر آسمان پر چاند دیکھنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے چاند نظر نہیں آتا وہ لوگوں کے ہمراہ چاند دیکھنے کی کوشش جاری رکھتا ہے۔ جو شخص اس کی روحانی بصیرت سے واقف نہیں ہے وہ یہی سمجھے گا کہ یہ بھی دیگر عام لوگوں کی مانند چاند دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے اور اسے بھی دیگر لوگوں کی مانند یہ معلوم نہیں ہے کہ آج چاند دکھائی دے گا یا نہیں؟ لیکن جو شخص اس کے باطن سے واقف ہو گا اسے یہ بات معلوم ہو گی کہ اس صاحب کشف کو چاند کی موجودگی کا پورا علم ہے لیکن وہ ظاہری آنکھ کے ذریعے بھی چاند کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہے لیکن عام لوگوں کو چاند کے دکھائی دینے یا دکھائی نہ دینے کے بارے میں شک ہے۔

انبیاء کرام اور عام محجوب لوگوں کے استدلال کے درمیان یہی بنیادی فرق ہے۔ اس لئے ہم پر واجب ہے کہ ہم انبیاء کرام کے استدلال کو شک اور بے یقینی سے پاک سمجھیں بلکہ ہر اس چیز سے پاک سمجھیں جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں یقینی علم کے منافی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء کرام معصوم ہوتے ہیں اور معصومیت کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے بارے میں کسی قسم کا کوئی بھی شک یا ناواقفیت نہ ہو کیونکہ ان دونوں کی موجودگی سے کفر لازم آ جاتا ہے جبکہ انبیاء کفر یا کبیرہ گناہ تو دور کی بات ہے صغیرہ گناہوں سے بھی معصوم ہوتے ہیں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) یہ بڑی معرفت کی بات ہے۔ خود مجھے بھی کئی بار اس بات کا تجربہ ہوا کہ آپ نے 29 ویں رات کو، اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے چاند دکھائی دینے کی اطلاع دے دی اور پھر کچھ دیر بعد کوئی شخص آ کر اس کی تصدیق کر دیتا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ سورج غروب ہونے سے پہلے آپ نے چاند کی پیش

گوئی کر دی اور پھر جب ہم نے رات کے وقت چاند دیکھنے کی کوشش کی تو چاند کی باریکی یا ہماری نظر کی کمزوری کے باعث وہ ہمیں دکھائی نہیں دے سکا لیکن بعد میں کسی تیز نظر والے شخص نے چاند کو دیکھ کر اس کی موجودگی کی تصدیق کی۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ آپ نے مجھے بتایا کہ آج رمضان کی پہلی تاریخ ہے حالانکہ سب لوگوں نے اسے شعبان کی آخری تاریخ سمجھتے ہوئے اس دن روزہ نہیں رکھا تھا۔ اس طرح بھی ہوا کہ آپ نے فرمایا: آج عید کا دن ہے حالانکہ لوگوں نے اس دن رمضان کی آخری تاریخ سمجھتے ہوئے روزہ رکھا ہوتا تھا۔ اسی طرح درحقیقت ذوالحج کی 9 تاریخ ہوتی تھی اور لوگ اسے 8 تاریخ سمجھتے تھے لیکن چند دن بعد پتہ چلتا کہ فلاں مقام کے لوگوں نے اسی دن چاند دیکھا تھا جس دن سیّدی دباغ نے چاند دکھائی دینے کی اطلاع دی تھی۔

غلبہ دین حق سے کیا مراد ہے؟

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ. (التوبۃ ۹:۳۳)

"وہی (اللہ) ہے جس نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تا کہ اس (رسول صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہر دین (والے) پر غالب کر دے اگرچہ مشرکین کو برا لگے۔"

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے سیّدی دباغ سے دریافت کیا: اس آیت میں دین اسلام کے غلبے سے مراد کیا ہے؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام نے دیگر تمام ادیان کو منسوخ کر دیا ہے؟ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ دیگر تمام ادیان کی بہ نسبت اسلامی عقائد و نظریات کے دلائل زیادہ مضبوط ہیں؟ یا اس کے علاوہ کوئی اور مطلب بھی ہو سکتا ہے؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: اللہ تعالیٰ نے ہر اعتبار سے اسلام کو غلبہ عطا کیا ہے۔ اس نے دیگر تمام ادیان کو منسوخ بھی کر دیا ہے اور اس کے اعتقادی و عملی نظریات دوسروں کی بہ نسبت زیادہ ٹھوس ہیں۔ اس کے مقابلے میں دیگر تمام ادیان کی حیثیت اقلیت کی سی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ اگر کسی شخص کو کشف و بصیرت عطا کر دے تو وہ یہ دیکھ لے گا کہ روئے زمین پر ہر جگہ مسلمان آباد ہیں اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہیں۔ غیر مسلم ریاستوں میں غاروں، پہاڑوں، میدانوں، آباد اور بے آباد جگہوں پر غرضیکہ ہر جگہ مسلمان آباد ہیں۔ اسلام کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ اس کے اندر ایک ایسا نور پایا جاتا ہے جس کی برکت کی وجہ سے عام طور پر مسلمان، مرتد ہونے سے محفوظ رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ اور محبوب پیغمبر ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں بے شمار ایسی خصوصیات جمع کر دی ہیں جن کی موجودگی میں اس دین کے پیروکار اس دین کو ترک کرنے سے محفوظ رہتے ہیں۔

(سیّدی دباغ فرماتے ہیں:) اگر کوئی صاحب کشف لوح محفوظ میں درج تمام انبیاء کرام اور ان کی

شریعتوں سے متعلق تفصیلات کو دیکھ لے تو اسے بخوبی یہ اندازہ ہو جائے گا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت قیامت تک باقی رہے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے نور اور ظلمت کو پیدا کیا پھر بنی نوع انسان کو پیدا کیا پھر نور کے دروازے پیدا کئے جن کی وساطت سے وہ نور بعض بنی نوع انسان کے اندر داخل ہوتا ہے۔ اسی طرح ظلمت کے دروازے پیدا کئے جن کی وساطت سے ظلمت بعض بنی نوع انسان کے اندر داخل ہوتی ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ رسولوں کو مخصوص شرعی احکام کے ہمراہ مبعوث کیا تا کہ نور کے دروازے کھل جائیں اور ظلمت کے دروازے بند ہو جائیں۔ چنانچہ ہر شریعت میں موجود ''اوامر'' نور کے دروازے کھولتے ہیں اور ''نواہی'' ظلمت کے دروازے بند کرتے ہیں اور یہ ''اوامر'' اور ''نواہی'' صرف شریعت محمدیہ میں مکمل طور پر پائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو تمام شریعتوں پر فوقیت حاصل ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیگر تمام امتوں پر فوقیت حاصل ہے جس کا اندازہ درج ذیل حدیث کے ذریعے سے کیا جا سکتا ہے:

لن یجمع اللّٰہ امتی علی ضلالۃ (المستدرک، ۱:۲۰۰)

''اللہ تعالیٰ میری امت کو کبھی گمراہی پر جمع نہیں کرے گا۔''

(سیّدی دباغ فرماتے ہیں:) اگر کوئی صاحب کشف سابقہ امتوں اور ان کی رہائشی بستیوں کو دیکھے تو اسے ان بستیوں کے اوپر گاڑھے سیاہ دھوئیں کے بادل موجود دکھائی دیں گے جیسے جیسے وہاں سے دھواں نکلتا رہے گا ویسے ویسے اس بستی کے لوگ دین حق کو ترک کرتے جائیں گے۔ یہاں تک کہ مکمل طور پر دھوئیں کی لپیٹ میں آ جائیں گے اور پوری بستی دین حق کو خیر باد کہہ دے گی اور پھر انہیں کبھی بھی ہدایت نصیب نہیں ہو سکے گی۔ دین اسلام کے غالب رہنے کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ (کوئی مسلمان بستی مکمل طور پر اسلام کو خیر باد نہیں کہے گی)

شانِ نزول کی تحقیق

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمِنْهُمْ مَّنْ عَاهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ آتَانَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصَّالِحِيْنَ

''اور ان میں سے بعض لوگوں نے اللہ کے ساتھ یہ عہد کیا کہ اگر وہ ہمیں مال و دولت عطا کر دے تو ہم صدقہ و خیرات کریں گے اور نیک بن جائیں گے۔'' (التوبہ، ۹:۷۵)

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے سیّدی دباغ سے اس آیت کے بارے میں دریافت کیا: مفسرین بیان کرتے ہیں یہ آیت ثعلبہ بن حاطب کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو بارگاہ رسالت مآب میں حاضر ہوا اور اس نے یہ درخواست کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لئے بکثرت دنیا نصیب ہونے کی دعا کریں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

یا ثعلبۃ قلیل تشکر علیہ خیر من کثیر لا تطیق شکرہ

''اے ثعلبہ! تمہارے لئے وہ تھوڑی چیز جس پر تم شکر کر سکو اس زیادہ چیز سے بہتر ہے جس پر تم شکر نہ کر سکو۔''

لیکن اس نے اپنی درخواست پر اصرار جاری رکھا اور عرض کی: یا رسول اللہ! اللہ کی قسم اگر مجھے کثیر مقدار میں بھی دنیا مل گئی تو میں ضرور اللہ کا شکر ادا کروں گا اور پھر اس نے یہ عہد کیا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اسے بہت سا مال عطا کیا تو وہ اللہ کی راہ میں صدقہ وخیرات کرے گا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے دعا کی تو اس کے جانور اس طرح زیادہ ہو گئے، جیسے کیڑے مکوڑے بہت زیادہ ہو جاتے ہیں۔ ثعلبہ پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تمام نمازیں ادا کیا کرتا تھا لیکن جب اس کے جانوروں کی تعداد زیادہ ہو گئی تو وہ مدینہ منورہ سے باہر کسی نواحی گاؤں میں منتقل ہو گیا۔ اب وہ صرف جمعے کی نماز میں حاضر ہوتا تھا۔ جب مویشیوں کی تعداد مزید بڑھ گئی تو جمعہ کے دن بھی حاضری ممکن نہ رہی۔ ایک دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا: ثعلبہ کہاں ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کی مویشیوں کی کثرت کے باعث وہ نمازِ جمعہ اور عام نمازوں میں بھی حاضر نہیں ہو پاتا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ثعلبہ پر افسوس ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن دو حضرات کو زکوٰۃ کی وصولی کے لئے ثعلبہ کے پاس بھیجا۔ دیگر لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرنے کے بعد یہ حضرات ثعلبہ کے پاس پہنچے اور اسے وہ دستاویز دکھائی جس میں زکوٰۃ کے احکام درج تھے۔ ثعلبہ نے کہا یہ تو تاوان ہے۔ تاوان کی ہی ایک شکل ہے ابھی تم جاؤ، میں اس پر غور وفکر کروں گا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی بعد میں ثعلبہ زکوٰۃ کے ہمراہ حاضر ہوا لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ان اللّٰہ منعنی ان اقبل منك (تفسیر طبری' ۱۰:۱۹۰)

''اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہاری زکوٰۃ قبول کرنے سے منع کر دیا ہے''

(یہ سن کر) ثعلبہ نے اپنے سر میں مٹی ڈالنا شروع کر دی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یہ تمہاری اپنی پسند تھی۔ میں نے تمہیں سمجھایا بھی تھا لیکن تم نے میری بات نہیں مانی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد ثعلبہ زکوٰۃ کے مال کے ہمراہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا لیکن آپ نے زکوٰۃ وصول نہیں کی۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت میں ثعلبہ دوبارہ زکوٰۃ کے مال کے ہمراہ حاضر ہوا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی زکوٰۃ وصول کرنے سے انکار کر دیا۔ آخر اسی حالت میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ثعلبہ مر گیا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) امام سیوطی نے تفسیر بیضاوی کے حاشیے میں تحریر کیا ہے: اس روایت کو ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ، طبرانی اور بیہقی نے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: کیا یہ روایت درست ہے اور واقعی کوئی ایسا شخص موجود تھا؟ سیدی دباغ نے جواب دیا: مجھے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام صحابہ میں ایک بھی ایسا شخص دکھائی نہیں دیا جس سے

اس گناہ کا صدور ہوا ہو اور نہ ہی مجھے ایسا واقعہ دکھائی دیا ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) حافظ ابن حجر نے بھی اپنی کتاب "الاصـــابـــہ" میں اس واقعہ کی مشکوک حیثیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ کسی مستند حوالے سے مذکور نہیں ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) قارئین خود اس کتاب کی طرف رجوع کر لیں کیونکہ میں نے بہت عرصہ پہلے اس کتاب کا مطالعہ کیا تھا اور حافظ ابن حجر کے بیان کا مفہوم یہاں نقل کر دیا ہے۔

عالم ارواح کا ایک واقعہ

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ (الاعراف ۷:۱۷۲)

"اور جب اللہ تعالیٰ نے اولاد آدم کی پشتوں میں سے ان کی اولاد کو نکالا۔"

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: یہ واقعہ عالم ارواح میں پیش آیا تھا؟ یا حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے بعد، اللہ تعالیٰ نے ان کی پشت میں سے ان کی اولاد کو نکالا، انہیں عقل اور گویائی عطا کی اور پھر انہوں نے اس عہد کا جواب دیا؟ یا پھر اس آیت میں تمثیلی طور پر استعارے کی شکل میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ اولادِ آدم کو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور ربوبیت کی معرفت عطا کرنا انہیں گواہ بنانے کے مترادف ہے اور پھر ان کے سامنے اپنی ربوبیت کے دلائل کو واضح کرنا ان کے اعتراف کے مترادف ہے؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: اس قصے کا تعلق عالم ارواح کے ساتھ ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ارواح کو ان کے اپنے وجود پر گواہ بنانا چاہا تو حضرت اسرافیل علیہ السلام کو "صور" پھونکنے کا حکم دیا جس کے نتیجے میں ارواح میں اس طرح ہیبت پیدا ہوئی جیسے قیامت کے دن "صور" پھونکے جانے کے وقت ہوگی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان ارواح سے حجاب کو ہٹایا اور ارواح نے اللہ تعالیٰ کے "قدیم کلام" کو سننے کا شرف حاصل کیا اور اسی وقت انوار کی قوت اور ضعف کے باعث ارواح کے مراتب میں فرق ظاہر ہو گیا۔ بعض ارواح نے جو مومنین کی ارواح تھیں، محبت کے ہمراہ اس کلام کا جواب دیا: اور بعض دیگر ارواح نے جو کفار کی ارواح تھیں مجبوری کے عالم میں اس کا جواب دیا: پھر محبت کے ساتھ جواب دینے والوں کے مراتب میں بھی فرق آ گیا کیونکہ بعض ارواح (کے انوار) "قدیم کلام" کو سن کر مضبوط اور بعض (کے انوار) کمزور ہو گئے۔ بعض نے اس کلام کو سن کر جھومنا شروع کر دیا۔ بعض نے اللہ تعالیٰ کے فضل کی بدولت اپنی طاقت دوسروں تک منتقل کرنا شروع کی اور یوں مشائخ اور مریدین کے مراتب کے درمیان فرق ظاہر ہو گیا اور اسی دن ارواح ایک دوسرے سے متعارف ہوئیں۔ اس کے بعد تمام ارواح پر "قدیم کلام" کی ہیبت طاری ہو گئی اور ہیبت کے باعث انہوں نے برزخ میں پرواز شروع کر دی اور آخر کار سکون کی تلاش میں زمین پر اتر آئیں۔ ان کے نزول کے اعتبار سے زمین کی بھی تین قسمیں ہو گئیں: ایک وہ جگہ جہاں صرف مومنین کی ارواح نازل ہوئی تھیں۔ دوسری وہ جگہ جہاں صرف کفار کی ارواح نازل ہوئی تھیں اور تیسری وہ جگہ جہاں کفار اور مومنین دونوں کی ارواح نازل ہوئی تھیں۔ جس مقام پر صرف مومنین کی ارواح نازل ہوئی

تھیں یہ وہ مقامات ہیں جہاں صرف مومنین ہی قیام کریں گے اور وہاں کبھی کوئی کافر آباد نہیں ہو سکے گا۔ جس جگہ پر صرف کفار کی ارواح نازل ہوئی تھیں وہاں صرف کفار ہی قیام کریں گے اور تیسری قسم سے تعلق رکھنے والے مقام پر مومنین اور کفار دونوں قیام کریں گے اور جس گروہ کی ارواح سب سے آخر میں نازل ہوئی تھیں وہی سب سے آخر میں اس جگہ پر قیام کرے گا چنانچہ کوئی بھی صاحب کشف اگر کسی ایسی بستی کو دیکھے جہاں کفار قیام پذیر ہوں تو اسے با آسانی پتہ چل جاتا ہے کہ بعد میں اسی جگہ پر مسلمان آباد ہوں گے یا نہیں؟ کیونکہ وہ صاحب کشف ''یوم الست'' کو ارواح کے اترنے کی کیفیت کا مشاہدہ کرتا ہے اور اسی کے نتیجے میں یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ کسی موجودہ غیر مسلم بستی میں کبھی مسلمان آباد ہوں گے یا نہیں؟ (سیّدی دباغ فرماتے ہیں:) یہی بات دو اور طریقوں سے بھی پتہ کی جا سکتی ہے۔ مثلاً اگر کسی غیر مسلم بستی میں صاحبان کشف وولایت کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہوا دکھائی دے تو یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ یہ جگہ عنقریب ایک مسلم ریاست کی شکل اختیار کر جائے گی۔ اسی طرح اگر کسی مقام پر صاحبان کشف وولایت کی تعداد کم دکھائی دے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس مقام پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوگا۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: اگر کسی غیر مسلم ملک میں رہائش کے دوران کسی کو ''فتح'' نصیب ہو جائے تو اسے کیا کرنا چاہئے؟ آپ نے فرمایا رجال غیب اس شخص کے پاس جا کر اسے دین کی تعلیم دیں گے کیونکہ اگر باطن کے ساتھ ظاہری علم نہ ہو تو اس وقت شاذ و نادر ہی فتح نصیب ہوتی ہے۔

علم ظاہر اور علم باطن میں فرق

ایک مرتبہ سیّدی دباغ نے ارشاد فرمایا: علم باطن کی مثال ایسے ہے جیسے کسی تحریر کی 99 سطور آب زر کے ساتھ لکھی گئی ہوں اور 100 ویں سطر سیاہ روشنائی کے ساتھ لکھی گئی ہو اور اس تحریر کی کیفیت یہ ہو کہ جب تک 100 ویں سطر کا مفہوم سمجھ میں نہ آئے اس وقت بقیہ 99 سطور سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہو سکتا ہو۔ اگر کسی شخص کو ظاہری علم کے بغیر فتح نصیب ہو جائے تو اس کی سلامتی کا امکان بہت کم ہوتا ہے۔

ایک دفعہ سیّدی دباغ نے ارشاد فرمایا: علم ظاہر کی مثال اس لالٹین کی مانند ہے جو رات کی تاریکی میں فائدہ پہنچاتی ہے جبکہ علم باطن کی مثال نصف النہار کے وقت چمکتے ہوئے سورج کی مانند ہے۔ ہو سکتا ہے کہ عین دوپہر کے وقت کوئی شخص یہ کہے کہ سورج کی موجودگی میں لالٹین کی کیا ضرورت ہے؟ اور پھر وہ اس لالٹین کو پھینک دے لیکن جب رات آئے گی تو اسے اپنی حماقت کا احساس ہوگا لہٰذا اگلے دن کی روشنی سے لطف اندوز ہونے کے لئے لالٹین کا وجود شرط ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: بہت سے لوگ اس مقام پر آ کر پھسل جاتے ہیں اور ان کو دن کی روشنی دوبارہ اس وقت تک نصیب نہیں ہوتی جب تک وہ دوبارہ لالٹین حاصل کر کے اسے روشن نہ کریں لیکن دوبارہ روشن کرنے کی توفیق کسی کو نصیب ہوتی ہے اور کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کی بدولت ہمیں اس

سے محفوظ رکھے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی صاحب کشف کسی غیر مسلم بستی کو دیکھے اور پھر کشفی طور پر اسے وہاں آباد مساجد دکھائی دیں جن میں لوگ عبادت میں مشغول ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس سرزمین پر عنقریب مسلمان آباد ہو جائیں گے اور اگر ایسا کچھ دکھائی نہ دے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خطہ ہمیشہ تاریکی میں ڈوبا رہے گا۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس کے بعد سیّدی دباغ نے اس بارے میں کچھ حکایات بھی بیان فرمائی تھیں جنہیں موقع ومحل کی مناسبت سے آئندہ صفحات میں بیان کیا جائے گا۔

عصمتِ انبیاء کی تحقیق

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) ایک مرتبہ کسی نے مجھ سے سوال کیا: کیا انبیاء کرام اعلان نبوت سے پہلے بھی معصوم ہوتے ہیں؟ اعلان نبوت سے پہلے انبیاء کی معصومیت پر ساری امت کا اتفاق ہے یا اس میں کوئی اختلاف بھی پایا جاتا ہے؟ کیا انبیاء کرام صغیرہ گناہوں کے ارتکاب سے بھی محفوظ رہتے ہیں؟ یہی سوال میں نے سیّدی دباغ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے عرض کیا: حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا یہ حضرات نبی تھے یا نہیں تھے؟ اگر یہ نبی تھے تو انہوں نے اپنے بھائی حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ جو سلوک کیا اس کی کیا توجیہہ پیش کی جائے گی؟

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے اس سوال کو اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا۔ میرا ارادہ تھا کہ اس کا جواب تحریر کروں گا۔

میرا ارادہ تھا کہ عصمت انبیاء کے بارے میں علم کلام کے ماہرین مثلاً ''شرح مواقف'' کے مصنف (میر سیّد شریف جرجانی) کا کلام نقل کر دوں گا اس کے علاوہ امام جلال الدین سیوطی نے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے بارے میں ''دفع التعسف عن اخوة یوسف'' نام کی ایک کتاب تالیف کی ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ اس کی تلخیص اپنے جواب میں نقل کر دوں گا مگر میرے جواب تحریر کرنے سے پہلے ہی سیّدی دباغ نے میری ڈائری میں موجود اس سوال کو پڑھ لیا اور پھر اس کے آگے اپنے دستِ اقدس سے اس کا جواب تحریر کیا جو درج ذیل ہے:

الجواب واللہ الموافق للصواب

انبیاء کرام علیہم السلام اعلان نبوت سے پہلے اور بعد میں ہر حال میں معصوم ہوتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں سے جو فعل سرزد ہوا اس کی ادائیگی کا انہیں باطنی طور پر حکم دیا گیا تھا البتہ ظاہری طور پر اللہ تعالیٰ نے ان پر ناراضگی کا اظہار کیا۔ باقی غیب کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ والسلام

یہ جواب احمد بن مبارک سلجماسی لمطی نے تحریر کیا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) سیّدی دباغ نے یہ جواب میری طرف منسوب کر دیا کیونکہ اصل سوال مجھ

سے کیا گیا تھا۔

عتاب کا حکم

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: انبیاء کرام پر نازل ہونے والے بیشتر عتاب اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں باطنی طور پر ایک کام کرنے کا حکم دیا حالانکہ وہ کام ظاہری حکم کے خلاف تھا اور پھر ظاہری حکم کی خلاف ورزی کو جرم قرار دیا گیا۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا اگر اللہ تعالیٰ نے باطنی طور پر اس فعل کی انجام دہی کا حکم دیا تھا تو پھر اسے جرم کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے یا اس پر عتاب کیوں نازل کیا جائے گا؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: اس کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء کرام کے نزدیک ظاہری حکم کی خلاف ورزی بھی گناہ ہوتی ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے عرض کی: اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ انبیاء اپنے اس فعل کو جرم سمجھتے تھے لیکن عتاب نازل ہونے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے باطنی حکم کی مثال یوں ہوگی جیسے اس نے ظاہری حکم کو منسوخ یا مخصوص کر دیا ہے۔ لہٰذا اس پر عتاب نازل نہیں ہونا چاہئے۔ سیّدی دباغ نے جواب دیا: وحی کا نزول انبیاء کے خیالات کا تابع ہوتا ہے اور نبی کے خیال کے مطابق اس پر وحی نازل ہوتی ہے۔ جب کوئی نبی اپنے کسی فعل کو ظاہری طور پر جرم سمجھتا ہے تو اپنے آپ کو سرزنش کرتا ہے اور اسی کے مطابق وحی نازل ہو جاتی ہے اگر کوئی شخص انبیاء کرام کے خیالات معلوم کرنا چاہے تو اسے ان انبیاء پر نازل ہونے والی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ جو ان انبیاء کے خیالات کے مطابق نازل کی گئی تھیں چنانچہ کسی کتاب میں کسی خاص مقام پر، پڑھنے والوں کو کوئی نصیحت کی گئی ہوگی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس وقت اس نبی کے ذہن میں مخلوق کو نصیحت کرنے کا خیال موجود تھا۔ اسی طرح کے کسی مقام پر خوشخبری دینے یا ڈرانے کا ذکر موجود ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس آیت کے نزول کے وقت، نبی کی اپنی ذہنی کیفیت بھی یہی تھی۔ اس ساری گفتگو کا خلاصہ یہ سامنے آیا کہ انبیاء کرام کی عصمت کا عالم یہ ہے کہ ان کے ذہن میں آنے والے تمام خیالات بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی باطنی کیفیت اور نزول قرآن

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَاهُ۔ (الاحزاب ۳۳:۳۷)

''اور تم لوگوں سے ڈرتے ہو اور اللہ اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ تو اس سے ڈرے۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر کیوں عتاب نازل کیا ہے حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیّد العارفین اور امام الانبیاء والمرسلین ہیں؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: جب حضرت زید رضی اللہ عنہ بن حارثہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ کیا، کیا وہ اپنی اہلیہ

سیّدہ زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو طلاق دیدیں؟ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایسا کرنے سے منع کیا اور اپنی اہلیہ کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کی حالانکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ جانتے تھے کہ سیّدہ زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا عنقریب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آ جائیں گی لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو ظاہر نہیں کیا۔ لیکن پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خیال آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کو سرزنش کرتے ہوئے اپنے نفس کو مخاطب کیا: کیا تم لوگوں سے ڈرتے ہو حالانکہ اللہ تعالیٰ اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خیال کے مطابق وحی نازل ہوگئی۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: جس شخص کو اللہ تعالیٰ "فتح" نصیب کر دے، ایسا شخص جب کسی آسمانی کتاب پر غور کرتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کے "قدیم کلام" کے نور کے ہمراہ وہ نور بھی دکھائی دیتا ہے جو اس وحی کے نزول وقت صاحب وحی نبی کی فطری حالت کا نور ہے۔ لہٰذا بعض اوقات وحی کے نزول کے وقت نبی پر قبض یا بسط کی کیفیت طاری ہوتی ہے اور پھر اسی کے مطابق آیتیں نازل ہو جاتی ہیں۔ تاہم یاد رکھیں کہ "کلام" کا نور "قدیم" ہے اور کیفیت کا نور "حادث" ہے۔ اسی طرح ہر آیت میں نبی کی طبعی حالت کا نور ضرور موجود ہوتا ہے۔ اس لئے تمہاری ذکر کردہ آیت میں اللہ تعالیٰ کے "قدیم کلام" کے نور کے ہمراہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طبعی حالت کا نور بھی موجود ہے جو عتاب کی شکل میں ظاہر ہوا۔ "قدیم کلام" اللہ تعالیٰ کی طرف سے امت کے لئے ہے اور عتاب کی ظاہری شکل خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے لئے ہے۔ عتاب کا یہ رنگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں: جب "اہل فتح" آپس میں کسی آیت کی تفسیر پر گفتگو کرتے ہیں تو وہ سب سے پہلے آیت کے شان نزول پر غور کرتے ہیں۔ شان نزول سے مراد وہ احوال و واقعات نہیں ہیں جو مفسرین نے ذکر کئے ہیں بلکہ اس سے مراد آیت کے نزول کے وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی باطنی کیفیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "صاحبان فتح" ان آیات کی تفسیر بیان کرتے ہوئے ایسے نادر نکات بیان کرتے ہیں جو انسانی عقل سے ماورا ہوتے ہیں کیونکہ "صاحبان فتح" ہر وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے باطن میں موجود سمندر میں غوطہ زن رہتے ہیں جس کے سات اجزاء ہیں یعنی آدمیت، قبض، بسط، نبوت، روح، رسالت اور علم کامل، ان کی وضاحت ہم سابقہ صفحات میں بیان کر چکے ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ تَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ۔

"اللہ تم سے درگزر کرے تم نے انہیں کیوں اجازت دی (اگر نہ دیتے) تو واضح ہو جاتا کہ ان میں سے کون سچا ہے اور تم جھوٹوں سے بھی آگاہ ہو جاتے" (التوبہ ۹:۴۳)

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے سیّدی دباغ سے اس آیت کا مفہوم دریافت کیا: تو آپ نے سابقہ

جواب کے مطابق جواب عنایت کیا اور فرمایا: اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسروں سے درگزر کرنے، معاف کردینے، حسن سلوک سے پیش آنے کا حکم دیا ہے۔ یہاں تک کہ قرآن کہتا ہے،

وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (آل عمران ۳:۱۵۹)

''اور اگر تم درشت مزاج اور سخت دل ہوتے تو لوگ ہرگز تمہارے آس پاس اکٹھے نہ ہوتے اس لئے تم ان سے درگزر کرو، ان کے لئے دعائے مغفرت کرو اور ان سے مشورے لیا کرو۔''

لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ یہی تھی۔ اسی وجہ سے جب منافقین نے جنگ میں شرکت سے بچنے کے لئے جھوٹے عذر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کئے تو اگرچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی منافقت کا علم تھا پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طبعی مہربانی اور اللہ تعالیٰ کے ان احکام کی بدولت ان کا عذر قبول کیا جن احکام میں اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کے ساتھ نیک سلوک کا حکم دیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کو مدینے میں رہنے کی اجازت عنایت کر دی لیکن یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش تھی کہ کوئی ایسی آیت نازل ہو جو منافقین کے نفاق کو ظاہر کر دے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں رحمت اور حیا کا رنگ غالب تھا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان منافقین کے نفاق کو ظاہر نہیں کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیا کے بارے میں قرآن کہتا ہے۔

اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ

''بے شک یہ بات نبی کو اذیت دیتی ہے لیکن وہ حیا کے باعث تمہیں منع نہیں کرتا لیکن اللہ حق کو ظاہر کرنے سے حیا نہیں کرتا۔'' (الاحزاب ۳۳:۵۳)

لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خواہش تھی کہ اللہ تعالیٰ کوئی آیت نازل کر کے عتاب کی شکل میں ان کے نفاق کو ظاہر کرے تاکہ اس میں تہمت کا اندیشہ بھی موجود نہ ہو اور دوسروں کی خیر خواہی بھی ہو جائے اور اگر کوئی شخص دوبارہ منافقت اختیار کرنے کی کوشش کرے تو اس کے لئے وہ آیت خطرے کا نشان ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر منافق، دشمن اور مخالف کے خلاف اللہ تعالیٰ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مددگار ہے لہٰذا اس عتاب میں بہت سی مصلحتیں پوشیدہ ہیں بلکہ باطنی طور پر تو اس میں کوئی عتاب نہیں ہے بلکہ اس میں حبیب اپنے محبوب کی جانب سے مقابلہ کر رہا ہے۔

سیدی دباغ فرماتے ہیں: کسی بھی شخص کو یہ گمان نہیں رکھنا چاہئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین کے نفاق کا علم نہیں تھا۔ بھلا یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیسے مخفی رہ سکتی ہے جبکہ آج کے زمانے میں بھی کوئی بھی صاحب کشف سچے اور جھوٹے کے درمیان امتیاز کر سکتا ہے اور تمام صاحبان کشف اس بات پر متفق ہیں کہ انہیں جو فضل و کمال بھی نصیب ہوا ہے وہ صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے نتیجے میں عطا ہوا ہے اور انہیں

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نور مبارک میں سے ایک بال کے برابر حصہ نصیب ہوا ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس سے پہلے ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علم مبارک کی کیفیت کے بارے میں مختصر گفتگو نقل کر چکے ہیں۔ سیّدی دباغ نے اس آیت کی نہایت عمدہ تفسیر بیان کی ہے۔

بیضاوی کی تفسیر

امام بیضاوی، اللہ تعالیٰ ان سے اور ہم سے درگزر فرمائے' فرماتے ہیں: اس آیت میں "عفا اللّٰہ عنك" (اللہ تعالیٰ تمہیں معاف کرے) کے ذریعے اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کا عذر قبول کر کے (معاذ اللہ) غلطی کی تھی کیونکہ معافی ہمیشہ غلطی کے ارتکاب پر دی جاتی ہے۔ تفسیر بیضاوی کے حاشیے میں شیخ الاسلام زکریا انصاری لکھتے ہیں: بیضاوی نے اس تفسیر میں زمخشری کی پیروی کی ہے اور زمخشری کے بارے میں علامہ طیبی کی رائے یہ ہے کہ اس نے اس آیت کی تفسیر میں بڑی فحش غلطی کی ہے۔ میں حیران ہوں کہ علم معانی کے ذریعے لطیف نکات کا استخراج کرنے کے حوالے سے اتنی بڑی شخصیت (زمخشری) سے یہ غلطی کیسے سرزد ہو گئی کیونکہ علم معانی کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ اس نوعیت کے کلمات کو جملے کے آغاز میں لانا اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ مخاطب کی تعظیم و توقیر کی جا رہی ہے جیسے اگر آپ کسی بزرگ سے مخاطب ہوں تو ان سے یہی کہیں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو معاف کرے آپ نے میرے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ یا اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ اسی لئے علامہ تفتازانی فرماتے ہیں: زمخشری کو چاہئے تھا کہ اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے یہ بات پیش نظر رکھتا کہ اللہ تعالیٰ نے کس قدر عمدہ انداز میں اپنے رسول کو مخاطب کیا ہے کہ پہلے عفو کا ذکر کیا پھر اذن کا ذکر کیا جو اس بات کی علامت ہے کہ مخاطب کو کس قدر عظمت اور تصرف حاصل ہے۔ نیز گفتگو کو استفہامیہ انداز میں پیش کیا گیا حالانکہ اصل مقصد انکار کرنا ہی تھا۔ (عربی زبان کے محاورے میں) بعض اوقات "عفا اللّٰہ عنك" خلاف اولیٰ کو ترک کرنے پر بھی بولا جاتا ہے بلکہ مخاطب کو تعظیم کے طور پر مخاطب کرنے کے لئے جملے کے آغاز میں اس طرح کے کلمات لائے جاتے ہیں۔

زمخشری کی غلطی

تفسیر بیضاوی کے حاشیے میں علامہ سیوطی لکھتے ہیں اس عبارت میں بیضاوی نے زمخشری کی پیروی کی ہے۔ "الانتصاف" کے مصنف لکھتے ہیں زمخشری کی بیان کردہ تفسیر میں دو امکان پائے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ زمخشری کی بیان کردہ تفسیر اللہ تعالیٰ کی مراد کے خلاف ہو اس صورت میں زمخشری نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ زمخشری کی بیان کردہ تفسیر اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق ہو اس صورت میں بھی غلطی زمخشری کی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کے اظہار کے پیش نظر کنایہ کی صورت میں کلام نازل کیا لیکن زمخشری نے اللہ تعالیٰ کے طریقے کے برعکس صراحت کے ساتھ اس بات کو نقل کیا اور نبی اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان کو پیش نظر نہیں رکھا۔ اس کے بعد ''الانتصاف'' کے مصنف نے طیبی اور تفتازانی کی عبارت نقل کی ہے پھر لکھتے ہیں قاضی عیاض مالکی نے اپنی کتاب ''الشفاء'' میں تحریر کیا ہے کہ اس نوعیت کے کلمات عام طور پر گفتگو کے آغاز میں استعمال کئے جاتے ہیں جن کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو عزت دے یا اللہ تعالیٰ آپ کو بھلائی عطا کرے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس آیت کی تفسیر میں زمخشری کے موقف کے ردّ میں شیخ حسن بن محمد بن صالح نابلسی نے ایک کتاب تحریر کی ہے جس کا نام ''جنۃ الناظر وجنۃ المناظر فی الانتصار لابی القاسم الطاہر'' ہے۔ (زمخشری کی تفسیر) ''کشاف'' کی انہی منفی عبارتوں کی وجہ سے بزرگوں نے اس کتاب کے مطالعے کو ممنوع قرار دیا ہے۔ امام تقی الدین سبکی شافعی نے اس موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ''سبب الانکفاف عن اقراء الکشاف'' ہے۔ اس رسالے کو تفسیر کشاف کے حاشیے میں نقل کر دیا گیا ہے۔

اخروی عذاب یا دنیاوی؟

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا۔ (بنی اسرائیل ۱۷:۱۵)

''اور ہم اس وقت تک عذاب نازل نہیں کرتے جب تک اپنا رسول مبعوث نہ کر دیں۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: اس آیت میں جس عذاب کی نفی کی گئی ہے اس سے مراد دنیا کا عذاب ہے یا آخرت کا عذاب ہے؟ نیز اس عذاب کے لئے بالغ ہونا شرط ہے جیسا کہ بظاہر اس آیت سے معلوم ہوتا ہے یا پھر بلوغت شرط نہیں ہے جیسا کہ ان تمام روایات سے ثابت ہوتا ہے جن میں یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ پاگل یا وہ لوگ جو بات کو نہیں سمجھ سکتے انہیں قیامت کے دن۔ امتحان کے طور پر جہنم میں داخل ہونے کا حکم ملے گا۔ اگر انہوں نے اس حکم پر عمل کیا تو انہیں جنت میں داخل کر دیا جائے گا ورنہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: دنیا میں عذاب کے نزول کے لئے دعوت کا پہنچنا شرط ہے۔ جیسے زمین کا دھنس جانا، پتھروں کی بارش ہونا وغیرہ، یہ عذاب سابقہ امتوں پر نازل ہوا کرتے تھے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا۔ (بنی اسرائیل ۱۷:۱۵)

''اور ہم اس وقت تک عذاب نازل نہیں کرتے جب تک اپنا رسول مبعوث نہ کر دیں۔''

یعنی ہم کسی امت کو اس وقت تک دنیاوی عذاب نہیں دیں گے جب تک ان کے پاس ہمارا رسول نہ آ جائے اور ان پر حجت قائم نہ ہو جائے لیکن آخرت کے عذاب کے لئے کسی رسول کی بعثت شرط نہیں ہے کیونکہ اگر اس کے لئے بھی بعثت کو شرط قرار دیا جائے تو یاجوج ماجوج جہنم میں داخل نہیں ہو سکیں گے حالانکہ جہنم میں اکثریت انہی کی ہو گی۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: ایک حدیث میں یہ بات منقول ہے کہ شب معراج آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر یاجوج ماجوج کے پاس سے ہوا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں

توحید کی دعوت دی لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ اس لئے یاجوج ماجوج جہنم میں جائیں گے؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: یہ روایت درست نہیں ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) علم حدیث کے ماہرین نے بھی اس روایت کو مشکوک قرار دیا ہے کیونکہ اس میں ایک راوی نوح بن ابی مریم ہے جو جھوٹی روایات نقل کیا کرتا تھا۔ مشہور محدث ابن حبان کہتے ہیں: اس شخص میں سچائی کے علاوہ ہر بات موجود تھی۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) پاگلوں کے بارے میں جو روایات منقول ہیں انہیں یہاں اس لئے ذکر نہیں کیا تاکہ کلام طویل نہ ہو جائے' اسی طرح اس آیت کی تفسیر میں مفسرین اور علماء اصول کی آراء نقل کرنے سے بھی گریز کیا گیا ہے کیونکہ میرا مقصد صرف سیّدی دباغ کے ملفوظات کو مرتب کرنا ہے۔ اگر جہالت عام نہ ہوتی تو میں اس کتاب میں سیّدی دباغ کے ملفوظات کے علاوہ اور کچھ نقل نہ کرتا لیکن لوگوں کے فائدے کے لئے بعض مقامات پر وہ روایات نقل کر دی ہیں جن سے سیّدی دباغ کے کلام کی تائید ہوتی ہے۔

اُسلوبِ بیان کی حکمت

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ (التکویر ۸۱:۲۲)

''اور (اے لوگو!) یہ تمہیں اپنی صحبت سے نوازنے والے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) دیوانے نہیں ہیں (جو فرماتے ہیں وہ حق ہوتا ہے)۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تعارف ان الفاظ میں کیوں کروایا ہے جبکہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے بارے میں قرآن کے الفاظ یہ ہیں:

رسول کریم ''مہربان پیغامبر'' مطاع ثم أمين ''امانت دار اور لائق اطاعت ہے'' (التکویر ۸۱:۱۹'۲۱)

سیّدی دباغ نے جواب دیا: قرآن مجید نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نورِ حق کی وساطت سے نازل ہوتا ہے اور اس کے نزول کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو کیفیت ہوتی ہے قرآن کی عبارت کے الفاظ اسی پر دلالت کرتے ہیں۔ بعض اوقات آیت کے نزول کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر تواضع کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ اس آیت کے نزول کے وقت بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر تواضع کا رنگ غالب تھا۔ اس لئے آپ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کا تذکرہ شاندار الفاظ میں کیا اور اپنا تعارف سادگی کے ساتھ کروایا۔

ایک مرتبہ اسی آیت کی تفسیر کرتے ہوئے سیّدی دباغ نے ارشاد فرمایا: اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ سابقہ آیات میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کی جن صفات کا تذکرہ کیا گیا ہے ان کی اطلاع تمہیں ایک ایسا رسول دے رہا ہے جو بہترین ہوش وحواس کا مالک ہے۔ تم اس کی سچائی اور امانت سے واقف ہو اور یہ بھی جانتے ہو کہ وہ ہر بات سوچ سمجھ کر کرتا ہے۔ لہٰذا اس آیت کے ذریعے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ سابقہ آیات کی تائید مقصود ہے۔ اس لئے اس آیت پر یہ اعتراض بھی وارد نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت جبرائیل

علیہ السلام کا تذکرہ بہتر انداز میں کیا گیا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تعارف میں ایک منفی صفت کی نفی کو کافی سمجھا گیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا۔ (الاعراف ۷:۸۹)

''ہمیں تمہاری طرف واپس آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے تاہم اگر ہمارا پروردگار چاہے (تو ہم ایسا بھی کر سکتے ہیں)''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: حضرت شعیب علیہ السلام نے یہ کیوں کہا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ہم دوبارہ تمہارے پاس واپس آ جائیں گے کیونکہ ایسی صورت میں استثنیٰ کا بالواسطہ مطلب یہ ہوگا کہ حضرت شعیب علیہ السلام کو اپنے ایمان کے بارے میں شک تھا؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: اس استثنیٰ کا مطلب اس بات کا اظہار تھا کہ ہم ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق کام کریں گے اور یہ ایمان کا کامل ترین درجہ ہے کیونکہ تمام ''صاحبان فتح'' اور بالخصوص انبیاء کرام بطور خاص اس بات کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ ان کا ہر عمل اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہے۔ ذاتی طور پر انہیں کوئی بھی کام کرنے یا نہ کرنے کی صلاحیت حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا اس کیفیت میں اگر کوئی شخص اپنا ہر عمل اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ معرفت کے سمندر میں غرق ہو چکا ہے اور ایمان کے بلند ترین مرتبے پر فائز ہو چکا ہے۔

ستارے کی قسم کی حکمت

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۔ مَاضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى۔ (النجم ۵۳:۱،۲)

''قسم ہے روشن ستارے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی جب وہ (چشم زدن میں شب معراج اوپر جا کر) نیچے اترے۔ تمہیں اپنی صحبت سے نوازنے والے (یعنی تمہیں اپنے فیض صحبت سے صحابی بنانے والے رسول صلی اللہ علیہ وسلم) نہ (کبھی) راہ بھولے اور نہ (کبھی) راہ سے بھٹکے۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو صحیح قرار دینے کے لئے ستارے کی قسم کیوں اٹھائی گئی ہے حالانکہ محض وہ ایک پتھر ہے؟ نیز ستارے اور نور رسالت کے درمیان وہ کون سی مناسبت موجود ہے جس کی وجہ سے قسم اٹھائی گئی ہے؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: ستارے کی قسم اس لئے نہیں اٹھائی گئی کہ وہ محض ایک ستارہ یا پتھر ہے بلکہ قسم اٹھانے کی وجہ وہ نور ہے جو اس ستارے میں پایا جاتا ہے جس کی مدد سے سمندروں اور صحراؤں کی تاریکیوں میں صحیح راستے کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ اس کے بعد سیّدی دباغ نے ایک مثال بیان کی: فرض کریں دو مسافر راستہ بھول جاتے ہیں دونوں کا زادِ راہ ختم ہو چکا ہے اور دونوں ایک دوسرے سے بھی بچھڑ چکے ہیں یہاں تک کہ دونوں انتہائی مایوس ہو کر اس بات کا یقین کر چکے ہیں کہ اب ان

کی ہلاکت نزدیک ہے لیکن ان میں سے ایک کو ستاروں کے ذریعہ راستہ تلاش کرنے کے طریقہ کا پتہ ہے۔ یہ مسافر رات کے وقت ستاروں کی مدد سے صحیح راستہ تلاش کر لے گا اور اپنی منزل تک پہنچ جائے گا لیکن جس شخص کو ستارے کی مدد سے راستہ تلاش کرنے کا پتہ نہیں ہے وہ شخص یونہی بھٹکتا ہوا موت کے منہ میں چلا جائے گا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لوگوں کے تعلق کی بھی یہی کیفیت ہے۔ ایک گروہ آپ پر ایمان لا کر اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کر کے جنت تک پہنچ جاتا ہے بالکل اسی طرح جیسے پہلا شخص ستارے کی مدد سے اپنی منزل مقصود تک پہنچ گیا تھا جبکہ دوسرا گروہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر کے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی مول لیتا ہے اور آخر کار جہنم کا ایندھن بن جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے دوسرا شخص بھٹکتا ہوا موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔ اسی نسبت کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ستارے سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: اس آیت میں ''اذا ھوی'' کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے فرمایا: اس کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ ستارہ آسمان کے وسط سے ہٹ جائے کیونکہ جب تک ستارہ کسی ایک جانب جھکے گا نہیں اس وقت تک اس کی مدد سے راستہ معلوم نہیں کیا جاسکتا۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کے بہت سے اقوال موجود ہیں جنہیں شیخ نجم الدین غیطی نے اپنی تصنیف ''الاسراء والمعراج'' میں جمع کر دیا ہے۔ یہ اس موضوع پر ایک قابل قدر تالیف ہے اگر آپ اس کا مطالعہ کریں تو آپ کو سیّدی دباغ کے بیان کی اہمیت کا اندازہ ہو جائے گا۔ اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا تو ہم اس کتاب کے کچھ اقتباسات یہاں نقل کرتے۔

''الصمد'' کی خصوصیت

ایک مرتبہ سیّدی دباغ نے اللہ تعالیٰ کے فرمان ''الصمد'' کی تفسیر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: یہ ایک ایسا اسم صفت ہے کہ ساری مخلوق، درخت، پتھر، ذی روح، بے روح غرضیکہ ہر طرح کی مخلوق اس اسم سے فیض حاصل کرتی ہے۔

اہل اعراف کون ہیں؟

ایک مرتبہ سیّدی دباغ نے ''اہل اعراف'' کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: فلاں سیّدی، فلاں سیّدی یعنی ''صاحبان فتح'' و اہل عرفان ہی ''اہل اعراف'' ہیں اور ان کا مقام جنت میں اس قدر بلند ہوگا کہ بقیہ ساری جنت ان کے نیچے ہوگی جیسے شہر ''فاس'' میں موجود مینار پر چڑھ کر پورا شہر نیچے نظر آتا ہے کیونکہ اس مقام کے مالک اپنے سے نیچے والے لوگوں سے زیادہ نمایاں ہو جائیں گے اس لئے ان کے بلند مقام کو ''اعراف'' قرار دیا گیا ہے۔

امام سیوطی نے ''اہل اعراف'' کی تشریح میں بہت سے اقوال اپنی تصنیف ''البدور السافرۃ'' میں نقل کئے ہیں اور یہ بات بھی بیان کی ہے کہ حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دیگر تمام شہداء ''اہل اعراف''

میں شامل ہیں۔

''فتح مبین'' سے کیا مراد ہے؟

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا لِّیَغۡفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡۢبِکَ وَ مَا تَاَخَّرَ

''(اے حبیبِ مکرم!) بے شک ہم نے آپ کے لیے (اسلام کی) روشن فتح (اور غلبہ) کا فیصلہ فرما دیا' تا کہ آپ کی خاطر آپ کی اُمت (کے اُن تمام افراد) کی اگلی پچھلی خطائیں معاف فرما دے (جنھوں نے آپ کے حکم پر جہاد کیے اور قربانیاں دیں)'' (الفتح' ۴۸:۱'۲)

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے اس آیت کا مفہوم دریافت کیا تو سیدی دباغ نے ارشاد فرمایا: یہاں ''فتح مبین'' سے مراد اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ بات پہلے سے معلوم تھی کہ ساری مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی معرفت نصیب نہیں ہوگی کیونکہ اگر ساری مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی معرفت نصیب ہوگئی تو وہ سب جنت کے مستحق قرار پائیں گے حالانکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہے کہ بعض مخلوق جنت میں رہے اور بعض مخلوق جہنم میں رہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے بہت سی مخلوق کو محجوب کر دیا۔ اب وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی ذات یا اس کے افعال کا مشاہدہ نہیں کر سکتے لیکن اگر یہ حجاب ہٹا دیا جائے تو پھر وہ مشاہدہ کر سکتے ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ (الحدید' ۵۷:۴)

''تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے''

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (ق' ۵۰:۱۶)

''اور ہم تمہاری شہ رگ سے زیادہ قریب ہیں''

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِيْبٌ (البقرہ' ۲:۱۸۶)

''اور جب میرے بندے تم سے میرے بارے میں پوچھیں تو کہہ دو کہ میں قریب ہوں۔''

ولا ادنی من ذٰلك ولا اكثر الا هو معهم اينما كانوا

''کم ہوں یا زیادہ وہ جہاں کہیں بھی ہوں گے اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ موجود ہوگا''

اس وقت جب حجاب موجود نہ ہوتا تو سب لوگ اس بات کا مشاہدہ کر لیتے کہ ان کے تمام تر افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور ان کی اپنی حیثیت صرف ایک کٹھ پتلی کی مانند ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنی مرضی کے مطابق حرکت دیتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ (الصافات' ۳۷:۹۶)

''حالانکہ اللہ نے تمہیں اور تمہارے (سارے) کاموں کو خلق فرمایا ہے۔''

اس صورت میں کوئی بھی شخص اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتا کیونکہ معصیت کا صدور اسی شخص سے ہو سکتا

ہے جو معصیت کے ارتکاب کے وقت اللہ تعالیٰ کو بھول چکا ہوا اس سے غافل ہو اور محجوب ہو۔ تمام اہل ایمان اگر چہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کے تمام تر افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے لیکن یہ اعتقاد کبھی پیش نظر رہتا ہے اور کبھی آنکھ سے اوجھل ہو جاتا ہے اور اس کا سبب بھی حجاب ہے۔ لہٰذا ان کا عقیدہ صرف ایمان بالغیب کی شکل میں ہوتا ہے۔ مشاہدے کی صورت میں نہیں ہوتا پھر جس شخص پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو اس کے سامنے سے حجاب ہٹ جاتا ہے اور اسے مشاہدہ نصیب ہو جاتا ہے اس وقت اسے حق کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ مذکورہ بالا آیت میں ''فتح مبین'' کہہ کر اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا یہ ''فتح'' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کب نصیب ہوئی تھی؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: پیدائش کے وقت ہی، کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی بھی اللہ تعالیٰ سے محجوب نہیں رہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: یہ ''فتح'' ہر نبی بلکہ ہر کامل ولی کو بھی نصیب ہوتی ہے' پھر اس میں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا خصوصیت ہے؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: قوت اور ضعف کے اعتبار سے ''فتح'' کے مختلف مراتب ہیں۔ اور ہر شخص کو اس کی طاقت کے مطابق ''فتح'' نصیب ہوتی ہے۔ عقل، روح، نفس، ذات، سرّ، حفظ کے اعتبار سے جو طاقت اور صلاحیت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھی وہ کسی اور کو حاصل نہیں ہو سکی۔ یہاں تک کہ اگر سارے انبیاء اور سارے اولیاء کو اکٹھا کر کے وہ ''فتح مبین'' (جس کی طرف آیت میں اشارہ کیا گیا ہے) ان سب پر ڈال دی جائے تو یہ سب ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ اس آیت میں لفظ ''ذنب'' سے مراد غفلت اور حجاب کی تاریکی ہے جو مٹی میں فطری طور پر پائی جاتی ہے اور اس غفلت وحجاب کا گناہ سے وہی تعلق ہے جو گندگی کا مکھی کے ساتھ ہوتا ہے لہٰذا کوئی بھی شخص اگر گندے کپڑے پہن لے تو مکھیاں اس کے گرد بھنبھنانے لگیں گی اور جب وہ شخص اس لباس کو اتار دے گا تو مکھیاں بھی چھٹ جائیں گی۔ اس لئے اگر کوئی شخص اس کپڑے کو ہی مکھی کہہ دے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہو گا۔ اسی طرح مذکورہ بالا آیت میں حجاب کو ''ذنب'' کہا گیا ہے۔ اور سابقہ وآئندہ ذنب سے مراد ان کا زائل ہو جانا ہے۔ گویا کہ آیت کا مفہوم یہ ہو گا اے رسول! ہم نے تمہیں فتح مبین عطا کر کے تمہارے تمام حجابات کو زائل کر دیا ہے تا کہ تم پر ہماری نعمت مکمل ہو جائے اور تمہیں مکمل معرفت اور ہماری مدد نصیب ہو جائے کیونکہ حجاب کے زائل ہونے سے اور بڑی نعمت کوئی نہیں ہے اور معرفت کے حصول سے بڑی ہدایت اور کوئی نہیں ہے اور جس شخص کو یہ نعمت نصیب ہو گئی اس سے بڑی مدد اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: کیا یہ ''فتح مبین'' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں! میں نے دریافت کیا: اس کی وجہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر شے کی اصل ہیں۔ میں نے دریافت کیا: شاید اسی وجہ سے قیامت کے دن تمام انبیاء یہ کہیں گے: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلو کیونکہ ان کے تمام حجابات زائل کر دیئے گئے ہیں۔

ابو یحییٰ تلمسانی کی تفسیر

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) سیّدی دباغ کی یہ تفسیر نہایت نفیس اور معرفت سے بھرپور ہے۔ اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ادب واحترام کا بطور خاص خیال رکھا گیا ہے اور انبیاء کرام کی عصمت کے متفقہ عقیدے کے حوالے سے بھی یہ تفسیر درست معلوم ہوتی ہے اور آیت کا سیاق وسباق بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ دیگر بہت سے مشائخ نے بھی اس آیت کی وہی تفسیر بیان کرنے کی کوشش کی جس کی طرف سیّدی دباغ نے اشارہ کیا ہے لیکن وہ صحیح معنی میں اس کی وضاحت نہیں کر سکے جیسا کہ شیخ سبکی، شیخ ابو یحییٰ تلمسانی، جنہوں نے ''ذنب'' کے اور مغفرت کے تین مراتب مقرر کیے ہیں۔ ''ذنب'' کا پہلا مرتبہ اس کی جائے صدور یعنی نفس ہے' دوسرا مرتبہ ''ذنب'' کی حقیقت یعنی اللہ تعالیٰ کے فرمان کی مخالفت ہے اور تیسرا مرتبہ ذنب کے اثرات یعنی اس کے نتیجے میں دل پر وارد ہونے والی تاریکیاں ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔ (المطففین ۸۳:۱۴)

''(ایسا) ہرگز نہیں بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) ان کے دلوں پر اعمال (بد) کا زنگ چڑھ گیا ہے جو وہ کمایا کرتے تھے (اس لیے آیتیں ان کے حل پر اثر نہیں کرتیں)۔''

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

اذا اذنب العبد نكت في قلبه نكتة سوداء (المستدرک ۱:۴۵)

''جب کوئی بندہ کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نکتہ پڑ جاتا ہے۔''

شیخ ابو یحییٰ تلمسانی کہتے ہیں بعض اوقات گناہ کے جائے صدور یا اثرات کو بھی مجازی طور پر گناہ کہہ دیا جاتا ہے جبکہ لفظ ''مغفرت'' لفظ ''غفر'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی ''ستر'' (کسی چیز کو ڈھانپ دینا) ہیں اور ستر کے بھی تین درجات ہیں: پہلا اور سب سے مضبوط درجہ یہ ہے کہ وہ چیز موجود ہی نہ ہو (تو گویا وہ مستور یعنی چھپی ہوئی شے ہے)' دوسرا درجہ یہ ہے کہ وہ چیز موجود ہو لیکن حواس کے ذریعے اس کا ادراک نہ کیا جا سکے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی چیز موجود ہو' حواس کے ذریعے اس کا ادراک بھی کیا جا سکے لیکن پھر کسی رکاوٹ کے باعث وہ نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ جیسے اگر سورج آسمان میں موجود ہی نہ ہو تو گویا عدم میں چھپا ہوا ہے لیکن اگر آسمان میں موجود ہو لیکن دیکھنے والا اندھا ہو تو گویا یہ دیکھنے کی حس کی عدم موجودگی کی وجہ سے اس سے چھپا ہوا ہے اور اگر سورج بھی موجود ہے اور دیکھنے کی حس بھی سلامت ہے یعنی سورج بادلوں کی اوٹ میں چھپا ہوا دکھائی نہیں دے رہا تو اس صورت میں ''ستر'' کا سب سے کمزور ترین درجہ ہوگا کیونکہ جیسے بادل سورج کے سامنے سے ہٹے گا سورج نظر آنے لگے گا۔

(ابو یحییٰ تلمسانی کہتے ہیں) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں مغفرت (یعنی ستر) سے مراد اس کا معدوم ہونا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ''ذنب'' سے مراد اس کی جائے صدور ہے۔ اگر اس سے مراد

گناہ کا اصل لیا جائے تو محل صدور یعنی نفس اور گناہ کی حقیقت یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کی نفی نہیں ہو سکے گی اور یہ صورت عصمت کے منافی ہوگی کیونکہ اس صورت میں گناہ کی نفی تو ہو جائے گی لیکن گناہ کے مادے کی نفی نہیں ہو سکے گی اور عصمت ختم ہو جائے گی اور یہ کیفیت تو عام مسلمان کو بھی حاصل ہو جاتی ہے۔

اگر اس آیت میں ذنب سے مراد گناہ کی حقیقت لی جائے تو آیت میں موجود لفظ "من"، "عن" کے معنی میں ہوگا اور آیت کا ترجمہ یہ ہوگا:

"اللہ تعالیٰ نے گناہ سے مقدم چیز یعنی گناہ کا محل صدور یعنی نفس کو بھی تم سے دور کر دیا ہے اور گناہ کے بعد آنے والی چیز یعنی گناہ کا اثر اور اس کے نتیجے میں دل پر چھانے والی تاریکی کو بھی تم سے دور کر دیا ہے۔"

اگر اس آیت میں حقیقی اور مجازی دونوں معنی مراد لئے جائیں تو گناہ سے پہلے سے مراد حقیقت گناہ ہوگی یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں گناہ کے ارتکاب سے محفوظ رکھا ہے اور گناہ کے بعد سے مراد اس کا اثر ہوگا یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں گناہ کے اثرات یعنی ظلمت و تاریکی سے بھی محفوظ رکھا ہے۔

یہ توجیہ اس اعتبار سے بھی بہتر ہوگی کہ گناہ کا ارتکاب اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ظلمت سے پہلے ہوتا ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) شیخ تلمسانی نے "مغفرت ذنب" کی وضاحت تو کر دی لیکن "فتح مبین" کی تشریح نہیں کی جو مسئلے کی اصل روح ہے۔ شیخ تلمسانی نے "فتح مبین" سے مراد تقدیر لی ہے لیکن اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ تقدیر میں کیا چیز طے کی گئی ہے جس کے نتیجے میں بعد میں آنے والی نعمت نصیب ہوئی ہے؟ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) امام جلال الدین سیوطی نے بھی اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس میں اس آیت کی تفسیر کے بارے میں علماء کے تمام اقوال نقل کر دیئے ہیں۔ اس کے علاوہ شیخ ابو یحییٰ تلمسانی نے بھی اس موضوع پر ایک رسالہ لکھا ہے۔ شیخ ابو العباس سوڈانی نے ان دونوں رسالوں کے مواد کو ایک جگہ اکٹھا کر کے ایک مستقل کتاب کی شکل میں ترتیب دیدیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان حضرات کے علوم سے فیض حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

علوم خمسہ اور کراماتِ اولیاء

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا۔ (الجن ۷۲:۲۶)

"اللہ تعالیٰ غیب کا علم رکھتا ہے اور اس غیب کو کسی کے سامنے ظاہر نہیں کرتا۔"

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ (لقمان ۳۱:۳۴)

"بے شک قیامت کا علم اللہ کو ہے"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

خَمْسٍ لَا يَعْلَمُهُنَّ اِلَّا اللّٰهَ۔ (صحیح بخاری ۱:۲۷، رقم الحدیث: ۵۰)

''پانچ چیزوں کا علم اللہ کے سوا اور کسی کو نہیں ہے۔''

ان آیات اور حدیث مبارکہ کے درمیان کس طرح تطبیق دی جائے گی نیز اولیاء کرام نے اپنے کشف کے ذریعے جو بہت سی غیب کی خبریں دی ہیں جن میں سے بیشتر ''رحم'' سے متعلق ہیں' ان کی کیا توجیہہ ہو گی؟ کیونکہ ''رحم مادر'' میں کیا ہے؟ اس کی اطلاع دینے کے بارے میں اولیاء کرام کی بہت سی کرامات منقول ہیں۔

سیّدی دَباغ نے جواب دیا: قرآن کی آیت اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارکہ میں جو حصر بیان کیا گیا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ کاہنوں کو غیب کا علم حاصل نہیں ہوتا۔ کاہنوں کا ذکر بطور خاص اس لئے کیا گیا ہے کیونکہ عرب ان کے بارے میں گمان رکھتے تھے کہ شاید انہیں غیب کا علم حاصل ہوتا ہے۔ اسی لئے عرب اپنے اختلافی مسائل میں کاہنوں کو ثالث مقرر کرتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس باطل عقیدے کی تردید کے لئے یہ اور اس جیسی دیگر آیات نازل فرمائیں اور اس کے علاوہ جنات کی حرکات کو محدود کر کے عملی طور پر کاہنوں کی فریب کاری کا پردہ چاک کیا گیا جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ مخلوق کو باطل سے ہٹا کر حق کی طرف راغب کیا جا سکے۔ لیکن اولیاء کرام کا تعلق کیونکہ حق کے ساتھ ہوتا ہے اس لئے انہیں اس آیت کا مصداق قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اور یہ حضرات آیت میں موجود ''حصر'' کے حکم میں داخل نہیں ہوں گے۔ سیّدی دباغ فرماتے ہیں: اس نوعیت کی آیات بظاہر عام ہوتی ہیں لیکن ان کے ذریعے مخصوص حکم مراد لیا جاتا ہے لہٰذا کوئی بھی صاحب کشف کسی آیت کو سن کر کشفی طور پر اس بات کا اندازہ لگا لیتا ہے کہ اس آیت کے مصداق میں کون کون سے افراد داخل ہیں نیز کون کون سے افراد اس کے حکم میں شامل نہیں ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے سے یہ بات معلوم ہوتی تھی کہ آیت کے حکم کا مصداق کون لوگ ہیں کیونکہ آیت کی تلاوت سے پہلے ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی مراد سے واقف ہو جایا کرتے تھے۔

ایک بنیادی اصول

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) اس تشریح میں سیّدی عبدالعزیز دباغ نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کلام اللہ میں موجود کسی بھی ''عام حکم'' کی دو قسمیں ہوں گی ایک وہ جس میں سے بعض افراد کو خاص کر لیا گیا ہے اور دوسرا وہ جس میں سے کسی ایک فرد کو بھی خاص نہ کیا گیا ہو۔ سیّدی دباغ نے ان اصطلاحات کا باقاعدہ علم حاصل نہیں کیا تھا لیکن آپ اس کے معنی کی معرفت کے باعث اس مفہوم سے واقف ہو گئے چنانچہ علم مناظرہ یا علم اصول کا بڑے سے بڑا ماہر بھی کسی بھی موضوع پر آپ کے ساتھ مناظرہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا کیونکہ آپ اشیاء کے معانی سے بخوبی واقف ہیں۔ میں اکثر سیّدی دباغ کی خدمت میں عرض کیا کرتا تھا۔ علماء ظاہر نے جتنی آپ کے ساتھ زیادتی کی ہے اتنی کسی اور کے ساتھ نہیں کی اگر وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آپ سے استفادہ کرتے تو ان کی معلومات میں بہت زیادہ اضافہ ہوتا۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میرے پاس سیّد ابوالمظفر الاسفرائینی کی کتاب ''التبصیر'' موجود تھی جس میں انہوں نے 72 فرقوں کے عقائد و نظریات پر بحث کی ہے۔

سیّدی دباغ اکثر مجھے کہا کرتے تھے: کسی بھی بدمذہب کا کوئی بھی شبہ پیش کرو میں تمہیں اس کا جواب دوں گا اور پھر میں نے جب کبھی کوئی سوال آپ کی خدمت میں پیش کیا آپ نے فوراً اس کا وافی و شافی جواب عنایت کیا جب سیّدی دباغ پر مرض الموت طاری ہوا تو اس بیماری کے دوران میں نے آپ کے ساتھ برہان قطع اور برہانِ تطبیق کے موضوع پر گفتگو کی تو آپ نے اس موضوع پر بہت سے ایسے نادر نکات بیان کیے جن سے اکابر ''علماء کلام'' بھی ناواقف ہوں گے۔ اس کے بعد سیّدی دباغ نے مجھے عارف باللہ صوفیاء کے نظریہ توحید کی تعلیم دی اور فرمایا: توحید کے بارے میں صحابہ کرام کا بھی یہی عقیدہ تھا۔ اس کے بعد میں نے سیّدی دباغ سے سوال کیا، اگر لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ توحید کا صحیح عقیدہ یہی ہے تو امت 73 فرقوں میں کیوں تقسیم ہوئی؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی وفات کے وقت اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ آپ لوگوں کی رہنمائی کے لئے ایک تحریر لکھ دیں تا کہ بعد میں کوئی گمراہ نہ ہو سکے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے سیّدی دباغ سے دریافت کیا: (سورۂ جن کی) آیت میں علم غیب کو رسول کے ساتھ خاص کیا گیا ہے لہٰذا ولی اس آیت کے حکم میں شامل نہیں ہوں گے اور اعتراض باقی رہے گا؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا: اس آیت کے حکم سے وہ لوگ خارج ہوں گے جو رسول کے ساتھ شامل نہیں ہو سکتے لیکن کیونکہ اولیاء کرام، انبیاء کرام کی پیروی کے باعث ان کے حکم میں شامل ہوں گے اس لئے وہ آیت کے مفہوم کے مصداق سے خارج نہیں ہوں گے۔ (سیّدی دباغ فرماتے ہیں:) اس کی مثال ہم یوں بیان کریں گے جیسے ایک بڑا زمیندار اپنی زرعی پیداوار کا جائزہ لینے کے لئے جاتا ہے تو اس کے مصاحبین بھی اس کے ہمراہ موجود ہوتے ہیں۔ مزارعین جو معلومات زمیندار کو دیں گے ان معلومات سے اس کے مصاحبین بھی آگاہ ہو جائیں گے۔ بالکل اسی طرح ہر نبی کے مصاحبین ہوتے ہیں جنہیں نبی کے علوم میں سے بعض علوم نصیب ہوتے ہیں۔

علوم خمسہ اور علم نبوی

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے عرض کی: محدثین اور دیگر علماء کے درمیان اس بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ (سورۂ لقمان کی) آخری آیت میں موجود پانچ امور کا علم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے یا نہیں ہے؟ آیت درج ذیل ہے:

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ

''بے شک قیامت کے معین وقت کا علم اللہ کو ہے بارش کے نزول کے معین وقت کا علم اللہ کو ہے ماں کے پیٹ میں (بیٹے یا بیٹی کی موجودگی کا) علم اللہ کو ہے، کوئی شخص یہ نہیں جان سکتا کہ کل کیا ہوگا۔ کوئی شخص یہ نہیں جان سکتا کہ وہ کہاں مرے گا، بے شک اللہ تعالیٰ ہی (ہر چیز کے بارے میں) جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے۔'' (لقمان ۳۱:۳۴)

سیّدی دباغ نے جواب دیا: یہ پانچ امور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیسے مخفی رہ سکتے ہیں جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا ایک عام صاحب تصرف ولی ان پانچوں امور کی معرفت کے بغیر کوئی تصرف نہیں کرسکتا۔

شبِ قدر اور علم نبوی

(احمد بن مبارک کہتے ہیں:) میں نے دریافت کیا: علماء کرام اس بات کے بھی قائل ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو لیلۃ القدر کا معین علم عطا نہیں کیا گیا؟ کیونکہ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

اصلبوها في التاسعة في السابعة في الخامسة

''اسے 9 ویں، 7 ویں اور 5 ویں رات میں تلاش کرو''

اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شب قدر کا معین علم ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کو اس سے آگاہ کر دیتے۔ (یہ سوال سن کر سیّدی دباغ نے) ناراضگی کے عالم میں ارشاد فرمایا: سبحان اللہ! اگر لیلۃ القدر اس وقت آئے جب مجھے موت آ چکی ہو میری لاش مردار کی طرح پھول چکی ہو اور کسی مردار گدھے کی مانند میری ٹانگیں ہوا میں بلند ہوں اس وقت بھی مجھے لیلۃ القدر کے وجود کا علم ہو جائے گا تو سیّد عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا علم کیسے مخفی رہ جائے گا؟ اس کے بعد سیّدی دباغ نے (سورۃ لقمان کی) آخری آیت میں موجود پانچ امور کی معرفت اور لیلۃ القدر کی معرفت میں ایسے اسرار بیان کئے جو کہ آپ جیسا ولی کامل ہی بیان کرسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں یہ توفیق دے کہ ہم ان میں سے بعض معارف کا تذکرہ اس کتاب میں درج کریں۔ خود سیّدی دباغ نے کئی مرتبہ لیلۃ القدر کا تعین فرمایا کبھی رجب کے مہینے میں کبھی شعبان کے آخر میں، کبھی رمضان کے آخر میں اور کبھی عیدالفطر کی رات میں۔ آپ اس رات کے آنے سے پہلے ہی ہمیں اس سے آگاہ کر دیا کرتے تھے اور ہمیں اس رات کی حفاظت کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ یہ رات منتقل ہوتی رہتی ہے۔ اسی طرح آپ (دعا کی قبولیت کے لئے) جمعہ کے دن کی مخصوص ساعت کی بھی تعیین فرما دیا کرتے تھے اور یہ بھی فرماتے تھے کہ جمعہ کی یہ ساعت منتقل ہوتی رہتی ہے۔ شاید ہم اس بارے میں آپ کے بعض ملفوظات آئندہ صفحات میں نقل کریں گے۔

قرآن کی آیات کی تفسیر کے حوالے سے حضرت کے ملفوظات کو ہم یہیں ختم کرتے ہیں اگرچہ بعض آیات کی تفسیر سے متعلق حضرت کے کچھ فرمودات ابھی باقی ہیں جن میں سے بعض ہم آئندہ صفحات میں نقل کریں گے اور بعض فرمودات کیونکہ ہماری سمجھ میں نہیں آ سکے اس لئے ہم نے انہیں یہاں نقل نہیں کیا۔ بعض آیات کی تفسیر میں معرفت کے ایسے نکات پوشیدہ تھے جنہیں تحریر نہیں کیا جا سکتا تاہم اللہ تعالیٰ ہماری اس کوشش کو خلوص کی نعمت عطا فرمائے اور اسے اپنی رضا کے حصول کا ذریعہ بنائے اور سیّدی دباغ کے وسیلے اور برکت سے ان ملفوظات کے مرتب، قارئین اور کسی بھی حوالے سے کوئی بھی خدمت کرنے والے شخص کو ان کے ذریعے نفع عطا فرمائے اور ہمیں دونوں جہانوں میں سیّدی دباغ کے محبین کی صف میں شامل فرمائے۔

تیسراباب

انسان کی ذات اور اعمال میں داخل ہو جانیوالی ظلمتوں کا بیان

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ ایک مرتبہ میرے شیخ حضرت عمر بن محمد الہواری رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے اپنی زرعی اراضی کی طرف بھیجا جہاں مختلف مزارعین کام کرتے تھے۔ میری ذمہ داری ان کی نگرانی کرنا تھا۔ ظہر کی نماز کے وقت شیخ الہواری خود بھی وہاں تشریف لے آئے اور پھر ہم نے ایک ساتھ نماز ادا کی۔ مزارعین کے کام کاج سے فارغ ہونے تک آپ وہیں موجود رہے۔ جب مزارعین اپنے کام سے فارغ ہونے کے بعد اجرت لے کر واپس چلے گئے تو میں نے آپ کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں ناراضگی کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ میں خوف زدہ ہو گیا آپ نے مجھ سے دریافت کیا۔ کیا تم نے کچھ دیکھا ہے؟ میں نے عرض کی میں نے کچھ نہیں دیکھا آپ کون سی چیز؟ (کے بارے میں پوچھ رہے ہیں) آپ نے فرمایا۔ غور کرو! شاید تم نے کچھ دیکھا ہو۔ میں نے عرض کی' کیا دیکھا ہو؟ آپ نے فرمایا تم نے ان مزارعین کو محنت کرتے دیکھا؟ میں نے عرض کی میں نے انہیں دیکھا ہے کہ آپ کے آنے سے پہلے نہایت سست روی سے کام کر رہے تھے لیکن جیسے ہی آپ تشریف لئے اور انہوں نے آپ کو دیکھا تو یہ اپنی ہمت سے زیادہ کام کرنے لگے۔ آپ نے مجھ سے فرمایا آج تم نے فاسقوں اور محروم لوگوں کا کام دیکھا ہے۔

فاسق کون ہے؟

فاسق وہ لوگ ہیں جو ظاہری طور پر عبادت کرتے ہیں لیکن یہ عبادت بغیر کسی نیت اور ارادے کے ان سے صادر ہو جاتی ہے۔ یہ ان کی عادت کا حصہ ہوتی ہے اس لئے اطاعت کے دوران ان کی حرکات وسکنات عادت کی بدولت صادر ہوتے ہیں جو ان کی طبیعت کے موافق ہوتی ہے۔ اس کے پس پردہ ان کی کوئی غرض نہیں ہوتی۔ خواہ وہ غرض صحیح ہو یا فاسد' ان کی عبادت اللہ تعالیٰ یا غیر اللہ کسی کے لئے بھی نہیں ہوتی کیونکہ یہ کام وہ صرف عادت سے مجبور ہو کر کرتے ہیں جیسے اگر کسی شخص کو بھوک یا پیاس نہ لگی ہو تو وہ کچھ کھانا پینا پسند نہیں کرتا اور اسے کھانے کی طلب بھی محسوس نہیں ہوتی لیکن اگر اسی وقت وہ چند دوسرے لوگوں کے ہمراہ باغ میں چلا جائے اور وہ دوسرے لوگ کچھ کھاتے ہوئے حرکت کر رہے ہوں (یعنی چل پھر رہے ہوں) تو یہ شخص بھی ان کے ساتھ حرکت

کرنے لگے گا۔ دوسرے لوگ اپنے ذاتی فائدے کے لئے حرکت کر رہے ہیں لیکن یہ کھانے کے لئے حرکت نہیں کر رہا کیونکہ اسے کھانے کی طلب نہیں ہے اور نہ ہی یہ اپنے ساتھیوں کی مدد کے خیال سے چل پھر رہا ہے یہ تو صرف دوسروں کے ساتھ ان کی دیکھا دیکھی اپنی طبیعت کے ہاتھوں مجبور ہو کر حرکت میں مصروف ہے۔ فاسق لوگوں کے عمل کی مثال بھی بالکل ایسی ہی ہے۔

محروم کون ہے؟

اسی طرح کچھ لوگ محروم ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے ذاتی فائدہ اور مقصد کے حصول کے لئے کوئی کام کرتے ہیں۔ اللہ کی رضا کا حصول ان کے پیش نظر نہیں ہوتا۔ نتیجتاً یہ لوگ اللہ سے دور ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے اعمال انسان کی ذات کی حقیقت کے سرّ کی ضد ہیں کیونکہ انسان کی ذات کی حقیقت کا سرّ یہ ہے کہ انسان اللہ کی مخلوق ہے۔ ہر عمل میں مشیت الٰہی کا پابند ہے بلکہ اس کی حیثیت بارگاہ خداوندی میں ایک غلام کی سی ہے۔ اس کی نسبت صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے اور اللہ کے علاوہ اور کسی کے ساتھ اس کی کوئی نسبت نہیں ہے۔ اگر انسان اس سرّ سے آگاہ ہو کر کوئی عمل سرانجام دے گا تو اس کا یہ عمل مکمل طور پر اللہ کی رضا کے حصول کے لئے ہوگا اور ایسی حالت میں وہ زبان حال سے اس بات کا اقرار کر رہا ہوگا کہ میرا کوئی عمل میری کسی ذاتی کوشش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ سب اللہ کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ ایسی صورت میں انسان سے صادر ہونے والے اعمال انسان کی ذات کی حقیقت کے راز کے عین مطابق ہونگے۔ اس کے برعکس اگر وہ یہ کہے کہ میری ذات اللہ کے لئے ہے۔ البتہ میرے اعمال میری اپنی خوبی کا نتیجہ ہیں اور وہ ان اعمال کے لئے اپنی ذاتی خواہشات کے حصول کی نیت کرے تو اب اس کا یہ عمل اس کی اپنی ذات کی حقیقت کے راز سے میل نہیں کھائے گا اور ایسا انسان کبھی بھی اللہ کے حقوق ادا نہیں کر سکے گا کیونکہ اس کا ہر عمل اللہ کی بجائے اس کے اپنے نفس کو خوش کرنے کے لئے ہوگا اور یوں ہر عمل کے نتیجے میں وہ اللہ کی بارگاہ سے دور ہوتا چلا جائے گا اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ توفیق سے محروم ہوتا چلا جائے گا۔

ترغیب والی احادیث کی توجیہہ

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے عرض کی بہت سی احادیث و روایات میں نیک عمل کی ادائیگی پر اجرو ثواب کے حصول کی ترغیب دی گئی ہے۔ سیّدی عمر الہواری کا فرمان درست ہوتا تو کوئی بھی آیت اور حدیث اجرو ثواب کی ترغیب کے ہمراہ وارد نہ ہوتی کیونکہ اس صورت میں اللہ تعالیٰ سے لاتعلقی کا پہلو پایا جاتا ہے۔

آپ نے جواب دیا۔ اس نوعیت کی آیات واحادیث کے ذریعے ہم پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کہیں بھی یہ بات ارشاد نہیں فرمائی کہ تم اپنے نفس کو خوش کرنے کے لئے کوئی عمل کرو تو میں تمہیں اس کا اجروثواب عطا کروں گا بلکہ اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ پورے خلوص کے ساتھ صرف میری عبادت کرو تو

میں تمہیں اجر وثواب عطا کروں گا لہٰذا اپنے اعمال کے بارے میں ہماری نیت یہ ہونی چاہئے کہ یہ تمام اعمال اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں اور انہیں بجالانے کا مقصد اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر بے شمار انعام و اکرام کیے ہیں اور آگے چل کر بھی محض اپنے فضل وکرم کی بدولت ہمیں اجر وثواب عطا کرے گا۔ ان آیات واحادیث کے ذریعے ہم پر اس وقت اعتراض وارد ہوسکتا تھا جبکہ ان میں یہ بات ذکر کی گئی ہوتی کہ اخلاص کے باوجود کسی عمل کا اجر نہیں ملے گا (آپ خود غور کریں) وہ شخص کتنا بڑا جاہل ہوگا جو اس غلط فہمی کا شکار ہو کہ وہ نیکیاں خود سرانجام دیتا ہے اور اپنی ذاتی محنت کی وجہ سے اجر وثواب حاصل کرے گا جبکہ وہ یہ بات بخوبی جانتا ہے کہ اس کے اعمال میں اس کی اپنی ذات کا کوئی دخل نہیں ہے کیونکہ اس کی اپنی ذات اللہ تعالیٰ کی تخلیق کردہ ہے اور اس کے اعمال بھی اللہ کی مخلوق ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم اللہ کے پیدا کردہ اعمال میں سے نیکیوں کو اپنے کھاتے میں شامل کرلیں اور اللہ کے فضل وکرم کی طرف توجہ ہی نہ کریں۔ (اصل بات یہ ہے) اللہ کی ذات سے غفلت ہماری آنکھوں کو اندھا کردیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے۔

ایک عابد کا قصہ

سیّدی عبدالعزیز دباغ رحمۃ اللہ علیہ نے مزید ارشاد فرمایا۔ ایک عبادت گزار شخص ایک ذاتی مقصد کے حصول کی خاطر بیس برس تک اللہ کی عبادت کرتا رہا۔ وہ نہایت عاجزی کے ساتھ دعائیں مانگا کرتا تھا لیکن اس کے باوجود اس کا مقصد حاصل نہیں ہوتا تھا۔ اس پر اس کی پریشانی میں مزید اضافہ ہوجاتا تھا۔ آخر وہ حیران و پریشان ہو کر یہ سوچنے لگا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ مسلسل بیس برس تک مانگنے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے میرا مقصد حل نہیں فرمایا اور اتنی طویل عبادت کے باوجود مجھ پر مہربانی نہیں فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر رحمت فرمائی اور اسی وقت اسے اس کے نفس اور اس کے اعمال کی حقیقت کی معرفت عطا فرمائی تو اس شخص نے یہ اعتراف کیا کہ میں بہت بڑا احمق ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہی مجھے اور میرے اعمال کو پیدا فرمایا ہے اسی نے مجھے صحت عطا کی ہے۔ عبادت کے لئے یہ مکان عطا فرمایا۔ وضو کے لئے پانی پیدا کیا ہے۔ وہ کپڑا پیدا کیا ہے۔ جس کو ڈھانپ کر میں عبادت کرتا ہوں۔ اس وقت کو پیدا کیا ہے جس میں عبادت کرتا ہے ان سب میں میرا کیسا عمل دخل ہے جس کے نتیجے میں اللہ سے کسی اجر کا مطالبہ کروں۔ خدا کی قسم میں نے کوئی عمل نہیں کیا کوئی عمل نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس میں نے اللہ کے افعال کو اپنی ذات کی طرف منسوب کرنے کی جسارت کی ہے اور میں اللہ سے اس کا اجر اور بدلہ مانگتا رہا ہوں۔ یہاں تک کہ میں نے یہ تک کہنا شروع کردیا تھا کہ میں اس کے دروازے پر بیس برس تک کھڑا رہا اور اس نے مجھے کچھ بھی عطا نہ کیا۔ اے میرے رب میں تیری بارگاہ میں توبہ کرتا ہوں اور پھر وہ بار بار توبہ کے الفاظ دہرانے لگا جب اس نے اللہ کی بارگاہ میں سچی توبہ کی تو اللہ نے اس کی تمام آرزوئیں پوری کردیں اور اسے وہ معرفت عطا کی جس کی ہم سر اور کوئی نعمت نہیں ہے یہاں تک کہ جنت بھی اس کی برابری نہیں کرسکتی۔ میں نے عرض کی امام جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب ''البدور السافرہ'' میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث

نقل کی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

کان فیمن قبلکم رجل کان یعبد اللّٰہ سبحانہ ستمائۃ فی جزیرۃ من البحر واعطاہ اللّٰہ فیھا عینا عذبۃ وانبت لہ شجرۃ من الرمان تثمرلہ کل یوم رمانہ یاکلھا و تکفیہ فی القوت فبقی علی عبادۃ ربہ المدۃ السابقۃ ولا حصل لہ فتور ولا ملل' فلمامات قال لہ ربہ عزوجل ادخل الجنۃ برحمتی و فضلی فقال یارب بل بعملی و عبادتی لک ستمائۃ سنتہ فناشہ اللّٰہ تعالٰی الحساب ' فقال لہ عزوجل' عبادتک ھذا ارلمدۃ لا یقوم بشکر نعمۃ واحدۃ من النعم التی النعمت بھا علیک فانی اخرجت لک عینا عذبہ وسط البحر المالح فبای حیلۃ استوجبت علی ھذہ النعمۃ ؟ وانبت لک شجرہ تثمر لک کل یوم وانماتثمر لغیرک مرۃ فی السنہ۔ فبای حیلۃ استوجبت علی ذلک ؟ واطلت عمرک ھذہ المدۃ الطویلۃ وانھا یعیش غیرک انقص من ذلک و قویتک علی العبادہ ھذہ المدۃ وغیرک لا یقوی علیھا۔ وطردت عنک الشیطان وسلمتک منہ و کم اھلک من الناس غیرک واعطیتک الصحہ فی ھذہ المدۃ الطویلۃ ولم اعطھا لخیرک وخلقت ذاتک و لم تک شیئا' وخلقت حرکاتک و سکناتک واتمت علیک نعمتی ادخلوہ جھنم فانطلقت بہ الملائکۃ الی جھنم فلمارای ھلک فقال یارب ادخلنی الجنۃ برحمتک و فضلک ' فقال اللّٰہ تعالٰی وھوارحم الرحمین و اکرم الاکرمین ردوہ وادخلوہ الجنۃ برحمتی قال اللّٰہ تعالٰی ادخل الجنۃ برحمتی فنعم العبدکنت بی

(البدور السافرہ از علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ)

''پرانے زمانے میں ایک شخص نے 600 برس تک اللہ تعالٰی کی عبادت کی۔ وہ شخص سمندر کے درمیان ایک جزیرے میں تنہا رہتا تھا۔ وہاں اللہ تعالٰی نے اس کے لیے میٹھے پانی کا ایک چشمہ جاری کر دیا تھا۔ اس طرح وہاں انار کا ایک درخت اگایا تھا۔ جس پر روزانہ ایک انار اگا کرتا تھا۔ جسے وہ شخص کھا لیتا تھا اور وہ ایک ہی انار اس کی ایک دن کی خوراک کے لئے کافی ہوتا تھا۔ وہ شخص کسی اکتاہٹ اور کاہلی کے بغیر مسلسل 600 برس تک اللہ تعالٰی کی عبادت میں مشغول رہنے کے بعد انتقال کر گیا۔ جب (اس کی روح) بارگاہ رب العزت میں حاضر ہوئی تو اللہ تعالٰی نے اسے فرمایا۔ میری رحمت اور فضل کے نتیجے میں جنت میں داخل ہو جا اس نے عرض کی۔ اے میرے پروردگار! میں 600 برس پر مشتمل اپنے عمل اور عبادت کی بدولت جنت میں داخلے کا مستحق قرار پاتا ہوں۔ اللہ تعالٰی نے اس سے حساب لینا شروع کر دیا اور اس سے فرمایا۔ تیری یہ تمام عبادت میری عطا کردہ ایک

نعمت کا بدلہ بھی نہیں ہو سکتی۔ میں نے کھاری پانی والے سمندر کے بیچ میں تیرے لئے میٹھے پانی کا چشمہ جاری کیا۔ میری یہ نعمت تیری کسی خوبی کا نتیجہ تھی؟

میں نے تیرے لیے ایک درخت پیدا کیا جو روزانہ پھل دیتا تھا۔ حالانکہ اس کے جیسے دیگر درخت سال بھر میں صرف ایک مرتبہ پھل دیتے تھے۔ مجھے بتا کس نیکی کے عوض میں تو اس نعمت کا حقدار قرار پاتا ہے؟

میں نے تجھے طویل عمر عطا کی حالانکہ دوسرے لوگوں کی زندگی بہت مختصر ہوتی ہے اور پھر اس تمام عرصے کے دوران میں نے تجھے عبادت کرنے کی طاقت عطا کی حالانکہ دوسرے لوگ اس سے بہت کم عبادت کر پاتے ہیں۔ اس تمام عرصے کے دوران میں نے تجھے شیطان کے شر سے محفوظ رکھا حالانکہ اس نے دوسرے بہت سے لوگوں کو تباہ و برباد کیا ہے۔

اتنے طویل عرصے تک میں نے تجھے صحت عطا کی حالانکہ دیگر بہت سے لوگ اس نعمت سے محروم رہتے ہیں۔

میں نے تمہیں پیدا کیا حالانکہ اس سے پہلے تو کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے ہی تیری تمام حرکات و سکنات کو پیدا کیا اور تمہیں ہر طرح کی نعمتیں عطا کی تھیں۔

(پھر فرشتوں کو حکم دیا جائے گا) اس شخص کو جہنم میں ڈال دو۔ جب فرشتے اسے جہنم کی طرف لے جانے لگیں گے اور اس کے سامنے واضح ہو جائے گا کہ اس کی ہلاکت قریب ہے تو وہ کہے گا۔

اے میرے پروردگار! اپنے فضل کرم کی بدولت مجھے جنت میں داخل فرما دے۔

پس اللہ تعالیٰ جو سب سے زیادہ کرم اور رحم فرمانے والا ہے' حکم دے گا اسے واپس لاؤ اور میری رحمت کے وسیلے سے اسے جنت میں داخل کرو۔ پھر اللہ تعالیٰ اس شخص کو حکم دے گا میری رحمت کے وسیلے سے جنت میں داخل ہو جاؤ۔ تم میرے اچھے بندے تھے"

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) حدیث کا مفہوم کچھ اس نوعیت کا ہے اور مجھے بہت عرصہ پہلے اسے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔

محروم اور فاسق کی عبادت میں فرق

(احمد بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں) میں نے حضرت سیّدی عبدالعزیز دباغ رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا۔ محروم اور فاسق میں سے کس کی عبادت زیادہ قبیح ہے؟

آپ نے ارشاد فرمایا' محروم لوگوں کی عبادت ایک لحاظ سے افضل اور بہتر ہے اور وہ یوں کہ اللہ تعالیٰ بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ جب وہ اپنے کسی بندے کو اس حال میں دیکھتا ہے کہ اس کا بندہ ایک طویل عرصے تک اپنی ذاتی غرض کی تکمیل کے لئے اس کی عبادت میں مشغول رہا ہے تو وہ اپنے اس بندے پر خاص فضل کرتے ہوئے اس بندے کو اس کی ذات اور اعمال کی حقیقت سے روشناس کروا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ بندہ اللہ کی بارگاہ میں توبہ کر کے خالصتاً اللہ کے لیے عبادت کرنا شروع کر دیتا ہے جیسے بہت سے لوگوں کے بارے

میں اس طرح کے واقعات منقول ہیں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے عرض کی کیا اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کے تحت ان لوگوں کو اس عبادت کا اجر و ثواب بھی عطا فرمائے گا؟ (جو انہوں نے اپنے ذاتی مقاصد کے حصول کے لئے کی تھی) کیونکہ جس لطف و کرم کی بدولت انسان کو حقیقت حال سے متعارف کروایا جا سکتا ہے اسی لطف و کرم کی وجہ سے انسان کو اجر و ثواب بھی عطا کیا جا سکتا ہے؟

آپ نے فرمایا۔ اگر تو تمہارے سوال کا مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ تمہیں (یعنی محروم لوگوں کو) حقیقت حال سے واقف کر دے گا اور اس کے بعد وہ لوگ جو عبادت کریں گے۔ اس عبادت کا اجر و ثواب انہیں دیا جائے گا تو ایسا ہی ہوگا لیکن اگر اس سے مراد یہ ہے کہ جس وقت وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے منقطع ہو چکے ہوں اور اپنے اعمال کو اپنی ذاتی کاوش قرار دے کر یہ سمجھیں کہ ان اعمال کا اجر دینا اللہ پر لازم ہے تو ایسی صورت میں انہیں کوئی اجر و ثواب عطا نہیں کیا جائے گا۔

حدیث پر اعتقاد کے باعث عمل کا حکم

(احمد بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں) میں نے عرض کی بالفرض اگر کوئی شخص کسی حدیث میں یہ بات پڑھتا ہے کہ فلاں عمل انجام دینے کی صورت میں فلاں اجر ملے گا یا فلاں عمل سے باز رہنے کی صورت میں فلاں ثواب حاصل ہوگا؟ اور وہ شخص اس بات پر پختہ یقین رکھتا ہو کہ اس کا کوئی عمل اللہ تعالیٰ کی رضا کے بغیر صادر نہیں ہو سکتا اور پھر وہ اس حدیث کو سننے کے فوراً بعد اس پر عمل شروع کر دے تاکہ اس اجر و ثواب کو حاصل کر سکے۔ (تو ایسے شخص کے بارے میں کیا حکم ہوگا) آپ نے فرمایا اگر تو وہ اللہ کے حکم کی پیروی کے ارادے سے وہ عمل کرتا ہے اور اجر و ثواب کے حصول کی نیت ثانوی حیثیت کی حامل ہے۔ یعنی اگر حدیث میں اس عمل کے ثواب کا تذکرہ موجود نہ ہوتا تو وہ پھر بھی اس عمل کو سرانجام دیتا تو ایسے شخص کو کوئی نقصان نہیں ہوگا لیکن اگر اس کی اصل نیت صرف اجر کا حصول تھی اور حکم کی پیروی ثانوی حیثیت رکھتی تھی یعنی اگر اس روایت میں اجر و ثواب کا ذکر نہ ہوتا تو وہ اس پر عمل بھی نہ کرتا۔ یہی شخص ہمارا موضوع گفتگو ہے اور ہم اسی کی مذمت بیان کریں گے کیونکہ یہ دنیا و آخرت میں خسارے کا شکار ہوگا لیکن اگر اس کی نیت (حکم کی پابندی اور اجر و ثواب کے حصول) دونوں پر یکساں تھی تو ایسے شخص کو اجر و ثواب عطا کیا جائے گا۔ بشرطیکہ دو باتیں اس کے پیش نظر ہوں۔

ایک یہ کہ جو عمل وہ کرنے لگا ہے وہ ایک نیکی کا کام ہے اور اس کی انجام دہی کی صورت میں مخصوص ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے عامل کو مزید کسی نصیحت کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسری یہ بات پیش نظر رکھے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا ہے اور اس کے اعمال کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ ان اعمال کی انجام دہی پر انعام و اکرام عطا کرنے کا وعدہ کیا ہے لیکن یہ اجر و ثواب صرف اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا نتیجہ ہے۔ وعدہ فرمانے کے باوجود اجر و ثواب عطا فرمانا' اللہ تعالیٰ پر لازم نہیں

ہے۔ اللہ تعالیٰ کو رحم کرنے یا عذاب دینے کا اختیار ہے لیکن اس کے باوجود جب اس نے اپنے ربّ کا حکم سنا تو اس پر عمل شروع کر دیا۔ اس امید کے ساتھ کہ پروردگار اسے اجر وثواب عطا فرمائے گا۔ جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس طرح کا عقیدہ رکھے گا تو اب اگر اس کے خیال میں اجر وثواب کا حصول بھی شامل ہو گیا تو اسے کوئی نقصان نہیں ہوگا اور اللہ تعالیٰ اس بندے کو اس کے اعمال کا اجر وثواب عطا فرمائے گا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے عرض کی۔ عبادت گزاروں کی اس قسم کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ امام غزالی نے اپنی تصنیف ''منہاج العابدین'' میں یہ رائے بیان کی ہے کہ ایسے لوگوں کو کسی قسم کا کوئی اجر وثواب نہیں ملے گا کیونکہ یہ شرک فی العمل کے مترادف ہے۔ جو ریاکاری کی ہی ایک شکل ہے جبکہ ریاکاری اعمال کو ضائع کر دیتی ہے البتہ شیخ ابوبکر بن العربی نے اپنی تصنیف ''سراج المریدین'' اور القرافی نے اپنی تصنیف ''القواعد والفروق'' میں یہ بات تحریر کی ہے کہ ایسے شخص کو اجر وثواب عطا کیا جائے گا۔ یہ تشریک ہونے کے باوجود مضر نہیں ہوگی کیونکہ یہ اس ریاء کی مانند نہیں ہے جو اعمال کو تباہ و برباد کر دیتی ہے۔ (آپ کی کیا رائے ہے؟)

حضرت عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا: شیخ ابن العربی اور القرافی کی رائے درست ہے (کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے)

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ

''بے شک اللہ تعالیٰ بھلائی کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا''

لہٰذا جب اس شخص کا عمل نیک نیتی اور اللہ ربّ العزت کی ذات پر خالص اعتقاد کے ساتھ صادر ہوگا تو دو طرح کے انوار کا مجموعہ ہوگا۔ ایک نیک نیتی اور دوسرا اللہ ربّ العزت کی ذات پر اعتقاد کامل اور یہ دونوں مجموعی طور پر عمل کے نور پر فوقیت رکھتے ہیں اس لیے ایسے شخص کے اجر سے محروم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تاہم جس شخص کے پیش نظر اجر نہ ہو وہ اس سے زیادہ کامل ہوگا اور ان دونوں سے بھی زیادہ کامل وہ شخص ہے جو کسی نیک عمل کے آغاز میں فقط نیت کرے اور پھر اس پر عمل سے لاتعلقی اختیار کرے۔ اس کو اپنے عمل کے صرف آغاز کے بارے میں علم ہو (انجام کے متعلق سوچے بھی نہیں) اس وقت ہم یہ کہہ سکیں گے کہ اس کا عمل خالصتاً اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اور مشاہدہ حق کی بدولت اس کی توجہ اپنے عمل کی طرف سے غافل ہوگئی۔ اب وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کے بارے میں غور میں مستغرق رہتا ہے (احمد بن مبارک کہتے ہیں) اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کی بدولت ہمیں بھی یہ مرتبہ عطا فرمائے۔

حضرت نے مزید ارشاد فرمایا: اسی مشاہدے کی بدولت اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوتی ہے جس کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیں اور جب بندہ خدا کا ہو جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ انعام و اکرام بندے کی بجائے خود اللہ تعالیٰ کی عظمت شان کے شایان شان

ہو۔اسی طرح مشاہدے سے محرومی کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی ذات سے غفلت پیدا ہوتی ہے اور انسان اپنی ذات کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔جس کے نتیجے میں (انسان کو ملنے والا اجر و ثواب) اللہ تعالیٰ کی عظمت شان کی بجائے خود بندے کی لیاقت کے مطابق ہوتا ہے۔

نیک نیتی سے درود پڑھنا

یہی وجہ ہے کہ ہم یہ بات دیکھتے ہیں کہ دو شخص بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں ہدیہ و درود پیش کرتے ہیں ان میں سے ایک کو زیادہ اجر و ثواب عطا کیا جاتا ہے اور دوسرا کم تر کا مستحق قرار پاتا ہے۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جس شخص کو کم اجر و ثواب عطا کیا گیا اس نے اپنے خیالات کی یورش میں بہتے ہوئے غفلت کے ساتھ درود پڑھا تھا۔گویا یہ درود اس نے محض عام عادت کے تحت پڑھا تھا اور نتیجتاً اسے کم اجر و ثواب ملا اس کے برعکس دوسرے نے پوری محبت و اخلاص کے ہمراہ درود پڑھا تھا۔

(اس کے بعد آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کے موضوع پر مزید اظہار خیال کرتے ہوئے ارشاد فرمایا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا بنیادی سبب یہ ہے کہ انسان کے دل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان اور رفعت مکان کا تصور جاگزیں ہو (انسان ہمیشہ یہ بات پیش نظر رکھے کہ) آپ کی ذات تمام موجودات کے وجود میں آنے کا وسیلہ ہے۔تمام انوار آپ ہی کے نور مبارک سے نکلتے ہیں۔آپ گزشتہ اور آئندہ سب لوگوں بلکہ تمام مخلوقات کے لئے رحمت ہیں۔جملہ مخلوق کو آپ ہی کے وسیلے سے اور آپ ہی کے ذریعے ہدایت نصیب ہوئی۔جب انسان اس عظمت شان کو پیش نظر رکھتے ہوئے درود پڑھے گا (تو بے شمار اجر و ثواب کا مستحق قرار دیا جائے گا)

جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کا تعلق ہے تو انسان کو ہمیشہ آپ کے عظیم مرتبے کا خیال پیش نظر رکھنا چاہئے کہ یہ عظیم مرتبہ کیا ہے؟ اور اس کا حامل کن خصوصیات کا مالک ہو سکتا ہے؟ (یہ بات بھی پیش نظر رکھے کہ) مخلوق میں سے کوئی ایک بھی آپ کی کسی ایک خصلت کا متحمل بھی نہیں ہو سکتا۔کیونکہ آپ کے کمالات تک رسائی انسانی فکر و عقل سے ماوراء ہے تو بھلا ان میں سے کسی ایک کمال کا حصول کیونکر ممکن ہو سکتا ہے؟ اگر کوئی شخص یہ جملہ نکات پیش نظر رکھ کر بارگاہ رسالت میں ہدیہ درود پیش کرتا ہے تو اس کا اجر و ثواب اللہ تعالیٰ کی شان اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ و مقام کے مطابق ہوگا جبکہ عام عادت کے تحت درود پڑھنے والے کو اپنے عمل کے مطابق اجر ملے گا۔(قرآن کہتا ہے)

وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا (تمہارا پروردگار کسی پر ظلم نہیں کرتا)

انسان اور خدا کے درمیان موجود عمل کا معاملہ بھی بالکل اس طرح ہے یعنی اگر عمل کا محرک جذبہ اللہ تعالیٰ کی عظمت شان کے آگے سر تسلیم خم کرنا ہوگا تو اجر و ثواب اللہ تعالیٰ کی عظمت کے مطابق ملے گا اور اگر عمل کے پس پردہ جذبہ ذاتی اغراض و مقاصد کا حصول ہوگا تو اجر بھی انسان کو اپنی حیثیت کے مطابق ملے گا۔

کیا درود سے نبی اکرم کو نفع حاصل ہوتا ہے؟

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا' کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے درود پڑھنے سے کوئی نفع حاصل ہوتا ہے؟ (یہ سوال میں اس لیے کر رہا ہوں کیونکہ) اس مسئلے میں علماء کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ہمیں درود پڑھنے کا اس لیے حکم نہیں دیا کہ اس کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی فائدہ ہوتا ہے بلکہ یہ حکم تو اللہ تعالیٰ نے خالصتاً ہمارے فائدے کے لئے دیا ہے (اس بات کی وضاحت میں ایک مثال کے ذریعے کرتا ہوں) مثال کے طور پر ایک شخص بہت سے غلاموں کا مالک ہے اور اپنے غلاموں پر مہربانی کرتے ہوئے اپنی زمین میں سے بہترین پیداوار والا حصہ ان غلاموں کو دیدے کہ وہ غلام اس حصے کی پیداوار سے فائدہ حاصل کریں البتہ اس زمین اور پیداوار کا اصل مالک وہی شخص رہے گا۔ بالکل یہی حال ہمارے درود کا بھی ہے کہ اس کا تمام تر اجر وثواب خالص ہمارے لیے ہی ہوتا ہے۔ تاہم اگر کبھی درود شریف کا نور مزید چمک کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نور مبارک سے مل جائے تو یہ سمجھنا چاہئے کہ کوئی چیز اپنی اصل سے جا ملی ہے وہ اس لیے کہ تمام اہل ایمان کو ان کے ایمان کی وجہ سے اجر وثواب حاصل ہوتا ہے جبکہ ان کا ایمان' نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا پرتو ہے اس لیے ہمیں ملنے والا تمام تر اجر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہی ہوگا۔ عالم محسوسات میں (ہم اس کی مثال یوں بیان کر سکتے ہیں) جیسے بارش کا پانی واپس سمندر میں چلا جائے کیونکہ بارش کا پانی' دراصل سمندری پانی ہی ہوتا ہے اس لیے جب وہ دوبارہ سمندر میں جا گرے گا تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کی بدولت سمندر کے پانی میں کسی قسم کا اضافہ ہوا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے عرض کی۔ بعض علماء اس بات کے قائل ہیں کہ ہماری طرف سے بھیجے جانے والے درود شریف سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نفع ہوتا ہے اور اس کی دلیل یہ بیان کرتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں جنت کی انواع واقسام کی نعمتیں پیش کی جائیں گی تو آپ ان سے لطف اندوز ہونگے۔ حور وغلمان کی خدمت سے لطف اندوز ہونگے۔ جس طرح انواع واقسام کی کھانے پینے کی نعمتیں ہاتھوں میں تھامے ہوئے برتنوں میں آپ کی خدمت میں پیش کی جائیں گی اور آپ ان سے لطف اندوز ہونگے بالکل اسی طرح منہ کے ذریعے یہ درود آپ کی خدمت اقدس میں پیش کیا جائے گا اور آپ اس کے انوار اور اجر سے محظوظ ہونگے۔ بادی النظر میں علماء کا یہ قیاس درست معلوم ہوتا ہے۔

حور وغلمان کا وجود نورِ محمدی کا مرہونِ منت ہے

(سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا تم نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی) کہ یہ حور وغلمان آئے کہاں سے ہیں؟ ان کا وجود نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا مرہون منت ہے کیونکہ ساری کائنات آپ ہی کے نور

مبارک سے پیدا ہوئی ہے۔ جن علماء کا تم ذکر کر رہے ہو ان کا قیاس اس وقت درست ہو سکتا تھا جبکہ حور و غلمان کا وجود یا ہمارا ایمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے مرہون منت نہ ہوتے۔

آپ نے مزید ارشاد فرمایا: جو شخص شان محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے واقف ہو جائے۔ وہ خوش نصیب ہوتا ہے۔ (پھر آپ نے اسی موضوع کے ایک دوسرے پہلو پر اظہار خیال کرتے ہوئے) ارشاد فرمایا بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہدیہ درود بھیجنے کی نیت سے "دلائل الخیرات" پڑھنا شروع کرتا ہے لیکن اس وقت وہ اس خیال میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس درود میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جس مقام محمود' وسیلہ اور درجہ رفیعہ کے لئے میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کر رہا ہوں۔ یہ سب میری دعا کے نتیجے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوگا اور یوں میری وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت نفع ہوگا۔ لہٰذا وہ جوش میں آ کر آواز بلند کر کے زیادہ شوق سے پڑھنے لگتا ہے۔ اسی وقت اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ درود اس کے دل کی آواز ہے اور اس پر رقت کی کیفیت طاری ہو گئی ہے اور پھر وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ شاید اس کیفیت سے عمدہ اور کوئی بھی کیفیت نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے۔

اس نیت کے ساتھ درود شریف پڑھنے کی وجہ سے اس شخص کو اللہ تعالیٰ کا قرب نصیب نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس کے فاسد گمان کے مطابق' اس کی کیفیت کا تعلق ایک باطل خیال کے ساتھ ہے۔ کسی بھی باطل شے کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ صرف حق کا تعلق ہوتا ہے اس لیے درود شریف پڑھنے والے کو چاہیے کہ اس باطل سوچ سے بچنے کی کوشش کرے کیونکہ بہت سے لوگ اپنی کم فہمی کی بدولت اس کیفیت کو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ رقت خیال کرنے لگ جاتے ہیں۔ زیادہ بہتر یہی ہے کہ انسان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان کا خیال سامنے رکھ کر ہدیہ درود پیش کرے تاکہ اس کے انوار سے فیضیاب ہو سکے۔ البتہ اگر کوئی شخص کسی ذاتی مقصد کے حصول کے لئے درود پڑھتا ہے تو ایسا شخص درحقیقت محجوب ہے اور اس کے اجر و ثواب میں بھی کمی آ جاتی ہے لیکن اگر کوئی درود پڑھتے ہوئے یہ نیت کرے کہ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی فائدہ ہوگا تو ایسا درود بارگاہ رب العزت میں قبول ہی نہیں ہوگا۔

ہر عمل کا مخصوص اجر اور نور ہوتا ہے

ہر عمل کا اجر اور ہر اجر کا نور ہوتا ہے اور یہ نور دنیاوی زندگی میں بھی انسان سے تعلق رکھتا ہے چنانچہ اگر کوئی عمل خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لئے کیا جائے گا تو اس عمل کے انوار' عمل کرنے والے کی شخصیت پر بھی ظاہر ہونگے اور عمل کرنے والا ان انوار کو محسوس بھی کرے گا۔ جو خشیت' لرزہ یا گریہ وزاری کی شکل میں ظاہر ہونگے اور اگر عمل کرنیوالا صاحب بصیرت ہوگا تو فوراً سمجھ جائے گا کہ اس کا عمل قبول ہو گیا ہے۔ اسی طرح اسے اجر کے بارے میں بھی علم ہو جائے گا۔ اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اجر کے بارے میں صرف آخرت میں پتہ چل سکتا ہے حالانکہ یہ کیفیت محجوب لوگوں کی ہے ورنہ اہل بصیرت کے سامنے ہر چیز روز روشن کی طرح عیاں ہوا کرتی

ہے لیکن اگر عمل کرنے والا اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کی بجائے کسی ذاتی مقصد کے حصول کے لئے کوئی نیکی کرتا ہے تو یہ نیکی بے نور ہوتی ہے اور عمل کرنے والے کو عمل کی مشقت اور محنت کی بجائے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے مزید ارشاد فرمایا: عمل کرنے والے کو عمل کرتے وقت اپنا جائزہ لینا چاہیے اگرچہ اس کا عمل کسی قدر معمولی ہی کیوں نہ ہو؟ کیونکہ ہر معمولی سی نیکی کا بھی کوئی نہ کوئی اجر ضرور ہوتا ہے اور اس اجر کا مخصوص نور ہوتا ہے جو نیکی کرنے والے شخص کے باطن پر ظاہر ہوتا ہے اور یہ اثر محسوس بھی کیا جا سکتا ہے (اس کو محسوس کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے) اگر کوئی نیکی کرتے وقت انسان کا دل دنیاوی خواہشات اور اللہ تعالیٰ سے منقطع کرنے والے امور سے معمور ہوگا۔ تو انسان کو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ اجر سے محروم ہوگا کیونکہ اجر سے محرومی کے باعث ہی اس کا دل غافل ہے۔ لیکن اگر عمل کرتے وقت انسان کا دل بارگاہ ربّ العزت کی طرف متوجہ ہو تو انسان کو سمجھ لینا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اسے اس عمل کا بہترین اجر عطا فرمائے گا۔

ایک مثال کے ذریعے وضاحت

(اس کی مثال ہم یوں بیان کر سکتے ہیں) ایک طالبعلم علم حاصل کرنے کے لئے ایک ملک سے دوسرے ملک تک سفر کرتا ہے۔ مگر اس کی نیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اس علم کے ذریعے دنیاوی مرتبہ و مقام حاصل کرے گا لوگ اس کے معتقد و مداح ہوں گے اور اسی طرح کی باطل اغراض اس کے پیش نظر ہوتی ہیں۔ برس ہا برس تک اسی منفی سوچ کے ہمراہ وہ علم حاصل کرتا رہتا ہے لیکن درحقیقت علم کے نور سے محروم رہتا ہے اور اس کا شمار ان لوگوں میں نہیں کیا جا سکتا۔ (جنہیں قرآن نے) والراسخین فی العلم (علم میں کمال حاصل کرنے والے) قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علم میں وہ شخص کمال حاصل کر سکتا ہے جس کا باطن بھی علم کی طرف متوجہ ہو جبکہ مذکورہ بالا شخص کا باطن دنیاوی اغراض و مقاصد کے حصول کی طرف متوجہ تھا۔ صرف اس کا ظاہر علم کے حصول کے لئے کوشش کر رہا تھا جب کہ علم کا تعلق اسرار سے ہے اور محض ظاہر اسرار کے حصول کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ بالکل اسی طرح جو اعمال اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لئے نہیں کیے جاتے ان کا اجر بھی حاصل نہیں ہوتا کیونکہ اجر اسرارِ خداوندی میں سے ایک سر ہے اور باطن کی مدد کے بغیر محض ظاہر اس سر کو حاصل نہیں کر سکتا۔

اولیاء سے استمداد کی وجہ

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے عرض کی عام طور پر لوگ اللہ تعالیٰ کا نام لینے کی بجائے اولیاء کرام کا نام لے کر استمداد کرتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ مثال کے طور پر ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ اگر کسی شخص سے کوئی قسم کھانا ہو تو وہ کہتا ہے۔ مجھے حضرت عبدالقادر گیلانی کی قسم یا حضرت ابوالعباس سبتی کی قسم اسی طرح اگر کسی نے دوسرے شخص سے قسم لینا ہو تو وہ قسم کو پختہ کرنے کے لئے یہی کہے گا کہ فلاں بزرگ کے نام کی قسم کھاؤ۔ اسی طرح اگر کوئی بھیک مانگ رہا ہو تو وہ دوسروں کے سامنے اللہ تعالیٰ کے نام کی بجائے کسی بزرگ کے نام کے وسیلے سے

دست سوال دراز کرتا ہے۔ اس طرح تو وہ اللہ تعالیٰ سے مکمل طور پر منقطع ہو جاتے ہونگے۔ اس کے برعکس اگر ان لوگوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کے نام کا وسیلہ پیش کیا جائے یا اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم اٹھانے کے لئے کیا جائے تو ان لوگوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا۔ ''دیوان الصالحین'' سے تعلق رکھنے والے اولیاء کرام نے جب یہ دیکھا کہ اکثر لوگوں کے اندر ظلمت پھیل گئی ہے اور ان کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات سے منقطع ہو چکا ہے ان کے وجود خباثت کا شکار ہو گئے ہیں تو ان اولیاء نے عموماً یہ کیفیت عام کر دی کیونکہ یہ حضرات اس بات کے خواہشمند تھے کہ صرف پاکیزہ اور نیک لوگ ہی اللہ تعالیٰ کا نام لیں کیونکہ اگر کوئی شخص پورے خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دست سوال دراز کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا ضرور قبول فرماتا ہے۔ البتہ اس قبولیت کا اثر دو طرح میں سے کسی ایک صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایک صورت یہ ہے کہ سائل کی درخواست کے مطابق اس کی مراد پوری کر دی جاتی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ سائل کی مراد تو پوری نہیں ہوتی البتہ اسے مراد پوری نہ ہونے کی حکمت کے راز سے آگاہ کر دیا جاتا ہے۔ یہ خصوصیت صرف اولیاء کرام کو حاصل ہے جو لوگ بارگاہ رب العزت سے دور اور محجوب ہوں۔ انہیں اس بارے میں کچھ بھی پتہ نہیں چلتا۔ اب اگر ایسا ہو کہ کوئی شخص اپنے باطن میں موجود ظلمات اور خباثت کے ہمراہ بارگاہ ربّ العزت میں دستِ سوال دراز کرے اور پھر نہ تو اس کی مراد پوری ہو اور نہ اس کی حکمت کا پتہ چلے تو عین ممکن ہے کہ وہ شخص (جو پہلے ہی باطنی طور پر ظلمت اور خباثت کا شکار ہے) اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کے وجود (یا اس کی شان عطا) کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا ہو جائیں اور یہ مراد کے پورے نہ ہونے سے بڑا وبال ہے اس لیے ''دیوان الصالحین'' کے ارکان نے مصلحت کے تحت لوگوں کی توجہ کو اولیاء اللہ کی طرف مبذول کروا دیا تا کہ اگر کبھی کسی کے دل میں کسی ولی کی ولایت کے بارے میں کوئی شبہ پیدا ہو تو اس کا ایمان (کم ازکم) محفوظ رہے۔

لوگوں کی اپنے خالق سے لاتعلقی

لوگوں کے اندر اللہ تعالیٰ سے لاتعلقی کس قدر بڑھ چکی ہے اور ان کے وجود ظلمات میں کس طرح سے گھرے ہوئے ہیں اس کا اندازہ تم اس بات سے کر سکتے ہو۔ یک شخص 20 موزونے لے کر اپنے گھر سے نکلتا ہے اور کسی بزرگ کی درگاہ پر بطور نذر ڈال آتا ہے تا کہ اس کا ذاتی مقصد حاصل ہو جائے۔ راستے میں اسے کئی محتاج ملتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نام پر اس سے خیرات کا سوال کرتے ہیں لیکن وہ ان فقیروں کو کچھ بھی نہیں دیتا۔ لیکن بزرگ کے مزار پر پہنچ کر ساری رقم وہاں ڈال دیتا ہے۔ یہ نہایت مذموم حرکت ہے کیونکہ اس کی نیت اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا حصول نہیں تھا کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لئے یہ عمل کیا ہوتا تو راستے میں ملنے والے ہر فقیر کو اللہ تعالیٰ کے نام پر کچھ نہ کچھ دیتا لیکن کیونکہ اس کا عمل ذاتی فائدے کے حصول کے لیے تھا اس لیے اس نے ایک خاص مقام کو مخصوص کر لیا کیونکہ اپنی کم علمی کے باعث وہ یہ سمجھتا تھا کہ اگر میں نے اسی

خاص مقام پر یہ رقم خرچ کی تو مجھے نفع ہوگا ورنہ نفع نہیں ہوگا پھر فرمانے لگے میں نے آج دیکھا ہے کہ باب تلمسان (نامی جگہ) سے لے کر ساقیۃ الحمراء (کے مقام تک) بزرگوں کے نام پر 80 دینار' 360 بکریاں' 72 بیل صدقہ کیئے گئے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے نام پر 10 درہم بھی خرچ نہیں کیے گئے۔

اللہ تعالیٰ سے دوری کے اسباب

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے مزید ارشاد فرمایا۔ یہ ایک بنیادی سبب ہے جس کی بدولت انسان اللہ تعالیٰ سے دور ہوتا چلا جاتا ہے اور اس میں اکثر لوگوں کو مبتلا کر دیا گیا ہے اور ان میں سے بہت سے لوگوں کو اس بات کا شعور بھی نہیں ہو پاتا۔ 366 اسباب ایسے ہیں جن کی وجہ سے انسان' اللہ تعالیٰ سے دور ہو جاتا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے عرض کی' اگر ان میں سے کچھ آپ کو اس وقت یاد ہوں تو بیان فرما دیں۔ آپ نے فرمایا (ہاں یاد ہیں) تم انہیں تحریر کر لو۔ (وہ اسباب درج ذیل ہیں)

۱- اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کی بجائے اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کے حصول کے لئے صالحین کی خدمت میں نذر پیش کرنا۔

۲- اپنے ذاتی مقصد کے حصول کے لئے صالحین کی خدمت میں اللہ تعالیٰ کی ذات کا وسیلہ پیش کرنا مثلاً یہ کہنا یا حضرت! اللہ کے واسطے میری فلاں ضرورت پوری کر دیں۔

یہ بھی اللہ تعالیٰ سے دوری کا باعث بنتا ہے کیونکہ یہاں زائر نے معاملہ الٹ کر دیا ہے کیونکہ اسے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بزرگ کے وسیلے سے دعا کرنا چاہیے تھی۔

۳- فرائض کے واجب الادا ہونے کے باوجود محض صالحین کی زیارت ہی کو کافی سمجھ لینا۔ مثال کے طور پر ایک شخص کے ذمہ کچھ نمازوں کی قضا لازم ہے جو اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور اس کے اندر وہ عظیم نور پنہاں ہے جس کی بدولت اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے۔ مگر اسے چھوڑ کر وہ شخص بزرگ کی زیارت کے لئے روانہ ہو جاتا ہے جو اس کی ذات میں موجود ظلمت اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے دوری کی نشانی ہے۔

۴- جان یا رزق کے نقصان کے خوف سے کسی ظالم سے ڈرنا' مثلاً یہ خیال کرنا کہ اگر میں نے اس ظالم کی کسی معاملے میں مخالفت کی تو وہ مجھے جان سے مار دے گا یا میرا رزق بند کر دے گا کیونکہ جب انسان کو یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ ہر حال میں بندے کے ساتھ ہے تو وہ اس بات کا بھی یقین رکھے گا کہ اس کی اور ظالم دونوں کی ذات کے اندر اللہ تعالیٰ ہی کا تصرف کارفرما ہے جس کا بدیہی مطلب یہ ہوگا کہ کوئی بھی شخص' خواہ کوئی کیسا ہی ظالم کیوں نہ ہو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ جب انسان کو اس بات کا یقین ہو جائے گا تو وہ کبھی بھی اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کسی سے بھی خوفزدہ نہیں ہوگا اور انسان کے اندر یہ سوچ جس قدر پختہ ہوتی چلی جائے گی اسی قدر اللہ تعالیٰ کا قرب زیادہ ہوتا چلا جائے گا اور یہ سوچ جتنی کمزور ہوگی اسی قدر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے دوری بڑھتی چلی جائے گی۔

۵- یہ سوچ رکھنا کہ ظالم کا مقرب بننے سے رزق میں اضافہ ہوگا کیونکہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ کے رازق ہونے کا یقین ہوگا وہ کبھی اس غلطی کا مرتکب نہیں ہوگا۔

۶- کفار کی مدد کرنا' انہیں مفید مشوروں کے ذریعے مختلف نوع کی کامیابیوں کے طریقے سمجھانا بھی اس صف میں شامل ہوگا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ جس شخص نے کبھی بھی کسی ظالم کی خیر خواہی کی کوشش کی انجام کار اسے برے انجام کا شکار ہونا پڑا۔ اس کی مثال میں ہم حضرت سفیان ثوری کا یہ واقعہ نقل کرنا چاہیں گے کہ ایک مرتبہ آپ اپنے ایک مرید کے ہمراہ کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ راستے میں ایک کوتوال کو سوتے دیکھا۔ آپ کے مرید نے اسے نماز کے لیے جگانا چاہا تو آپ نے اسے منع کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دو کیونکہ جب تک یہ سو رہا ہے۔ ہم (اور دوسرے بہت سے لوگ) اس کے شر سے محفوظ رہیں گے۔

۷- مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی کا سلوک نہ کرنا یعنی انہیں کسی مضر چیز سے بچنے اور مفید کو اختیار کرنے کی ترغیب نہ دینا۔

۸- اللہ تعالیٰ کی عبادت کی بجائے۔ دنیاوی محنت' مشقت سے لطف اندوز ہونا۔ اگر کوئی شخص اس کیفیت میں مبتلا ہو جائے تو اسے سمجھ لینا چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے بے تعلق ہونے کے ایک (بنیادی) سبب کا مرتکب ہو چکا ہے۔

۹- ایسے ذرائع سے دنیاوی مال و دولت حاصل کرنا جو بذات خود دنیا سے بھی زیادہ کم تر اور حقیر ہوں۔ پہلے زمانے میں لوگ دنیاوی مال و دولت ان ذرائع سے حاصل کیا کرتے تھے جو (فی نفسہ) دنیا سے زیادہ بہتر تھے جس میں جہاد' تجارت اور زراعت وغیرہ جیسے امور شامل ہیں۔ (مگر آج کے زمانے میں) جو شخص جھوٹ' دھوکہ دہی' جھوٹی قسمیں کھا کر دنیا کے حصول کا خواہاں ہوتا ہے۔ وہ درحقیقت دنیا کو ایسے ذرائع سے حاصل کرنا چاہتا ہے جو دنیا سے بھی زیادہ (اللہ تعالیٰ کی نظر میں) حقیر ہیں اس لئے اس خامی میں مبتلا شخص کو فوراً توبہ کر کے' جائز اور حلال ذرائع سے رزق حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔

۱۰- کوئی شخص یہ نیت رکھتے ہوئے نیک عمل کرے (کہ اس عمل کے نتیجے میں) اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرماتے ہوئے اس کا کوئی ذاتی مسئلہ حل فرما دے گا اور اس عمل کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول مقصود نہ ہو۔ یہ خرابی بہت سے لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ البتہ جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ اپنا خاص فضل و کرم فرماتا ہے۔ وہ اس آفت سے محفوظ رہتے ہیں۔ (مؤلف دعا کرتا ہے) کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے ان نیک بندوں میں شامل فرمائے۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے مزید ارشاد فرمایا۔ اگر اللہ تعالیٰ دوزخ یا جنت کو پیدا نہ فرماتا (تو ہم جیسے انسانوں کے سامنے) اس وقت یہ واضح ہو جاتا کہ کون اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے اور کون اس سے غافل رہتا ہے؟ نیز کس کی عبادت اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول کے لئے ہوتی ہے؟ لیکن جب لوگوں کو جہنم اور جنت کے

بارے میں پتہ چلا تو وہ اصل مقصود (یعنی معرفت الٰہیہ و رضا کے الٰہی کے حصول) سے ہٹ کر اغراض کی طرف متوجہ ہو گئے۔

۱۱- ان مقامات پر گناہوں کا ارتکاب کرنا جنہیں اللہ تعالیٰ نے قابل تعظیم قرار دیا ہے جیسے مسجد' کیونکہ جب انسان کے سامنے یہ بات واضح ہو جائے کہ اس شے (یا مقام کی) نسبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے (مثال کے طور پر مسجد کے بارے میں) وہ یہ خیال کرے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا گھر ہے تو وہ کبھی بھی وہاں پہ گناہ کے ارتکاب کی جرات نہیں کر سکے گا۔

۱۲- اغلام' اس کے مزید نقصانات ہم آئندہ صفحات میں بیان کریں گے۔

۱۳- شوہر کا بغیر کسی قصور کے اپنی اہلیہ کو پیٹنا بیوی کے بھی کچھ حقوق ہیں اس لیے یہ عمل اللہ تعالیٰ سے دوری کا باعث بنتا ہے۔

۱۴- اہل وعیال پر روپے پیسے خرچ کرنے کے بعد ان پر احسان جتانا کہ میں نے تم پر اس قدر رقم خرچ کی ہے۔

۱۵- حسد کرنا' اس کے نقصانات پر بھی آئندہ صفحات میں تفصیلی روشنی ڈالی جائے گی کیونکہ یہ بہت سی خرابیوں کی جڑ ہے۔

۱۶- گناہ کو گناہ سمجھنے کے باوجود اس کے ارتکاب کی کوشش کرنا۔ قیامت کے دن جن لوگوں کو شدید ترین عذاب دیا جائے گا۔ان کی اقسام کا ذکر کرتے ہوئے ہم اس موضوع پر بھی تفصیلاً اظہار خیال کریں گے۔
(احمد بن مبارک کہتے ہیں) یہ بات پیش نظر رہے کہ اس قسم اور نویں قسم کے درمیان خاصا فرق پایا جاتا ہے جو اہل فہم سے مخفی نہیں ہو گا۔

۱۷- والدین کی نافرمانی کرنا۔ سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں۔

ایک دن میں اپنے شیخ حضرت عمر بن محمد الہواری کے ہمراہ بیری کے اس درخت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا جو حضرت علی بن حرزھم کی درگاہ کے نزدیک موجود ہے۔ اسی دوران ان کا صاحبزادہ حج کی ادائیگی کے لئے ان سے اجازت لینے آیا۔ حضرت عمر الہواری نے اسے اجازت دینے سے انکار کر دیا لیکن وہ اپنے والد کا نافرمان تھا اس لیے اجازت نہ ملنے کے باوجود اپنے سفر پر روانہ ہو گیا (اس کے جانے کے بعد حضرت عمر الہواری نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا)

والدین کی نافرمانی کے 4 (بڑے) نقصانات ہیں:

(i) دنیا اس سے دور ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ لوگ اس سے اس قدر نفرت کرنے لگتے ہیں جتنی نفرت کوئی بندہ مومن جہنم سے کرتا ہے۔

(ii) ایسا شخص لوگوں کے درمیان بیٹھ کر گفتگو کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ سامعین کی توجہ کسی اور طرف مبذول کروا دیتا ہے۔ اس شخص کی گفتگو سے نور و برکت نکال دیتا ہے اور لوگ ایسے شخص (کی گفتگو سن کر) اسے ناپسند

کرنے لگتے ہیں۔

(iii) دیوان الصالحین کے اراکین ایسے شخص کی طرف مہربانی اور شفقت کی نظر سے نہیں دیکھتے (یہاں تک کہ اسے مشکل میں مبتلا دیکھ کر بھی) اس پر ترس نہیں کھاتے۔

(iv) ایسے شخص کا نور ایمان دن بدن کم ہوتا چلا جاتا ہے پھر اللہ تعالیٰ جس شخص کو تباہی کا شکار کرنا چاہے اس کے ایمان کا نور مکمل طور پر ختم ہو جاتا ہے اور ایسے شخص کی موت کفر کی حالت میں ہوا کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس آفت سے محفوظ فرمائے۔ البتہ اللہ تعالیٰ جس شخص کو مکمل طور پر تباہی کا شکار نہ کرنا چاہے (اس کا ایمان بھی دن بدن کم ہوتا چلا جاتا ہے) اور وہ ناقص ایمان کے ہمراہ اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس آفت سے بھی محفوظ رکھے۔

اسی طرح والدین کی فرمانبرداری کے چار فوائد ہیں۔ جو مذکورہ نقصانات کی ضد ہیں:

(i) دنیا اس شخص سے اس طرح محبت کرتی ہے جس طرح بندہ مومن جنت کے ساتھ محبت کرتا ہے۔

(ii) لوگ اس کی گفتگو توجہ اور دلچسپی سے سنتے ہیں۔

(iii) اولیاء کرام ایسے شخص سے محبت کرتے ہیں۔

(iv) ایسے شخص کا ایمان بڑھتا چلا جاتا ہے۔

میرے عزیز! ان چاروں فوائد اور چاروں نقصانات کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھو۔

۱۹- اہل حجاب یعنی امراء ورؤساء کی ہم نشینی و قربت اختیار کرنا۔ (یاد رکھو) ہر مومن کے وجود میں سے ایک خاص مقام سے نور کی ایک شعاع نکلتی ہے جو آخر کار عطیہ خداوندی سے جا ملتی ہے۔ اولیاء کی ہم نشینی اختیار کرنے سے اس نور میں اضافہ ہوتا ہے جبکہ امراء ورؤسا کی ہم نشینی کی بدولت اس میں کمی آ جاتی ہے یہاں تک کہ یہ اندیشہ موجود ہوتا ہے کہ کہیں وہ مقام (جہاں سے نور نکلتا ہے) مکمل طور پر بند ہی نہ ہو جائے کیونکہ امراء و رؤساء اپنے مال و دولت کی وجہ سے انسان (کے خیالات) پر حاوی ہو جاتے ہیں اور انسان ان کے چنگل میں پھنس کر مکمل طور پر انہی کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک طویل عرصہ اسی حالت میں بسر کرنے کے بعد اسے کبھی بھی اللہ تعالیٰ کا خیال تک نہیں آتا۔ جس کا وبال یہ ہے کہ اس کی ذات میں موجود نور کا یہ مخرج بند ہو جاتا ہے اور اس آفت کا مرکزی و بنیادی سبب صرف امراء ورؤساء کی ہم نشینی ہے۔

۲۰- خلفاء اربعہ کے درمیان تفریق کرنا' تفریق کا مطلب یہ ہے کہ خوارج یا روافض (شیعہ) کی طرح ان چاروں حضرات میں سے کسی ایک سے محبت رکھے اور دوسرے حضرات سے بغض رکھے۔ یہ تفریق اس لیے اللہ تعالیٰ سے دوری کا باعث بنتی ہے کیونکہ ان چاروں حضرات میں سے ہر ایک نبی اکرم علیہ السلام کی کسی نہ کسی مخصوص خوبی کا وارث ہے۔ لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی وارث سے بغض رکھنا بالواسطہ طور پر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے (معاذ اللہ) بغض رکھنے کے مترادف ہے جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے

دوری کا باعث بنتا ہے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی عظمت شان

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے عرض کی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کون سی خوبی کے وارث ہوئے ہیں؟

سیدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے حوالے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک خاص کیفیت حاصل تھی جو اگر روئے زمین پر بسنے والے تمام لوگوں' خواہ وہ صحابہ کرام ہی کیوں نہ ہوں؟ تقسیم کر دی جاتی تو وہ سب لوگ ہلاک ہو جاتے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ان کی استعداد کے مطابق اس کیفیت میں سے بہت تھوڑی سی کیفیت نصیب ہوئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود پوری امت میں کوئی ایک بھی ایسا شخص نہیں ہے جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی کیفیت' بلکہ اس کی قریبی کیفیت کو بھی برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور اس میں تمام صحابہ اور جملہ اغواث واقطاب' نیز وہ لوگ جنہیں فتح کبیر عطا ہوئی ہے سب شامل ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جس قدر الوہیت کے اسرار' ربوبیت کے حقائق اور معرفت کے دقائق کا علم عطا کیا گیا ہے۔ اسے بیان کرنا ممکن نہیں ہے اور نہ ہی کوئی انہیں سننے کی طاقت رکھتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی۔ آپ بعض اوقات حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے چند حقائق بیان کر دیا کرتے تھے جس کے نتیجے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو یہ مرتبہ و مقام نصیب ہوا ہے۔ تاہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات ظاہری کے آخری تین برسوں میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بھی معرفت کی کوئی بات نہیں بتائی تاکہ ایسا نہ ہو کہ وہ اس کی تاب نہ لاسکیں (اور ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر جائے)

خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی خصوصیات

مسلمانوں کی خیر خواہی' شفقت' ان کے لئے ایثار' عسکری امور کی نگرانی اور عام فلاح و بہبود کے کاموں کی نگرانی' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خصوصیت ہے۔ یہ درحقیقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خوبی ہے جس میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان کے استطاعت کے مطابق حصہ ملا ہے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شخصیت میں مہربانی' صلہ رحمی اور شفقت کا رنگ غالب تھا جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات ہیں اور ان میں حضرت عثمان غنی کو ان کی حیثیت کے مطابق حصہ ملا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی نمایاں خصوصیت شجاعت و بہادری ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اہم خصوصیت ہے اور اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان کے نصیب کے مطابق حصہ ملا۔

اسی طرح ہر صحابی' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نہ کسی خوبی کا (بطور خاص) وارث ہوا ہے اس لیے کسی ایک

صحابی سے بغض رکھنا بھی اللہ تعالیٰ سے دوری کا باعث بنتا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس مقام پر آ کر یہ مجلس ختم ہوگئی۔ بعد میں دیگر مجالس میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے دوری کے دیگر اسباب کا ذکر نہ ہوسکا۔ یہاں تک کہ حضرت سیّدی عبدالعزیز دباغ کا انتقال ہوگیا اللہ تعالیٰ آپ کی برکت (اور وسیلے) سے ہمیں ان امور کی معرفت نصیب فرمائے۔

ایمان میں اضافے کے اسباب

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ان امور کا تذکرہ کیا جن کی بدولت ایمان میں اضافہ ہوتا ہے (ان میں سے بعض درج ذیل ہیں):

(i) قبروں کی زیارت کرنا۔

(ii) صرف اللہ کی رضا کے حصول کے لئے صدقہ کرنا۔

(iii) جھوٹی قسم کھانے سے بچنا

(iv) جن اعضاء کے پردے کا حکم دیا گیا ہے۔ (دوسروں کے) ان اعضاء کی طرف دیکھنے سے بچنا۔

(v) لوگوں کے گناہوں سے پردہ پوشی کرنا کیونکہ جو شخص دوسروں کے گناہوں کی ٹوہ میں رہنا شروع کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے دل میں یہ وسوسہ پیدا کر دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس گناہ گار کو اس کے تمام تر گناہوں کے باوجود اس قدر نعمتوں سے نوازا ہے۔ شاید یہ نعمت اسے اس کے گناہوں کی بدولت ملی ہو اور پھر شیطان اس شخص کے دل میں یہ وسوسہ ڈالے گا کہ تم بھی گناہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو اس کے گناہوں کی وجہ سے یہ نعمت عطا کی ہے اور آخر کار وہ شخص اس معصیت کا مرتکب ہو جائے یا شیطان اس کے دل میں یہ وسوسہ ڈال دے کہ دیکھو اس کے پروردگار نے اس کے تمام تر گناہوں کے باوجود اس قدر نعمتیں عطا کی ہیں اور تمہاری تمام تر نیکوکاری کے باوجود تمہیں ان نعمتوں سے محروم رکھا۔ کیا یہ بات حکمت کے منافی نہیں ہے؟ غرض یہ کہ اسی طرح کے اور بہت سے وسوسے پیدا کرتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان وسوسوں سے محفوظ فرمائے۔

(vi) حاملین شریعت یعنی علمائے کرام کی تعظیم بھی ایمان میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کی قدر پہچاننے کی توفیق عطا فرمائے۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں۔ اگر لوگوں کو علماء کی قدر و قیمت کا پتہ چل جائے تو وہ انہیں زمین پر چلنے بھی نہ دیں بلکہ ہر علاقے کے لوگ اپنے عالم کو کندھوں پر اٹھا کر گھومیں۔

اغلام بازی کی حرمت کا سبب

ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے اغلام بازی کو اس لیے حرام قرار دیا ہے کہ

جب مرد کا نطفہ خارج ہوتا ہے تو اس کے ہمراہ چند فرشتے بھی باہر آتے ہیں۔ جب وہ نطفہ پچھلی شرمگاہ میں گرتا ہے۔ جو درحقیقت پیدائش کا محل نہیں ہے تو وہ تمام فرشتے مر جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا ان فرشتوں کی مثال کبوتر کے بچوں کی مانند ہے۔ اگر ان میں سے کوئی گھونسلے میں سے سخت پتھر پر گر جائے تو کیا وہ زندہ رہے گا۔ اسی طرح جب نطفہ عورت کی اگلی شرمگاہ جو پیدائش کا محل ہے میں گرتا ہے تو اس کے ہمراہ دو طرح کے فرشتے آتے ہیں۔ ایک باپ کے نطفے کی طرف سے اور دوسرے ماں کے نطفے کی جانب سے ان کی مجموعی تعداد 366 ہوتی ہے۔ ان میں سے آدھے مرد کی طرف سے اور بقیہ نصف عورت کی طرف سے آتے ہیں۔ البتہ مرد کے نطفے کے ساتھ دس فرشتے زیادہ آتے ہیں (کیونکہ اصل خلقت کے اعتبار سے مرد اصل ہے) کیونکہ حضرت حوا کو سیدنا آدم کے جسم سے پیدا کیا گیا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ اس نطفے کی پیدائش کا ارادہ فرمائے تو یہ پہلے جمے ہوئے خون اور پھر گوشت کے لوتھڑے کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ اس کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ فرشتوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب بچہ دنیا میں آتا ہے تو یہ فرشتے بھی اس کے ساتھ آ کر تا عمر اس کی حفاظت و نگرانی کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ دائیں کندھے پر مقرر فرشتہ ان سب کا نگران ہوتا ہے جس طرح ماں باپ بچوں کی نشوونما کرتے ہیں بالکل اسی طرح ابتدائی 366 فرشتے بعد میں پیدا ہونے والے تمام فرشتوں کی نشوونما کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔

اگر اللہ تعالیٰ کی منشاء یہ ہو کہ اس نطفے کے ذریعے بچہ پیدا نہیں ہوگا تو نطفے کے ہمراہ آنے والے فرشتے رحم مادر میں انتقال کر جاتے ہیں لیکن اس میں بندے کا کوئی قصور نہیں ہوتا کیونکہ یہ بات اس کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔ اس کی مثال ہم یوں بیان کر سکتے ہیں کہ جب کسی چراغ میں اس کی مخصوص مقدار سے زیادہ تیل بھر دیا جائے تو چراغ کی بتی سے تیل ٹپکنا شروع ہو جاتا ہے اور ہر قطرے کے ہمراہ آگ کا ایک شعلہ سا زمین کی طرف لپکتا ہے لیکن نیچے گرنے کے ساتھ ہی بجھ جاتا ہے۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں۔ اسی لیے اس طرح کے وہ تمام اسباب اختیار کرنا جائز نہیں ہیں جن کی بدولت نطفہ رحم میں داخل نہ ہو سکے کیونکہ ہم یہ بات نہیں جان سکتے کہ اللہ تعالیٰ نے اس نطفے کے ذریعے کسی بچے کی پیدائش کا ارادہ کیا ہے یا نہیں اور یوں نادانستگی میں کچھ فرشتوں کی ہلاکت کے مجرم بن سکتے ہیں۔

(پھر آپ نے زنا کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرمایا) زنا کو فرشتوں کے حوالے سے حرام قرار نہیں دیا گیا بلکہ اس کی حرمت کا سبب یہ ہے کہ اس کی بدولت نسب مشکوک ہو جاتا جبکہ قیامت کے دن انسان کو نسب کے ذریعے بہت فائدہ حاصل ہوگا اور اصول یہ ہے کہ دعویٰ نسب گواہی کے بغیر قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اسی حکمت کے پیش نظر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح میں گواہ مقرر کرنے اور (ولیمے کی شکل میں) اس کا عام اعلان کرنے کا حکم صادر کیا ہے۔ اس کے برعکس زانی کا عمل خفیہ ہوتا ہے کیونکہ اگر وہ اعلانیہ طور پر ایسا کرے گا تو اس پر حد جاری کر دی جائے گی۔ پس ایسا شخص نسب کو منقطع کرنے اور مشکوک کرنے کا مرتکب ہوتا ہے جس کے

نقصانات کے بارے میں ہم پہلے گفتگو کر چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اس سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔

روز قیامت شدید ترین عذاب کیسے ہوگا؟

ایک دن سیّدی عبدالعزیز دباغ نے دریافت کیا' کیا تم جانتے ہو کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ دردناک عذاب کسے ہوگا؟ میں نے عرض کی کہ آپ بیان فرمائیں۔ آپ نے فرمایا۔

جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے تندرست جسم' مکمل عقل اور پوری صحت عطا کی ہو اور اس کے ساتھ اسے زندگی کی تمام نعمتوں سے سرفراز کیا ہو اور پھر ایک' دو یا اس سے زیادہ دن تک اسے اپنے پروردگار کا خیال بھی نہ آ سکے۔ اس کے برعکس جب وہ کسی گناہ کا ارتکاب کرنے لگے تو مکمل طور پر اس گناہ کی طرف متوجہ ہو جائے اس سے بھرپور لذت حاصل کرے اور اپنے پروردگار کی بارگاہ میں حاضری سے بے نیاز ہو کر اس گناہ کے ارتکاب کو اچھا سمجھنے لگے۔ غرض یہ کہ گناہوں کی دلدل میں پوری طرح سے دھنس جائے اور اللہ تعالیٰ سے مکمل طور پر لاتعلق ہو جائے۔ پوری طرح سے گناہوں کی طرف مائل ہو جائے اور ان کا ارتکاب اس طرح کرے جیسے یہ ایک جائز عمل ہے۔ ایسے شخص کو قیامت کے دن یہ عذاب دیا جائے گا کہ اسے مکمل طور پر آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ اس کے ہر طرف عذاب ہوگا اور اسے اس عذاب کی مزید طلب بالکل اسی طرح ہوگی جیسے کسی خارش زدہ کو خارش کی طلب ہوتی ہے حالانکہ خارش کرنا خود اسی کے لئے نقصان دہ ہوتا ہے۔

ارتکاب گناہ کے وقت خدا کو یاد کرنا

آپ نے مزید ارشاد فرمایا گناہ کے ارتکاب کے وقت خدا کو یاد کرنا بہت افضل عمل ہے اس لیے جب کوئی بندہ مومن کسی گناہ کا مرتکب ہونے لگے تو اسے چاہیے کہ یہ بات پیش نظر رکھنے کی کوشش کرے کہ اس کا پروردگار زبردست قدرت کا مالک ہے۔ انشاء اللہ اس کے نتیجے میں اس شخص کے دل میں اللہ کا خوف پیدا ہو جائے گا (اور اللہ تعالیٰ اس کے گناہ کو معاف کر دے گا) لیکن اگر گناہ کو پوری طرح سے معاف نہ بھی کیا گیا تو بھی اس کے عذاب میں ضرور کمی آ ئے گی۔ اس موضوع پر ہم اس سے پہلے بھی کچھ گفتگو کر چکے ہیں۔

ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے گناہ کے ارتکاب کے وقت اپنے رب کو یاد کرنے کے بارے میں حضرت عمر بن محمد الہواری کے حوالے سے ایک حکایت بیان کی۔ حضرت عمر الہواری فرماتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک انتہائی گناہگار شخص میرے شیخ کی خدمت میں آیا۔ میں بھی اس وقت شیخ کے پاس موجود تھا۔ اس نے شیخ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اے میرے آقا میں بہت گناہگار ہوں اور مسلسل گناہوں کا ارتکاب کرتا رہتا ہوں۔ اس سے بچنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ میرے شیخ نے فرمایا تجھ پہ افسوس ہے کہ تو اپنے پروردگار کی نافرمانی میں مشغول ہے۔ گناہوں کو چھوڑ دے اور دوبارہ ان کا ارتکاب نہیں کرنا۔ اس نے عرض کی یہ میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ شیخ نے فرمایا تجھ پہ افسوس ہے تو اپنے پروردگار کی بارگاہ میں توبہ کر لے۔ اس نے عرض کی میں یہ بھی نہیں کر

سکتا۔ شیخ نے اپنی توجہ اس سے ہٹالی۔ وہ شخص ایک یا دو دن تک وہاں ٹھہرا رہا۔ آخراٹھ کے جانے لگا تو دوبارہ شیخ سے دریافت کیا اے میرے آقا میں گناہوں سے کیسے نجات حاصل کروں۔ شیخ نے فرمایا تو جب بھی کسی گناہ کا ارتکاب کرنے لگے تو تین باتیں ذہن میں رکھ لینا۔

(i) جو گناہ تم کرنے لگے ہو اس کی قباحتوں اور اس کے ارتکاب کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کے بارے سوچ لینا۔

(ii) اپنے وجود کی کم مائیگی اور کمزوری کا خیال کرنا کہ کس طرح تم اپنے رب کی نافرمانی کر رہے ہو۔

(iii) اپنے پروردگار کی عظمت و طاقت کا خیال دل میں لانا کہ وہ جب چاہے تمہیں سزا دے سکتا ہے اور پھر یہ سوچنا کہ اللہ تعالیٰ نے تم سے درگزر کرتے ہوئے کس طرح تمہارے عیوب پر پردہ ڈال رکھا ہے۔

جب تمام ان تینوں نکات کو پیش نظر رکھو گے تو پھر جو جی میں آئے کر لینا۔ یہ نصیحت سننے کے بعد وہ شخص وہاں سے روانہ ہو گیا۔ ایک مدت کے بعد میری دوبارہ اس کے ساتھ ملاقات ہوئی تو اس نے مجھے سلام کیا اور دریافت کیا' کیا تم نے مجھے پہچانا ہے؟ میں نے پوچھا تم کون ہو؟ اس نے کہا کہ میں وہی گناہگار ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخ کی برکت سے مجھے گناہوں سے نجات عطا فرمائی ہے۔ جب کسی گناہ کا ارتکاب کرنے لگتا ہوں تو شیخ کی نصیحت کے مطابق ان تینوں نکات کو ذہن میں دہرالیتا ہوں جس کے نتیجے میں گناہ کے ارتکاب سے بچ جاتا ہوں اور آخر اسی کے نتیجے میں اب میں گناہوں سے مکمل توبہ کر چکا ہوں۔

کبیرہ گناہ کیا ہے؟

ایک مرتبہ سیدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا۔ میرے نزدیک اس گناہ کو کبیرہ قرار دیا جائے گا۔ جس کا ارتکاب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے غفلت کی حالت میں کیا جائے اور انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے فرشتوں' کتابوں' رسولوں اور آخرت سب سے لاتعلق ہو چکا ہو اور یہ لاتعلقی باطنی اعتبار سے ہو کیونکہ اس صورت میں ظاہری تعلق کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔

اس کیفیت میں گناہ کو اس لیے کبیرہ قرار دیا جائے گا۔ اس وقت دل' دماغ' ہاتھ' پاؤں بلکہ تمام اعضاء اس گناہ کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ انسان کی عقل اسے گناہ کے ارتکاب سے باز نہیں رکھتی اور نہ ہی اپنے پروردگار کی یاد دلاتی ہے۔

صغیرہ گناہ اس گناہ کو کہا جائے گا جس کے ارتکاب کے وقت انسان کا اللہ تعالیٰ اور اس تک پہنچانے والی چیزوں یعنی اللہ کی کتابیں اس کے رسول' فرشتوں سے لاتعلقی نہ ہو۔ اگر ایسی کیفیت میں کوئی انسان کسی گناہ کا ارتکاب کرے گا تو اس کا عالم یہ ہوگا کہ اس کا دل اسے ملامت کر رہا ہوگا اور اسے اپنے پروردگار سے حیا محسوس ہو رہی ہوگی۔

احادیث میں کبیرہ گناہوں کا تذکرہ

میں نے عرض کی۔آپ کی بیان کردہ تعریف پر یہ اشکال وارد ہوگا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کبیرہ گناہ گنواتے ہیں۔ان میں اللہ تعالیٰ سے لاتعلقی کی شرط بیان نہیں کی۔(تو آپ یہ شرط کس طرح عائد کر سکتے ہیں) آپ علیہ السلام نے فرمایا ہے یہ حدیث بخاری و مسلم نے نقل کی ہے۔

سءالنبی صلی اللہ علیہ وسلم عن الکبائر قال اِلاشراك باللہ وعقوق الوالدین و قتل النفس وشهادة الزور

کبیرہ گناہ یہ ہیں۔اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا' والدین کی نافرمانی کرنا اور کسی کو ناحق قتل کرنا اور جھوٹی گواہی دینا۔(بخاری'۲:۹۳۹'رقم:۲۵۷۰)

امام بخاری نے اپنی روایت میں اس بات کا اضافہ نقل کیا ہے۔

والیمین الغموس (جھوٹی قسم اٹھانا)(بخاری'۶:۲۴۵۷'رقم:۵۲۹۸)

امام مسلم نے اپنی روایت میں یہ اضافہ نقل کیا ہے۔

وقول الزور (جھوٹ بولنا)(مسلم'۱:۹۲'رقم:۸۸)

بخاری و مسلم میں موجود ایک اور روایت اس طرح نقل کی گئی ہے۔

اجتنبوا السبع الموبقات' قالو یا رسول اللّٰہ وما هن قال الشرك باللّٰہ والسحر و قتل النفس التی حرم اللّٰہ الا بالحق واکل الربوا واکل مال الیتیم والتولی یوم الزحف و قذف المحصنات المؤمنات الغافلات (بخاری'۳:۱۰۱۷'رقم:۲۶۱۵)

''ان سات مہلک گناہوں سے اجتناب کرو' صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ کیا ہیں؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا' جادو کرنا' جس کے قتل کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہوا سے ناحق قتل کرنا' سود کھانا' یتیم کا مال کھانا' جنگ کے دوران فرار ہو جانا اور بے خبر پاکدامن مومن خواتین پر زنا کی تہمت لگانا''۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا۔یہ تمام گناہ انسان سے اسی وقت صادر ہوتے ہیں جب وہ اپنے پروردگار سے لاتعلق ہو جاتا ہے کیونکہ اگر اس کے دل کا پروردگار کے ساتھ بھی تعلق ہوگا تو وہ کبھی بھی شرک کا ارتکاب نہیں کرے گا۔جادو نہیں کرے گا اور نہ ہی کسی ایسے گناہ کا ارتکاب کرے گا جس کا ذکر تمہاری بیان کردہ احادیث میں کیا گیا ہے۔

تم فلاں شخص سے واقف ہو؟ وہ اگرچہ اس وقت ایک عام آدمی ہے لیکن عنقریب اس کا شمار اولیاء اللہ میں ہونے لگے گا کیونکہ اس کے دل کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ ان گناہوں کا ارتکاب نہیں کرتا بلکہ ان سے اس طرح خوف زدہ رہتا ہے جیسے کوئی شخص آگ سے خوف کھاتا ہے۔اس کے برعکس تم فلاں

صاحب کی مثال لے لو۔ (وہ ظاہری طور پر کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کرتا ہے) مگر وہ مرتبہ ولایت پر فائز نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس کا دل اللہ سے لاتعلق ہو چکا ہے اور محض زبانی ذکر کرنا کافی نہیں ہے۔ تم خود ہی دیکھ لو کہ وہ کتنے ہی گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کی بدولت ہمیں سلامتی عطا فرمائے جو لوگ اللہ سے لاتعلق ہو چکے ہوں ان کا پتا چل جاتا ہے۔ اسی طرح جن کا تعلق باقی ہو وہ بھی صاف پہچانے جاتے ہیں۔

دنیاوی اسباب کی مثال

ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا' دنیاوی ذریعہ معاش خواہ تجارت ہو یا زراعت ان کی حیثیت فقیر کے ہاتھ میں موجود کشکول کی سی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ کسی سبب کے بغیر رزق عطا نہیں فرماتا بلکہ جب بندہ دنیاوی اسباب میں سے کسی ایک سبب کا کشکول ہاتھ میں لے کر اللہ کی بارگاہ میں دست سوال دراز کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی شان کے مطابق اسے رزق عطا فرما دیتا ہے اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے اختیار کردہ کشکول کی اصل حقیقت کو پیش نظر رکھے اور اللہ کی بارگاہ میں دستِ طلب دراز کرتے ہوئے سبب کی بجائے اللہ کی ذات کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی فقیر کی پوری توجہ اپنے کشکول کی بجائے خیرات دینے والے کے ہاتھ کی طرف ہوتی ہے۔ جب انسان اس کیفیت کے ہمراہ اللہ کی بارگاہ میں سوال کرے تو اس کا اللہ سے تعلق قائم ہوگا اور اس کا ظاہری ذریعہ معاش بھی قرب خداوندی کا سبب بنے گا کیونکہ اس کا اصل اعتماد اور بھروسہ اللہ کی ذات پر ہے اس لیے وہ صرف وہی ذرائع اختیار کرے گا جنہیں اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے۔ نیز ایسی حالت میں ذرائع آمدن کے ایک یا زیادہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ رزق دینے والی ذات اللہ کی ہے۔ وہ چاہے تو کسی ایک ذریعے سے اس قدر رزق عطا فرما دے جو دوسروں کو متعدد ذرائع سے حاصل ہوتا ہے (ان تمام نکات کو ذہن میں رکھتے ہوئے) انسان کو ہمیشہ اللہ سے ڈرنا چاہئے اور ہمیشہ آمدن کے جائز ذرائع اختیار کرنے چاہیے اولیاء اللہ کا بھی یہی طریقہ ہے۔

اس کے برعکس جو لوگ خدا سے لاتعلق ہو جاتے ہیں۔ وہ روزگار کے حصول کے لئے اپنا آپ تباہ کر دیتے ہیں۔ ان کو اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ ان کا اختیار کردہ ذریعہ آمدن جائز بھی ہے یا نہیں۔ وہ اس غلط فہمی کا شکار ہوتے ہیں کہ انہوں نے اپنی ذہانت اور چال بازی کے ذریعے رزق حاصل کیا ہے۔ اس طرح کے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت کی بجائے دنیا کمانے کے لئے مشکلات کا سامنا کرنے میں زیادہ راحت محسوس ہوتی ہے اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے لاتعلق ہو جاتے ہیں!۔

اسی موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے آپ نے ارشاد فرمایا۔ بنی نوع انسان کی مثال ان لوگوں کی مانند ہے جنہیں کمر میں رسی باندھ کر پہاڑ سے لٹکا دیا جائے اور وہ زمین اور آسمان کے درمیان معلق ہو جائیں اور پھر ایک مدت تک انہیں اسی حالت میں رکھا جائے۔ ان میں جو لوگ عقلمند ہوں گے انہیں ایک لمحے کے لئے بھی قرار نہیں آئیگا اور نہ ہی وہ آس پاس موجود کسی شے کو دیکھ کر سکون حاصل کر سکیں گے۔ وہ ہر وقت اسی ادھیڑ بن میں

جتنا! رہیں گے کہ کیا قریب موجود پہاڑ کی ابھری ہوئی سطح پر پاؤں جمائے جاسکتے ہیں یا نہیں؟ وہاں تک پہنچا بھی جا سکتا ہے یا نہیں؟ کیا وہ جگہ نرم ہے یا سخت ہے اور پھر یہ سوچو کہ اگر وہ اس بلندی سے نیچے گر پڑیں تو ان کی کیا حالت ہوگی؟ اس صورتحال میں انسان کا جگر پھٹ جائے گا اور دل کے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ کبھی ان (لٹکے ہوئے لوگوں) کی توجہ اس شخص پر مبذول ہوگی جس نے پہاڑ کے سرے پر رسی ہاتھ میں تھام رکھی ہے۔ کہیں وہ رسی چھوڑنے کا ارادہ تو نہیں کر رہا؟ کیا وہ شخص ان پر یہ مہربانی کرے گا کہ انہیں کس نرم جگہ پر اتار دے۔ اب ایسی حالت میں ان لوگوں کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہوگا کہ وہ پہاڑ پر موجود شخص کے سامنے پوری عاجزی وانکساری کے ساتھ گڑ گڑائیں اس کی طرف رحم طلب اور خوف زدہ نظروں سے دیکھیں اور اس شخص کو پھر بھی یہ اختیار ہوگا کہ وہ ان پر رحم کرے یا نہ کرے اگر وہ چاہے تو ان لوگوں کو سزا بھی دے سکتا ہے۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے ان لوگوں کے دل اس شخص کے خوف اور عذاب کے ڈر سے بری طرح لرز رہے ہوں گے۔ اس کے برعکس جو لوگ مکمل طور پر عقل وشعور سے بے بہرہ ہونگے ان کی توجہ کبھی بھی اپنی حالت زار کی طرف مبذول نہیں ہوگی نہ انہیں اس بات کا خیال آئے گا کہ وہ کہاں گر سکتے ہیں نہ وہ یہ سوچنے کی زحمت گوارا کریں گے کہ جس شخص کے ہاتھ میں رسی موجود ہے۔ وہ ان کے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ ان پر نسیان غالب آ جائے گا اور وہ یہی سمجھیں گے کہ جس حالت میں ہیں یہی حالت ہمیشہ باقی رہے گی اس لیے وہ وہاں مستقل رہائش اختیار کرنے میں معاون امور کا جائزہ لینے میں مشغول ہو جائیں گے۔ آخر کار جب رسی ٹوٹ جائے گی اور وہ نیچے آ گریں گے تو اس وقت انہیں یہ خیال آئے گا کہ ہم سے بہت بڑی کوتاہی سرزد ہوئی ہے کہ ہم نے اپنے اس انجام کو پیش نظر نہیں رکھا جس کی بدولت ہم اپنے انجام کے بارے میں کوئی تیاری بھی نہیں کر سکے حتی کہ اس انجام سے بچنے کے لئے گریہ وزاری بھی نہیں کی کہ شاید رو پیٹ کے ہم اپنی سلامتی کی درخواست منظور کروا لیتے۔

اللہ سے غافل شخص کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ اس مثال میں رسی کی مثال عمر کی مانند ہے جو موت کے ہاتھوں ٹوٹ جاتی ہے۔ گرنے کا (نرم مقام) جنت اور (سخت مقام) جہنم ہے جس کے ہاتھ میں رسی موجود ہے۔ وہ خدا کی ذات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اولیاء کرام ہمیشہ اپنے انجام کے بارے میں خوف کا شکار رہتے ہیں جس کی بدولت اللہ تعالیٰ قیامت کے دن انہیں بہترین اجر عطا فرمائے گا جبکہ غافل لوگوں کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔

حق اور باطل کا دروازہ

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی طرف اپنے رسولوں کو مبعوث کیا اور بندوں کو ان کی اطاعت کا حکم دیا۔ انبیاء کی بعثت کا بنیادی مقصد صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ انسان خدا تعالیٰ کی معرفت حاصل کر کے اس کی وحدانیت کے قائل ہوں اور کسی کو بھی اس کی ذات کا شریک ٹھہرانے سے گریز کریں لہٰذا جب بندہ ایسا کرے تو وہ اللہ کا پسندیدہ محبوب بن جاتا ہے۔ اطاعت درحقیقت انسان کے وجود میں ایک خاص دروازے کے کھولنے کا نام ہے جس کی بدولت حق کا نور انسان کی ذات کے اندر داخل ہو جاتا ہے اور مختلف قسم کے گناہوں

سے بچنے کا حکم اس لیے دیا گیا ہے تا کہ اس دروازے کو بند کر دیا جائے جس کے راستے سے تاریکیاں انسان کے اندر داخل ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا جو شخص اللہ کے احکامات کی پیروی کرے گا اور اس کی ممنوع کردہ اشیاء سے بچے گا۔ گویا وہ اپنی ذات کے اندر حق کے نور کے دروازے کھول دے گا اور باطل کے داخلے کے دروازے بند کر دے گا اس کے برعکس جو شخص اللہ کے احکام کی پیروی کرنے کی بجائے ان کی نافرمانی کرے گا وہ گویا اپنی ذات کے اندر تاریکیوں کے داخل ہونے کا راستہ کھول دے گا اور نور حق کے داخلے کے دروازے بند کر دے گا۔ اگر کوئی شخص فرمانبرداری اور نافرمانی دونوں کا ارتکاب کرے گا تو گویا وہ اپنی ذات کے اندر دونوں دروازے کھول دے گا۔

لوگوں کی اقسام

انسان کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ اپنی کیفیت کا جائزہ لیتا رہے کہ وہ کس مقام پر موجود ہے اور اس نے اپنی ذات کے اندر کونسا دروازہ کھول رکھا ہے (یہ کام فوراً کر لینا چاہیے) اس سے پہلے کہ انسان اپنے کیے پر نادم ہو اور اس کی ندامت اسے کوئی فائدہ نہ دے سکے۔ اکثر لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ظاہری طور پر اللہ کے احکام کی فرمانبرداری کرنا حق کے دروازوں کو کھولنے کے لئے کافی ہے جیسا کہ ظاہری طور پر اللہ کی نافرمانی کرنا شر کے دروازوں کو کھولنے کے لئے کافی ہوتا ہے حالانکہ حقیقت حال اس سے مختلف ہے کیونکہ ظاہر کا باطن کے مطابق ہونا ضروری ہے لہٰذا اس اعتبار سے لوگوں کی چار قسمیں ہونگی۔

(i) وہ لوگ جن کا ظاہر اور باطن دونوں اللہ کے ساتھ ہوں ظاہر کی صورت یہ ہے کہ انسان مکمل طور پر اللہ کے احکام کی پیروی کرے جبکہ باطنی تعلق کا مفہوم یہ ہے کہ ظاہری اطاعت کے وقت انسان کسی قسم کی غفلت کا شکار نہ ہو۔ اسے مراقبے اور مشاہدے کی صلاحیت حاصل ہو۔ اس قسم سے تعلق رکھنے والے لوگ اللہ کے محبوب بندے ہونگے۔

(ii) وہ لوگ جن کا ظاہر و باطن دونون غیراللہ کی طرف مبذول ہوں (اللہ تعالیٰ ہمیں اس بات سے محفوظ رکھے) یہ وہ لوگ ہیں جن کا ظاہر احکام باری تعالیٰ کی خلاف ورزی ہے اور ان کے باطن پر غفلت کے اندھیرے چھائے ہوئے ہیں۔ یہ اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ ترین لوگ ہیں۔

(iii) وہ لوگ جن کا ظاہر اللہ کے ساتھ متعلق نظر آئے اور ان کا باطن غیر اللہ کی طرف مائل ہو۔ چنانچہ ظاہری طور پر یہ لوگ احکام خداوندی کی پیروی میں مشغول نظر آتے ہیں مگر ان کا باطن غفلت کا شکار ہوتا ہے۔

اس خامی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انسان عبادت کرتے وقت صرف عام عادت کے تحت چند افعال سرانجام دے۔ ان کے نزدیک عبادت بھی دیگر عام عادات کی مانند ایک عادت کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کا وجود اس عادت سے مانوس ہو جاتا ہے لہٰذا یہ احکام شریعت کی پیروی کی بجائے صرف عادت سے مجبور ہو کر عبادت کرتے ہیں۔

اس قسم سے تعلق رکھنے والے کچھ افراد کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ لوگوں میں ایک متقی و پرہیزگار اور عبادت گزار شخص کی حیثیت سے مشغول ہو جاتے ہیں اور پھر اس بات سے خوف زدہ ہو جاتے ہیں کہ اگر ہم نے عبادت

میں کوئی کوتاہی کی تو ہماری شہرت کو نقصان پہنچے گا۔ ایسے لوگ ہمیشہ لوگوں کی نظروں میں قدر و منزلت کے لئے عبادت میں مشغول نظر آتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو جتنی عبادت کرتے جائیں گے اسی قدر اللہ سے دور ہوتے چلے جائیں گے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس قسم سے تعلق رکھنے والے افراد میں سے کسی شخص کی ملاقات پہلی قسم سے تعلق رکھنے والے اولیاء کرام میں سے کسی ایک ولی کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ وہ ولی اس کے باطن میں موجود خرابی کو جان کر اس بیماری سے نجات کے لئے ایسے شخص کو ظاہری عبادات کی عدم ادائیگی کا حکم دیتا ہے۔ جن کا یہ شخص عادی ہو چکا ہو لیکن اپنی بیماری سے مجبور ہو کر وہ ولی کا مشورہ قبول نہیں کرتا اور بدستور ظاہری عبادات کی ادائیگی میں مشغول رہ کر اپنے آپ کو تباہ و برباد کر لیتا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس نوعیت کا ایک واقعہ حضرت بایزید بسطامی کے بارے میں منقول ہے۔ ان کے زمانے میں کسی شخص کی باطنی کیفیت ایسی ہی تھی۔ آپ نے اسے نفل چھوڑنے کا حکم دیا۔ لیکن اس نے آپ کا حکم نہیں مانا۔ اس کے ساتھیوں نے اسے سمجھایا بھی کہ تم اتنے بڑے شیخ کی بات کیوں نہیں مان رہے؟ لیکن بایزید نے اس کے ساتھیوں سے کہا کہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دو کیونکہ یہ اللہ کی نظروں سے گر چکا ہے۔

(iv) وہ لوگ جن کا ظاہر غیر اللہ کی طرف مائل محسوس ہوتا ہے لیکن باطن کے اعتبار سے وہ اللہ کی طرف مائل ہیں۔ ایسا شخص ظاہری طور پر شریعت کے احکام کی خلاف ورزی کرتا ہے لیکن اس کا باطن مراقبہ حق میں مشغول ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ معصیت کے ظاہری ارتکاب کے باوجود مشاہدہ حق سے غافل نہیں ہوتا۔ ایسے شخص کو گناہ بہت بھاری محسوس ہوتا ہے اور اسے یوں لگتا ہے جیسے اس پر پہاڑ پھینک دیا گیا ہو۔ ایسا شخص ہمیشہ پریشان اور غمگین رہتا ہے۔ اس قسم سے تعلق رکھنے والے افراد تیسری قسم والوں سے کئی گنا افضل ہیں کیونکہ ظاہری عبادت کا بنیادی مقصد انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری کے وقت خشوع و خضوع اور عاجزی اور انکساری کا جذبہ پیدا کرنا ہے جو اس قسم کے افراد کو نصیب ہو جاتا ہے لیکن تیسری قسم سے تعلق رکھنے والے افراد اس سے محروم رہتے ہیں۔

''وجد'' کا سبب کیا ہے؟

ایک مرتبہ ایک صاحب نے دریافت کیا۔ بعض اوقات کچھ لوگ (وجد کے عالم میں) مضطرب ہو جاتے ہیں اور چیخنے چلانے لگتے ہیں (اس کی کیا وجہ ہے؟) سائل کے بقول اس کی اپنی یہی کیفیت ہے کہ بعض اوقات ذکر اور عبادت کے دوران ہی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ اس بات سے خوف زدہ ہے کہ کہیں یہ شیطان کی فریب کاری نہ ہو اور اس نے یہ بھی ذکر کیا کہ جب وہ دنیاوی امور کی طرف متوجہ ہو جائے تو یہ کیفیت زائل ہو جاتی ہے۔

سیدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا بعض اوقات روح اپنے اندر موجود نور کا فیض ذات پر ڈالتی ہے۔ اس وقت جسم پر اضطراب کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات یہ کیفیت نیکی کا کام کرتے وقت طاری ہوتی ہے اور کبھی گناہ کے ارتکاب کے وقت بھی طاری ہو جاتی ہے۔ اگر گناہ کے ارتکاب کے وقت کسی شخص پر یہ

کیفیت طاری ہو جائے تو وہ گناہ کے ارتکاب سے باز آ جاتا ہے کیونکہ اس وقت روح اپنے نور کا فیض جسم پر ڈالتی ہے جس کے نتیجے میں جسم پر خشیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ اللہ کی ذات کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

آپ نے مزید فرمایا اگر اطاعت کے عالم میں یہ کیفیت طاری ہو تو انسان کو ہرگز یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ کیفیت اس کی عبادت و ریاضت کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے کیونکہ اس طرح وہ خود پسندی کا شکار ہو جائے گا۔ انسان کو اپنے نفس کو یہ تنبیہ کرنا چاہیے کہ اگر یہ کیفیت عبادت کا نتیجہ ہوتی تو عبادت کے علاوہ کبھی بھی طاری نہ ہوتی (جبکہ درحقیقت ایسا نہیں ہے) روح کی طرف سے جسم کو حاصل ہونے والے اس نور کی مثال لگام کی مانند ہے۔ جب روح یہ دیکھتی ہے کہ جسم صحیح راستے سے بھٹک رہا ہے اور اس کے گمراہ ہونے کا اندیشہ موجود ہے۔ اس وقت یہ نور جسم پر ظاہر ہوتا ہے تاکہ صحیح راستے کی طرف اس کی رہنمائی کرے۔ یہ کیفیت صرف انہی لوگوں پر طاری ہوتی ہے جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ کر لے کیونکہ یہ کیفیت بھی ہدایت کے حصول کا ایک بنیادی سبب ہے لیکن جن لوگوں کے نصیب میں ہدایت نہ ہو۔ ان کے لیے یہ کیفیت ظلمت بن جاتی ہے جو انہیں راہ حق سے بھٹکا کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و فرمانبرداری سے باز رکھنے کا باعث بنتی ہے۔

ہر شخص کے وجود کے اندر ایک خاص روشنی ہوتی ہے جو اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ اگر یہ روشنی انسان کو صحیح راستے پر گامزن کر دے تو نہایت مناسب ہے اور اگر یہ روشنی انسان کو بے راہ روی کا شکار کر دے تو انسان ذلیل و رسوا ہو جاتا ہے۔

روح کے اسرار

روح میں 366 اسرار پائے جاتے ہیں جن میں سے ایک سر ایسا بھی ہے اگر روح اسے جسم پر ڈال دے تو انسان ہمیشہ گریہ وزاری میں مشغول رہے۔ ایک سر ایسا ہے کہ اگر اسے جسم پر ڈال دیا جائے تو انسان ہمیشہ مسکراتا رہے۔ ایک سر ایسا ہے کہ اگر اسے جسم پر ڈال دیا جائے تو انسان ہمیشہ چیخ و پکار میں مشغول رہے لیکن روح جسم پر صرف وہی اسرار ڈالتی ہے جو پہلے سے تقدیر میں لکھ دیئے گئے ہوں (احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک دن میں شیخ کی خدمت میں حاضر تھا۔ آپ کچھ بیان کر رہے تھے۔ اچانک حاضرین میں سے ایک صاحب بلند آواز سے چیخنے چلانے لگے اور کافی دیر تک ان پر یہ کیفیت طاری رہی۔ حضرت نے بعد میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ یہ بہت زبردست کیفیت ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس کیفیت میں شیطان انسان کو فریب نہ دے اور اس کی نماز کو فاسد نہ کرے' میں نے دریافت کیا' یہ کیسے ممکن ہے؟ آپ نے فرمایا۔

دل کا اللہ کی طرف متوجہ ہونا ہی دل کی نماز ہے جیسے رکوع و سجود وغیرہ کرنا جسم کی نماز ہے۔ نماز سمیت دیگر تمام شرعی احکام کی بنیادی حکمت اسی توجہ کا حصول ہے اور اسی کے نتیجے میں انسان عبادات کے صحیح فوائد حاصل کر سکتا ہے۔ لہٰذا جب شیطان یہ دیکھتا ہے کہ کوئی بندہ اللہ کا ذکر یا کوئی رقیق کلام سن کر اللہ کی طرف متوجہ ہونے لگا ہے تو شیطان اس کے دل میں جا کر اس کیفیت کو زائل کرنے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ آخر کار وہ انسان کا

بدترین شخ ن ہے۔ شیطانی کوشش کے نتیجے میں انسان کی حقیقی توجہ فاسد ہو جاتی ہے اس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔ وہ توجہ مکمل طور پر ختم بھی ہو سکتی ہے یا انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ شاید اسے معرفت نصیب ہوگئی اور پھر یہ اندیشہ سامنے آتا ہے کہ کہیں وہ اللہ سے لاتعلق نہ ہو جائے کیونکہ چیخنے چلانے کی وجہ سے انسان خود اور دوسرے لوگ اسے کچھ سمجھنے لگے ہیں اور اس کی طرف اشارے کیے جاتے ہیں اور یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ جس کی طرف اشارے کئے جانے لگیں وہ تباہ ہو جاتا ہے۔

شیطان کے سینگ

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس کی تائید شیخ زروق کی بیان کردہ اس حکایت سے ہوتی ہے جس کے مطابق فاس (نامی شہر) میں کچھ درویشوں کی ایک خانقاہ تھی۔ ایک دن انہوں نے ایک نابینا شخص کو بھی اپنی محفل میں مدعو کرلیا لیکن وہ نابینا صادق الحال شخص تھا۔ جب تمام لوگ ذکر میں مشغول ہوئے تو اچانک نابینا شیخ کہنے لگا۔ لوگو! شیطان تمہارے درمیان ایک سانڈ کی شکل میں گھس آیا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں جس شخص نے سرخ لباس پہن رکھا ہے۔ شیطان اسے سونگھنے کی کوشش کررہا ہے۔ پھر نابینا چلایا' شیطان نے اسے سینگ ماردیا ہے اور وہ سینگ اس کے اندر گھس گیا ہے۔ ابھی نابینا کی بات پوری نہ ہوئی تھی کہ اس سرخ پوش نے چیخ ماری اور اس کے حواس مختل ہو گئے۔ پھر نابینا نے کہا کہ فلاں لباس کس نے پہن رکھا ہے؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ اب شیطان اسے سونگھ رہا ہے۔ پھر وہ چلایا۔ شیطان نے اسے بھی سینگ ماردیا۔ مذکورہ شخص نے بھی چیخ ماری اور حواس کھو بیٹھا۔ اس حکایت سے یہ بات واضح ہوتی ہے ایک صادق شخص کی موجودگی میں ان تمام درویشوں کو شرمندگی کا شکار ہونا پڑا حالانکہ اس سے پہلے وہ خود کو صوفی سمجھتے تھے حالانکہ یہ ان کی جہالت تھی۔

ایک مرتبہ ایک بزرگ کی موجودگی میں' ایک شخص نے چیخ ماری بزرگ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ میں نے تمہاری چیخ کا تعاقب کیا تو وہ فلاں قبرستان کی ایک قبر میں داخل ہوگئی اس شخص نے جواب دیا آپ سچ فرمارہے ہیں۔ میں جب آپ کے پاس سے گزرا اور دیکھا کہ آپ کے حلقے کے لوگ اپنے محبوب حقیقی کی یاد میں مشغول ہیں تو مجھے اپنی محبوبہ یاد آ گئی جو میری چچازاد تھی۔ اس کا انتقال ہو چکا ہے اور اس کی قبر اسی قبرستان میں ہے جس کا آپ نے ذکر کیا۔ اس کی یاد میں بےقراری کے عالم میں میری چیخ نکل گئی۔

تمباکو نوشی حرام ہے

سیدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا۔ تمباکو نوشی حرام ہے کیونکہ یہ مضر صحت ہے اور اس میں مبتلا شخص اللہ کی عبادت سے غافل ہو جاتا ہے۔ جب ہمیں کسی چیز کے حرام یا حلال ہونے کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی واضح فرمان نہ ملے تو ہم ''دیوان الصالحین'' کے اراکین اولیاء کرام کیطرف دیکھتے ہیں۔ وہ یہ عمل کرتے ہوں تو ہم سمجھ جاتے ہیں کہ یہ حلال ہے لیکن اگر وہ یہ عمل نہ کرتے ہوں تو ہمیں پتہ چل جاتا ہے کہ یہ

حرام ہے اور اگر ان میں سے بعض یہ عمل کرتے ہوں اور اکثر یہ عمل نہ کرتے ہوں تو ہم اکثر کی پیروی کریں گے کیونکہ اکثریت حق بجانب ہوتی ہے جبکہ ''دیوان الصالحین'' کے اراکین میں سے کوئی ایک بھی تمبا کو استعمال نہیں کرتا۔ پھر فرشتوں کو بھی اس کی بو سے تکلیف ہوتی ہے۔ پھر آپ نے ایک ایسے شہر کا تذکرہ کیا جہاں کی فضاء بنی نوع انسان اور جانوروں کے فضلات کے باعث متعفن رہتی تھی کیونکہ وہاں پانی کم تھا۔ شیخ نے اس شہر سے متعلق دیگر معلومات بھی بیان فرمائی تھیں مگر ہم انہیں حذف کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ وہاں بے انتہا بدبو موجود رہتی تھی۔ ایک دن اہل تصرف اولیاء میں سے آٹھ حضرات اس شہر میں داخل ہوئے۔ اس کے درمیان میں پہنچنے کے بعد نہایت تیزی کے ساتھ یہاں سے نکل گئے کیونکہ ان کے ہمراہ موجود فرشتے بدبو کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ ان اولیاء کو یہ خدشہ پیدا ہوا تھا کہ کہیں وہ فرشتے ان سے الگ نہ ہو جائیں۔ فرشتوں کے الگ ہونے کے نقصان کو اہل بصیرت بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ ہم اس کی مثال یوں دے سکتے ہیں جیسے کسی شخص کو دشمن کے محلے یا چوروں کے گڑھ میں لایا جائے اور پھر اس کا اسلحہ چھین لیا جائے۔ اب وہ شخص کس طرح اپنے دشمن کا مقابلہ کرے گا۔

لہسن اور پیاز کا حکم

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے عرض کی لہسن اور پیاز اور ان جیسی دیگر اشیاء میں بھی بدبو پائی جاتی ہے لیکن ان کا استعمال حرام نہیں ہے؟ آپ نے فرمایا جب کسی مسئلے میں انسان اور فرشتے کے حقوق میں تصادم آجائے تو انسان کے حق کو فوقیت دی جائے گی کیونکہ تمام اشیاء انسان کے لئے ہی پیدا کی گئی ہیں اس لیے ہر وہ چیز جو انسان کے لئے مفید ہو حرام نہیں ہوگی۔ خواہ اس کے باعث کسی فرشتے کو ضرر کا سامنا کرنا پڑے۔ لہسن اور پیاز انسان کے عام استعمال کی چیزیں ہیں لیکن تمباکو کا حکم اس سے مختلف ہے کیونکہ یہ صحت کے لیے نقصان دہ ہے اس کی مثال ہم یوں بیان کر سکتے ہیں جیسے کوئی شخص خود ہی اپنا کپڑا پھاڑ کر اسے دوبارہ سینے لگے۔ اگر وہ کپڑا نہ پھاڑتا تو سینے کی ضرورت پیش نہ آتی اس لیے اگرچہ تمباکو نوشی کرنے والے کو اس کی طلب محسوس ہوتی ہے لیکن یہ طلب اس کی اپنی پیدا کردہ ہے (احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک مرتبہ ایک تمباکو نوشی کرنے والے شخص نے مجھے بتایا کہ اس نے ایک عیسائی طبیب کی زبانی تمباکو نوشی کے مضر اثرات کے بارے میں ہی کچھ سنا تھا جو حضرت شیخ نے بیان کیا تھا۔

حمام میں داخلے کا حکم

حضرت نے بیان کیا ہے کہ اگر فرشتے انسان سے الگ ہو جائیں تو یہ انسان کے لیے نہایت مضر ہوگا۔ ایک مرتبہ ایک اور سوال کا جواب دیتے ہوئے آپ نے یہی بات بیان کی جب میں نے آپ سے ایک مسئلے کے بارے میں دریافت کیا تھا جس میں علماء کی آراء مختلف ہیں اگر کسی شخص پر غسل واجب ہو اور پانی ٹھنڈا ہو تو کیا وہ غسل کے لئے کسی حمام میں جا سکتا ہے؟ شیخ حطاب کی رائے یہ ہے کہ حمام میں داخلہ مطلقاً ممنوع ہے۔ ایسے

شخص کو تیمم کر لینا چاہئے جبکہ شیخ مواق کی رائے یہ ہے کہ ایسا شخص اپنا ستر ڈھانپ کر حمام میں داخل ہو جائے او اپنی نگاہیں نیچے رکھے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا شیخ حطاب کی رائے درست ہے جبکہ شیخ مواق کے مشورہ پر عمل کرنا آفت سے خالی نہیں ہے۔ اگرچہ وہ شخص مکمل طور پر اپنی ستر پوشی کرے اور دوسروں کی شرمگاہ کی طرف دیکھنے سے مکمل طور پر بچا رہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گناہ کا ارتکاب اسی وقت ہوتا ہے۔ جب انسان کے اندر (یا اس کے آس پاس) وہ تاریکی چھا جائے جو جہنم کی تاریکیوں سے تعلق رکھتی ہے اور جس کے نتیجے میں انسان جہنم میں داخلے کا حقدار قرار پاتا ہے۔ ان تاریکیوں کو فرشتوں سے زیادہ اور کوئی محسوس نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب کچھ لوگ کسی حمام کی چھت کے نیچے کسی گناہ کے ارتکاب کے لئے اکٹھے ہوں گے تو وہاں تاریکی چھا جائے گی اور فرشتے اس جگہ سے دور ہو جائیں گے۔ فرشتوں کے رخصت ہوتے ہی شیطان اپنے لشکر سمیت وہاں پہنچ جائے گا۔ اس وقت وہاں موجود لوگوں کے ایمان کی کیفیت یہ ہوگی کہ جیسے کوئی چراغ تند ہواؤں کی زد میں آ جائے اور اس کی لو بھڑ کنے لگے۔ یہاں تک کہ وہ چراغ بجھ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ گناہوں کے ارتکاب کو کفر کا قاصد قرار دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے پس جب حمام میں موجود لوگوں کی یہ حالت ہوگی اور پھر وہاں ایک نیک اور دیندار شخص داخل ہوگا تو اس کا اپنا نور ایمان بھی حمام میں موجود تاریکیوں کی وجہ سے مضطرب ہو جائے گا کیونکہ یہ تاریکیاں ایمان کی ضد ہیں اس لیے اس نیک شخص کے ہمراہ موجود فرشتے بھی مضطرب ہو جائیں گے لہٰذا شیاطین ایسے شخص کو بہکانے کے بارے میں پرامید ہونگے۔ اس کے پاس پہنچ کر اسے دوسروں کی شرمگاہ کی طرف دیکھنے کی ترغیب دیں گے اسے بہکائیں گے۔ یہاں تک کہ اس پر غالب آ جائیں اور یہ شخص ان کے سامنے کمزور پڑ جائے گا۔ آخر اسے شہوت اچھی لگے گی اور یہ دوسروں کی شرمگاہ دیکھ کر لذت حاصل کرے گا۔ ہم اللہ تعالیٰ سے سلامتی کے طلبگار ہیں۔

صحبت کا اثر

فرض کریں کچھ لوگ محفل ناؤ نوش سجا کے بیٹھے ہوں اور اس کے ہمراہ دیگر لوازمات بھی وہاں موجود ہوں شراب کے نشے میں مست ہوں، بہک رہے ہوں، فحش کلامی میں مشغول ہوں اور پھر وہاں ایک شخص آئے جس کے ہاتھ میں ''دلائل الخیرات'' موجود ہو اور پھر وہ ان سب لوگوں کے سامنے اسے پڑھنا شروع کر دے اور پورے ایک دن تک ان کے پاس رہے۔ اس سارے عرصے کے دوران وہ شراب نوشی میں مشغول رہیں اور یہ پڑھتا رہے۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ یہ شخص بھی ان لوگوں کے ساتھ مل جائے گا۔ اس کی وجہ وہی ہے جو ہم نے ابھی بیان کی ہے (یعنی وہاں سے فرشتے رخصت ہو جاتے ہیں) یہی وجہ ہے کہ شریعت نے بدکار لوگوں کی ہم نشینی سے منع کیا ہے کیونکہ خون، شہوت اور غفلت، نیک و بد سب کے اندر پائی جاتی ہے۔ بہت کم لوگ ان (کی آفات) سے محفوظ رہے ہیں۔

جہنم کی ہیبت

ایک مرتبہ آپ نے جہنم کا ذکر کرتے ہوئے اس کے اس قدر اوصاف بیان کئے کہ حاضرین میں سے ایک صاحب کہنے لگے۔ میرے آقا! اگر لوگوں کو جہنم کے (عذاب کے) بارے میں علم ہو جائے تو وہ کھانے پینے سے بھی باز آ جائیں۔ آپ نے فرمایا اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھنے والا ہر شخص جہنم سے واقف ہوتا ہے کیونکہ جس شخص کی زبان پر جہنم کا ذکر جاری ہوگا۔ اس کے دل پر بھی یہ ذکر جاری ہوگا۔ جب اس کے کان اس کا ذکر سنیں گے تو اس کا دل بھی اس کے ذکر کو سنے گا لہٰذا جہنم پر ایمان کے حوالے سے اس شخص کا ظاہر اور باطن ایک جیسے ہوں گے اور جس طرح اس کا ظاہر جہنم سے آگاہ ہوگا۔ اسی طرح اس کا باطن بھی جہنم سے آگاہ ہوگا لیکن اصل خوبی یہ ہے کہ انسان کا ظاہر و باطن ہر وقت جہنم کو پیش نظر رکھے جسے یہ کیفیت نصیب ہو گئی اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمائے گا اس کی غفلت کو زائل فرمائے گا اور اس کی مخالفت کم ہو جائے گی۔ اس کے برعکس جو شخص ہمیشہ جہنم کو پیش نظر نہیں رکھے گا اس کے ساتھ الٹ معاملہ ہوگا۔

جسمانی نظام میں خون کے اثرات

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا کس وجہ سے لوگ جہنم کو ہمیشہ پیش نظر نہیں رکھتے؟ آپ نے فرمایا اس کا سبب انسان کے جسم میں موجود خون اور اس کے بخارات ہیں۔ جب انسان جہنم کا ذکر کرتا یا سنتا ہے تو اس کی ہیبت دل پر طاری ہوتی ہے اور اس وقت وہ خون اور بخارات پھٹ جاتے ہیں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) یہی وجہ ہے کہ خوف کے عالم میں انسان کا چہرہ زرد ہو جاتا ہے کیونکہ جب خون رخصت ہو جائے تو اس کی بدولت پیدا ہونے والی غفلت بھی زائل ہو جاتی ہے اور پھر جب یہ کیفیت ختم ہو جائے تو خون اپنی اصل حالت میں واپس آ جاتا ہے اور غفلت دوبارہ آ جاتی ہے۔ جب انسان دوبارہ جہنم کا ذکر سنتا ہے تو خون پھر رخصت ہو جاتا ہے اور غفلت زائل ہو جاتی ہے چنانچہ اسی طرح جہنم کو یاد کرنے سے غفلت دور ہوتی ہے اور جہنم کو بھلا دینے سے غفلت طاری ہو جاتی ہے لیکن اگر اللہ کا فضل شامل حال ہو (تو غفلت طاری نہیں ہوتی) یہ غفلت کتنے عرصے تک طاری رہتی ہے اور کتنے عرصے بعد ختم ہوتی ہے اس بارے میں لوگوں کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے کچھ لوگ ایک یا دو گھڑی تک غافل رہتے ہیں اور کچھ ایک دو دن تک ہمیں اس بات کا جائزہ لینا چاہیے کہ ہماری کیفیت کیا ہے۔ (قرآن کے الفاظ کے بقول)

عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ (شوریٰ ۴۲:۱۰)

''اسی پر توکل کرتا ہوں اور اس کی طرف رجوع کرتا ہوں''۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا جہنم کا ذکر سن کر غفلت کے زائل ہونے اور خون کے بھاگنے اور اس کی برعکس صورتحال کا بنیادی سبب کیا ہے؟ آپ نے فرمایا ذکر سن کر بیداری اور افاقہ حاصل ہوتا

ہے۔ گویا اسی وقت اس شخص کو عقل ملی ہے اور اب اس کے سارے کام درست ہو جائیں گے۔ جب اس نے ذکر نہیں سنا تو وہی غفلت واپس آ جاتی ہے۔ اس کی مثال ہم یوں بیان کر سکتے ہیں جیسے کوئی شخص نیند کی حالت میں ہو اور اسے کوئی شخص آواز دے تو وہ ناگواری کے عالم میں جواب دے گا اور جیسے ہی آواز آنا بند ہو گی وہ دوبارہ گہری نیند سو جائے گا۔ اس لیے کہ دراصل اس کی شخصیت پر نیند غالب تھی جو اس پکار سے پہلے موجود تھی اسی طرح غفلت بھی انسان پر پہلے سے موجود ہوتی ہے۔

کشف کا حکم

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے حضرت سے کشف کے بارے میں دریافت کیا کہ اس کے بارے میں غور و فکر کرنا اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والے غیب کے علم کی حیثیت کیا ہے؟

آپ نے فرمایا کشف اور اس جیسے دیگر کمالات دل کو اللہ تعالیٰ سے لاتعلق کر دیتے ہیں اور انسان کا باطن معرفت الٰہیہ سے دور ہو جاتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی بندہ اپنے دل میں اللہ کا تصور کرتے ہوئے اس بات کا پختہ یقین کر لے کہ اللہ تعالیٰ جو چاہے کر سکتا ہے اور اپنی پسند کے مطابق کوئی بھی حکم دے سکتا ہے اس کے سوا کوئی دوسرا امور کی تدبیر نہیں کر سکتا۔ اس کی بادشاہی میں کوئی شریک نہیں۔ وہ اپنے بندوں پہ نہایت مہربان ہے اور ان کی آرزوؤں سے بڑھ کر انہیں عطا کرتا ہے۔ ان کے گمان سے زیادہ ان پر رحمت کرتا ہے۔ اس کیفیت میں انسان پوری رضامندی کے ساتھ اپنے پروردگار کو اپنا کارساز سمجھنے لگتا ہے اور اپنے تمام امور میں اسی کی ذات کو رہنما سمجھتا ہے۔ مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے وہ اپنی ذات کی ساری کنجیاں اور لگامیں اسی کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ ہر معاملے میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ ایسی صورت میں اسے ان چیزوں کا مشاہدہ نصیب ہوتا ہے جنہیں کسی آنکھ نے نہ دیکھا ہوگا۔ کسی کان نے نہ سنا ہوگا اور نہ ہی کسی انسان کے ذہن میں انکا خیال آیا ہوگا۔ یہ وہ فضل و کرم ہے جو آقا و مولا اس بندے پر کرتا ہے اور یہ کیفیت اس شخص کی ہے جس کا دل اللہ کے ذکر سے معمور ہو۔

اس کے برعکس جس کا دل اللہ کی یاد سے غافل ہو اور اس پر مکمل غفلت چھا چکی ہو۔ وہ صرف اپنے آپ کا اور اپنے اعمال کا مشاہدہ کرتا ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو مذکورہ بالا امور (کشف وغیرہ میں) مشغول ہو کر غیب کی اطلاعات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ پوشیدہ چیزوں سے آگاہ ہو کر بہت سے فوائد حاصل کر سکے۔ ایسی صورت میں اللہ اسے اس کے نفس کے حوالے کر دیتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کی اپنی تدبیر ہی اس کی بربادی کا باعث بنتی ہے اس پر بلائیں اور مصیبتیں نازل ہوتی ہیں۔ امیدیں پوری نہیں ہوتی اور مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اس طرح کے لوگوں سے متعلق عام مشاہدات بھی اس بات کی تائید کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کی بدولت ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔ یہ اس شخص کے لئے نہایت ہلکی سی سزا ہے جو اپنے آقا و مولا سے منہ موڑ کر اپنی تقدیر پر راضی نہ ہو۔

ایک عیسائی راہب کا قصہ

ایک عیسائی راہب کا نہایت حیرت انگیز قصہ منقول ہے۔ وہ اپنے گرجا میں سب سے مقدس اور محترم سمجھا جاتا تھا۔ اس کی عادت یہ تھی کہ وہ گرجا سے باہر جاتے ہوئے کبھی بھی اپنی پشت صلیب کی طرف نہیں کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اس کا بیٹا سمندر کے سفر پر روانہ ہوا۔ سمندر ان دنوں طغیانی کی زد میں تھا۔ اسے اپنے بیٹے کی خیریت کے بارے میں طرح طرح کے خدشات ستانے لگے اور وہ اپنے بیٹے کی خیریت کی اطلاعات کا شدت سے منتظر تھا۔ آخر ایک دن اسے اطلاع ملی کہ اس کا بیٹا بخیریت واپس آ گیا ہے۔ وہ خوشی کے مارے اس قدر دیوانہ ہوا کہ گرجا سے باہر نکلتے وقت اپنی عادت کو بھول گیا اور صلیب کی طرف پشت کر کے باہر نکلا' بیٹے سے ملاقات کے بعد اسے خیال آیا کہ اس سے کیا غلطی سرزد ہوئی ہے؟ وہ فوراً واپس آیا اور دوسرے پادریوں سے کہا کہ مجھے 1000 کوڑے لگاؤ۔ انہوں نے حیرانگی سے دریافت کیا' وہ کیوں؟ اس نے بتایا آج میں نے صلیب کی طرف پشت کر لی تھی۔ انہوں نے اس غلطی کو عظیم شمار کرتے ہوئے اسے پورے ہزار کوڑے مارے اسے شدید تکلیف ہوئی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ تکلیف کی اس شدت کے باعث اس کے دل سے صلیب کا ادب واحترام ختم ہو جائے گا اور وہ اپنے دین سے دستبردار ہو جائے گا۔ مگر اس نے چھری لے کر اپنے دونوں پاؤں ٹخنوں سے کاٹ دیئے اور بولا ''جو اپنے آقا سے منہ موڑے' اس کا یہی انجام ہونا چاہیے''۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں۔ اگر گمراہ اور باطل عقائد کے حامل لوگوں سے یہ عمل سرزد ہو سکتا ہے تو ان کا حال کیا ہونا چاہیے جو صحیح عقیدے پر قائم ہیں؟ پھر خود ہی فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کے علم اور ارادے میں پہلے سے یہ بات طے تھی کہ وہ کچھ لوگوں کو اپنی رحمت کے لئے پیدا کرے گا اور کچھ کو عذاب کے لئے پیدا کرے گا۔ اس لیے لوگوں کی حرکات ان کی تقدیر کے مطابق ہوتی ہیں مگر جو لوگ اہل رحمت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے قلوب کو اپنی ذات سے متعلق کر دیا ہے۔ ان کی تمام تر کوششیں اللہ کی رضا کے حصول کے لئے ہوتی ہے۔ ان کی حرکات وسکنات احکام الٰہی کی تابع ہوتی ہیں۔ ان کی نماز' روزے' قیام' قعود' شب بیداری اور محبت سب کچھ اللہ کے لیے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی پسندیدہ چیزوں کی طرف متوجہ کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ واصل باللہ ہو جاتے ہیں اور اللہ کی رحمت کی آغوش میں آ کر اپنی تقدیر کا لکھا حاصل کر لیتے ہیں ان کے برعکس اہل عذاب کے دل غیر اللہ سے متعلق ہو جاتے ہیں اور ان کی تمام تر کوششیں ان چیزوں کے لئے ہوا کرتی ہیں۔ جن کی حیثیت لکڑی کے جالے سے زیادہ کمزور ہوتی ہے۔ جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں اس لیے ان کی تمام حرکات انہی امور کی تابع ہوتی ہیں۔ ان کا قیام غیر اللہ کے لیے ہوتا ہے۔ ان کا بیٹھنا' راتوں کو جاگنا' غرض یہ کہ ہر کام غیر اللہ کے لئے ہوتا ہے اور وہ اپنے مقدر کے مطابق عذاب کے حقدار قرار پاتے ہیں۔

بچوں اور بوڑھوں کی حالت

ایک بزرگ نے یہ حکایت بیان کی ہے ایک مرتبہ میں صبح سے لیکر دو پہر تک ستر برس کی عمر کے دو بوڑھوں کے پاس بیٹھا رہا۔ اس سارے وقت میں وہ صرف دنیا کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ ان کی زبان پر اللہ اور اس کے رسول کا ذکر تک نہیں آیا۔ آخر میں اٹھا اور وضو کر کے دو لڑکوں کے پاس آ کر بیٹھا جو بلوغت کی عمر کو پہنچنے والے تھے۔ وہ دونوں اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کے بارے میں ایسی گفتگو کر رہے تھے کہ مجھے ان کی اور دونوں بوڑھوں کی حالت پر حیرت ہو رہی تھی۔ (قرآن کہتا ہے)

ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (الانعام ۶:۹۶)

(یہ علم رکھنے والے غالب (پروردگار) کی مقرر کردہ تقدیر ہے)

پھر سیّدی عبدالعزیز دباغ نے اسی بات کی تائید میں فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے دل کو غیر کے ساتھ متعلق کر دیتا ہے تو اسے اس قدر ڈھیل دیتا ہے جو گمان سے ماوراء ہے اور اسے فتنے میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے سامنے غیب کی خبریں بھی ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ پھر آپ نے حکایت بیان کی جس سے دل پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔

برے انجام کا شکار ایک بدنصیب

ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ نے ایک ولی کی ولایت سلب کر لی اور اس کے دل کو نورِ حق سے لاتعلق کر دیا۔ اس کیفیت سے پہلے اس ولی سے دیگر اولیاء کی مانند کرامات کا صدور ہوتا تھا لیکن اب اس کی ذات سے مختلف طبی کمالات کا اظہار ہونے لگا جو نہایت حیرت انگیز تھے مگر اس کے لیے فتنے کی حیثیت رکھتے تھے کیونکہ وہ بدستور اسی غلط فہمی کا شکار تھا کہ وہ اب بھی اللہ کا ولی ہے۔ اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی لوگ اس کی خدمت میں بھاری نذرانے پیش کیا کرتے تھے اور وہ مال اکٹھا کرنے میں مشغول ہو گیا۔ کم و بیش تیرہ برس تک وہ اس فتنے میں مشغول رہا اور اس نے ستر ہزار دینار جمع کیے لیکن مرتے وقت اس کا کوئی وارث نہیں تھا اس لیے وہ تمام مال بیت المال میں جمع کروا دیا گیا اور اس کا انجام خسارے کی صورت میں ہوا۔ ہم اللہ تعالیٰ سے سلامتی اور عافیت کے طلبگار ہیں۔

جنابت کیا ہے؟

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک مرتبہ میں نے حضرت سے سوال کیا۔ ولی کو جنابت کے بارے میں کیسے پتا چلتا ہے جب کسی جنبی نے غسل نہ کیا ہو؟

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا۔ اولیاء کے نزدیک جنابت کی مختلف صورتیں ہیں' غسل ایک ہی صورت میں واجب ہوتا ہے لیکن اولیاء کے نزدیک اس کے کئی اسباب ہیں لیکن علماء کے نزدیک اس کا ایک سبب

ہے لہٰذا اولیاء کے نزدیک ان تمام اسباب میں سے کسی ایک سبب کے پائے جانے سے بھی غسل واجب ہو جائے گا جبکہ علماء کے نزدیک صرف ایک مخصوص سبب کی بدولت غسل واجب ہوگا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا۔ وہ کون سا امر ہے جس کا سبب علماء کے نزدیک ایک ہے؟ اور اولیاء کے نزدیک اس کے اسباب مختلف ہیں؟ آپ نے فرمایا۔ اس کی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ سے اس طرح لاتعلق ہو جائے کہ اس کی توجہ مکمل طور پر اللہ سے ہٹ جائے۔ اس کا وجود غیر اللہ کے قرب میں فرحت محسوس کرے اور اس کے وجود کے تمام اجزاء اس کی سوچ سمیت غیر اللہ کی طرف متوجہ رہیں اور وہ غیر اس عالم میں اس شخص کو مکمل طور پر اللہ سے لاتعلق کر دے۔ جب انسان اس کیفیت میں اللہ تعالیٰ سے لاتعلق ہو جائے گا تو اس کے ہمراہ تعینات محافظ فرشتے اس سے دور بھاگیں گے کیونکہ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ سے لاتعلقی بہت بڑا گناہ ہے۔ لہٰذا صوفیاء کے نزدیک ہر وہ عمل جو اللہ تعالیٰ سے لاتعلقی کا باعث بنے اس کے ارتکاب پر غسل واجب ہوتا ہے لیکن علماء کے نزدیک صحبت کرنے یا اس نوعیت کے دیگر امور سے غسل واجب ہوتا ہے۔ غسل کا راز یہ ہے کہ انسان کو اللہ سے لاتعلقی سے پاک کر دیا جائے کیونکہ یہ لاتعلقی بھی نجاست کی حیثیت رکھتی ہے اس لیے جب انسان غسل کرنے لگتا ہے۔ تو محافظ فرشتے بھی واپس آنے لگتے ہیں لہٰذا ولی جب کسی ایسے شخص کو دیکھے جو اللہ تعالیٰ سے غافل ہو چکا ہو اور اس کے ہمراہ محافظ فرشتے موجود نہ ہوں تو ولی سمجھ جاتا ہے کہ فرشتوں کی عدم موجودگی کا سبب انسان کی اللہ تعالیٰ سے لاتعلقی ہے جو جنابت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ اگر کوئی شخص صحبت کرتے وقت اپنی توجہ اللہ کی طرف مبذول رکھے تو اس پر غسل واجب نہیں ہونا چاہیے۔ آپ نے فرمایا ایسے شخص کی مثال نادر ہے اور نادر شخص پر حکم عائد نہیں ہوتا۔

ولی کی صلاحیت

ایک دفعہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا۔ ولی کے اندر یہ صلاحیت موجود ہوتی ہے کہ اگر وہ کسی عام شخص کے بارے میں یہ بات کہہ دے تو فوراً وہ عام شخص اور ولی معرفت کے ایک ہی مرتبے پر فائز ہو جائیں اور ان دونوں کے درمیان کوئی فرق نہ رہے یعنی کوئی بھی ولی ایک لمحے میں کسی بھی شخص کو رحمت باری تک واصل کر سکتا ہے لیکن اس کا سارا مدار اس گوند پر ہے جس کے ذریعے اس سر کو چپکایا جاتا ہے۔ اگر اس عام شخص کے اندر اس سر کو چسپاں کرنے کی صلاحیت نہیں ہوگی تو سر اپنے اصل کی طرف لوٹ آئیگا۔ اس کی مثال بالکل اسی طرح ہے جیسے کوئی شخص ہوا میں قمیض، شلوار یا عمامہ لٹکا دے تو وہ ہوا کے سامنے نہیں ٹھہر سکیں گے۔

نفس کی موت

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں اس بارے میں حضرت سے ایک سوال کرنا چاہتا تھا لیکن اسی وقت مجلس

برخاست ہونے کی وجہ سے سوال نہ کرسکا۔ رات خواب میں حضرت کی زیارت ہوئی تو میں نے اپنا سوال پیش کیا۔ آپ نے فرمایا اس گوند سے مراد نفس کی موت ہے۔ جب اگلے دن میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور رات کا خواب سنایا تو آپ نے فرمایا۔ یہ جواب ٹھیک ہے۔ میں نے عرض کی۔ نفس کی موت سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا کبھی اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ انسان کے اعمال صرف اللہ کی رضا کے حصول کے لئے ہوں اور کبھی اس کی علامت یہ ہوتی ہے کہ جب بندے کے دل میں وسوسے پیدا ہوں تو یہ نفس کی زندگی کی علامت ہے۔ نفس جس قدر طاقتور ہوگا۔ وسوسے اتنے ہی زیادہ آئیں گے جس شخص کا دل وسوسوں سے خالی ہوگا۔ اس کا نفس گویا قریب المرگ ہوگا جس کا دل وسوسوں کی آماجگاہ ہوگا۔ اس کا نفس زندہ ہوگا اور نفس کی زندگی اس بات کی دلیل ہے کہ ایسے شخص کا عمل خالص اللہ کی رضا کے لئے نہیں ہے بلکہ نفس کی خوشنودی کے لئے ہوگا۔ میں نے عرض کی۔ اس صورتحال سے نجات کا طریقہ کیا ہے جس کے نتیجے میں نفس فنا کے گھاٹ اتر جائے؟ اور اس طرح پگھل جائے جیسے نمک پانی میں حل ہو جاتا ہے تاکہ ہمیں اس کی فریب کاری سے نجات حاصل ہو۔ آپ نے فرمایا اس کا علاج یہی ہے کہ اس پر بہت بڑا پہاڑ گرا دیا جائے۔ میں نے دریافت کیا کہ وہ پہاڑ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا وہ اللہ کی معرفت اور اس کا مشاہدہ ہے۔ جب انسان کا دل اللہ کی معرفت سے معمور ہوگا اور اسے اس بات کا یقین ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اس کے ہر قول اور فعل سے بخوبی آگاہ ہے۔ نیز اس کی ہر حرکت اللہ کی مشیت کے مطابق ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے ارادے کے مطابق اسے انعام و اکرام سے نوازتا ہے اور آخر کار اسے اپنے پروردگار کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے پھر اس کا پروردگار اسے جہاں چاہے گا داخل فرما دے گا۔ جب انسان ان سب باتوں پر یقین کرے گا تو اسے بخوبی یہ پتہ چل جائے گا کہ وہ اپنی ذات کو اور دوسروں کو دنیا میں و آخرت میں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ البتہ اگر اللہ چاہے تو یہ دوسروں کے فائدے کا سبب بن سکتا ہے۔ اس کیفیت میں انسان کو کسی کی طرف دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور اس کا نفس موت کے گھاٹ اتر جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کی بدولت ہمیں بھی نفس کو مغلوب کرنے کے اسباب مہیا فرمائے۔

ضامہ کا حکم

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک مرتبہ میں کچھ لوگوں کے پاس سے گزرا جو "ضامہ" (نامی کھیل) کھیلنے میں مشغول تھے۔ میں نے حضرت سے اس کھیل کا حکم دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ کھیل حرام ہے۔ میں نے دریافت کیا کیوں؟ آپ نے فرمایا کسی بھی شے کو حرام قرار دینے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ شے انسان کو اللہ تعالیٰ سے لاتعلق کر دیتی ہے۔ لہٰذا ہر وہ شے جو انسان کو اللہ تعالیٰ سے لاتعلق کر دے اور شارع کے نزدیک اس کا کوئی فائدہ بھی نہ ہو تو وہ شے حرام ہوگی۔ جس کھیل کے بارے میں تم نے دریافت کیا ہے اس میں کوئی فائدہ نہیں پایا جاتا۔ صرف یہ انسان کو اللہ تعالیٰ سے غافل کر دیتا ہے لہٰذا یہ حرام ہے کیونکہ اس کھیل کو کھیلتے وقت انسان کی پوری توجہ اس کھیل کی طرف مبذول ہو جاتی ہے اور انسان مکمل طور پر اللہ کی طرف سے غافل ہو جاتا ہے۔ میں

نے سوال کیا تیر اندازی، گھڑ دوڑ اور اس جیسے دیگر آلات حرب (مثلاً تلوار بازی، نیزا بازی) کے دوران بھی انسان اللہ تعالیٰ سے غافل ہو جاتا ہے لیکن یہ امور حرام نہیں ہیں۔ آپ نے فرمایا ان کو ضامہ پر قیاس نہیں کیا جا سکتا کیونکہ شارع کی نظر میں ضامہ کا کوئی فائدہ نہیں اور انسان کو بھی اس کھیل سے کوئی فائدہ نہیں لیکن تیر اندازی اور گھڑ سواری کے نتیجے میں انسان اپنے دشمنوں کیخلاف تیاری کرنے کے قابل ہو جاتا ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں دیا ہے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ (الانفال ۸:۶۰)

(جہاں تک ہو سکے ان کفار کے مقابلے میں قوت اور گھوڑے تیار رکھو)

لہٰذا ہر وہ چیز جو شارع کا مقصود ہو یا مقصود بننے کی صلاحیت رکھتی ہو وہ اللہ تعالیٰ سے قطع تعلقی کا باعث نہیں بنے گی یہی وجہ ہے کہ شطرنج کے بارے میں علماء کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض حضرات نے اسے جائز قرار دیا ہے کیونکہ اس کے ذریعے دشمن کا مقابلہ کرنے کی مشق ہوتی ہے اور یہ بات شارع کا مقصود قرار دی جا سکتی ہے جبکہ بعض دیگر حضرات کے نزدیک یہ حرام ہے کیونکہ شارع کی غرض صرف اسی ایک طریقے سے متعلق نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے کوئی اور طریقہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے جو زیادہ آسان اور واضح ہو البتہ اس صورت میں شطرنج کی حرمت کا حکم ضامہ سے کم ہوگا۔

اہل ایمان سے محبت کا ثمر

ایک مرتبہ حضرت سیّدی عبدالعزیز دباغ نے کسی بزرگ کا یہ قول بیان کیا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی جو راسخ کیفیت نصیب ہوئی، اس کی جملہ فروعات کے حصول کا بنیادی سبب یہی ہے کہ میں بلا امتیاز تمام اہل ایمان سے محبت کرتا ہوں اور بلا امتیاز تمام کفار سے نفرت کرتا ہوں۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے فرمایا۔ جب انسان کی کیفیت یوں ہو جائے تو اس کی خواہش اور طلب کے بغیر بھی اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرنے کی کیفیت نازل ہونے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر انسان اس کیفیت سے چھٹکارہ حاصل کرنے کی کوشش کرے تب بھی اس کا نزول جاری رہتا ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ انسان بلا تفریق ہر مسلمان سے محبت کرے۔ بعض سے محبت اور بعض سے نفرت کرنا درست نہیں ہے۔ کیونکہ یہ صورتحال اس وقت پیدا ہوگی جب انسان کے دل میں حسد یا تکبر کی وجہ سے کسی مومن کے خلاف بغض کے جذبات پائے جائیں گے اور اس کی نیت درست نہیں ہوگی جبکہ خالص توبہ اس شخص کو نصیب ہوتی ہے جس کے دل کی زمین صاف اور پاکیزہ ہو اس لیے جب انسان تمام اہل ایمان سے محبت کرنے لگتا ہے تو اس کے دل کا میل صاف ہوتا ہے اور اس پر خالص توبہ کا نزول ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت نے ارشاد فرمایا: ایسے شخص کو توبہ کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی کیونکہ اہل ایمان سے محبت رکھنے کے باعث اس کے تمام گناہ ختم ہو جاتے ہیں اور دل میں گناہ کی طرف راغب کرنے والے تمام

جذبات اس کی بدولت ختم ہو جاتے ہیں۔

آپ نے مزید ارشاد فرمایا گناہ کی طرف راغب کرنے والے امور میں سب سے زیادہ خطرناک حسد ہے اور جب یہ محبت پائی جائے گی تو حسد ختم ہو جائے گا۔ ہم حسد کو سب سے بڑا فریب اس لیے قرار دیتے ہیں کیونکہ دیگر تمام گناہوں کی بنیاد یہی جذبہ ہے۔ مثال کے طور پر اگر آپ کسی شخص سے صرف اس لیے بغض رکھتے ہو کہ مال و دولت یا اولاد کے حوالے سے وہ آپ سے بڑھ کر ہے تو یہ بغض حسد ہی کا نتیجہ ہوگا۔ اسی طرح اگر آپ اپنے غرور اور تکبر کی بدولت کسی دوسرے کو اپنا ہم مرتبہ ہونے سے باز رکھنا چاہتے ہیں تو اس کا محرک بھی حسد ہوگا کیونکہ بالواسطہ طور پر آپ کی خواہش یہی ہے کہ دوسرے کو یہ مرتبہ نہ ملے اور یہ خواہش حسد ہے جو تمام خرابیوں کی بنیاد ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ہم اس سے پہلے بھی حسد کے نقصانات کا تذکرہ کر چکے ہیں اور یہ بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ حسد ظلمتوں کے ابواب میں سے ایک دروازہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نفس کے شر اور ہر شریر کے شر سے محفوظ فرمائے۔

رضائے الٰہی کے لیے محبت یا نفرت

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے حضرت سے دریافت کیا۔ اگر یہ شخص بغیر کسی تفریق کے تمام اہل ایمان سے محبت کرتا ہے تو پھر اللہ کی رضا کے لئے کسی سے دوستی یا دشمنی کا حکم کہاں جائے گا حالانکہ اس عمل کو ایمان کی شاخ قرار دیا گیا ہے اس لیے جب ہم کسی گناہ گار شخص سے نفرت کرنے کی بجائے اس سے محبت کریں گے تو گویا حکم خداوندی کی مخالفت کے مرتکب ہونگے۔ حضرت نے جواب دیا' ہمیں کسی گناہگار کے عمل سے نفرت کرنی چاہیے۔ اس کے مومن وجود' پاکیزہ دل اور مستقل ایمان سے نفرت نہیں کی جا سکتی کیونکہ اس کی محبت کو لازم کرنے والے یہ امور مستقل ہیں جبکہ نفرت پیدا کرنے والا عمل یعنی گناہوں کا ارتکاب عارضی حیثیت رکھتا ہے اس لیے اصولی طور پر ہمیں ہر مومن سے محبت رکھنی چاہیے اور اس کی عارضی خرابی سے نفرت کرنی چاہیے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم یوں محسوس کریں کہ جیسے اس کے لباس پر پتھر بندھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ہمیں ان پتھروں سے الجھن ہوگی لیکن اس کی وجود سے محبت ہوگی۔ شریعت نے ہمیں گناہگار شخص سے اسی قدر نفرت کرنے کا حکم دیا ہے۔ اسی لیے ہم کفار کی ذات اور ان کے افعال سے نفرت کرتے ہیں لیکن گناہگار مومن کا حکم اس سے مختلف ہے کیونکہ ہمیں اس سے نفرت کرنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ مبادا کہ اس نفرت کی بدولت اس کی ذات اور اللہ تعالیٰ' رسالت' نبوت' آسمانی کتابوں' یوم آخرت' حشر ونشر' جنت و دوزخ' صراط و میزان' فرشتوں' تقدیر وغیرہ پر اس کے ایمان سے بھی نفرت کرنے لگیں۔ اس لیے ہم اس کی ہر خوبی سے محبت کریں گے اور جب مذکورہ بالا خوبیاں اس میں پائی جاتی ہیں تو ان کے مقابلے میں کبھی بھی اس شخص کو نفرت ہمارے دل میں نہیں سما سکے گی۔ البتہ ہم صرف اس کے گناہوں سے نفرت کرتے ہوئے اس کے لئے دعائے خیر میں مشغول رہیں گے بالخصوص اس

وقت جب ہماری توجہ اس کی حقیقت کی طرف مبذول ہوگی۔ عام طور پر لوگ جب کسی گناہگار سے نفرت کرنے لگتے ہیں تو ان کی نفرت کا مرکز سب سے پہلے اس کی ذات ہوتی ہے اور یہ لوگ اس کی ان خوبیوں کو نظرانداز کر دیتے ہیں جن کی بدولت اس گناہگار سے محبت رکھنا واجب ہے۔ آخر کار ایسے لوگوں کے دل میں اس گناہگار کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

خودنمائی کا وبال

ایک مرتبہ حضرت دباغ نے ارشاد فرمایا۔ وہ شخص ٹھیک نہیں ہے جو سواری' لباس' رہائش یا خوراک کے حوالے سے اپنے آپ کو دوسروں سے نمایاں کرنے کا خواہشمند ہو۔ میں نے دریافت کیا' اس میں کیا حرج ہے؟ آپ نے فرمایا کیونکہ یہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر کے اللہ ربّ العزت سے غافل کر دیتا ہے اس لیے یہ خود بھی اللہ تعالیٰ سے لاتعلق ہو جاتا ہے۔ میں نے عرض کی۔ اس کی طرف متوجہ ہونے والے لوگ اگر پہلے ہی سے اللہ تعالیٰ سے غافل ہوں تو اس کی وجہ سے مزید کیا لاتعلق ہوں گے؟ آپ نے فرمایا۔ (تم ٹھیک کہہ رہے ہو) یہ لوگ پہلے ہی سے لاتعلق ہوتے ہیں مگر اب ان کی عدم توجہ میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے اور جو اس امتیاز میں مشغول ہو جائے روح اس سے متنفر ہونے لگتی ہے کیونکہ اس عمل کی بدولت روح کو ذلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا وہ جسم کے فعل پر ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے اس سے نفرت کرنے لگتی ہے کیونکہ اب اسے اپنے پروردگار کی طرف جانے کا راستہ دکھائی نہیں دیتا اور اپنی بربادی صاف دکھائی دیتی ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) گویا خودنمائی میں دو آفات پائی جاتی ہیں۔ ایک اپنی ذات کے لئے اور دوسری آفت دوسرے لوگوں کے لئے (احمد بن مبارک کہتے ہیں) حاضرین میں ایک سخی اور مہربان طبیعت کے مالک صاحب نے دریافت کیا۔ اگر کوئی نمایاں کر کے صدقہ و خیرات کرے تو کیا یہ مضر کام ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں! جہاں تک ممکن ہو' پوشیدہ طور پر صدقہ و خیرات کرنا چاہیے۔ میں ایک ایسے شخص سے واقف ہوں جس نے مغرب اور عشاء (کے درمیان مختصر سے وقت میں) 25 مثقال سونا' حاجتمندوں میں بطور خیرات تقسیم کیا۔ لیکن کوئی ایک حاجت مند بھی اس شخص کو نہیں جانتا۔ انہی صاحب نے دوبارہ سوال کیا۔ بالفرض وہ شخص پوشیدہ طور پر صدقہ کرتا ہے۔ مگر دل میں اپنے آپ کو اس عمل پر بہت شاباش دیتا ہو؟ آپ نے فرمایا اگر تو وہ اپنے آپ کو بہت نیک سمجھتا ہے تو بھی اسی طرح صدقہ کرنے میں زیادہ بہتری ہے کیونکہ عین ممکن ہے کہ کسی وقت وہ خود پسندی سے باز آ جائے اور اس وقت اس کے صدقے میں کوئی کھوٹ نہ ہو اور وہ صدقہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہو۔

عمر میں اضافے کی حکمت

پھر آپ نے مزید ارشاد فرمایا۔ ہماری عمروں میں اضافے کا سب سے بڑا فائدہ ہی یہ ہے کہ ۶۰' ۷۰ برس کے دوران شاید کوئی ایسی گھڑی نصیب ہو جائے جو قبولیت کی ہو کیونکہ ہمارے اوپر شہوت اور نفس کی پیروی اس

قدر غالب ہو چکی ہے کہ ہمارا کوئی بھی عمل ان کی دخل اندازی سے محفوظ نہیں ہوتا۔ ہمارا ہر عمل خلوص سے خالی ہوتا ہے۔ لہٰذا اس نوعیت کے اسباب نیکی کے ارتکاب میں رکاوٹ نہیں بن سکتے۔ لیکن اگر صرف ریا کاری یا کسی دنیاوی مقصد کے حصول کے لئے صدقہ کیا جائے تو یہ سوچ ضرور رکاوٹ بن سکتی ہے اس صورت میں صدقے کا عمل نیکی کی بجائے گناہ بن جائے گا۔ اگرچہ اس کی ظاہری شکل نیکی سے مشابہت رکھتی ہوگی۔

غرور و ریا کاری

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس بات کے ذریعے حضرت نے آئمہ کے اس قول کی وضاحت کی ہے کہ غرور کے ڈر سے کوئی نیک کام ترک نہیں کرنا چاہئے۔ البتہ اگر ریا کا اندیشہ ہو تو ترک کر دینا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ حضرت سے راضی ہو۔ آپ کے علم کا دائرہ کس قدر وسیع ہے۔ مجھے اکثر اس بات پر حیرانی ہوتی ہے اور اس بات پر حیرت اور بڑھ جاتی ہے کہ ایک امی (یعنی ایسا شخص جس نے باقاعدہ کوئی تعلیم حاصل نہ کی ہو) کی زبانی ان علوم کا ظہور ہوتا ہے۔ جو بے حد و شمار ہیں۔ کوئی عام شخص اس علم کے تحمل کی طاقت نہیں رکھ سکتا۔ مگر آپ کو کوئی بھی جواب دیتے ہوئے لمحہ بھر کے لئے غور و فکر کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اللہ کی ذات پاک ہے۔ جس نے حضرت کو اس قدر علوم لدنیہ اور معارف ربانیہ سے نوازا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس کے بعد انہی صاحب نے سوال کیا۔ حضرت! آپ ہمیں بتائیں کہ صدقہ یا دوسرا کوئی سا بھی عمل (ریا سے کس طرح محفوظ رہ سکتے ہیں) اور خالصتاً اللہ تعالیٰ کے لئے ہو سکتے ہیں؟

آپ نے فرمایا۔ اجر و ثواب کے حصول کے لئے کیا جانے والا کوئی بھی عمل خدا کے لئے نہیں ہوتا اس لیے اس میں وسوسوں کا آنا بعید از فہم نہیں ہے۔ چنانچہ جب تم اس نیت سے صدقہ کرو گے تو تمہارے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوگا کہ جس شخص کو صدقہ دیا ہے شاید وہ اس کا اہل نہیں تھا اور اگر بالفرض اہل تھا بھی تو کوئی دوسرا شخص اس سے زیادہ اہل ہو اور اس دوسرے شخص کو صدقہ کرنے سے زیادہ اجر و ثواب حاصل ہو جس سے میں محروم رہ گیا۔ پھر آخر میں یہ وسوسہ پیدا ہوگا کہ پتہ نہیں اللہ تعالیٰ نے میرے اس صدقے کو قبول بھی فرمایا ہے یا نہیں؟ جس عمل میں وسوسہ آجائے وہ اللہ تعالیٰ کے لئے کیسے ہو سکتا ہے کیونکہ وسوسے کا محرک شیطان ہوتا ہے اور خالصاً اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کیے جانے والے کام میں شیطان رخنہ اندازی نہیں کر سکتا۔

سائل نے اگلا سوال کیا۔ اگر میں اجر و ثواب کی بجائے اللہ تعالیٰ کے قرب کے حصول کے لئے صدقہ کروں تو کیا یہ بھی مضر ہوگا؟

آپ نے فرمایا ہاں! کیونکہ اللہ تعالیٰ کے قرب کا حصول بھی ایک غرض ہے لہٰذا اس نیت سے عمل کرنا بھی اپنی ذاتی غرض کے حصول کے لئے ہوگا۔

پھر اپنی بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کسی بھی عمل کے خالصتاً لوجہ اللہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان پہلے اللہ تعالیٰ کی جلالی اور جمالی صفات کا مشاہدہ کرے، اس کی عظمت و کبریائی کا تصور ذہن میں

لائے اپنی ذات پر ہونے والی اللہ تعالیٰ کی ان گنت نعمتوں اور انعامات کو سامنے رکھے اور پھر یہ سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات اس بات کے لائق ہے کہ اس کی بارگاہ میں سر تسلیم خم کر دیا جائے۔ اس کے حضور عاجزی کی جائے (پھر آپ نے اس نکتے کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا)

عمل کے خالص ہونے کا مطلب

کسی بھی عمل کے اللہ کے لئے خالص ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی صفات کے جلال و کمال اور اس کی کبریائی کی عظمت کا شعور حاصل کرنے کے بعد اس بات پر غور کرے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کتنی بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے اور پھر اسے اس بات کا احساس ہو کہ صرف اللہ کی ذات اس بات کی اہل ہے کہ اس کے حضور سر تسلیم خم کر دیا جائے عاجزی اور انکساری اختیار کی جائے اس کیفیت میں انسان کے دل میں اپنے کسی ذاتی مقصد کے حصول کے لئے عبادت کا خیال نہیں آنا چاہئے اور انسان کو اس بات کا یقین کر لینا چاہیے کہ اگر وہ اپنے پروردگار کی ہمیشہ عبادت کرتا رہے اور یہ عبادت مشکل ترین عبادت ہو اور پھر اس شخص کی عمر بھی بے حد طویل ہو اس کی عبادت میں باقاعدگی ہو پھر بھی وہ اللہ کی عبادت کا حق ادا نہیں کر سکے گا۔ انسان ذاتی خواہش کے حصول کے لئے اللہ کی عبادت اس وقت کر سکتا ہے جبکہ وہ اللہ تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی سے فارغ ہو چکا ہو مگر یہاں تو یہ عالم ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کا کوئی ایک حق بھی ادا نہیں کر سکتا جبکہ دیگر بے شمار حقوق ابھی باقی ہیں تو اس عالم میں کوئی شخص اپنی ذاتی غرض کے حصول کے لئے کس طرح عبادت کر سکتا ہے۔

(آپ نے مزید ارشاد فرمایا) جب اہل جنت' جنت میں داخل ہو جائیں گے (اور اپنے اپنے مرتبہ و مقام کے مطابق) انہیں اللہ کی معرفت نصیب ہوگی تو اس وقت انہیں افسوس ہوگا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری مزید کیوں نہیں کی۔

(آپ نے فرمایا) میری اس تمام گفتگو سے آپ حضرات کے سامنے یہ بات واضح ہو چکی ہوگی کہ اجر کے حصول کے لئے کوئی بھی نیک عمل کرنا انسان کو اللہ تعالیٰ سے بے تعلق کر دیتا ہے اور انسان اللہ تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی سے دور ہو جاتا ہے لہٰذا ایسا شخص اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے اور دور ہو جاتا ہے۔ انسان اگر یہ سوچ کر اللہ کی عبادت کرے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی عبادت کا اہل ہے تو اس کی عبادت میں کبھی بھی کوئی وسوسہ داخل نہیں ہو سکے گا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا اگر کوئی شخص صدقہ دیتے وقت یہ سوچ لے کہ میں جو مال صدقہ کر رہا ہوں وہ اللہ کا دیا ہوا ہے میری ذات کا مالک بھی اللہ ہے اور جس فقیر کو میں صدقہ دے رہا ہوں اس کی ذات کا مالک بھی اللہ ہے۔ چنانچہ اس کی سوچ یہ ہو کہ ہر چیز اللہ ہی کے لئے ہے اور اسی نیت کے ہمراہ وہ صدقہ کرے تو ایسے شخص کے صدقے کا عالم کیا ہوگا؟ آپ نے فرمایا یہ بہترین صدقہ ہوگا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) سابقہ سطور میں ہم اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو چالیس برس کی عمر میں کیوں مبعوث کیا تھا؟

اللہ نے چاہا تو ہم آئندہ سطور میں بھی اس کی حکمتوں پر گفتگو کریں گے۔

ایک مجذوب کا قصہ

اس کے بعد حضرت نے ایک مجذوب کا واقعہ بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ایک مجذوب سے میری واقفیت ہوگئی وہ ایک ولی تھا سردی کے موسم میں اس کے پاس مناسب لباس نہیں تھا۔ اگر کوئی اسے گرم کپڑا دے دیتا تو کوئی دوسرا گنہگار اور ظالم شخص اس سے وہ کپڑا چھین لیتا مجھے اس پر بہت ترس آتا تھا۔ ایک دن میں ایک گرم کپڑا لے کر اس کے پاس گیا۔ اس کی رہائش آٹا پیسنے والی ایک چکی میں تھی۔ میں وہاں پہنچا تو وہ مجذوب وہیں موجود تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں آپ کے لئے ایک گرم کپڑا لایا ہوں۔ میری نیت یہ تھی کہ مجذوب کی اس خدمت کے عوض اللہ تعالیٰ میری فلاں حاجت پوری کر دے گا اور میری اس نیت کا علم صرف اللہ کو تھا۔ مجذوب نے میری بات سن کر جواب دیا میں اس کپڑے کو قبول نہیں کروں گا۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ یہ کپڑا قبول کر لے۔ اس نے پھر انکار کیا۔ میں نے تیسری مرتبہ اپنی درخواست کو دہرایا تو وہ کہنے لگا۔ تم نے یہ سوچ کر یہ کپڑا مجھے دیا ہے تا کہ تمہاری فلاں حاجت پوری ہو جائے اور پھر اس نے میری حاجت بھی بیان کر دی اور کہنے لگا۔ میں وہ کپڑا پہنوں گا جو صرف اللہ کی رضا کے حصول کے لئے دیا گیا ہو۔ سیدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں میں وہ کپڑا وہیں چھوڑ کر آ گیا اور چکی میں کام کرنے والوں سے کہا کہ یہ کپڑا بعد میں اسے پہنا دینا، کئی دن بعد مجھے پتہ چلا کہ وہ کپڑا کئی دن تک یونہی پڑا رہا اور مجذوب نے اسے نہیں پہنا۔

(یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا) وہ ولی اللہ کی مخلوق تھا اور مخلوق کا یہ عالم ہے کہ وہ غیر اللہ کی نیت سے پیش کی جانے والی نذر کو قبول نہیں کرتی تو خود خالق ایسی نذر کو کیسے قبول کرے گا۔

ایک عبادت گزار کا انجام

ایک عبادت گزار کی موت کا وقت قریب آیا اور اس نے نزع کی تکلیف محسوس کی تو اسے اندازہ ہوا کہ اس قدر شدید تکلیف تو اسے ساری زندگی کبھی پیش نہیں آئی۔ اسی وقت اس عابد پر خوف خدا طاری ہوا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری کے خیال سے وہ لرزہ براندام ہوا۔ (عین اسی وقت شیطان نے وسوسہ ڈالا) اس کی توجہ اپنی کثیر عبادت کی طرف مبذول ہوئی۔ یہ سوچ کر اسے تسلی ہوئی کہ اس نے بہت عبادت کر رکھی ہے۔ جب اس نے اپنی عبادت کو اپنے خوف کے مقابلے میں رکھا تو عبادت کا پلڑا بھاری نظر آیا جس سے اس کو تسلی ہوئی اور اس کی بے چینی کو قرار آ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی عبادت پر فخر کرنے کی غلطی کی بدولت اس کی ساری عبادت سلب کر لی اور اسی عالم میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس محرومی سے محفوظ رکھے۔

(حضرت نے مزید ارشاد فرمایا) بہت سے عبادت گزار صرف اسی وجہ سے جہنم کا ایندھن بنے ہیں کہ انہوں نے اپنی عبادت پر بھروسہ کیا تھا۔

مزید فرمایا' اپنی عبادت پر وہی شخص اعتماد کر سکتا ہے جس نے اجر کے حصول کے لئے اللہ کی عبادت کی ہوگی۔ اگر وہ اللہ کی رضا کے حصول کے لئے عبادت کرتا تو یہ عبادت آخرت میں اس کے لئے فائدہ مند ثابت ہوتی۔

اولیاء کاملین کی عبادت

اولیاء کاملین کی عبادت صرف اللہ کے لئے ہوتی ہے اس لئے وہ تعظیم و تکریم کے جذبات کے ہمراہ خوف و رجاء کے عالم میں عبادت کرتے ہیں کیونکہ انہیں اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ اگر وہ ساری زندگی پتھروں کے ساتھ سر رگڑتے رہیں اور تمام عمر نیک اعمال سرانجام دیتے رہیں تو بھی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا حق ادا نہیں کر سکیں گے تو بھلا کون سے اجر کا مطالبہ کر سکتے ہیں؟ کیونکہ اجر کا مطالبہ وہ شخص کر سکتا ہے جسے اس بات کا یقین ہو کہ اس نے حق ادا کر دیا ہے۔

جبکہ ان اولیاء کو اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ ان کی عبادت میں بے شمار کوتاہیاں موجود ہیں۔ پھر یہ بات بھی ان کے پیش نظر ہوتی ہے کہ جو عمل انہوں نے کیا ہے اس کی توفیق اللہ تعالیٰ کی ہی عطا کردہ ہے۔ اس میں ان کا کوئی کمال نہیں ہے۔ اس لئے جب ان کے عمل کا حقیقی فاعل کوئی اور ہے تو وہ کس بات پر اجر کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا' آپ نے جس عابد کا واقعہ بیان کیا ہے اس کی کونسی چیز سلب کی گئی تھی۔ اگر وہ سلب شدہ چیز معرفت تھی تو یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ اگر اسے معرفت حاصل ہوتی تو وہ کبھی بھی اپنے اعمال پر بھروسہ نہ کرتا اسلئے میرے خیال میں سلب شدہ شے یا اس کا ایمان ہوگا یا اس کی نیکیاں ہوں گی؟

آپ نے فرمایا' اس کی نیکیاں سلب ہوئی تھیں کیونکہ اس نے انہی نیکیوں پر اعتماد کیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے ان نیکیوں کے ردعمل میں سامنے آنے والی اپنی رحمت کو زائل کر دیا جس کیوجہ سے اس کی تمام نیکیاں گناہوں میں تبدیل ہوگئیں۔ اب ان گناہوں کا عذاب اسے جہنم میں ہوگا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے عرض کی' اس کو سزا دینے کے لئے یہی کافی تھا کہ اس کے تمام نیک اعمال ضائع کر دیے جاتے۔ ان اعمال کو گناہوں میں کیوں تبدیل کیا گیا؟

آپ نے فرمایا' اس کی وجہ یہ ہے کہ اس شخص نے ان اعمال پر اعتماد کیا تھا۔ آپ فرض کریں ایک نیزا آپ کی طرف آ رہا ہے جس کے بارے میں یقین ہے کہ وہ آپ کے پہلو میں لگ جائے گا۔ اب اگر آپ اس سے بچنا چاہتے ہیں تو اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آپ اس نیزے کو ڈھال پر روکیں لیکن اس سے پہلے آپ کو اس بات کا یقین کر لینا چاہیے کہ وہ ڈھال نیزے کے وار کو روک سکتی ہے۔ اگر آپ کو پہلے پتہ چل جائے کہ نیزے کو روکنا ڈھال کے بس میں نہیں ہے تو اب آپ اپنے بچاؤ کے لئے اس ڈھال کو استعمال نہیں کریں گے بلکہ کسی دوسرے نیزہ بردار کی پناہ میں چلے جائیں گے تاکہ وہ آپ کو دشمنوں کے وار سے محفوظ رکھ سکے۔ بالکل یہی

کیفیت اس عابد کی تھی کہ اس نے اپنی عبادت کو اللہ کے خوف کے مقابلے میں رکھ کر یہ گمان کیا کہ اس کے اعمال اللہ کے حقوق سے زیادہ طاقتور ہیں اور یہ اعمال اسے اللہ کے خوف اور گرفت سے بچا سکتے ہیں بلاشبہ یہ ایک انتہائی درجے کی گمراہی ہے۔

(سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا) تمام شرائع وعبادات کو قائم کرنے کا بنیادی سبب یہی ہے کہ دنیا میں توحید کا بول بالا ہو اور تمام مخلوقات کو (یعنی بنی نوع انسان کو) اپنے پروردگار کی معرفت حاصل ہو لہٰذا جب انسان کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوگی تو ان عبادات کا مقصد پورا ہو جائے گا۔لیکن اگر انسان کو یہ معرفت ہی حاصل نہ ہو سکے جو اصل مقصد ہے تو پھر مقصد کے حصول کے لئے قائم کیے جانے والے ذرائع یعنی عبادات بے فائدہ ہوں گی۔اسی طرح گناہوں کے ارتکاب کو اس لئے ممنوع قرار دیا گیا ہے کہ اس کے نتیجے میں انسان اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے دور ہو جاتا ہے لہٰذا اگر کسی عبادت کی وجہ سے (خود پسندی وریا کاری کی بدولت) انسان اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے دور ہو جائے تو اس عبادت اور گناہ کے درمیان کیا فرق باقی رہے گا؟

سرکاری اہلکاروں سے میل جول رکھنا

ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا' ارباب حکومت میں بھی بعض لوگ ایسے مومن ہوتے ہیں جن کے قلوب ہر وقت اپنے پروردگار کی طرف متوجہ رہتے ہیں اور ان میں بعض ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے مکمل طور پر لاتعلق ہوتے ہیں۔ان کی علامت یہ ہے کہ جو شخص اس بات پر رنجیدہ ہو کہ وہ اپنے پروردگار کے حکم کی فرمانبرداری نہیں کر رہا بلکہ کسی اور کی اطاعت میں مشغول ہے اور پھر اسی بات پر اس کا دل مغموم رہے ایسا شخص پہلی قسم سے تعلق رکھتا ہے۔قیامت کے دن اس شخص کو اپنی خطاؤں کے حساب کتاب' علامت اور عتاب کے بعد جنت میں داخل ہونے کی سعادت حاصل ہو جائے گی اور اگر اللہ تعالیٰ اس پر اپنا خاص لطف وکرم فرمائے تو یہ شخص بے حساب وکتاب جنت میں داخل ہو جائے گا۔اس کے برعکس جو حکومتی اہلکار ظلم کی حالت میں ہی خوش رہے اور اسے آخرت کی کوئی فکر نہ ہو ایسا شخص دوسری قسم سے تعلق رکھتا ہے۔ایسا شخص ظلم اور زیادتی سے اسی طرح لطف اندوز ہوتا ہے جیسے گندگی کا کوئی کیڑا نجاست اور غلاظت کھا کر مسرور ہوتا ہے (احمد بن مبارک کہتے ہیں) ہم یہ بات پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ایسے شخص کو قیامت کے دن سب سے زیادہ سخت عذاب ہوگا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) حضرت نے یہ بات ایک ۔۔ب کے سوال کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمائی تھی جس نے آپ سے یہ دریافت کیا تھا کہ حکومتی اہلکاروں کے ساتھ میل جول رکھنے کا کیا حکم ہے؟ کیونکہ اگر میں انکے ساتھ کوئی تعلق نہ رکھوں تو وہ مجھے مختلف طریقوں سے نقصان پہنچائیں گے۔اس کے جواب میں حضرت نے اسے نیکی کی ترغیب دیتے ہوئے لوگوں کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم دیا اور مذکورہ بالا کلمات ارشاد فرمائے۔مزید فرمایا مومن کی مثال ایک ایسے پرندے کی ہے جو کسی ناپاک جگہ پر اتر جائے تو اپنے وجود کو سمیٹ

لیتا ہے اور اگر کسی پاکیزہ مقام پر اترے تو خوش وخرم ہو کر اپنے پر پھیلا کر رزق کی تلاش شروع کر دیتا ہے۔

پھر حضرت نے بطور خاص اس سائل کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا اگر کوئی ظالم کسی شخص کے دراہم غصب کرے اور ان دراہم پر اللہ تعالیٰ کا نام بھی کندہ ہو اور پھر کوئی نیک شخص کسی تدبیر یا حیلے کے ذریعے وہ دراہم اس ظالم سے واپس حاصل کرے تو وہ چند فرشتوں کی نجات کا باعث بنے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں کہیں اللہ تعالیٰ کا نام تحریر یا کندہ ہوگا وہاں اس نام کے ہر حرف پر ایک فرشتہ تعینات ہوگا اور اللہ تعالیٰ کے ہر نام پر ایک ایسا فرشتہ تعینات ہوتا ہے جس میں ستر انسانوں کے برابر طاقت پائی جاتی ہے تو جب ایسے دراہم کسی ظالم شخص کے پاس چلے جائیں تو ان فرشتوں کی حالت اس پرندے کی سی ہو جاتی ہے جسے قید کر کے اس کے پاؤں باندھ دیئے گئے ہوں۔ لہٰذا جب کوئی نیک شخص وہ دراہم اس غاصب سے حاصل کر لیتا ہے تو ان فرشتوں کی تنگی ختم ہو جاتی ہے۔ فرشتے ظالموں اور گنہگاروں کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔

غفلت کا وبال

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا' انسان کے اعمال پر گرفت اس لئے کی جاتی ہے کیونکہ انسان خود اپنے اعمال کی بدولت اپنے آپ کو تباہ کر دیتا ہے وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ سے لاتعلق کر لیتا ہے اور صرف اپنی کی ہوئی تدبیر کو سامنے رکھتا ہے اور اپنے ذاتی مقاصد کے حصول کے لئے اس قدر تگ و دو کرتا ہے کہ اس دوران مکمل طور پر اللہ تعالیٰ سے غافل ہو جاتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ پہلے اس کا تعلق غیر اللہ سے قائم ہوتا ہے پھر وہ غیر اللہ کو محسوس کرنے لگتا ہے چنانچہ موسم کی سردی یا گرمی اس پر اثر انداز ہونے لگتی ہے۔ زخم یا بیماری اسے تکلیف دہ محسوس ہوتے ہیں۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ سے لاتعلقی اختیار نہ کرتا اور اپنا آپ اللہ کے سپرد کر دیتا اور غیر اللہ سے مکمل طور پر صرف نظر کر لیتا اور تمام اغیار کو اپنے دل سے نکال دیتا تو خواہ اسے لوہے کے کیلوں پر ہی کیوں نہ چلنا پڑتا اسے کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہوتی۔

اسی غفلت کی وجہ سے انسان پر بھاری بوجھ ڈالا گیا ہے۔ انسان کو احکام کا مکلّف قرار دیا گیا ہے۔ انبیاء کرام کو شرائع کے ہمراہ مبعوث کیا گیا ہے تاکہ وہ اسے غفلت سے نکال کر اللہ کی طرف لے جا سکیں۔ اگر یہ غفلت درمیان میں نہ ہوتی تو انسان فرشتوں کی مانند ہوتے اور انہیں کسی قسم کی تکلیف کا سامنا کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ اگر غفلت نہ ہوتی تو جہنم کو پیدا نہ کیا جاتا۔ اگر غفلت نہ ہوتی تو انسان اللہ تعالیٰ کو اپنے تمام اعمال کا خالق سمجھتا اور انسان نفس کی چالاکیوں سے محفوظ رہتا کیونکہ نفس ہی انسان کو اعمال پر بھروسہ کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور اعمال کو اپنا کارنامہ سمجھتا ہے۔ جب انسان کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اس میں نفس ہی نہیں ہے تو وہ ہر وقت اپنے آپ کو خالی محسوس کرتا تو ایسے شخص کو کیسے مکلّف بنایا جا سکتا ہے؟

آپ نے مزید ارشاد فرمایا' سب سے بڑا احمق وہ ہے جو رخصت ہو جانے والی چیز یعنی دنیائے فانی کے حصول کے لئے دوڑ دھوپ کرے اور سب سے بڑا عقل مند وہ شخص ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والی ذات یعنی اللہ

تعالیٰ کی خاطر تگ و دو میں مشغول رہے کیونکہ اگر فانی دوسرے فانی کے لئے مر جائے گا تو دونوں میں سے کسی ایک کو بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا لیکن اگر ایک فانی کسی باقی کے لئے موت کو گلے لگا لے گا (تو مجازی طور پر) وہ فانی بھی باقی ہو جائے گا۔

پھر آپ نے مزید ارشاد فرمایا' لوگ کہتے ہیں موت کی کوئی دوا نہیں ہے حالانکہ اس کی دوا موجود ہے اور اس کی دوا یہی ہے جو میں نے بیان کی ہے اور اس کے علاوہ کوئی دوسری دوا نہیں ہے۔ اس کے بعد آپ نے اپنی بات کے درست ہونے کی قسم کھائی اور پھر کئی بار قسم کھا کر اپنی بات کو دہرایا۔ پھر آپ نے مزید ارشاد فرمایا۔ جب انسان ظاہری و باطنی ہر اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کوشش کرتا ہے تو وہ کبھی فنا نہیں ہوگا اور نہ ہی اس کی موت ایسی موت ہوتی ہے جسے عام لوگ موت سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد آپ نے بتایا' جب اہل دیوان کا انتقال ہوتا ہے تو بیشتر حضرات وفات کے بعد خود اپنے جسم کو غسل دیتے ہیں بظاہر میت تختے پر موجود ہوتی ہے اور غسل دینے والا پاس کھڑا ہوتا ہے لیکن درحقیقت دونوں ایک ہی شخص ہوتے ہیں۔

قطبِ زمان کا واقعہ

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس گفتگو کو میں ایک عجیب و غریب حکایت پر ختم کرتا ہوں جو میں نے سیّدی عبدالعزیز دباغ کی زبانی سنی ہے ایک مرتبہ میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ بہت سے لوگ دور افتادہ غاروں یا سمندری جزیروں میں تنہا رہ کر اللہ کی عبادت میں مشغول ہو جاتے ہیں اور مخلوق سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں ایسے لوگ نہایت قابل تعریف ہیں۔ اس پر حضرت نے فرمایا میں تمہیں ایک واقعہ سناتا ہوں۔ اسے غور سے سنو اگر میں اس واقعے میں ذرا بھی غلط بیانی کروں تو اللہ تعالیٰ مجھ سے شدید باز پرس فرمائے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے عرض کی ہم تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتے کہ آپ کسی قسم کی غلط بیانی کر سکتے ہیں۔ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا۔

ایک دن میں قطب وقت حضرت سیّدی منصور بن احمد کے ہمراہ باب الفتوح کی مسجد میں بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک ہمارے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ہم سمندر کے پاس جزیرے میں جائیں جس کے کنارے ''سلا'' نامی شہر آباد ہے۔ لہٰذا ہم دونوں وہاں چلے گئے ہم نے دیکھا کہ جزیرے کا رقبہ تقریباً ایک مربع میل پر مشتمل ہے اور جزیرے میں میٹھے پانی کے دو چشمے موجود ہیں۔ وہاں ہماری ملاقات ایک شخص سے ہوئی جس کی عمر چالیس برس کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ اللہ کی عبادت میں مشغول تھا اس جزیرے میں چٹانوں کو تراش کر گھر بنائے گئے تھے اور ان گھروں میں اس طرح کی کھڑکیاں موجود تھیں جیسے ہمارے ہاں عام طور پر حمام میں موجود ہوتی ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ یہ گھر کس نے بنائے تھے کیونکہ یہ جگہ عام آبادی سے بہت دور تھی اور یہاں آمد و رفت بالکل بھی نہیں تھی۔ شاید کبھی کبھار کوئی کشتی وہاں پہنچ جاتی ہو وہاں دو مختلف قسم کے درخت تھے۔ ایک قسم کے درخت پر بادام جیسا پھل لگتا تھا لیکن یہ بادام سے ذرا مختلف تھا لیکن دوسری قسم کے درخت ایسے ہی تھے جیسے ہمارے ہاں

تغزار کے درخت ہوتے ہیں۔تاہم یہ تغزار کے درخت سے کچھ چھوٹے تھے البتہ وہاں کے درختوں کے پتے کچھ چوڑے تھے اور ہمیشہ سبز رہتے تھے۔انہی دونوں درختوں کا پھل اس عابد کی خوراک تھا اور جب ہماری توجہ اس کے لباس کی طرف مبذول ہوئی تو ہم نے دیکھا کہ اس نے تغزار کی شاخوں کو ملا کر اپنی شرمگاہ کو ڈھانپ رکھا ہے۔اس کا بقیہ بدن لباس سے بے نیاز تھا۔ہم نے اس سے گفتگو شروع کی اور دریافت کیا' تم کب سے یہاں رہ رہے ہو؟ اس نے بتایا' چالیس برس سے' ہم نے دریافت کیا' تمہاری عمر چالیس برس ہی معلوم ہوتی ہے تو پھر تم یہاں کب آئے؟ اس نے جواب دیا' میں تقریباً پانچ برس کی عمر میں اپنے والد کے ہمراہ یہاں آیا تھا اور پھر پچیس برس تک اپنے والد کے ہمراہ یہاں رہا۔اس کے بعد ان کا انتقال ہو گیا اور میں نے انہیں یہیں دفن کر دیا۔ ہم نے فرمائش کی' اپنے والد کی قبر ہمیں بھی دکھاؤ تاکہ ہم اس کی زیارت کریں۔چنانچہ وہ ہمیں اپنے والد کی قبر کے پاس لے گیا۔ہم نے وہاں مرحوم کے لئے دعائے خیر کی اور پھر اس عابد کے ساتھ گفتگو میں مشغول ہو گئے کیونکہ وہ نہایت کم عمری میں وہاں آ گیا تھا اور لوگوں کے ساتھ اس کا میل جول بالکل بھی نہیں تھا اس لئے اس کی زبان سمجھنے میں ذرا مشکل پیش آتی تھی۔اس کا آبائی وطن تیونس کا نواحی علاقہ تھا اسلیئے وہ عربی بول سکتا تھا۔ہم نے اس سے ایمان کے بارے میں دریافت کیا تو پتا چلا کہ وہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے لئے جہت کا بھی قائل تھا۔ہم نے اسے اس نظریے سے باز رہنے کی تلقین کی اور صحیح عقیدہ بیان کیا۔پھر وہ شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی واقف تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوق کے سردار اور آقا ہیں۔وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور سیدہ خاتون جنت حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہ سے بھی واقف تھا۔ہم نے اس سے امام حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں دریافت کیا تو پتہ چلا کہ وہ ان سے واقف نہیں ہے پھر ہم نے اس سے رمضان المبارک کے بارے میں دریافت کیا تو پتا چلا کہ وہ اس سے بھی ناواقف ہے۔تاہم اس نے ہمیں بتایا کہ وہ پورے سال میں متفرق طور پر تیس دن کے روزے رکھتا ہے۔ہم نے اسے بتایا کہ رمضان کے روزے فرض ہیں اور پھر اسے سمجھایا کہ ہر سال میں فلاں مخصوص مہینہ رمضان کا ہوتا ہے۔ہم نے اس سے دریافت کیا' کیا تمہیں قرآن مجید کا کچھ حصہ یاد ہے اس نے جواب دیا ہاں اور اس نے ہمیں پڑھ کے سنایا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ

اسے صرف یہی کلمات یاد تھے (جو ترتیب کے لحاظ سے غلط تھے) ہم نے اس سے دریافت کیا' تم عبادت کس طرح کرتے ہو؟ اس نے جواب دیا' میں اللہ تعالیٰ کے سامنے رکوع اور سجدہ کر لیتا ہوں' ہم نے دریافت کیا' کیا تم سوتے بھی ہو؟ اس نے جواب دیا ہاں۔میں سورج غروب ہونے کے بعد سے لے کر رات کے ابتدائی حصے تک سوتا ہوں اور پھر اس کے بعد ساری رات رکوع و سجود میں مصروف ہو جاتا ہوں۔میں نے اس سے دریافت کیا' کیا تم ہمارے ساتھ کسی اسلامی ملک میں جاؤ گے؟ تاکہ وہاں قیام کر سکو کیونکہ تمہارا دین بھی وہی ہے جو وہاں کے مسلمانوں کا ہے اور تم بھی ان کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہو۔اس نے جواب دیا' یہ ٹھیک

ہے کہ میں مسلمان ہوں لیکن میں اس جگہ کو چھوڑنا پسند نہیں کروں گا بلکہ بقیہ ساری عمر یہیں بسر کروں گا۔ (سید عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں) جب ہم گفتگو کے دوران اس کے قریب ہونے کی کوشش کرتے تو وہ ہم سے دور ہو جاتا کیونکہ وہ انسانوں سے مانوس نہیں تھا۔ اسی طرح وہ ہمارے ہاں رائج خوراک کھانے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتا تھا کیونکہ ایک طویل مدت سے وہ مختلف طرح کی چیزیں کھانے کا عادی تھا۔ اچانک ہماری نگاہ پڑی تو کیا دیکھتے ہیں کہ اس کے آس پاس سونے اور چاندی کے کچھ سکے بکھرے ہوئے پڑے ہیں۔ ہم نے دریافت کیا' یہ کہاں سے آئے ہیں؟ اس نے جواب دیا سمندر میں سفر کرنے والے اگر کبھی غلطی سے یہاں آ جائیں تو مجھے دیکھ کر دعا کی درخواست کرتے ہیں اور نذر کے طور پر یہ سکے دے جاتے ہیں۔ ہم نے اس سے کہا' تمہیں اس رقم کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ نہ تو تم نے کوئی مکان تعمیر کرنا ہے نہ شادی کرنی ہے اور نہ ہی لباس حاصل کرنا ہے۔ ہمیں ان کی ضرورت ہے لہٰذا یہ ہم لے لیتے ہیں اس نے انکار کر دیا اور کہا یہ درا ہم میری ملکیت ہیں اور میں یہ تمہیں نہیں دوں گا۔ خیر ہم کافی دیر تک اس کے پاس ٹھہرے رہے اور اسے شریعت کے مختلف احکام کی تعلیم دیتے رہے اور آخر اس سے رخصت ہو کر واپس آ گئے۔ واپسی پر جب اس نے ہمیں دیکھا کہ ہم سمندر کی سطح پر پیدل چل رہے ہیں اور پانی میں نہیں ڈوبے تو وہ ہم سے اللہ کی پناہ مانگنے لگا وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید ہمارا تعلق شیاطین کے گروہ کے ساتھ ہے۔ وہ شخص آج بھی اسی جزیرے میں رہائش پذیر ہے جبکہ آج ۲ ذوالحج ۱۱۲۹ھ ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس واقعے میں نصیحت کے حصول کے کئی نکات پوشیدہ ہیں۔

پہلا نکتہ:

ہمیں اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نعمت کا شعور حاصل ہوا جو اہل ایمان کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ہمیں حاصل ہوئی ہے یعنی اسلامی احکام کا علم حاصل ہوا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام کے حالات و واقعات سے آگاہی حاصل ہوئی اور اسی طرح کی دیگر معلومات حاصل ہوئیں جن کے نتیجے میں ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے ساتھ عدم تعلق کی وجہ سے جزیرے میں رہنے والا وہ شخص ان تمام چیزوں سے محروم رہا یہاں تک کہ میں نے حضرت شیخ کی خدمت میں عرض کیا کہ اس کے والد نے جزیرے میں لا کر اور مسلمانوں سے لاتعلق کر کے اس شخص کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ اگر وہ اپنے بیٹے کے ہمراہ کسی مسلمان آبادی میں رہتا تو یہ اس کے لئے زیادہ بہتر تھا۔ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے میری اس بات کی تائید کی۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مسلمان اللہ کے کتنے ہی نافرمان کیوں نہ ہوں۔ ان کی قربت کی اہمیت پھر بھی باقی رہتی ہے کیونکہ دین اور شریعت کے احکام کی معرفت ہی سب سے قیمتی چیز ہے لہٰذا ہمیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ہم مسلمانوں کے ہمراہ رہتے ہیں۔ گلیوں اور بازاروں میں ہمارا واسطہ مسلمانوں سے پڑتا ہے۔ بطور خاص وہ مقامات جہاں نیکی کی دعوت دی جاتی ہے اور دین کی تبلیغ کی جاتی ہے۔

عارف باللہ حضرت شیخ عبدالقادر الگیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

''مسلمانوں کے چہروں کی طرف نظر کرنے سے بھی ایمان میں اضافہ ہوتا ہے''

دوسرا نکتہ:

اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کی معرفت حاصل ہوئی جن کا تعلق ہماری روزمرہ کی زندگی کے ساتھ ہے۔ مثلاً انواع و اقسام کے کھانے' قیام و طعام کی سہولتیں' نکاح' اولاد وغیرہ جیسی نعمتیں اس میں شامل ہوں گی جبکہ جزیرے میں رہنے والا وہ عابد ان تمام نعمتوں سے محروم رہا ہے۔ اگر وہ کسی مسلم معاشرے میں رہائش اختیار کرتا تو اس نوعیت کی تمام نعمتوں سے لطف اندوز ہوتا اور ان نعمتوں کے حصول پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا اور اس کا یہ شکر ادا کرنا جزیرے میں ساری زندگی عبادت کرنے کے برابر ہوتا۔

تیسرا نکتہ:

اکثر لوگ خلوت نشینی اختیار کرنے والے ظاہردار فقیروں کے ہاتھوں دھوکہ کھا جاتے ہیں اور اس غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ یہ گوشہ نشین فقیر صاحب کمال لوگ ہیں اور یہ جس مرتبے پر فائز ہیں اس مقام پر وہ اولیاء فائز نہیں ہو سکتے جو لوگوں میں گھل مل کے رہتے ہیں۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں: میں اکثر ان انوار کا مشاہدہ کرتا ہوں جو لوگوں کے ایمان کے نتیجے میں ان کی ذات سے ظاہر ہوتے ہیں اور آخرکار برزخ میں مل جاتے ہیں۔ کمزوری اور طاقت کے اعتبار سے ان کے درمیان فرق پایا جاتا ہے کیونکہ بعض لوگوں کا ایمان مضبوط ہوتا ہے اور بعض لوگوں کا ایمان کمزور ہوتا ہے اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ تنہائی یا غار میں رہنے والے شخص کا ایمان کمزور دکھائی دیتا ہے اور معاشرے میں رہنے والے کسی عام مسلمان کا ایمان زیادہ مضبوط نظر آتا ہے کیونکہ عام مسلمان اللہ کے فضل پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں اور ان کا یہ بھروسہ غار میں بسنے والوں کی عبادت پر فوقیت رکھتا ہے۔

پھر آپ نے مزید ارشاد فرمایا: کوئی بھی عبادت گزار اپنی عبادت کی وجہ سے صرف اس وقت نجات کا مستحق قرار پائے گا جبکہ اسے اس بات کا یقین ہو کہ اس کی ساری عبادت اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ توفیق کا نتیجہ ہے اور اس کا یہ یقین مستقل ہونا چاہیے اگر وہ کبھی اس یقین سے ہٹ گیا تو اس کے تمام اعمال کے ہلاک ہونے کا اندیشہ ہوگا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) حضرتؒ کا یہ بیان سن کر مجھ پر بہت رقت طاری ہوئی کیونکہ یہ وہ نعمتیں ہیں جن کی طرف ہماری توجہ مبذول نہیں ہوتی۔ اس کے بعد میں نے عرض کی کہ آپ اس عابد کو اپنے ہمراہ لا کر کسی متمدن شہر میں آباد کر دیتے تا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مختلف نعمتوں سے لطف اندوز ہو کر اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم کا مستحق قرار پاتا تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اس کے نصیب میں وہی مقام مقرر کر دیا تھا۔ اللہ کی ذات پاک ہے جس کے قبضہ قدرت میں بادشاہی ہے۔

اس کے بعد سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا: جو شخص روئے زمین پر بکھرے ہوئے عجائبات پر غور کرنا شروع کرے گا تو اس کے لئے اس اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لانے کے لئے یہی کافی ہوگا اور اسے مزید کسی دوسری چیز کی ضرورت نہیں ہوگی کیونکہ روئے زمین پر بسنے والی مخلوقات میں تنوع دکھائی دے گا۔ کوئی شخص عقل مند ہوگا اور کوئی بے وقوف' کسی کو نعمتیں میسر ہوں گی اور کوئی نعمتوں سے محروم ہوگا' کوئی ایک شخص دوسرے کو قتل کر رہا ہوگا اور کوئی دوسرا کسی اور پر رحم کرنے میں مشغول ہوگا' کوئی ایک شخص امور دنیا میں غور وفکر میں مشغول ہوگا اور کوئی دوسرا تجارت میں سر کھپا رہا ہوگا' کسی کی توجہ پڑوسیوں کے معاملات کی طرف مشغول ہوگی اور کوئی دوسرا علمی موشگافیوں میں الجھا ہوا ہوگا جبکہ کوئی آخرت کی طرف متوجہ بیٹھا ہوگا۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں' ایک مرتبہ مجھے سیّدی محمد بن عمر بن محمد الھواری نے بتایا کہ ایک مرتبہ وہ جمعرات کے دن باب مخروق کے پاس بیٹھے ہوئے دروازے سے باہر نکلنے والوں کی باطنی کیفیت کا جائزہ لینے میں مشغول تھے۔ اس دوران مختلف احوال رکھنے والے لوگوں کا مشاہدہ کرنے کا تجربہ حاصل ہوا۔

☆ ایک شخص باہر نکلا اس کے باطن کی طرف توجہ کی تو پتا چلا کہ وہ کسی عورت کی محبت کا اسیر ہے اور اس کی تمام توجہ اسی نکتے پر مرکوز ہے کہ وہ کس طرح اس عورت کو حاصل کر سکتا ہے۔ اس عورت کے خیال نے اسے تمام دوسری اشیاء سے غافل کر دیا تھا۔

☆ ایک اور شخص باہر نکلا تو اس کی کیفیت بھی یہی تھی البتہ اس کی توجہ کا مرکز عورت کی بجائے ایک لڑکا تھا۔

☆ تیسرا شخص باہر نکلا جس کا دل مکمل طور پر دنیا کی طرف مشغول ہو چکا تھا اور دنیا کی طلب اس قدر اس پر مسلط ہو چکی تھی کہ اسے دنیا کے علاوہ اور کسی بھی چیز کا خیال ہی نہیں آتا تھا۔

☆ چوتھا شخص باہر آیا تو اس کا باطن شراب کی محبت میں چور تھا اس کی طلب اور آرزو کا مرکز صرف اور صرف شراب تھی۔

☆ پانچواں شخص باہر آیا تو اس کا باطن آخرت میں منہمک تھا جس کا اثر اس کے ظاہر پر بھی نمایاں تھا۔

☆ چھٹا شخص باہر آیا تو اس کا دل علم اور حصول علم کی توجہ میں غرق تھا۔ اسے علم کے سوا اور کسی بھی چیز کا خیال نہیں آتا تھا۔

☆ ساتواں شخص باہر نکلا اسے گھوڑے خریدنے کا بہت شوق تھا اس کی تمام توجہ کا مرکز گھوڑوں کی خریداری تھی۔

☆ آٹھواں شخص باہر نکلا جس کی تمام تر توجہ کھیتی باڑی کی طرف مبذول تھی۔

☆ نواں شخص باہر نکلا جس کا دل سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے معمور تھا۔ اس کے تمام تر خیالات کا مرکز صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال و واقعات تھے۔ وہ ہر وقت اسی سوچ میں گم رہتا تھا کہ بعثت سے پہلے اور بعثت کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ کیا تھا۔ وحی کے نزول کے وقت آپ صلی

اللہ علیہ وسلم کی کیفیت کیا ہوتی تھی مکی اور مدنی زندگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ کار کیا ہوتا تھا۔

☆ دسواں شخص باہر نکلا جس کا دل اللہ رب العالمین کی محبت سے معمور تھا۔ اللہ تعالیٰ کی صفات اور عظمت و جلال کے بارے میں غور و فکر کرنا اس کا مشغلہ تھا۔

عمر بن محمد الھواری کہتے ہیں' جب میں نے اس ساری صورتحال کا بنظر غائر جائزہ لیا تو یوں محسوس ہوا کہ جیسے ان سب کو ایک رسی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی مشیت کی طرف کھینچا جا رہا ہے مگر انہیں خود اس بات کی خبر نہیں ہے اور وہ اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ یہ تمام افعال ان کی اپنی ذات سے سرزد ہو رہے ہیں۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں' حضرت عمر بن محمد الھوّاری کا یہ بیان سن کر مجھے بہت عبرت حاصل ہوئی کہ مجھے اس بات کا یقین کامل ہو گیا کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے اور اس کی بادشاہی میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے وہ جو چاہے کرتا ہے اپنی پسند کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ اس کے فیصلے کو کوئی رد نہیں کر سکتا۔ وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔

قرآن کہتا ہے:

وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (البقرہ' ۲:۲۰۲)

(اس کے فیصلے کو کوئی رد نہیں کر سکتا اور وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے)

جبکہ مخلوق بہت بڑی غفلت اور عظیم حجاب میں گرفتار ہے۔

احمد بن مبارک کہتے ہیں' اس طرح غور و فکر کرنا عارفین کاملین ہی کی خصوصیت ہے۔ ایک مرتبہ میں نے سیّدی عبدالعزیز کو یہ ارشاد فرماتے سنا دو اشخاص ایک ہی جگہ سے گزرتے ہیں اور کچھ چلنے کے بعد دونوں میں سے ایک کی بخشش ہو جاتی ہے۔ میں نے دریافت کیا' وہ کس طرح؟ آپ نے فرمایا' کیونکہ وہ شخص چلنے کے دوران اللہ کی مخلوق میں غور و فکر کر رہا تھا جس کے نتیجے میں اس کو اللہ کی معرفت حاصل ہوئی جبکہ اس کا ساتھی بے خبر اپنے حال میں مست جا رہا تھا۔

احمد بن مبارک کہتے ہیں۔ اس باب میں ہم نے سیّدی عبدالعزیز دباغ کے کچھ ملفوظات درج کر دیئے ہیں۔ خواب کی تعبیر کے بیان میں ظلمتوں کے دس درجات ہیں۔

(۱) مقرر کردہ سہو (۲) حرام سہو (۳) مکروہ عمد (۴) حرام عمد (۵) خفیف عقیدے سیاسی جہل بسیط (۶) خفیف عقیدے میں جہل مرکب (۷) ثقیل عقیدے میں جہل بسیط (۸) ثقیل عقیدے میں جہل مرکب (۹) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کے بارے میں جہل بسیط (۱۰) ذات اقدس کے بارے میں جہل مرکب

اس باب میں جو معلومات ہم نے بیان کی ہیں۔ ان کی بدولت انسان کی معرفت میں بہت زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ وہ ہمیں سیّدی عبدالعزیز دباغ کے روحانی فیوض و برکات سے بہرہ مند فرمائے۔ تمام تعریفوں کا مستحق اللہ ہے۔ جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

چوتھا باب

دیوان صالحین کا تذکرہ

سیّدی عبدالعزیز دباغ ارشاد فرماتے ہیں' صالحین کا دیوان اسی غار حرا میں منعقد ہوتا ہے جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بعثت سے پہلے تنہائی میں عبادت کیا کرتے تھے۔

اندازِ نشست

(دیوان کا سربراہ) غوث' غارِ حرا کے باہر کی طرف بیٹھتا ہے۔ اس وقت مکہ اس کے دائیں کندھے کے عین پیچھے ہوتا ہے جبکہ مدینہ منورہ اس کے بائیں گھٹنے کے بالکل مقابل ہوتا ہے۔ چار اقطاب غوث کے دائیں جانب بیٹھتے ہیں۔ (سیّدی عبدالعزیز دباغ کے زمانے میں) یہ چاروں اقطاب (فقہی اعتبار سے) مالکی ہیں اور امام مالک کے وابستہ دامن ہیں جبکہ بقیہ تین قطب' غوث کے بائیں جانب بیٹھتے ہیں اور ان کا تعلق دیگر تینوں مذاہب (حنفی' شافعی' حنبلی) کے ساتھ ہے۔ غوث کے بالکل سامنے وکیل بیٹھتا ہے جسے قاضی دیوان بھی کہا جاتا ہے۔ آج کل قاضی دیوان بھی مالکی مسلک سے تعلق رکھتا ہے اور بصرہ کے ایک نواحی علاقے میں آباد بنو خالد قبیلے کا فرد ہے۔ اس کا نام سیّدی محمد بن عبدالکریم بصری ہے۔ غوث کیونکہ اسی وکیل کے توسط سے اہل دیوان کے ساتھ کلام کرتا ہے اور یہ وکیل دیوان کے جملہ اراکین کی نمائندگی کرتا ہے۔ اسی لئے اسے وکیل کہا جاتا ہے۔

آپ نے مزید ارشاد فرمایا' ساتوں اقطاب' غوث کے حکم کے تحت تصرف کرتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک قطب کے ماتحت مزید اولیاء کرام ہوتے ہیں جو اپنے سربراہ کے زیر انتظام مختلف امور میں تصرف کرتے ہیں۔ وکیل کے پیچھے چھ صفیں ہوتی ہیں جن کا دائرہ چوتھے قطب سے لے کر بائیں طرف موجود آخری قطب تک ہوتا ہے۔ گویا ساتوں اقطاب اس دائرے کے ایک سمت ہوتے ہیں اور یہ پہلی صف ہوتی ہے۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے دیگر صفیں ہوتی ہیں۔

خواتین و مرحومین کی آمد

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں' بعض اوقات دیوان صالحین میں خواتین بھی حاضر ہوتی ہیں۔ تاہم ان کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ خواتین ں صرف تین صفیں ہوتی ہیں۔ یہ خواتین بائیں جانب موجود تین اقطاب اور

غوث کے درمیان حاضر ہوتی ہیں۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں' بعض اوقات مرحوم اولیاء کاملین میں سے بھی کوئی بزرگ اس مجلس میں تشریف لاتے ہیں اور زندہ مشائخ کے ساتھ تشریف فرما ہوتے ہیں۔ تاہم ان کو تین نکات کی بدولت زندہ مشائخ سے ممتاز کیا جاسکتا ہے۔

(I) مرحوم مشائخ کی ہیئت اور لباس تبدیل نہیں ہوتا جبکہ زندہ مشائخ کا لباس اور ہیئت تبدیل ہو جاتی ہے مثلاً بعض اوقات وہ سر منڈوا کر آتے ہیں یا لباس تبدیل شدہ حالت میں ہوتا ہے جبکہ مرحومین کی حالت تبدیل نہیں ہوتی۔ اگر آپ کو اہل دیوان میں کوئی ایسا شخص نظر آئے جس کی حالت کسی بھی مجلس میں تبدیل نہ ہو تو آپ سمجھ لیں کہ وہ مرحوم ہے مثال کے طور پر آپ نے اسے اس حالت میں دیکھا کہ اس کے سر کے بال منڈے ہوئے تھے اور پھر کبھی بھی آپ کو اس کے سر پر اگے ہوئے بال دکھائی نہ دیں تو آپ سمجھ لیں کہ اسی حالت میں اس کا انتقال ہوا تھا۔

(II) مرحوم بزرگوں سے زندہ لوگوں سے متعلق امور میں مشورہ نہیں کیا جاتا کیونکہ یہ لوگ زندہ لوگوں کے معاملات میں تصرف نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حضرات ایک ایسے جہان کی طرف منتقل ہو چکے ہیں جو ہماری اس دنیا سے یکسر مختلف ہے البتہ ان حضرات سے مرحومین کے بارے میں مشورہ کیا جاتا ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں' قبرستان کی زیارت کے آداب میں یہ بات شامل ہے کہ کسی مرحوم کے لئے دعائے خیر کرتے وقت' زندہ کی بجائے کسی مرحوم ولی کا وسیلہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کیا جائے کیونکہ اس صورت میں دعا کی قبولیت کا اثر ظاہر ہونے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔

(III) مرحوم شخص کے وجود کا کوئی سایہ نہیں ہوتا یہاں تک کہ اگر وہ آپ کے اور سورج کے درمیان آ کر کھڑا ہو جائے تو سورج کی روشنی بدستور آپ پر پڑتی رہے گی کیونکہ اس مرحوم کے وجود کا کوئی سایہ نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرحومین کی ارواح حاضر ہوتی ہیں۔ مٹی سے بنے ہوئے ان کے اجسام حاضر نہیں ہوتے جبکہ روح کا وجود انتہائی لطیف اور شفاف ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا' کبھی ایسا بھی اتفاق ہوتا ہے کہ دیوان برخواست ہونے یا اولیاء کرام کی کسی اور مجلس میں شامل ہوتے وقت سورج طلوع ہو چکا ہو اور بعض اولیاء دور سے دیکھ کر مجھ سے ملنے کے لئے لپک کر میری طرف آتے ہیں اور میں انہیں اپنی ظاہری آنکھوں سے دیکھتا ہوں اور صرف سائے کی موجودگی یا عدم موجودگی کی بدولت ان کے درمیان فرق کر لیتا ہوں۔

مرحوم بزرگ عالم برزخ سے پرندوں کی مانند اڑتے ہوئے روح کی شکل میں دیوان میں حاضر ہوتے ہیں۔ جب یہ دیوان کے قریب پہنچتے ہیں تو زمین پر اتر کر اپنے پیروں پر چل کر دیوان میں شامل ہوتے ہیں۔ اسی

طرح رجال غیب جب ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں تو ان کی روح چل کر دوسرے کے پاس جاتی ہے اور جب وہ دوسرے شیخ کے پاس پہنچتے ہیں تو ادب کے تحت پیروں پر چل کر جاتے ہیں۔

مجلس دیوان میں فرشتے بھی حاضر ہوتے ہیں ان کی صف مذکورہ بالا چھ صفوں کے پیچھے ہوتی ہے اسی طرح مجلس دیوان میں بعض کامل اور نیک جنات بھی حاضر ہوتے ہیں جنہیں ''روحانیون'' کہا جاتا ہے ان کی صف سب سے پیچھے ہوتی ہے لیکن تعداد کے اعتبار سے ایک صف بھی مکمل نہیں ہوتی۔

جنات اور فرشتوں کی حاضری کا فائدہ یہ ہے کہ دیوان کے اراکین جو کام خود براہ راست سرانجام نہیں دے سکتے اور وہ امور ان فرشتوں یا جنات کے دائرہ کار میں شامل ہوں تو وہ کام ان فرشتوں یا جنات کے ذمے لگا دیۓ جاتے ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں بعض اوقات مجلس دیوان میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف لے آتے ہیں۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئیں تو غوث کے بیٹھنے کے مخصوص مقام پر جلوہ افروز ہوتے ہیں جبکہ غوث' وکیل کے مقام پر بیٹھ جاتا ہے اور وکیل پچھلی صف میں شامل ہو جاتا ہے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ اس قدر انوار ہوتے ہیں جنہیں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ شاید حاضرین مجلس ان کی بدولت جل جائیں گے یا بے ہوش ہو جائیں گے یا قتل ہو جائیں گے کیونکہ یہ انوار اپنے اندر بے انتہا ہیبت' جلال اور عظمت لیے ہوئے ہوتے ہیں یہاں تک کہ اگر چالیس افراد بہادری کے انتہائی درجے پر فائز ہوں اور پھر انہیں ان انوار کے سامنے لایا جائے تو وہ سب بے ہوش ہو کر گر جائیں گے۔ مگر اللہ تعالیٰ دیوان کے اراکین کو اپنے فضل کی بدولت یہ صلاحیت عطا فرماتا ہے کہ وہ ان انوار سے بہرہ مند ہوتے ہیں البتہ دیوان کے اراکین میں بہت کم افراد ایسے ہوتے ہیں جو بعد میں بھی ان انوار کو محفوظ رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جو انوار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے وقت صادر ہوتے ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غوث کو براہ راست مخاطب کرتے ہیں۔

اسی طرح جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم موجود نہ ہوں اور مجلس کا سربراہ غوث ہو تو غوث کے انوار اس قدر شدید ہوتے ہیں کہ اہل دیوان غوث کے قریب بیٹھنے کے متحمل نہیں ہو سکتے بلکہ وہ کچھ فاصلے پر بیٹھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والے حکم کا سامنا کرنے کی صلاحیت صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے صادر ہونے والے حکم کو صرف غوث برداشت کر سکتا ہے۔ پھر اس غوث سے ساتوں اقطاب رہنمائی لیتے ہیں جن کے وسیلے سے وہ حکم دیوان کے دیگر اراکین تک پہنچتا ہے۔

دیوان کے انعقاد کا مخصوص وقت رات کا وہ آخری حصہ ہے جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے

تھے۔ رات کا یہ تیسرا پہر دعا کی مقبولیت کے لئے ایک بنیادی سبب ہے جیسا کہ احادیث میں یہ بات ذکر کی گئی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ اس طرح ہیں۔

ینزل ربنا تبارك و تعالیٰ کل لیلة الی السمآء الدنیا حین یبقی ثلث اللیل الآخر فیقول من یدعونی فاستجیب له (بخاری ۱:۳۸۴ حدیث نمبر ۱۰۹۴)

(ہمارا پروردگار رات کے آخری پہر میں آسمان دنیا پر خاص توجہ فرماتا ہے اور یہ ارشاد فرماتا ہے کون ہے جو مجھ سے دعا مانگے اور میں اس کی دعا کو قبول کروں)

احمد بن مبارک کہتے ہیں' جو شخص اس ساعت کو حاصل کرنا چاہے اسے چاہیے کہ رات سوتے وقت سورہ کہف کی آخری چار آیات تلاوت کرے اور یہ دعا کرے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس مخصوص ساعت میں بیدار کر دے تو امید ہے کہ عین اس مخصوص وقت میں اس کی آنکھ کھل جائے گی۔

شیخ عبدالرحمٰن ثعالبی فرماتے ہیں کہ ہم نے بارہا اس بات کا تجربہ کیا ہے بلکہ بہت سے افراد نے اسی مخصوص طریقے کے تحت رات سوتے وقت ان آیات کو پڑھا اور وہ سب ایک دوسرے کی نیت سے واقف نہیں تھے لیکن وہ سب ایک ہی وقت میں بیدار ہوئے۔

سیّدی دباغ ارشاد فرماتے ہیں پہلے زمانے میں اہل دیوان فرشتے ہوا کرتے تھے۔ پھر جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے اولیاء کو دیوان میں شامل کیا جانے لگا جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ فرشتے امت محمدیہ کے اولیاء کے نائب کے طور پر کام کیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب کوئی ولی دیوان میں شامل ہوکر اپنے مخصوص مقام پر آتا تو اس جگہ پر متعین فرشتہ رخصت ہوکر آسمان کی طرف پرواز کر جاتا اور یوں آخر کار پورا دیوان اولیاء سے بھر گیا۔ اب جو فرشتے اولیاء کی چھ مخصوص صفوں کے پیچھے موجود ہوتے ہیں۔ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدسہ سے متعلق ہیں کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نور مبارک تمام اہل دیوان میں پھیلا ہوا ہے اسلئے اس نور کے ہمراہ چند فرشتے تعینات ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس دیوان میں تشریف لاتے ہیں تو یہ تمام فرشتے تیزی کے ساتھ نور محمدی میں گم ہو جاتے ہیں اور جب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما رہتے ہیں ان میں سے کوئی ایک فرشتہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے جانے کے بعد یہ فرشتے واپس اپنے مخصوص مقام پر لوٹ آتے ہیں۔

فرشتے اہل دیوان کی مدد کرتے ہیں

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں' وہ تمام امور جو اولیاء کرام کے براہ راست تصرف سے باہر ہوں ان کی بجا آوری کے لئے ہر شہر میں فرشتوں کی ایک مخصوص جماعت حاضر رہتی ہے۔ مختلف علاقوں میں اس تعداد میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ یہ فرشتے انسانی شکلوں میں موجود ہوتے ہیں۔ امیر غریب' چھوٹے بڑے ہر شکل میں موجود ہوتے ہیں اور لوگوں کے درمیان گھل مل کے رہتے ہیں لیکن لوگوں کو اس کا پتہ نہیں چلتا۔

احمد بن مبارک کہتے ہیں' پھر سیّدی عبدالعزیز دباغ نے اس بارے میں چند حکایات بھی یہاں فرمائی ہیں لیکن انہیں یہاں ذکر نہیں کیا جا سکتا کیونکہ لوگ ان معلومات کو برداشت نہیں کر سکیں گے۔ حضرت نے یہ حکایات میرے سامنے بھی اس لئے بیان کی تھیں کہ آپ نے ایک مرتبہ مجھے ایک شخص کو یہ بتاتے ہوئے سن لیا کہ اگر کوئی شخص صحیح بخاری کا ایک پارہ لے کر کسی ولی کے مزار پر جائے اور اسے کھول کر راویان حدیث اور مرحوم ولی کے وسیلے سے دعا مانگے تو اس کی دعا پوری ہوتی ہے۔ بطور خاص اگر بخاری شریف کا آخری پارہ ہو تو اثر جلد ظاہر ہوتا ہے۔ میں نے حضرت شیخ سے اس عمل کی صحت کے بارے میں دریافت کیا' تو آپ نے فرمایا۔

الفاظ کے اسرار

ہر شہر میں کچھ مخصوص فرشتے موجود ہوتے ہیں جب وہ دیکھیں کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دست سوال دراز کر رہا ہے اور پھر وہ یہ بھی دیکھ لیں کہ جس سوال کا وہ طلبگار ہے وہ اس کی تقدیر میں موجود ہے تو یہ فرشتے اس کی مدد کرتے ہوئے اسے صحیح طریقے سے دعا کرنے کا طریقہ القاء کرتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ توفیق اس شخص کے شامل حال ہو جاتی ہے لیکن اگر وہ چیز اس شخص کے نصیب میں نہ ہو تو وہ فرشتے اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں اور شیطان اس شخص کو بہکانے کے لئے آ جاتا ہے۔

لہٰذا جب وہ فرشتے کسی شخص کو دیکھتے ہیں کہ وہ صحیح بخاری کا کوئی پارہ لے کر کسی بزرگ کی درگاہ کی طرف جا رہا ہے اور وہ یہ بھی دیکھ لیں کہ اس کی حاجت پوری ہو جائے گی تو وہ اس شخص کو سیدھے راستے پر لا کر دعا کے دوران اس کے دل میں عاجزی اور انکساری کے جذبات پیدا کر دیتے ہیں اس کے ہمراہ مزار تک جاتے ہیں۔ ظاہری طور پر کتاب کے اوراق اس شخص کے پاس ہوتے ہیں لیکن کتاب کے الفاظ کے اسرار فرشتوں نے اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں جب وہ دعا مانگتا ہے تو فرشتے ساتھ میں آمین کہتے ہیں لہٰذا اس شخص کی دعا قبول ہو جاتی ہے لیکن اگر وہ فرشتے یہ دیکھ لیں کہ اس شخص کے نصیب میں حاجت روائی نہیں ہے تو وہ کتاب کے اسرار کو نکال کر الگ ہو جاتے ہیں اور وہ شخص کتاب کے صرف ظاہری وجود کو ہاتھ میں لے کر مزار کی طرف جاتا ہے۔ راستے میں شیطان اس کے دل میں مختلف طرح کے وسوسے پیدا کرتا ہے جس کی بدولت اس کی دعا میں حلاوت ختم ہو جاتی ہے۔

احمد بن مبارک کہتے ہیں' میں نے دریافت کیا' وہ اسرار کیا ہیں جو کتاب کے ظاہری وجود کے علاوہ ہوتے ہیں جنہیں فرشتے نکال کر لے جاتے ہیں۔ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواباً مجھ سے سوال کر دیا' وہ کیا چیز ہے جو شہد کو اس نوعیت کی دیگر چیزوں سے ممتاز کرتی ہے؟ میں نے عرض کی' مٹھاس ہے۔ آپ نے فرمایا یہ خوبی اس کے ظاہری وجود سے الگ ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے؟ میں نے عرض کی جی ہاں۔ آپ نے فرمایا اسی طرح ہر کتاب کے مخصوص اسرار ہوتے ہیں جو اس کتاب کے ظاہری جسم سے الگ مستقل وجود رکھتے ہیں جس طرح شہد میں سے مٹھاس نکال دی جائے تو وہ بے کار ہو جائے گا اسی طرح اگر کسی کتاب میں سے اسرار نکال دیئے جائیں

تو وہ بے فائدہ ہو جاتی ہے۔

آپ نے مزید ارشاد فرمایا' ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے ایسے اوراق زمین پر گرے ہوئے ہوتے ہیں جن پر اللہ کا نام تحریر ہوتا ہے اور یہ اوراق لوگوں کے پیروں تلے بھی آ جاتے ہیں اگر فرشتے ان اسماء کے اسرار نہ نکالیں تو بہت سے لوگ اس بے ادبی کی وجہ سے ہلاک ہو جائیں۔

انبیاء کرام کی تشریف آوری

احمد بن مبارک کہتے ہیں' میں نے دریافت کیا' کیا مجلس دیوان میں انبیاء کرام بھی تشریف لاتے ہیں' مثلاً سیدنا ابراہیم علیہ السلام یا سیدنا موسیٰ علیہ السلام یا دیگر انبیاء کرام علیہم السلام؟

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا' سال بھر میں صرف ایک رات میں انبیاء کرام علیہم السلام تشریف لاتے ہیں۔ میں نے دریافت کیا' وہ کونسی رات ہے؟ آپ نے فرمایا' لیلۃ القدر کی رات اس رات میں تمام انبیاء کرام اور ملاء اعلیٰ سے تعلق رکھنے والے مقرب فرشتے بھی تشریف لاتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ازواجِ مطہرات اور اکابر صحابہ کرام کے ہمراہ تشریف لاتے ہیں۔

احمد بن مبارک کہتے ہیں۔ میں نے دریافت کیا۔ محدثین کے درمیان اس بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے کہ ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا میں سے افضل کون ہے؟ تو سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا' ایک مرتبہ لیلۃ القدر میں' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ میں نے دونوں امہات المؤمنین کی زیارت کی تھی اس وقت سیّدہ عائشہ صدیقہ کا نور سیّدہ خدیجہ کے نور سے زیادہ دکھائی دے رہا تھا۔ (جس کا مطلب یہ ہے کہ سیّدہ عائشہ' سیّدہ خدیجہ سے افضل ہیں)۔

لیلۃ القدر

اس کے بعد سیّدی دباغ نے لیلۃ القدر کے وجود کا سبب بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ سورج کی پیدائش سے پہلے یہ دنیا تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی اور تمام روئے زمین میں موجود غاروں' پہاڑوں' میدانوں اور وادیوں میں فرشتے رہائش پذیر تھے۔ جب سورج میں نور پیدا کیا گیا اور اس کی روشنی سے یہ جہان روشن ہوا تو فرشتوں میں بے چینی پیدا ہوئی اور وہ یہ سمجھے کہ شاید اب اس دنیا کو ختم کر دیا جائے گا اور ایک بہت بڑی مصیبت نازل ہونے لگی ہے۔ یہ فرشتے روشنی سے بچنے کے لئے تاریکی کی تلاش میں بھاگے کیونکہ یہ تاریکی سے مانوس تھے۔ اس دوران وہ گڑگڑا کر گریہ وزاری کے ہمراہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعائیں کرتے رہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا طلب کرتے رہے۔ وہ اس بات سے خوف زدہ تھے کہ شاید اللہ تعالیٰ ان سے ناراض ہو گیا ہے اور اب یہ دنیا ختم ہونے والی ہے۔ یہاں تک کہ دوڑتے بھاگتے انہوں نے روئے زمین کا ایک چکر لگا لیا اور واپس وہیں پہنچ گئے جہاں سے دوڑنے کا آغاز کیا تھا لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ بظاہر کوئی تباہی نازل نہیں ہوئی اور زمین و آسمان

سلامت ہیں تو وہ واپس اپنی جگہ پر آ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف ہو گئے اس کے بعد ان کا یہ معمول بن گیا کہ وہ ہر سال میں ایک رات کے لئے اکٹھے ہو کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کیا کرتے تھے۔ یہی لیلۃ القدر کی اصل ہے۔

قبولیت دعا کی مخصوص گھڑی

احمد بن مبارک کہتے ہیں' میں نے دریافت کیا' آپ کی بات سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شب قدر حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے موجود تھی جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رات صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو عطا کی گئی۔ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے اور برکت سے اس رات کی پہچان اور اس کا اجر وثواب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو عطا کیا گیا ہے۔ پہلی امتوں کے لوگ اس رات سے واقف بھی نہیں تھے جیسے جمعہ کے دن میں موجود قبولیت کی مخصوص گھڑی حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے موجود تھی مگر اس کی پہچان صرف امت محمدیہ کو عطا کی گئی۔ یہ ساعت جب یہود کے سامنے پیش کی گئی تو انہوں نے ہفتے کے دن کو اختیار کیا جبکہ عیسائیوں نے اتوار کا دن اختیار کیا اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسے پانے کی توفیق عطا کی۔

احمد بن مبارک کہتے ہیں' میں نے حضرت سے اس مخصوص ساعت کا سبب دریافت کیا تو آپ نے جواب دیا' جب اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء کو پیدا کر لیا۔ اس وقت جمعہ کی آخری ساعت تھی۔ تمام مخلوقات نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی کہ وہ اپنی نعمتیں ان پر جاری رکھے اور انہیں وہ چیزیں عطا کرے جو مخلوقات کی بقا اور بہبود کا باعث ہوں۔

اگر کوئی شخص جمعہ کی اس مخصوص ساعت پر مطلع ہو جائے تو اسے چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دنیا و آخرت کی بھلائی کا سوال کرے کیونکہ اس وقت تمام مخلوقات نے یہی دعا کی تھی اس لئے جس کی دعا اس مقبول ساعت کے موافق ہو گی اس کی قبولیت کا اثر جلد ظاہر ہو گا۔ اس مخصوص ساعت کی مدت بہت مختصر ہوتی ہے ایک انسان جتنی دیر میں رکوع کر کے دوبارہ اطمینان کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے۔ اتنا ہی دورانیہ اس مخصوص ساعت کا ہوتا ہے۔ یہ ساعت بھی منتقل ہوتی رہتی ہے البتہ ہوتی صرف جمعہ کے دن میں ہے۔ کبھی زوال سے پہلے ہوتی ہے' کبھی عین زوال کے وقت ہوتی ہے اور کبھی زوال کے بعد سے لے کر غروب آفتاب تک کے درمیانی وقت میں موجود ہوتی ہے۔ 6 ماہ تک یہ زوال سے پہلے ہوتی ہے اور اگلے 6 ماہ زوال کے بعد ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں یہ ساعت اس وقت موجود ہوتی تھی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے اور یہ زوال کا وقت ہوتا تھا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت میں یہ ساعت منتقل ہو گئی اور زوال کے بعد ہوتی تھی۔ خطبے کا وقت اس سے خالی ہو گیا حالانکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی مخصوص ساعت کے حصول کے لئے خطبہ جمعہ میں لوگوں کی

حاضری ضروری قرار دی تھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کھڑے ہو کر عاجزی وانکساری کے ہمراہ خطبہ دینا ایسا عمل ہے جس کی ہمسری کوئی نہیں کر سکتا۔ اس وقت' جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوا کرتے تھے' کو نہایت عظیم شرف اور نور حاصل ہے لہٰذا یہ مخصوص وقت جمعہ کی مخصوص گھڑی کے برابر بلکہ اس سے بھی بہتر ہوتا ہے لہٰذا جس شخص کو جمعہ کی وہ مخصوص ساعت نصیب نہ ہوتی لیکن وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبے کو پالیتا تو اس کی برکتوں سے فیضیاب ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبے کے مخصوص وقت کو منتقل کرنے کا حکم نہیں دیا حالانکہ جمعہ کی مخصوص ساعت منتقل ہوتی رہتی ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کی سہولت کے لئے جمعے کے خطبے کے لئے مخصوص وقت مقرر کر دیا کیونکہ جمعہ کی مخصوص ساعت ایک راز ہے جس سے مخصوص لوگ ہی آگاہ ہو سکتے ہیں جبکہ خطبے کا وقت متعین ہے جس سے ہر شخص آگاہ ہے اور اس کی فضیلت سے فیض یاب ہو سکتا ہے لہٰذا جو شخص زوال کے وقت نماز جمعہ نہیں ادا کرتا بلکہ تاخیر کے ساتھ جمعہ کی نماز ادا کرنے کا عادی ہو تو سمجھ لو اس نے جمعہ کی مخصوص ساعت کا فیض حاصل کرنے میں کوتاہی کی ہے کیونکہ جمعہ کی مخصوص ساعت کا علم ہونے میں شک وشبہ ہے جبکہ زوال کے وقت سنت نبوی کے مطابق خطبہ سننا ایک یقینی امر ہے اس لئے شک کی بنیاد پر یقینی چیز کو ضائع نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر کاربند رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ایک اہم عقدے کا حل

احمد بن مبارک کہتے ہیں' میں نے دریافت کیا' ہم مراکش میں رہتے ہیں۔ جب ہم زوال کے وقت خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوں گے تو ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق رکھنے والی خطبے کی مخصوص ساعت سے فیض یاب نہیں ہو سکتے کیونکہ مدینہ منورہ میں زوال کا وقت ہم سے پہلے گزر جاتا ہے اس لئے یوں ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے مقامی وقت کے اعتبار سے زوال سے پہلے اس ساعت کو تلاش کریں لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہمیں جمعہ کی نماز زوال سے پہلے ادا کرنا پڑے گی اور یہ جائز نہیں ہے۔ اس مشکل کا کیا حل ہے؟ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ساعت کا مخصوص فیض مطلقاً زوال کے وقت کے ساتھ مخصوص ہوگا اس کے لئے کسی مخصوص مقام کے زوال کا اعتبار نہیں ہوگا جیسا کہ سورج کے طلوع وغروب سے متعلق احکام میں ہر مقام کے مخصوص طلوع وغروب کا اعتبار کیا جاتا ہے جیسے ہم فجر کی نماز اپنے خطے کے مخصوص وقت کے اعتبار سے پڑھتے ہیں یا روزہ اپنے خطے میں غروب آفتاب کی مناسبت سے افطار کرتے ہیں اس میں مدینہ منورہ کے طلوع وغروب کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ اسی طرح زوال کا حکم بھی ہمارے خطے میں سورج کی حرکت سے متعلق ہوگا۔

مخصوص ساعت کی منتقلی

احمد بن مبارک کہتے ہیں' میں نے عرض کی جمعہ کی ساعت کے منتقل ہونے کے بارے میں ہماری رہنمائی

فرمائیں نیز اس بات کی بھی وضاحت کریں کہ یہ بتدریج کیوں منتقل ہوتی ہے؟ کیا وجہ ہے کہ پہلے یہ ساعت جمعے کی آخری ساعتوں میں ہوتی تھی۔ پھر پیچھے ہٹتے ہٹتے زوال تک آ پہنچی اور پھر اور پیچھے جا کر جمعہ کے دن کے آغاز تک پہنچ گئی یہاں تک کہ دوبارہ منتقل ہو کر پہلی صورت کے مطابق جمعہ کے دن کی آخری ساعت کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ حالانکہ تقدیر کا تقاضہ یہ ہے کہ اس گھڑی میں کوئی تبدیلی نہ ہو جیسے رات کا تیسرا پہر کبھی منتقل نہیں ہوتا اور یہی وہ وقت جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی تھی۔ مزید برآں جمعہ کی ساعت کا وقت بہت مختصر ہوتا ہے اس کے برعکس زوال سے لے کر غروب آفتاب تک یا طلوع آفتاب سے لے کر زوال تک کا وقت 6 ساعتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا تمہارے سوال کا تفصیلی جواب دینا حکمت کے منافی ہے۔

احمد بن مبارک کہتے ہیں۔ اب میں ان احادیث کو ذکر کروں گا جن میں حضرت کے بیان کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت نے فرمایا تھا کہ صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو جمعہ کی ساعت حاصل کرنے کی توفیق عطا کی گئی ہے۔ اس کی دلیل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ہے جسے امام مسلم نے صحیح مسلم میں روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

نحن الآخرون الاوّلون يوم القيامة‘ ونحن اوّل من يدخل الجنة بيدأنهم اوتواالكتاب من قبلنا واوتيناه من بعدهم‘ فاختلفوا فهدانا الله لما اختلفوافيه من الحق فهذا يومهم الذى اختلفوا فيه هدانا الله له قال يوم الجمعة فاليوم لنا وغدا لليهود و بعد غد للنصارى (صحیح مسلم‘۲:۵۸۵‘رقم:۸۵۵)

''ہم سب سے بعد میں آنے والے لوگ ہیں لیکن قیامت کے دن سب سے پہلے ہوں گے ہم دوسری تمام امتوں سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ انہیں ہم سے پہلے کتاب ملی اور ہمیں ان کے بعد مگر انہوں نے اختلاف کیا اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں حقیقت کی راہ دکھائی جس کے بارے میں انہوں نے اختلاف کیا چنانچہ دن کے بارے میں ان کے درمیان اختلاف ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ہماری رہنمائی کی کہ وہ جمعہ کا دن ہے لہٰذا جمعہ ہمارا ہے ہفتہ یہود کا اور اتوار عیسائیوں کا (مخصوص دن ہے)''

سیّدی دباغ نے بتایا تھا کہ جمعہ کے دن کی مخصوص ساعت نہایت مختصر ہوتی ہے اور منتقل ہوتی رہتی ہے اس کی دلیل سنن ابوداؤد میں موجود وہ روایت ہے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے حوالے سے راویت کی گئی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"خير يوم طلعت فيه الشمس يوم الجمعة‘ فيه خلق آدم و فيه اهبط و فيه تيب عليه و فيه مات و فيه تقوم الساعة‘ ومامن دابة الا وهى مسيخة يوم الجمعة

من حين تصبح حتى تطلع الشمس شفقا من الساعة الا الجن والانس وفيه ساعة لا يصادفها عبد مسلم وهو يصلي يسال اللّٰه حاجة الا اعطاه اياه"

(سنن ابوداؤد'۱:۲۷۴' رقم:۱۰۴۶)

"سب سے بہترین دن جمعہ کا دن ہے اسی دن حضرت آدم علیہ السلام پیدا ہوئے اسی دن انہیں زمین پر اتارا گیا۔ اسی دن ان کی توبہ قبول ہوئی اسی دن ان کا انتقال ہوا اور اسی دن قیامت قائم ہوگی۔ روئے زمین پر موجود ہر جانور جمعہ کے دن قیامت کے خوف سے چیختا چلاتا ہے۔ صرف انسان اور جنات ایسا نہیں کرتے۔ اس دن میں ایک ساعت ایسی بھی ہے کہ اگر اس گھڑی میں کوئی بندۂ مومن نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کرے تو اللہ تعالیٰ اس دعا کو ضرور قبول کرتا ہے"

امام مسلم اپنی "صحیح" میں یہ الفاظ روایت کرتے ہیں۔

فيه خلق آدم و فيه ادخل الجنة وفيه اخرج منها (صحیح مسلم'۲:۵۸۵' رقم:۸۵۴)

(اس دن آدم پیدا ہوئے اسی دن جنت میں داخل کیے گئے اور اسی دن جنت سے نکالے گئے)

اور اس مخصوص ساعت کے بارے میں یہ الفاظ نقل کیے۔

وهي ساعة خفيفة (صحیح مسلم'۲:۵۸۴' رقم:۸۵۲) (وہ مختصر سی گھڑی ہے)

اور پھر یہ فرمایا۔

لا يو افقها مسلم قائم يصلي (ایضاً)

"جو شخص اس گھڑی میں نماز میں مشغول ہو جائے"

امام مسلم حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

هي ما بين ان يجلس الامام الى ان تقضى الصلاة (صحیح مسلم'۲:۵۸۴' رقم:۸۵۳)

"جتنی دیر میں امام قعدہ اخیرہ پڑھتا ہے (اسی قدر یہ ساعت مختصر ہوتی ہے)"

ایک مشہور محدث عبدالحق فرماتے ہیں کہ یہ حضرت ابوموسیٰ اشعری کا اپنا قول ہے اور اس حدیث کے راوی مخرمہ مشکوک حیثیت رکھتے ہیں۔

امام ابوداؤد حضرت جابر بن عبداللہ انصاری کے حوالے سے روایت کرتے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

يوم الجمعة ثنتا عشرة ساعة' لا يوجد مسلم يسال اللّٰه تعالىٰ شيئا الا آتاه اللّٰه عزوجل فالتمسوها آخر ساعة بعد العصر (سنن ابوداؤد'۱:۲۷۵' رقم:۱۰۴۸)

"جمعہ کے دن میں کل بارہ ساعات ہوتی ہیں ان کے دوران جو مسلمان جو بھی دعا کرتا ہے۔ وہ دعا

قبول ہوتی ہے تاہم تمہیں اس دن عصر کے بعد آخری ساعت میں دعا کرنی چاہیے''

عبدالحق نامی محدث کہتے ہیں اس روایت کی سند میں بھی ایک مشکوک راوی موجود ہے۔

امام ابن عبدالبر حضرت ابوہریرہ کے حوالے سے روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

ان الساعة التی یتحری فیھا الدعاء یوم الجمعة ھی آخر ساعة من الجمعة

''جمعہ کے دن دعا کی قبولیت کے لئے جس ساعت کو تلاش کیا جاتا ہے وہ جمعہ کے دن کی آخری ساعت ہے'' (التمہید لابن عبدالبر ۲۳:۴۳)

محدث عبدالحق نے اپنی تصنیف ''الاحکام الکبریٰ'' اور امام ابن حجر نے اپنی تصنیف ''فتح الباری'' میں اس بارے میں اکتالیس مختلف اقوال ان کے دلائل اور جوابات نقل کیے ہیں اور ان دلائل پر نقد وتبصرہ بھی کیا ہے۔ میں نے کیونکہ یہ تمام بحث پڑھ رکھی تھی اس لئے اس موضوع پر تفصیل سے حضرت کی گفتگو سنی اور ان میں سے بعض امور یہاں ذکر کردیئے اللہ تعالیٰ ہمیں ان سے فائدہ حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اب ہم دوبارہ اپنے موضوع بحث یعنی دیوان صالحین کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

اہل دیوان سریانی میں گفتگو کرتے ہیں

ایک مرتبہ سیّدی دباغ نے ارشاد فرمایا: اہل دیوان آپس میں سریانی زبان میں گفتگو کرتے ہیں کیونکہ اس میں لفظی طور پر نہایت اختصار اور معنوی اعتبار سے انتہائی جامعیت ہوتی ہے۔ نیز کیونکہ دیوان میں ارواح اور فرشتے بھی حاضر ہوتے ہیں جن کی زبان سریانی ہے اس لئے بھی اہل دیوان سریانی میں گفتگو کرتے ہیں۔ البتہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئیں تو ادب کے پیش نظر اہل دیوان عربی میں گفتگو کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ سیّدی دباغ نے فرمایا۔ یہ لازم نہیں ہے کہ دیوان میں حاضر ہونے والا ہر ولی لوح محفوظ کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو بعض حضرات یہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ بعض اسے دیکھنے کی صلاحیت تو رکھتے ہیں لیکن اس میں موجود تحریر پڑھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے جبکہ بعض لوح محفوظ کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے کیونکہ وہ اس بات سے واقف ہوتے ہیں کہ وہ لوح محفوظ کی طرف دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ لوح محفوظ کی مثال مہینے کی پہلی رات کے چاند کی سی ہے جسے دیکھنے والے مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔

جب اولیاء کرام دیوان میں اکٹھے ہوتے ہیں تو یہ ایک دوسرے کی روحانی مدد بھی کرتے ہیں چنانچہ ان کے وجود سے انوار نکل کر دوسروں کے وجود میں اس طرح داخل ہوتے ہیں جیسے تیر ایک طرف سے چل کر دوسرے کی طرف لپکتا ہے لہٰذا جب یہ مجلس برخواست ہوتی ہے تو تمام اولیاء کی روحانیت ونورانیت میں اضافہ ہو چکا ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا' نچلے طبقے کے اولیاء اپنے وجود کے ہمراہ دیوان میں حاضر ہوتے ہیں لیکن

اکابر اولیاء کے لئے ایسی کوئی پابندی نہیں ہے۔(احمد بن مبارک کہتے ہیں) حضرت کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والا کوئی ولی دیوان میں حاضر ہوتا ہے تو اس وقت وہ اپنے گھر یا شہر میں موجود نہیں ہوگا کیونکہ وہ اپنی ذات کے ہمراہ دیوان میں حاضر ہوا۔ اس کے برعکس اکابر اولیاء اپنے روحانی تصرف سے کام لیتے ہوئے جسمانی طور پر اپنے گھر یا شہر میں موجود رہتے ہوئے روحانی طور پر دیوان میں حاضر ہوتے ہیں کیونکہ یہ اپنے روحانی تصرف کی بدولت 366 مختلف صورتیں اختیار کر سکتے ہیں بلکہ ایک مرتبہ جبکہ میں سیّدی عبدالعزیز دباغ کے ہمراہ باب حبشہ جو فاس شہر کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے سے باہر نکل رہا تھا کہ آپ نے ارشاد فرمایا' دیوان کیا ہے اور اس کے اراکین کی کیا حیثیت ہے؟ یہ سب میرے سینے کے اندر ہیں۔

ایک مرتبہ فرمایا' دیوان میرے سینے کے اندر منعقد ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ یہ ارشاد فرمایا' تمام زمینوں اور آسمانوں کی مثال میرے سامنے ایسے ہی ہے جیسے وسیع و عریض میدان میں ایک سکہ پڑا ہوا ہو۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس طرح کا کلام آپ سے اس وقت صادر ہوتا تھا۔ جب آپ روحانی طور پر عروج کی منازل طے کر رہے ہوتے تھے بلکہ مجھے یہ کہنا چاہیے کہ آپ کے روحانی مرتبہ و مقام میں ہر لمحے اضافہ ہوتا رہتا تھا۔

ایک مرتبہ میں آپ کے ہمراہ باب الفتوح سے باہر نکل رہا تھا کہ اس دوران آپ نے اکابر اولیاء کا ذکر شروع کر دیا۔ اگرچہ آپ امی تھے' میں نے دریافت کیا' آپ کو ان حضرات کے بارے میں کیسے علم ہوا؟ آپ نے فرمایا' اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو فتح کبیر عطا فرماتا ہے۔ ان کی ارواح برزخ میں رہتی ہیں لہٰذا جس شخص کو ہم وہاں دیکھیں تو سمجھ لیتے ہیں کہ یہ کوئی بڑا بزرگ ہے۔ اسی دوران سیّدی ابراہیم دسوقی کا ذکر چل نکلا تو آپ نے فرمایا' وہ اکابر اولیاء میں سے ایک ہیں یہ سن کر میں نے (احمد بن مبارک نے) شیخ ابراہیم دسوقی کے فضائل اور کمالات بیان کرنا شروع کیے تو سیّدی دباغ نے ارشاد فرمایا اگر حضرت ابراہیم دسوقی اپنے زمانے سے لے کر آج کے زمانے تک زندہ رہتے تو بھی وہ اتنے مقامات طے نہیں کر سکتے جو تمہارے بھائی عبدالعزیز نے کل سے لے کر آج تک طے کیے۔ اللہ کی قسم! تمہارا بھائی یہ بات فخر کے طور پر نہیں کہہ رہا بلکہ اظہار نعمت کے طور پر بیان کرتا ہے۔

ایک دن میں سیّدی عبدالعزیز دباغ کے ہمراہ باب حبشہ سے شہر کے اندر داخل ہو رہا تھا کہ آپ نے مجھے دیکھ کر ارشاد فرمایا' اس وقت مجھے تین خلعتیں عطا کی گئی ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی فاس شہر پر ڈال دی جائے تو اس کے تمام باشندے ہلاک ہو جائیں۔ تمام فصلیں اور مکانات تباہ و برباد ہو جائیں۔

ایک دن ہم باب الفتوح سے شہر کی طرف آ رہے تھے کہ میں نے آپ سے اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ کی تعداد کے بارے میں دریافت کیا کیونکہ بعض علماء کی تحقیق کے مطابق ان کی تعداد چار ہزار ہے۔ آپ نے فرمایا میں یہ

ایک لحظے میں یعنی پلک جھپکنے کے دوران ایک لاکھ کے قریب بلکہ اس سے بھی زیادہ اللہ تعالیٰ کے اسماء کا مشاہدہ کرتا ہوں اور یہ کیفیت مستقل طور پر ہر لحہ میں باقی رہتی ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ہم دوبارہ اپنے اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں کیونکہ حضرت کی مثال ایک بے کراں سمندر کی مانند ہے جس کے کنارے پر بیٹھ کر اپنی استعداد کے مطابق چند گھونٹ حاصل کر لیتے ہیں۔

غوث کی عدم تشریف آوری

ایک دن حضرت عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا' بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ غوث دیوان میں تشریف نہیں لاتا' اس کی غیر حاضری میں اہل دیوان کے درمیان اختلاف ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں بعض اوقات کچھ حضرات کو جان سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں مثلاً ایک مسئلے میں اکثریت ایک طرف تھی اور بعض حضرات کی رائے مختلف تھی تو اکثریت کی رائے کے مطابق عمل ہوتا ہے اور اقلیت اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔ اگر دو مختلف آراء ہوں اور دونوں طرف تعداد برابر ہو تو دونوں کی رائے کے مطابق تصرف ہوتا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا یہ حضرات کشف اور بصیرت کی نعمت سے مالا مال ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مراد کا اپنی بصیرت کی بدولت مشاہدہ کر رہے ہوتے ہیں تو پھر ان کے درمیان اختلاف کیوں ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا اگر اختلاف کرنے والی جماعت کم ہو تو ان کے سامنے حجاب آ جاتا ہے جس کی بدولت وہ مراد الٰہی کا مشاہدہ نہیں کر سکتے اور آخر کار تقدیر کے فیصلے کے مطابق ان کا وقت پورا ہو جاتا ہے۔ اگر دونوں طرف تعداد برابر ہو تو دونوں فریق حجاب کا شکار ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ حضرات تقدیر الٰہی کے مظہر ہوتے ہیں۔ جب ان کے درمیان اختلاف ہوگا تو تقدیر کو ان سے چھپا دیا جائے گا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا' غوث کی غیر حاضری کا سبب کیا ہوتا ہے؟

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا' اس کے صرف دو بنیادی سبب ہوتے ہیں ایک یہ کہ غوث اس وقت ذات باری تعالیٰ کے مشاہدے میں مستغرق ہوتا ہے اور اس کیفیت میں تمام کائنات اس کی نگاہ سے اوجھل ہو جاتی ہے اسی لیے اس کی توجہ دیوان کی طرف بھی مبذول نہیں ہوتی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر کسی غوث کا تقرر کیے ہوئے زیادہ عرصہ نہ گزرا ہو مثلاً سابقہ غوث کا انتقال کچھ عرصہ پہلے ہوا تھا اور پھر اسے مقرر کیا گیا تو ابتدا میں وہ غوث مستقل طور پر دیوان میں نہیں آتا۔

بعض اوقات غوث کی غیر حاضری میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف لے آتے ہیں۔ اس وقت اہل دیوان پر اس قدر شدید ہیبت طاری ہوتی ہے کہ انہیں اس بات کی خبر بھی نہیں ہوتی کہ کس وقت دیوان کے معاملات انجام پذیر ہوئے ہیں۔ ان کے حواس رخصت ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہی کیفیت کچھ دن جاری رہے تو تمام دنیا کا نظام تباہ و برباد ہو جائے۔

صحابہ کرام کی تشریف آوری

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ حضرت ابوبکر' حضرت عمر' حضرت عثمان' حضرت علی' حضرت حسن' حضرت حسین اور ان کی والدہ سیّدہ فاطمہ الزہرہ رضی اللہ عنہم بھی تشریف لاتے ہیں۔ کبھی یہ تمام حضرات ایک ساتھ آتے ہیں اور کبھی بعض حضرات تشریف لے آتے ہیں۔ سیّدہ خاتون جنت دیوان میں بائیں جانب موجود خواتین کی صف میں تشریف فرما ہوتی ہیں اور اس وقت آپ ہی ان کی قائد اور پیشوا ہوتی ہیں۔

سیدہ فاطمہ کا مخصوص درود

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے سیّدہ فاطمہ خاتون جنت رضی اللہ عنہ کو اپنے والد حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اس طرح درود پڑھتے ہوئے سنا جس کے الفاظ کچھ اس قسم کے تھے۔ بعینہ یہی نہیں تھے۔

اللھم صل علی من روحہ محراب الارواح والملائکۃ والکون' اللھم صلّ علی من ھو امام الانبیاء والمرسلین' اللھم صل علی من ھو امام اھل الجنۃ عباداللہ المؤمنین

''اے اللہ! اس ذات پر درود و نازل فرما' جن کی روح' تمام ارواح' فرشتوں بلکہ ساری کائنات کے لئے محراب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اے اللہ! اس ذات پر درود نازل فرما جو انبیاء و مرسلین کے امام ہیں۔ اے اللہ! اس ذات پر درودو نازل فرما جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے والے جنتی لوگوں کے بھی امام ہیں''۔

غوث سے اختلاف ممکن ہے؟

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا' کیا غوث کی موجودگی میں کوئی غوث سے اختلاف کی جرات کرسکتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا' غوث کی موجودگی میں اختلاف کے طور پر بولنا تو کیا کوئی رکن اپنا نچلا ہونٹ ہلانے کی جرات بھی نہیں کرسکتا کیونکہ اس صورت میں اس بات کا امکان موجود ہے کہ بولنے والے کا ایمان سلب ہوجائے۔

دیوان کے اراکین روزانہ اگلے دن میں پیش آنے والے تمام امور اتفاق رائے سے طے کرتے ہیں جو قضائے الٰہی کے عین مطابق ہوتے ہیں۔ یہ تمام حضرات ان امور کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرتے ہیں ان کا تصرف تمام جہانوں میں ہوتا ہے۔ خواہ وہ عالم علوی ہو یا عالم سفلی ہو بلکہ (عالم علوی سے اوپر) ستر حجابات کے اندر (بلکہ اس سے بھی اوپر) عالم رقاء میں بھی ان کا تصرف ہوتا ہے۔ یہ لوگ ان تمام جہانوں کے رہائشیوں کے

قلوب اور خیالات تک میں تصرف کرتے ہیں۔ ان کے تصرف کے بغیر کسی کے ذہن میں کوئی خیال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ ستر حجابات عرش سے اوپر ہیں اور عالم رقاء کے حجابات اس سے بھی اوپر ہیں۔ اگر یہ حضرات وہاں تک تصرف کر سکتے ہیں تو اس دنیا میں ان کے تصرف کا کیا عالم ہوگا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک مرتبہ سرکاری اہلکاروں نے میرے ایک دوست کے بیٹے کو گرفتار کر لیا جو کافی عرصے سے انہیں مطلوب تھا۔ گرفتاری کے بعد میرا دوست اس اندیشے کا شکار ہوا کہ شاید اب اس کے بیٹے کو قتل کر دیا جائے گا۔ وہ میرے پاس آیا اور میں اسے ہمراہ لے کر سیّدی عبدالعزیز دباغ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کے بیٹے کا معاملہ بیان کیا تو آپ نے فرمایا' تم کیا سمجھتے ہو کوئی بلی میری اجازت کے بغیر چوہے کو کھا سکتی ہے؟ (اگر ایسا نہیں ہو سکتا) تو دیگر معاملات کی کیا حیثیت ہے اس لئے اس لڑکے کے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے باپ سے کہو' تسلی رکھے' پھر ایسا ہی ہوا اور وہ لڑکا آسانی کے ساتھ رہا ہو گیا۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ اکثر ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ اگر تمہیں یا تمہارے کسی ساتھی کو کوئی حاجت پیش ہو تو صرف ایک مرتبہ میرے سامنے اس کا ذکر کیا کرو اس حاجت کی تکمیل کے لئے اصرار نہ کیا کرو کیونکہ بعض اوقات اسی وجہ سے حاجت پوری نہیں ہوتی۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) یہ بات میری آزمودہ ہے کہ بعض اوقات حضرت کے سامنے کسی حاجت کو ایک مرتبہ ذکر کیا تو وہ حاجت پوری ہو گئی اور اگر کسی حاجت کو اصرار کے ساتھ بار بار ذکر کیا تو وہ پوری نہیں ہوئی۔

غار حراء کے علاوہ دیوان کہاں منعقد ہوتا ہے؟

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک مرتبہ میں نے سوال کیا' کیا دیوان کا اجلاس غار حرا کے علاوہ اور کسی مقام پر بھی منعقد ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا' ہاں' سال بھر میں صرف ایک مرتبہ دشت سوس اور سوڈان کے مغربی حصے کے درمیان ''زاویہ اسا'' نامی جگہ پر سوڈان سے تعلق رکھنے والے اولیاء کرام کا اجتماع ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض حضرات صرف اسی ایک رات میں دیوان میں تشریف لاتے ہیں تو میں نے دریافت کیا' کیا ان دو مقامات کے علاوہ اور کسی جگہ پر بھی اولیاء کا اجتماع ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا ان دو مقامات کے علاوہ کسی بھی جگہ پر زیادہ سے زیادہ دس اولیائے کرام اکٹھے ہوتے ہیں۔ اس سے زیادہ نہیں ہوتے کیونکہ زمین ان کے انوار کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی پھر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت بھی یہی ہے کہ یہ حضرات پوری روئے زمین پر مخلوق خدا کے درمیان پھیلے رہیں۔

دیوان میں مجاذیب کی شمولیت

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا' کیا دیوان میں مجذوب بھی شامل ہوتے ہیں اور کیا یہ

حضرات بھی دیگر اولیاء کی مانند تصرف کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا' مجذوب دیوان میں داخل نہیں ہوتے اور نہ ہی انہیں کسی قسم کے تصرف کا اختیار ہے کہ جب انہیں تصرف کی اجازت دی جائے گی تو لوگ ہلاک ہو جائیں گے۔ میں نے دریافت کیا' ایسا کب ہوگا؟ آپ نے فرمایا' دجال کے خروج کے وقت تصرف مجاذیب کے سپرد کر دیا جائے گا اور اس وقت دیوان کا سربراہ کوئی مجذوب ہوگا کیونکہ اس کے پاس عقل نہیں ہوگی اس لیے اس کے تصرف میں خلل واقع ہوگا اور یہی خلل دجال کے خروج کا باعث بنے گا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک مرتبہ حضرت نے مجھے ایک واقعہ سنایا جس میں مجاذیب سے متعلق بہت سے قیمتی نکات اور ان کے علاوہ دیگر فوائد بھی موجود ہیں اس لئے میں اس واقعے کو یہاں نقل کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا۔

سیّدی حماد نام کے ایک مجذوب گزرے ہیں جن کا تعلق مراکش سے تھا۔ آپ بازار میں دست سوال دراز کیا کرتے اور کھانے کی اشیاء مانگتے۔ اس زمانے میں اشیائے خورد ونوش بہت مہنگی ہو چکی تھیں۔ ایک مرتبہ آپ روٹی مانگنے کے لئے ایک دکان کے پاس گئے اور آپ نے نظر کشفی سے دیکھا کہ دکان کے سامنے زمین میں ایک ملکہ دفن ہے۔ اس میں بہت سا سونا موجود ہے لیکن دکاندار بھی صاحب کشف تھا اس نے جب سیّدی حماد کو اپنی طرف آتے دیکھا تو ان کا امتحان لینے کا ارادہ کیا۔ سیّدی حماد نے آ کے سوال کیا تو وہ بولا اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا کر رکھا ہے' سیّدی حماد نے سوال دہرایا تو اس نے بھی اپنا جواب دہرا دیا۔ پھر اس نے سوچا کہ سیّدی حماد کو آزمانا چاہیے کہ یہ واقعی کوئی بزرگ ہستی ہیں۔ اس نے سیّدی حماد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا' تم جس ضرورت کا سوال کر رہے ہو اس کی تکمیل کے لئے وہ چیز کافی ہے جو تمہارے پاؤں کے نیچے ہے۔ اس کا اشارہ زیر زمین دفن خزانے کی طرف تھا جس پر سیّدی حماد کھڑے ہوئے تھے تو سیّدی حماد نے جواب دیا' میرے پاؤں کے نیچے سونا موجود ہے جبکہ میں نے تم سے چاندی کے سکے کا مطالبہ کیا ہے تاکہ میں اس کے عوض کھانا کھا سکوں۔ اس پر اس دکاندار کو سیّدی حماد کے کشف کا یقین ہوا اور اس نے چاندی کے دس سکے حضرت کی خدمت میں پیش کیے۔ جنہیں سیّدی حماد نے قبول کیا اور واپس تشریف لے گئے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا' دکاندار سیّدی حماد کو دیکھنے سے پہلے کیسے اس نتیجے تک پہنچا کہ اسے سیّدی حماد کے کشف کو آزمانے کا خیال آیا۔ آپ نے فرمایا' اس کی مثال تم یوں سمجھ سکتے ہو کہ ایک شخص سویا ہوا تھا اور خواب میں اس نے کسی اور شخص کو دیکھا۔ جب آنکھ کھلی تو وہی خواب والا شخص پاس موجود تھا۔ اب یہ غور سے اس کی طرف دیکھ رہا ہے تاکہ یقین ہو جائے کہ یہ وہی خواب والا شخص ہے یا اس کی بجائے کوئی اور ہے۔ اسی طرح وہ دکاندار سیّدی حماد کی بزرگی کو جانتا تھا لیکن تجربے کے بعد اس کا یقین پختہ ہو گیا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا' دکاندار نے پہلے تو انہیں صاف انکار کر دیا لیکن پھر جب پتا چلا کہ یہ کوئی بزرگ ہے تو سوال سے زیادہ عطا کیا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ کیونکہ اگر ہم اللہ کے نام پر کوئی مال

خرچ کرتے ہیں تو اس میں اس بات کا لحاظ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ مال کسی ولی پر خرچ ہو رہا ہے یا غیر ولی پر اس لئے کہ دونوں کا پروردگار تو ایک ہی ہے لیکن اگر وہ عطیہ اللہ کے نام پر نہیں تھا تو اس ولی کو قبول نہیں کرنا چاہیے تھا کیونکہ یہ ان کی شان کے لائق نہیں تھا۔ لہٰذا اگر دکاندار نے پہلی مرتبہ اللہ کی رضا کے لئے انکار کیا تھا تو دوسری مرتبہ بھی انکار کرنا چاہیے تھا اور اگر دوسری مرتبہ اللہ کی رضا کے لئے مال دیا تھا تو وہ پہلی مرتبہ ہی دے دینا چاہیے تھا؟

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا' کسی بھی مومن کا ایک حق ہوتا ہے یعنی ایمان کا حق جبکہ ولی کے دو حقوق ہوتے ہیں۔ ایک ایمان کا حق اور دوسرا اللہ کی معرفت کا حق' اس لئے پہلی مرتبہ صرف حق ایمان کا لحاظ کر کے دینا ضروری نہیں سمجھا جبکہ دوسری مرتبہ حق معرفت کا لحاظ کر کے دیا گیا کیونکہ معرفت الٰہی میں دونوں مشترک ہیں اور اس اعتبار سے دونوں کے درمیان خصوصی تعلق اور بھائی چارہ قائم ہو جائے گا اس لئے پہلی مرتبہ انکار بھی اللہ کے لئے تھا اور دوسری مرتبہ عطا بھی اللہ کے لئے کیا۔ اس بات کو ایک مثال کے ذریعے ہم یوں بیان کر سکتے ہیں کہ دروازے کے پرے کسی شخص نے سوال کیا تو جواباً معذرت کر لی لیکن پھر پتا چلا کہ سائل اس کا اپنا سگا بھائی ہے تو اب یہ مناسب نہیں ہے کہ اس کے ساتھ بیگانگی کا مظاہرہ کیا جائے بلکہ صلہ رحمی کے تحت اس کے سوال سے زیادہ اس کی مدد کرنی چاہیے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) حق معرفت کی بدولت سائل کس قدر حصے کا حقدار ہوگا؟ آپ نے فرمایا' اسی قدر حصے کا جو اللہ کے نام پر قائم کی جانے والی اخوت کا تقاضہ ہے یعنی اگر تمہارا صرف ایک دینی بھائی ہے تو وہ تمہارے نصف مال کا مالک ہوگا اور اگر تمہارے 9 دینی بھائی ہیں تو کل مال کے دس حصے کر کے ہر ایک کو ایک ایک حصہ دیا جائے گا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا' دکاندار نے سیّدی حماد کو اپنا نصف مال دینے کی بجائے صرف 10 سکے کیوں دیئے؟ آپ نے فرمایا' ممکن ہے کہ ان کے علاوہ اور بھی مشائخ اس دکاندار کے پاس آئے ہوں اس لئے اس نے ان سب کے حقوق کا خیال رکھا ہر انسان خود بہتر سمجھ سکتا ہے کہ وہ اپنے حصے کے فرائض کس طرح سرانجام دے سکتا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا' سیّدی حماد کیا تھے؟ آپ نے فرمایا' سیّدی حماد ایک مجذوب تھے جبکہ وہ دکاندار ایک سالک تھا اور اس کا نام سیّدی ابراہیم تھا' یہ دونوں حضرات صاحب کشف بزرگ تھے۔

سالک اور مجذوب میں فرق

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک مرتبہ میں نے دریافت کیا' سالک اور مجذوب دونوں کو معرفت نصیب ہوتی ہے پھر دونوں کے درمیان بنیادی فرق کیا ہے؟ آپ نے فرمایا' مجذوب وہ شخص ہوتا ہے جو کوئی چیز دیکھ

کرفوراً اس کا اثر قبول کرے۔ مجذوب اپنے مشاہدے کی بدولت نہایت مسرور ہوتا ہے اور اسی خوشی کے عالم میں اپنے جسم کے ساتھ وہی حرکات کرنے لگ جاتا ہے جو مشاہدے میں دکھائی دیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ جب کسی شخص پر رحم کرتے ہوئے اس کی بصیرت کو فتح عطا فرما دے تو ایسا شخص ہمیشہ ملاء اعلیٰ کے عجائبات کے مشاہدے میں محو رہتا ہے اور یہ ایک ایسی کیفیت ہے جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مجذوب جب یہ مشاہدہ کرتا ہے تو اس کی نقل کرنے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ مشاہدات کی کوئی حد نہیں ہے اس لئے ان کی نقل کرنا عملاً ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجذوب کی حالت میں ٹھہراؤ اور قرار نہیں ہوتا اس لئے اگر آپ کسی مجذوب کو دیکھیں کہ وہ خوشی کے مارے جھومتا ہوا چل رہا ہے تو سمجھ جائیں کہ وہ حور عین کے مشاہدے میں گم ہے کیونکہ ان کی حرکات اسی طرح کی ہوتی ہیں۔

اس کے برعکس سالک مشاہدے سے متاثر نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کی نقل کرنے کی کوشش کرتا ہے بلکہ اس کی مثال بے کراں سمندر کی سی ہے جس پر کوئی چیز اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ سالک معرفت کے اعتبار سے مجذوب سے زیادہ کامل ہوتا ہے اور سالک مجذوب کی بہ نسبت تین گنا زیادہ اجر و ثواب کا مستحق ہوتا ہے کیونکہ سالک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ظاہری مشاہدے سے متاثر نہیں ہوتا اس لئے سالک کے ہوش و حواس قائم رہتے ہیں۔ اس کے برعکس مجاذیب کے حواس عام طور پر قائم نہیں رہتے کیونکہ ان کا ظاہر اپنے مشاہدے سے متاثر ہو کر اسی کی پیروی کرنے لگ جاتا ہے جس کی بدولت ان کی عقل متاثر ہو جاتی ہے۔

ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا' ایک مرتبہ دیوان کے اراکین میں ایک صاحب اپنے کم سن بیٹے کو کندھے پر بٹھا کر دیوان میں لے آئے انہیں اپنے بیٹے کے بارے میں یہ معلوم تھا کہ وہ ان کا روحانی وارث ہوگا لیکن کیا وہ سالک ہوگا یا مجذوب ہوگا؟ اس بارے میں پتا نہیں تھا دیوان کے اراکین نے انہیں سرزنش کی کہ جو شخص اس مرتبے کا مالک نہ ہوا سے دیوان میں لانا مناسب نہیں ہے پھر تم اسے کیوں یہاں لائے ہو؟ ان صاحب نے دیوان کے اراکین سے معذرت کی اور اس کے بعد غوث کی خدمت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل مجلس کا واسطہ دیتے ہوئے یہ درخواست کی کہ اس بات کو ظاہر کر دیا جائے کہ میرا بیٹا سالک ہوگا یا مجذوب ہوگا؟ غوث نے جواب دیا یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ جو نور ایمان سالک میں موجود ہوتا ہے وہی مجذوب میں بھی موجود ہوتا ہے۔ دونوں ہی کو اللہ تعالیٰ کی معرفت نصیب ہوتی ہے۔ صرف درجات اور نیکیوں کا فرق باقی رہ جاتا ہے اس کے بارے میں آخرت میں پتا چل سکے گا۔ لٰہذا ہم یہ نہیں جان سکتے کہ یہ بچہ بڑا ہو کر مجذوب ہوگا یا سالک ہوگا۔ ان صاحب نے دوبارہ عرض کی' حضرت! آپ اس وقت کے غوث ہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے شمار علوم عطا کیے ہیں۔ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس راز سے پردہ اٹھا دیں۔ اس پر غوث نے ایک ٹہنی اور چھری منگوائی۔ بچے کو اپنے سامنے بٹھایا پھر چھری کے ذریعے ٹہنی کو تراش کر اپنے منہ میں لے کر کبھی دانتوں اور کبھی ہونٹوں کے ذریعے دبانا شروع کیا۔ ساتھ میں بچے کا مشاہدہ بھی

کرتے رہے کہ وہ کیا ردعمل ظاہر کرتا ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ بچہ ہو بہو ان کی نقل کر رہا ہے تو آپ نے فرمایا' یہ بچہ بڑا ہو کر مجذوب ہوگا۔ بچے کے والد نے دریافت کیا' یہ کیسے پتا چلا؟ انہوں نے فرمایا کیونکہ یہ بچہ اپنے مشاہدے سے متاثر ہو جاتا ہے۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں' سالکین کو مجاذیب سے پرہیز کرنا چاہیے اور کسی مجذوب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھانا چاہیے کیونکہ مجذوب کو اس بات کی پرواہ نہیں ہوتی کہ اس کی زبان سے گالی نکل رہی ہے یا کوئی اور بات۔ اس لیے سالک کو مجذوب سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اسی طرح کسی بھی سالک کو کسی مجذوب کے ہمراہ سفر نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی کسی مجذوب کا لباس پہننا چاہیے کیونکہ ممکن ہے کہ مجذوب کے لباس پر نجاست لگی ہوئی ہو۔ اسی طرح کسی سالک کو کسی مجذوب عورت کے ساتھ نکاح نہیں کرنا چاہیے نہ ہی کسی سالک عورت کا نکاح کسی مجذوب مرد کے ساتھ کیا جائے۔ البتہ ایسا ہوسکتا ہے کہ بعض اوقات کسی سالک شیخ کا مرید مجذوب ہو جیسا کہ مذکورہ بالا واقعے میں بچے کا والد سالک تھا اور وہ بچہ مجذوب تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی مجذوب کا تربیت یافتہ مرید سالک ہو۔ جیسا کہ سیّدی یوسف الفاسی سالک تھے لیکن آپ کے شیخ طریقت سیّدی عبدالرحمٰن مجذوب تھے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے عرض کی' مجذوب کو تو اپنی خبر نہیں ہوتی دوسرے کی کیا ہوگی؟ (جب دوسرے کی خبر ہی نہیں ہوگی) تو پھر اس کی تربیت کیسے کر سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا' جذب کی مختلف کیفیات ہوتی ہیں۔ بعض حضرات کا جذب کم ہوتا ہے اور بعض کا اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ کسی بھی وقت جذب کی کیفیت ختم نہیں ہوتی۔

ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا' اولیائے کرام بعض اوقات اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ قدرت کے تحت ایسے کارنامے سرانجام دیتے ہیں جنہیں دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے لیکن جب آپ حقیقت حال کا جائزہ لیں گے تو پتا چلے گا کہ درحقیقت فاعل اللہ کی ذات ہے اور تمام اولیاء دیگر مخلوقات کی مانند مشیت ایزدی کے پابند ہیں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا' اگر اولیائے کرام افعال باری تعالیٰ کے مشاہدے میں گم رہتے ہیں تو پھر انہیں اپنے افعال کا کیسے پتا چلتا ہے؟ یا پھر وہ کسی فعل کو اپنی طرف کیوں منسوب کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا' اولیائے کرام اور بزرگان دین صرف دوسروں میں اللہ تعالیٰ کے افعال کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ مخلوق میں سے کسی ایک کے اندر بھی یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ اپنی ذات کے اندر اللہ تعالیٰ کے افعال کا مشاہدہ کر سکے۔ کیونکہ اگر وہ اپنی ذات کے اندر افعال باری تعالیٰ کا مشاہدہ کرے تو فوراً اسی وقت فنا ہو جائے۔ یاد رکھو تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ کے افعال کا مشاہدہ مختلف واسطوں کے ذریعے دوسروں میں کرتی ہیں اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مختلف واسطے پیدا کیے ہیں اور فرشتوں کو اپنے افعال کا مظہر بنایا ہے تاکہ مخلوقات ہلاک نہ ہو جائیں اور یہ واسطہ

بننے کی صلاحیت بھی فرشتوں کے اندر ہے کیونکہ ان کا وجود نور پر مشتمل ہوتا ہے۔ جسد خاکی اس کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

یہ بات ذہن نشین کرلو! اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو یہ خصوصیت عطا کی ہے کہ وہ افعال باری تعالیٰ اور مخلوق کے درمیان واسطہ بنتے ہیں۔ چنانچہ اگر تمہیں فتح (کشف) نصیب ہو جائے تو تم دیکھو گے کہ یہ فرشتے ساری کائنات میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ حجابات میں' ان کے نیچے عرش پہ' اس کے نیچے' جنت' دوزخ' آسمان' زمین' پہاڑ' وادیاں اور سمندروں میں ہر جگہ فرشتے موجود ہیں۔

آپ نے مزید ارشاد فرمایا کیونکہ فرشتے خالق اور مخلوق کے درمیان واسطہ بنتے ہیں اس لئے ان پر ایمان لانا ضروری قرار دیا گیا ہے حالانکہ فرشتوں سے بلند مرتبہ مخلوق بھی موجود ہے لیکن اس پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے جیسے عرش کے اوپر کے حجابات۔

اولیاء کے تصرفات

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک مرتبہ گفتگو کے دوران میں نے سیدنا سلیمان علیہ السلام کا ذکر کیا کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے جنات' انسان' شیاطین اور ہوا کو مسخر کر دیا پھر میں نے حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر کیا کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے انہیں لوہے کو ڈھالنے کا معجزہ عطا کیا تھا؟ کہ کس طرح لوہا ان کے ہاتھ میں آ کر گندھے ہوئے آٹے کی مانند نرم ہو جایا کرتا تھا؟ اس کے علاوہ میں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا ذکر کیا کہ وہ کس طرح پیدائشی اندھوں اور جذام کے مریضوں کو تندرست کر دیا کرتے تھے؟ اس کے علاوہ وہ مردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے۔ آپ سمجھ گئے کہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان تمام انبیاء سے افضل ہیں لیکن اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے اس قدر معجزات کا ظہور نہیں ہوا بلکہ آپ کے معجزات کی نوعیت مختلف تھی۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا' ان حضرات انبیاء کرام کو جو معجزات عطا کیے گئے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے صاحب تصرف اولیاء کو ان کے برابر بلکہ ان سے بھی زیادہ تصرف کا اختیار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان اولیاء کے لئے انسانوں' جنات' شیاطین' فرشتوں اور ہواؤں کو بلکہ کائنات کی تمام اشیاء کو مسخر کر دیا ہے اور انہیں یہ صلاحیت عطا کی ہے کہ یہ پیدائشی اندھوں یا جذام کے مریضوں کو تندرست کر سکتے ہیں۔ مردوں کو زندہ کر سکتے ہیں لیکن یہ ایک غیبی امر ہے جسے عام مخلوق سے پوشیدہ رکھا گیا ہے تاکہ لوگ ان کی طرف متوجہ ہو کر اپنے پروردگار سے غافل نہ ہو جائیں اور اہل تصرف اولیاء اکرام کو یہ تمام خصوصیت صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے حاصل ہوئی ہیں لہٰذا یہ تمام کرامات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ شمار ہوں گی۔ پھر آپ نے اس بارے میں ایسے اسرار بیان کیے جو ہماری عقل سے ماورا ہیں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک دن میں نے دریافت کیا' اہل تصرف اولیائے کرام اس بات کی صلاحیت

رکھتے ہیں کہ وہ تمام کفار کو ہلاک کر دیں پھر کیا وجہ ہے کہ وہ ان کے کفر اور غیر اللہ کی عبادت کے باوجود انہیں ہلاک نہیں کرتے جبکہ ان کفار کو ہلاک کرنا ضروری ہے۔ میری یہ بات سن کر سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ایک لمحے کے لئے اپنا چہرہ پیچھے کی طرف موڑ کر آگے کیا اور فرمایا۔ ولی ایک لمحے کے اندر روئے زمین پر موجود تمام بنی نوع انسان کو ہلاک کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ اس بات کا پابند ہے کہ کفار اور مسلمانوں کی جنگ کے دوران اپنی روحانی طاقت استعمال نہیں کر سکتا کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے مطابق کفار کے ساتھ تیر و تفنگ کے ذریعے مقابلہ کیا جائے گا۔

ایک مرتبہ مسلمانوں کے بحری جہاز کا کفار کے بحری جہاز کے ساتھ مقابلہ ہو گیا۔ مسلمانوں کی کشتی میں دو ولی بھی موجود تھے۔ ان میں سے ایک مرتبے کے اعتبار سے کم تھا۔ جب جنگ نے شدت اختیار کی تو اس نے اپنے روحانی تصرف کی بدولت کفار کے جہاز میں آگ لگا دی۔ جس کا کوئی ظاہری سبب سامنے نہ آ سکا تا کہ اس کی آڑ میں اس کا تصرف چھپ جاتا۔ کفار کا جہاز کسی ظاہری سبب کے بغیر جل کر راکھ ہو گیا۔ دونوں اولیاء میں سے جو مرتبے کے اعتبار سے بڑا تھا اس نے اپنی روحانی طاقت کو استعمال کرتے ہوئے کم مرتبے والے ولی کی روحانی طاقت کو سلب کر لیا تا کہ اس کی غلطی کی سزا دی جائے۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں' کفار کے خلاف روحانی تصرف اس لئے ممنوع ہے کیونکہ روحانی تصرف کرتے وقت ولی عالم بشریت سے نکل کر عالم روحانیت میں شامل ہو جاتا ہے جبکہ عالم روحانیت کے باسی فرشتوں کے لئے بھی یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی طاقت کفار کے خلاف استعمال کریں۔ کوئی بھی صاحب کشف ولی صرف ان امور میں تصرف کر سکتا ہے جن کا تعلق کائنات کے عمومی نظام کے ساتھ ہو جیسا کہ مختلف فرشتے انسان کے پیدائش سے لے کر اس کی وفات تک مختلف امور کا انتظام کرتے ہیں اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ کفار کا تعلق کیونکہ عالم بشریت کے ساتھ ہے اس لئے ان کے مقابلے میں وہی ذرائع اختیار کئے جائیں گے جو عالم بشریت سے متعلق ہیں۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں' ایک مرتبہ اک عیسائی بچی نے آسمان پر چاند دیکھ کر اپنے والد سے دریافت کیا' اس چاند کو کس نے پیدا کیا ہے؟ اس کے والد نے صلیب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اس نے' بچی نے صلیب کو اٹھا کر سر سے بلند کیا اور ہوا میں چھوڑ دیا' صلیب زمین پر گر گئی۔ اس نے اپنے والد سے کہا جو چیز اپنے آپ کو اتنی سی بلندی سے نہیں تھام سکتی وہ آسمان میں چاند کو کیسے تھام سکتی ہے۔ یہ سن کر اس کے والد نے اسے برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے حضرت سے دریافت کیا' کیا وہ بچی مسلمان تھی؟ آپ نے فرمایا' نہیں' میں نے دریافت کیا' کیا وہ بعد میں مسلمان ہو گئی تھی؟ آپ نے فرمایا' نہیں' میں نے دریافت کیا' پھر اس نے اتنا وزنی اعتراض کیسے کیا؟ یہ نور عقل اسے کیسے حاصل ہوا؟ آپ نے فرمایا' اس وقت ایک ولی وہاں موجود تھا

اس نے لڑکی کی طرف توجہ کی جس کے نتیجے میں لڑکی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) جو ولی وہاں موجود تھا وہ خود سیّدی عبدالعزیز دباغ تھے اور آپ نے روحانی طور پر اس بچی پر نگاہ ڈالی تھی۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک مرتبہ میں نے حضرت سے دریافت کیا اگر کوئی ولی کسی دوسری شکل میں موجود ہو اور اس دوسری صورت میں قتل ہو جائے تو موت کی تکلیف کسے ہوگی؟ ولی کی روح کو یا اس جسم کو جس کی شکل ولی نے اختیار کر رکھی تھی؟

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا' ہمارے لیے یہ عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ دونوں جہانوں میں تکلیف ایک ہی قسم کی ہوتی ہے مگر عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید جسم کو تکلیف ہوئی ہے حالانکہ درحقیقت روح اس تکلیف کو محسوس کرتی ہے اس کے بعد آپ نے اس مسئلے کے کچھ اسرار بیان کیے اور بتایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی ولی کو کسی ایسی جگہ پر متعین فرمائے جہاں کی سردی یا گرمی ولی کا جسد خاکی برداشت نہ کر سکے تو اس وقت ولی کی روح اس کے جسم سے نکل کر اس وجود میں داخل ہو جاتی ہے جو موسم کی شدت کو برداشت کر سکے ولی اپنے ذمے لازم کام کو پورا کر کے واپس اپنے جسم میں آ جاتا ہے اس لئے اگر اس نئے جسم کو کوئی تکلیف لاحق ہو تو ولی کی روح اس کے درد کو محسوس کرتی ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا عام طور پر ولی کی روح کون سے اجسام میں داخل ہوتی ہے؟ تو آپ نے فرمایا' پہاڑوں اور ایسے جانوروں کے جسم میں جو موسم کی سختی کو برداشت کر سکیں۔ میں نے دریافت کیا' ان اجسام کی اپنی روح کہاں جاتی ہے؟ آپ نے فرمایا' ان کی اپنی روح اگرچہ ان کے جسم میں موجود ہوتی ہے مگر ان کی روح کی مثال انسانی روح کی طرح نہیں ہے کیونکہ جانوروں کی روح ان کی عقل کی طرح کمزور ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کی عقل بھی ان کی روح کی طرح کمزور ہوتی ہے اس لئے ان کی روح ان کے وجود پر اس طرح اثر انداز نہیں ہو سکتی جیسے انسانوں کی ارواح ان کے وجود پر اثر انداز ہوتی ہیں اس لئے جب کوئی ولی اللہ کے حکم کی تعمیل میں جسم تبدیل کرتا ہے تو اس کی روح بھی کسی چوپائے کے جسم میں منتقل ہو جاتی ہے لیکن کسی بھی ولی کی روح کسی دوسرے انسان کے جسم میں منتقل نہیں ہو سکتی کیونکہ انسانوں کے جسم میں طاقتور روح موجود ہوتی ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک مرتبہ میں نے دریافت کیا' بعض اوقات ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایک غیر متحرک روشنی اچانک حرکت میں آ کر کسی شخص کی طرف لپکتی ہے اور اسے ہلاک کر دیتی ہے۔ شاید وہ کوئی ولی ہو سکتا ہے جو آگ کی شکل اختیار کر کے امر الٰہی کو نافذ کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا' ممکن ہے' لیکن شرط یہ ہے کہ مقتول کوئی کافر ہو کیونکہ عام طور پر نور اور ظلمت کے درمیان جنگ جاری رہتی ہے۔ میں نے عرض کی' بعض شیاطین بلی یا کتوں کی شکل اختیار کر جاتے ہیں اس کی بھی یہی نوعیت ہوگی۔ آپ نے فرمایا' ہاں! شیاطین میں باطل اور

ظلمت کی طاقت موجود ہوتی ہے جبکہ اولیاء کرام حق اور نورانیت کے محافظ ہوتے ہیں جبکہ ظلمت اور نور دو مستقل گروہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ تقدیر کو نافذ کرنے کے پابند ہیں۔ یہ دونوں گروہ مختلف شکلیں اختیار کر کے امر الٰہی کو نافذ کرتے ہیں۔

میں نے دریافت کیا' کیا کوئی ولی سانپ کی شکل اختیار کر سکتا ہے؟

آپ نے فرمایا' ہاں! اگر کسی شخص کے نصیب میں زہر کے ذریعے قتل ہونا لکھا ہو تو اس وقت ولی کی روح سانپ کی شکل اختیار کر کے تقدیر کے فیصلے کو نافذ کرتی ہے۔

میں نے دریافت کیا' لیکن روح میں تو زہر نہیں ہوتا؟

آپ نے فرمایا' ولی کا ارادہ ہی تمام امور میں تصرف کرتا ہے۔

میں نے دریافت کیا' جب کوئی ولی اپنے جسم سے نکل کر دوسرے جسم میں داخل ہوتا ہے تو اس کے اپنے وجود کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے؟ آپ نے فرمایا اگر وہ کم مرتبے کا مالک ہو تو اس کا اپنا وجود ساکن اور بے ہوش ہو جاتا ہے اور کوئی بات نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر وہ ولی بلند مرتبے کا حامل ہو تو اس کے اپنے وجود پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور وہ تمام معمولات معمول کے مطابق سرانجام دیتا ہے۔

میں نے عرض کی' جب اس ولی کی روح جسم سے نکل جاتی ہے تو اس کا بالواسطہ مطلب یہ ہے کہ اس ولی کا انتقال ہو گیا ہے تو پھر کم مرتبے کے مالک ولی کے بے ہوش رہنے یا عام مرتبے کے مالک ولی کے معمول کے مطابق رہنے کا کیا مطلب ہوگا؟ آپ نے فرمایا' روح کے جسم سے نکلنے کے بعد زندگی کے کچھ آثار مثلاً حرارت جسم میں باقی رہتے ہیں اور اس کی مدت چوبیس گھنٹوں کے برابر ہوتی ہے۔ جب تک یہ آثار باقی رہیں تو زندگی باقی رہتی ہے۔ اگر ولی کی روح اپنے فرض کی تکمیل کے بعد چوبیس گھنٹوں سے پہلے واپس آ جائے تو ولی بدستور زندہ رہتا ہے لیکن اگر تاخیر ہو جائے تو ولی کا انتقال ہو جاتا ہے اور اب اس کی روح جسم کی طرف واپس نہیں لوٹ سکتی۔ بہت سے اولیاء کا انتقال اسی حالت میں ہوا ہے اور وہ لوگ نہایت خوش نصیب ہیں جنہیں یہ سعادت نصیب ہوئی۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے عرض کی' میں نے یہ سن رکھا ہے کہ بعض مشائخ کی ارواح 3'3 دن تک جسم سے الگ رہتی تھیں اور پھر واپس آ جاتی تھیں۔ یہ بات آپ کے بیان سے مختلف ہے۔ تو سیدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا' تم نے ٹھیک سن رکھا ہے۔ بعض اولیاء کی ارواح 17 دن تک جسم سے الگ رہتی تھیں مگر اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس تمام عرصے کے دوران روح کی توجہ جسم کی طرف مبذول رہے اور اسی توجہ کی بدولت جسم میں زندگی کے آثار باقی رہتے ہیں۔

اس بات کی وضاحت ہم یوں کر سکتے ہیں جیسے کوئی شخص کسی ایسی جگہ پر نہانے کے لئے نہر میں داخل ہو جہاں چوری کا اندیشہ ہو اب اس کا لباس نہر کے کنارے موجود ہوگا اور اس کا اپنا جسم پانی کے اندر ہوگا لیکن اس

کی پوری توجہ لباس کی طرف مبذول ہوگی۔ یہی حال روح کا ہے کہ وہ اپنے جسم سے نکلنے کے بعد اس کی خبر گیری میں مشغول رہتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ پانی میں اترنے والا شخص صرف دیکھ کر اپنے کپڑوں کی خبر گیری کرتا ہے مگر روح کیونکہ خفیف ہے اور اس کے لئے حرکت آسان ہے اس لئے وہ جسم میں داخل ہو کر جسم کی خبر گیری کرتی ہے۔ چنانچہ روح کا جسم کی طرف متوجہ ہو جانا ہی جسم میں داخل ہو جانے کے مترادف ہے۔ اس کے بعد وہ امر الٰہی کو نافذ کرنے کے لئے اپنے فرائض سرانجام دیتی ہے پھر کچھ دیر کے بعد دوبارہ توجہ کرتی ہے۔ غرضیکہ جب تک اللہ کا حکم ہو جسم سے دور رہتی ہے اس لئے ایسی حالت میں تین دن گزریں یا تین سے زیادہ دن گزریں اس کی حالت پر کوئی فرق نہیں پڑتا اس لئے تمہاری سنی ہوئی بات میرے بیان کے خلاف نہیں ہے۔

ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا' صاحب تصرف بزرگ جب چاہے کسی بھی شخص کی جیب میں ہاتھ ڈال کر مال نکال سکتا ہے اور اس شخص کو اس بات کی خبر بھی نہیں ہو سکے گی۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس کی وجہ یہ ہے کہ ولی جس ہاتھ کے ذریعے پیسے نکالتا ہے وہ ظاہری نہیں بلکہ باطنی ہاتھ ہوتا ہے۔ اس کے بعد سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ایک واقعہ بیان کیا۔

ایک مرتبہ ایک ولی کے پڑوسی کی بیوی کے پاس کسی شخص نے امانت کے طور پر پانچ مثقال سونا رکھوایا اور خود کسی سفر پر روانہ ہو گیا۔ اس نے عورت کو وصیت کی کہ اگر میں زندہ رہا تو خود آ کر اپنی امانت واپس لوں گا اور اگر میرا انتقال ہو گیا تو تم میری اولاد کو یہ رقم دے دینا۔ کچھ عرصے بعد اس عورت کا آخری وقت قریب آیا تو اس نے اپنے شوہر کو وصیت کی کہ اگر اس سونے کا مالک آ گیا تو یہ اسے دے دینا' عورت کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس کے شوہر کی نیت خراب ہو گئی اور اس نے وہ سونا ہضم کر لیا۔ اصل مالک واپس آیا اور اس نے تقاضا کیا تو عورت کے خاوند نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ایک دن وہ خاوند کچھ رقم لیکر خریداری کے لئے گھر سے باہر نکلا وہ رقم پانچ مثقال سونے کی مالیت کے برابر تھی۔ اس وقت ولی اپنے گھر کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔ یہ دونوں فاس شہر کے رہنے والے تھے۔ عورت کے شوہر نے بازار سے ایک چراغ خریدا تا کہ اسے حضرت شیخ عبدالقادر الفاسی کی درگاہ پر جا کر جلائے جب وہ درگاہ کے پاس پہنچا تو اس ولی نے اپنے گھر کے دروازے کے آگے کھڑے ہوئے اس شخص کی جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ رقم نکال لی جس کی مالیت پانچ مثقال سونے کے برابر تھی۔ اس شخص کو اس کا علم نہیں ہو سکا۔ جب وہ شخص شیخ عبدالقادر الفاسی کی درگاہ پر پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ وہ ولی بھی وہاں موجود ہے اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو وہاں کچھ بھی موجود نہیں تھا۔ وہ شخص اس ولی کی ولایت سے لاعلم تھا اور اسے ایک عام زائر سمجھ کر مخاطب ہو کر کہنے لگا' خدا کی قسم! دنیا میں زندہ یا مردہ کوئی ولی نہیں ہے۔ یہ بات سن کر اس ولی کو اس قدر زور سے ہنسی آئی کہ شاید ہنسی کے مارے وہ زمین پر گر جاتا۔ ولی نے اس سے پوچھا' کیا بات ہے؟ اس نے جواب دیا جب میں گھر سے نکلا تھا تو میری جیب میں اتنی رقم موجود تھی۔ میں نے سوچا شیخ عبدالقادر الفاسی کی درگاہ پر جا کر بطور تبرک چراغ جلانا چاہیے مگر کسی نے میری جیب میں سے پیسے نکال لیے یہ

سن کر اس ولی کو اور بھی ہنسی آئی۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) وہ ولی سیّدی عبدالعزیز دباغ تھے۔ اسی طرح کا ایک واقعہ اس وقت پیش آیا جب سیّدی محمد بن علی المجادی جو مشہور فقیہ ہیں' اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ حضرت کی زیارت کے لئے آئے ہوئے تھے اور حضرت ان کے ہمراہ اپنے گھر کے باہر تشریف فرما تھے۔ حضرت نے شیخ المجادی سے دریافت کیا' آپ کے پاس کچھ دراہم ہیں؟ انہوں نے انکار کیا' حضرت نے تین مرتبہ اپنا سوال دہرایا اور انہوں نے بھی تینوں دفعہ انکار کیا۔ حضرت نے دوبارہ اصرار کیا' حضرت کے اصرار پر انہوں نے اپنی جیب ٹٹولی تو اس میں واقعی کچھ نہیں تھا۔ حالانکہ ان کے پاس 18 سکے موجود تھے۔ وہ بہت حیران ہوئے اور اقرار کیا میرے پاس 18 سکے موجود تھے لیکن اب نہیں ہیں۔ شیخ مسکرائے اور ان کے 18 سکے اپنی پشت کے پیچھے سے نکال کر انہیں دیتے ہوئے ارشاد فرمایا' اے محمد بن علی! جس شخص کے اندر یہ صلاحیت ہو اس سے تم اپنا مال کیسے چھپا سکتے ہو؟

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) انہی صاحب کے ساتھ ایک اور واقعہ بھی پیش آیا۔ پہلے یہ صاحب فطری طور پر لالچی طبیعت کے مالک تھے۔ دنیا کی محبت ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ انہوں نے بہت سا مال ومتاع جمع کر رکھا تھا۔ لیکن ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔ جب ان کی سیّدی عبدالعزیز دباغ سے ملاقات ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں سیّدی دباغ کی محبت ڈال دی تو حضرت نے انہیں اس بات کی تلقین کی کہ وہ اللہ کی رضا کے حصول کے لئے اپنا مال خرچ کریں۔ حضرت کی نصیحت سن کر فقیہ مذکور نے بے دریغ اپنا مال خرچ کرنا شروع کر دیا وہ خود بھی اس بات پر حیرانگی کا اظہار کرتے تھے کیونکہ اس سے پہلے انہیں اپنا مال خرچ کرنے کی عادت نہیں تھی۔ اس کے بعد حضرت نے اس کے مال سے اور زیادہ صدقہ اور خیرات کروانا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ ہمیں اس شخص پر رحم آتا اور ہم اکثر یہ کہا کرتے کہ حضرت نے اس شخص پر زیادہ بوجھ ڈال دیا ہے مگر وہ فقیہ بہت خوش تھے ہمیں ان کے انجام کا پتا نہیں تھا مگر حضرت اس کے انجام سے واقف تھے کیونکہ ان کا آخری وقت قریب آ چکا تھا اور حضرت ان کے لئے جنت میں محلات تیار کروا رہے تھے۔ اس کے لئے ذخیرۂ آخرت تیار کر رہے تھے۔ جب اس فقیہ کا مال اس قدر خرچ ہو گیا کہ اب اس کے مال میں صرف اتنی گنجائش باقی رہ گئی کہ اس کی بیوی مہر کی رقم وصول کر سکے تو اس فقیہ کا انتقال ہو گیا۔

اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت کے ایک بزرگ دوست علی بن عبداللہ الصباغی کے ساتھ پیش آیا جن کا ذکر کتاب کے آغاز میں کیا جا چکا ہے۔ حضرت نے انہیں بھی اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی اور جب انہوں نے اس فرمائش پر عمل کیا تو کچھ ہی عرصہ بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

معزز قارئین! اللہ تعالیٰ آپ کو توفیق دے آپ اس بات پر غور کریں کہ حضرت جیسے بزرگوں کی صحبت انسان کے لئے کس قدر مفید ہوتی ہے؟

ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا' کسی بھی چور اور صاحب تصرف ولی کے درمیان مال

نکالنے کے حوالے سے فرق صرف حجاب کا ہے چور کے سامنے حجاب ہوتا ہے اور ولی کے سامنے کوئی حجاب نہیں ہوتا۔ ولی کو مشاہدۂ حق نصیب ہوتا ہے جس کے نتیجے میں وہ اللہ کی جانب سے وہ مال حاصل کرنے پر مامور ہوتا ہے۔ قرآن نے اسی بات کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ (الکہف ۸۲:۱۸)

(میں نے یہ کام اپنی مرضی سے نہیں کیا)

ایک مرتبہ حضرت سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا' ایک مرتبہ میں قطب وقت حضرت منصور بن احمد کے ہمراہ شیخ مولائے ادریس کی درگاہ کی زیارت کے لئے آیا۔ اس وقت حضرت شیخ ابویعزی بن ابوزیان البکری بھی درگاہ کی زیارت کے لئے آئے ہوئے تھے۔ واپسی پر حضرت منصور نے ان کا سامان اٹھایا اور واپس چل دیئے۔ میں نے عرض کی (حضرت یہ چوری نہیں ہے؟) آپ نے فرمایا' چور اور ولی کے درمیان فرق حجاب اور عدم حجاب کا ہے۔ حضرت منصور بن احمد چونکہ قطب زمان تھے اس لئے انہوں نے لوح محفوظ میں یہ بات دیکھ لی کہ یہ مال ان کا نصیب ہے اس لئے وہ مال حاصل کرنا ان کے لئے جائز تھا۔ خواہ وہ کسی بھی طریقے سے لیں۔ اس کے برعکس چور کیونکہ محجوب ہوتا ہے اس لئے اپنے پروردگار سے غافل ہوتا ہے۔ اس کے بعد آپ نے شیخ عبدالرحمٰن المجذوب کا قصہ بیان کیا۔ ایک مرتبہ ان کے مریدین نے ایک بیل پکڑا' سیّدی عبدالرحمٰن نے اسے ذبح کر کے اس کا گوشت کھا لینے کا حکم دیا مگر سیّدی عبدالرحمٰن کے روحانی جانشین سیّدی یوسف الفاسی نے وہ گوشت تناول نہیں کیا۔ بعد میں اس بیل کا مالک وہاں آیا تو اس نے عرض کی کہ میرا بیل سیّدی عبدالرحمٰن اور ان کے مریدین کے لئے صدقہ ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) بالکل یہی معاملہ شیخ منصور بن احمد کے ساتھ پیش آیا کیونکہ بعد میں شیخ عبدالعزیز نے بیان کیا کہ اگر میرے لیے ممکن ہوتا تو میں خود اپنا زادراہ شیخ منصور بن احمد کی نذر کر دیتا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اولیائے کاملین کے بارے میں غلط فہمی سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اس باب میں ہم اسی قدر معلومات فراہم کرنا چاہتے تھے اللہ تعالیٰ اسے نافع بنائے۔

☆☆☆

پانچواں باب

شیخ اور مرید کے آداب کا بیان

کیا روحانی تربیت باقی ہے؟

ایک مرتبہ ایک فقیہ نے سیّدی عبدالعزیز دباغ سے کسی بزرگ کے اس قول کے بارے میں دریافت کیا کہ اب (روحانی) تربیت باقی نہیں رہی۔ کیا یہ قول صحیح ہے یا نہیں؟ ان کے سوال کی اصل عبارت یہ ہے۔

اے ہمارے آقا و پیشوا! اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہی (روحانی) فتوحات عطا فرمائی ہیں جو اس نے اپنے اکابر اولیاء کو عطا کی تھیں۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اہل بیت نبوت سے نسبت کا شرف بھی عطا کیا ہے۔ آپ اپنے علوم میں سے ہمیں بھی کچھ عطا فرمائیں تاکہ لوگوں کے دلوں میں سے شبہات دور ہوسکیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو علم لدنی سے مالا مال فرمائے۔ آپ واضح عبارات میں مثالوں کے ہمراہ جواب عنایت کریں تاکہ ہمارے ذہن صاف ہوسکیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

الخلق عیال اللّٰہ واحب الخلق الی اللّٰہ انفعهم لعیاله (مجمع الزوائد ہیثمی ۸: ۱۹۱)

''تمام مخلوق اللہ کی عیال ہے اور مخلوق میں سب سے زیادہ اللہ کا محبوب وہ شخص ہے جو اس کی عیال کو زیادہ سے زیادہ نفع پہنچائے''

(میرا پہلا سوال یہ ہے) مشہور صوفی بزرگ شیخ زروق فرماتے ہیں۔

''آج کل وہ تربیت ختم ہوچکی ہے جسے تصوف کی اصطلاح میں تربیت کہا جاتا ہے آج کل صرف ہمت اور حال باقی رہ گئے ہیں۔ لہٰذا تم کتاب و سنت کو مضبوطی سے تھام لو اور اس میں کوئی کمی یا اضافہ نہ کرو''

کیا تربیت کا یہ انقطاع صرف شیخ زروق کے زمانے ہی میں تھا یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری تک جاری رہے گا؟ اگر یہ انقطاع اب بھی موجود ہے تو اس کا بنیادی سبب کیا ہے؟ اور اگر اب بھی تربیت باقی ہے تو روئے زمین پر وہ کون سا شیخ ہے جو اپنی پسند اور طریقہ کار کے مطابق مرید کی صحیح تربیت کرسکتا ہے؟ آپ

ہمیں بتائیں کہ وہ شیخ کون سی مملکت اور کون سے شہر کا باسی ہے جسکے ہاتھ میں ہاتھ دے کر کوئی شخص کامیابی حاصل کر سکتا ہے؟

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) یہ وہی فقیہ ہیں جن کا ذکر "ق" کی تفسیر کے دوران ہو چکا ہے اور اہل جنت و دوزخ کے اسماء سے متعلق منقول حدیث کی شرح میں بھی ان کا ذکر آ چکا ہے۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا' روحانی تربیت کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ انسان کے وجود کو رعونت سے پاک کیا جائے تا کہ وہ سر خداوندی کو حاصل کرنے کے قابل ہو سکے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس کے اندر موجود تمام تاریکیاں چھٹ جائیں اور کسی بھی حوالے سے اس کا باطل کے ساتھ کوئی تعلق باقی نہ رہے۔ بعض اوقات باطل سے لاتعلقی کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اصل خلقت کے اعتبار سے انسان پاک وصاف پیدا ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت عام طور پر قرون ثلاثہ سے تعلق رکھنے والے حضرات میں پائی جاتی تھی اسی لئے اس زمانے کو خیر القرون کہا جاتا ہے کیونکہ اس زمانے سے تعلق رکھنے والے لوگ حق کے ساتھ نہایت پختہ تعلق رکھتے تھے سوتے جاگتے کسی بھی وقت حق سے لاتعلق نہیں رہتے تھے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص روحانی طور پر ان کے باطن کا جائزہ لینے کی کوشش کرے تو اس نتیجے پر پہنچے گا کہ ان میں سے بیشتر حضرات کی توجہ کا مرکز اللہ اور اس کے رسول کی رضا کا حصول تھا اسی لیے ان سے کثرت کے ساتھ بھلائی کا صدور ہوتا تھا۔ ان کے وجود میں حق کا نور روشن نظر آتا تھا۔ علم وفضل کے اعتبار سے یہ لوگ اجتہاد کے اس مرتبے تک پہنچ چکے تھے۔ جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا ان لوگوں کو رسمی تربیت کی ضرورت نہ تھی۔ عام طور پر کوئی مرید صرف اپنے شیخ سے ملاقات کر کے شیخ کے سر اور نور کا وارث بن جاتا۔ شیخ مرید کے کان میں کوئی ایک بات کہتا جس کے نتیجے میں مرید کو (روحانی) فتح نصیب ہو جاتی کیونکہ وہ مرید باطنی اعتبار سے نہایت پاکیزگی کا مالک ہوتا تھا اور اس کی تمام تر توجہ کا مرکز ہدایت و رہنمائی کا حصول ہوتا تھا۔

بعض اوقات شیخ کو مرید کے وجود سے تاریکیاں دور کرنے کے لئے اس کی تربیت کرنا پڑتی ہے یہ صورتحال اس وقت پیش آئی جب قرون ثلاثہ کا بہترین زمانہ رخصت ہو چکا تھا۔ لوگوں کی نیتوں میں فتور آ چکا تھا ان کے ارادے اور خواہشات خراب ہو چکے تھے۔ دنیا ان کے دل و دماغ پر قابض ہو چکی تھی اور ان کی زندگی کا مقصد صرف شہوانی خواہشات کی تکمیل تھی۔ اس زمانے میں جب کسی شیخ طریقت کو کوئی اہل مرید نظر آتا اور شیخ یہ دیکھتا کہ مرید کی تمام تر توجہ کا مرکز دنیا ہے تو وہ اس کی فکر کی اصلاح کے لئے خلوت میں بیٹھ کر ذکر کی کثرت اور خوراک کی قلت کی تلقین کرتا۔ اس خلوت کی وجہ سے وہ مرید باطل پرست لوگوں سے الگ ہو جاتا اور خود باطل کلام اور لغو گفتگو سے محفوظ رہتا۔ خوراک کی قلت کے باعث خون کے بخارات کم ہو جاتے اور اس کی طبیعت شہوانی خواہشات سے ہٹ جاتی آخر کار اس کی توجہ مکمل طور پر اللہ اور اس کے رسول کی طرف مبذول ہو جاتی۔ جب مرید اس حد تک پاک وصاف ہو جاتا تو اس کا وجود سر کو برداشت کرنے کے قابل ہو جاتا۔ پھر ایک طویل

عرصے تک یہی طریقہ کار جاری رہا۔ یہاں تک کہ حق اور باطل' نور اور ظلمت کے درمیان کوئی امتیاز نہ رہا۔ بعض لوگوں نے مشیخیت کا لبادہ اوڑھ کر لوگوں کو خلوت میں جا کر تعویذ و عملیات اور اسی نوعیت کی چلہ کشی کرنے کی تلقین شروع کر دی جس کے نتیجے میں انسان کو ظاہری طور پر کچھ کرتب دکھانے کی صلاحیت حاصل ہو جاتی تھی۔ شیخ زروق کے زمانے میں یہی چلن عام تھا۔ اس لئے انہوں نے لوگوں کو یہ مشورہ دیا کہ اگر تم تربیت کے حصول کے لئے کسی شیخ کے پاس جاؤ گے اور وہ کوئی دھوکے باز اور بازی گر ہو تو تمہارا اپنا نقصان ہوگا۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ تم کتاب و سنت کے راستے کو اختیار کرو کیونکہ اس میں دھوکہ بازی اور فریب کاری کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کیونکہ ان کے ذریعے ہدایت حاصل کرنے والا شخص گمراہی سے محفوظ رہتا ہے اس لیے شیخ زروق یا ان جیسے دیگر مشائخ کا کلام حزم و احتیاط شمار ہوگا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوگا کہ روحانی تربیت مکمل طور پر دنیا میں ناپید ہو چکی ہے اور یہ ہو بھی کس طرح سکتا ہے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روحانی فیوض و برکات قیامت تک اہل ایمان کے شامل حال رہیں گے۔

اب رہا آپ کا یہ سوال کہ وہ شیخ کونسا ہے؟ جو تربیت کر سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد وہ شیخ ہوگا جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و کردار سے واقف ہو اور ہر معاملے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے کامل ایمان عطا فرمایا ہو اور پاکیزہ معرفت عطا کی ہو۔ ایسا شخص اس قابل ہوگا کہ کوئی مرید اپنا آپ اس کے حوالے کر دے جس کی محبت اور صحبت انسان کے لئے مفید ثابت ہوگی اور جو بندے کو اپنے پروردگار سے ملا دے گا اور انسان کے باطن سے تمام وسوسے دور کر کے اس کے دل میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ڈال دے گا اور پھر محبت کی اس کیفیت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

اب رہا آپ کا یہ سوال کہ آپ کو واضح طور پر یہ بتایا جائے کہ وہ کون سی سلطنت اور کون سے شہر میں قیام پذیر ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے مختلف ممالک میں ایسے بہت سے افراد موجود ہیں آپ اہل سنت و جماعت کے عقیدے پر گامزن رہتے ہوئے انہیں تلاش کریں تو ضرور انہیں پالیں گے۔

قرآن کہتا ہے:

إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَالَّذِينَ هُمْ مُحْسِنُونَ (النحل ۱۶: ۱۲۸)

''بے شک اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو پرہیزگاری اختیار کرتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں''

2999 روحانی مقامات

فقیہ مذکور نے حضرت شیخ سے دوسرا سوال ایسے شخص کے بارے میں کیا جو اس بات کا دعویدار ہو کہ اس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار کیا ہے۔ ان کے سوال کے الفاظ یہ تھے۔

اے میرے آقا! (دوسرا) سوال یہ ہے کہ ایک شخص اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے بیداری کے عالم

میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہے۔ بعض صوفیاء یہ کہتے ہیں کہ ایسے شخص کا دعویٰ گواہی کے بغیر قابل قبول نہیں ہوگا اور وہ گواہی یہ ہے کہ وہ شخص 2999 روحانی مقامات طے کر چکا ہو۔ جب وہ یہ دعویٰ کرے تو اس سے کہا جائے کہ وہ ان تمام مقامات کو بیان کرے۔ آپ سے درخواست یہ ہے کہ آپ اشارے کنائے میں مختصر طور پر ہی سہی اپنی سہولت کے مطابق ان مقامات کو بیان کریں۔ تفصیل کی ضرورت نہیں۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا' ہر شخص کے جسم میں 366 رگیں ہوتی ہیں اور ہر رگ کی اپنی مخصوص خاصیت ہوتی ہے۔ صاحب کشف ولی ان تمام رگوں کی انفرادی خصوصیات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ کسی رگ کا تعلق جھوٹ کے ساتھ ہوتا ہے۔ کوئی حسد سے متعلق ہوتی ہے۔ اسی طرح ریا کاری' غداری' خود پسندی اور تکبر وغیرہ الگ الگ رگوں میں روشن دکھائی دیتے ہیں۔ جس وقت کوئی صاحب کشف کسی انسان کو دیکھتا ہے تو گویا اسے اس انسان کے جسم کے فانوس میں 366 بلب جلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جن میں سے ہر ایک کا رنگ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک رگ کی مخصوص کیفیت کی مزید تفصیلات ہیں مثلاً ایک رگ شہوت کے ساتھ متعلق ہے اور شہوت کی کئی قسمیں ہیں۔ کبھی اس کا تعلق شرمگاہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ کبھی یہ مرتبہ و مقام سے متعلق ہوتی ہے اور کبھی دیگر خواہشات اور مال کے ساتھ اس کا تعلق ہوتا ہے۔ اسی طرح جھوٹ سے متعلق رگ ایک ہے لیکن جھوٹ کی کئی قسمیں ہیں مثلاً ایک شخص خود جھوٹ بولتا ہے۔ یہ الگ قسم کا ہے اور ایک شخص دوسرے کو جھوٹا سمجھتا ہے اور اس کی بات کے بارے میں شک و شبے کا شکار رہتا ہے تو یہ الگ قسم ہے۔

جب تک کوئی انسان ان تمام مقامات کو طے نہ کرے اس وقت تک اسے فتح نصیب نہیں ہوتی۔ لہٰذا جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کو نوازنا چاہے اور اسے فتح عطا فرمانا چاہے تو اسے ان تمام عوارض سے بتدریج پاک و صاف کرتا چلا جاتا ہے۔ مثلاً جب کذب کی خصوصیت وجود میں باقی نہیں رہے گی تو انسان پہلے صدق پھر تصدیق کے مقام پر فائز ہوگا۔ جب مال کی محبت ختم ہو جائے گی تو انسان زہد کے مرتبہ پر فائز ہو جائے گا۔ جب گناہوں سے محبت جاتی رہے گی تو سچی توبہ نصیب ہوگی اور جب خواہشات کا پھیلاؤ ختم ہو جائے گا تو انسان دنیا سے بے رغبت ہو جائے گا۔ وہ دنیا جو دھوکے کا گڑھ ہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ انسان کو فتح عطا فرما کر اپنا سر اس کی ذات میں رکھ دیتا ہے تو ایسا شخص مختلف جہانوں کے مشاہدے کے قابل ہو جاتا ہے۔ یہ مشاہدہ بتدریج نصیب ہوتا ہے۔ سب سے پہلے انسان عالم ناسوت کے اسرار کا مشاہدہ کرتا ہے۔ پھر عالم جبروت کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ پھر عالم ملکوت کے اسرار اس کے سامنے نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ پھر یہ کیفیت نصیب ہوتی ہے کہ انسان مخلوق میں اللہ تعالیٰ کے افعال کا مشاہدہ کرتا ہے۔

مشاہدے کا طریق

سب سے پہلے انسان کو عالم ناسوت کا مشاہدہ نصیب ہوتا ہے اور یہ بھی بتدریج ہوتا ہے مثلاً انسان کو پہلے اپنے ملک پھر سمندر پھر تمام روئے زمین پہاڑوں' دریاؤں' وادیوں یہاں تک کہ ساتوں زمینوں کا مشاہدہ نصیب

ہوتا ہے۔ پھر اسے زمین اور پہلے آسمان کے درمیان موجود خلا کا مشاہدہ ہوتا ہے پھر پہلا آسمان پھر دوسرا' مختصر یہ کہ وہ ساتوں آسمانوں (اور ان میں موجود عجائبات) کا مشاہدہ کرتا ہے۔ پھر برزخ' ارواح' ملائکہ' محافظ فرشتوں اور آخرت سے متعلق امور کا مشاہدہ نصیب ہوتا ہے۔

ان تمام مشاہدات میں سے ہر ایک مشاہدے میں انسان پر لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حقوق ربوبیت میں سے ایک حق کا خیال رکھے اور اپنے فرائض بندگی میں سے ایک فرض کو ادا کرے کیونکہ ان مشاہدات کے دوران ایسی خوفناک چیزیں سامنے آتی ہیں جو انسان کے لئے تباہ کن ثابت ہوتی ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق اور فضل و کرم شامل حال نہ ہو تو کم از کم انسان ہوش و حواس سے بیگانہ ضرور ہو جائے گا۔ اپنی ذات کے اندر موجود رگوں اور ان کے خواص کا مشاہدہ کرنے کی بہ نسبت ان جہانوں کا مشاہدہ زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ خصوصیات کا مشاہدہ ایک باطنی امر ہے جبکہ جہانوں کی سیر ایک ظاہری امر ہے جنہیں انسان ظاہری آنکھ سے مشاہدہ کرتا ہے اور یہ کیفیت فتح کے حصول کے بعد نصیب ہوتی ہے۔ لہٰذا جب انسان کی نظر صاف ہو جائے اور اس کا نور بصیرت مکمل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے شامل حال ہو یہاں تک کہ کسی بدبختی کا اندیشہ باقی نہ رہے تو اس وقت اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو سید الاولین والآخرین علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم کی زیارت کا شرف عطا فرماتا ہے اور انسان بیداری کے عالم میں سر کی آنکھ کے ساتھ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرتا ہے۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے جسے بیان نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ اس وقت انسان کو بے انتہا لذت اور سرور حاصل ہوتا ہے (اور جس شخص کو یہ سعادت نصیب ہو جائے) وہ لائق صد مبارک باد ہے۔

جب آپ انسان کی ذات میں موجود (رگوں کے) خواص اور جہانوں کی سیر کے دوران پیش آنے والے مشاہدات کو گننا شروع کریں گے تو ان کی تعداد آپ کے بیان کردہ عدد (2999) سے تجاوز کر جائے گی۔ پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و کمالات سے اہل علم بخوبی آگاہ ہیں۔ سیرت کی کتابوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہری و باطنی بہت سے فضائل و کمالات کا ذکر ملتا ہے لہٰذا جو شخص حالت بیداری میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے شرف کے حصول کا دعوے دار ہو اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری دلکشی و رعنائی کے بارے میں دریافت کیا جائے۔ (اور یہ ایک طے شدہ امر ہے) کہ دیکھ کر جواب دینے والے کا انداز صاف پہچانا جا سکتا ہے۔

اگر اس گفتگو سے آپ کی تسلی ہو جاتی ہے تو بہت بہتر ہے ورنہ میں یہی بات ایک اور پہلو سے آپ کے سامنے بیان کرتا ہوں۔

حصول فتح کے بعد کی کیفیت

جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو فتح نصیب کرتا ہے تو بہت سے انوار اس کے وجود میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ انوار اس کی ہڈیوں اور گوشت کے ریشوں کے اندر سما جاتے ہیں اور ان کے داخلے کے

وقت جو ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے اس کی کیفیت نزع کی تکلیف کی مانند ہوتی ہے۔ ان انوار کی خصوصیت یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ بندے کو کسی ایک قسم کی مخلوق کا مشاہدہ کروانا چاہتا ہے تو یہ انوار اس مخلوق سے متعلق اسرار کو بندے کے سامنے نمایاں کر دیتے ہیں۔ اس لئے زمین، بنی نوع انسان، حیوانات، جمادات وغیرہ تمام اشیاء کے اسرار جب تک انسان کے وجود میں سرایت نہ کر جائیں۔ اس وقت تک انسان ان مخلوقات کا مشاہدہ نہیں کر سکتا اور ان کے اسرار کی آمد کے وقت بھی انسان کو نزع کی سی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی مخلوق کا حصہ ہیں اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار اور مشاہدہ اس وقت تک نصیب نہیں ہو سکتا۔ جب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ کے اسرار کے ساتھ انسان کا وجود سیراب نہ ہو جائے۔

اس کی مثال ہم یوں بیان کر سکتے ہیں کہ فتح سے پہلے انسان کی ذات ایک تاریک وجود کی حیثیت رکھتی تھی جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ایک نور کی مانند ہے جس کی کئی قسمیں ہیں اور یہ اقسام ایک لاکھ سے زیادہ ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے تاریک وجود کو اس نور سے منور کرنا چاہتا ہے تو اس وقت نور محمدی کی تجلی انسان کے وجود پر وارد ہوتی ہے چنانچہ انسان کے وجود (کی 366 رگوں) میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے اسرار سرایت کر جاتے ہیں مثلاً جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نورانیت میں صبر کا پہلو اس کے وجود میں موجود صبر کی رگ میں داخل ہوگا تو اس کی ضد یعنی بے صبری انسان کے وجود سے رخصت ہو جائے گی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کی رحمت کا پہلو انسان کے وجود میں موجود مخصوص رگ میں داخل ہوگا تو اسکی ضد یعنی عدم رحمت انسان کے وجود سے رخصت ہو جائے گی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نور حلم کا پہلو انسان کے وجود میں داخل ہوگا تو اس کے وجود سے اس کی ضد یعنی عدم حلم رخصت ہو جائے گی۔ مختصر یہ کہ جیسے ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے انوار انسان کے وجود میں داخل ہوتے چلے جائیں گے۔ انسان کے وجود کی ہر رگ اور ریشے سے ظلمت اور تاریکی رخصت ہوتی چلے جائے گی اور جب تک انسان کے وجود میں تاریکی کا ایک ذرہ بھی موجود ہو اس وقت تک انسان مشاہدۂ نبوی کی نعمت کے لائق نہیں ہو سکتا۔

(یہاں یہ بات ذہن نشین کر لیں) کہ کسی ولی کے جسم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نورانیت کے اسرار داخل ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ یہ انوار و اسرار ولی کی ذات میں اسی کمال کے ساتھ موجود ہوتے ہیں۔ جو عظمت و کمال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے ذاتی انوار و اسرار کو حاصل ہے بلکہ ہر ولی اپنی صلاحیت کے مطابق ان اسرار سے فیض یاب ہوتا ہے اور ولی کو حاصل ہونے والے اسرار کی بدولت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار میں کوئی کمی نہیں آتی کیونکہ یہ انوار اس نوعیت کے نہیں ہیں کہ انہیں دوسروں کو دینے سے جگہ خالی ہو جائے۔ لہٰذا اس تمام گفتگو کے بعد ہم بآسانی اس نتیجے تک پہنچ سکتے ہیں کہ کوئی بھی بندہ اس وقت تک زیارت نبوی کے قابل نہیں ہو سکتا جب تک اس کے اپنے وجود میں تمام ذاتی اوصاف ختم نہ ہو جائیں اور ان کی جگہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار و اسرار سما نہ جائیں۔ اس مرتبے تک پہنچنے کے لئے بے شمار مقامات و مراحل طے کرنا پڑتے ہیں۔ (اس

حقیقت کو امام بوصیری نے اپنے شہرۂ آفاق ''قصیدہ بردہ شریف'' میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے)

فان فضل رسول اللہ لیس لہ حد فیعرب عنہ ناطق بفم

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و کمالات کی کوئی حد ہی نہیں ہے تو کوئی کیسے انہیں بیان کر سکتا ہے؟''

(سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں) جن حضرات نے مشاہدۂ نبوی کے لئے 2000 مقامات کی قید عائد کی ہے۔ انہوں نے اپنے ذاتی تجربے اور کیفیت کو سامنے رکھا ہوگا لیکن اس کے علاوہ اور بھی بہت سے مقامات ہیں۔ نیز ہم نے جو یہ کہا کہ جب تک انسان کا وجود انوار نبوی سے سیراب نہ ہو جائے اس وقت تک مشاہدہ نصیب نہیں ہوتا۔ اس سے مراد کامل مشاہدہ ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص جزوی طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار سے فیض یاب ہوتا ہے اور پھر اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہو جاتی ہے تو یہ ممکن ہے لیکن ہم اسے کامل مشاہدہ قرار نہیں دے سکتے۔

شیخ کے قرب کا فیض

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) فقیہ مذکور نے شیخ سے اگلا سوال یہ کیا کہ پیر کی موجودگی میں مرید کی روحانی کیفیت میں اضافہ اور عدم موجودگی میں کمی کیوں ہوتی ہے۔ ان کا سوال درج ذیل ہے۔

میرے آقا! میرا اگلا سوال یہ ہے کہ جب کوئی مرید کسی عارف باللہ کامل شیخ کی صحبت اختیار کرتا ہے اور وہ شیخ اس بات کا دعویدار ہو کہ وہ شیخ اپنی توجہ کے ذریعے اس کی تربیت کر سکتا ہے تو پھر موت یا سفر کی بدولت شیخ کی ظاہری عدم موجودگی کی صورت میں اس مرید کی روحانی کیفیت' علم اور عمل میں کمی کیوں محسوس ہوتی ہے لہٰذا حال اور توجہ کے ذریعے تربیت کرنے کا کیا فائدہ ہوا؟ کہ ذرا سی دوری آ جائے تو یہ تربیت کارگر نہیں رہتی؟

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا' شیخ کامل کی توجہ سے مراد اللہ کی راہ پر اس کے ایمان کا نور ہے اور اسی نور کی بدولت وہ اپنے مرید کی تربیت کرتے ہوئے اسے ترقی کی منازل طے کرواتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی مرید اپنے شیخ کے ساتھ اس نور ایمان کی وجہ سے محبت کرتا ہو تو شیخ کی ظاہری موجودگی یا عدم موجودگی ہر حال میں شیخ کا فیض مرید کو ملتا رہے گا بلکہ اگر شیخ کے وصال کو کئی ہزار برس بھی گزر گئے ہیں تو بھی اس کا فیض ختم نہیں ہوگا یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے کے اکابر صوفیاء نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نور ایمان سے فیض حاصل کرتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی تربیت کرتے ہوئے (روحانی طور پر) انہیں سلوک کی منازل طے کروا رہے ہیں۔ اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ ان اولیاء کی محبت کا اصل سبب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نور ایمان ہے لہٰذا جب کوئی مرید اپنے شیخ کے ساتھ صرف شیخ کی ظاہری شخصیت کی وجہ سے محبت کرے گا اور اس کی توجہ شیخ کے نور ایمان کی طرف نہیں ہوگی تو اس وقت اسے شیخ کی ظاہری موجودگی میں توفیق ملے گی مگر شیخ کی غیر حاضری کی صورت میں فیض نہیں مل سکے گا۔ ظاہری شخصیت کے ساتھ محبت کی علامت یہ ہے کہ مرید دنیاوی یا اخروی فائدے کے حصول یا نقصان سے بچنے کی خاطر شیخ سے محبت کرے اور شیخ کے نور ایمان کے باعث محبت کی دلیل یہ ہے کہ مرید کا مقصد

صرف اللہ کی رضا کا حصول ہو اس کے علاوہ اور کوئی غرض نہ ہو لہٰذا جب کوئی مرید شیخ کی غیر حاضری میں اپنے اندر کوئی کمی محسوس کرتا ہے تو اس میں شیخ کی بجائے مرید کا اپنا قصور زیادہ ہوتا ہے۔

شکر اور مجاہدے میں سے افضل کیا ہے؟

فقیہ مذکور کا اگلا سوال یہ تھا کہ شکر اور مجاہدہ میں سے کون سا طریقہ افضل ہے؟ ان کے سوال کے الفاظ یہ ہیں۔

سیدی! اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو اور آپ کو بھی راضی رکھے مشہور صوفی بزرگ ابوالحسن الشاذلی اور ان کے پیروکاروں کا امام غزالی اور ان کے پیروکاروں سے بنیادی اختلاف کیا ہے؟ کیونکہ الشاذلی اس بات کے قائل ہیں کہ بغیر کسی مشقت اور تکلیف کے انسان کو ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کا شکر کرنا چاہیے اور خوش رہنا چاہیے (یہی تصوف کی روح ہے) جبکہ غزالی کے نزدیک (تصوف نام ہے) ریاضت و مشقت کرنے' راتوں کو جاگنے اور بھوکا رہنے کا' کیا دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ ریاضت کرنی چاہیے؟ کیا الشاذلی کا نکتہ نظر یہ ہے کہ جب انسان مقام ولایت کے قریب پہنچ جائے تو اس وقت شکر کا طریق اختیار کرے یا نقطہ آغاز سے ہی شکر کا راستہ اختیار کرنا چاہیے؟ کیا کوئی شخص دونوں طریقوں پر عمل پیرا ہو سکتا ہے؟ یا دونوں میں سے صرف کسی ایک طریقے کو اختیار کرنا زیادہ مفید ہوگا؟ تفصیلی جواب عنایت کریں۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا' شکر کا طریقہ کار بہتر ہے کیونکہ انبیاء کرام علیہم السلام اور اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسی طریقے کو اختیار کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان خالص بندگی کے جذبات کے ہمراہ اللہ کی عبادت کرے اس کے دل میں کسی ذاتی مقصد کے حصول کی تمنا نہ ہو اور پھر وہ اس بات کا بھی معترف ہو کہ وہ بندگی کا حق ادا کرنے سے قاصر ہے اور پھر ساری عمر یہی کیفیت باقی رہے اور اسی کیفیت کی بدولت ان حضرات کو فتح نصیب ہوئی۔ جب اہل ریاضت نے انہیں دیکھا کہ ان لوگوں کو فتح نصیب ہوگئی ہے تو ان کے دل میں بھی فتح کے حصول کی خواہش پیدا ہوئی اور پھر انہوں نے فتح کے حصول کے لئے کثرت صوم وصلوٰۃ' خلوت نشینی اور شب بیداری کا راستہ اختیار کیا اور اپنے نصیب کے مطابق روحانیت حاصل کی۔ لہٰذا شکر کے راستے پر چلنے والے اپنے سفر کے آغاز ہی سے اللہ اور اس کے رسول کی طرف جا رہے تھے۔ ان کی توجہ کا مرکز فتح یا کشف کا حصول نہیں تھا۔ اس کے برعکس ریاضت اختیار کرنے والوں کا مطمع نظر فتح اور کشف کا حصول تھا۔ لہٰذا پہلا گروہ دل کو اللہ کے راستے پر لے جا رہا تھا اور دوسرا گروہ اپنے جسم کو اللہ کی طرف لے جا رہا تھا۔ پہلے طریقے پر گامزن شخص کو اچانک فتح نصیب ہو جاتی ہے۔ اگرچہ اسے اس کے حصول کی تمنا یا انتظار نہیں ہوتا بلکہ وہ تو صرف گناہوں کی معافی مانگنے اور توبہ طلب کرنے میں مشغول ہوتا ہے۔

یہ دونوں طریقے ٹھیک ہیں لیکن شکر کا طریقہ زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس میں زیادہ کامل اخلاص پایا جاتا ہے۔
یہ دونوں طریقے ریاضت پر متفق ہیں لیکن پہلا طریقہ دل کی ریاضت پر مشتمل ہے تاکہ دل کو مستقل حق

تعالیٰ کی طرف متوجہ رکھا جائے تمام حرکات وسکنات اللہ کی رضا کے لئے ہوں اور کوئی لمحہ غفلت کا نہ ہو۔ شکر کے راستے میں یہی ریاضت ہے کہ دل ہمیشہ اللہ کی طرف متوجہ رہے خواہ ظاہری طور پر انسان کا وجود کسی عبادت میں مشغول نہ ہو یہی وجہ ہے کہ اس طریقے پر گامزن رہنے والے صوفیاء کبھی روزہ رکھا کرتے تھے اور کبھی نہیں رکھتے تھے۔ کبھی رات کے وقت نوافل ادا کیا کرتے تھے اور کبھی سو جاتے تھے۔ ازدواجی زندگی بسر کرتے تھے اور وہ تمام کام سرانجام دیتے تھے جنہیں شریعت نے جائز قرار دیا ہے مگر وہ ظاہری طور پر ریاضت کے منافی ہوتے۔

ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے فرمایا' ریاضت کے طریقہ کار میں توجہ کا مرکز فتح اور مراتب کا حصول ہوتا ہے۔ پھر فتح کے حصول کے بعد بعض لوگ اپنی اسی نیت پر قائم رہتے ہیں جس کے نتیجے میں ان کی توجہ صرف اپنے مشاہدات تک محدود رہتی ہے اور یہ لوگ کرامات کا اظہار کر کے خوش ہوتے ہیں ان کے نزدیک ولایت کی انتہا یہی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو آغاز سے لے کر انجام تک اللہ سے لاتعلق رہتے ہیں اسی طرح کے لوگوں کے بارے میں قرآن کہتا ہے۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ○ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا○ (الکہف:۱۸:۱۰۳'۱۰۴)

''ان کے اعمال خسارے کا شکار ہیں۔ دنیاوی زندگی ہی میں ان کی کوشش رائیگاں گئی اور وہ اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ انہوں نے کوئی اچھا کام کیا ہے''

البتہ بعض حضرات فتح کے حصول کے بعد نیت کی اصلاح کر لیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل وکرم ہوتا ہے تو ان کا دل غیر اللہ سے منقطع ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس شخص کو فتح کے بعد جو حالت نصیب ہوتی ہے۔ طریق شکر میں سفر کا آغاز اسی حالت سے ہوتا ہے۔ لہٰذا آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ دونوں فریقوں کے درمیان کیا اختلاف اور کیا فرق ہے۔ پہلے طریقے میں دل کی ریاضت ہوتی ہے اور دوسرے میں صرف جسم پہلے طریقے میں نیت میں اخلاص پایا جاتا ہے جبکہ دوسرے طریقے میں دیگر اغراض بھی شامل ہوتی ہیں۔ پہلے طریقے میں کسی طلب اور انتظار کے بغیر فتح نصیب ہوتی ہے لہٰذا وہ حقیقی معنی میں فتح ربانی ہوتی ہے جبکہ دوسرے طریقے میں اسباب کے استعمال کی بدولت فتح نصیب ہوئی ہے جس کی دو قسمیں ہوتی ہیں پہلی قسم کا تعلق صرف مسلمان صوفی کے ساتھ ہے جبکہ دوسری قسم وہ ہے جس سے متعلق تم نے اکثر سن رکھا ہوگا کہ فلاں راہب یا پادری کو اتنی شدید ریاضت کے بعد فلاں کمال حاصل ہوا۔

آپ نے مزید ارشاد فرمایا' میں جس ریاضت کا ذکر کر رہا ہوں اس سے مراد مطلق ریاضت ہے۔ میرا مقصد امام غزالی کے تجویز کردہ طریق ریاضت پر نقد کرنا نہیں ہے کیونکہ آپ اکابر صوفیا میں سے ایک ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ کیا کوئی شخص بیک وقت دونوں طریقوں پر گامزن ہو سکتا ہے؟ تو اس کا جواب اثبات میں ہوگا کیونکہ یہ دونوں طریقے ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔ عین ممکن ہے کہ ایک شخص کا دل مکمل طور پر اللہ کی طرف متوجہ

ہو اور ساتھ میں اس کا ظاہری جسم عبادت و ریاضت میں مشغول ہو۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) فقیہ مذکور کا اگلا سوال یہ تھا۔

مرید کی خصوصیات کیا ہونا چاہیے؟

سیدی! کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنے بارے میں یہ معلوم کر سکے کہ وہ مرید بننے کے لائق بھی ہے یا نہیں؟ یا اس کے لئے کسی صالح شیخ یا نیک پیر بھائی کا تجربہ شرط ہے؟

آپ نے جواب دیا' انسان اپنی اہلیت کے بارے میں خود اندازہ لگا سکتا ہے۔ مثلاً وہ اس بات کا جائزہ لے کر عام طور پر اس کے خیالات کی نوعیت کیا ہوتی ہے کیونکہ یہ خیالات اس کی فطرت سے مطابقت رکھتے ہوں گے اور انسان کا وجود ہمیشہ اپنے خیالات کی پیروی کرتا ہے۔ لہٰذا جس شخص کے خیالات کا مرکز اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی عظمت شان کے بارے میں غور وخوض کرنا ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کا اس پر خاص فضل و کرم ہے۔ اگرچہ ظاہری طور پر اس کا عمل ان خیالات کے مطابق نہیں ہے۔ اگرچہ ایسا شخص اپنے خیالات کے برعکس عمل میں مشغول ہو پھر بھی اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کی بدولت اسے ہدایت کے راستے پر گامزن کر دیتا ہے۔ پھر اس کے بعد اگلا مرحلہ یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں موجود اس صلاحیت کے مختلف مراتب ہوتے ہیں جیسے مردانگی اور بہادری میں کوئی کم ہوتا ہے اور کوئی زیادہ ہوتا ہے۔

انسان کی فطرت ظاہر ہو جاتی ہے

اگر آپ کچھ بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھیں تو آپ کو بہت جلد یہ اندازہ ہو جائے گا کہ ان میں سے کس کی رفتار تیز ہے؟ اور کس کی رفتار سست ہے؟ بالکل یہی کیفیت ارادت کی ہوتی ہے ان میں کچھ لوگ زیادہ بہتر حالت میں ہوتے ہیں اور ان کی توجہ ہر وقت اپنے پروردگار کی طرف مبذول ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کی حالت کمزور ہوتی ہے اور انہیں کبھی کبھار اپنے خالق و مالک کا خیال آتا ہے۔ اگرچہ بعض متوسط کیفیت کے مالک ہوتے ہیں۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ غور و فکر کرنا عقل کا ایک نور ہے جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ تقدیر کے مطابق نصیب ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر تقدیر میں کسی شخص کو نیک عقل عطا کی گئی ہو تو اس کے اسباب خود بخود انسان کے سامنے آتے چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی انسان کے نصیب میں برا بننا لکھا ہو تو بری سوچ اور برائی کے اسباب اسے میسر آ جاتے ہین اس لئے خیر اور شر دونوں میں فکر کے تینوں درجات پائے جاتے ہیں اور پھر خیر اور شر پر ہی کیا موقوف جو چیز بھی انسان کے مقدر میں موجود ہو اس کے حصول کے اسباب خود بخود پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہر انسان کی فطری صلاحیت کو بچپن میں آسانی کے ساتھ پرکھا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص چند بچوں کو غور سے دیکھے جن میں سے ایک بچے کے نصیب میں کاتب' دوسرے کے حجام اور تیسرے بچے کے مقدر میں سپاہی بننا لکھا ہو تو پہلے بچے کے قلم پکڑنے کے انداز سے ہی اس کی تحریری قابلیت کا اندازہ ہو جائے گا اور وہ

آسانی سے لکھنا سیکھ جائے گا لیکن اگر آپ اسے استرہ یا تلوار چلانا سکھائیں گے تو اسے یہ دونوں فن سیکھنے میں کافی مشکل پیش آئیگی۔ اسی طرح دوسرا بچہ استرہ چلانے کا فن آسانی سے سیکھ جائے گا لیکن لکھنا یا تلوار چلانا اس کے لئے مشکل ہوگا جبکہ تیسرا بچہ تلوار چلانے کے فن سے واقف ہوگا مگر استرہ چلانا یا قلم چلانا اس کے لئے بہت مشکل ہوگا۔ مشہور حدیث ہے۔

''کل میسر لما خلق لہ'' (بخاری ۶:۴۴:۲۷)

''ہر ایک کے لئے وہ کام آسان کر دیا جاتا ہے جس کے لیے اُسے پیدا کیا گیا ہے۔''

اسی طرح جس بچے کی توجہ کپڑے کی تجارت کی طرف مبذول ہوگی اور اس کا والد اسے کھیتی باڑی سکھانے کے درپے ہوگا تو اسے کوئی فائدہ نہیں ملے گا۔ اس کے برعکس اگر وہ بچہ تجارت شروع کر دے تو اس کا باپ پریشانی کا شکار نہیں ہوگا۔ اس ساری گفتگو کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کسی بھی انسان کی قابلیت کو جانچنے کا معیار اس کی سوچ ہے اور ہر شخص یہ بات بخوبی جان سکتا ہے کہ اس کے اپنے خیالات کا مرکز کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نیکی کی توفیق عطا فرمائے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ایک خاتون کا واقعہ سنایا جس کے تین بچے تھے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ جب اس عورت کے وصال کا وقت قریب آیا تو اس نے اپنے عزیز رشتہ داروں کو بتایا کہ میرا فلاں بیٹا بزرگ بنے گا جب کہ دوسرا گنہگار شخص ہوگا اور میری بیٹی ایک مالدار عورت ہوگی۔ دنیا جس کے سامنے بچھی ہوگی۔ اس عورت سے پوچھا گیا' کیا تم غیب کا علم رکھتی ہو؟ اس نے جواب دیا' میں غائب کا علم تو نہیں رکھتی لیکن میں نے یہ دیکھا ہے کہ میرا پہلا بیٹا خدا کے خوف کی وجہ سے اپنے ساتھی بچوں کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کرتا اور اللہ تعالیٰ کا خیال ہر وقت اس کے دل میں موجود رہتا ہے۔ لہٰذا مجھے امید ہے کہ اس سے بھلائی کے آثار ظاہر ہوں گے جبکہ میرا دوسرا بیٹا اس کے برعکس طبیعت کا مالک ہے جس سے مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ یہ برائی کے راستے پر گامزن ہوگا۔ جب میں نے اپنی بیٹی کو دیکھا تو مجھے پتا چلا کہ یہ نہایت کم عمری ہی میں نہایت خوبصورت زیورات وغیرہ بنا لیتی ہے اور اس کا بیشتر وقت اسی کام میں صرف ہوتا ہے اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس کا میلان دنیا کی طرف زیادہ ہوگا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک مرتبہ ایک صاحب نے مجھے اپنے بارے میں بتایا کہ ان کے والد کے انتقال کے بعد ان کی والدہ نے انہیں ریشم کا کام سیکھنے کے لئے ایک استاد کے سپرد کیا۔ اس وقت وہ صاحب کمسن تھے وہ کہتے ہیں کافی کوشش کے باوجود میں یہ کام صحیح طریقے سے نہیں سیکھ سکا اور مجھے یہ کام بہت مشکل محسوس ہوتا ہے۔ ایک دن کہیں سے گزرتے ہوئے میں نے کچھ لوگوں کو چونے کے پلستر میں کندہ کاری کرتے ہوئے دیکھا تو مجھے یہ کام بہت دلچسپ محسوس ہوا۔ میں نے ریشم کا کام چھوڑ کر یہ سیکھنا شروع کر دیا اور بہت جلد اس کام میں مہارت حاصل کر لی۔ یہ کام کرتے ہوئے مجھے کسی تھکن یا ناپسندیدگی کا احساس نہیں ہوتا تھا اس کے بعد میں نے ریشم کے کام کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) آج کل وہ شخص چونے کے کام کا سب سے بڑا ماہر ہے۔

اسی طرح ایک اور صاحب نے بتایا کہ ان کے پاس ایک نحیف گدھا تھا۔ وہ صاحب کچھ لوگوں کے ہمراہ جنگل میں رہتے تھے۔ جہاں ایک یتیم بچہ بھی رہتا تھا۔ اس بچے کو میرے گدھے پر سوار ہونے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں آتا تھا لیکن وہ گدھے پر اس طرح سوار ہوتا تھا جیسے کسی گھوڑے پر سوار ہو۔ اس نے کچھ شاخوں کو ملا کر ایک لگام بنا رکھی تھی اور ایک نقلی نیزہ ہاتھ میں رکھتا تھا اور یوں گدھے پر سواری کرتا تھا جیسے ہی میری توجہ منقطع ہوتی وہ گدھے پر سوار ہو جاتا وہ بچہ بڑا ہو کر فوج کا ایک بڑا جرنیل بنا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ہم یہاں ایک معلم کا واقعہ نقل کریں گے۔ اس نے اپنے شاگردوں کا امتحان لینے کے لئے انہیں ایک ایک پرندہ دے کر کہا اسے کسی ایسی جگہ ذبح کرنا جہاں تمہیں کوئی نہ دیکھے۔ ایک بچے کے سوا سب بچے اپنا' اپنا پرندہ ذبح کر کے لے آئے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بچہ مشہور صوفی بزرگ حضرت ابوالعباس سبتی تھے۔ جب وہ اپنا پرندہ زندہ حالت میں استاد کے پاس لائے تو استاد سے کہا' مجھے کوئی ایسی جگہ نہیں مل سکی جہاں اللہ موجود نہ ہو۔ اس بات سے ان کے استاد نے اندازہ لگا لیا کہ یہ بچہ بڑا ہو کر معرفت کے بلند مقام پر فائز ہوگا اس لئے وہ اس بچے کا ہمیشہ خیال رکھتے۔

علم اور نیکی فطرت میں شامل ہوتے ہیں

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا' جب کسی شخص میں ولایت کی رگ موجود ہو اور وہ شخص بدکاروں کی صحبت میں رہے اور پھر اس کے قریب سے کسی ولی کا گزر ہو۔ اگرچہ وہ شخص اب بھی بدکاروں کا ساتھی ہو لیکن ولی کے قرب کی برکت سے اس کے اندر موجود ولایت کی رگ اللہ کے حکم سے زندہ ہو جاتی ہے اور اس شخص کو شرح صدر نصیب ہوتا ہے یہ صرف ولی کے قریب سے گزرنے کا فیض ہے اگرچہ وہ شخص اس ولی سے ناواقف ہو اور ولی نے بھی اس سے کوئی کلام نہ کیا ہو۔ دونوں کے درمیان کوئی گفتگو نہ ہوئی ہو لیکن اگر وہ دونوں ایک دوسرے سے مل لیں اور ان کے درمیان جان پہچان پیدا ہو جائے تو پھر ولایت کی رگ کی زندگی کا عالم ہی نرالا ہوتا ہے اور وہ شخص ہر گھڑی بھلائی کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص کے اندر شر کی رگ موجود ہو مثلاً اس میں چوری کی رگ موجود ہو اور وہ اولیاء و صالحین کی خدمت میں حاضر رہتا ہے۔ پھر اگر ان اولیاء کے پاس سے کسی چور کا گزر ہو تو اس شخص میں موجود چوری کی رگ زندہ ہو جائے گی اور اس برائی کے لئے اسے شرح صدر نصیب ہوگا۔ یہ کیفیت صرف چور کے پاس سے گزرنے کے نتیجے میں پیدا ہوگی حالانکہ یہ شخص چور کو نہیں جانتا اور نہ ہی اس نے اس کی ہم نشینی اختیار کی ہے۔ اگر ان دونوں کے درمیان جان پہچان ہو جائے تو پھر چوری کی یہ رگ ترقی کر جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) یہ ایک وسیع بات ہے اور اس شخص کے لئے مفید ہے جو درس و تدریس سے متعلق ہو۔ جب وہ اس گفتگو کو سنے گا اور پھر اپنے ذاتی تجربات کو سامنے رکھے گا تو اسے بخوبی اس کی اہمیت کا

اندازہ ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مجھے ستائیس برس تک تدریس کا شرف حاصل ہوا ہے۔ جب میں نے سیّدی عبدالعزیز دباغ کی زبانی انسان کی فطری صلاحیت اور قابلیت کے بارے میں یہ گفتگو سنی اور اسے اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں پرکھا تو مجھے یوں لگا جیسے یہ ایک جامع و مانع ضابطہ ہے جس کی بدولت میری بہت سی ایسی پریشانیاں دور ہو گئیں۔ جو تدریس کے دوران پیش آیا کرتی تھیں کیونکہ اکثر اوقات میں اپنے شاگردوں کو بحث و تمحیص کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کیا کرتا تھا میری یہ خواہش ہوتی تھی کہ یہ لوگ کچھ سیکھ جائیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے میں ان کے ساتھ کھاتا پیتا تھا' ان کے ساتھ رہتا لیکن اس کے باوجود انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ برسوں کی محنت کے ذریعے میں جو صلاحیت ان کے اندر پیدا کرتا تھا اس کا اثر چند دن کے اندر' کسی دنیادار کی ہم نشینی کے باعث ختم ہو جاتا تھا بلکہ بعض اوقات اگر میں کچھ دن انہیں تنبیہ نہ کرتا تو بھی وہ غفلت کا شکار ہو جاتے۔ بالکل اسی طرح جیسے آپ ایک گدھے کو جب تک مارتے رہیں گے وہ چلتا رہے گا۔ جب مارنا بند کر دیں گے وہ ٹھہر جائے گا۔ چند طلباء کا معاملہ اس کے برعکس تھا وہ لوگ کچھ دیر میرے پاس بیٹھتے اور میں جو کچھ بیان کرتا اسے یاد کر لیتے۔ اگرچہ میں انہیں زیادہ محنت اور توجہ کے ساتھ نہیں پڑھاتا تھا۔ ایک طویل عرصے تک میں اس صورتحال کی بنیادی وجہ تلاش کرتا رہا اور پھر جب میں نے حضرت کی یہ گفتگو سنی تو انہیں اپنے اس تجربے سے آگاہ کیا۔ آپ نے فرمایا' (جو لوگ خود سیکھنے پر تیار نہ ہو) انہیں تم کچھ سکھانے کی کوشش نہ کرو کیونکہ یہ ٹھنڈے لوہے کو کوٹنے کے مترادف ہے (مشہور کہاوت ہے) جس کا کام اسی کو ساجھے۔ انسان کا آغاز ہی اس کے انجام کی طرف رہنمائی کر دیتا ہے۔ لہٰذا تم کسی بھی شخص کے آغاز کو سامنے رکھ کر اسی کے مطابق اس سے سلوک کیا کرو (احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس دن کے بعد میری بے چینی ختم ہو گئی اور لوگوں کی اہلیت کا اندازہ لگانے کا علم حاصل ہو گیا لہٰذا اگر آپ میں ذرا سی بھی سوجھ بوجھ ہو تو اس گفتگو کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھیں آپ کو لوگوں کے ساتھ معاملات طے کرنے میں آسانی محسوس ہو گی۔

سہل تستری کا واقعہ

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اسی فقیہ نے اگلا سوال یہ کیا۔

سیدی! شیطان مردود نے مشہور صوفی بزرگ حضرت سہل بن عبداللہ تستری کے ساتھ گفتگو کے دوران قرآن کی یہ آیت پیش کی تھی۔

وَرَحْمَتِىْ وَسِعَتْ كُلَّ شَىْءٍ (الاعراف' ۷:۱۵۶)

''اور میری رحمت ہر شے پر حاوی ہے''

جبکہ میں (یعنی شیطان) بھی ایک شے ہوں (اور وہ رحمت مجھ پر بھی حاوی ہو گی جس کا یہی مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں اپنی رحمت کے سبب مجھے معاف کر دے گا۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟ تو حضرت سہل بن عبداللہ تستری نے جواب دیا۔ قرآن یہ بھی کہتا ہے۔

سَاَكْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ ○ (الاعراف ۷: ۱۵۶)

"یہ رحمت پرہیزگار لوگوں کے ساتھ خاص ہے"

جبکہ تم پرہیزگار نہیں ہو اس لئے تمہاری پیش کردہ آیت مطلق نہیں بلکہ متعین ہے۔ شیطان نے جواب دیا' آیت میں قید کا اضافہ تم نے کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کوئی قید عائد نہیں کی۔ یہ سن کر سہل خاموش ہو گئے۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا جبکہ مشہور صوفی بزرگ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کہتے ہیں کہ اس مسئلے میں شیطان سہل کا استاد ہے۔

(فقیہ نے کہا) براہ مہربانی اس کا جواب عنایت کریں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس واقعے کو امام عبدالوہاب شعرانی نے بغیر کسی تبصرے کے نقل کیا ہے۔ اس کی وجہ سے قاری اس الجھن کا شکار ہو جاتا ہے کہ شاید یہ واقعہ درست ہے اور یہ بات واضح نہیں ہو سکی کہ آیت میں موجود قید اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے یا سہل نے بیان کیا ہے اسی لئے یہ سوال حضرت کی خدمت میں پیش کیا گیا۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا' اس آیت میں موجود قید مخلوق کی جانب سے نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور شیطان کی پیش کردہ دلیل درست نہیں ہے جبکہ سہل بن عبداللہ تستری کا نکتہ نظر درست اور شیطان کا خیال غلط ہے۔ مگر شیطان کے اس قول کی تعریف اس لئے کی گئی کہ اس سے صادر ہونے والے کلام سے شیخ سہل بن عبداللہ تستری اور شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے وہ معنی اخذ کئے ہیں جو شیطان کے احاطہ خیال میں بھی نہیں آ سکتے اور اس کلام کے نتیجے میں سہل کو بہت سے انوار کے مشاہدے کا موقع ملا۔

صوفیاء کرام کا طریقہ کار یہ ہے کہ جب انہیں فتح نصیب ہوتی ہے تو وہ فتح کے حصول سے پہلے اللہ کی ذات کے بارے میں اپنے آپ کو بہت سے معاملات میں مقید دیکھتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں بہت سی قیود ان کی اپنی خود ساختہ ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب شیطان نے یہ کہا کہ قید تم نے لگائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات قید سے پاک ہے تو یہ کلام سہل تستری پر اثر انداز ہوا اور حیرت کے عالم میں وہ خاموش ہو گئے۔ اگرچہ شیطان نے وہ معنی مراد نہیں لیا تھا اور نہ ہی اسے اس معنی کا خیال آیا (اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں) کہ صوفیاء (شیطان کی) باتوں پر بھی اس قدر غور و فکر کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ ایک بزرگ اپنے مرید کے گھر گئے اور دروازے پر دستک دی۔ مرید نے اندر سے ہی جواب دیا' کون ہے؟ گھر میں میرے سوا کوئی موجود نہیں۔ یہ سن کر کہ یہاں میرے سوا کوئی نہیں ہے' وہ شیخ بیہوش ہو کر گر گئے مگر اس مرید کو اصل صورتحال کا پتا بھی نہیں چل سکا۔ اب اگر کوئی یہ کہہ دے کہ اس مسئلے میں وہ مرید اپنے پیر کا (لاشعوری طور پر) استاد بن گیا ہے تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟

ایک مرتبہ ایک بچی نے اپنے والد سے کوئی فرمائش کی باپ اس فرمائش کی تکمیل کے لئے گھر سے نکلا تو بچی کی ماں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا تم نے اپنے باپ کو کیوں تکلیف دی؟ بچی نے جواب دیا کیا ان کے علاوہ میرا

کوئی اور بھی ہے (جس سے میں کوئی فرمائش کرسکوں) یہ جملہ کسی صوفی نے سن لیا اور غش کھا کے گر پڑا۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں۔ اسی بات سے ابلیس کا باطل ہونا ظاہر ہو جاتا ہے اور صوفیاء کی روحانی کیفیات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

گناہ اور رحمت

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس کے بعد اسی فقیہ نے اگلا سوال یہ کیا۔

سیدی! کسی بزرگ کا قول ہے کہ گناہ کے ارتکاب کی صورت میں بندہ مومن اللہ تعالیٰ کی سو رحمتوں کا مستحق قرار پاتا ہے۔ یہ کونسی سو رحمتیں ہیں جو درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا نتیجہ ہیں۔ نیز یہ ناراضگی سے رحمت میں کیسے تبدیل ہوتی ہیں؟

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا' اس گناہ سے مراد اس شخص کا گناہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال کو پہچانتا ہو کیونکہ ایسے شخص سے کسی گناہ کا صدور صرف تقدیر کا حکم پورا کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ تاہم اس شخص سے مراد صاحب کشف و فتح صوفی نہیں ہے بلکہ متقی و پرہیزگار مسلمان مراد ہے۔ کیونکہ اس کے دل میں ہر وقت اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال کا خوف برقرار رہتا ہے۔ اگر نیکی کرتے وقت اس کی یہ کیفیت ہوتی ہے تو گناہ کے ارتکاب کی صورت میں اس کے خوف کا عالم کیا ہوگا۔ لہٰذا جب ہم نے یہ فرض کرلیا کہ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال کو پیش نظر رکھتا ہے تو اس کا بدیہی مطلب یہ ہوگا کہ وہ ہر وقت گناہ اور غفلت سے بچا رہتا ہے۔ اسے ہر وقت یہ اندیشہ ستاتا ہوگا کہ میں نے جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی فرمانبرداری کی ہے کہیں میری کسی خامی کے باعث یہ عبادت رائیگاں نہ چلی جائے اور یہ سوچ کر وہ ہمیشہ متفکر اور پریشان رہے گا۔ اس کی یہ کیفیت کسی بھی نیک کام کے آغاز میں' دوران میں اور تکمیل کے بعد بھی باقی رہے گی۔ لہٰذا جب نیکی کر کے اس کے خوف کا یہ عالم ہوگا تو گناہ کے ارتکاب کی صورت میں تو عالم ہی نرالا ہونا چاہیے۔

ایک مرتبہ ایک بندہ مومن سے گناہ کا صدور ہوا اور اس کے بعد وہ چوبیس برس تک زندہ رہا اور اس تمام عرصے کے دوران اپنی اس غلطی پر پشیمانی کی وجہ سے اور اللہ کے خوف کے مارے اس کے آنسو نہیں تھمتے تھے۔ اس گناہ کے ارتکاب پر پشیمانی اور خوف کی بدولت اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم کی بدولت اس پورے عرصے میں اسے مزید کسی گناہ کے ارتکاب سے محفوظ رکھا اور اس تمام عرصے کے دوران اللہ کی طرف متوجہ رہنے کے نتیجے میں اس پر سینکڑوں رحمتیں نازل فرمائیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے نزول کا بنیادی سبب انسان کے اندر موجود اپنے پروردگار کا خوف ہے اور یہ خوف اس وقت مزید ہوتا ہے۔ جب انسان کو اپنے پروردگار کی معرفت حاصل ہو جائے اور یہ معرفت روح کے توسط سے حاصل ہوتی ہے کیونکہ روح کا تعلق ملاءاعلیٰ کے ساتھ ہے اور ملاءاعلیٰ کو ساری مخلوق میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہے لہٰذا جب انسان کا وجود پاک ہوگا تو نیکی یا گناہ ہر حالت میں روح اپنے معارف کا اثر ظاہری وجود پر ڈالے گی لیکن اگر وجود ناپاک ہوگا تو

روح کے معارف بھی محجوب ہو جائیں گے اور انسان کا وجود دنیاوی لذات اور شہوانی خواہشات کی لپیٹ میں آ جائے گا۔ اس کیفیت میں انسان انہی خواہشات کا اسیر ہو جاتا ہے اور اس کی تمام تر جدوجہد کا مقصد اپنی ذاتی خواہشات کی تکمیل ہوتا ہے۔ ایسا شخص آداب بندگی کی پرواہ نہیں کرتا اور اپنی ذاتی خواہش کی تکمیل کے لئے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے گریز نہیں کرتا لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ کی رحمت کا تعلق نیکی یا گناہ کے ساتھ نہیں بلکہ خوف یا بے خوفی کے ساتھ ہے بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ رحمت کا مدار معرفت یا عدم معرفت پر ہے۔ آپ اس رحمت کو کسی معین عدد مثلاً 100 میں قید نہیں کر سکتے بلکہ اس سے مراد مطلق رحمت ہے جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں۔

ھمہ اوست کا مفہوم کیا ہے؟

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اب اس فقیہ کے دو سوال باقی رہ گئے ہیں اس کے بعد ہم خود اس موضوع کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیں گے۔ فقیہ کا اگلا سوال یہ تھا:

''سیدی! بعض صوفیاء یہ کہتے ہیں کہ ہم جو بھی چیز دیکھتے ہیں اس میں ہمیں اللہ تعالیٰ دکھائی دیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہے؟ کہ ایک حادث چیز میں قدیم ذات دکھائی دے؟ کیونکہ دونوں کے درمیان حلول اور اتحاد ممکن نہیں ہے پھر صوفیاء یہ بھی کہتے ہیں کہ مخلوق خالق کا عین نہیں ہے اور اس کا غیر بھی نہیں ہے اور یہ بات ناممکن ہے؟''

سید عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا۔ پہلے جملے کا مطلب یہ ہے کہ ہم جب بھی کسی شے کو دیکھتے ہیں تو اس میں ہمیں اللہ تعالیٰ کا فعل دکھائی دیتا ہے۔ یہ صوفیاء اپنی روحانی قوت کے باعث تمام کائنات میں اللہ تعالیٰ کے افعال کا مشاہدہ کرتے ہیں اور مخلوق میں کوئی ایک وجود بھی ایسا نہیں ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے افعال موجود نہ ہوں لیکن یہ حلول اور اتحاد کے بغیر ہوتے ہیں اس مسئلے کے بہت سے اسرار ہیں جنہیں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس کا جواب کتاب میں تحریر نہیں کیا جا سکتا البتہ دوسرا کلام واضح نہیں ہے کیونکہ قدیم اور حادث ایک دوسرے کی ضد ہیں لہٰذا یہ ایک دوسرے کا عین نہیں ہو سکتے جب عین نہیں ہو سکتے تو غیر ہوں گے۔ (مگر غیر بھی نہیں ہیں' یہ بات واضح نہیں ہو سکتی)

(فقیہ کا اگلا سوال یہ تھا) اگر کسی بندۂ مومن کے ذہن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صورتِ مبارکہ کا خیال آ جائے تو اس صورت کا تعلق عالمِ ارواح کے ساتھ ہوگا یا عالمِ خیال یا عالمِ مثال کے ساتھ ہوگا؟ نیز ذہن میں آنے والی اس خیالی صورت کے ساتھ اگر کوئی گفتگو کی جائے تو کیا وہ گفتگو بھی شیطان کے اثر سے محفوظ ہوگی جیسے خواب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنا شیطان کے اثر سے محفوظ ہوتا ہے جس کی دلیل یہ حدیث ہے:

من رآني فقد رأى الحق فان الشيطان لا يتكونني ۔ (صحیح بخاری ۲:۱۰۶۸، رقم: ۶۵۹۶)

''جس نے خواب میں مجھے دیکھا اس نے یقیناً مجھے ہی دیکھا ہے کیونکہ شیطان میری صورت اختیار نہیں کر سکتا۔''

یا پھراس کی حیثیت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کی سی ہوگی:

هي ليست مثلها.

(یہ اس کی مانند نہیں)

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا یہ استحضار اس شخص کی روح اور ذہن کا ایک عمل ہے جس کے نتیجے میں جب انسان اپنی توجہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مبذول کرتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورتِ مبارکہ (کی شبیہہ) دکھائی دیتی ہے اگر یہ کیفیت اس شخص کو حاصل ہو جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورتِ مبارکہ سے واقف ہے۔ مثلاً کوئی صحابی یا ایسا عالمِ دین جس نے سیرت کی کتابوں کے تحقیقی مطالعے کے بعد آپ کی صورتِ مبارکہ سے واقفیت حاصل کی ہو تو انہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل صورتِ مبارکہ کی زیارت ہوگی لیکن اگر وہ کوئی عام شخص ہے تو اسے ایک ایسی صورت دکھائی دے گی جو خَلق اور خُلق کے اعتبار سے مرتبۂ کمال پر فائز ہو۔ چنانچہ ایسی صورت کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی صورت کے عین مطابق ہوتی ہے اور کبھی مختلف ہوتی ہے البتہ اس کی سوچ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی صورت ہوتی ہے جس کا تعلق جسم کے ساتھ ہے کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کی روح کو نہیں بلکہ جسم کو دیکھا تھا اور علماء نے سیرت کی کتابوں میں بھی آپ کے جسم مبارک کا تذکرہ کیا ہے اسی طرح انسان کا خیال صرف کسی معلوم چیز کا تصور کرسکتا ہے۔

لہٰذا آپ کا یہ کہنا کہ کیا اس کا تعلق عالمِ ارواح کے ساتھ ہے اگر اس سے مراد استحضار ہے تو پھر یقیناً یہ سوچنے والے شخص کی روح کا عمل ہے اور اگر اس سے مراد یہ ہے کہ حاضر ہونے والے صورت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارکہ کی ہے تو اس کا جواب میں پہلے دے چکا ہوں' باقی رہا باہمی گفتگو کا سوال تو اگر وہ شخص پاکیزہ وجود رکھتا ہے اور اس شخص کی روح اس سے محبت کرتی ہے یعنی اپنے اسرار سے اسے آگاہ کرتی رہتی ہے تو اس صورت میں ہونے والا مکالمہ شیطان کے اثر سے محفوظ ہوگا لیکن اگر اس شخص کا وجود پاکیزہ نہیں ہے تو پھر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

خیال اور کشف

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) یہاں تک حضرت کے جوابات مکمل ہوگئے۔ ایک مرتبہ میں نے حضرت کے سامنے یہ واقعہ بیان کیا کہ ایک بزرگ اپنے کچھ مریدین کے ہمراہ ذکر میں مشغول تھے کہ اچانک حاضرین میں سے ایک شخص کی رنگت اور حالت اچانک تبدیل ہوگئی اور وہ مؤدب ہوکر بیٹھ گیا' کسی نے اس کا سبب دریافت کیا تو اس نے جواب دیا۔ خبردار ہو جاؤ' تمہارے درمیان اللہ کے رسول موجود ہیں۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ اللہ کے رسول وہاں موجود ہیں اور اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے سیدی عبدالعزیز دباغ سے دریافت کیا اس شخص نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت فتح (کشف) کی وجہ سے کی تھی یا یہ اس کا خیال تھا؟

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا یہ صرف اس کا خیال تھا اور اس کا مرتبہ اگرچہ کشف سے کم ہوتا ہے لیکن یہ خصوصیت صرف ان اہلِ ایمان کو حاصل ہے جن کا ایمان خالص' نیت صادق اور محبت سچی ہو اور یہ کیفیت اس شخص کو نصیب ہو سکتی ہے' جس کا تعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے ساتھ کامل ہو۔ بہت سے لوگ اس مشاہدے کو کشف کا نتیجہ سمجھتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے البتہ اس کیفیت کے مالک لوگ اگرچہ صاحبِ کشف نہیں ہوتے مگر پھر بھی ان کا ایمان' عام اہلِ ایمان کی بہ نسبت زیادہ قوی ہوتا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس بات کی تائید اس چیز سے بھی ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص صاحبِ کشف نہ ہو اور اسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور سے محبت ہو جائے تو بھی اس طرح کی کیفیت اس محبوب شخصیت کے بارے میں حاصل ہو جاتی ہے۔ ایک مرتبہ ایک قصاب نے مجھے بتایا کہ اس کے ایک بیٹے کا انتقال ہو گیا جس سے اسے شدید محبت تھی' وہ ہر وقت اپنے بیٹے کے تصور میں گم رہتا۔ ایک دن جب وہ باب الفتوح کی طرف بکریاں خریدنے کے لیے گیا تو اس وقت بھی اپنے بیٹے کا خیال اس کے ذہن میں موجود تھا اچانک اسے اپنا بیٹا سامنے سے آتا دکھائی دیا اور اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ قصاب کہتا ہے میں نے اس سے مختصر گفتگو کی اور اپنے پاس موجود بکری اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا تم اسے پکڑو میں دوسری بکری خرید لاؤں اس وقت میرے حواس گم ہو چکے تھے جب کچھ لوگوں نے مجھے بظاہر خلا میں باتیں کرتے سنا تو مجھے اپنی طرف متوجہ کیا اچانک مجھے ہوش آیا تو میرا بیٹا کہیں موجود نہیں تھا اس وقت مجھے شدید افسوس ہوا۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں مرید کو اپنے شیخ کے ساتھ ایسی ہی محبت ہونی چاہیے یہ اس کے لیے بہت مفید ثابت ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے فرمایا ایسی شدید محبت کرنے والے' اہلِ تصرف کی مانند دوسرے کو نفع یا نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں اور جب محبت کی آگ بھڑک اُٹھے تو پھر اسے ٹھنڈا نہیں کیا جا سکتا۔

ایک مرتبہ فرمایا ایک شخص کو اپنے شیخ سے بہت محبت تھی اور ہر وقت اس کے ذہن میں شیخ کا خیال موجود رہتا تھا۔ چنانچہ اگر وہ شیخ مرید کے سامنے موجود نہ ہوتا اور اپنے گھر میں کسی کام میں مصروف ہوتا تو وہ مرید بھی اپنے کام میں اسی کام کی نقل کرتا یہاں تک کہ اگر شیخ اپنے گھر میں اپنی بیٹی فاطمہ کو آواز دیتا تو مرید بھی اپنے گھر میں فاطمہ کو آواز دیتا (حالانکہ اس کے گھر میں کوئی فاطمہ نامی لڑکی نہیں تھی) شیخ اپنے گھر میں کسی کو ہدایت دیتا' یوں کرو' مرید بھی اپنے گھر میں یہی الفاظ دہرا دیتا۔ شیخ اپنے گھر میں سر پر عمامہ باندھتا تو مرید بھی اپنے گھر میں سر پر کوئی چیز لپیٹنے لگ جاتا ہر وقت اس کی یہی کیفیت رہتی اور پھر اسی محبت کے نتیجے میں وہ اپنے شیخ کا روحانی وارث بنا۔

ایک مرتبہ فرمایا ایک شخص کو کسی خوب صورت خاتون کے ساتھ عشق ہو گیا (جس کا نام فاطمہ تھا) اور دیوانگی اس قدر زیادہ ہوئی کہ اگر کوئی شخص کسی اور عورت کو فاطمہ کہہ کر بلاتا تو جواباً یہ اُٹھ کھڑا ہوتا اور یہ سب کچھ لاشعوری طور پہ ہوتا۔ آپ فرماتے ہیں ایک مرتبہ میں نے خود اس شخص کو دیکھا کہ کسی نے فاطمہ پکارا تو اس نے لاشعوری

طور پر اس کا جواب دیا لہٰذا اگر مجاز میں عشق کی یہ کیفیت ہوسکتی ہے تو حقیقت کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں۔

ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے بیان کیا میرے شیخ منصور بن احمد فرمایا کرتے تھے اللہ تعالیٰ کی محبت کے دعوے دار لوگوں کے لیے ایک عیسائی کا واقعہ بہت نصیحت رکھتا ہے۔ایک عیسائی شخص کو کسی پادری کی بیٹی کے ساتھ عشق ہو گیا' ایک رات وہ دونوں اکٹھے ہوئے اور یہ شخص اس عورت کی قربت میں بے خود ہو گیا اس کے چہرے پر ایک مسہ تھا اس عورت کے پاس ایک زہر آلود چاقو تھا مگر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ زہر آلود ہے اس عورت نے اس چاقو کی مدد سے اس شخص کا مسہ کاٹ دیا جس کے نتیجے میں زہر اس شخص کے جسم میں سرایت کر گیا مگر اس عورت کے قرب کی بے خودی نے اسے پتہ بھی نہیں چلنے دیا کہ کب زہر اس کے جسم میں پھیلا اور کب اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی؟ جب کافر کی شیطانی محبت کا یہ عالم ہے کہ اسے اپنے جسم سے روح نکلنے کا پتہ بھی نہیں چلا تو پھر اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ اہلِ ایمان کی محبت کا کیا عالم ہو گا؟

حصولِ فیض کے لئے قابلیت ضروری ہے

ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا کوئی بھی بزرگ خواہ وہ نبی ہی کیوں نہ ہو اس کی محبت اس وقت تک کسی چھوٹے کو فائدہ نہیں دیتی جب تک وہ چھوٹا خود اس بزرگ کی محبت میں گرفتار نہ ہو جائے البتہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کے ساتھ محبت فرمائے تو اس کا فائدہ اس بندے کو ہوتا ہے خواہ وہ بندہ بظاہر اللہ تعالیٰ کی محبت سے کتنا ہی دُور کیوں نہ ہو اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی چھوٹا کسی بزرگ کے ساتھ محبت کرتا ہے تو اس محبت کی بدولت وہ اس بزرگ کے انوار کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے لیکن جب کوئی بزرگ کسی چھوٹے سے محبت کرے تو وہ اس سے کیا کھینچ سکتا ہے؟

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) جب آپ یہ گفتگو فرما رہے تھے اس وقت آپ کے سامنے ایک آلوچہ رکھا ہوا تھا۔آپ نے فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ اس آلوچے کے دل میں سیب کی محبت ڈال دے تو یہ سیب کا سارا ذائقہ اپنے اندر جذب کر لے گا لیکن سیب اس آلوچے کے ذائقے سے متاثر نہیں ہو گا کیونکہ اگر کوئی بندہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرے تو اس کی محبت اس وقت تک مفید نہیں ہو گی جب تک اللہ تعالیٰ بھی اس سے محبت نہ کرے اور اس وقت تک وہ اللہ تعالیٰ (کے افعال) کے اسرار کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت حاصل نہیں کر سکے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اسے اپنی معرفت عطا فرما دیتا ہے جس کے نتیجے میں وہ بندہ ان اسرار سے واقفیت حاصل کرتا چلا جاتا ہے لیکن اگر انسان کو اللہ تعالیٰ کی معرفت کے بغیر ہی اس سے محبت ہو جائے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا بعض حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ شیخ اپنے مرید کے وجود کے اندر موجود ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا یہ بات ٹھیک ہے لیکن اس کے لیے بنیادی شرط یہی ہے کہ وہ مرید اپنے شیخ سے شدید محبت کرتا ہو جس کے نتیجے میں شیخ کی توجہ مرید کی طرف مبذول ہو جاتی ہے اور پھر مرید کا

وجود شیخ کی قیام گاہ بن جاتا ہے اور ہر شخص اپنی قیام گاہ کو صاف رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) حضرت کی اس بات کا مطلب یہ ہے کہ شیخ اپنی توجہ کے ذریعے مرید کے باطن کی صفائی کرتا رہتا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا جب کوئی شیخ اپنے مرید کے وجود میں قیام کرتا ہے تو اس کی کیفیت بالکل اسی طرح ہو جاتی ہے جیسے کسی حاملہ عورت کے پیٹ میں بچہ موجود ہو۔ چنانچہ بعض اوقات صحیح وقت پر صحیح طریقے سے وضع حمل ہو جاتا ہے اور کبھی حمل ضائع بھی ہو جاتا ہے۔ کبھی ایک برس کے بعد وضع حمل ہوتا ہے اور کبھی اس سے بھی زیادہ تاخیر ہو جاتی ہے بالکل یہی کیفیت مرید کی ہوتی ہے کہ جب شیخ اس کے وجود میں قیام پذیر ہوتا ہے تو کبھی مرید کے دل میں شیخ کی محبت مستقل طور پر باقی رہتی ہے یہاں تک کہ شیخ کی توجہات کی بدولت اس مرید کو فتح نصیب ہو جاتی ہے اور بعض اوقات مرید کی سچی محبت کسی دنیاوی سبب کے باعث منقطع ہو جاتی ہے لہٰذا اپنے شیخ کے بارے میں اس کا ارادہ تبدیلی ہو جاتا ہے اور شیخ کی توجہات اس سے ہٹ جاتی ہیں پھر قلیل یا طویل عرصے کے بعد شیخ کی محبت واپس آ جائے تو دوبارہ وہی اسرار حاصل ہو جاتے ہیں لہٰذا اصل چیز مرید کی اپنی کیفیت ہے کہ اس کی حالت کیسی ہے؟

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) واقعی مرید اسی طرح کے ہوتے ہیں اس لیے ہر مرید کو حضرت کا یہ کلام پیش نظر رکھنا چاہیے تاکہ اس کے لیے ہمیشہ مفید رہے۔

شیخ سے محبت خالص ہونی چاہیے

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا اگر کوئی شخص ولایت یا سر کے حصول کے لیے شیخ سے محبت کرے یا شیخ کے علم، مہربانی یا اسی کی مانند کسی اور خوبی کی وجہ سے محبت کرے تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا مرید بغیر کسی غرض اور لالچ کے شیخ سے محبت رکھے جیسے عام طور پر بچے ایک دوسرے کے ساتھ بغیر کسی غرض اور لالچ کے محض پسندیدگی کے جذبات کی بدولت محبت رکھتے ہیں تو اس صورت میں اس مرید کی محبت اپنے شیخ کے ساتھ بے غرض ہوگی تاکہ اغراض و مقاصد سے متعلق محبت مرید کو شیطانی وسوسوں کا شکار نہ کر دے کیونکہ ان وسوسوں کے نتیجے میں بعض اوقات محبت ختم ہو جاتی ہے اور کبھی اس میں وقتی طور پر انقطاع آ جاتا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا' علم' ولایت یا سر کے حصول کے لیے محبت مفید کیوں نہیں ہوتی؟

آپ نے جواب دیا اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تمام اسرار و معارف درحقیقت اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ہیں' ہر شخص اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے مگر ضروری نہیں کہ وہ شیخ سے بھی محبت کرے گا اس لیے شیخ کے ساتھ محبت اس وقت کامل ہوگی جب وہ شیخ کے اسرار کے بجائے صرف شیخ کے وجود سے محبت کرے۔ میں نے عرض کی جب ہر چیز اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے تو شیخ کا وجود بھی اللہ کا عطا کردہ ہے پھر کیا وجہ ہے کہ ایک کی محبت مفید ہے اور دوسرے کی نہیں؟ آپ نے جواب دیا تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن شیخ کی ذات سے محبت کا مطلب یہ ہے کہ یہ محبت صرف

اللہ کے لیے ہے کیونکہ محض شیخ کی ذات کوئی نفع یا نقصان نہیں دے سکتی لہٰذا جب ذات کے ساتھ محبت کی بات ہوگی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ محبت بے غرض ہے۔

میں نے عرض کی کہ ہر انسان کی بہت سی مجبوریاں اور ضروریات ہوتی ہیں اگر کوئی شخص کھیتی باڑی کرتا ہے تو اپنے کھیت کے ساتھ محبت صرف اس کی پیداوار کی وجہ سے ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا یہ بھی ٹھیک ہے لیکن اگر وہ شخص آغاز میں پیداوار کے حصول کا ارادہ کر کے پھر اپنی توجہ دوسری طرف مبذول کر لے گا تو اس کے لیے بہتر ہے لیکن اگر وہ ہر وقت اسی خیال میں گم رہے کہ پیداوار کتنی ہوگی؟ کیسی ہوگی؟ اس سے کیسے فائدہ حاصل کرے گا؟ تو اب پیداوار کے حصول سے پہلے ہی اس پر وسوسوں کا غلبہ ہو جائے گا' کبھی اسے خیال آئے گا کہ جانے ابھی فصل پکنے میں کتنا عرصہ باقی ہے؟ کہیں کوئی آفت نازل نہ ہو جائے؟ کوئی آ کر اسے خراب نہ کر دے؟ اور اسی طرح کے دیگر بہت سے وسوسے پیدا ہوتے رہیں گے لیکن اگر کوئی شخص اپنی توجہ ہٹا لے گا تو ایسے بہت سے بے کار تفکرات سے محفوظ رہے گا۔ شیخ کی ذات سے بے غرض یا کسی غرض کے ہمراہ محبت کرنے والوں کے درمیان یہی بنیادی فرق ہوگا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک مرتبہ میں سیّدی عبدالعزیز دباغ کے ہمراہ ایک مقام سے گزر رہا تھا کہ اچانک آپ نے فرمایا قطبِ زمان شیخ منصور بن احمد فلاں جگہ موجود ہیں' کیا تم ان سے ملنا پسند کرو گے؟ میں نے عرض کی' ضرور! یہ میری خوش نصیبی ہوگی' میں بھلا ایک قطب سے کیوں نہیں ملوں گا؟ آپ نے فرمایا اگر ہم یہ فرض کریں کہ تمہارے ماں باپ کے ہاں بالکل تمہاری شکل وصورت اور علم وفضل جیسے سو بیٹے مزید پیدا ہو جائیں تو بھی میری توجہ کا مرکز صرف تم رہو گے کیونکہ تم ہی میرا مقدر اور نصیب ہو' بقیہ سب کی مثال میرے لیے عام لوگوں جیسی ہوگی۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) یہ سُن کر میری آنکھ کھل گئی اور مجھے احساس ہوا کہ میں نے شاید غلط فرمائش کی کیونکہ محبت میں شرکت برداشت نہیں ہوتی۔

ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا سر کے حصول کے طلب گار مرید کا وجود خاکی ہوتا ہے جبکہ سر عطا کرنے والا شیخ بھی خاکی وجود کا مالک ہوتا ہے لہٰذا جب ایک خاکی وجود دوسرے خاکی وجود سے محبت کرتا ہے تو دوسرا خاکی وجود اپنے اسرار وانوار سے پہلے وجود کو نوازتا ہے لیکن جب مرید کی توجہ کا مرکز شیخ کے خاکی وجود کے بجائے اس کے اسرار ہوں تو اس وقت شیخ کے خاکی وجود میں موجود روح بھی اس مرید کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی اس لیے مرید کو چاہیے کہ تمام اغراض سے منہ موڑ کر صرف شیخ کی ذات سے محبت کرے۔

محبت کی علامات

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک مرتبہ میں نے حضرت سے دریافت کیا' کیا محبت کی کوئی علامت اور نشانی بھی ہوتی ہے؟ آپ نے جواب دیا محبت کی دو نشانیاں ہیں: ایک یہ کہ مرید کو صرف شیخ کی ذات سے سکون ہو' مرید کی زندگی کا محور اس کے خیالات کا مرکز' خوشی اور غم سب شیخ کی ذات سے متعلق ہوں یہاں تک کہ محفل اور

تنہائی ہر حال میں مرید کی تمام تر حرکات وسکنات اس کی اپنی ذات کے بجائے اپنے شیخ کے کسی فائدے کی تکمیل کے لیے ہوں جبکہ دوسری علامت یہ ہے کہ دل میں شیخ کا ادب واحترام اس قدر زیادہ ہو کہ بالفرض شیخ کسی کنویں میں موجود ہو اور مرید پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھا ہو تو محض شیخ کی تعظیم کے جذبات کے تحت مرید کو یوں محسوس ہو کہ گویا اس کا شیخ پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھا ہے اور وہ خود کنویں میں موجود ہے۔

ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا' لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شیخ اپنے مرید پر احسان کرتا ہے حالانکہ درحقیقت مرید اپنے شیخ کے لیے سودمند ثابت ہوتا ہے کیونکہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ محض شیخ کی محبت فائدہ مند نہیں ہوتی بلکہ اصل صلاحیت مرید کی محبت میں ہوتی ہے لہٰذا اگر کسی مرید کا وجود پاک نہ ہو اس کی عقل صاف نہ ہو' اس کے نفس میں بھلائی کو قبول کرنے کی صلاحیت نہ ہو اور اس کی محبت شیخ کے اسرار جذب نہ کر سکتی ہو تو کوئی بھی شیخ کچھ بھی نہیں کر سکتا کیونکہ اگر صرف شیخ کی محبت فائدہ مند ہوتی تو اس کے حلقۂ بگوش ہونے والا ہر مرید مرتبۂ کمال پر فائز ہوتا۔ (جبکہ عملاً ایسا نہیں ہے)

ایک مرتبہ سیّدی دباغ نے ارشاد فرمایا' شیخ کے ساتھ کسی مرید کی سچی اور پکی محبت کی نشانی یہ ہے کہ بالفرض اگر شیخ کی ذات میں موجود تمام اسرار' خوبیاں اور کمالات' یکلخت ختم ہو جائیں اور شیخ بھی دیگر عام انسانوں کی مانند ایک عام انسان رہ جائے تو اس وقت بھی اس مرید کو اپنے شیخ کے ساتھ پہلے کی سی سچی محبت ہو لیکن اگر ان کمالات کے رخصت ہو جانے کے باعث اس محبت میں دراڑ آ جائے تو یقیناً وہ محبت جھوٹی تھی۔

ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا' سچی اور خالص محبت کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ مرید اپنے شیخ کو تولنا چھوڑ دے یہاں تک کہ اس کی نظر میں اپنے شیخ کے تمام افعال' اقوال اور احوال بالکل درست ہوں جو بات سمجھ میں آ جائے' ٹھیک ہے اور جو نہ آئے' اسے اللہ کے سپرد کر دے لیکن اس بات کا یقین ہو کہ شیخ کا عمل درست ہے لیکن اگر وہ شیخ کے کسی بظاہر غلط کام کو دیکھتا ہے اور یہ یقین کر لے کہ شیخ غلطی پر ہے تو ایسا شخص سر کے بل گر جاتا ہے اور اپنے دعوئ ارادت میں جھوٹا ثابت ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا' کوئی بھی شیخ اپنے مرید سے کسی قسم کی ظاہری خدمت' نذر نیاز یا کسی اور فائدے کا طلب گار نہیں ہوتا بلکہ اسے اپنے مرید سے صرف یہ توقع ہوتی ہے کہ اس کا مرید ہر حالت میں اپنے شیخ کو صاحب کمال' صاحب توفیق' صاحب بصیرت' صاحب معرفت اور صاحب قرب سمجھے اور پھر ساری زندگی اسی نظریے پر قائم رہے اس صورت میں ہر قسم کی خدمت مرید کے لیے مفید ثابت ہوگی لیکن اگر یہ خوش اعتقادی موجود نہ ہو یا اگر ہو اور پختہ نہ ہو تو مرید کا دل وسوسوں کا شکار رہے گا اور اس صورت میں مرید کچھ بھی حاصل نہیں کر سکے گا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک مرتبہ میں حضرت شیخ کے ہمراہ باب الحدید کے پاس موجود تھا اس وقت ہمارے ساتھ حضرت کا ایک مرید بھی موجود تھا جو تمام مریدین میں سب سے زیادہ حضرت کی خدمت کیا کرتا۔

حضرت نے اس سے دریافت کیا' کیا تم میرے ساتھ صرف اللہ کی رضا کے حصول کے لیے محبت کرتے ہو؟ تو اس نے عرض کی جی ہاں! میری محبت صرف اللہ کے لیے ہے اس میں کوئی ریا کاری اور شہرت کا حصول مقصد نہیں ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) یہ سُن کر مجھے بہت تاؤ آیا۔ شیخ نے اس سے دریافت کیا اگر تمہیں پتہ چلے کہ میرے اندر موجود تمام اسرار سلب ہو گئے ہیں تو کیا پھر بھی تمہاری محبت باقی رہے گی؟ اس نے عرض کی جی ہاں! آپ نے فرمایا اگر لوگ تم سے یہ کہیں کہ میں ایک عام شخص کی مانند ہو گیا ہوں تو بھی یہ محبت باقی رہے گی؟ اس نے پھر اقرار کیا۔ آپ نے فرمایا اگر تمہیں لوگ بتائیں کہ میں نے گناہوں کا ارتکاب شروع کر دیا ہے' کیا پھر بھی تمہاری محبت باقی رہے گی؟ اس نے عرض کی جی ہاں! آپ نے دریافت کیا اور اگر میں کئی برس تک مثلاً 20 برس تک گناہوں کی دلدل میں غرق رہوں تو پھر؟ اس نے عرض کی پھر بھی میرے دل میں کوئی شک وشبہ داخل نہیں ہوگا۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے اس سے کہا تم ایسا نہیں کر سکتے جبکہ شیخ نے اس سے کہا میں عنقریب تمہارا امتحان لوں گا۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے اس شخص سے کہا میں تمہارے بارے میں اندیشوں کا شکار ہو گیا ہوں کیونکہ ایک اندھا شخص کسی دانا و بینا کو کیسے امتحان دے سکتا ہے؟ اس لیے تم شیخ سے معافی مانگ لو اور اپنی عاجزی اور کمزوری کا اعتراف کرو' میں بھی تمہارا ساتھ دیتا ہوں پھر ہم دونوں نے شیخ سے معافی مانگ لی لیکن تقدیر کا لکھا پورا ہو کے رہا (کچھ عرصے بعد) شیخ نے اس شخص کو ایک کام کہا (جو بظاہر اسے پسند نہیں تھا) لیکن درحقیقت اس کے لیے فائدہ مند تھا مگر وہ اس کی حکمت نہیں سمجھ سکتا اور اس نے وہ کام نہیں کیا یہاں تک کہ آخر کار وہ حضرت کے بارے میں بدگمانی کا شکار ہوتا چلا گیا۔

یقین کی اہمیت

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اللہ تعالیٰ کے اسرار کو وہی شخص برداشت کر سکتا ہے جو پاک طینت ہو اس کا نظریہ درست ہو اور عزم پختہ ہو۔ اپنے شیخ کے علاوہ اور کسی کی بات پر یقین نہ کرے بلکہ دیگر تمام لوگوں کی حیثیت اس کی نظر میں مردوں کی مانند ہو یہاں میں چند حکایات نقل کرنا چاہوں گا تاکہ اپنے نفس کی اصلاح کے خواہش مند افراد ان سے مستفید ہو سکیں البتہ اس سے پہلے میں حضرت کے چند فرمودات ذکر کروں گا۔

ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا' فتح کے حصول سے پہلے ایک مرتبہ مجھے ایک لمبی خوف ناک صورت دکھائی دی جس کی شکل اونٹ جیسی تھی جب مجھے فتح نصیب ہوئی اور میں نے تمام جہانوں کا مشاہدہ کیا تو کہیں بھی وہ خوف ناک چیز دکھائی نہیں دی' میں نے اس کا تذکرہ قطب زمان شیخ محمد بن عبدالکریم البصری سے کیا تو انہوں نے فرمایا یہ چیز کہیں بھی موجود نہیں ہے۔ میں نے کہا پھر میں نے اسے کیسے دیکھ لیا؟ انہوں نے جواب دیا' یہ تمہاری روح کا عمل تھا۔ میں نے حیرانگی سے دریافت کیا' وہ کیسے؟ تو انہوں نے کہا جب انسان کا وجود اپنے سامنے کسی چیز کے وجود کا یقین کر لے تو روح اس شے کے وجود کو سامنے حاضر کرنے میں انسان کی مدد کرتی ہے اگرچہ اس سے انسان کو نقصان ہی کیوں نہ پہنچے؟ بھلائی اور برائی ہر معاملے میں یقین سے بڑھ کر اور

کوئی چیز نہیں۔

(شیخ محمد بن عبدالکریم فرماتے ہیں) فتح کے حصول سے پہلے ایک مرتبہ میرے راستے میں ایک دریا آ گیا جسے کشتی کے بغیر عبور نہیں کیا جا سکتا تھا' میرے دل میں یہ پختہ یقین پیدا ہو گیا کہ میں پانی کے اوپر چلتے ہوئے اس دریا کو عبور کر سکتا ہوں۔ میں نے پانی پر پاؤں رکھا اور باآسانی دریا عبور کر کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا' واپسی پر جب دوبارہ اسی دریا کو عبور کرنے کا موقع آیا تو اس وقت یقین کی وہ کیفیت حاصل نہ ہوئی' میں نے آزمائش کے لیے پانی پر ایک پاؤں رکھا تو وہ ڈوب گیا جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اب میں اس دریا کو پانی پر چل کر عبور نہیں کر سکوں گا۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ ارشاد فرماتے ہیں' جب تک انسان کو کسی بات کا یقین رہے اس وقت تک شیطان دُور رہتا ہے لیکن جیسے ہی یقین متزلزل ہو' شیطان کو فوراً پتہ چل جاتا ہے اور وہ انسان کی رگوں میں دوڑنے والے خون میں شامل ہو کر وسوسے ڈالنا شروع کر دیتا ہے (ان الشیطان یجری من الانسان مجری الدم) (صحیح مسلم' ۴:۱۷۱۲' رقم: ۲۱۷۴) یہاں تک کہ انسان بہت سی بھلائیوں سے محروم رہ جاتا ہے۔ یقین کی مثال شہر کے گرد موجود فصیل کی سی ہے جب تک فصیل باقی رہے گی' دشمن کے شہر میں داخل ہونے کی امید نہ ہوگی لیکن جب اس میں دراڑیں پڑ جائیں یا اندر داخلے کے راستے کھل جائیں تو دشمن باآسانی شہر میں داخل ہو جائے گا لہٰذا شیطان صرف اس وقت انسان کو بہکا سکتا ہے جب انسان کے وجود کی فصیل یعنی یقین کمزور ہو لہٰذا ہر عقل مند شخص کو پوری کوشش کرنی چاہیے کہ اس کی فصیل مضبوط رہے تاکہ وہ شیطان کے شر سے محفوظ رہے۔

ایک مرتبہ حضرت نے ارشاد فرمایا اگر کوئی شخص کسی کے ساتھ کوئی وعدہ کرے اور سننے والا اس وعدے پر یقین کر لے تو یہ اس بات کی نشانی ہے کہ وہ وعدہ ضرور پورا ہوگا لیکن اگر وعدہ سنتے وقت ذہن میں کسی قسم کا کوئی شک موجود ہو تو اس بات کی نشانی ہے کہ وہ وعدہ پورا نہیں ہو سکے گا لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ یقین سچے لوگوں کی نشانی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے فضل و کرم کی بدولت ہمیں یقین کی حلاوت اور اس کے اسرار سے بہرہ مند فرمائے۔

نیک نیتی کا انجام

ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے یہ حکایت بیان کی کہ گزشتہ زمانے میں ایک شخص پر اللہ تعالیٰ کا خاص لطف و کرم ہوا اور اس کے دل میں صالحین کی محبت پیدا ہو گئی یہاں تک کہ اس نے اپنا سارا مال و اسباب فروخت کیا اور حاصل ہونے والی رقم لے کر ایک شخص کے پاس چلا گیا جو صوفی بزرگ کے طور پر مشہور تھا اور دُور دُور سے لوگ اس کی زیارت کے لیے آیا کرتے اس نام نہاد صوفی کا نام عبدالعلی تھا اور اس کی زیارت کے لیے جانے والے اس شخص کا نام بھی عبدالعلی تھا' وہ نام نہاد صوفی ایک گناہ گار شخص تھا جب وہ زائر اس نام نہاد صوفی کے پاس پہنچا اور دربان کو اپنا نام بتایا تو اس نام نہاد صوفی نے اسے اپنے ہی قبیلے کا ایک فرد سمجھتے ہوئے خلوت میں بلا لیا جہاں ایک بدکار عورت اور شراب موجود تھی مگر اللہ تعالیٰ نے اس زائر پر اپنا خاص فضل کیا اور اس کی توجہ ان حرام

چیزوں کی طرف مبذول نہ ہوئی اس نے آگے بڑھ کر اپنا سارا مال اس نام نہاد صوفی کے سامنے رکھتے ہوئے نہایت عاجزی کے ساتھ عرض کی کہ میں آپ کی شہرت سُن کر اپنے وطن سے صرف آپ کی زیارت کے لیے حاضر ہوا ہوں اور اپنا مال خالصتاً اللہ کی رضا کے حصول کے لیے آپ کی نذر کرتا ہوں۔ نام نہاد صوفی نے وہ مال قبول کیا اور رسمی طور پر دعا دی کہ اللہ تعالیٰ تمہاری اس خدمت کو قبول کرے پھر اس نے اپنے خادم کو حکم دیا کہ اسے ایک روٹی کھانے کے لیے دو اس شخص نے روٹی لے کے کھالی پھر صوفی نے اسے حکم دیا کہ فلاں باغ میں جا کر کلہاڑی کے ذریعے لکڑیاں اکٹھی کرو۔ وہ زائر اسی وقت اُٹھا اور باغ کی طرف روانہ ہو گیا' دل ہی دل میں وہ اس بات پر بہت مسرور تھا کہ صوفی صاحب نے مجھے اپنا خادم بنا لیا ہے۔ سفر کی تمام تر تھکن کے باوجود اس نے پوری تندہی سے اپنی خدمت سرانجام دی لیکن اس کی خوش قسمتی کی انتہا یہ ہے کہ جب وہ اس نام نہاد صوفی کے پاس پہنچا اسی وقت دیوان کے اراکین میں سے ایک بڑے بزرگ کا آخری وقت قریب آ گیا اس وقت ان کے سرہانے اس وقت کا غوث اور ساتوں اقطاب موجود تھے جنہوں نے مل کر ان بزرگ سے کہا کہ ہم نے آپ کو کئی بار ہدایت کی کہ اپنا کوئی روحانی وارث تلاش کریں لیکن آپ نے توجہ نہیں دی اب آپ کا آخری وقت قریب آ چکا ہے اور آپ کے وصال کے بعد آپ کے تمام تر اسرار ضائع ہو جائیں گے اور کوئی بھی شخص آپ کا روحانی وارث نہیں ہو سکے گا۔ وہ بزرگ کہنے لگے محترم حضرات! اللہ تعالیٰ نے میرا وارث بھیج دیا ہے۔ سب نے حیرانگی سے دریافت کیا' وہ کون ہے؟ وہ بزرگ کہنے لگے عبدالعلی نامی وہ شخص جو فلاں بے دین شخص کے پاس آیا ہوا ہے' آپ اس کے ارادے اور خیال کی پختگی باطن کی سچائی اور یقین کی مضبوطی ملاحظہ کریں کہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود اس کا ارادہ متزلزل نہیں ہوا اور اس کے ذہن میں کوئی وسوسہ پیدا نہیں ہوا۔ آپ حضرات نے ایسی خوش اعتقادگی کے بارے میں کبھی کچھ سنا ہے' میں اسے اپنا وارث مقرر کرتا ہوں' آپ میں سے کسی کو کوئی اعتراض تو نہیں؟ تو ان تمام بزرگوں نے اس بات کی تائید کی اور اس شیخ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اس کے فوراً بعد حضرت عبدالعلی کو سرالٰہی حاصل ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی نیک نیتی کے باعث یہ اجر عطا کیا اور فتح کے حصول کے بعد انہیں یہ بھی پتہ چل گیا کہ انہیں یہ نعمت کہاں سے حاصل ہوئی ہے؟ اور جس شخص کو وہ خدا کا ولی سمجھ رہے تھے' وہ ایک جھوٹا دغاباز شخص تھا۔ گویا اللہ تعالیٰ نے صرف ان کی نیک نیتی کے باعث ان پر یہ فضل و کرم کیا۔

دوسری حکایت

ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے یہ واقعہ بیان کیا۔ ایک بزرگ کا ایک سچا مرید تھا' ایک دن انہوں نے اپنے مرید کی سچائی کا امتحان لینے کی غرض سے اس سے دریافت کیا' کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟ اس نے عرض کی' جی ہاں! بزرگ نے دوبارہ دریافت کیا' تم مجھ سے زیادہ محبت کرتے ہو یا اپنے والد سے؟ اس نے عرض کی' آپ سے! شیخ نے اس سے دریافت کیا' اگر میں تم سے یہ فرمائش کروں کہ اپنے والد کا سر اُتار کر میرے پاس لے آؤ تو کیا ایسا کر لو گے؟ اس نے عرض کی' ضرور! کیوں نہیں؟ یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور سیدھا اپنے گھر روانہ ہو گیا اس

وقت تمام اہل خانہ سو چکے تھے اور اس کا والد ایک الگ کمرے میں اپنی اہلیہ کے ساتھ صحبت میں مشغول تھا اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اس کا سرکاٹ کے چادر میں لپیٹ کر شیخ کی خدمت میں لا کے پیش کر دیا۔ شیخ نے کہا میں نے مذاق کیا تھا۔ مرید نے عرض کی لیکن میں نے اسے سنجیدگی سے لیا۔ شیخ نے کہا دیکھو! یہ کس کا سر ہے؟ مرید نے اب غور سے دیکھا تو یہ کسی اور شخص کا سر تھا۔

سیدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں اس مرید کا والد اس وقت گھر میں موجود ہی نہیں تھا اور اس کی عدم موجودگی میں اس کے والد کی بیوی نے خیانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا آپ کسی اور کے حوالے کر دیا اور یہ بات اس مرید کے شیخ کو کشف کے ذریعے معلوم ہوگئی اس نے اسی صورتِ حال سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنے مرید کا امتحان لیا جس میں وہ مرید کامیاب ثابت ہوا اور بعد میں یہی مرید اپنے شیخ کی فتح اور اس کے اسرار کا وارث ثابت ہوا۔

ایک مرتبہ ایک بزرگ کے پاس ایک شخص آیا اور درخواست کی۔ اے میرے آقا! خدا کے لیے مجھے قبول کر لیں۔ شیخ نے رضامندی کا اظہار کیا اور اپنے پاس ٹھہرنے کی ہدایت کی' کچھ دن بعد اسے ایک کدال دی جس کے ایک سرے پر لوہے کا ایک خول لگا ہوا تھا۔ بظاہر اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی بلکہ کھدائی کرنے والے کے لیے اُلٹا مشکل کا باعث بنتا تھا۔ شیخ نے اس شخص کو کھدائی کا حکم دیا لیکن یہی وہ شخص تھا جس نے آخر کار اس شیخ کا روحانی وارث بننا تھا بشرطیکہ اس کی توجہ اس خول کی طرف مبذول نہ ہو لیکن اگر اسے یہ خیال آ جاتا کہ اس خول کا کیا فائدہ ہے؟ یا یہ ایک بے کار چیز ہے تو اس صورت میں وہ شخص اس شیخ کا روحانی وارث نہیں بن سکتا تھا۔ وہ شخص سات برس تک اسی کدال کے ہمراہ شیخ کی خدمت کرتا رہا' وہ فاس ہی کا رہنے والا تھا اس تمام عرصے کے دوران وہ شیطانی وسوسوں کی اثراندازی سے محفوظ رہا اور اسے کبھی بھول کر بھی لوہے کے اس کا خول کا خیال نہیں آیا۔ گویا اس کے لیے وہ خول موجود ہی نہیں تھا۔ صادق الاحوال لوگوں کی یہی کیفیت ہوا کرتی ہے۔

تیسری حکایت

اسی طرح ایک بزرگ کا ایک سچا مرید تھا جس نے اس بزرگ کا روحانی وارث بننا تھا اسے اپنے شیخ کی کئی خلاف شرع حرکات نظر آئیں لیکن اس کے باوجود اس کے دل میں کوئی وسوسہ پیدا نہیں ہوا۔ شیخ کے وصال کے بعد جب اسے فتح نصیب ہوئی تو اس نے کشف کے ذریعے دیکھا کہ ان تمام امور میں کوئی ایک بھی درحقیقت شرعی احکام کے خلاف نہیں تھا بلکہ اسے صرف یہ غلط فہمی ہوئی تھی۔ مثلاً ان امور میں ایک بات یہ بھی تھی کہ شیخ کے پڑوس میں ایک بدکردار عورت رہتی تھی جس کی شکل وصورت سے وہ مرید واقف تھا' اتفاقیہ طور پر شیخ کی اہلیہ محترمہ کی شکل اس عورت سے خاصی ملتی تھی لیکن اس مرید نے کبھی بھی شیخ کی اہلیہ کو نہیں دیکھا تھا' شیخ کے گھر کی بیٹھک اور گھر کے دیگر کمروں کے درمیان ایک کمرہ شیخ کی مخصوص خلوت گاہ تھی' وہ مرید اس خلوت گاہ کے صرف دروازے تک جا سکتا تھا۔ ایک دن وہ اسی خلوت گاہ کے دروازے پر بیٹھا تھا کہ شیخ کے پڑوس میں رہنے والی

عورت آئی اور اس کمرے میں داخل ہوگئی (کچھ دیر بعد اس مرید کی عدم موجودگی میں وہ عورت واپس چلی گئی اس کے کچھ دیر بعد شیخ کی اہلیہ اس کمرے سے باہر نکلی اور مرید یہ سمجھا کہ شاید یہ وہی عورت ہے) لیکن اس کے دل میں کوئی وسوسہ پیدا نہیں ہوا۔ بعد میں شیخ نے تیمم کیا تو مرید کو یقین ہو گیا کہ شیخ نے اس بدکردار عورت کے ساتھ صحبت کی ہے اور اب کسی عذر کے بغیر تیمم کر رہے ہیں لیکن اس کے باوجود اس کی عقیدت متزلزل نہیں ہوئی پھر ایک مرتبہ شیخ کو ہاضمے کی خرابی کی شکایت ہوئی تو انہوں نے ایک خاص قسم کے پودے کا عرق منگوا کے پیا' مرید یہ سمجھا کہ شاید شیخ نے شراب پی ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اسے فتح نصیب کی تو اسے پتہ چلا کہ شیخ نے کوئی کام خلافِ شریعت نہیں کیا اور تمام امور کی حقیقت اس کے سامنے ظاہر ہوگئی۔

چوتھی حکایت

ایک شخص کے پیر بھائی کا انتقال ہو گیا اس نے یہ معمول بنا لیا کہ اپنی آمدنی کا نصف حصہ اپنی اولاد پر خرچ کرتا اور بقیہ نصف پیر بھائی کی اولاد پر خرچ کرتا اس شخص کی اپنے بھائیوں کے ہمراہ کچھ مشترکہ زمین تھی جسے حکومت نے زبردستی خرید لیا جب اس زمین کی قیمت ادا کی گئی تو اس شخص کے حصے میں چالیس مثقال سونا آیا اس کے بھائیوں نے اس سے دریافت کیا' تم اس رقم کا کیا کرو گے؟ اس نے جواب دیا' اسے اپنے پیر بھائی کے بچوں کے درمیان تقسیم کروں گا اس کے بھائیوں نے اس عمل کو حماقت قرار دیتے ہوئے کہا کہ ہم نے تم جیسا بے وقوف شخص کبھی نہیں دیکھا' تم اس رقم سے کوئی کاروبار کر سکتے ہو اس لیے اس حماقت کو چھوڑو اور فلاں فلاں چیز خرید لو اس کے نفس نے بھائیوں کی تجویز پر عمل کرنے کی ترغیب دی تو اس نے اپنے آپ سے دریافت کیا اگر کل قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نے تجھ سے دریافت کیا کہ میں نے تجھے چالیس مثقال سونا عطا کیا تھا اور تو نے اپنا فائدہ سامنے رکھتے ہوئے بھائی چارگی کو پسِ پشت ڈال دیا اس لیے اب تمہیں اس کی سزا بھگتنا پڑے گی (یہ سوچ کر اس کے دل میں خوف پیدا ہوا) اور اس نے یہ رقم اپنے اور اپنے پیر بھائی کے بچوں کے برابر تقسیم کر دی (اس نیکی کے بدلے میں) اللہ تعالیٰ نے اسے فتح نصیب کی اور ان انعامات سے نوازا جو انسان کے وہم و گمان سے ماوراء ہیں۔

حقیقت پسندی

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک بزرگ کے چند مریدین تھے جن میں سے ایک میں نیکی کے آثار زیادہ نمایاں تھے۔ ایک دن اس بزرگ نے اپنے مریدین کا امتحان لیا مگر اس امتحان میں ایک کے سوا بقیہ سب مرید ناکام ہو گئے۔ امتحان کی صورت یوں ہوئی کہ شیخ نے ان سب کے سامنے ایسی صورتِ حال پیدا کر دی جس سے وہ سب یہ سمجھے کہ شاید شیخ زنا کے مرتکب ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ کر تمام مریدین تو بہ استغفار کرتے ہوئے شیخ کو چھوڑ کر چلے گئے صرف ایک شخص باقی رہ گیا' وہ اٹھا اور پانی گرم کرنے لگا۔ شیخ نے باہر آ کر دریافت کیا' یہ کیا کر رہے

ہو؟ اس نے عرض کی میرا خیال ہے کہ شاید آپ کو غسل کی ضرورت پیش آئے گی۔ شیخ نے دریافت کیا' تم نے مجھے زنا کرتے ہوئے دیکھا ہے اس کے باوجود میری خدمت کر رہے ہو؟ اس نے جواب دیا' میں آپ کی خدمت کیوں نہ کروں جبکہ ایک انسان ہونے کے ناطے آپ سے گناہ کا صدور ممکن ہے کیونکہ گناہوں سے پاک ذات صرف انبیاء کی ہوتی ہے' میں یہ سوچ کر آپ کا حلقہ بگوش نہیں ہوا تھا کہ آپ کوئی نبی ہیں اور آپ سے گناہ کا ارتکاب نہیں ہو سکتا بلکہ میں تو اس نیت سے یہاں آیا تھا کہ آپ معرفتِ الٰہیہ کے بارے میں مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں اور یہ خصوصیت اب بھی آپ کو حاصل ہے اس لیے میں آپ کو چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں؟ شیخ نے کہا' یہ دنیا تھی جو عورت کی شکل میں میرے پاس آئی تھی اور میں نے ایسا قصداً کیا تھا' تم میرے ساتھ اندر آ کر دیکھو۔ وہ مرید اندر گیا تو وہاں کسی عورت کا نام و نشان بھی نہیں تھا' یہ دیکھ کر اس مرید کی عقیدت میں مزید اضافہ ہو گیا۔

راز داری شرط ہے

ایک مرتبہ ایک شخص کسی بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی جو سر اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا کیا ہے' وہ آپ مجھے بھی دے دیں۔ شیخ نے اسے سمجھایا کہ تم اسے برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے لیکن اس شخص نے اصرار کیا کہ مجھ میں یہ صلاحیت موجود ہے۔ آخر شیخ نے اسے ایک ایسی آزمائش کا شکار کیا کہ وہ سر کے بل زمین پر آ رہا۔ ہوا یوں کہ شیخ کا ایک مرید کسی بڑے سرکاری اہلکار کا بیٹا تھا' شیخ نے اس نوجوان کو ایک جگہ چھپا کر یہ ہدایت کی کہ جب تک میں تمہیں باہر نکلنے کے لیے نہ کہوں' تم نے باہر نہیں آنا پھر شیخ نے اپنی خلوت گاہ سے ایک بکری ذبح کی اور خون آلود چھری اور ہاتھوں سمیت خلوت گاہ سے باہر آ کر سر کے طلب گار شخص سے کہا کہ میں نے طیش میں آ کر فلاں امیرزادے کو قتل کر دیا ہے اور اس کی لاش میری خلوت گاہ میں موجود ہے اگر تم مجھ سے سر حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس بات کا تذکرہ کسی سے نہ کرو اگر تم نے میری اس ہدایت پر عمل کیا تو میں انشاء اللہ تمہیں سر دے دوں گا اگر اس مقتول کے والد نے مجھ سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو میں اسے کہوں گا کہ تمہارا بیٹا بیماری کے عالم میں انتقال کر گیا ہے۔ وہ شخص یہ بات سُن کر نہایت غضب ناک ہوا اور شیخ کے پاس سے اُٹھ کر سیدھا اس نوجوان کے والد کے پاس گیا اور اسے بتایا کہ جس شخص کو تم متقی پرہیزگار سمجھتے ہو اس نے تمہارے بیٹے کو قتل کر دیا ہے اور پھر مجھے یہ ہدایت کی ہے کہ میں اس بات کو پردے میں رہنے دوں اگر تمہیں میری اس بات کا شبہ ہو تو تم ابھی میرے ساتھ چلو اور اپنے بیٹے کو خون میں لت پت دیکھ لو۔ لوگوں نے اس سے کہا' تمہارا بُرا ہو' حضرت یہ حرکت نہیں کر سکتے' شاید تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہو اس نے بھڑک کر کہا تم خود میرے ساتھ چل کے دیکھ لو کہ میں سچ کہہ رہا ہوں یا جھوٹ کہہ رہا ہوں۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر ہر طرف پھیل گئی اور اربابِ حکومت کو بھی اس کی اطلاع ہو گئی' آخر وہ سب لوگ شیخ کی رہائش گاہ کی طرف چل پڑے' ان میں سب سے آگے وہی شخص تھا (جس نے شیخ سے سر کا مطالبہ کیا تھا) جب یہ لوگ شیخ کی رہائش گاہ پر پہنچے اور دروازے پر دستک دی تو شیخ باہر آئے اور ان سے ان کی آمد کا سبب دریافت کیا۔ لوگوں نے اسی شخص کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے کہا' آپ کو نہیں معلوم کہ یہ شخص کیا افواہ پھیلا رہا ہے؟ شیخ نے حیرانگی سے دریافت کیا' کیا ہوا؟ اس شخص نے جواب دیا' وہی جو تم چھپانا چاہتے ہو اور تم نے مجھے اس کی ہدایت بھی کی ہے۔ شیخ نے جواب دیا' میں نے تو تمہیں کچھ بھی نہیں کہا۔ وہ شخص کہنے لگا جھوٹ بول کر تم بچ نہیں سکتے' تم نے ایک بچے کو قتل کیا ہے اب ہم تمہیں قتل کر دیں گے۔ اے خدا کے دشمن! تم اپنی عبادت کے ذریعے لوگوں کو دھوکہ دیتے ہو۔ شیخ نے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا' تم اس سے پوچھو کہ اسے کیسے پتہ چلا کہ میں نے کسی بچے کو قتل کیا ہے؟ وہ شخص کہنے لگا پہلے جب تم میرے پاس آئے تھے تو کیا اس وقت تمہارے ہاتھوں اور کپڑوں پر خون کے نشانات موجود نہیں تھے؟ شیخ نے اقرار کیا' تھے! میں نے ایک بکری ذبح کی تھی اس شخص نے کہا اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو ہمیں بھی اپنی خلوت میں داخل ہونے دو جب سب لوگ اندر داخل ہوئے تو واقعی وہاں ایک ذبح شدہ بکری موجود تھی۔ وہ شخص کہنے لگا تم نے مقتول کی لاش کہیں چھپا دی ہے اور اس کی جگہ یہ بکری یہاں رکھ دی ہے تاکہ جواباً تمہیں قتل نہ کیا جائے۔ شیخ نے کہا اگر وہ نوجوان صحیح سلامت سامنے آ جائے تو کیا تم میری بات مان لو گے؟ کیا تمہارا شمار ان جھوٹوں میں ہوتا ہے جو کبھی کامیاب نہیں ہوتے؟ وہ شخص کہنے لگا اگر تم سچے ہو تو اس نوجوان کو سامنے لا کے دِکھاؤ۔ شیخ نے ایک مرید بھجوایا اور تھوڑی دیر بعد وہ نوجوان وہاں آ گیا' اسے اس سارے قصے کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا' لوگوں نے اسے زندہ سلامت دیکھ کر شیخ کی خدمت میں معذرت پیش کی اور اس شخص کو بُرا بھلا کہنے لگے جس نے ان کے سامنے غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ شیخ نے اس شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اے کذاب! تو نے ہی یہ دعویٰ کیا تھا نا کہ تو سر کو برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے حالانکہ تو تو ایک چھوٹے سے راز کو بھی برداشت نہیں کر سکا جس کی سر کے سامنے کوئی حیثیت نہیں ہے۔ میں نے یہ سب کچھ تیرے دعوے کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے کیا ہے اب دفع ہو جا' میں نے تجھے وہ سر دیا ہے جو تیرے جیسے کو دینا چاہیے تھا اس کے بعد وہ شخص نصیحت حاصل کرنے والوں کے لیے عبرت کی مثال بن گیا اور جھوٹے دعوے داروں کے لیے سزا کی مثال بن گیا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کی بدولت ہمیں نیکی کی توفیق عطا فرمائے۔

عرب کا رہائشی ایک شخص صالحین کی زیارت کا مشتاق رہتا تھا اور اس کی خواہش ہوتی تھی کہ کسی اللہ والے کا پتہ چلے اور میں اس کی خدمت میں حاضری دے کر فیض حاصل کروں۔ اپنے اسی شوق کی تکمیل کے لیے وہ اکثر مشرقی ممالک کا سفر کرتا تھا۔ ایک مرتبہ مصر میں ایک بزرگ سے ملا تو انہوں نے ایک امانت اس کے سپرد کرتے ہوئے کہا کہ جو شخص تم سے اس امانت کا مطالبہ کرے گا' وہی تمہارے پیر بننے کے قابل ہوگا۔ وہ عربی مختلف بلاد و امصار میں گھومتا ہوا اور بہت سے اولیاء کی زیارت کرتا ہوا واپس اپنے شہر میں پہنچا' کچھ عرصے بعد ایک دن اس کے پڑوسی نے اس سے دریافت کیا' فلاں صاحب نے مصر میں تمہیں جو امانت دی تھی' وہ کہاں ہے؟ اس وقت اسے پتہ چلا کہ اسی کا پڑوسی خود ایک بہت بڑا ولی ہے' وہ اس کے پیروں میں گر کر قدم بوسی کرنے لگا اور عرض کی حضرت! آپ نے خود کو مجھ سے چھپائے رکھا جبکہ میں نے مشرق و مغرب میں موجود ہر مشہور بزرگ کے ہاں

حاضری دی ہے اور آپ میرے پڑوس میں موجود تھے مگر میں آپ سے بے خبر رہا پھر اس نے اس شیخ سے سر طلب کیا۔ شیخ نے جواب دیا تم اسے حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اس نے عرض کی حضور! میرے اندر یہ صلاحیت موجود ہے۔ شیخ نے کہا کہ اگر تمہارے اندر یہ صلاحیت موجود ہے تو میری ایک شرط ہے اس نے دریافت کیا کہ وہ کیا؟ شیخ نے کہا کہ کوئی بڑی شرط نہیں ہے اور تمہیں کوئی مشکل بھی نہیں ہوگی۔ شرط یہ ہے کہ تم اپنی طویل داڑھی منڈوا دو اس نے عرض کی یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کیونکہ مختلف شہروں میں موجود بہت سے لوگ اسی داڑھی کی وجہ سے میری تعظیم کرتے ہیں۔ شیخ نے کہا کہ اگر تم سرِ حاصل کرنا چاہتے ہو تو میری یہ شرط پوری کرنی پڑے گی اس نے عرض کی یہ میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ شیخ نے کہا اب میرا کوئی قصور نہیں ہے کیونکہ تم نے خود ہی بنیادی شرط کو قبول نہیں کیا اس کے بعد شیخ اس سے جدا ہو گئے۔ شیخ کے وصال کے بعد اسے افسوس ہوا کہ میں نے کس قدر عظیم نعمت کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی اور وہ کہنے لگا جو عقل آج میرے پاس ہے' وہ شیخ کے زمانے میں حاصل ہوتی تو میں ان کی شرط پوری کر دیتا بلکہ اگر وہ اور شرائط بھی پیش کرتے تو وہ بھی پوری کرتا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) فاس میں ایک بزرگ رہتے ہیں جنہیں بیداری کی حالت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف حاصل ہو چکا ہے اور وہ یہیں بیٹھ کر مدینہ منورہ کی خوشبو سونگھ لیتے ہیں' انہی بزرگ نے ایک دن مجھے بتایا کہ ایک دن انہوں نے فاس شہر میں موجود جامع مسجد الاندلس میں ایک ولی کے ہمراہ جمعہ کی نماز ادا کی جب نماز پڑھ کر باہر نکلے تو اس شخص نے اس ولی کی دست بوسی کرتے ہوئے عرض کی حضرت! میں آپ سے صرف اللہ کے لیے محبت کرتا ہوں اس ولی نے ناراضگی سے اسے دیکھتے ہوئے جواب دیا' کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ ظاہر اور پوشیدہ چیزوں کا علم رکھتا ہے؟ ولی کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اس شخص کو دعویٰ محبت کرنے کی بجائے اس بات پر بھروسہ رکھنا چاہیے تھا کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی محبت کا علم ہے اور ولی سے شاباش لینے کے بجائے اسے اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب کی امید رکھنی چاہیے تھی۔ یہ کہہ کر وہ ولی چل دیا اور محبت کا دعوے دار شخص ولی کی یہ بات سُن کر رونے لگا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا تم نے ایک بہت بڑا دعویٰ کیا ہے اب وہ ولی ضرور تمہارا امتحان لے گا اس لیے تم پوری تندہی سے اس امتحان میں پورا اُترنے کی کوشش کرنا ورنہ تم اس ولی سے دُور ہو جاؤ گے۔

(فاس میں رہنے والے وہی بزرگ کہتے ہیں) اس ولی اور اس شخص کے باغات ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ تھے۔ شیخ کے باغ کے کنارے پر انجیر کا ایک درخت موجود تھا اس کا پھل ہر سال وہ شخص توڑ لیا کرتا تھا اور شیخ حق ہمسائیگی کا لحاظ کرتے ہوئے خاموش رہتے لیکن جب اس شخص نے دعویٰ محبت کیا تو ولی نے صبر و تحمل کو پس پشت ڈالتے ہوئے اس سے جھگڑا شروع کر دیا اس جھگڑے کے دوران اس شخص نے اس ولی کو خوب بُرا بھلا کہا۔

فیضِ نبوت قبرِ انور میں محصور نہیں ہے

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) فاس میں رہنے والے انہی بزرگ نے ایک مرتبہ مجھے بتایا کہ جب میں حج

سے فراغت کے بعد روضۂ انور پر حاضر ہوا تو مجھ پر ایک خاص کیفیت طاری ہوگئی اور میں نے عرض کی یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میری خواہش تھی کہ مدینہ منورہ آنے کے بعد مجھے دوبارہ اپنے وطن جانا نصیب نہ ہو۔ اس قبر انور سے آواز آئی اگر میں اپنی اس قبر میں قید ہوں تو پھر یہاں آنے والے ہر شخص کو یہیں رہ جانا چاہیے اور اگر میں ہر حال میں اپنی اُمت کے ساتھ ہوں تو تمہیں واپس اپنے شہر چلا جانا چاہیے۔ (وہ بزرگ کہتے ہیں) یہ سُن کر میں فاس واپس آ گیا۔

سید عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں' ایک مجذوب کی یہ عادت تھی کہ وہ قصداً خلافِ شریعت کام کرتا تھا تا کہ لوگ اس کے پاس نہ آئیں۔ ایک دن اس نے اپنے کپڑوں پر شراب اُنڈیل لی' شراب کی بو سونگھ کر سب لوگ اس کے پاس سے دُور بھاگ گئے لیکن جس شخص نے اس کے سر کا وارث بننا تھا' وہ وہیں موجود رہا۔ یہ دیکھ کر وہ مجذوب کہنے لگا' میں نے جان بوجھ کر یہ حرکت کی ہے تا کہ یہ چیونٹیاں مجھ سے دُور ہو جائیں۔ چیونٹیوں سے اس کی مراد وہ لوگ تھے جو اس کے پاس آیا کرتے تھے۔ (مجذوب اپنے روحانی وارث سے کہنا لگا) مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں ہے' مجھے صرف تمہاری ضرورت ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے مجھے یہ واقعہ سنایا کہ ایک شخص کسی بزرگ کے پاس آیا اور خوب غور سے انہیں سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا' بزرگ نے اس سے دریافت کیا' تم کیا چاہتے ہو؟ اس نے عرض کی حضور! میرے لیے یہی غنیمت ہے کہ میں آپ کی زیارت کرلوں تا کہ کل اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آپ میری شفاعت کر سکیں۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں' اس شخص کو اس بات سے بہت فائدہ ہوا۔ سیّدی دباغ جب بھی یہ حکایت بیان کیا کرتے تھے تو اکثر یہ فرماتے تھے کہ الحمد اللہ! ابھی اس اُمت میں مردانِ خدا باقی ہیں۔

ایک مرتبہ ایک شخص ایک بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی مجھے آپ سے اللہ کے لیے محبت ہے۔ اس وقت فجر کی نماز ہو چکی تھی۔ بزرگ نے اس سے کہا اگر تم کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہو تو اب کبھی بھی اپنے گھر واپس نہ جانا بلکہ تم مشرقی ممالک کی طرف سفر کرو اس شخص نے بزرگ کے مشورے پر عمل کیا اور دنیا اور آخرت کے بہت سے فوائد حاصل کیے۔

صرف کرامت ولایت کی دلیل نہیں ہوتی

ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا' جن حضرات نے اولیاء کرام کی کرامات قلم بند کی ہیں۔ اگرچہ وہ اس اعتبار سے مفید ہیں کہ لوگ ان اولیاء کے احوال سے واقف ہو گئے ہیں لیکن اس کا ایک نقصان بھی ہوا ہے صرف کرامات ذکر کرنے کی وجہ سے قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ولی کسی کام سے عاجز نہیں ہوتا اور اس سے کوئی خلاف شرع حرکت سرزد نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ ظاہری طور پر ہی ایسا کیوں نہ ہو اس کے نتیجے میں ایک بہت بڑی غلط فہمی جنم لیتی ہے اور قاری یہ گمان کرنے لگتا ہے کہ شاید ولی میں خدائی اوصاف پیدا ہو گئے ہیں یعنی وہ

جب' جو چاہے کرسکتا ہے اور کسی کام سے عاجز نہیں ہے یا پھر اس ولی میں نبوت کے اوصاف پیدا ہو گئے ہیں یعنی وہ ہر حال میں گناہوں کے ارتکاب سے محفوظ ہوتا ہے۔ پہلی خوبی اللہ تعالیٰ کی ذاتی خصوصیت ہے اور یہ صفت اولیاء تو کجا اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو بھی عطا نہیں کی جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ۔ (آلِ عمران ۳:۱۲۸)

"(اے حبیب!) تمہیں اس بات کا کوئی اختیار نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرماتا ہے یا انہیں عذاب دیتا ہے کیونکہ آخرکار یہ ظالم لوگ ہیں۔"

نیز ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ۔ (القصص ۲۸:۵۶)

"(اے حبیب!) جسے تم چاہو' اسے تم ہدایت نہیں دے سکتے البتہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے' اسے ہدایت عطا فرما دیتا ہے۔"

حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

لما نزلت هذه الآية قل هوالقادر على ان يبعث عليكم عذابا من فوقكم قال رسول الله صلى الله عليه وسلم فقلت اعوذ بوجهك قال اومن تحت ارجلكم قال اعوذ بوجهك قال اويلبسكم شيعا ويذيق بعضكم باس بعض قال رسول الله صلى الله عليه وسلم هذا أهون أو هذا أيسر اعوذ بوجهك فقال سبق القضاء.

(صحیح بخاری' ۴:۱۶۹۴' رقم: ۴۳۵۲)

"جب آیت "تم فرماؤ وہ قادر ہے کہ تم پر عذاب بھیجے تمہارے اُوپر سے" نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی' اے اللہ! میں تیری ذات کی پناہ پکڑتا ہوں۔ جب فرمایا: یا تمہارے پیروں کے نیچے سے' تو دعا مانگی کہ میں تیری ذات کی پناہ پکڑتا ہوں' اور یہ حصہ نازل ہوا' یا تمہیں بھڑا دے مختلف گروہ کر کے اور ایک دوسرے کی سختی چکھائے"۔ اِس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ عذاب ہلکا ہے' یہ آسان ہے"۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ۝ قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ط اِنِّيْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ (هود ۱۱:۴۵-۴۶)

"اور نوح نے اپنے پروردگار کو پکارا کہ اے میرے رب! میرا بیٹا میرے اہل میں شامل ہے اور بے شک تیرا وعدہ حق ہے اور تو سب سے بڑا حاکم ہے تو (اللہ نے) فرمایا۔ اے نوح! یہ تیرے اہل میں

شامل نہیں ہے اس کے اعمال نیک نہیں ہیں تو اس کے بارے میں مجھ سے سوال نہ کر جو تو نہیں جانتا اور میں تجھے سمجھا رہا ہوں کہ کہیں (مشیت سے) لاعلم لوگوں کی مانند نہ ہو جانا۔"

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتَاهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا (التحریم ۶۶:۱۰)

"اور اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کے لیے نوح اور لوط کی بیویوں کی مثال بیان کرتا ہے کہ وہ دونوں ہمارے دو نیک بندوں کی بیویاں تھیں لیکن ان دونوں نے خیانت کی اور وہ دونوں نبی انہیں اللہ (کی گرفت) سے نہیں بچا سکے۔"

(سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں) آج کل لوگوں کا یہ حال ہے کہ اگر وہ دیکھیں کہ کسی ولی کی دعا قبول نہیں ہوئی یا اس کی بیوی یا بچہ متقی پرہیز گار نہیں ہیں تو اس کی ولایت کا انکار کر دیتے ہیں یہ کہہ کر کہ اگر یہ ولی ہوتا تو اس کی دعا ضرور قبول ہوتی یا اگر یہ ولی ہوتا تو پہلے اپنے گھر والوں کی اصلاح کرتا۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ولی دوسروں کی اصلاح کر سکتا ہے حالانکہ وہ خود اپنی اصلاح کرنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتا جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ (النور ۲۴:۲۱)

"اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور رحمت نہ ہوتو تم میں سے کوئی ایک کبھی بھی پاک نہیں ہو سکتا لیکن اللہ جسے چاہے' پاک کر دیتا ہے۔"

عصمت' نبوت کی خصوصیات میں سے ایک ہے اور ولایت کبھی بھی نبوت کے برابر نہیں ہو سکتی۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں' ولی کے ذریعے جو بھلائی ظاہر ہوتی ہے' وہ درحقیقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت کا نتیجہ ہے کیونکہ جس ایمان کے نتیجے میں وہ بھلائی ظاہر ہوئی ہے وہ اس ولی کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہوا اس لیے ولی کی مثال عام لوگوں کی مانند ہے لیکن انبیاء کرام کا معاملہ اس کے برعکس ہے کیونکہ وہ گناہوں کے ارتکاب سے معصوم ہوتے ہیں جبکہ تقویٰ و معرفت ان کی اصل فطرت میں ودیعت کر دیئے جاتے ہیں' ان حضرات کو کسی شریعت کی پیروی یا کسی استاد سے استفادے کی ضرورت پیش نہیں آتی کیونکہ حق ان کی ذات کے اندر موجود ہوتا ہے یعنی حرفِ نبوت جو ان کی فطرت میں شامل ہے اور یہی انہیں سیدھے راستے پر گامزن رکھتا ہے۔

جن حضرات نے اولیاء کرام کے کشف و کرامات کے بارے میں کتب تصنیف کی ہیں اگر وہ ہر صاحب تذکرہ کے ساتھ اس سے صادر ہونے والے عام معاملات بھی ذکر کر دیتے تو لوگوں کو اس صاحب تذکرہ ولی کے مکمل حالات سے آگاہی حاصل ہو جاتی اور انہیں پتہ چل جاتا کہ کسی بھی ولی کی دعا کا اثر بعض اوقات ظاہر ہو

جاتا ہے اور کبھی ظاہر نہیں ہوتا اگر کوئی کام کرنے کا ارادہ کرے تو بعض اوقات وہ پورا ہو جاتا ہے اور کبھی پورا نہیں بھی ہوتا۔ جیسا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہو جاتا ہے۔ ولی صرف ایک اعتبار سے عام لوگوں پر فوقیت رکھتا ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کی معرفت نصیب ہوتی ہے لیکن اس معرفت کے باوجود اگر اس سے بظاہر کسی گناہ کا صدور دکھائی دے تو درحقیقت وہ گناہ نہیں ہوتا بلکہ دیکھنے والے کی کوتاہ بینی ہوتی ہے کیونکہ مشاہدے کی جو کیفیت اس ولی کو نصیب ہوتی ہے' وہ اسے گناہ کے ارتکاب سے باز رکھتی ہے لیکن یہ کیفیت عصمت نہیں ہو سکتی کیونکہ اس صورت میں ولایت کا مقام نبوت کے برابر ہو جائے گا۔ گناہوں سے معصوم ہونے کا وصف انبیاء کرام میں ذاتی طور پر پایا جاتا ہے جبکہ اولیاء میں یہ صفت عارضی ہوتی ہے لہٰذا عین ممکن ہے کہ کسی ولی سے یہ صفت زائل ہو جائے لیکن یہ ناممکن ہے کہ کسی نبی کی ذات سے یہ صفت زائل ہو جائے اس کا بنیادی سبب میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ انبیاء میں خیر اور بھلائی ذاتی طور پر پائی جاتی ہے جبکہ اولیاء کے کمالات ذاتی نہیں ہوتے لہٰذا انبیاء کی عصمت ذاتی ہوگی اور اولیاء کا گناہوں سے محفوظ ہونا عارضی ہوگا جب کسی عارفِ کامل سے بظاہر کسی خلافِ شریعت کام کا صدور ہوگا تو بظاہر ایسا ہوگا' درحقیقت نہیں اور اس کا سبب دیکھنے والے کی نیت کا امتحان ہوگا اس میں اور بھی کچھ اسرار ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اولیاء کرام کے بارے میں حسنِ ظن رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں کہ جو شخص کھانے' پینے' سونے' جاگنے' گھر کے عام معاملات' غزوات وغیرہ سے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ کرے گا تو اسے پتہ چلے گا کہ غزوات میں کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پلڑا بھاری ہوتا تھا اور کبھی صورتِ حال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین کے ہاتھ میں نظر آتی اسی طرح کچھ لوگ فریب سے کام لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ صحابہ کو اپنے ہمراہ لے جا کر دھوکے سے انہیں شہید کر دیتے تھے جیسا کہ غزوۂ رجیع اور غزوۂ بئر معونہ کے موقع پر اس طرح کے واقعات پیش آئے۔

صلح حدیبیہ کا واقعہ بھی خاص اہمیت رکھتا ہے اور اس طرح کے دیگر تمام واقعات اللہ تعالیٰ کی حکمت کے راز ہیں جن سے اس نے اپنے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ کیا ہے۔ یہ واقعات انسان کی رہنمائی اس بات کی طرف کرتے ہیں کہ ولایت کا مرتبہ کیونکہ نبوت سے کم ہے اس لیے) اگر کسی ولی سے کوئی ایسا عمل صادر ہو جائے جو دیگر عام اہلِ ایمان کی مانند ہو تو اس سے اس کی ولایت متاثر نہیں ہوتی لہٰذا ہر وہ عقل مند شخص جو صوفیاء اور تصوف سے محبت رکھتا ہے' اسے سیرت کا مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ اسے اولیاء کی حقیقی معرفت حاصل ہو اور اولیاء کے بارے میں وہ کسی بھی قسم کی خوش فہمی کا شکار ہونے سے بچا رہے اس موضوع پر تحریری شکل میں صرف اسی قدر بیان کیا جا سکتا ہے تاہم عقل مندوں کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں' ایک شخص نے کسی ولی سے متعلق سُن کر اس ولی کی ذہن میں ایسی تصویر بنالی جو اس سے منسوب کرامات کے مطابق تھی لیکن جب اس کی اس ولی سے ملاقات ہوئی تو وہ ولی اس کے

خیال کے بالکل برعکس تھا۔ یہ دیکھ کر وہ شخص مشکوک ہوگیا کہ یہ واقعی ولی ہے بھی یا نہیں۔

الجزائر کے رہنے والے ایک شخص نے فاس میں رہنے والے کسی ولی کے بارے میں سنا کہ یہ بڑا صاحب کرامت ولی ہے اس نے اپنے ذہن میں یہ تصویر بنائی کہ وہ ولی ایک عمر رسیدہ شخص ہوگا جس کی ہیبت اور رعب کا عالم ہی نرالا ہوگا لہٰذا وہ اس کی زیارت کے لیے چل پڑا جب وہ فاس پہنچا اور لوگوں سے معلوم کر کے اس ولی کے دروازے پر پہنچا تو اس کا خیال تھا کہ دروازے پر بہت سے دربان موجود ہوں گے (مگر وہاں کوئی دربان نہیں تھا) اس نے دروازے پر دستک دی۔ وہ ولی خود باہر نکلا اس نے ولی کو دربان سمجھتے ہوئے درخواست کی کہ میں حضرت صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ ولی نے اسے جواب دیا جس شخص کی زیارت کے لیے تم اتنا طویل سفر کر کے یہاں آئے ہو' وہ میں ہی ہوں لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس ولی میں کوئی ظاہری شان و شوکت نہیں ہے تو دوبارہ درخواست کی جناب! میں ایک مسافر ہوں اور بڑے شوق سے حضرت صاحب کی زیارت کے لیے آیا ہوں۔ براہِ مہربانی آپ ان تک میری رہنمائی کر دیں۔ ولی نے کہا تم جس سے ملنا چاہتے ہو' وہ میں ہی ہوں اس شخص نے پھر کہا جناب! میں ایک مسافر ہوں اور میں نے آپ سے درخواست کی ہے کہ مجھے حضرت صاحب سے ملوا دیں لیکن آپ میرے ساتھ مذاق کیے جا رہے ہیں۔ ولی نے اس سے کہا اگر میں تمہارے ساتھ مذاق کروں تو اللہ تعالیٰ مجھ سے اس کا حساب لے اس شخص نے کہا اب اللہ ہی تم سے اس کا حساب لے گا' یہ کہہ کر وہ واپس چل دیا کیونکہ ولی کی ظاہری حالت اس کے معیار کے مطابق نہیں تھی۔

ولایت کی شرائط

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اولیاء کرام کی کرامات کے بارے میں کتابوں کا مطالعہ کر کے بہت سے لوگ اولیاء کرام کے بارے میں خیالی معیار قائم کر لیتے ہیں اور پھر اسی معیار کی روشنی میں اپنے زمانے میں موجود اولیاء کا جائزہ لیتے ہیں اور جب یہ حضرات اس خیالی معیار پر پورے نہیں اُترتے تو ان کی ولایت کے بارے میں مشکوک ہو جاتے ہیں کیونکہ ان حضرات کی کرامات کتابوں میں ذکر شدہ اولیاء کی کرامات سے کم ہوتی ہے حالانکہ جن اولیاء کا تذکرہ یہ لوگ کتابوں میں پڑھتے ہیں اگر یہ ان کے زمانے میں انہیں دیکھتے تو ان اولیاء میں بھی وہی احوال ملاحظہ کرتے جو ان کے اپنے زمانے کے اولیاء میں پائے جاتے ہیں۔ بہت سے جہلاء ایسے بھی ہیں جن کے نزدیک آج کل کوئی بھی ولی موجود ہی نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ذہن میں ولایت کے لیے کچھ شرائط مقرر کر دی ہیں اور جب یہ ان نام نہاد شرائط کی روشنی میں اپنے زمانے کے اولیاء کو پرکھتے ہیں اور انہیں اپنے قائم کردہ معیار پر پورا اُترتے نہیں پاتے تو ان کی ولایت کا انکار کر دیتے ہیں۔ گویا وہ صرف ایک خیالی ولی کے وجود کے قائل ہوتے ہیں' وہ یہ نہیں جانتے کہ ولایت اس بات کا نام ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو (معرفت کے لیے) منتخب کرے اور اس عمل کے لیے مخلوق میں سے کوئی ایک بھی (اللہ تعالیٰ کے لیے) ضابطہ مقرر نہیں کر سکتا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک مرتبہ ایک فقیہ میرے پاس ایک کتاب لے کر آئے جس میں ولایت کی شرائط تحریر تھیں کہ جو شخص لوگوں کی رہنمائی کا دعوے دار ہو اس میں کیا خوبیاں ہونی چاہئیں؟

اس فقیہ نے مجھ سے کہا کہ میری خواہش ہے کہ میں آپ کے سامنے یہ کتاب پڑھوں اور آپ اس میں موجود ولایت کی شرائط سے آگاہ ہو جائیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ صاحب ہمارے زمانے میں موجود بعض اولیاء کی ولایت کا انکار کرنا چاہتے ہیں اس کا یہ خیال تھا کہ وہ پہلے کتاب کے مندرجات مجھے سنا کر ان شرائط کو تسلیم کروا کے پھر بعض اولیاء کا انکار کرے گا' میں نے اس سے کہا پہلے مجھے ایک سوال کا جواب دو پھر اس کے بعد کتاب پڑھ کے سنانا۔ (سوال یہ ہے) جو کتاب تم نے ہاتھ میں تھام رکھی ہے کیا اس کے مصنف نے اللہ تعالیٰ کے تمام خزانوں' عنایات اور بادشاہی کا احاطہ کیا ہے؟ یا اس مصنف کی وہی کیفیت ہے جیسا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے گفتگو کرتے ہوئے بیان کی تھی؟ (اے موسیٰ!) میرا اور تمہارا علم اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں وہ حیثیت بھی نہیں رکھتے جو اس سمندر کے مقابلے میں وہ پانی رکھتا ہے جو اس چڑیا نے پیا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اگر تم اس بات کے قائل ہو کہ اس کے مصنف نے اللہ تعالیٰ کے تمام خزانوں اور اس کی ساری بادشاہی کا احاطہ کر لیا ہے تو پھر تم ضرور مجھے یہ کتاب پڑھ کے سناؤ۔ وہ فقیہ کہنے لگے معاذ اللہ! میں یہ کیسے کہہ سکتا ہوں؟ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) اگر مصنف کے علم کی وہی حیثیت ہے جو حضرت خضر علیہ السلام نے بیان کی تو پھر اس بارے میں خاموشی بہتر ہے کیونکہ اس مصنف کی مثال اس چیونٹی کی مانند ہے جو ایک چھوٹی سی بل میں رہتی ہے اور جب وہ اپنی بل سے باہر نکلتی ہے تو اسے گندم کا ایک دانہ مل جاتا ہے جسے وہ اُٹھا کر اپنی بل میں لے جائے اور پھر خوشی کے مارے تمام چیونٹیوں کے درمیان یہ چلاتی پھرے اے چیونٹیو! پناہ اور بھلائی صرف میرے پاس ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) وہ چیونٹی صرف اپنے حلق کو تکلیف دے گی لہٰذا اس کتاب کے مصنف کا علم' علمِ الٰہی کے مقابلے میں وہ حیثیت بھی نہیں رکھتا جو سمندر کے مقابلے میں ایک قطرے کی ہے تو ایسے صاحبِ علم مصنف کی تحریر کی وجہ سے ہم اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ کیسے کر سکتے ہیں کہ وہ فلاں شخص پر رحم نہیں کرے گا یا اس طرح کے شخص کو فتح نصیب نہیں کرے گا فلاں شخص ولی نہیں ہو سکتا اور فلاں ولایت کے معیار پر پورا نہیں اُترتا جب اللہ تعالیٰ کسی بندے پر اپنا فضل کرنا چاہے اور وہ بندہ اس وقت کافر ہو تو اللہ تعالیٰ اسے ایمان کی دولت نصیب کر کے اسی ایک لمحے میں فتح عطا فرما دیتا ہے تو تمہارے پیش کردہ ولایت کے قواعد کہاں گئے؟

(عام فہم سی بات ہے) کہ اگر تم کسی دنیاوی بادشاہ کے بارے میں یہ سنو کہ اس نے اپنے فلاں غلام کو بے انتہا مال و دولت سے نوازا ہے [illegible] امیر کو کچھ نہیں دیا' فلاں یہودی کو خلعتِ فاخرہ سے نوازا ہے تو تم اس بادشاہ کے بارے میں یہی گمان کرو گے کہ وہ بادشاہ ہے جو چاہے کر سکتا ہے۔ (جب دنیاوی بادشاہ کے بارے

میں تمہاری یہ سوچ ہے کہ وہ جو چاہے کرسکتا ہے) تو پھر تم اللہ تعالیٰ کو اپنے قواعد وضوابط کا کس طرح پابند کر سکتے ہو؟ جبکہ قرآن کی یہ آیات تمہارے عقیدے کا حصہ ہیں۔

فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (ھود۱۱:۱۰۷)''(اللہ تعالیٰ) جو چاہے وہی کرتا ہے۔''

وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ۔(یوسف۱۲:۲۱)''(اللہ تعالیٰ) اپنے حکم کو نافذ کرسکتا ہے۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میری یہ گفتگو سُن کر وہ فقیہ کہنے لگے' آپ نے بالکل صحیح بات کی ہے۔ اللہ کی قسم! حق یہی ہے(یہ کہہ کر) انہوں نے کتاب بند کردی(اور کہنے لگے) اگر ہم یہ کہیں کہ ان کتب کے مصنفین کو اللہ تعالیٰ کے برابر علم ہے تو یہ غلط ہے اور اگر ہم یہ کہیں کہ ان مصنفین کا علم بہت محدود ہے تو پھر ہم ان کے مقرر کردہ قواعد کی روشنی میں اللہ تعالیٰ پر کوئی حکم جاری نہیں کر سکتے اگر یہ حضرات خاموش رہتے تو یہی بہتر تھا۔ ہدایت اسی شخص کو حاصل ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ ہدایت عطا کرے جبکہ ان قواعد کی تحریر وتدوین سے پہلے بھی بہت سے لوگ ہدایات پا چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ پابند نہیں ہے

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک مرتبہ ایک درویش جو خود کو صالحین کا خادم قرار دیتا تھا اس کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کی گفتگو ہوئی۔ کسی زمانے میں ہم دونوں ایک بزرگ کی زیارت کے لیے جایا کرتے تھے جب ان کا انتقال ہوگیا تو وہ ان کے مزار کا مجاور بن گیا اور میں نے ایک اور بزرگ کے ہاں جانا شروع کردیا۔ ایک دن میری اس کے ساتھ ملاقات ہوئی تو وہ کہنے لگا میں تمہیں ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا ضرور! سرآنکھوں پر' میں اس کا مطلب سمجھ چکا تھا اس نے کہا تم پہلے فلاں بزرگ کی خدمت میں حاضری دیا کرتے تھے جن کی ولایت کے بارے میں کوئی سے دو اشخاص کے درمیان بھی کوئی اختلاف نہیں ہوگا اور اب تم ایک اور شخص کے پاس جاتے ہو' تمہاری مثال بالکل اسی طرح ہے جیسے کوئی ہیرے جواہرات کے بدلے میں پتھر خرید لے۔ میں نے اس سے کہا تم نے یہ بات بصیرت کی روشنی میں کہی ہے یا اس کے بغیر؟ اگر بصیرت کی روشنی میں کہی ہے تو اقرار کرو' میں تمہیں اپنی بصیرت دِکھاتا ہوں اور اگر تم بصیرت کے بغیر یہ کہہ رہے ہو تو اس کی دلیل بیان کرو۔ اس نے کہا(دلیل کی کیا ضرورت ہے؟) یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔

میں نے اس سے کہا اگر تم سے کوئی یہ کہے کہ اپنی اس بات کے ذریعے تم اللہ سے دُور اور شیطان کے نزدیک ہوگئے تو تم یقیناً اس سے دلیل مانگو گے اور اگر وہ جواب میں یہ کہہ دے کہ یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے تو پھر تم کیا کرو گے؟ یہ سُن کر وہ شخص خاموش ہوگیا کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد میں نے اس سے کہا میں نے تمہاری بات کی تائید میں جب دلیل تلاش کی تو میرے ذہن میں ایک دلیل آئی ہے اس نے دریافت کیا' وہ کیا؟ میں نے کہا تم یہ سمجھتے ہو کہ شاید تم اللہ تعالیٰ کی بادشاہی میں اس طرح [illegible] شریک ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہاری اجازت کے بغیر کسی کو کوئی بھی چیز یا روحانی فتح عطا نہیں کرسکتا اور کیونکہ تم جس شخص کا انکار کر رہے ہو' اسے اللہ

تعالیٰ تمہاری اجازت کے بغیر فتح نصیب نہیں کر سکتا اس لیے یقیناً فتح نصیب نہیں ہوئی ہوگی اسی لیے تم اللہ کے نیک بندوں کا انکار کر رہے ہو کیونکہ اگر تمہارا یہ عقیدہ ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کی بادشاہی میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے اور اس کی کسی عطا پر کوئی اس سے اختلاف نہیں کر سکتا تو تم ان نیک لوگوں پر نازل ہونے والی اللہ تعالیٰ کی عنایات کو تسلیم کر لیتے۔ یہ سُن کر وہ درویش کہنے لگا کہ میں توبہ کرتا ہوں' یہ بات اس نے تین مرتبہ دہرائی اور پھر کہا تم ٹھیک کہہ رہے ہو' میں بے وقوف ہوں اور میرا انکار غلط تھا۔

ولی کا فقہ دین

(احمد بن مبارک کہتے ہیں معزز قارئین!) یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ جب اللہ تعالیٰ کسی ولی کو فتح عطا فرماتا ہے تو وہ ولی حق اور صواب کی معرفت حاصل کر لیتا ہے اور اس وقت وہ کسی ایک فقہی مذہب کی پیروی کا پابند نہیں رہتا یہاں تک کہ اگر تمام فقہی مذاہب دنیا سے ناپید ہو جائیں تو وہ ولی شرعی احکام کو دوبارہ دنیا میں عام کر سکتا ہے کیونکہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ایک لمحے کے لیے بھی اس کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتی اسی طرح وہ ہر وقت مشاہدہ حق میں مستغرق رہتا ہے لہٰذا وہ شرعی احکام میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد سے بخوبی واقف ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ولی دوسروں کے لیے حجت ہو سکتا ہے لیکن دوسرے اس کے لیے حجت نہیں ہو سکتے کیونکہ جس شخص کو فتح نصیب نہ ہوئی ہو اس کی بہ نسبت یہ ولی اللہ کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ پس جس شخص کی یہ کیفیت ہو اس کے کسی عمل پر انکار نہیں کیا جا سکتا بعض لوگ یہ اعتراض کرتے نظر آتے ہیں کہ فلاں ولی کا فلاں عمل' فلاں فقہی مذہب کے خلاف ہے جب آپ ایسا کوئی اعتراض سنیں تو اس کے جواب سے پہلے یہ نکتہ ذہن نشین کر لیں کہ وہ منکر دو طرح کا ہو سکتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ شرعی احکام سے خود بھی ناواقف ہوگا اور اکثر منکرین کی یہی حالت ہوتی ہے حالانکہ ایسے شخص کو انکار کا کوئی حق نہیں ہے کیونکہ کوئی اندھا کسی آنکھوں والے کی بات کا کیسے انکار کر سکتا ہے؟ اس لیے اسے چاہیے کہ وہ پہلے اپنی جہالت دُور کرے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ منکر کسی ایک فقہی مذہب کا عالم ہوگا اور دیگر فقہی مذاہب سے ناواقف ہوگا لیکن ایسا شخص بھی اس وقت اعتراض کر سکتا ہے جبکہ وہ یہ بات یقینی طور پر جانتا ہو کہ متنازع مسئلے میں حق اسی کے فقہی مذہب کے مطابق ہے اور یہ بات فقہی مذاہب سے تعلق رکھنے والے حضرات کے نزدیک بھی درست نہیں ہے کیونکہ ان فقہی مذاہب کے بارے میں اہلِ علم کے دو گروہ ہیں۔ بعض حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ تمام فقہی مذاہب حق پر ہیں' ان حضرات کے نزدیک کسی متنازع مسئلے میں مجتہدین کی آراء کے مطابق اللہ تعالیٰ کا حکم بھی مختلف اور متعدد ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی مسئلے میں ایک مجتہد نے حرمت کا فتویٰ دے دے تو اس کے پیروکاروں کے لیے بھی اللہ کا حکم یہی ہوگا۔ اہلِ علم کے دوسرے گروہ کے نزدیک کسی بھی متنازع مسئلے میں اللہ تعالیٰ کا حکم صرف ایک ہوتا ہے لہٰذا مجتہدین کے اختلاف کی صورت میں کسی ایک مجتہد کی رائے درست ہوگی تاہم ان اہلِ علم کے نزدیک کوئی ایک فقہی مذہب بھی ایسا نہیں ہے جس کی تمام فقہی تحقیقات کو صحیح قرار دیا جاتا ہے بلکہ

ان کے نزدیک ہر فقہی مذہب میں بعض مسائل صحیح اور بعض غلط ہوتے ہیں لہٰذا ولی پر اعتراض کرنے والا اگر مذاہب اربعہ سے واقف ہو بھی تو وہ اس وقت اعتراض کرنے کے لائق ہوگا جب وہ اس بات کا قائل ہو کہ ائمہ اربعہ کے علاوہ دیگر ائمہ کی فقہی آراء مکمل طور پر باطل ہیں جیسے امام ابوعبدالرحمٰن الاوزاعی' عطا بن ابی رباح' عبدالملک بن جریج' طاؤس' ابراہیم نخعی' عکرمۃ' معمر' عبدالرزاق بن ہمام' ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری' ابوعبداللہ مسلم بن الحجاج القشیری' محمد بن اسحاق ابن خزیمہ' ابن المنذر' ابن جریر طبری اور دیگر ائمہ بلکہ تابعین یہاں تک کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی فقہی آراء حق نہیں ہیں حالانکہ یہ نظریہ بذاتِ خود باطل ہے اس لیے کسی بھی صاحبِ فتح ولی پر اعتراض کرنے کے بجائے انسان کو اپنی ہی خرابیوں کی اصلاح کرنی چاہیے کیونکہ ہماری تمام گفتگو سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ کسی صاحبِ فتح ولی کا انکار صرف وہ شخص کر سکتا ہے جو شریعت سے متعلق تمام احکام سے بخوبی واقف ہو اور ایسا شخص صرف غوث ہو سکتا ہے اس لیے دوسرے لوگ اپنی کم علمی کی وجہ سے اگر خاموش رہیں تو یہی ان کے حق میں بہتر ہے تاہم ہماری یہ ساری گفتگو ان اولیاء سے متعلق ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے فتح عطا فرمائی ہو اور جو ایسا نہ ہو اس کی حرکتوں سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے۔

وزن اور باٹ

ایک مرتبہ ایک عالمِ دین نے اپنے شیخ طریقت سے بعض صاحبِ فتح اولیاء پر اعتراضات کی اجازت مانگتے ہوئے کہا حضرت! میں شریعت کے ترازو کے پلڑے میں ان کا وزن کروں گا جو ٹھیک ہوا اسے صحیح قرار دوں گا اور جو ٹھیک نہ ہوا اس کا انکار کروں گا اس شخص نے اس سے کہا مجھے ڈر ہے کہ تمہارے پاس وزن کرنے کے لیے تمام ضروری باٹ موجود نہیں ہوں گے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس شیخ نے بھی اسی بات کی طرف اشارہ کیا جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ وہ شخص اپنی جہالت کے باعث اولیاء کی صحیح باتوں کا انکار کرے گا۔

صحیح جواب کیا ہے؟

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک مرتبہ ایک ذہین وفطین شخص نے کسی کو ایک صاحبِ فتح ولی سے ایک مسئلہ دریافت کرتے ہوئے سنا اس وقت میں بھی وہاں موجود تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اگر کوئی شخص نماز میں سورۂ فاتحہ کے بعد دوسری سورۃ کی تلاوت کرنا بھول جائے اور اس پر سجدہ سہو لازم ہو جائے اور پھر وہ سجدہ سہو کرنا بھی بھول جائے اور سلام پھیر لے تو کیا اس کی نماز اس وجہ سے باطل ہوگی کہ اس نے نماز میں سورۃ کی تلاوت نہ کر کے تین سنتیں ترک کی ہیں؟ مشہور مالکی فقیہ خطاب اس بات کے قائل ہیں کہ اس کی نماز نہیں ہوگی جبکہ بعض دیگر فقہاء کے نزدیک نماز ہو جائے گی۔ سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حق کیا ہے؟ ولی نے جواب دیا کہ حق یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بھول کر سورۃ نہ پڑھے تو سجدہ سہو سرے سے لازم ہی نہیں آتا اور اس صورت میں اگر کوئی شخص سجدہ سہو

کر لیتا ہے تو اس کی نماز باطل ہوگی۔

سوال کرنے والا یہ بات جانتا تھا کہ اس ولی نے کسی مدرسے میں کوئی تعلیم حاصل نہیں کی لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ ولی صاحب فتح ہیں اور بلند مرتبے پر فائز ہیں اس لیے اس نے جب یہ جواب سنا تو اس کی صحت کا یقین کر لیا لیکن اس ذہین و فطین شخص کے ذہن میں اشکال پیدا ہوا اس نے ولی کے وہاں سے رخصت ہو جانے کے بعد اس سائل سے کہا کہ ولی کہلانے والا یہ شخص جاہل ہے جسے کچھ علم نہیں ہے اتنا عام سا مسئلہ بھی اسے معلوم نہیں ہے اور اس نے یہ کہہ دیا ہے کہ بھول کر سورۃ ترک کرنے پر سجدہ سہو لازم نہیں ہوتا حالانکہ ابن رشد نے اسے سنتِ مؤکدہ قرار دیا ہے۔ مسئلہ دریافت کرنے والے نے جواب دیا' وہ ولی صاحبِ فتح ہے اور اس کے لیے کسی مذہب کی قید ضروری نہیں ہے بلکہ وہ صرف صحیح مسئلے کے مطابق فتویٰ دینے کا پابند ہے۔ وہ ذہین و فطین شخص جو درحقیقت ایک طالب علم تھا' کہنے لگا ہم اپنے امام یعنی امام مالک کے علاوہ اور کسی کا فتویٰ نہیں مانتے۔ سائل نے جواب دیا (فقہ کی مشہور کتاب) ''توضیح'' میں امام اشہب نے امام مالک سے یہی قول نقل کیا ہے جو ولی نے بیان کیا ہے اس کتاب میں تصریح ہے کہ امام مالک کے نزدیک نماز میں سورۃ پڑھنا سنت نہیں بلکہ مستحب ہے پھر امام شافعی کا بھی یہی فتویٰ ہے لہٰذا اگر کوئی شخص سورۃ کو ترک کر دیتا ہے تو اس پر سجدہ سہو لازم نہیں آئے گا اور اگر ایسی سورۃ میں وہ نمازی سجدہ سہو کر لیتا ہے تو اس کی نماز درست نہیں ہوگی۔

(پھر اس سائل نے طالب علم کو مخاطب کرتے ہوا کہا' تم نے غور نہیں کیا) میں نے حضرت سے مسئلے کا صحیح جواب دریافت کیا تھا' یہ نہیں پوچھا تھا کہ اس بارے میں امام مالک کی رائے کیا ہے؟ آپ نے صحیح جواب عنایت کیا جو حسنِ اتفاق سے امام مالک سے منقول ایک روایت کے مطابق تھا اور پھر امام شافعی کی بھی یہی رائے ہے اس لیے حضرت کے جواب پر اب کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سُن کر وہ معترض ساکت ہو گیا۔

ایک مہربان ناصح کا قصہ

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) منکرین کی یہی عادت اور یہی طریقہ ہے حالانکہ وہ خود جاہل ہوتے ہیں اسی طرح ایک مرتبہ ایک بزرگ فقیہ جو ہمارے اساتذہ میں سے ایک ہیں' نے مجھ سے کہا کہ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں اس لیے میں تمہیں ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے عرض کی ضرور! وہ کہنے لگے اگر بہت سے لوگ ایک طرف ہوں اور تم تنہا دوسری طرف ہو اس شخص کے بارے میں تم کشف اور ولایت کے قائل ہو جسے لوگ اچھا نہیں سمجھتے۔ یہ ناممکن ہے کہ صرف تنہا تمہاری رائے درست ہو۔ انہوں نے اسی نوعیت کی کچھ اور باتیں بھی کیں۔ میں نے عرض کی میں آپ کی نصیحت ضرور قبول کروں گا لیکن آپ پہلے مجھے ایک سوال کا جواب دیں۔ انہوں نے کہا پوچھو میں نے کہا کیا آپ نے کبھی اس بزرگ سے کوئی ملاقات کی ہے؟ ان کی گفتگو سنی ہے؟ یا ان سے کسی مسئلے پر بحث کی ہے؟ جس کے نتیجے میں آپ کو لوگوں کی باتیں درست معلوم ہوتی ہیں؟ انہوں نے جواب دیا' مجھے کبھی اس شخص سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اب میں نے روایتی احترام کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ان سے کہا مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ آپ نے اُلٹ طریق کار اختیار کر لیا ہے جن امور میں شک وشبہ کی گنجائش ہوتی ہے' آپ ان پر یقین کیے بیٹھے ہیں اور جن پر یقین کیا جا سکتا ہے' ان میں آپ نے شک بلکہ بہتان پر اتفاق کر لیا ہے۔ انہوں نے کہا تم اپنی اس بات کی وضاحت کرو؟ میں نے جواب دیا جب آپ فقہ کا درس دے رہے ہوں اور اس وقت کوئی شخص آپ کے سامنے شیخ لخمی کی تصنیف ''تبصرہ'' امام ابن رشد کی تصنیف ''البیان'' شیخ ابن شاس کی تصنیف ''الجواہر'' یا اس جیسی کسی دوسری کتاب کا حوالہ دے جو فقہ کے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں تو آپ اس حوالے پر اس وقت تک یقین نہیں کریں گے جب تک وہ مسئلہ خود ان کتابوں میں دیکھ نہ لیں اگرچہ ابن مرزوق' خطاب' یا مصنف توضیح جیسے جلیل القدر آئمہ نے اس مسئلے کو کیوں نہ نقل کیا ہو؟ حالانکہ علم کے حصول کی یہ صورت ظنی ہے اور آپ اس پر یقین کیے بیٹھے ہیں اور اس بارے میں جلیل القدر آئمہ کی نقل پر بھی اعتبار نہیں کرتے حالانکہ اس صورت میں آپ کو کبھی یقین حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ آپ نے ایک ظن کو اس سے بھی زیادہ کمزور ظن کے مقابلے میں پیش کیا ہے کیونکہ ان فقہاء کا زمانہ سابقہ فقہاء کے زمانے کے زیادہ قریب ہے اور ان کے زمانے میں کتابوں کے نسخے میں کسی تبدیلی کا امکان ہمارے زمانے کی بہ نسبت کم تھا۔ پہلے زمانے کے فقہاء' اکابر فقہاء کے اقوال کتابوں میں نقل کرنے کے ساتھ زبانی بھی روایت کیا کرتے تھے مگر ہمارے زمانے میں نہ تو زبانی اقوال روایت کرنے کا رواج باقی رہا اور نہ ہی کتابوں کی نقل کو مستند قرار دیا جا سکتا ہے اس لیے آپ اپنے پاس موجود کسی بنیادی فقہی ماخذ میں موجود کسی عبارت کو دلیل بنا کر خطاب جیسے آئمہ کے نقل کردہ مسئلے کو یقینی طور پر رد نہیں کر سکتے اور دوسری طرف یہ عالم ہے کہ جس شخص پر آپ اعتراض کر رہے ہیں' وہ آپ کے زمانے میں موجود ہے' آپ خود اس کے پاس جا کر اس بات کا جائزہ لے سکتے ہیں کہ لوگوں نے اس کے بارے میں جو کچھ مشہور کر رکھا ہے' وہ کس حد تک صحیح ہے؟ آپ اس کے پاس جائیں اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق شامل حال ہو تو آپ اس کی ولایت پہچان کر اس کے معتقدین میں شامل ہونے کی سعادت حاصل کر سکتے ہیں ورنہ براہِ راست اس پر تنقید کر سکتے ہیں اس طرح آپ کو ذاتی تجربے کی بدولت اس کی خامیوں سے آگاہی ہو گی لیکن مزید ستم یہ ہے کہ آپ جو کسی مسئلے کی تحقیق میں معتبر اور ائمہ فقہ کی نقل پر بھی اعتماد نہیں کرتے اس شخص کے بارے میں جھوٹے اور فریب کار لوگوں پر اعتماد کیے بیٹھے ہیں حالانکہ دوسروں کی نقل سے ظنی علم حاصل ہوتا ہے اور آپ خود جا کر یقینی علم حاصل کر سکتے ہیں۔ آخر آپ کے طرزِ عمل میں یہ دورخی کیوں ہے؟ میری یہ بات سُن کر وہ کہنے لگے تم نے مجھے لاجواب کر دیا ہے' میرے پاس اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں ہے اب تم گواہ بن جاؤ کہ میں اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرتا ہوں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے کہا اگر آپ نے کسی کی نقل پر اعتماد کرنا ہے تو پھر دو وجہ سے مجھ پر اعتماد کریں۔ ایک یہ کہ میرے اندر کسی چیز کو پرکھنے کی صلاحیت موجود ہے' دوسرا یہ کہ آپ بھی واقف ہیں کہ میری کئی برس سے ان کے ہاں آمد ورفت ہے لہٰذا ان کے بارے میں جتنا میں جانتا ہوں' اتنا یہ دوسرے لوگ نہیں جانتے

کیونکہ اعتراض کرنے والوں میں سے اکثر لوگ آپ کی طرح کبھی ان سے بالمشافہ طور پر نہیں ملے ہیں بلکہ ان کے تمام تر اعتراضات صرف سُنی سنائی باتوں پر مبنی ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے بلکہ یہ باتیں انسان کے لئے محرومی اور شرمندگی کا باعث بنتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے فضل و کرم کی بدولت نیکی کی توفیق عطا فرمائے۔ (یہ سُن کر) استاد صاحب کہنے لگے' تم نے کہنے کو کچھ بھی باقی نہیں رہنے دیا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس کے بعد میری ایک اور فقیہ سے ملاقات ہوئی جو مذکورہ فقیہ کے اساتذہ میں سے تھے' انہوں نے مجھ سے کہا کہ اس (مذکورہ فقیہ) نے مجھے تمہاری گفتگو سے آگاہ کیا ہے پھر انہوں نے اس فقیہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا' تم نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے یہ گفتگو کی ہے۔ انہوں نے جواب دیا جی ہاں! اس پر ان دونوں نے بیک زبان کہا کہ تم نے ہمیں لاجواب کر دیا ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) یہ دونوں فقیہ ہمارے زمانے میں فقہاء کے پیشوا ہیں اور علم و فضل کے اعتبار سے اس وقت کوئی بھی ان کا ہم پلہ نہیں ہے جہاں تک دوسرے منکرین کا تعلق ہے تو ان میں سے اکثر صرف سُنی سنائی باتوں پر اعتماد ہیں جس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

بعض منکرین یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ ہم فلاں بزرگ سے واقف ہیں' ان کے احوال ایسے نہ تھے حالانکہ انہیں یہ سوچنا چاہیے کہ پھولوں کا رنگ اور خوشبو ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ (قرآن کہتا ہے)

صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۙ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ (الرعد' ۱۳:۴)

''دونوں طرح کے پودوں کو ایک ہی پانی سے سیراب کیا جاتا ہے لیکن کھانے کے اعتبار سے ایک کو دوسرے پر فضیلت حاصل ہے اس میں عقل مند لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں موجود ہیں۔''

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک مرتبہ میں سیّدی عبدالعزیز دباغ کے ہمراہ' بہار کے موسم میں' ایک باغ میں داخل ہوا۔ آپ نے پھولوں کے رنگ اور خوشبو کے تنوع کو کچھ دیر ملاحظہ کرنے کے بعد مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا جو شخص اولیاء کرام کے احوال اور مقامات میں موجود اختلاف کا جائزہ لینا چاہے' اسے ان پھولوں کو دیکھنا چاہیے کہ ان کے رنگ اور خوشبو کس طرح ایک دوسرے سے مختلف ہیں اسی طرح تمام اولیاء صاحب ہدایت ہوتے ہیں اور ان کی محبت لوگوں کے دلوں میں موجود ہوتی ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) پس اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ فلاں بزرگ ایسے نہیں ہیں تو گویا وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو اسی فلاں بزرگ کی حد تک محدود کر رہا ہے۔ (احادیث کی کتب میں یہ بات منقول ہے) ایک مرتبہ ایک دیہاتی نے مسجد نبوی میں پیشاب کر دیا (اور پھر جاتے وقت کہنے لگا) اے اللہ! مجھ پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر رحم فرما' ہم دونوں کے علاوہ اور کسی پر رحم نہ کرنا۔ (اس کی یہ بات سُن کر) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لقد حجرت واسعا۔ (صحیح بخاری ۵:۲۲۳۸، رقم: ۵۶۶۴) ''تم نے ایک وسیع چیز کو تنگ کر دیا ہے۔''
اور اگر معترض یہ سوچتا ہو کہ ہر ولی کو اس بزرگ کی مانند ہونا چاہیے جس سے معترض واقف ہے تو یہ بھی ممکن نہیں ہے کیونکہ ہم پہلے ہی یہ بات بیان کر چکے ہیں کہ اولیاء کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں اور یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ جس ولی کی یہ شخص مثال بیان کر رہا ہے' وہ اپنے سے پہلے موجود ولی کی مانند نہیں ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے اس موضوع پر خاصی تفصیل سے گفتگو کی ہے اور اس بارے میں چند لوگوں کے ساتھ کی جانے والی اپنی ذاتی بحثیں بھی ذکر کی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ فقہاء اور طلباء اس سے فائدہ حاصل کر سکیں اور یہ صرف ان کی محبت میں اور نصیحت کرنے کے لیے کیا ہے کیونکہ ہر زمانے میں اور ہر جگہ لوگ اولیاء پر اعتراض کرتے رہتے ہیں اور اس کی بنیادی وجہ وہی ہوتی ہے جو ہم نے ذکر کر دی ہے اگر کوئی شخص نظر انصاف کے ساتھ ہماری گفتگو کو پڑھ لے گا تو اولیاء پر اعتراض کرنے سے باز آ جائے گا اور حق اس کے سامنے واضح ہو جائے گا۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ ارشاد فرماتے ہیں' اگر کوئی شخص کسی ولی کی ظاہری حالت دیکھ کر اس کی ولایت کا وزن کرنا چاہے تو وہ شخص دنیا اور آخرت میں خسارے کا شکار ہوگا کیونکہ ولی کا باطن عجائب وغرائب سے معمور ہوتا ہے اس کی مثال اس موٹے اونی کپڑے کی مانند ہوتی ہے جس کے درمیان میں ریشم بھرا ہوا ہو اور ولی کے وہ عجائبات صرف آخرت میں ظاہر ہوں گے جبکہ جو شخص ولی نہ ہو اس کی مثال اس ریشمی کپڑے کی مانند ہوتی ہے جس کے اندر اونی کپڑا لگا ہوا ہو۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ولی سے ظاہری طور پر شریعت کی مخالفت کیوں نظر آتی ہے؟ اس کے بہت سے اسباب ہیں جنہیں ہم نے مختلف مواقع پر حضرت کی زبانی سنا ہے اور ان میں سے چند ایک اہم اسباب یہاں ترتیب کے ساتھ بیان کر دیں گے۔

ایک بزرگ ولی کا مریدان سے شدید محبت کرتا تھا' اللہ تعالیٰ نے جب اس مرید کو اس کے شیخ کے روحانی اسرار پر مطلع کیا تو اس کی محبت اس قدر بڑھ گئی کہ ڈر تھا کہ وہ اپنے شیخ کو مقامِ نبوت سے بھی بلند مرتبے پر فائز سمجھنے لگے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے اس مرید پر کرم کرتے ہوئے ایسی صورت پیدا کی جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ شاید شیخ نے زنا کا ارتکاب کیا ہے (حالانکہ درحقیقت ایسا نہیں تھا) جب اس مرید نے یہ دیکھا تو اپنی خوش اعتقادی میں غلو سے باز آ گیا اور شیخ کے اصل مرتبے کے مطابق اس سے عقیدت رکھنے لگے اس پر اللہ تعالیٰ نے اس مرید کو بھی فتح عطا کی لیکن اگر وہ مرید اپنی سابقہ خوش اعتقادی میں مبتلا رہتا تو اس کا انتقال کفر کی حالت میں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔

بعض افعال نبوی کی حکمت

(سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے بھی کچھ افعال ایسے

ظاہر ہوئے جن کی بنیادی علت یہی تھی۔ مثلاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو یہ مشورہ دیا کہ اگر تم کھجوروں میں پیوند کاری ترک کر دو گے تو پیداوار بہتر ہوگی لیکن جب صحابہ نے اس پر عمل کیا تو پیداوار پہلے سے بھی کم ہوگئی اسی طرح آپ نے صحابہ کو اپنا خواب سنایا کہ ہم سب مسجد الحرام میں امن کی حالت میں داخل ہوئے اور ہم میں سے کسی نے سر منڈوا رکھا تھا اور کسی نے بال کتروا رکھے تھے پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ہمراہ کعبۃ اللہ کی زیارت کے لیے نکلے تو مشرکین نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں داخل نہ ہونے دیا اور پھر معاہدے کے مطابق آئندہ برس مسلمان مکہ میں داخل ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تمام امور اس لیے ظاہر فرمائے تا کہ کوئی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں الوہیت کا عقیدہ اختیار نہ کرے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ۔ (القصص ۲۸:۵۶)

"بے شک یہ نہیں کہ تم جسے اپنی طرف سے چاہو ہدایت کر دو ہاں اللہ ہدایت فرماتا ہے جسے چاہے"

ایک اور مقام پر یوں ارشاد فرمایا:

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ۔ (آل عمران ۳:۱۲۸)

"یہ بات تمہارے ہاتھ نہیں۔"

اس نوعیت کی تمام آیات کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ لوگوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات کی طرف متوجہ رکھا جائے۔

ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا' ولی کامل زائرین کی نیت کے مطابق اسی رنگ میں ان سے ملاقات کرتا ہے مثلاً اگر کوئی شخص نیک نیتی کے ارادے سے آیا تھا تو اسے ولی کے کمالات اور کرامات دِکھائی دیں گے اور اگر کسی کی نیت ٹھیک نہیں تھی تو اسے ولی ایک عام شخص کی مانند محسوس ہوگا گویا ہر شخص کے سامنے ولی کا ظہور اس شخص کے اپنے باطن کے حسن یا قبح کے مطابق ہوتا ہے اور ولی کی حیثیت صرف ایک آئینے کی مانند ہوتی ہے جس میں اچھی یا بُری ہر طرح کی صورت کا عکس دِکھائی دیتا ہے لہٰذا اگر کسی شخص کے سامنے کسی ولی کی کرامات اور کمالات ظاہر ہوں تو اسے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور اگر کسی کے سامنے ولی کی خامیاں ظاہر ہوتی ہوئی محسوس ہوں تو اسے اپنے نفس کا محاسبہ کرنا چاہیے۔

ولی کی مخالفت بدبختی کا علامتی نشان ہے

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں' جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو بدبختی میں ثابت قدم کر دے اور ان کے نصیب میں کسی ولی کے فیض کا حصول نہ ہو تو ایسے لوگ اولیاء کی مخالفت میں مزید پختہ ہو جاتے ہیں' وہ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید ولی بھی ان ہی کی مانند ہے۔ یہ مخالفت اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ یہ تصور کرنے لگتے کہ شاید ولی ان کے ہمراہ بیٹھ کر شراب پی رہا ہے لہٰذا وہ ولی کو شرابی سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ یہ صرف ان کی اپنی روح کا عمل ہوتا ہے

جو ایک غیر موجود شے کو موجود صورت میں ظاہر کر دیتی ہے حالانکہ درحقیقت وہ کچھ بھی نہیں ہوتا بلکہ صرف اس شخص کے اپنے وجود کا سایہ ہوتا ہے جو اسی طرح حرکت کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے جیسے آئینے میں کوئی تصویر حرکت کرتی ہوئی محسوس ہو لہٰذا جب آپ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کچھ بولنا شروع کریں گے تو آئینہ بھی بولتا ہوا محسوس ہوگا اگر آپ آئینے کے سامنے بیٹھ کر کچھ کھائیں گے تو آئینے میں موجود صورت بھی کھاتی ہوئی دِکھائی دے گی۔ غرضیکہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کچھ پئیں' مسکرائیں یا حرکت کریں' آئینے میں موجود صورت آپ کی ہر ایک ادا کی نقل کرتی ہوئی محسوس ہوگی حالانکہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے' یہ صرف آپ کے وجود کا سایہ ہے لہٰذا جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو بدبختی میں مبتلا کر دے تو ولی ان کے اپنے سائے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور انہی کی مانند حرکات کا ارتکاب کرتا ہے۔

مقصود صرف باطن ہے

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں' جو لوگ ولی کی زیارت کے لیے آتے ہیں' ولی صرف ان کے باطن کا جائزہ لیتا ہے' ان کے ظاہر کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی' زیارت کے لیے آنے والے لوگ چار طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ لوگ جن کا ظاہر اور باطن ولی کے بارے میں خوش اعتقاد ہو اور یہ لوگ سب سے زیادہ سعادت مند ہیں' دوسرے وہ لوگ جن کا ظاہر اور باطن ولی پر تنقید کے اعتبار سے یکساں ہو' یہ لوگ سب سے زیادہ محروم ہیں' تیسرے وہ لوگ جن کا ظاہر عقیدت مند ہو لیکن باطنی طور پر وہ ولی کے مخالف ہوں' ایسے لوگ ولی کو سب سے زیادہ ضرر پہنچاتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے منافقین اپنی دوغلی پالیسی کے باعث نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچایا کرتے تھے اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ولی ان کی ظاہری حالت کے پیش نظر انہیں فیض دینا چاہتا ہے تو ان کا باطن رکاوٹ بن جاتا ہے اور اگر ولی ان کے باطن کی بدولت ان سے دُور رہنا چاہے تو ان کی ظاہری عقیدت کے باعث چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا۔

ولی جس طرح ظاہری کلام سنتا ہے اسی طرح باطنی گفتگو بھی سُن لیتا ہے لہٰذا دوغلے شخص کی حیثیت ولی کے سامنے بالکل اسی طرح ہوتی ہے جیسے اس شخص کے پیٹ میں ایک اور شخص ہو۔ بظاہر وہ شخص یہ کہتا ہوا دِکھائی دے کہ حضور! آپ میرے آقا ہیں' میں آپ کا غلام ہوں اور اندر موجود شخص یہ چلا رہا ہو کہ تم ولی نہیں ہو' لوگ تمہارے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہیں' مجھے تمہارے بارے میں اور تمہارے متعلق لوگوں کی رائے کے بارے میں شک و شبہ ہے۔

جو لوگ انسانوں کی باطنی کیفیت سے آگاہ نہیں ہوتے' وہ اکثر اس بات پر حیران ہوتے ہیں کہ پہلی قسم سے تعلق رکھنے والے لوگ ولی سے بہت سا فیض حاصل کر لیتے ہیں جبکہ تیسری قسم سے متعلق لوگ بھی بظاہر عقیدت مند دِکھائی دیتے ہیں لیکن انہیں فیض حاصل نہیں ہوتا ایسا کیوں ہے؟ شاید اس ولی میں کوئی خامی موجود ہے اور پھر اولیاء کے بارے میں مختلف طرح کے وسوسوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ چوتھی قسم وہ ہے جو باطنی طور پر

اولیاء کے معتقد ہوتے ہیں لیکن ظاہری طور پر اولیاء پر تنقید کرتے ہیں اس کا سبب عام طور پر حسد ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک دن میں نے سیّدی عبدالعزیز دباغ سے دریافت کیا' آپ معرفت کی باتیں بیان کرتے ہیں اس طرح اظہارِ خیال کرتے ہوئے آپ کو قصداً ایسا کرنا پڑتا ہے یا اس کے بغیر ہی یہ باتیں صادر ہو جاتی ہیں۔ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا' کامل ولی ہر وقت مشاہدۂ حق میں مستغرق رہتا ہے اور پلک جھپکنے کے عرصے کے برابر بھی اس مشاہدے میں انقطاع نہیں آتا البتہ ولی کا ظاہر مخلوق کے ساتھ متعلق ہوتا ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ زائرین کی نیت اور ان کے مقدر کے مطابق ولی کو ظاہری طور پر مخلوق کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ چنانچہ جس شخص کے نصیب میں اللہ کا فضل ہوگا اس کے سامنے ولی کی زبان سے معرفت کے امور بیان ہوتے ہیں اور وہ شخص ولی کی ذات میں بہت سی کرامات کا مشاہدہ کرتا ہے اور جس شخص کے نصیب میں محرومی ہو' ولی اس کے سامنے کوئی بھی معرفت کی بات بیان نہیں کر سکتا۔ گویا لوگوں کے لیے ولی کی مثال اس پتھر کی مانند ہے کہ جب بنی اسرائیل اس کے پاس پہنچے تو وہاں سے پانی کے بارہ چشمے پھوٹ نکلے لیکن جب کفار اس پتھر کے پاس پہنچے تو اس میں سے پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں نکلا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے خود کئی مرتبہ اس بات کا مشاہدہ کیا ہے کہ جب حضرت کے سامنے کوئی غیر معتقد شخص بیٹھا ہوا ہوتا تو آپ کے منہ سے معرفت کی کوئی ایک بات بھی نہیں نکلتی اور جب وہ شخص اُٹھ کر چلا جاتا تو آپ معارف بیان کرتے۔ آپ اکثر ہمیں یہ ہدایت کرتے کہ جب کوئی غیر معتقد شخص بیٹھا ہوا ہو تو اس کے سامنے مجھ سے کوئی سوال نہ کیا کرو۔ آپ کی اس ہدایت سے پہلے ہم اکثر غیر معتقدین کے سامنے آپ سے سوال کیا کرتے تھے تاکہ آپ کی زبانی ظاہر ہونے والے معارف کو سُن کر وہ شخص اپنے نظریے کی اصلاح کر کے آپ کا حلقہ بگوش ہو جائے لیکن جب ہم سوال کرتے تو یوں محسوس ہوتا کہ آپ کی شخصیت بدل گئی ہے' ہم آپ سے اور آپ ہم سے واقف ہی نہیں ہیں اور آپ کی زبان سے کبھی بھی کوئی بھی معرفت کی بات صادر نہیں ہوئی پھر جب آپ نے اس نکتے کی وضاحت کی تو اس صورتِ حال کا بنیادی سبب ہماری سمجھ میں آیا۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں' بعض اوقات کوئی بزرگ لوگوں کے سامنے کسی گناہ کا ارتکاب کرتا دِکھائی دیتا ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہوتا بلکہ اس کی روح اس کی ذات کو محجوب کر دیتی ہے جس کی وجہ سے دیکھنے والوں کو ظاہری طور پر ایسا دِکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ ظاہری طور پر معصیت دِکھائی دینے والا عمل درحقیقت معصیت نہیں ہوتا مثلاً اگر کوئی ولی حرام چیز کھاتا ہوا دِکھائی دے تو وہ چیز اس نے صرف اپنے منہ میں ڈالی ہوگی اور پھر وہ جب چاہے جہاں چاہے اسے باہر پھینک دیتا ہے اس ظاہری معصیت کا بنیادی سبب حاضرین کی بدبختی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے اگر تم کسی ولی کو لوگوں کے سامنے کرامت ظاہر کرتے ہوئے دیکھو تو سمجھ جاؤ کہ حاضرین نیک بخت ہیں اور اگر ولی گناہ کا ارتکاب کرتا دِکھائی دے تو سمجھ جاؤ کہ حاضرین بدبخت ہیں۔

ایک دفعہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا' بعض اوقات ولی کی ذات پر شہود کی کیفیت طاری ہوتی ہے اس وقت اسے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں اس کا خاکی وجود فنا نہ ہو جائے اس لیے وہ ایسے افعال کا مرتکب ہوتا ہے جو اسے شعور و ادراک کی طرف واپس لے آئیں اگرچہ ظاہری طور پر وہ کوئی معیوب حرکت ہی کیوں نہ ہو جیسا کہ عام اصول ہے کہ دو بُرائیوں میں سے کم تر بُرائی کو اختیار کرنا چاہیے لہٰذا جب کوئی شخص ایسے کسی عمل کی بنیادی علت سمجھے بغیر ولی کو اس کا مرتکب دیکھے گا تو فوراً اعتراض کر دے گا اور ولی کی برکت سے محروم رہ جائے گا۔ عام شرعی حکم یہ ہے کہ اگر کسی عضو کی وجہ سے بقیہ جسم کے ہلاک ہونے کا اندیشہ ہو تو اس عضو کو کاٹ کر پھینک دیا جائے گا حالانکہ ذاتی طور پر اس عضو کا کوئی قصور نہیں ہے اس طرح اگر کوئی شخص بہت زیادہ بھوکا ہو یہاں تک کہ مرنے کا اندیشہ ہو تو اس کے لیے مردار کھانا جائز ہے اسی طرح کے دیگر بہت سے مسائل اسی اصول کے تحت آئیں گے اس مسئلے میں ہم اسی بیان پر اکتفاء کریں گے کیونکہ اس کی مزید تفصیل قارئین کے لیے اُلجھاؤ کا باعث بنے گی۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں' جب کسی غیر ولی کی شرم گاہ بے پردہ ہو جائے تو ملائکہ وہاں سے رخصت ہو جاتے ہیں کیونکہ ان پر حیا کا غلبہ ہوتا ہے یہاں شرم گاہ سے مراد ظاہری شرم گاہ ہے لیکن جب کسی ولی کی ظاہری شرم گاہ بے پردہ ہو جائے تو فرشتے وہاں سے نہیں جاتے کیونکہ کوئی ولی کسی خاص حکمت کے تحت یہ عمل کرتا ہے اس لیے ولی کو بے پردگی کی صورت میں بھی گناہ نہیں ہوگا۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے کہا' وہ ایسی کونسی مصلحت ہے جس کی وجہ سے کوئی ولی اپنی شرم گاہ کو بے پردہ کر دیتا ہے یا بُرے الفاظ استعمال کرتا ہے؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا' ہر وہ چیز جو ولی کو احساس و شعور کی طرف واپس لے آئے لہٰذا اگر کسی ولی کا شعور کشفِ عورت کی وجہ سے واپس آ سکتا ہے تو وہ اس کا مرتکب ہوگا اور اگر کسی کا شعور نازیبا الفاظ استعمال کرنے سے واپس آ سکتا ہے تو وہ اس طریقے کو اختیار کرے گا غرضیکہ کوئی سا بھی عمل ہو اس کا شعور واپس آنا چاہیے۔

ولی اور عالمِ محسوسات

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا' کیا ولی کی ذات عالمِ احساس سے غائب ہو جاتی ہے؟ نیز اسے عالمِ احساس کی طرف لوٹ آنے کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے؟

سیّدی دباغ نے جواب دیا' ولی کی ذات عالم احساس سے غائب ہو جاتی ہے اس کی مثال ہم یوں بیان کر سکتے ہیں جیسے ایک شخص کے پاس بہت سا مال و دولت ہو اور وہ خود بوڑھا ہو چکا ہو یہاں تک کہ اس کی بینائی بھی رخصت ہو چکی ہو اور وہ کوئی بھی کام نہ کر سکتا ہو مزید ستم یہ ہو کہ اس کے بہت سے کم عمر بچے ہوں اور ان میں سے کوئی ایک بھی اس کے مال کی حفاظت کرنے کے لائق نہ ہو اور پھر وہ شخص اپنا مال تجارت کی غرض سے ایسے لوگوں کے سپرد کر دے جو ایسے موسم میں سمندری سفر پر نکلیں جس میں ہلاکت کا امکان غالب ہو جبکہ اس بوڑھے شخص نے اپنا سارا مال و متاع اس تجارتی سفر میں جھونک دیا ہو اب آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس بوڑھے کی ذہنی

کیفیت کیا ہوگی؟ وہ اپنی ذات سے بالکل بے پرواہ ہوگا اور اس کی پوری توجہ بحری تاجروں کی طرف مبذول ہوگی اس وقت اسے دو آفات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ایک یہ کہ اس کی بھوک اُڑ جائے گی کیونکہ پریشانی کی کثرت کی وجہ سے اس کے جسم میں خون کی روانی متاثر ہوگی اور کھانے سے متعلق رگیں سکڑ جائیں گی۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے ایک عالم کو دیکھا ہے جو حافظ بھی تھا اور اس کا دماغ اُلٹ گیا تھا اور ہر وقت سونا بنانے کے نسخوں اور خزانوں کی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا اس نے لوگوں سے ملنا جلنا ختم کر دیا تھا اس کا رنگ زرد ہو چکا تھا اور بھوک ختم ہو چکی تھی اور دن بدن اس کی صحت بگڑتی چلی گئی یہاں تک کہ اس کا انتقال ہو گیا اس کی بنیادی وجہ وہی ہے کہ دورانِ خون متاثر ہونے سے رگیں سکڑ جاتی ہیں' بھوک ختم ہو جاتی ہے اور انسان موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔

(سیّدی دباغ فرماتے ہیں) اس بوڑھے کو دوسری آفت یہ درپیش ہوگی کہ جب کچھ عرصے تک اس کی توجہ مکمل طور پر بحری تاجروں کی طرف مبذول رہے گی تو کچھ ہی دن بعد اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر جائے گی کیونکہ روح کو پہلے مجبوراً اس کے جسم میں داخل ہونا پڑا تھا اور جب اسے جسم کی قید سے نکلنے کا موقع ملا تو وہ وہاں سے نکل گئی اور روح جب ایک مرتبہ جسم سے نکل جائے تو واپس نہیں آتی لہٰذا اگر اللہ کی مرضی یہ ہو کہ اس بوڑھے کی عمر ختم ہونے والی ہے تو بیماریاں اسے گھیر لیں گی اور آخر کار وہ مر جائے گا لیکن اگر اس کے مقدر میں مزید زندہ رہنا ہو تو وہ پاگل ہو جائے گا لہٰذا اب اگر کوئی شخص اس بوڑھے کی توجہ اس کے مالِ تجارت سے ہٹا دے تو وہ بوڑھا ان دونوں آفتوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں' اولیاء پر بھی اسی طرح محویت کا عالم طاری ہوتا ہے لہٰذا وہ اپنے شعور اور احساس کو واپس لانے کے لیے اس طرح کی حرکتیں کرتے ہیں اس لیے کسی کو بھی ان پر اعتراض کرنے کا حق نہیں ہے کیونکہ ان کا مقصد درست ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی طبعی عمر تک زندہ رہتے ہیں اور لوگ ان سے فیض یاب ہوتے ہیں (لیکن اگر وہ اس طرح کی حرکات نہ کریں تو عین ممکن ہے کہ ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر جائے)

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) بعض اوقات ہم سیّدی دباغ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور آپ ہمیں حکم دیتے کہ شور کرو اس سے تمہیں فائدہ حاصل ہوگا۔ ایک مرتبہ فرمایا مشاہدہ کرنے والے ولی کی مثال ایک ایسے شخص کی ہے جس نے ایک پرندے کو ڈور سے باندھ رکھا ہو اور وہ پرندہ بلندی پر اُڑ رہا ہو اچانک ہوا چلنے لگے تو اب یہ شخص اس اندیشے کا شکار ہو کہ کہیں ہوا اس پرندے کو اُڑا کر دُور نہ لے جائے اس لیے وہ ڈور کو آہستہ آہستہ اپنی طرف کھینچنا شروع کرے گا اور اسے یہ اندیشہ بھی ہوگا کہ جلدی کھینچنے کی صورت میں کہیں ڈور ٹوٹ نہ جائے یہاں تک کہ وہ پرندہ واپس اس کے ہاتھ میں آ جاتا ہے۔ بالکل یہی کیفیت انسانی وجود کی ہے کہ جسدِ خاکی جن امور کا عادی ہو وہی امور انسان کو حواس کی دنیا میں واپس لے آتے ہیں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) صوفیاء کے اس نوعیت کے بہت سے واقعات مشہور ہیں اور اگر ہم انہیں یہاں ذکر کرنا شروع کریں تو اپنے موضوع سے بہت دُور ہو جائیں گے۔

ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا' ولی کے وجود کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اس کے ذریعے اللہ کی طرف رہنمائی حاصل کی جائے اور ماسوا سے توجہ ہٹالی جائے لہٰذا جب کوئی مرید کسی شیخ سے معرفت کا سوال کرے گا تو اسے بہت فائدہ ہوگا لیکن اگر وہ دنیاوی حاجات کی تکمیل کی درخواست کرے گا تو ولی اس سے ناراض ہو جائے گا اور عین ممکن ہے کہ وہ مرید اپنے اس سوال کی بدولت کسی ناگوار صورتِ حال کا شکار ہو جائے اس کی وجہ یہ ہے کہ گویا اس مرید کو اس شیخ کے ساتھ اللہ کے لیے محبت نہیں ہے بلکہ اس کی محبت صرف ظاہری ہے اور ظاہری محبت خسارے کا سودا ہے ایسا شخص فیض سے محروم رہتا ہے پھر اس بات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جب ولی اس مرید کی توجہ دنیا کی طرف مائل دیکھتا ہے تو اس کی توجہ اللہ کی طرف مبذول کروانے کی کوشش کرتا ہے جبکہ مرید بدستور دنیا کی طرف ہی متوجہ رہنا چاہتا ہے۔ گویا ولی اسے کھجور کھلانا چاہتا ہے اور وہ اپنے منہ میں انگارہ رکھنا چاہتا ہے کیونکہ دنیا کی محبت انگارے کی مانند ہے جبکہ اللہ کی معرفت اور دنیا سے بے رغبتی کی مثال کھجور کی طرح ہے اسی مسئلے کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ اگر ولی اس شخص کی خواہشات کی تکمیل میں اپنا تصرف ظاہر کرے پھر وہ شخص اس غلط فہمی کا شکار ہو سکتا ہے کہ شاید معرفت اسی چیز کا نام ہے اور یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے اسی لیے دنیا طلب کرنے پر ولی ناراضگی کا اظہار کرتا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ناراضگی کے اظہار کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات ولی اس شخص کے سامنے بظاہر کوئی خلافِ شریعت حرکت کرتا ہے یا پھر کسی چیز کی پیش گوئی کرتا ہے جو پوری نہیں ہوتی اس طرح وہ شخص بددل ہو کے اس ولی سے لاتعلقی اختیار کر لیتا ہے۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں' صوفیاء کا سماع مشاہدۂ حق پر مبنی ہوتا ہے جو چیز وہ سنتے ہیں اس کی مثال کشتی کی مانند ہوتی ہے جس کی مدد سے سمندر کو عبور کیا جاتا ہے لہٰذا وہ ان امور پر اعتماد کر کے ان کی مدد سے ان چیزوں کا مشاہدہ کرتے ہیں جنہیں بیان نہیں کیا جا سکتا اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کی ذات بے نظیر و بے مثال ہے اور انسان کا خاکی وجود سہاروں کا محتاج ہے لہٰذا یہ حادث الفاظ ہی اس کا سہارا بنتے ہیں۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں' جب کسی ولی کا مشاہدہ وسیع ہو جائے اور اس کا شمار اکابرین میں ہونے لگے تو اس وقت اس کا عشقِ حقیقی ظاہری صورت میں مجازی عشق کے قریب ہو جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کیفیت میں وہ صوفی مخلوقات میں اللہ تعالیٰ کے افعال کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس مشاہدے کے نتیجے میں حاصل ہونے والے سرور کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا یہاں تک کہ ایک مرتبہ کسی بزرگ نے ایک بلی کو اپنی گردن کھجاتے ہوئے دیکھ لیا تو ان پر خشیت طاری ہو گئی اور زار و قطار رونے لگے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا' اس کا سبب کیا ہے؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا اس کی

وجہ یہ ہے کہ اس بزرگ نے بلی کے اس عمل میں اس بات کا مشاہدہ کیا کہ اس فعل میں فاعلِ حقیقی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور یہی دیکھ کر ان پر خشیت طاری ہو گئی۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں' مشاہدے کی یہ کیفیت ولی کو ہر وقت حاصل ہوتی ہے البتہ جب انسان کی ذات میں شعور موجود نہ ہو تو جسم روح کی موافقت میں حرکت کرتا ہے لیکن اگر شعور اور احساس باقی ہو تو عقل جسم کو ایسی حرکات کے ارتکاب سے روکتی ہے تاکہ اس کا ظاہری وجود سلامت رہے۔ چنانچہ آپ کو کبھی ایسا منظر دِکھائی دے گا کہ کسی ولی نے کسی درخت کی جھومتی ہوئی شاخ کو دیکھ کر خود بھی جھومنا شروع کر دیا اسی لیے لوگ کہتے ہیں کہ اگر محبوب پتھر بھی مارے تو وہ پھولوں سے زیادہ اچھا لگتا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ اس فعل کے مشاہدے کے وقت جو لذت اور سرور حاصل ہوتا ہے' اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔

''فتح'' ظاہری حالت پر اثر انداز نہیں ہوتی

سیّدی دباغ فرماتے ہیں' جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو فتح نصیب کرتا ہے تو اس وقت اس کی جو حالت ہوتی ہے' بقیہ ساری زندگی وہ اسی حالت میں قائم رہتا ہے۔ مثلاً فتح کے حصول کے وقت اگر وہ قصاب تھا تو بعد میں بھی قصاب رہے گا کیونکہ باطنی حالت کے ساتھ ظاہری حالت کو تبدیل کر لینا تصنع ہے اور صاحبِ فتح ولی کے نزدیک تصنع سب سے بڑا گناہ ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں' شام کے شہر رملہ میں ایک شخص کو اس حالت میں فتح نصیب ہوئی کہ لوگ اس کا مذاق اُڑاتے تھے جیسے ہمارے ہاں فاس میں معیز و نامی شخص کا مذاق اُڑایا جاتا ہے اور پھر فتح کے حصول کے بعد بھی اس کی یہی کیفیت باقی رہی۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) معیز و نامی شخص کی حالت یہ ہے کہ بچے سارا دن اس کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں اور اس کا مذاق اُڑاتے رہتے ہیں۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں' میں ایک ایسے شخص سے واقف ہوں جسے اللہ تعالیٰ نے فتح عطا فرمائی ہے اور فتح کے حصول سے پہلے وہ ڈھول بجایا کرتا تھا اور فتح کے حصول کے بعد بھی اس نے اس پیشے کو ترک نہیں کیا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے اس بارے میں سیّدی عبدالعزیز دباغ کی زبانی بہت سے اسرار سنے ہیں جنہیں یہاں درج نہیں کیا جا سکتا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

چھٹا باب

شیخ تربیت کا بیان

اس باب میں ضمنی طور پر سیّدی عبدالعزیز دباغ کے ان مشائخ کا تذکرہ بھی شامل ہوگا جن کی روحانی وراثت سیّدی دباغ کو حاصل ہوئی اس کے ساتھ تلقین ذکر، اسماء حسنیٰ اور حضوری کے بارے میں حضرت کے بعض ملفوظات بھی نقل کیے جائیں گے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) قصیدہ رائیہ کے مصنف نے شیخ تربیت کے بارے میں بعض فوائد ذکر کیے ہیں۔ سیّدی دباغ نے ان میں سے بعض اشعار کی وضاحت کسی مجلس میں بیان کی تھی کیونکہ میرا مقصد حضرت کے ملفوظات کو مرتب کرنا ہے اس لیے میں نے پسند کیا کہ ان تشریحات کو یہاں نقل کروں۔ شاعر کہتا ہے:

ولـلـشيـخ ايـات اذا لـم تـكـن لـه

فـمـا هـو الا فـي لـيـالي الهوىٰ ليسرى

''پیر کی کچھ نشانیاں ہیں اگر یہ کسی شخص میں نہ پائی جائیں تو سمجھ لو کہ وہ گمراہی کی تاریکی میں بھٹک رہا ہے۔''

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، شیخ طریقت کی علامات واضح ہیں کہ اس کے دل میں مخلوق میں سے کسی ایک کے لیے بھی کوئی غبار نہ ہو یعنی وہ اس سوچ کا مالک ہو کہ پوری اُمت میں کوئی بھی شخص میرا دشمن نہیں ہے۔ (وہ شیخ) سخی ہو اگر کوئی اس سے کسی چیز کا سوال کرے تو وہ شیخ جواب میں کنجوسی کا مظاہرہ نہ کرے اگر کوئی اس کے ساتھ کسی قسم کی کوئی زیادتی کرے تو یہ اس سے محبت کرے۔ مریدین سے صادر ہونے والی غلطیوں سے چشم پوشی کرے اگر کسی شخص میں یہ خصوصیات موجود نہ ہوں تو وہ شیخ تربیت بننے کا اہل نہیں ہے۔

اذا لـم يـكـن عـلـم لـديـه بـظـاهـر

ولا بـاطـن فـاضـرب بـه لجج البحر

''اگر اسے ظاہری و باطنی علم نہ ہو تو اسے سمندر کی لہروں کے سپرد کر دو۔''

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، علم ظاہر سے مراد علم فقہ اور علم توحید (علم کلام) کی وہ مقدار ہے جسے سیکھنا ہر

مکلف پر فرض ہے جبکہ علم باطن سے مراد معرفتِ الٰہیہ ہے۔

وان کـــان الا انـــه غیـــر جـــامع
لـو صـفیهـمـا جمعا علی اکمل الامر
فـــاقـرب احـوال الـعـلیل الی الردی
اذا لـم یـکـن منه الطبیب علی الخبر

''اور اگر کوئی مکمل طور پر ان دونوں خصوصیات (یعنی علم ظاہر و علم باطن) سے متصف نہ ہو تو پھر (اس کے پاس جانے والے مرید کی حیثیت) اس مریض کی سی ہوتی ہے جس کی بیماری سے طبیب آگاہ نہ ہو اور اس وجہ سے وہ موت کے قریب پہنچ جائے۔''

سیّدی دباغ فرماتے ہیں اگر کسی شیخ میں علم ظاہر و علم باطن موجود نہ ہو تو مرید تباہ ہو جاتا ہے کیونکہ یہ شیخ اپنی کم علمی کے باعث یہ نہیں جان سکتا کہ کونسی شے مرید کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے؟ (سیّدی دباغ فرماتے ہیں) میرے شیخ سیّدی منصور فرمایا کرتے تھے جب تمہیں کوئی کامل پیر مل جائے تو پھر اپنی مراد کو شیخ کی مراد کے سامنے فنا کر دو اور یہی آرزو رکھو کہ شیخ کے بعد تم بھی زندہ نہ رہو کیونکہ اس کے بعد تم کسی اور (شیخ) کی صحبت میں سلامت نہیں رہ پاؤ گے اور پھر (اسی دوسرے شیخ سے) تمہارا ملنا (تصوف کے اصولوں اور روایات کی رو سے) نہایت عجیب و غریب بات ہوگی۔

ومـن لـم یـکـن الا الـوجـود اتـامـه
واظهــره مـــنشـــور الـــریة الـنـصـر
فـــاقبـــل ارباب الارادة نـحـــــوه
بصدق یحل العسر فی حلمد الصخر
وایتـــه ان لا یـــمـیـــل الـــی الهوی
ودنیـــاه فـی طبـی و آخـراه فـی نشر

''اور اگر کوئی شخص خود ہی سجادۂ مشیخیت پہ بیٹھ جائے اور پھر اللہ تعالیٰ کی مدد بھی اس کے شاملِ حال ہو لوگ ارادت کے حصول کے لیے اس کا رُخ کریں اور ان کی ارادت اتنی سچی ہو کہ سخت پتھروں کو بھی ریزہ ریزہ کر سکتی ہو تو ایسے شخص کی نشانی یہ ہوگی کہ وہ نفسانی خواہشات کی طرف مائل نہیں ہوگا اور دنیا کی بجائے آخرت کو پیشِ نظر رکھے گا۔''

سیّدی دباغ فرماتے ہیں' اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو اس کے پیر نے باقاعدہ طور پر خلافت نہ دی ہو اور اس کی تربیت کی تکمیل سے پہلے اس پیر کا انتقال ہو جائے لیکن لوگ اس شیخ کو اس کے پیر کا روحانی جانشین تصور کر لیں۔ گویا زبانِ خلق نقارۂ خدا کی حیثیت اختیار کر جائے اور پھر اس کے مریدین بھی شیطان کے حملوں سے

محفوظ رہیں اور اللہ تعالیٰ کی مدد ان کے شاملِ حال ہو اور پھر پاک طینت اور نیک نیت مریدین اسے اپنا شیخ تصور کر لیں تو ایسا شخص بھی اللہ کے ہاں مقبول ہوگا کیونکہ اس بات کا امکان موجود ہے کہ شاید رجالِ غیب میں سے کسی نے اس کی تربیت مکمل کی ہو یا اس نے حضرت خضر علیہ السلام کے دستِ اقدس پر بیعت کر لی ہو۔ شاعر نے اس کی علامت یہ بیان کی ہے کہ اگر وہ شخص دنیا سے روگرداں ہو کر آخرت کی طرف مائل ہو اور بظاہر نفسانی خواہشات کا شکار نظر نہ آئے تو یہ اس بات کی نشانی ہوگی کہ وہ شخص سجادۂ مشیخیت پر بیٹھنے کا حق دار ہے۔ شاعر نے آخری مصرع میں اسی شخص کے زہد کی طرف اشارہ کیا ہے یعنی وہ شخص دنیا سے بے رغبت ہوتا ہے اور دنیا سے اعراض کرتا ہے۔

وان کان ذا جمع لا کل طعامہ

مرید فلا تصحبہ یوما من الدھر

''اگر کوئی شیخ لوگوں کو صرف کھانا کھلانے کے لیے جمع کرتا ہو تو تم کبھی بھی اس کی صحبت اختیار نہ کرنا۔''

سیّدی دباغ فرماتے ہیں' اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص صرف اس نیت سے لوگوں کو اپنے پاس جمع کرتا ہے کہ وہ انہیں کھانا کھلا دے تو تم کبھی ایسے شیخ کی صحبت اختیار نہ کرنا کیونکہ یہ اجتماع صرف کھانے کے لیے منعقد ہوا ہے اس لیے اس میں روحانیت کا کوئی عمل دخل نہیں ہوگا البتہ اگر کوئی شخص لوگوں کو اللہ کی رضا کے لیے جمع کرتا ہے اور پھر انہیں کھانا بھی کھلا دیتا ہے تو ایسے شخص کی ہم نشینی میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ولا تسالن عنہ سوی ذی بصیرۃ

خلی من الاھواء لیس بمغتر

''اگر تم نے کسی شیخ کا پتہ دریافت کرنا ہو تو کسی صاحبِ بصیرت شخص سے پوچھو جو نفسانی خواہشات سے پاک ہو اور کسی دھوکے کا شکار نہ ہو۔''

سیّدی دباغ فرماتے ہیں' شاعر نے کسی شیخ تربیت کا پتہ معلوم کرنے کے لیے رہنما شخص کی خصوصیات ذکر کی ہیں۔ ایک یہ کہ صاحبِ بصیرت ہو' یہ شرط اس لیے عائد کی تا کہ جس شیخ کی طرف وہ تمہاری رہنمائی کرے گا' وہ محض سالک نہ ہو جس کو قلبی معاملات کی کوئی خبر نہیں ہوتی کیونکہ ایسا شخص تمہیں کسی ایسے شخص کے بارے میں بتائے گا جو اس سے زیادہ عبادت گزار' مجاہدہ کرنے والا اور کثرت سے وظائف پڑھنے والا ہوگا اگر تم ایسے شیخ کے ہتھے چڑھ گئے تو تمہارے نزدیک بھی ولایت کی انتہا یہی ہوگی کیونکہ ان سالکین کے نزدیک اوراد و وظائف کی کمی وبیشی ہی کسی شخص کے مرتبے ومقام کا تعین کرتی ہے اس لیے ایسا کوئی سالک شیخ تربیت بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ شاعر نے دوسری شرط یہ عائد کی ہے کہ تمہارا رہنما نفسانی خواہشات کا اسیر نہ ہو کیونکہ اس صورت میں وہ صاحبِ بصیرت ہونے کے باوجود کسی اور شخص کی طرف طبعی میلان رکھتا ہوگا اور صرف اپنی ذاتی پسند کے سبب تمہیں بھی اس کی طرف بھیج دے گا۔ نیز ایسا شخص اپنے کسی ذاتی تعصب کی بنیاد پر کسی صحیح شیخ کی طرف تمہاری

رہنمائی نہیں کر سکے گا یا وہ خود شیخ کامل کے اوصاف سے لاعلم ہوگا اور کسی مجذوب کی چند ظاہری کرامات دیکھ کر تمہیں اس کے پاس جانے کا مشورہ دے گا حالانکہ مجذوب شیخ تربیت بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

فمن صدئت مراة فهمه

ارته بوجه الشمس من كلف البدر

ومن لم يكن يدرى العروض فربما

يرى القبض فى التطويل من اقبح الكسر

''جس کی عقل پر پردہ پڑ جائے' اُسے سورج میں بھی چاند کی طرح کا داغ نظر آتا ہے اور جو شخص علم عروض سے ناواقف ہو وہ بحر طویل میں قبض کو انتہائی ناپسند کرے گا۔''

سیدی دباغ فرماتے ہیں' جس شخص کی عقل پر پردہ پڑ گیا ہو' اسے سورج میں بھی ویسا ہی داغ نظر آتا ہے جیسے چاند میں موجود ہے کیونکہ ایسا شخص حقیقت کو تسلیم کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا یعنی جو شخص صاحب بصیرت نہ ہو' اسے کامل شیخ میں بھی خامیاں دِکھائی دیں گی اور وہ اس کامل شیخ کو چھوڑ کر کسی وظیفے پڑھنے والے کے پیچھے لگ جائے گا اسی طرح علم عروض کی مثال دینے کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص صوفیاء کی مقرر کردہ شرائط سے ناواقف ہوگا' وہ اپنی لاعلمی کے باعث کسی کامل شیخ کو بھی مبتدی تصور کرے گا اور کسی مجذوب کی طرف تمہاری رہنمائی کر دے گا حالانکہ مجذوب کسی کی تربیت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) تمام گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ جب کوئی شیخ علم ظاہر و علم باطن سے ناواقف ہو یا آگاہ ہو لیکن آگاہی ناقص ہو تو ایسے شخص کے مرید ہونے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا لیکن اگر وہ ان دونوں علوم سے صحیح طور پر واقف ہو اور اس میں مذکورہ بالا دیگر تمام صفات بھی پائی جاتی ہوں تو ایسا شخص مریدین کی تربیت کر سکتا ہے لیکن اگر کسی مرید کی تربیت کے دوران اس کا شیخ انتقال کر جائے اور اس شیخ نے اسی مرید کو اپنا روحانی وارث بنانا تھا لیکن اس مرید کی تربیت پوری ہونے سے پہلے اس شیخ کا انتقال ہو جائے اور اس مرید پر فتح اور فیض کے آثار دِکھائی دیں' وہ دنیا سے بے رغبت ہو کے آخرت کی طرف متوجہ ہو اور چند مریدین اس کی تربیت کے بعد فتح حاصل کر لیں تو ایسا شخص بھی شیخ تربیت بن سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص (ختم کے نام پر) لوگوں کو صرف کھانے کے لیے اکٹھا کرتا ہے تو ایسے شخص کا مرید ہونا بے فائدہ ہے نیز اگر کوئی شخص کسی کامل شیخ کا پتہ دریافت کرنا چاہے تو اسے ایسے شخص سے معلومات حاصل کرنا چاہیے جس میں مذکورہ بالا تین صفات پائی جاتی ہیں کیونکہ کوئی دوسرا شخص اس کی غلط رہنمائی بھی کر سکتا ہے۔

اس کے بعد شاعر ان آداب کا ذکر کرتا ہے جو کسی کامل شیخ کی موجودگی میں مرید پر لازم ہوتے ہیں۔

ولا تقعدن من قبل اعتقادك انه

مرب ولا اولى بها منه فى العصر

فــان رقيــب الالتــفــات بــغيــره
يــقــول لــمـحـبـوب الســرايــه لاتســر

''جب تک تمہارا یہ اعتقاد نہ ہو کہ تمہارا شیخ ہی تمہاری تربیت کرسکتا ہے اور اس وقت کوئی دوسرا شیخ میرے پیر سے افضل نہیں ہے (اس وقت تک تمہیں فیض حاصل نہیں ہوگا) کیونکہ رقیب محبوب کی توجہ کسی اور کی طرف مبذول نہیں ہونے دیتا۔''

سیّدی دباغ فرماتے ہیں' تم اس وقت تک کسی شیخ کے مرید نہ بنو جب تک تمہیں یہ اعتقاد حاصل نہ ہو کہ وہ شیخ تربیت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس وقت اس سے اچھا شیخ اور کوئی نہیں ہے کیونکہ اگر مرید کی توجہ کسی اور کی طرف مبذول ہوگی تو شیخ اپنا فیض اسے نہیں دے گا کیونکہ جب اس کی توجہ کسی دوسرے شیخ کی طرف مبذول ہوگی تو وہ یہی سمجھے گا کہ وہ دوسرا شیخ میرے پیر سے زیادہ کامل ہے اس طرح وہ دونوں مشائخ کے فیض سے محروم ہو جائے گا۔ (سیّدی دباغ فرماتے ہیں) ہمارے زمانے میں اس بات کا عام رواج ہے۔

ومــن بــعــده الشيــخ الــذى هــو قــدوة
يــلــقــى مــراد الــحــق فــى الســر والجهر

''اس کے بعد یہ اعتقاد بھی ہو کہ یہی شیخ میرا پیشوا ہے اور ظاہری اور باطنی ہر اعتبار سے یہی مجھے منزلِ مقصود تک پہنچا سکتا ہے۔''

سیّدی دباغ فرماتے ہیں' جب تم کسی کامل شیخ کے مرید بن جاؤ تو یہی خیال کرو کہ اب یہی شیخ میری تربیت کرسکتا ہے کیونکہ وہ شیخ تمہارے نفس کی اصلاح کرے گا جس کے نتیجے میں تمہیں معرفت حاصل ہوگی لہٰذا ایسے شخص کا وجود نہایت ضروری ہے جو تمہیں کسی کامل شیخ کی بارگاہ میں حاضری کے آداب سکھائے کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو تمہاری مثال ایک ایسے مریض کی مانند ہوگی جس کا کوئی طبیب نہیں ہے اور اس وقت تم جس طرح کا چاہو' طرزِ عمل اختیار کرلو گے۔

نــقــم واجتــنــب مــاذمــه العلم واجتلب
لــمــا خــصــه بــالــمــدح فهو جنى الدر

''لہٰذا اُٹھو اور اس بات سے پرہیز کرو جو قابلِ مذمت ہو اور وہ چیزیں اختیار کرو جو قابلِ تعریف ہوں (میری یہ بات) ایک ایسا موتی ہے جسے حاصل کرنا چاہیے۔''

سیّدی دباغ فرماتے ہیں' جب اللہ تعالیٰ تمہیں کامل شیخ عطا فرما دے تو تم اس کی خدمت میں مشغول ہو جاؤ اور اس کے حقوق کی معرفت حاصل کر کے اسے اللہ تک رسائی کا وسیلہ بناؤ لیکن یہ بات پیش نظر رہے کہ جن امور کو شریعت نے ممنوع قرار دیا ہے' ان سے بچتے رہو اور جن کاموں کی شریعت نے تعریف کی ہے' انہیں بجا لاؤ اور یہ نصیحت ایک چنے ہوئے موتی کی طرح قیمتی ہے۔ گویا تمہیں تقویٰ اختیار کرنے کی ترغیب دی گئی ہے کیونکہ حرام

سے بچنا اور حلال اختیار کرنا ہی تقویٰ ہے جس کی بنیاد پر دیگر احوال و مقامات نصیب ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل کی بدولت ہمیں بھی یہ نعمت عطا کرے۔

وان تسم نحو الفقر نفسك فاطرح

هو اها و جانبه مجانبة الشر

''اگر تم تصوف کا راستہ اختیار کرنا چاہتے ہو تو اپنی خواہش کی پیروی سے اس طرح بچو جیسے کسی شر انگیز چیز سے بچا جاتا ہے۔''

سیّدی دباغ فرماتے ہیں' اگر تم فقر کے راستے یعنی تصوف کے راستے پر چلنا چاہتے ہو تو پھر تمہیں اپنی ہر پسند سے ہاتھ دھونا پڑے گا خواہ اس کا تعلق نفلی عبادت سے ہی کیوں نہ ہو (یاد رکھو) شیخ کی ہدایت کے بغیر ہر قسم کی نفلی عبادت سے اسی طرح پرہیز کرو جیسے کسی بُرائی سے بچا جاتا ہے کیونکہ مرید صرف شیخ کے مقرر کردہ اوراد و وظائف کی بدولت ہی حقیقی کامیابی حاصل کرسکتا ہے اور اگر وہ اپنی پسند کے مطابق عمل کرنا شروع کرے گا تو تباہ ہو جائے گا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) بہت سے مریدین اسی وجہ سے برباد ہوئے ہیں کیونکہ بعض اوقات مرید کے اپنے اختیار کردہ نوافل کی ادائیگی کے نتیجے میں مرید میں ریاکاری کا احساس پیدا ہو جاتا ہے اور یوں اس کا عمل غیر اللہ کے لیے ہوتا ہے لہٰذا اگر اللہ تعالیٰ اس پر فضل فرمائے اور اس کی توجہ صرف اپنے شیخ کی طرف مبذول ہو تو شیخ اس کے اندر موجود خرابی کو پہچان کر اسے دُور کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اگر مرید شیخ کی ہدایت پر عمل کرے اور اللہ تعالیٰ کی عنایت بھی مرید کی شاملِ حال ہو تو شیخ مرید کو ایسے عمل کی تلقین کرتا ہے جو اللہ کی رضا کا باعث ہو لیکن اگر کوئی مرید شیخ کی ہدایت کو نظر انداز کر دے اور یہ کہے کہ ہم تو اس شیخ کے پاس اس لیے آئے تھے تاکہ زیادہ نیکیاں کریں اور یہ پہلی نیکیاں بھی چھوڑنے کی ہدایت کر رہا ہے تو ایسے مرید کا نظریہ شیخ کے بارے میں تبدیل ہو جاتا ہے اور شیطان اس پر حملہ کر کے اسے ریاکاری کا شکار کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔

صحابہ کرام کا واقعہ

ہم یہاں بعض صحابہ کا ایک واقعہ نقل کریں گے۔ ایک مرتبہ چند صحابہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خانۂ اقدس کے دروازے پر حاضر ہوئے (آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت گھر میں موجود نہیں تھے) ان صحابہ نے اُم المؤمنین سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت و ریاضت کے بارے میں دریافت کیا تو اُم المؤمنین نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولاتِ عبادت سے انہیں آگاہ کیا۔ (انہیں یہ عبادت ظاہری طور پر کچھ کم محسوس ہوئی) مگر وہ کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنا خاص فضل و کرم کیا ہے اس لیے ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مانند نہیں ہو سکتے (ہمیں زیادہ عبادت کرنا چاہیے) ایک نے کہا' میں ہمیشہ روزانہ روزہ رکھا کروں گا۔ دوسرے نے کہا' میں ساری رات نوافل ادا کیا کروں گا اور سونے سے بچوں گا۔ تیسرے نے کہا' میں کبھی بھی

نکاح نہیں کروں گا۔ (یہ کہہ کر تینوں حضرات چلے گئے) بعد میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو اُم المؤمنین نے تینوں حضرات کے اقوال کا تذکرہ کیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بُلوایا اور ارشاد فرمایا:

''میں تم سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں' تم سے زیادہ پرہیز گار ہوں اور تم سے زیادہ صاحب علم ہوں (لیکن اس کے باوجود) میں کبھی روزہ رکھتا ہوں اور کبھی نہیں رکھتا' کبھی ساری رات قیام کرتا ہوں اور کبھی (کچھ دیر کے لیے) سو جاتا ہوں اور میں ازدواجی زندگی بھی بسر کر رہا ہوں۔ پس جو شخص میری سنت کے برعکس عمل کرے گا' وہ میرا (حقیقی پیروکار) نہیں ہوگا۔''

اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ○ (المائدہ'۵:۸۷)

''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے جو پاکیزہ اشیاء حلال قرار دی ہیں (انہیں تم خود) حرام قرار نہ دو اور (اپنی مخصوص) حد سے تجاوز نہ کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

یہ تینوں حضرات کون تھے؟ اس بارے میں احادیث کے راویوں کی آراء مختلف ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ حضرات حضرت عثمان بن مظعون' حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابوہریرہ تھے۔ بعض نے حضرت سعد بن ابی وقاص کا نام ذکر کیا ہے' بعض نے حضرت علی بن ابوطالب اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص جبکہ بعض نے حضرت ابوبکر صدیق کا نام ذکر کیا ہے۔ رضی اللہ عنہم

آپ اسی ایک واقعہ پر غور کر لیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابہ کرام کی کثرت نوافل کی خواہش کو کس طرح ختم کیا اور اپنی ذاتی پسند کے مطابق انہیں عبادات میں میانہ روی اختیار کرنے کی تلقین کی جو مشائخ اپنے مریدین کو (ظاہری طور پر) کثرت نوافل سے پرہیز کی تلقین کرتے ہیں یہ اس کی سب سے زیادہ مضبوط دلیل ہے البتہ جو لوگ مرتبہ مشیخیت پر فائز نہیں ہیں' وہ ہمارا موضوع بحث نہیں ہیں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک مرتبہ ایک شخص میری موجودگی میں ایک شیخ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لیے آیا۔ یہ شخص بہت زیادہ عبادت کیا کرتا تھا' روزانہ رات کو ایک مرتبہ قرآن پورا پڑھتا' دن کے وقت کئی مرتبہ ''دلائل الخیرات'' کا ورد کرتا اور روزانہ روزہ رکھتا۔ (کثرت عبادت کے باعث) اس کا رنگ زرد ہو چکا تھا اور وہ نیم جان دکھائی دیتا۔ شیخ نے اس کی عبادت کم کرنا شروع کی یہاں تک کہ اسے نکتہ اعتدال تک لے آئے' ایک دن اس مرید کو مخاطب کر کے فرمانے لگے اللہ تعالیٰ نے تمہیں کتنی بڑی مشقت سے نجات عطا کی ہے؟ اس نے عرض کی' اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا کرے' پہلے میں صرف دکھاوے کے طور پر عبادت کیا کرتا تھا' اللہ تعالیٰ نے آپ کی برکت سے مجھے اس مصیبت سے نجات عطا کی ہے۔

ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا' اگر کوئی شخص سرے سے نوافل ادا ہی نہ کرے تو قیامت کے دن اس سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی لیکن اگر کوئی ریاکاری کی نیت سے نوافل ادا کرتا ہوں تو اسے اس عمل پر سزا ملے گی کیونکہ ریاکاری ایک بہت بڑا گناہ ہے۔

جو شخص اللہ تعالیٰ سے محجوب ہو اس میں ریاکاری کے جذبات پائے جاتے ہیں اور اگر کوئی شخص بہت زیادہ عبادت کرتا ہو اور یہ بات اس کے ذہن میں ہو کہ اس کے تمام اعمال اللہ تعالیٰ کی ہی عطا کردہ توفیق کا نتیجہ ہیں اور پھر کسی وقت اس کی توجہ اس بات سے ہٹ جائے تو وہ ریاکاری میں مبتلا ہو جائے گا۔

وضعها بحجر الشيخ طفلا فمالها
خروج بلا فطم من الحجر والحجر

''تم اپنے آپ کو شیخ کی گود میں ایک کمسن بچے کی طرح چھوڑ دو جو اس وقت تک (ماں کی گود سے) نہیں نکلتا جب تک اس کا دودھ زبردستی نہ چھڑوایا جائے۔''

سیّدی دباغ فرماتے ہیں' یعنی انسان اپنے آپ کو اس طرح شیخ کے سپرد کر دے جیسے کوئی کمسن بچہ ماں کی گود میں تربیت پاتا ہے اور تمہارا وجود اس وقت تک شیخ کے رحم و کرم پر رہے جب تک تربیت مکمل ہونے کے بعد شیخ خود تمہیں اجازت نہ دے۔ شعر میں موجود پہلے لفظ حجر سے مراد شیخ کی نظر اور اس کا تصرف ہے جبکہ دوسرے حجر سے مراد مرید کو ان تمام امور سے منع کرنا ہے جو اس کے فرائض کے منافی ہوں۔

ومن لم يكن سلب الارادة وصفه
فلا يطمعن في شم رائحة الفقر

''اگر کوئی مرید اپنا ارادہ نہیں ترک کر سکتا تو اسے فقر کی بو سونگھنے کی امید بھی نہیں ہونی چاہیے۔''

سیّدی دباغ فرماتے ہیں' یعنی مرید شیخ کے سامنے اس طرح حاضر رہے جیسے اس کا اپنا ارادہ اور خواہش ختم ہو چکے ہیں اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تو پھر اسے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ اسے تصوف کی خوشبو بھی نصیب ہو سکتی ہے۔

وهذا وان كان العزيز وجوده
ولكنه في العزم خال من العسر

''یہ خصوصیت اگرچہ کم پائی جاتی ہے لیکن اگر ارادہ مضبوط ہو تو یہ کام کچھ ایسا مشکل بھی نہیں ہے۔''

سیّدی دباغ نے فرمایا' روحانیت کے حصول کے لیے یہ بات شرط ہے کہ انسان اپنے ارادے سے دست بردار ہو جائے' عام طور پر یہ بات نہیں پائی جاتی لیکن اگر کوئی اس کا پختہ ارادہ کر لے تو یہ ناممکن بھی نہیں ہے۔

اس کے بعد قصیدہ رائیہ کا شاعر یہ بات کہتا ہے:

ولا تعترض يوما عليه فانه
كفيل بتشتيت المريد على هجر

''اپنے شیخ پر کبھی بھی اعتراض نہ کرو کیونکہ اس صورت میں تم شیخ سے دور بھی ہو سکتے ہو''۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں' مرید کو کبھی بھی اپنے شیخ پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اعتراض کی بدولت کوئی بھی مرید اپنے پروردگار' اپنے دین اور شیخ سے ہاتھ دھو سکتا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) یہ تشریحات قصیدۂ رائیہ کے حاشیے میں تحریر تھیں' میں نے انہیں شیخ کی زبانی نہیں سنا ہے بلکہ آپ نے اپنے دستِ اقدس سے ان الفاظ کو سپردِ قلم کیا تھا تاہم شیخ کا علم و فضل ان تشریحات سے کہیں زیادہ ہے اور میری یہ خواہش ہے کہ میں شیخ کے سامنے یہ قصیدہ پڑھوں اور آپ اپنی عام عادتِ مبارکہ کے مطابق اس کے اشعار کی تشریح فرمائیں اور ہمیں اسرار اور معرفت سے متعلق بہت سی چیزوں کا علم حاصل ہو۔ ان کے علاوہ بھی قصیدے میں چند اور اشعار موجود ہیں لیکن شیخ نے ان کی شرح تحریر نہیں کی ہے۔ پہلے میں نے یہ سوچا کہ کسی شرح کے بغیر تمام اشعار یہاں نقل کر دوں مگر پھر خیال آیا کہ ان کی مختصر اور جامع تشریح بھی لکھنی چاہیے۔

ومن یعترض والعلم عنہ بمعزل

یری النقص فی عین الکمال ولا یدری

''جو شخص اپنی جہالت کے باوجود شیخ پر اعتراض کرتا ہے' وہ ایک مکمل چیز کو ناقص قرار دیتا ہے لیکن اسے اس کا احساس نہیں ہوتا۔''

معترضین کے لیے نصیحت

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) یعنی جو شخص اپنے شیخ یا صوفیاء پر' خود جاہل ہونے کے باوجود اعتراض کرتا ہے تو گویا اس کی نظر میں ایک مکمل چیز نامکمل ہے مگر اسے اپنی ناسمجھی کا احساس نہیں ہو پاتا اس شعر میں شاعر نے ''عوارف المعارف'' کے مصنف (شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردی) کے اس قول کی ترجمانی کی ہے:

''جب کبھی کسی مرید کو اپنے شیخ کی کوئی بات یا عمل سمجھ میں نہ آئے تو اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا واقعہ یاد کر لینا چاہیے کہ کس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام کے بعض افعال پر اعتراض کیا تھا اور پھر جب حضرت خضر علیہ السلام نے ان افعال کے اسباب بیان کیے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا اعتراض واپس لے لیا لہٰذا جب کوئی مرید کم علمی کے باعث شیخ کے کسی عمل پر اعتراض کرے تو شیخ کو چاہیے کہ علم و حکمت کے ذریعے اپنے عمل کا سبب اس مرید کے سامنے ظاہر کر دے۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) قصیدۂ رائیہ درحقیقت ''عوارف المعارف'' کا منظوم اختصار ہے۔

شیخ ابوالحسن ششتری ارشاد فرماتے ہیں' مشائخ کے کسی بھی عمل پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے کیونکہ وہ (اللہ تعالیٰ کے) اذن کے ہمراہ اپنی (روحانی) بصیرت کی روشنی میں وہ کام کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ نہیں ہوتے جن کی آنکھوں کے سامنے حجابات موجود ہوں اور جو عالمِ ملکوت کو نہ دیکھ سکتے ہوں۔ ان کی عقل صرف ظاہر سے متاثر نہیں ہوتی' یہ لوگ حرکات و سکنات' کھانے پینے اور بول چال کے اعتبار سے عام لوگوں کی مانند ہوتے ہیں لیکن

دوسرے لوگ حجاب کا شکار ہوتے ہیں اس لیے صوفیاء کے افعال کی حقیقت سے کوئی صوفی ہی آ گاہ ہوسکتا ہے۔

ومن لم یوافق شیخه فی اعتقاده

یظل من الانکار فی لهب الجمر

''اگر کوئی شخص اپنے شیخ کے ساتھ عقیدت نہیں رکھے گا تو اپنے انکار کی وجہ سے انگاروں کے شعلوں میں جل جائے گا۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ شیخ کا ہر عمل درست ہوتا ہے اور مرید کو بھی یہی اعتقاد رکھنا چاہیے کہ اس کے شیخ کا ہر عمل بالکل درست ہے تو اس صورت میں وہ مرید کامیابی حاصل کر لے گا اگر وہ یہ سمجھنے لگے کہ شیخ نے فلاں کام غلط کیا ہے تو وہ اپنے اس انکار کی وجہ سے شیخ سے جدا ہو جائے گا اور یہ جدائی اتنی ہی نقصان دہ ہے جتنا آگ میں جلنا نقصان دے گا۔

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی فرماتے ہیں' مرید کے لیے یہ بات شرط ہے کہ وہ اس بات کا پختہ اعتقاد رکھے کہ اس کے شیخ کا ہر عمل اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ شریعت کے مطابق ہے۔ مرید کبھی بھی شیخ کو اپنے اوپر قیاس نہ کرے کیونکہ بعض اوقات شیخ ظاہری طور پر ایک مذموم حرکت کا مرتکب دِکھائی دیتا ہے لیکن باطنی طور پر وہی حرکت قابلِ تعریف ہوتی ہے اس لیے مرید کو ہر حال میں سرِ تسلیم خم رکھنا چاہیے۔ میں نے ایسے بہت سے مشائخ دیکھے ہیں جنہوں نے شراب کے پیالے کو منہ کی طرف بڑھایا اور ان کے منہ میں پہنچنے تک وہ شہد میں تبدیل ہو چکا تھا' دیکھنے والے نے اس ولی کو شراب منہ میں ڈالتے ہوئے دیکھا لیکن اس ولی نے منہ میں شہد ڈالا تھا اس طرح کے اور بھی بہت سے واقعات ہیں۔ میں نے ایسے بھی بہت سے لوگ دیکھے ہیں جو بعض اوقات اپنی روحانی قوت کے ذریعے ایسی صورتِ حال پیدا کر دیتے ہیں جیسے وہ خود کوئی کام کر رہے ہوں اور لوگ اس صورتِ حال کو دیکھ کر یہ کہتے ہیں کہ ہم نے خود اس بزرگ کو یہ کام کرتے ہوئے دیکھا ہے حالانکہ اس بزرگ نے جسمانی طور پر کوئی کام نہیں کیا ہوتا۔

مشہور صوفی بزرگ شیخ ابوعبداللہ المصلی جو قضیب البان کے نام سے مشہور ہیں' وہ اکثر یہی کام کرتے تھے اس کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگوں میں' میں نے اس بات کا مشاہدہ کیا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس بارے میں ہم سیّدی عبدالعزیز دباغ کے کچھ ملفوظات بھی نقل کر چکے ہیں جو معنوی اعتبار سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

فذو العقل لا یرضی سواه وان نای

عن الحق نای اللیل عن واضح الفجر

''عقل مند شخص اپنے پیر ہی سے وابستہ رہے گا اگرچہ وہ شیخ بظاہر حق سے اتنا ہی دُور ہو جتنی تاریک رات صبح سے دُور ہوتی ہے۔''

یعنی جس شخص کی عقل سلامت ہو اور فطرت درست ہو' وہ اپنے شیخ کے علاوہ اور کسی کی ہمراہی میں راضی نہیں ہوگا' ہر حال میں شیخ کے ساتھ رہے گا۔ اگرچہ وہ شیخ ظاہری طور پر حق سے اتنا ہی دُور ہو جتنی رات دن سے دُور ہوتی ہے ایسا شخص یہی سوچتا ہے کہ شاید کچھ عرصے بعد میرا شیخ مجھے اس عمل کی حکمت کے بارے میں بتا دے گا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے فرمایا' جب کوئی مرید' شیخ سے صادر ہونے والے کسی (بظاہر) خلافِ شریعت کام کو دیکھ کر شیخ کے بارے میں حسنِ ظن رکھے گا تو جب اللہ تعالیٰ اس مرید کو فتح نصیب کرے گا اس وقت اس کے سامنے شیخ کے عمل کے اسرار بھی ظاہر ہو جائیں گے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس بارے میں سیّدی عبدالعزیز دباغ نے کچھ واقعات بھی بیان کیے ہیں جن میں سے چند ایک اس بات کے آغاز میں نقل کر چکے ہیں۔

ولا تعرفن فی حضرۃ الشیخ غیرہ
ولا تملأن عینا من النظر الشزر

''شیخ کے دامن سے وابستہ ہونے کے بعد ہر ایک کو بھول جاؤ اور شیخ کو ناراضگی سے دیکھنے سے بچو۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تم کسی شیخ کی بارگاہ میں حاضر ہو جاؤ تو پھر اس کے بعد کسی اور کی طرف دیکھنے سے گریز کرو اور اپنے شیخ کو بھی کبھی ناراضگی سے نہ دیکھنا بلکہ ہمیشہ نظریں جھکائے رکھنا۔

(مترجم عرض گزار ہے کہ اس مقام پر شیخ احمد بن مبارک نے اس شعر کے معنی کی وضاحت میں ایک پورا پیراگراف تحریر کیا ہے جسے تکنیکی اعتبار سے اردو میں منتقل کرنا قارئین کے لیے اُلجھن کا باعث بنے گا اس لیے ہم نے اپنے الفاظ میں اس کی تلخیص بیان کر دی ہے۔)

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ادب کی یہ کیفیت کسی بھی مرید کو اس وقت نصیب ہوگی جب شیخ کی روحانی توجہ اس کی شاملِ حال ہو کیونکہ جب شیخ کسی سے محبت کرتا ہے تو اس کا روحانی فیض مرید کو گھیر کر شیخ کی طرف لے آتا ہے اور اسے ہر اس بات سے محفوظ کر دیتا ہے جو شیخ کی بارگاہ سے دُوری کا باعث بن سکتی ہو لہٰذا جب تک شیخ کا فیض باقی رہے گا' شیخ کے ساتھ تعلق بھی برقرار رہے گا اور اگر فیض ختم ہو جائے گا تو تعلق بھی ٹوٹ جائے گا۔

ایک بزرگ کا مرید ہر وقت ان کی خدمت میں حاضر رہتا تھا' پانچوں نمازیں ان کے ہمراہ ادا کرتا تھا' وہ اس غلط فہمی کا شکار تھا کہ کیونکہ اسے اس بزرگ سے محبت ہے اس لیے وہ ہر وقت ان کے پاس حاضر رہتا ہے لیکن اسے یہ شعور نہیں تھا کہ درحقیقت شیخ کو اس سے محبت ہے۔ ایک دن اس بزرگ نے اس سے دریافت کیا' کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟ اس نے عرض کی' مجھے آپ سے محبت ہے اسی لیے تو ہر وقت آپ کی خدمت میں حاضر

رہتا ہوں۔ بزرگ کہنے لگے' عنقریب تمہیں اس کا پتہ چل جائے گا اس دن کے بعد پورے ایک برس تک اسے شیخ کی بارگاہ میں حاضری کا موقع نصیب نہیں ہوا اور شیخ کی خدمت میں حاضر رہنا تو دُور کی بات ہے اس سارے عرصے کے دوران اسے شیخ کی زیارت کا موقع بھی نہیں مل سکا آخر شیخ نے اسے معاف کر دیا۔

ایک مرتبہ ایک بزرگ نے اپنے مریدین سے دریافت کیا' کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟ انہوں نے عرض کی یا سیدی! آپ سے زیادہ ہمیں کوئی عزیز نہیں ہے۔ بزرگ نے دریافت کیا' کیا میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں؟ مریدین نے عرض کی' ہمیں نہیں معلوم۔ بزرگ نے کہا' تمہیں کچھ پتہ نہیں۔ پہلے میں نے تم سے محبت کی تو پھر جب اس کے انوار تم پر پڑے تو تمہیں بھی مجھ سے محبت ہوگئی۔

سیّدی دباغ کے مریدین کی کیفیت

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) سیّدی عبدالعزیز دباغ کے مریدین کی یہ کیفیت ہے کہ وہ کسی اور بزرگ کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے بلکہ بعض حضرات تو کسی اور بزرگ کے پاس جانا (عملی طور پر) حرام سمجھتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک صاحب نے یہ واقعہ سنایا کہ میں سیّدی عبدالعزیز دباغ کی زیارت کے لیے آ رہا تھا' راستے میں کچھ دوست مل گئے جو مشہور صوفی بزرگ سیّدی قاسم ابوعسریہ کی درگاہ کی زیارت کے لیے جا رہے تھے' انہوں نے مجھے بھی دعوت دی اور مروتاً میں بھی ان کے ساتھ چل پڑا جب ہم ان کی درگاہ کے قریب پہنچے تو میرے پیٹ میں شدید درد اُٹھا یہاں تک کہ میں درگاہ سے متصل احاطے میں بیٹھ گیا اور وہیں ساری رات گزار دی۔ مجھے قبر مبارک کی زیارت کی سعادت بھی حاصل نہیں ہو سکی' اگلے دن صبح کے وقت جب ہم وہاں سے واپس روانہ ہوئے تو وہ درد ختم ہو گیا اسی طرح کا واقعہ ایک مرتبہ پھر پیش آیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ یہ سیّدی عبدالعزیز دباغ کا تصرف ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) سیّدی عبدالعزیز دباغ کی یہ عادت تھی کہ جو مریدین حاضرِ خدمت ہوا کرتے تھے' آپ انہیں راستے میں پیش آنے والے تمام واقعات یہاں تک کہ سفر کے دوران ان کی باہمی گفتگو بلکہ ذاتی خیالات تک بیان کر دیا کرتے تھے لیکن ایک شخص کے ساتھ ان سب سے زیادہ عجیب نوعیت کا واقعہ پیش آیا۔ سیّدی دباغ کی خدمت میں حاضر ہونے سے سات برس پہلے اس مرید کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ صالحین کی زیارت کے قابل نہیں ہے اس کے نتیجے میں اس پر قنوطیت طاری ہوگئی اور وہ یہ سمجھنے لگا کہ شاید بدبختی نے اسے گھیر لیا ہے۔ چنانچہ وہ ایک نیک آدمی کے پاس گیا اور اسے بتایا۔ مجھے اولیاء کی زیارت کرنا مشکل لگتا ہے اس نے جواب دیا' اولیاء کو تمہارا اپنے پاس آنا پسند نہیں ہوگا۔ یہ سُن کر وہ شخص اور کبیدہ خاطر ہوا پھر ایک اور نیک آدمی کے پاس گیا اور اپنی حالت کا تذکرہ کیا' اس نے جواب دیا بعض اوقات (مرحوم) مشائخ کی ارواح قبر میں موجود ہوتی ہیں اور کسی وقت بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہوتی ہیں اس لیے عین ممکن ہے کہ جب تم کسی بزرگ کے مزار پر گئے تھے اس وقت ان کی روح بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہو جس کی وجہ سے تمہیں وہاں بے چینی کا احساس ہوا ہو۔ یہ جواب سُن کر اسے کچھ تسلی ہوئی لیکن پھر کہنے لگا' میں جب بھی کسی مزار پر جاتا ہوں اسی وقت

صاحبِ مزار کی روح قبر میں موجود نہیں ہوتی' یہ تو میری بدقسمتی ہوئی پھر جب اسے سیّدی عبدالعزیز دباغ کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا تو اس نے اپنا یہ مسئلہ حضرت کے سامنے پیش کیا اور دیگر حضرات کے جوابات بھی گوش گزار کیے۔ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے سامنے دُکان میں موجود ایک تازہ گلاب کو دیکھتے ہوئے ارشاد فرمایا اگر یہ دُکان دار ہر شخص کو اس بات کی اجازت دے کہ کوئی بھی شخص کسی بھی وقت اس گلاب کو چھو سکتا ہے تو یہ گلاب بہت جلد کملا جائے گا اس لیے بہتر یہی ہے کہ اسے لوگوں کی دست برد سے محفوظ رکھا جائے۔ (وہ شخص کہتا ہے) اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ سیّدی عبدالعزیز دباغ کی زیارت سے کئی سال پہلے ہی مجھے دیگر مشائخ کی زیارت سے کیوں روک دیا گیا؟

حضرت کے مریدین میں ایک صاحب پہلے کسی اور بزرگ کے بہت معتقد تھے اور اکثر ان کی خدمت میں حاضری دیا کرتے تھے جب اس بزرگ کا انتقال ہو گیا تو ان صاحب نے یہ طے کیا کہ اب میں اور کسی بزرگ کے پاس نہیں جاؤں گا کیونکہ ان کے خیال میں اور کوئی بزرگ ان کے مرحوم پیر سے زیادہ کامل نہیں ہو سکتا لیکن پھر ایک مرتبہ اتفاقاً ان کی ملاقات سیّدی عبدالعزیز دباغ کے ساتھ ہوئی۔ (یہ صاحب کہتے ہیں) میں کچھ ہی دیر آپ کے پاس بیٹھا تھا لیکن اس کی وجہ سے پہلے بزرگ سے میری محبت یکسر ختم ہو گئی حالانکہ بظاہر کوئی ایسی وجہ سامنے نہ آئی جس کی وجہ سے سابقہ بزرگ سے والہانہ لگاؤ ختم ہو جاتا اس کے بعد مجھے کبھی اس بزرگ کی قبر کی زیارت کا موقع نہیں مل سکا۔ ایک دن میں نے سیّدی دباغ سے دریافت کیا' میرے ساتھ ایک عجیب معاملہ پیش آیا ہے' میں فلاں بزرگ سے شدید محبت کرتا تھا اور مجھے اس بات کا یقین تھا کہ کوئی دوسرا بزرگ ان کی جگہ نہیں لے سکتا لیکن میں کچھ دیر آپ کے پاس بیٹھا تو میری یہ کیفیت ختم ہو گئی حالانکہ آپ کے پاس موجودگی کے دوران نہ تو ان بزرگ کا کوئی تذکرہ آیا اور نہ ہی کوئی ایسی چیز سامنے آئی جس کی وجہ سے ان سے محبت ختم ہو جاتی۔ (اس کی کیا وجہ ہے؟)

اصل شیخ سگے والد کی مانند ہوتا ہے

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا' وہ بزرگ واقعی ایک صوفی تھے اور تمہیں واقعی ان سے سچی محبت تھی لیکن یہ ایسی محبت نہیں تھی' جس کی بدولت تمہیں خاص فیض حاصل ہوتا اس کی مثال ہم یوں بیان کر سکتے ہیں۔ ایک بچہ اپنے والد سے بچھڑ گیا اور پھر کسی اور شخص نے اسے اپنا لیا۔ یہ بچہ اس دوسرے شخص کو بھی والد کہہ کر مخاطب کرتا ہے اور اپنے سگے والد کی طرح اس سے محبت کرتا ہے' سات برس کے بعد اس کا سگا باپ آ جاتا ہے اور کچھ دیر بچے کے سامنے کھڑا رہتا ہے تو صرف اتنی سی بات سے اس بچے کی تمام تر توجہ اپنے سگے باپ کی طرف مبذول ہو جائے گی اور اب اس کی توجہ کا مرکز وہ شخص نہیں ہوگا جس نے اس کی پرورش کی تھی حالانکہ اس سے پہلے وہ اسی شخص کو اپنا باپ سمجھتا تھا۔ (وہ صاحب کہتے ہیں) حضرت کی یہ مثال سُن کر میرے دل میں پہلے بزرگ کی محبت کی باقی کیفیت بھی رخصت ہو گئی۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) مشائخ کا قول ہے کہ مرید کی مثال حمام کے لوٹوں کی مانند ہوتی ہے کہ جو انہیں تھام لے یہ اسی کے ہو جاتے ہیں لہٰذا اگر کوئی شیخ اپنے کسی مرید سے اس بات پر ناراض ہو کہ وہ مرید اسے چھوڑ کر کسی اور بزرگ کے پاس کیوں گیا ہے تو ایسا شیخ یا عاجز ہوگا یا اس میں کوئی اور کمزوری موجود ہوگی کیونکہ عاجز اور کمزور شیخ کے مریدین کسی اور شیخ کا رُخ کر لیتے ہیں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) بعض اوقات ایسا بھی ہوا' سیّدی عبدالعزیز دباغ کسی بزرگ کی مزار پر زیارت کے لیے تشریف لے گئے اور آپ کے ہمراہ چند ایسے مریدین بھی تھے جو اس بات کے قائل تھے کہ حضور! ہمارے لیے آپ ہی کی زیارت کافی ہے خواہ آپ کہیں بھی تشریف لے جائیں۔ چنانچہ جب سیّدی دباغ کسی مزار کے پاس پہنچتے تو یہ مریدین باہر کھڑے رہتے اور سیّدی دباغ تنہا درگاہ کے احاطے میں داخل ہوتے۔ یہ مریدین اس بات کے قائل تھے کہ صحابہ کرام کے بعد آنے والے زندہ اور مرحوم مشائخ میں سے کوئی ایک بھی ہمارے شیخ کے مرتبے تک نہیں پہنچ سکتا۔ گویا ان مریدین کے نزدیک سیّدی دباغ کی موجودگی یا غیر موجودگی' زندگی یا وفات کسی بھی حالت میں' صرف سیّدی دباغ ہی ان کا قبلہ حاجات ہیں۔

سیّد دباغ کا تصرف بعد از وصال

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) سیّدی دباغ کے وصال کے بعد میں اکثر اوقات اہتمام کے ساتھ آپ کے مزارِ مبارک کی زیارت کے لیے جایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ مجھے خواب میں آپ کی زیارت ہوئی اور آپ نے فرمایا میری ذات قبر میں قید نہیں ہے بلکہ دنیا میں جہاں کہیں جانا چاہے' جا سکتی ہے۔ تم جس جگہ مجھے پکارو گے' مجھے وہیں موجود پاؤ گے یہاں تک کہ اگر تم کسی مسجد کے ستون کے پاس کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں میرے وسیلے سے دعا کرو گے تو میں وہیں تمہارے ساتھ موجود رہوں گا لیکن خبردار! ہر مقام پر میری موجودگی کے باوجود تم یہ گمان نہ کرنا کہ میں خدا بن گیا ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ اس جہان میں سمانے سے پاک ہے جبکہ میں اس جہان کے دائرے میں منحصر ہوں۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) آپ نے یہ الفاظ خواب میں ارشاد فرمائے تھے۔

اسی طرح ایک دن آپ نے اپنی زندگی میں ہی ارشاد فرمایا' تمام جہان بعض اوقات میرے پیٹ میں موجود ہوتا ہے اسی طرح آپ بعض اوقات یہ بات ارشاد فرماتے' ساتوں زمینیں اور ساتوں آسمان بندۂ مومن کی نظر میں اس چھلے کی مانند ہوتی ہیں جو کسی بیابان میں پڑا ہوا ہو لہٰذا قصیدۂ رائیہ کے شاعر کے اس قول کا مطلب یہ ہوگا کہ مشائخ کے مقامات کے مطابق ان سے حسنِ عقیدت رکھنی چاہیے۔

ولا تعرفن في حضرة الشيخ غيره۔

''شیخ کی موجودگی میں کسی اور کی طرف دھیان نہ دو۔''

جبکہ ہمارے شیخ (سیّدی عبدالعزیز دباغ) روحانی طور پر اب بھی موجود ہیں۔

ولا تنطقن یوما لدیه فان دعا   الیه فلا تعدل علی الکلم النزر

''شیخ کی موجودگی میں خاموش رہو اور جب شیخ کوئی سوال کرے تو مختصر جواب دو۔''

یعنی شیخ کی موجودگی میں گفتگو سے پرہیز کرنا چاہیے اور اگر شیخ کوئی سوال کر دے تو طویل جواب نہ دو کیونکہ یہ بات احترام کے خلاف ہے البتہ اگر شیخ خود اس بات کا خواہش مند ہو کہ تم تفصیلی گفتگو کرو تو اس وقت شیخ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ان کی پسند کے مطابق تفصیلات بیان کرو اور پھر خاموش ہو جاؤ۔ ہم پہلے یہ بات بیان کر چکے ہیں کہ بعض اوقات جب سیّدی پر مشاہدے کی کیفیت طاری ہوتی تھی اس وقت آپ ہمیں شور کرنے کا حکم دیتے تھے تا کہ آپ ظاہری حواس کی طرف واپس آ جائیں۔

اس شعر کا مرکزی خیال بھی (شیخ شہاب الدین عمر سہروردی کی تصنیف) ''عوارف المعارف'' سے ماخوذ ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ۔(الحجرات'۴۹:۱)

''اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو''

شیخ سہروردی نے اس کی مختلف تفاسیر نقل کرنے کے بعد بیان کیا ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے حق میں نازل ہوئی تھی جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اگر ان سے کوئی بات دریافت کرتے تو وہ مسئلے کا حل پیش کرنے میں سبقت لے جانے کی کوشش کرتے' آخر انہیں اس حرکت سے منع کر دیا گیا۔

(سہروردی کہتے ہیں) شیخ کی موجودگی میں مرید کو بھی یہی طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے کہ وہ خاموش رہے اور جب شیخ اجازت دے تو اس کی پسند کے مطابق گفتگو کرے۔ مرید کو شیخ کے سامنے (اپنا علم جھاڑنے کی بجائے) یہ تصور کرنا چاہیے کہ میں کسی سمندر کے کنارے بیٹھا ہوا اپنے حصے کے رزق کا انتظار کر رہا ہوں لہٰذا وہ پوری توجہ سے شیخ کی گفتگو سنے تو یقیناً اسے فیض نصیب ہوگا لیکن اگر وہ شیخ کے سامنے خود ہی بولنا شروع کر دے تو گویا وہ اپنی نفسانی خواہشات کا اسیر ہوگا اور اس کی یہ حرکت گناہ کے مترادف ہوگی۔ کسی سچے مرید کو شیخ کے سامنے سوال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ شیخ خود ہی اس کی پسند کے مطابق گفتگو شروع کر دیتا ہے کیونکہ شیخ کی توجہ اللہ کی طرف مبذول ہوتی ہے اور وہ صدیقین کی موجودگی میں اپنے دل کو اللہ کی بارگاہ میں حاضر کرتا ہے اور اپنے مریدین کے لیے اللہ کے فضل و کرم کا طلب گار ہوتا ہے جس کے نتیجے میں اس کا دل اور زبان گویائی کی صورت میں ضرورت کے مطابق مریدین کی حاجت روائی میں مشغول ہو جاتے ہیں اور اس وقت جو باتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ولی کی زبان پر جاری ہوتی ہیں' وہ ولی خود بھی انہیں غو سے سنتا ہے۔

شیخ ابوالسعود کی طرف جو باتیں القاء کی جاتی تھیں' آپ انہیں مریدین کے سامنے بیان کرتے اور ساتھ یہ ارشاد فرماتے کہ میں خود بھی تمہاری طرح ان باتوں کو غور سے سنتا ہوں۔ حاضرین میں سے ایک صاحب کو یہ بات سمجھ نہیں آئی' انہوں نے عرض کی جب کوئی شخص بولتا ہے تو اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں کیا کہنے لگا ہوں؟ پھر

غور سے سننے کی کیا ضرورت ہے؟ (شیخ نے کوئی جواب نہیں دیا) وہ شخص گھر جا کر واپس سو گیا اور خواب دیکھا جیسے کوئی شخص اسے یہ بات کہہ رہا ہے جب کوئی غوطہ خور سمندر کی تہہ میں سے سیپیاں نکال کر لاتا ہے تو اس وقت اس کے پاس موتی موجود ہوتے ہیں لیکن وہ موتی اسی وقت دیکھ سکتا ہے جب واپس ساحل پر آ جائے اور اس وقت ساحل پر موجود دوسرے لوگ بھی ان موتیوں کو دیکھ سکتے ہیں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) گویا اس شخص کو اپنے سوال کا جواب خواب کی صورت میں ملا لہٰذا مریدین کو شیخ کے سامنے خاموش رہنا چاہیے۔

ولا ترفعوا اصواتکم فوق صوتہ

ولا تجھروا جھر الذی ھو فی قفر

"شیخ کی آواز سے اپنی آواز کو بلند نہ کرو اور نہ ہی اس کے سامنے گنوار لوگوں کی طرح گفتگو کرو۔"

شیخ کے سامنے آواز بلند کرنے کو اس لیے ممنوع قرار دیا گیا ہے کیونکہ یہ بات ادب کے خلاف ہے اسی طرح صحراؤں اور جنگلوں میں رہنے والے غیر تہذیب یافتہ لوگوں کی طرح بھی گفتگو نہ کیا کرو بلکہ احترام کے ساتھ آداب والقاب کے ہمراہ شیخ کو مخاطب کرو۔ گویا اس شعر کا مضمون قرآن مجید کی اس آیت سے ماخوذ ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝ (الحجرات ۴۹:۲)

"اے ایمان والو! تم اپنی آوازوں کو نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آواز سے بلند نہ کرو اور انہیں (بے تکلفی کے ساتھ) اس طرح نہ بلاؤ جیسے آپس میں ایک دوسرے کو بلاتے ہو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہیں پتہ بھی نہ چل سکے اور تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں۔"

شیخ سہروردی کا بیان

اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے شیخ سہروردی تحریر کرتے ہیں' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں حضرت ثابت بن قیس بن شماس کی سماعت کمزور تھی جس کی وجہ سے بولتے ہوئے بھی ان کی آواز بلند ہو جایا کرتی تھی بعض اوقات جب وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہوتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی آواز کی بلندی گراں محسوس ہوتی اس وقت یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی اور حضرت ثابت سمیت دیگر صحابہ کرام کو بارگاہِ رسالت مآب کا ادب سکھایا گیا۔ ایک اور روایت کے مطابق اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی آپس میں کسی بات پر تکرار ہوگئی اور یہ صورتِ حال نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں پیش آئی۔ چنانچہ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں اس قدر پست آواز میں گفتگو کرتے تھے کہ ان کی بات سمجھنے میں دقت پیش آتی تھی جبکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ قسم اُٹھائی کہ میں آئندہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں پست آواز میں گفتگو کیا کروں گا۔

مرید کو شیخ کی موجودگی میں یہی ادب و احترام اختیار کرنا چاہیے اور بلند آواز میں گفتگو کرنے یا ہنسی مذاق سے پرہیز کرنا چاہیے البتہ شیخ کی اجازت کی صورت میں آواز بلند کی جا سکتی ہے کیونکہ اونچی آواز میں گفتگو احترام کے منافی ہے۔ بعض مریدین اپنے شیخ کے احترام کا اس قدر خیال رکھتے ہیں کہ نظر بھر کے شیخ کے چہرے کی طرف بھی نہیں دیکھتے۔

ابن عطا فرماتے ہیں' اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ہلکی سی غلطی پر گرفت کی ہے تاکہ کوئی اس سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرے۔

سہل کہتے ہیں' اس آیت کا مقصد یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف اسی وقت مخاطب کیا کرو جب تمہیں ان سے کوئی بات دریافت کرنی پڑے۔

ابوبکر بن طاہر کہتے ہیں' (اس آیت کا مفہوم یہ ہے) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرنے میں پہل نہ کرو اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی بات کا جواب دینا پڑے تو احترام کے ساتھ پست آواز میں جواب دو اور جس طرح آپس میں ایک دوسرے کو بے تکلفی سے مخاطب کرتے ہو' یہ رویہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اختیار نہ کرو بلکہ انہیں ادب واحترام کے ساتھ یا نبی اللہ' یا رسول اللہ جیسے القابات کے ہمراہ اپنی طرف متوجہ کرو۔

مرید کو شیخ کے ساتھ اسی انداز میں گفتگو کرنی چاہیے کیونکہ انسان کی گفتگو کے ذریعے ہی اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے دل میں مقابل کے لیے کس قدر عزت واحترام کے جذبات موجود ہیں۔

شیخ سہروردی' حضرت ثابت بن قیس کا واقعہ نقل کرنے کے بعد تحریر کرتے ہیں:

''اگرچہ یہ آیت خاص طور پر حضرت ثابت بن قیس کے بارے میں نازل ہوئی تھی لیکن کیونکہ اس کے بعد انہوں نے اس بات کو اپنے اوپر لازم کر لیا کہ آئندہ کبھی بھی ان کی آواز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے بلند نہیں ہوگی' ان کے اس عمل کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے انہیں بہت سی عنایات سے نوازا۔ مثلاً انہیں نیک زندگی بسر کرنے کی توفیق ملی' شہادت کی موت نصیب ہوئی' جنت میں داخل ہوئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کے وصال کے بعد ان کی گواہی اور وصیت کو نافذ کیا جبکہ وہ قرآن کی اس آیت کا مصداق بھی بنے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ۔(الحجرات'۳:۴۹)

''جو لوگ بارگاہِ رسالت میں اپنی آواز کو پست رکھتے ہیں۔ (ان کے قلوب کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ سے منور کر دیا ہے)''

یعنی ان کے قلوب امتحان کے نتیجے میں اس طرح خالص ہو گئے ہیں جیسے آگ خالص سونے کو الگ کر دیتی ہے لہٰذا زبان کیونکہ دل کی ترجمان ہوتی ہے اس لیے جب دل خالص ہوگا تو اس خلوص کے اثرات زبان پر بھی محسوس ہوں گے اور گفتگو میں شائستگی آ جائے گی۔ ہر مرید کو اپنے شیخ کے سامنے اسی احترام کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

شیخ ابوعثمان فرماتے ہیں' بزرگوں کا ادب کرنا انسان کے درجات کی ترقی اور دنیا و آخرت کی بھلائی کے

حصول کا باعث بنتا ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ.(الحجرات:۴۹:۵)

اگر یہ لوگ تمہاری (صلی اللہ علیہ وسلم) آمد تک صبر کریں تو یہ ان کے لیے زیادہ بہتر ہے۔''

اس سے قبل ارشاد فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرَاتِ.(الحجرات'۴۹:۴)

''جو لوگ حجرے کے باہر کھڑے ہو کر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بُلاتے ہیں (ان میں سے اکثر بے وقوف ہیں)''

اس آیت میں مریدین کے لیے یہ نکتہ موجود ہے کہ جب شیخ کے گھر آؤ تو جب تک شیخ خود باہر نہ آئے اس وقت تک صبر سے شیخ کی آمد کا انتظار کرو۔

ولا ترفعن بالضحك صوتك عنده

فلا قبح الادون ذلك فاستقر

''شیخ کی موجودگی میں قہقہہ بلند نہ کرو' تلاش کے باوجود تمہیں اس سے بڑی برائی نہیں ملے گی۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) شیخ کی موجودگی میں قہقہہ بڑی بے ادبی ہے بلکہ کثرت سے ہنسنا رعونت کا علامتی نشان ہے اور اس عمل سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہ نے قہقہے کو گناہ شمار کرتے ہوئے یہ فتویٰ دیا ہے کہ قہقہہ لگانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ ان کے نزدیک قہقہہ لگانا گناہ ہے اسی طرح شیخ عیسی فرماتے ہیں کہ جو شخص تکبر کے بغیر قہقہہ لگاتا ہے' اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوتا ہے۔

ولا تقعدن قدامه متربعا

ولا باديا رجلا فبادى الى الستر

''شیخ کے سامنے چارزانو ہو کر یا پاؤں پھیلا کے مت بیٹھو (اگر پھیل جائے) تو سمیٹ لو۔''

شیخ ابوطالب مکی بیان کرتے ہیں کہ علماء کا طریقہ یہ ہے کہ وہ علمی مجلس میں احترام کے ساتھ بیٹھا کرتے ہیں۔ صحابہ کرام اور خواجہ حسن بصری کے زمانے میں اہلِ علم زمین پر اکڑوں بیٹھا کرتے تھے۔ شیخ جنید بغدادی کے زمانے تک یہی معمول باقی رہا۔ بعض روایات کے مطابق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح تشریف فرما ہوتے تھے لیکن بعد میں نحو اور لغت کے ماہرین اور دنیادار علماء چارزانو بیٹھنے لگے حالانکہ یہ متکبرین کا طریقہ ہے۔ تواضع یہی ہے کہ اجتماع میں زمین پر بیٹھا جائے لہٰذا مریدین کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابر اہلِ علم کی پیروی کرتے ہوئے اپنی نشست کا (یعنی بیٹھنے کے انداز کا) خاص خیال رکھنا چاہیے۔

ولا باسطا سجادة بحضوره

فلا قصد الا السعى للخادم البر

وسجادۃ الصوفی بیت سکونہ
ولا وکرا الا ان تطیر عن الوکر

''شیخ کی موجودگی میں اپنا سجادہ نہیں بچھانا چاہیے کیونکہ اچھا خادم صرف خدمت کر کے خوش ہوتا ہے۔ نیز کسی بھی صوفی کو صرف اپنی خانقاہ میں سجادہ بچھانا چاہیے کیونکہ کوئی بھی پرندہ اسی وقت اپنا گھونسلہ بناتا ہے جب وہ ماں باپ کے گھونسلے سے پرواز کر جائے۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) یعنی کسی بھی طرح مرید کو اپنے شیخ کی موجودگی میں (اپنے آپ کو نمایاں کرتے ہوئے) اپنا سجادہ نہیں بچھانا چاہیے کیونکہ یہ بات مرید کے مرتبے کے منافی ہے کیونکہ مرید کا اصل فرض شیخ کی خدمت و فرماں برداری ہے جبکہ سجادے پر بیٹھنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ شخص کسی کا خادم نہیں ہے اس لیے اس میں بظاہر شیخ کی برابری کا التباس ہوتا ہے پھر یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ سجادے پر بیٹھنے کا حق اس شخص کو حاصل ہوگا جس کی اپنی خانقاہ ہو۔ شیخ کی مجلس میں تو عاجزی و انکساری اختیار کی جاتی ہے کیونکہ شیخ کی خانقاہ میں تمہاری خانقاہ نہیں بن سکتی اس لیے شیخ کی موجودگی میں سجادہ نشینی ادب کے منافی ہے البتہ تربیت کی تکمیل کے بعد جب شیخ تمہیں اجازت و خلافت دیدے اور تم خود دوسروں کے شیخ بن جاؤ اور تمہاری اپنی الگ خانقاہ ہو اس وقت تم ایسا کر سکتے ہو۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ جب شیخ کی موجودگی میں تمہارے پاس سجادہ نہیں ہوگا تو گویا تمہارے پاس کوئی گھونسلہ نہیں ہے یعنی تم ایسی کوئی بھی مجلس منعقد نہیں کر سکتے جس میں لوگ فیض کے حصول کے لیے تمہاری طرف رجوع کریں کیونکہ اس صورت میں شیخ کی بے ادبی اور نافرمانی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو اس سے محفوظ رکھے لیکن اگر تمہاری تربیت مکمل ہو چکی ہو اور دودھ چھڑانے کی نوبت آ جائے۔ شیخ تمہیں اجازت و خلافت عطا کر دے اور تم ایک پیر طریقت کی حیثیت اختیار کر جاؤ تو اب تم اپنی الگ مجلس منعقد کر سکتے ہو لیکن شیخ کی خانقاہ سے نکل کر کسی اور مقام پر بالکل اسی طرح جیسے کسی پرندے کے بچے کی تربیت مکمل ہو جائے اور وہ اُڑنے کے قابل ہو جائے تو اب وہ اپنے ماں باپ کا محتاج نہیں رہتا۔ پہلے شعر کے دوسرے مصرعے کا مفہوم یہ ہے کہ سچا خادم کسی غرض کے بغیر اپنے آقا کی خدمت میں مشغول رہتا ہے۔

شیخ سہروردی عوارف المعارف میں تحریر کرتے ہیں' مشائخ کے آداب میں یہ بات شامل ہے کہ کوئی بھی مرید شیخ کی موجودگی میں اپنا سجادہ (بچھونا) نہ بچھائے البتہ نماز کے وقت ایسا کیا جا سکتا ہے۔ (اسے ممنوع اس لیے قرار دیا گیا ہے) کیونکہ ظاہری طور پر سجادے پر بیٹھنے کا مقصد راحت و آرام کا حصول اور عزت افزائی کا اظہار ہوتا ہے۔ (شیخ سہروردی ایک اور مقام پر تحریر کرتے ہیں) جو شخص صوفیاء کے حلقے میں نیا داخل ہو اور اسے روحانی معاملات کی خبر نہ ہو' ایسے شخص کو شیخ کی خدمت پر مامور کرنا چاہیے کیونکہ اس مرتبے میں یہ خدمت ہی اس کے لیے عبادت شمار ہوگی اور وہ شخص اسی خدمت کی بدولت اہل اللہ کی روحانی توجہات اپنی طرف مبذول

کروائے گا جبکہ اس کے دیگر پیر بھائی عبادت وریاضت میں مشغول رہیں گے۔(ایک اور مقام پر شیخ سہروردی لکھتے ہیں) صوفیاء کے نزدیک خدمت بھی ایک نیک عمل ہے اور یہ ایک ایسا طریقہ ہے جس کے ذریعے انسان اچھے اخلاق واوصاف کا مالک بن سکتا ہے۔

مادمت لم تفطم فلا فرجية

عليك ولا تلفي عليها بمستحر

''جب تک تمہارا دودھ نہ چھڑوایا جائے اس وقت تک تمہیں فرجیہ پہننے کی جرأت نہیں کرنی چاہیے۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) یعنی اے مرید! جب تک تیری تربیت مکمل نہ ہو جائے اور تو استقلال کے درجے تک نہ پہنچ جائے اس وقت تک مشائخ عظام کا مخصوص لباس پہننے کی جرأت نہ کر۔

شیخ ابو عبدالرحمٰن السلمی فرماتے ہیں کہ مشائخ کے علاوہ اور کسی کے لیے فرجیہ پہننا درست نہیں ہے کیونکہ اس کی حیثیت بھی مشائخ کے ساتھ مخصوص سجادے اور کلاہ کی سی ہے۔

صوفیاء کی تواضع

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) یعنی اے مرید! تو روئے زمین پر موجود کسی بھی کافر یا مسلمان کے بارے میں یہ سوچ نہ رکھ کہ وہ تجھ سے حقیر ہے یا اللہ کی بارگاہ میں اس کا مرتبہ تجھ سے کم ہے۔

شیخ بایزید بسطامی فرماتے ہیں' جب تک کوئی شخص اس غلط فہمی کا شکار ہو کہ شاید مخلوق میں کوئی ایک شخص بھی اس سے بدتر ہو سکتا ہے اس وقت تک گویا یہ شخص تکبر کا شکار ہے' کسی نے دریافت کیا پھر تواضع کی کیا صورت ہوگی؟ تو آپ نے فرمایا جب وہ اپنے آپ کے بارے میں یہ سوچ رکھتا ہو کہ میں کسی مرتبے یا مقام پر فائز نہیں ہوں۔ نیز وہ ہر شخص کے ساتھ اس کے مرتبے کے مطابق سلوک کرے۔

(شیخ سہروردی) عوارف المعارف میں تحریر کرتے ہیں' شیخ یوسف بن اسباط سے کسی نے سوال کیا' تواضع کی انتہا کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا' یہ کہ جب تم گھر سے نکلو تو باہر ملنے والے ہر شخص کو خود سے بہتر سمجھو۔

(سہروردی تحریر کرتے ہیں) ایک مرتبہ مجھے اپنے شیخ ضیاء الدین ابوالنجیب سہروردی کے ہمراہ شام جانے کا اتفاق ہوا۔ کسی دنیادار امیر نے کچھ فرنگی قیدیوں کے سروں پر رکھوا کر کھانے کی کچھ اشیاء شیخ کی خدمت میں بھجوائیں۔ ان قیدیوں کے پاؤں بیڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے جب دسترخوان بچھایا گیا تو آپ نے خادم کو حکم دیا' ان قیدیوں کو بلواؤ تا کہ وہ بھی درویشوں کے ہمراہ ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھائیں لہٰذا ان سب قیدیوں کو لایا گیا اور ایک دسترخوان پر بٹھا دیا گیا۔ شیخ ضیاء الدین ابوالنجیب اپنے سجادے سے اٹھے اور ان قیدیوں کے درمیان جا کر بیٹھ گئے گویا آپ انہی میں سے ایک ہیں۔ ان سب نے آپ کے ہمراہ بیٹھ کے کھانا کھایا اس وقت آپ کی طبیعت کی عاجزی اور انکساری ہمارے سامنے ظاہر ہوئی کہ اس قدر علم' فضل اور مرتبہ و

مقام کے باوجود آپ نے تکبر سے اپنے آپ کو بچائے رکھا۔

شیخ ابوالحسن علی القرطبی فرماتے ہیں' میرے شیخ ابومحمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن ہیں جو ایک جید فقیہ اور صاحبِ علم شخص تھے۔ ایک دن شدید بارش اور کیچڑ کے موسم میں میں نے انہیں پیدل چلتے ہوئے دیکھا' سامنے سے ایک کتا آتا دکھائی دیا' آپ دیوار کے ساتھ لگ گئے اور کتے کے گزرنے کے لیے راستہ چھوڑ دیا جب کتا قریب آیا تو آپ نچلی طرف آ گئے اور راستے کا اوپری حصہ کتے کے گزرنے کے لیے چھوڑ دیا جب کتا گزر گیا تو میں آپ کے پاس پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ آپ کے چہرے پر افسوس کے آثار موجود ہیں۔ میں نے عرض کی' آج میں نے ایک حیران کن بات دیکھی ہے کہ آپ نے کتے کے لیے صاف راستہ چھوڑ دیا اور خود کیچڑ میں پاؤں رکھ دیا۔ آپ نے جواب دیا جب میں پہلے دیوار کے ساتھ لگا تو مجھے خیال آیا' میں نے اپنے آپ کو بہتر سمجھتے ہوئے اپنے لیے صاف جگہ اختیار کی ہے جبکہ وہ کتا اس اعتبار سے مجھ سے بہتر ہے کہ اس نے کبھی کوئی گناہ نہیں کیا اور میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کرتے ہوئے بہت سے گناہوں کا مرتکب رہتا ہوں۔ یہی سوچ کر میں خود کیچڑ میں ہو گیا اور کتے کے لیے صاف جگہ خالی کر دی اب مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ میری اس خود پسندی کے باعث کہیں اللہ تعالیٰ مجھ سے ناراض نہ ہو جائے' اللہ تعالیٰ میرے اس گناہ کو معاف فرمائے کہ میں نے خود کو اس سے بہتر سمجھا جو مجھ سے بہتر ہے۔

شیخ ذوالنون مصری ارشاد فرماتے ہیں جو شخص تواضع اختیار کرنا چاہے' اسے چاہیے کہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال کا تصور پیش نظر رکھے اس طرح اسے اپنا وجود کم تر اور حقیر نظر آئے گا جو شخص اللہ کی عظمت اور حاکمیت کو سامنے رکھے گا' وہ کبھی بھی نفس کے ہاتھوں مغلوب نہیں ہو سکے گا کیونکہ اللہ کی عظمت کے سامنے ہر چیز حقیر ہے اور جب کوئی انسان تواضع اختیار کرلے گا تو لوگوں کے ساتھ انکساری سے ملے گا کیونکہ یہ بات اس کے پیش نظر ہو گی کہ یہ ساری مخلوق اللہ سے منسوب ہے۔

اسی لیے (شیخ شہاب الدین سہروردی نے) عوارف المعارف میں تحریر کیا ہے:

''جب تک کسی صوفی کو بارگاہِ ربّ العزت میں تواضع کا سلیقہ نہیں آئے گا اس وقت تک وہ لوگوں کے ساتھ متواضع رویہ اختیار نہیں کر سکتا۔''

فان ختام الامن عنك مغيب

ومن ليس ذاخسر يخاف من المكر

''کیونکہ تجھے اپنے خاتمے کا علم نہیں ہے اور اگر کوئی شخص گناہ گار نہ بھی ہو پھر بھی اسے اللہ تعالیٰ کی تدبیر سے ڈرنا چاہیے۔''

انجام کا خوف

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) یعنی کیونکہ انسان کو اپنے انجام کی خبر نہیں ہے اس لیے اسے کسی کو بھی اپنے سے

کم تر نہیں سمجھنا چاہیے کیونکہ اگر وہ شخص خود گناہ گار ہوتا ہوگا تو یقیناً اسے اپنے انجام کی خرابی کا اندیشہ ہوگا لیکن اگر وہ نیکوکار بھی ہو تو بھی اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدبیر (یعنی اس کی مشیت اور فیصلے) کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی فرماتے ہیں' اللہ تعالیٰ کے بارے میں انسان کو یہی اعتقاد رکھنا چاہیے لیکن بہت کم لوگوں کو یہ نعمت نصیب ہوتی ہے کہ انسان اس بات کا اعتقاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت اپنے بندے کی قلبی کیفیت سے آگاہ ہے اور جس وقت جسے چاہے' اپنے لطائف و معارف عطا فرما سکتا ہے لہٰذا اگر کوئی شخص ایک لمحے کے لیے جدا ہوا اور پھر دوبارہ واپس آ کر تمہارے ساتھ بیٹھے تو تمہیں اس عزت اور تعظیم کرنی چاہیے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اسی ایک لمحے میں اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے خاص فضل و کرم سے نواز دیا ہو اور بالفرض ایسا نہیں بھی ہوا تو بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کا ادب بہرحال فوقیت رکھتا ہے لیکن یہ کیفیت بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے اسی طرح اگر صوفیاء کسی شخص کو معصیت کا مرتکب دیکھ لیں تو پھر بھی اسے گناہ گار نہیں سمجھتے کیونکہ عین ممکن ہے کہ اس شخص نے خفیہ طور پر اپنے گناہ سے توبہ کر لی ہو یا انجام کار اللہ تعالیٰ کا فضل اس کے شاملِ حال ہو اور اسے توبہ کی توفیق نصیب ہو جائے لہٰذا اگر کوئی شخص اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر سمجھے حالانکہ اسے اپنے یا دوسرے شخص کے انجام کے بارے میں کچھ پتہ نہیں ہے تو ایسا شخص درحقیقت اللہ تعالیٰ (اور اس کے فضل و کرم) سے واقف نہیں ہے اس لیے اس میں کوئی بھلائی نہیں ہوگی بلکہ وہ دھوکے کا شکار ہوگا اور اگر بظاہر اسے کچھ معارف نصیب ہوں تو بھی درحقیقت اسے معرفت کے بارے میں کچھ پتہ نہیں ہے۔

شیخ ابوطالب المکی تحریر کرتے ہیں' صوفیاء کرام اس وجہ سے اللہ تعالیٰ (کی بے نیازی) سے خوف زدہ رہتے ہیں کیونکہ انہیں یہ بات معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو دوسرے بندوں کے ذریعے نصیحت عطا فرماتا ہے اور بعض اوقات بلند مرتبہ لوگوں کو کم مرتبہ لوگوں کے لیے عبرت بنا دیا جاتا ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی خاص حکمت ہوتی ہے۔ صوفیاء اس بات سے واقف ہوتے ہیں کہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ عام مسلمانوں کو نصیحت کرنے کے لیے بعض صالحین کو باعثِ عبرت بنا دیتا ہے یا صالحین کی بہتری کے لیے شہداء کو' شہداء کی بہتری کے لیے صدیقین کو سبب بنایا جاتا ہے لہٰذا ہر مرتبے کے لوگ نچلے طبقے کے لوگوں کے لیے باعثِ عبرت اور اوپری طبقے کے لوگوں کے لیے باعثِ نصیحت جبکہ اپنے ہم مرتبہ لوگوں کے لیے باعثِ خوف ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ایک خاص شان یہ بھی ہے کہ وہ لوگوں کے علوم اور اعمال (کی ظاہری حیثیت) کی پرواہ نہیں کرتا اسی لیے کوئی بھی صوفی اپنے مقام سے مطمئن نہیں ہوتا اور نہ ہی خود کو اللہ تعالیٰ کے فیصلے سے محفوظ سمجھتا ہے۔

امام ابوحامد غزالی لکھتے ہیں' امور سے متعلق اللہ تعالیٰ کی مشیت عقل و فہم سے ماوراء ہے لہٰذا تحقیقی اور یقینی طور پر کوئی اصول مقرر کرنا تو دُور کی بات ہے' ہم اس کے بارے میں کوئی اندازہ یا قیاس بھی نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیاء کے دل ہر وقت اللہ تعالیٰ کے خوف سے لرزتے رہتے ہیں کیونکہ سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ہمارے تمام معاملات اس ذات کی مشیت سے وابستہ ہیں جو ہم سب سے بے نیاز ہے (اس کے بعد مزید کچھ

گفتگو کرنے کے بعد شیخ غزالی لکھتے ہیں) کسی بزرگ کا قول ہے کہ اگر میں کسی ایسے شخص کو دیکھوں جو پچاس برس سے توحید کا قائل ہے اور پھر ایک لمحے کے لیے وہ شخص ستون کی آڑ میں گم ہوا اور اسی ایک لمحے میں اس کا انتقال ہو جائے تو میں اس کے بارے میں یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ کیا وہ توحید پر ایمان کی حالت میں مرا ہے یا اس کے ایمان میں تبدیلی آ چکی تھی۔

ایک اور بزرگ فرماتے ہیں اگر مرتبۂ شہادت میرے گھر کے دروازے پر موجود ہو اور حالتِ ایمان میں مرنا میرے کمرے کے دروازے پر موجود ہو تو میں ایمان کی حالت میں مرنا پسند کروں گا کیونکہ مجھے نہیں معلوم کہ اپنے کمرے کے دروازے سے لے کر گھر کے دروازے تک میرے باطن کی کیا حالت ہو جائے۔

شیخ سہل بن عبداللہ تستری ارشاد فرماتے ہیں' اکابر صوفیاء کو ہر لمحے اور ہر گھڑی میں یہی خوف رہتا ہے کہ کہیں ہمارا انجام بُرا نہ ہو۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں کیا ہے:

وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ۔ (المؤمنون' ۲۳:۶۰)

''اور ان کے دل (اللہ کے خوف سے) لرزاں رہتے ہیں۔''

شیخ سہل یہ بھی کہا کرتے تھے' مرید کو گناہ کا خوف ہوتا لیکن شیخ کو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں وہ کفر میں مبتلا نہ ہو جائے۔

شیخ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں' جب میں مسجد کی طرف جانے لگتا ہوں تو گویا میری کمر میں ''زنار'' موجود ہوتی ہے اور مجھے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ میں کہیں کسی گرجے میں یا آتش کدے میں نہ چلا جاؤں یہاں تک کہ جب میں مسجد میں داخل ہو جاتا ہوں تو مجھے ''زنار'' سے نجات ملتی ہے۔ روزانہ پانچوں نمازوں کے اوقات میں میرا یہی معمول ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس بارے میں سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ایک مرتبہ ایک عجیب وغریب واقعہ سنایا۔ آپ فرماتے ہیں کہ مکہ مکرمہ میں میری ملاقات ابوالحسن علی الہندی سے ہوئی جن کی حالت بہت عجیب و غریب تھی' وہ جب چلنے کے لیے قدم اُٹھاتے تو ان کا پاؤں لرز رہا ہوتا اور پھر جب اسے واپس زمین پر رکھتے تو بھی لرزتا' دیکھنے والا یہ سمجھتا کہ شاید یہ صاحب مجنون ہیں' چلنے کی طرح' کھانے کے وقت بلکہ کسی بھی ارادی حرکت کے ارتکاب کے وقت ان کی یہی کیفیت ہوتی۔ میں نے جب ان کی یہ کیفیت دیکھی تو مجھے ان پر بہت رحم آیا' میں نے ان سے دریافت کیا۔ اے ابوالحسن! آپ نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟ حالانکہ آپ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ ولی ہیں اور دیوان الصالحین کے اراکین میں شامل ہیں پھر آپ کو کوئی جسمانی بیماری بھی نہیں ہے؟ انہوں نے جواب دیا میں صرف آپ کو اپنی حالت کا سبب بتانے لگا ہوں' اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے مجھے اور اپنی تمام مخلوق میں موجود اپنے افعال کا مشاہدہ نصیب کیا ہے اور میں تمام مخلوق میں موجود اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا مشاہدہ کرتا ہوں' ان میں سے کوئی ایک چیز بھی مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے پھر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے افعال اور

فیصلوں کے اسرار کا علم بھی عطا فرمایا ہے۔ چنانچہ میں جب بھی اللہ تعالیٰ کے کسی فعل کا مشاہدہ کرتا ہوں تو اس کی علت' سبب اور راز سے بھی آگاہ ہو جاتا ہوں لیکن جب میں نے اپنی ذات کی طرف توجہ کی تو میری ذات میں موجود اللہ تعالیٰ کے تمام افعال محجوب ہیں اور مجھے ان کا مشاہدہ نصیب نہیں ہوا اس لیے مجھے یہ اندیشہ ہے کہ شاید میری کسی غلطی کی وجہ سے مجھے اپنی ذات کا مشاہدہ عطا نہیں کیا تا کہ اگر کوئی کام میرے لیے مضر ہو تو میں اس سے بچنے کی کوشش نہ کروں۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنے ہر اختیاری فعل کے بارے میں اس بات سے خوف زدہ رہتا ہوں کہ کہیں وہ میری تباہی کا باعث نہ بن جائے اسی خوف کے نتیجے میں کسی بھی اختیاری حرکت کے صدور کے وقت میرے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں' میں نے ان کے سامنے اس حدیث قدسی کا ذکر کیا:

انا عند ظن عبدی بی ۔ (بخاری' ۶: ۲۶۹۴ رقم: ۶۹۷۰)

''میں اپنے بارے میں' اپنے بندے کے گمان کے مطابق ہوتا ہوں۔''

اس کے علاوہ میں نے ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کی رحمت کی عظمت اور وسعت کا تذکرہ بھی کیا۔

شیخ ہندی میری باتوں کو غور اور توجہ سے سنتے رہے یہاں تک کہ میں نے یہ خیال کیا کہ شاید اب ان کی حالت ٹھیک ہو جائے گی لیکن کچھ دیر بعد ان کی پھر وہی حالت ہو گئی جو شخص انہیں دیکھتا' اسے ان پر رحم آتا اور ہر شخص یہ دعا کرتا کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس حالت سے نجات عطا فرمائے۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں' میری بڑی خواہش تھی کہ اہلِ حجاب اسے دیکھیں اور اس کی اس حالت کی علت سے آگاہ ہو جائیں' اسے اللہ تعالیٰ کا کتنا خوف ہے اور وہ کیسے ہر وقت صرف اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہتا ہے اور پھر ان اہلِ حجاب کو اس بات کا احساس ہو کہ وہ نفسانی خواہشات کی پیروی میں گم ہو کر اللہ کی بارگاہ سے کتنے دُور ہو چکے ہیں؟

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں' اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص رحمت کے باعث انہیں ان کی اپنی ذات میں موجود اپنے افعال کا مشاہدہ عطا نہیں کیا کیونکہ اگر انہیں یہ مشاہدہ نصیب ہو جاتا تو ایک ہی لمحے میں ان کی ذات پگھل جاتی لیکن کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت اور ارادے کے مطابق انہیں زندہ رکھنا ہے اس لیے انہیں ان کی اپنی ذات کا مشاہدہ عطا نہیں کیا گیا' دیگر مخلوقات کے مشاہدے کی جو کیفیت انہیں نصیب ہوئی' وہ دیگر بہت سے اولیاء اور جملہ انبیائے کرام کو بھی عطا کی گئی لیکن ان سب میں کوئی ایک بھی اپنی ذات میں موجود اللہ تعالیٰ کے افعال کے مشاہدے کی صلاحیت نہیں رکھتا بلکہ یہ سب صرف دوسری مخلوق میں اللہ تعالیٰ کے افعال کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

ولاتنظرن یوما الی الخلق انه　　　یخلی طریق الصفوفی کدر الاسر

''اور کبھی بھی مخلوق کی طرف نہ دیکھو کیونکہ یہ چیز انسان کی صفائی کو ختم کر کے اسے میلا کر دیتی ہے۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) جب مرید کو تکبر سے بچنے کی ہدایت کر دی گئی تو اب اس کے برعکس یعنی بالکل ہی مخلوق کی طرف مائل ہونے سے بچنے کی تلقین کی جا رہی ہے یعنی کوئی مرید اپنے احوال و اقوال میں مخلوق سے کسی صلے کے حصول کا طالب نہ ہو' اپنی عادات' عبادات اور دیگر تمام امور میں مخلوق کی طرف توجہ نہ دے کیونکہ اس صورت میں تمہارے باطن کی پاکیزگی گرد آلود ہو جائے گی اور باطن کے صاف وشفاف شیشے پر دِکھاوے اور ریاکاری کا میل آ جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ ابوعبداللہ القرشی ارشاد فرماتے ہیں جو شخص اپنے افعال و اقوال میں اس بات کا لحاظ نہ کرے کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے تو ایسا شخص لازمی طور پر ریاکاری کا شکار ہو جاتا ہے۔

بشر حافی فرماتے ہیں' جو شخص مشہور ہونا چاہے' وہ رسوا ہو جاتا ہے۔

آپ ہی کا فرمان ہے جو شخص مشہور ہونا چاہے' وہ آخرت میں کچھ حاصل نہیں کر سکے گا۔

کسی اور بزرگ کا قول ہے اگر تم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کوئی مرتبہ حاصل کرنا چاہتے ہو تو لوگوں کے درمیان مرتبے کے حصول کا خیال دل سے نکال دو۔

(شیخ شہاب الدین سہروردی) عوارف المعارف میں تحریر کرتے ہیں' ریاکاری کی وجہ سے بہت سے اعمال تباہ ہو جاتے ہیں اور ان سے بچنے کی صورت میں بہت سے مقامات حاصل ہوتے ہیں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) مذکورہ بالا شعر کا مرکزی مضمون شیخ سہروردی کی اسی بات سے ماخوذ ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک دن میں سیّدی عبدالعزیز دباغ کے ہمراہ باب الحدید کے پاس سے گزر رہا تھا کہ آپ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا' کوئی بھی شخص اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل نہیں کر سکتا جب تک اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت حاصل نہ ہو جائے اور کسی بھی شخص کو اس وقت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت حاصل نہیں ہو سکتی جب تک اسے اپنے شیخ کی معرفت حاصل نہ ہو اور شیخ کی معرفت اس وقت تک نصیب نہیں رہے گی اور وہ اپنے کسی بھی قول یا فعل میں لوگوں سے بے پرواہ ہو گا تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اس طرح اس کے شاملِ حال ہو گی جس کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) سیّدی عبدالعزیز دباغ ایسے شخص کو بہت پسند کرتے تھے جو لوگوں سے بے پرواہ ہو اور اس بارے میں آپ نے بہت سے اسرار بھی بیان کیے ہیں۔

وان نظم الحق الكرامات اسطرا

فلا تبدين حرفا لغيرك من سطر

سری الشیخ لاتكتمه سر افانه

بساحة كشف السر يجری علی بحر

''اگر اللہ تعالیٰ تمہیں کرامات عطا کرے تو تم اپنے شیخ کے علاوہ اور کسی کے سامنے اس کا ایک حرف بھی ظاہر نہیں کرنا لیکن شیخ سے کوئی راز پوشیدہ نہیں رکھنا کیونکہ راز سے آگاہی کے معاملے میں شیخ

کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص پانی پر چل رہا ہو۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ جب کوئی شخص تمام لوگوں سے بے نیاز ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اس طرح اس کی شاملِ حال ہوتی ہے جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا اسی لیے شاعر کہتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی رحمت تمہاری شاملِ حال ہو اور تمہارے سامنے کرامات (اسرار) کا ظہور ہو تو ادب کا تقاضہ یہ ہے کہ تم کسی کے سامنے ان کا ذکر نہ کرو البتہ اپنے شیخ سے کوئی بات چھپانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ تمہارا معالج ہے اور تمہاری خرابیوں سے آگاہ ہے جو معرفت سے دُوری کا باعث بنتی ہیں لہٰذا وہ شیخ اس بات کا حق دار ہے کہ اس کے سامنے اسرار کا تذکرہ کیا جائے اور کوئی بھی بات اس سے پوشیدہ نہ رکھی جائے لہٰذا وہ شیخ تمہاری باطنی خامیوں سے آگاہی کے باعث اسی طرح ہوگا جیسے وہ پانی پر چلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

(شیخ شہاب الدین سہروردی) عوارف المعارف میں تحریر کرتے ہیں' مریدین کے آداب میں یہ بات شامل ہے کہ مرید اپنی روحانی کیفیت اور اللہ تعالیٰ کی عنایات کے بارے میں ہر بات سے شیخ کو آگاہ رکھے اگر کسی بات کو وضاحت سے بیان کرتے ہوئے شرم محسوس ہو تو علامتی طور پر یا اشارے کنائے میں اس کا تذکرہ کرے اگر کوئی مرید کوئی بات صراحتاً یا کنایتاً شیخ کے سامنے بیان نہیں کرے گا تو اس کے باطن پر ایک گرہ لگ جائے گی اور یہ گرہ اس وقت کھلے گی جب مرید اس بات کا تذکرہ شیخ کے سامنے کرے گا۔

شیخ سہروردی اس کے بعد مشائخ کے آداب کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ مشائخ کے لیے یہ بات ضروری ہے کہ وہ اپنے مریدین کی روحانی کیفیات کا علم اپنی ذات تک محدود رکھیں یعنی مرید کی کیفیت سے اللہ تعالیٰ اور شیخ کے علاوہ اور کوئی آگاہ نہ ہو اس کے بعد شیخ مرید کو یہ تلقین کرے کہ خلوت میں پیش آنے والی یہ کیفیات مثلاً کشف' ہاتفِ غیبی کی آواز سننا یا دیگر خوارق کی طرف پوری طرح متوجہ ہو جانا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے دُوری کا باعث بنتا ہے۔

سیّد دباغ کی مریدین پر شفقت

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک دن میں سیّدی عبدالعزیز دباغ کے ساتھ اس آیتِ کریمہ کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا:

اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى۔

''(اللہ تعالیٰ نے ارواح سے دریافت کیا) کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ انہوں نے عرض کی' جی ہاں! (تو ہی ہمارا پروردگار ہے)

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے اس کے بارے میں بہت سی نفیس باتیں بیان فرمائیں جن کی میں نے تاویل کی اور یہ تاویل نماز کے دوران میرے ذہن میں آئی تھیں جب میں نے اس کا تذکرہ شیخ کے سامنے کیا تو آپ نے میری تائید کی لیکن کچھ دن بعد آپ نے ارشاد فرمایا' اسے ترک کر دو۔ مجھے اس کی حکمت سمجھ میں نہیں آئی

لیکن آپ نے اپنی بات پر اصرار کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اگر میں اپنے طرز عمل سے باز نہ آیا تو گمراہی کا شکار ہو جاؤں گا اس پر میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ سیّدی عبدالعزیز دباغ کی برکت سے مجھے نیکی کی توفیق مل گئی۔

ایک مرتبہ میں نے آپ کے سامنے ایک مسئلے کی شکایت کی تو آپ نے فرمایا' آئندہ کبھی بھی یہ مسئلہ دوبارہ تمہیں درپیش نہ ہوگا۔ گویا آپ نے میرے اور اس مسئلے کے درمیان دیوار قائم کردی۔ ایک مرتبہ میں نے ایک اور شکایت پیش کی جو میرے نزدیک دین اور دنیا دونوں میں نقصان کا باعث ہوسکتا تھا تو آپ نے فرمایا اس مسئلے میں تم دنیا کی فکر نہ کرو اس کے باعث دنیا میں تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا جہاں تک آخرت کا تعلق ہے تو میں اس بات کا ذمہ لیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں بھی تم سے اس کے بارے میں کوئی باز پرس نہیں فرمائے گا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) دنیا میں ایسا ہی ہوا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے امید ہے کہ حضرت کے بیان کے مطابق اللہ تعالیٰ معاملہ فرمائے گا۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ اپنے مریدین سے فرمایا کرتے تھے' دین یا دنیا سے متعلق اپنا کوئی بھی معاملہ مجھ سے نہ چھپایا کرو یہاں تک کہ اگر تم سے کسی گناہ کا ارتکاب ہو جائے تو بھی مجھے بتاؤ اگر تم مجھے نہیں بتاؤ گے تو پھر میں تمہیں بتا دوں گا کیونکہ ایسے ساتھ کا کوئی فائدہ نہیں ہے جس میں انسان اپنے ساتھی کو اپنے راز سے آگاہ نہ کر سکے۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ اکثر فرمایا کرتے تھے' میں تم سے اپنی کوئی بھی بات نہیں چھپاتا اور واقعی حضرت اپنے تمام احوال اور کیفیات مریدین کے سامنے ذکر کر دیا کرتے تھے۔ آپ یہ بھی فرماتے اگر میں تمہیں اپنے حالات سے آگاہ نہ کروں تو اللہ تعالیٰ مجھ سے ناراض ہوگا اور مجھ سے حساب لے گا کیونکہ تم میرے بارے میں نیک گمان رکھتے ہو۔ میں تمہیں اپنی باطنی کیفیت سے آگاہ کرتا ہوں جو تمہیں معلوم نہیں ہے اس کے بعد تمہیں اختیار ہوگا کہ میرے پاس رہو یا اُٹھ کے چلے جاؤ جب میں تمہیں اپنی کیفیات سے آگاہ کر دوں گا تو اس کے بعد میرے لیے تمہاری نذر قبول کرنا جائز ہوگا۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) سیّدی عبدالعزیز دباغ اپنے مریدین پر بہت مہربان تھے اور ان کی کوتاہیوں سے چشم پوشی فرمایا کرتے تھے' مصیبت کے وقت ان کی مدد کرتے اور ان کی مشکلات اپنے سر لے لیتے یہاں تک کہ آپ اپنی ضروریات سے زیادہ اپنے مریدین کی ضروریات کا خیال رکھتے تھے۔

ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا' جو شخص بُرائیوں میں اپنے دوستوں کے ساتھ شریک نہ ہو' اسے دوست نہیں کہا جا سکتا اگر تعلق صرف نیکیوں کی حد تک محدود ہو تو وہ حقیقی تعلق نہیں ہوگا۔ مختصر یہ کہ آپ مریدین کے حق میں اللہ تعالیٰ کی رحمت تھے اگر میں آپ کی دیگر خصوصیات کا تذکرہ شروع کروں تو بات بہت پھیل جائے گی تاہم اس ساری گفتگو کے ذریعے شیخ سہروردی کی اس بات کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے کہ ''شیخ کی معیت میں عقدے حل ہو جاتے ہیں۔''

وفي الكشف ان كوشفت راجعه انه

لتوضيح ما كوشفت مبتسم الثغر

''اگر تمہیں کشف نصیب ہو تو اسے بھی وضاحت کے لیے شیخ کے سامنے بیان کرو کیونکہ شیخ راضی خوشی اس کشف کی وضاحت کر دے گا۔''

شیخ سہروردی فرماتے ہیں' بعض اوقات کسی مرید کے سامنے روحانی حقائق ایسی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں جن سے وہ مرید ناواقف ہوتا ہے حالانکہ یہ سب کشف کا نتیجہ ہوتا ہے جو کبھی دیکھ کر اور کبھی سُن کر حاصل ہوتا ہے بعض اوقات مرید کو اپنے ہی باطن سے آواز سنائی دیتی ہے اور کبھی ہوا کے دوش پر آواز آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے جیسے کوئی ہاتفِ غیبی کلام کر رہا ہو اس کے نتیجے میں اس مرید کو یہ اطلاع مل جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے کیا حکم صادر کر رہا ہے۔ گویا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والی ایک اطلاع ہوتی ہے جس کے نتیجے میں اس مرید کا یقین زیادہ ہو جاتا ہے اور پھر بعض اوقات اس سے بھی بڑھ کر انسان اس یقین کا مشاہدہ کرتا ہے کیونکہ بعض اوقات برہمنوں' فلسفیوں' دہریوں اور راہبوں کو بھی کشف (کے ابتدائی مراتب) نصیب ہو جاتے ہیں لیکن ان کے لیے وہ کشف فریب کاری کا باعث ہوتا ہے تاکہ وہ اپنے کمالات کو حق سمجھتے ہوئے کفر پر ثابت قدم رہیں لیکن ایک سچا مسلمان سالک یہ بات جانتا ہے کہ وہ اگر پانی پر بھی چلنے لگے تو بھی یہ ایک بے کار کمال ہوگا۔ اصل کمال تقویٰ اور زہد ہے اسی لیے کشف کے ان خطرات سے بچنے کے لیے مرید کو شیخ کی طرف رجوع کرنے کی نصیحت کی جاتی ہے۔

ولا تنفرد عنه بواقعة جرت

ففي غشي عيناك والسمع في وقر

''کسی بھی واقعے کے ظہور کے وقت خود کو شیخ سے الگ نہ سمجھو کیونکہ تمہاری بصیرت کمزور ہے اور سماعت میں بھی نقص پایا جاتا ہے۔''

واقعہ اور کشف میں فرق

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس شعر کے پہلے مصرعے میں لفظ ''واقعہ'' شیخ سہروردی کے کلام سے ماخوذ ہے جن کے نزدیک مثالی صورت میں حقائق کے ظہور کو واقعہ کہا جاتا ہے لیکن کشف' حقیقت کے ایسے ظہور کو کہتے ہیں جس کا تعلق عالم مثال کے ساتھ نہ ہو جیسے ایک شخص خواب میں دیکھے کہ وہ دشمن پر غالب آ گیا ہے تو اب اس خواب کی تعبیر کی کوئی ضرورت نہیں ہے لیکن جب مثالی صورت میں یہ بات القاء کی جائے گی تو اس کی صورت یہ ہوگی کہ یہ شخص یہ خواب دیکھے کہ اس نے کسی سانپ کو مار دیا ہے اس دوسری صورت میں غالب آنے کو ایک علامتی شکل میں دِکھایا گیا ہے اس لیے یہ خواب تعبیر کا محتاج ہوگا لہٰذا انسان جب بیداری کی حالت میں کسی علامتی شکل کے بغیر کسی چیز کا مشاہدہ کرتا ہے تو اسے ''کشف'' کہا جائے گا لیکن اگر وہ علامتی شکل میں کسی چیز کا مشاہدہ

کرتا ہے تو اسے ''واقعہ'' قرار دیا جائے گا۔ بعض اوقات علامتی شکل بھی کسی خاص حکمت سے خالی ہوتی ہے اور اس کی مثال کسی بھی عام خواب کی سی ہوتی ہے لیکن اصطلاحی طور پر اسے ''واقعہ'' قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ ''واقعہ'' صرف اسی صورت میں ہوگا جب ذکر میں اخلاص ہو اور پھر ذکر میں استغراق بھی ہو جس کی نشانی یہ ہے کہ ذاکر دنیا سے بے رغبت ہو اور متقی و پرہیزگار ہو لہٰذا شعر کا مطلب یہ ہوگا کہ تمہاری بینائی اور سماعت کمزور ہے کسی بھی مشاہدے کے ''واقعہ'' ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں شیخ ہی تمہاری رہنمائی کر سکتا ہے کیونکہ اس کے اندر حقیقت کو پرکھنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔

(شیخ شہاب الدین عمر سہروردی) عوارف المعارف میں تحریر کرتے ہیں:

''شیخ کی طرف رجوع کیے بغیر کوئی بھی مرید کسی بھی ''واقعہ'' یا ''کشف'' کو مستقل تصور نہ کرے کیونکہ شیخ کا علم اس سے زیادہ ہے اور اللہ تعالیٰ کا فضل بھی اس پر زیادہ ہے لہٰذا اگر مرید کا مشاہدہ درست ہوگا تو شیخ اسے درست قرار دے گا اور اگر اس میں کوئی شبہ ہوگا تو شیخ اس کو زائل کر دے گا۔'' (احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس کے بعد حضرت شیخ سہروردی نے اس موضوع پر نہایت تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

شیخ سہروردی یہ بھی فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے شیخ کی جو کرامات دیکھی ہیں' ان میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ایک دن آپ نے اپنے مریدین سے فرمایا' مجھے مزید علم کی ضرورت ہے اس لیے تم سب خلوت میں جاؤ اور جس چیز کا مشاہدہ ہو' اسے میرے سامنے آ کے بیان کرو۔ (مریدین نے اس پر عمل کیا) کچھ دیر بعد آپ کا ایک مرید جس کا نام اسمٰعیل تھا' حاضرِ خدمت ہوا اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ موجود تھا جس پر تیس (۳۰) دائرے بنے ہوئے تھے اس نے عرض کی' میں نے اس چیز کا مشاہدہ کیا ہے۔ شیخ نے وہ کاغذ پکڑ لیا' کچھ دیر بعد ایک شخص وہاں آیا جس کے پاس کچھ اشرفیاں تھیں جو اس نے شیخ کی خدمت میں پیش کر دیں۔ شیخ نے انہیں گنا تو ان کی تعداد بھی تیس (۳۰) تھی تو آپ نے فرمایا یہ اسمٰعیل بھائی کے کشف کا نتیجہ ہے۔

سہروردی مزید لکھتے ہیں' بعض اوقات حقائق خیالی اور کبھی مثالی شکل (علامتی شکل) میں بھی ظاہر ہوتے ہیں جیسے ایک شخص خواب میں دیکھے کہ اس نے کسی سانپ کو مارا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے دشمن پر غالب آ جائے گا۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس کے بعد شیخ سہروردی نے ''واقعہ'' اور ''کشف'' ''صحیح واقعہ'' اور خام خیالی کے درمیان فرق کی وضاحت کرتے ہوئے تفصیلی بحث تحریر کی ہے' ہم نے اس کی تلخیص یہاں نقل کر دی ہے:

وفر الیہ فی المہمات کلہا

فانک تلقی النصر فی ذلک الفر

''اور ہر اہم معاملے میں شیخ ہی کی طرف بھاگو کیونکہ اس کی طرف دوڑنے کے نتیجے میں ہی تمہیں کامیابی نصیب ہو سکے۔''

شیخ شہاب الدین عمر سہروردی تحریر کرتے ہیں' مرید کو یہ اعتقاد رکھنا چاہیے کہ شیخ ایک ایسا دروازہ ہے جس سے گزر کر ہی وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوسکتا ہے وہاں سے واپس آ سکتا ہے اور شیخ اس کی تمام حاجات کی تکمیل میں مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔ مرید کو یہ اعتقاد بھی رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس شیخ کے وسیلے سے اس پر انعامات نازل فرماتا ہے۔ نیز جس طرح وہ مرید شیخ کی طرف رجوع کرتا ہے اسی طرح شیخ اللہ تعالیٰ کی طرف صرف اس مرید کی بہتری کے لیے رجوع کرتا ہے۔ نیند اور بیداری ہر حالت میں گفتگو اور تبادلہ خیال کے لیے شیخ ہی کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے اور شیخ' مرید میں اپنی مرضی سے تصرف نہیں کرتا کیونکہ وہ مرید شیخ کے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہوتا ہے اور جس طرح شیخ اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتا ہے اسی طرح مرید کی دینی اور دنیاوی ضروریات کی تکمیل کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دست بدعا رہتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا. (الشوریٰ ۴۲:۵۱)

''کسی بشر میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ کلام کرے سوائے (ان تین صورتوں کے) وحی' حجاب کے پیچھے سے (آنے والی آواز کی صورت میں) یا کسی فرشتے کے ذریعے۔''

فرشتے کی آمد اور وحی انبیاء کرام کے ساتھ مخصوص ہے البتہ حجاب کے پیچھے سے کلام اولیاء سے کیا جاتا ہے جیسے الہام' خواب اور ہاتفِ غیبی کی وساطت وغیرہ۔

شیخ سہروردی تحریر کرتے ہیں' شیخ کی بارگاہ میں جن آداب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے' ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مرید اس وقت تک شیخ کے سامنے کسی بھی دینی یا دنیاوی مسئلے میں زبان نہ کھولے جب تک اسے یہ یقین نہ ہو کہ شیخ اس کی بات سننے کے لیے مکمل طور پر آمادہ ہے۔ دعا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کلام کی مانند ہے اس لیے اس کے مخصوص آداب ہیں اسی طرح شیخ سے مخاطب ہونے کے بھی کچھ آداب ہیں کیونکہ یہ بالواسطہ طور پر اللہ تعالیٰ سے ہی کلام کرنا ہے لہٰذا مرید کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ دعا کرتا رہے کہ اللہ تعالیٰ اسے شیخ کی بارگاہ کے آداب کا لحاظ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) سیدی عبدالعزیز دباغ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا' مرید کے لیے شیخ کی وہی حیثیت ہے جو کلمۂ طیبہ کی ہے کیونکہ شیخ ہی اپنے مرید کے ایمان اور دیگر تمام دینی و دنیاوی امور کا نگہبان ہوتا ہے۔ اہلِ بصیرت کشفی طور پر اس کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) پہلے مجھے آپ کے مراتب کا علم نہیں تھا اور میں اکثر آپ کے ساتھ گھومتا پھرتا رہتا تھا' آپ اکثر یہ بات ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ تمہاری مثال اس شخص کی مانند ہے جو فصیل شہر پر چل رہا ہو یعنی اس کے چلنے کے لیے پاؤں کے نیچے جگہ بہت تنگ ہے اور اگر وہ گر جاتا ہے تو بہت بلندی سے نیچے گرے گا۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی' کافی عرصے بعد جب اس کا مفہوم میرے

سامنے واضح ہوا تو میرے اوپر کپکپی طاری ہوگئی۔

ایک دن میں نے آپ کی خدمت میں عرض کی' مجھے اپنے چند معاملات کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے بہت ڈر لگتا ہے۔ آپ نے دریافت کیا' کون سے معاملات؟ میں نے سب ذکر کر دیئے' آپ نے فرمایا' تم اس طرح کی باتوں سے نہ ڈرو' تمہارے حق میں سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ تم پر کوئی ایسی گھڑی آ جائے جب میں تمہارے پاس موجود نہ رہوں کیونکہ یہ وہ معصیت ہے جو دین و دنیا میں تمہارے لیے مضر ثابت ہوگی۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک مرتبہ میں نے عرض کی' میں بھلائی سے بہت دُور ہوں تو آپ نے ارشاد فرمایا' یہ خیال دل سے نکال دو اور میری نظر میں تمہارا جو مقام ہے' اسے ہمیشہ پیشِ نظر رکھو کیونکہ یہی تمہاری حقیقت ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) آپ اپنے مریدین پر اتنے مہربان تھے کہ اس کی مثال کم ہی دِکھائی دیتی ہے۔ ہم اپنے تمام معاملات آپ کے سامنے ذکر کر دیا کرتے تھے اور آپ انہیں اپنے ذمے لے لیتے اور یہ فرمایا کرتے کہ تم اب اس بارے میں فکر مند نہ ہونا' آپ ہمارے ساتھ خوش طبعی بھی فرمایا کرتے اور بعض اوقات ہمارے ذکر کرنے سے پہلے ہی ہمارے مسئلے کا جواب خود ہی عنایت کر دیتے۔ آپ ہم سے یہ کہا کرتے تھے' تم مجھے اپنا شیخ نہ سمجھو' میں تمہارا بھائی ہوں' تم شیخ کے آداب پورے نہیں کر سکتے لہٰذا میں تم سے درگزر کرتا ہوں اور اس کے بجائے تمہارے ساتھ رشتہ اخوت قائم کرتا ہوں تاکہ ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھی رہیں۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) اللہ تعالیٰ ہماری طرف سے سیّدی عبدالعزیز دباغ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آپ کی مہربان طبیعت کے بارے میں چند باتوں کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اگر ہم اس کی تفصیل بیان کرنا شروع کریں تو گفتگو بہت طویل ہو جائے گی۔

اعمال پر فخر ممنوع ہے

ولا تکن ممن یحسن الفعل عندہٗ
فیفسد الا ان یفر الی الکسر

''تم اپنے اعمال پر فخر نہ کرو تاکہ یہ ضائع نہ ہوں بلکہ کسرِ نفسی اختیار کرو۔''

اس شعر میں اپنے اعمال پر فخر کرنے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ فخر اعمال کو ضائع کر دیتا ہے لیکن اگر تم فخر کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو گے تو اس صورت میں تمہارا کوئی ایک عمل بھی فاسد نہیں ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کے نتیجے میں تمہیں یہ پتہ چلے گا کہ تمہارا ہر عمل اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہے اور تمہاری مثال صرف ایک کٹھ پتلی کی سی ہے اگر تم اپنے کسی عمل پر فخر کرتے ہو تو گویا کسی اور کا فعل اپنی طرف منسوب کرتے ہو' یہ سوچ تمہارے اندر اللہ تعالیٰ کے بارے میں حیا پیدا کرے گی اور اس کی ناراضگی سے خوف زدہ ہو کر اور اس کے شکر کی ادائیگی کے لیے تم اپنی ذات پر فخر کرنا ترک کر دو گے کیونکہ کسی بھی عمل پر فخر کرنا اس بات کی علامت ہے کہ وہ عمل مقبول نہیں ہے۔

ایک بزرگ ارشاد فرماتے ہیں' کسی نیک عمل کی قبولیت کی دلیل یہ ہے کہ تم اسے بھول جاؤ اور تمہاری توجہ کبھی بھی اس کی طرف مبذول نہ ہو کیونکہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ (فاطر ۳۵:۱۰)

''اور نیک عمل کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کر دیا جاتا ہے۔''

لہٰذا جب کسی نیک عمل کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کر دیا جائے تو اس کا بدیہی مطلب یہ ہوگا کہ اب تمہارے پاس کچھ بھی باقی نہیں لیکن اگر تمہاری توجہ اپنی نیکی کی طرف مرکوز رہے تو سمجھ جاؤ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ تک نہیں پہنچ سکی ہے۔

امام السیّد السجاد زین العابدین ارشاد فرماتے ہیں:

''اگر تمہاری توجہ اپنے عمل کی طرف مرکوز رہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ عمل مقبول نہیں ہے کیونکہ مقبول عمل کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کر دیا جاتا ہے اور تم اس سے غافل ہو جاتے ہو لہٰذا تم جس عمل سے لاتعلق ہو جاؤ' وہی عمل مقبول ہوگا۔''

ومن حل من صدق الانابة منزلا
یری العیب فی افعاله وهو مستبری

''جو شخص صدقِ نیت کے ساتھ (اللہ تعالیٰ کی طرف) رجوع کر کے کسی مقام تک پہنچ جائے اس کی نظر میں اس کے اپنے افعال غلطیوں کا مجموعہ ہوتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو ان سے بَری سمجھتا ہے۔''

یعنی جب کوئی شخص صدقِ دل سے' مکمل طور پر' اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے تو وہ ایسے مقام پر فائز ہو جاتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول کے لیے کیے جانے والے تمام اعمال اس کی نظر میں عیوب سے پُر ہوتے ہیں اس لیے اگرچہ وہ عیب سے بَری ہوتے ہیں اور اس نے ان اعمال کی انجام دہی کے دوران شریعت اور طریقت کے تمام اصولوں کی پاس داری کی ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ یہ سمجھتا ہے کہ شاید مجھ سے کوئی ایسی غلطی سرزد ہو گئی ہو جس کی طرف میری توجہ مبذول نہیں ہو سکی۔

شیخ ابو یعقوب اسحاق بن محمد فرماتے ہیں جس شخص کے تمام اعمال اللہ تعالیٰ کے سپرد ہوں اس کی نشانی یہ ہے کہ اسے اپنی (نیت کے اخلاص میں کمی نظر آئے گی' اپنے ذکر کو غفلت سمجھے گا' اپنا صدق اس کی نظر میں ناقص ہوگا۔ مشاہدہ' مشکوک سمجھے گا اور اپنا فقر اسے غیر محتاط دِکھائی دے گا لہٰذا ہر حالت اس کے نزدیک خامیوں سے پُر ہوگی اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف زیادہ شدت کے ساتھ رجوع کرے گا۔

شیخ ابو عمر اسمٰعیل بن نجید ارشاد فرماتے ہیں' کوئی بھی شخص بندگی میں اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتا جب تک اس کے نزدیک اس کے اپنے تمام افعال دِکھاوا نہ ہوں اور تمام احوال کی حالت محض چند جھوٹے دعووں کی

سی ہو کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل شاملِ حال نہ ہو تو نفس صرف برائی کی طرف ہی راغب کرتا ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا۔(النور ۲۴:۲۱)

''اگر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم تمہارا شاملِ حال نہ ہو تو تم میں سے کوئی ایک بھی کبھی بھی پاک (پرہیزگار) نہیں بن سکتا۔''

ایک اور مقام پر قرآن نے کسی قائل (حضرت یوسف علیہ السلام) کا یہ قول نقل کیا ہے:

وَمَا اُبَرِّئُ نَفْسِيْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ۔(یوسف ۱۲:۵۳)

''میں اپنے نفس سے بے پرواہ نہیں ہوں کیونکہ یہ گناہ کی طرف بہت زیادہ راغب کرتا ہے سوائے اس شخص کے جس پر میرا رب رحم فرمائے۔''

ایک بزرگ ارشاد فرماتے ہیں' ہر وقت اللہ ہی کا فضل شاملِ حال ہے اور اسی نے ہماری پردہ پوشی کر رکھی ہے اگر یہ پردہ ہٹ جائے تو ہماری برائیاں سب کے سامنے ظاہر ہو جائیں۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) یہی وجہ ہے کہ اکابر اولیاء اپنے بڑے بڑے اعمال سے بھی بے زاری کا اظہار کیا کرتے تھے۔

شیخ بایزید فرماتے ہیں' اگر میں ایک مرتبہ صحیح طریقے سے کلمہ طیبہ ہی پڑھ لوں تو میرے لیے یہی بہت ہے۔

شیخ ابوسلیمان دارانی فرماتے ہیں' میں نے آج تک کبھی کوئی نیک عمل نہیں کیا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں جس قصیدے کی تشریح ہم نے بیان کی ہے) اسے شیخ امام ابوالعباس احمد بن محمد بن احمد بن محمد بن احمد بن خلف القرشی البکری نے منظوم کیا ہے' آپ 581ھ میں ''سلا'' میں پیدا ہوئے' مراکش میں نشوونما پائی اور مصر کے شہر ''الفیوم'' میں مستقل رہائش پذیر ہوئے۔ یہیں 641ھ میں ربیع الاول کے مہینے میں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ یہاں ''تاج الدین'' کے لقب سے معروف تھے اور آپ کی کنیت ابوالعباس تھی۔ آپ علم نحو' ادب' شاعری کے زبردست ماہر تھے' علم کلام میں بھرپور دسترس تھی' اصولِ فقہ سے بخوبی آگاہ تھے اور علمِ تصوف میں بلند مرتبے کے مالک تھے۔ تصوف سے آپ کو خاص دلچسپی تھی اور آپ نے تصوف کے موضوع پر نظم اور نثر میں تصانیف یادگار چھوڑی ہیں' آپ کے مرتبہ و مقام کا اندازہ اس قصیدے سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جس کا نام ''انوار السرائر وسرائر الانوار'' ہے۔ یہ قصیدہ بہت مشہور ہوا' اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ ایک مختصر اور جامع کاوش ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں' یہ قصیدہ اہلِ طریقت کے لیے حجت ہے اور مشائخ اپنے مریدین کو اس کا ورد کرنے اور اس پر عمل کرنے کی تلقین کرتے رہے ہیں۔ شیخ ابوعبداللہ محمد الخزمیری اپنے مریدین کو اس کی بہت تلقین کیا کرتے تھے اور ان کے مریدین بھی اہتمام سے اسے پڑھا کرتے تھے جو شخص باقاعدگی سے اسے پڑھے اسے بہت فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ شیخ ابوعبداللہ بعض اوقات خود بھی مریدین کے سامنے اس کی تشریح بیان کیا

کرتے تھے۔

اس قصیدے کے ناظم ابوالعباس البکری القرشی نے ابتدائی تعلیم مراکش میں حاصل کی پھر مزید علم کے حصول کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ آپ نے فاس میں اصول فقہ کے مشہور ماہر' امام شیخ ابوعبداللہ محمد بن عبدالکریم سے استفادہ کیا جو ابن الکتانی العبدلاوی کے نام سے مشہور ہیں اس کے علاوہ آپ نے مشہور نحوی شیخ ابوزرمصعب الحسنشنی سے بھی استفادہ کیا جو مشہور صحابی رسول حضرت ابوثعلبہ الحسنشنی کی اولاد میں سے ہیں اس کے علاوہ شیخ ابوالعباس بن ابوالقاسم بن القفال بھی آپ کے اساتذہ کی فہرست میں شامل ہیں۔

اس کے بعد شیخ ابوالعباس القرشی (جو اس قصیدے کے ناظم ہیں) اندلس تشریف لے گئے اور وہاں کے اہلِ علم سے استفادے کے بعد مختلف مشرقی ممالک کا سفر کیا۔ بعدازاں حج کی ادائیگی سے سرفراز ہوئے' بغداد میں آپ نے امام ابومحمد عبدالرزاق سے فیض حاصل کیا جو قطب الصدیقین' حجۃ اللہ للعارفین' محی الملتہ والدین' ابومحمد عبدالقادر الجیلانی کے صاحب زادے ہیں۔ ان کے علاوہ مشہور مؤرخ ومحدث ابوالحسن محمد بن احمد القطیعی اور ابومحمد قیس بن فیروز الحنبلی سے فیض حاصل کیا۔ علم کلام کا درس شیخ تقی الدین مظفر الازوی الشافعی سے لیا۔ اسکندریہ میں امام شمس الدین الابیاری المالکی سے اصولِ فقہ کا فن سیکھا۔

آپ نے بغداد میں' اہلِ حقیقت کے سلطان' شہاب الدین ابوالحفص عمر بن محمد بن عبداللہ بن محمد عبداللہ القرشی التیمی البکتری الصدیقی الشافعی کے دستِ اقدس پر بیعت کا شرف حاصل کیا جو ''سہروردی'' کے نام سے مشہور ہیں اور ان کی تصنیف ''عوارف المعارف'' اس قصیدے کا بنیادی ماخذ ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

فصل

سیّدی دباغ کے مشائخ کا تذکرہ

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) شیخ تربیت' اس کے آداب' مریدین کے آداب کے تذکرے کے بعد ہم نے مناسب سمجھا کہ ان مشائخ کا تذکرہ بھی کر دیا جائے جن سے سیّدی عبدالعزیز دباغ کو روحانی فیض حاصل ہوا۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں' مجھے دس اولیائے کرام کا روحانی وارث بننے کا شرف حاصل ہوا ہے جن میں سے ایک شیخ عمر بن محمد الھواری ہیں جو شیخ علی بن حرزہم کی درگاہ کے سجادہ نشین تھے' دوسرے سیّدی عبداللہ البرناوی ہیں جو اپنے وقت کے قطب تھے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) ان حضرات سے حضرت کی ملاقات کا تذکرہ ہم کتاب کے آغاز میں تحریر کر چکے ہیں۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں' سیّدی اللہ البرناوی کو ستر (۷۰) سے زیادہ اسمائے حسنیٰ کے انوار عطا کیے گئے۔

سیّدی یحیٰی کے تصرفات

تیسرے بزرگ' سیّدی یحیٰی ہیں' آپ بھی قطبِ وقت تھے' ظاہری اور باطنی دونوں طرف سے شریعتِ محمدیہ کے احکام کی سختی سے پیروی کرتے تھے۔ مرحوم بزرگوں کے مزارات پر دعا کرنے والے زائرین کی حاجات کا جائزہ لینا اور حسبِ مشیت الٰہی ان کی تکمیل' آپ ہی کے ذمہ تھی۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) سیّدی دباغ نے یہ بات مجھے اس وقت بتائی جب میں نے آپ سے بزرگوں کے مزارات پر جا کر دعا کرنے کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ آپ نے فرمایا' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے قلوب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بڑی شان کے مالک ہیں یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے چند افراد اگر کسی ایسی جگہ پر اکٹھے ہو جائیں جہاں درحقیقت کوئی بھی شخص دفن نہیں ہے لیکن لوگ یہ سمجھتے ہوں کہ وہاں کوئی ولی دفن ہے تو اللہ تعالیٰ اس مقام میں یہ فضیلت پیدا کر دیتا ہے کہ وہاں کی جانے والی دعا جلد قبول ہوتی ہے۔ آج کل (جب یہ گفتگو ہو رہی تھی) سیّدی یحیٰی اسی تصرف پر مامور ہیں۔ بعض اوقات یہی صورت زندہ لوگوں کے بارے میں بھی پیش آ جاتی ہے۔ مثلاً کوئی شخص درحقیقت ولی نہیں ہے لیکن لوگ اسے ولی سمجھتے ہوئے دعا کے لیے اس کے پاس آتے ہیں تو اہلِ تصرف اس شخص کی دعا کا اثر بھی ظاہر کر دیتے ہیں تا کہ گناہ گار لوگ اسی بہروپے تک محدود رہیں اس وقت اس بہروپے کی مثال اس ڈھانچے کی سی ہوتی ہے جسے کسان کھیت کے درمیان کھڑا کر دے اور پرندے اسے انسان سمجھتے ہوئے اس سے خوف زدہ رہیں اب درحقیقت اس ڈھانچے کا کوئی عمل نہیں ہے بلکہ اصل عمل کسان کا ہے اسی

طرح اہلِ تصرف اولیائے کرام لوگوں کے سامنے نمائشی ڈھانچہ کھڑا کر دیتے ہیں' لوگ اسی کی طرف متوجہ رہتے ہیں اور یوں اہلِ تصرف ان سے پوشیدہ رہتے ہیں ویسے بھی اکثر لوگ اہلِ تصرف سے فیض حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تاہم ان اہلِ تصرف اولیائے کرام کا تمام تر تصرف مشیتِ الٰہی کے تابع ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے یہ واقعہ بیان کیا' ایک شخص رات کے وقت سفر کر رہا تھا' راستہ پُرخطر تھا اور اس راستے کے آغاز اور درمیان میں دو لٹیرے بیٹھے ہوئے تھے اس خطرناک علاقے میں داخل ہونے سے پہلے مسافر نے اپنے پیر کو پکارا' یا سیّدی فلاں! نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے اس سفر کے دوران میری حفاظت کریں۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر نذر پیش کروں گا حالانکہ اس مسافر کا پیر ایک بہروپیا تھا لیکن ایک صاحبِ تصرف ولی نے اس کی پکار سُن لی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے کا خیال کرتے ہوئے اس مسافر کی مدد کی اور اس مسافر نے بخیریت وہ راستہ عبور کر لیا' دونوں لٹیروں کی آنکھوں پر پردہ پڑا رہا اور وہ کچھ بھی نہ کر سکے۔ مسافر کو یہ یقین ہو گیا کہ اس کے پیر نے اس کی مدد کی ہے لہٰذا وہ اپنے پیر کی خدمت میں حاضر ہوا اور چار مثقال سونا بطورِ نذر پیر صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔

(سیّدی عبدالعزیز دباغ جن اولیاء کے روحانی وارث ہوئے ہیں ان میں سے تیسرے بزرگ) سیّدی منصور بن احمد ہیں۔ آپ جبل حبیب کے رہنے والے تھے اور مرتبۂ قطبیت پر فائز تھے' سمندروں سے متعلق امور آپ ہی کے زیر نگرانی تھے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے مجھے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا' تم نے کبھی غور کیا ہے جب گوشت کو کاٹا جا رہا ہو تو بعض اوقات وہ پھڑکنے لگتا ہے؟ میں نے عرض کی' جی ہاں! آپ نے فرمایا جب سیّدی منصور بن احمد کو فتح نصیب ہوئی تو ان کی بھی یہی کیفیت ہو گئی' اللہ تعالیٰ کی عظمت اور جلال کے خوف سے ہر وقت ان پر لرزہ طاری رہتا تھا اور ایک طویل عرصے تک ان کی یہی کیفیت رہی۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ان دونوں حضرات یعنی سیّدی یحییٰ اور سیّدی منصور کے بہت سے علمی اور روحانی ملفوظات ہمارے سامنے بیان کیے ہیں بلکہ اکثر اوقات آپ یہ فرمایا کرتے تھے' میں سیّدی یحییٰ اور سیّدی منصور فلاں جگہ گئے یا یہ کہتے کہ سیّدی یحییٰ نے یہ کیا اور سیّدی منصور نے وہ کیا اور میں نے یہ کیا لیکن یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں سیّدی عبدالعزیز دباغ سے نیا نیا متعارف ہوا' جس وقت میں نے سیّدی دباغ کے ملفوظات قلم بند کرنے شروع کیے اس وقت ان دونوں حضرات کا انتقال ہو چکا تھا۔

(چوتھے بزرگ) سیّدی محمد سراج ہیں آپ انجرا کے رہنے والے تھے' آپ بھی قطب تھے' آپ کے ساتھ سیّدی دباغ کی پہلی ملاقات کا تذکرہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ سیّدی دباغ نے آپ کے بارے میں صرف تین واقعات بیان کیے ہیں جو ہم اس سے پہلے ذکر کر چکے ہیں۔

(پانچویں بزرگ) شیخ احمد بن عبداللہ مصری ہیں جو اپنے وقت کے غوث تھے۔ کتاب کے آغاز میں ہم ان

کا ایک واقعہ نقل کر چکے ہیں جس میں انہوں نے حضرت کو ایک نصیحت کی تھی۔

(چھٹے بزرگ) سیّدی علی بن عیسی المغربی ہیں' آپ بھی اپنے وقت کے قطب تھے اور شام کے رہنے والے تھے۔ حضرت نے ان کی مراکش سے شام منتقلی کا واقعہ تفصیل سے بیان کیا تھا لیکن کیونکہ یہ بہت پہلے کی بات ہے اس لیے اب مجھے صحیح طرح سے یاد نہیں۔

(ساتویں' آٹھویں اور نویں بزرگ) سیّدی محمد بن علی الکیمونی' سیّدی محمد المغربی اور سیّدی عبداللہ الجراز ہیں۔ سیّدی عبداللہ الجرار بھی مراکش کے رہنے والے تھے۔ ۱۱۲۹ھ میں سیّدی عبدالعزیز دباغ کو ایک اور بزرگ کی روحانی وراثت نصیب ہوئی جن کا نام سیّدی ابراہیم لملوتھا' آپ نے جب پہلی مرتبہ ان کا نام بیان کیا تو مجھے یہ تلقین کی کہ اس نام کو یاد رکھنا لیکن کچھ دن بعد میں اس نام کو بھول گیا' آپ نے دوبارہ دریافت کیا تو پھر مجھے یاد نہیں آیا۔ آپ نے پھر ان کا نام بتایا تو میں نے تحریری طور پر نوٹ کر لیا۔ سیّدی ابراہیم لملو الجزائر کے رہنے والے تھے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے سیّدی عبدالعزیز دباغ سے دریافت کیا جن حضرات کے آپ روحانی وارث بنے ہیں' کیا ان کے درمیان کوئی فرق ہے؟ آپ نے فرمایا' ان سب سے مجھے اللہ تعالیٰ کی معرفت ہی حاصل ہوئی۔ اس کی مثال یوں بیان کی جاسکتی ہے کہ ایک گھوڑے پر ایک شخص سوار تھا' ایک شخص اس سوار کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا تھا اس نے کسی سے دریافت کیا تو جواب دینے والے نے گھوڑے کی خصوصیات بیان کرنا شروع کر دیں لیکن گھڑسوار کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ اگرچہ گھوڑے کی تعریف کرنے والے نے ایسا نقشہ کھینچا ہو کہ سننے والا یہ محسوس کرے جیسے اس نے خود اسے دیکھا ہے۔ گویا سننے والے کا علم بیان کرنے والے کا ممنونِ احسان ہے اور پھر ایک اور شخص آ کر گھڑسوار کا تذکرہ اس انداز میں کرے کہ سننے والا یہ محسوس کرے۔ گویا وہ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا ہے۔

آپ نے ایک مرتبہ ایک اور مثال بھی بیان کی۔ حضرت عمر بن محمد الھواری سے مجھے جو فیض حاصل ہوا ہے اس کی مثال ایسے ہے جیسے ایک شخص دوسرے سے کہے' تم میرے ساتھ اس راستے پر چلو' تمہیں پانی مل جائے گا لیکن وہ یہ نہ بتائے کہ کہاں جا کر پانی ملے گا لہٰذا وہ شخص چل پڑے اور اسے یہ نہیں معلوم کہ پانی کہاں مل سکے گا اور پھر جب وہ چشمے کے پاس پہنچ جائے تو اسے پانی کا پتہ چلے۔

ایک مرتبہ آپ نے یہ مثال بیان کی۔ سیّدی عمر کے ساتھ میرے تعلق کی مثال ایسے ہے جیسے ایک شخص دوسرے کے سامنے شکار چھوڑ کر چلا جائے اور دوسرا شخص یہ نہ سمجھ پائے کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے پھر ایک اور شخص آگ اور لکڑیوں کے ہمراہ آئے اور آگ جلا کر چھری اس کے ہاتھ میں تھمائے اور کہے' چھری پکڑو! اور اپنی مرضی کے مطابق گوشت کاٹ کر اسے کھاؤ۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا' کیا سیّدی عمر کو دوسری طرح کی فتح حاصل تھی؟ آپ نے

فرمایا' ہاں! مگران کی فتح کمزور تھی۔ میں نے دریافت کیا' کیا وہ دیوان میں حاضر ہوتے تھے؟ آپ نے فرمایا' ہاں! لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ دیوان میں حاضر ہونے والے ہر شخص کو دیوان سے متعلق تمام امور کا علم ہو۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) گویا دیوان کی مثال بھی مجلسِ علم کی مانند ہے جس میں حاضر ہونے والے ہر شخص کی معلومات کا معیار مختلف ہوتا ہے پھر میں نے دریافت کیا' سیّدی عمر کے ساتھ آپ کی پہلی ملاقات کیسے ہوئی؟ آپ نے فرمایا' پہلے میری ایسے بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی جو سر سے محروم تھے پھر اللہ تعالیٰ نے میرے دل کو سیّدی عمر کی طرف مائل کر دیا۔ آپ سے میری ملاقات سیّدی علی بن حرزہم کی درگاہ پر ہوئی' آپ وہاں کے متولی تھے اور ہم لنگر لینے کے لیے آپ کے پاس گئے تھے۔ میں نے غور سے آپ کو دیکھا تو آپ مجھے اچھے لگے۔ میں نے آپ سے وظیفہ مانگا مگر آپ نے کوئی جواب نہ دیا۔ میرے شوق میں اضافہ ہوا اور میں ایک رات سیّدی علی بن حرزہم کی درگاہ پر آپ کے ہمراہ ٹھہر گیا جہاں حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کا واقعہ پیش آیا۔ (جو کتاب کے آغاز میں ذکر کیا گیا ہے)

تلقین شیخ کا فائدہ

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک مرتبہ میں سیّدی دباغ کی خدمت میں موجود تھا کہ کسی صاحب نے دریافت کیا' مشائخ اپنے مریدین کو جس وظیفے کی تلقین کرتے ہیں اس کا کیا فائدہ ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا' تم صحیح بزرگوں کے بارے میں دریافت کر رہے ہو یا بہروپیوں کے بارے میں؟ اس نے عرض کی' صحیح بزرگوں کے بارے میں۔ آپ نے فرمایا' اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کے لوگوں کے دین کو شریعت کے احکام کی بدولت محفوظ کیا ہے لہٰذا جب تم شریعت کے کسی حکم پر ظاہری طور پر عمل کرو گے تو اللہ تعالیٰ باطن میں تمہارے ایمان کو محفوظ کر دے گا اور کامل شیخ کا باطن مشاہدۂ حق سے معمور ہوتا ہے۔ مرید' شیخ سے ملاقات سے پہلے اگر ایک مرتبہ کلمہ پڑھتا ہے تو صرف اس کی زبان کلمے کا ورد کرتی ہے مگر اس کا دل غافل ہوتا ہے البتہ شیخ اپنے عظیم مشاہدے کی بدولت اس کلمے کو مرید کے باطن میں اُجاگر کرتا ہے لہٰذا جب کوئی شیخ مرید کو کسی وظیفے کی تلقین کرتا ہے تو شیخ کا روحانی فیض مرید کے باطن میں سرایت کرنا شروع کرتا ہے یہاں تک کہ وہ مرید ترقی حاصل کرتا چلا جاتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کی مرضی ہو تو خود وہ مرید بھی مرتبۂ مشیخیت پر فائز ہو جاتا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس کے بعد حضرت نے مثال کے طور پر ایک مشہور کہانی سنائی۔ ایک بادشاہ کا ایک ہی بیٹا تھا' بادشاہ اس سے شدید محبت کرتا تھا' ایک مرتبہ وہ بچہ بیمار ہو گیا۔ بادشاہ نے طبیبوں کو بلوا کر کہا اگر یہ بچہ تندرست نہ ہوا تو تم سب کو قتل کر دیا جائے گا' تمام طبیب اس بات پر متفق ہوئے کہ اگر یہ بچہ گوشت کھانا چھوڑ دے تو تندرست ہو جائے گا۔ بچے کو بتایا گیا تو وہ کہنے لگا' میں مرنا پسند کروں گا لیکن گوشت کھانا نہیں چھوڑوں گا۔ طبیب بہت پریشان ہوئے کیونکہ شہزادے نے ان کی تجویز ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ اسے جتنا سمجھانے کی کوشش کرتے اس کی ضد میں اضافہ ہوتا چلا جاتا آخر ایک طبیب اُٹھا اور غسل کے بعد بارگاہِ ربّ العزت میں گریہ

زاری کے ہمراہ دعا کرتے ہوئے یہ نیت کی جب تک یہ شہزادہ گوشت کھانے کے قابل نہیں ہوگا اس وقت تک میں بھی گوشت نہیں کھاؤں گا' واپس آ کر اس نے شہزادے سے دوبارہ گوشت چھوڑنے کی درخواست کی تو شہزادے نے فوراً اس کی بات مان لی' دوسرے طبیبوں نے اس پر حیرانگی کا اظہار کیا تو اس نے انہیں سارا ماجرا بتایا۔

ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا' اولیائے کرام جب عام لوگوں کو دیکھیں اور انہیں ان تمام لوگوں میں ایک ایسا شخص نظر آئے جو سر برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو تو وہ اسے ذکر کی تلقین کرتے ہیں جن لوگوں میں سر کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہ ہو' صوفیاء اسے بھی ذکر کرنے کی تلقین کرتے ہیں تاکہ کوئی بھی شخص ذکر کے فیض سے محروم نہ رہے۔ ذکر کی تلقین کا ایک فائدہ قیامت کے دن ظاہر ہوگا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ اقدس میں لواء الحمد ہوگا جو درحقیقت ایمان کا نور ہوگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت دیگر انبیاء اور ان کی اُمتیں' سب لوگ آپ کے پیچھے ہوں گے۔ ہر اُمت اپنے نبی کے جھنڈے تلے جمع ہوگی اور ہر نبی کا جھنڈا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے سے مدد حاصل کرے گا' تمام انبیاء کی اُمتیں ایک طرف ہوں گی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت دوسری طرف ہوگی جس میں اولیاء کی تعداد دوسری جانب موجود انبیاء کے برابر ہوگی اور ہر ولی کا بھی مخصوص جھنڈا ہوگا۔ دوسری جانب موجود انبیاء کے اُمتیوں کی طرح اس طرف اولیاء کے مریدین ہوں گے۔ یہ اولیاء نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد حاصل کریں گے اور ان کے مریدین ان اولیاء سے مدد حاصل کریں گے لہٰذا اگر کوئی مرید دنیا میں سر حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو آخرت میں شیخ کے تلقین کردہ ذکر کی برکتوں سے فیض یاب ہوگا۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں' صرف ذکر کی تلقین یا صرف زبان کے ذریعے ذکر کے الفاظ ادا کر دینا کافی نہیں ہیں بلکہ ایمان کی بعض جزئیات کا علم اور ذکر کا کچھ باطنی فائدہ بھی ہونا چاہیے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) طبیبوں کے واقعے کی مانند چند دیگر واقعات بھی' میں نے دوسرے لوگوں کی زبانی سنے ہیں۔ مثلاً ایک مرتبہ ایک غلام نے ایک بزرگ سے درخواست کی' آپ میرے آقا سے یہ سفارش کریں کہ وہ مجھے آزاد کر دے۔ ایک برس تک اس بزرگ نے اس درخواست کا نوٹس نہیں لیا۔ ایک برس بعد اسے اس کے آقا کے پاس لے گئے اور آقا سے یہ سفارش کی کہ اس غلام کو آزاد کر دے اس کے آقا نے سفارش قبول کرتے ہوئے غلام کو آزاد کر دیا۔ غلام بہت خوش ہوا اس نے عرض کی اگر آپ ایک سال پہلے میری سفارش کر دیتے تو اس تمام عرصے کے دوران میں بہت سی پریشانیوں سے بچا رہتا اور آپ کو اس کا اجر ملتا۔ آپ نے اس کام میں اتنی تاخیر کیوں کی؟ بزرگ نے جواب دیا' میں کسی دوسرے کو اس وقت تک کوئی کام کرنے کے لیے نہیں کہتا جب تک خود وہ کام نہ کر لوں جب تم نے مجھ سے یہ درخواست کی اس وقت میرے پاس کوئی غلام موجود نہیں تھا جسے میں خود آزاد کرتا' پورے ایک سال تک محنت کر کے اور پیسے بچا کر میں نے ایک غلام خرید کے خود اسے آزاد کیا اور پھر تمہارے آقا سے تمہاری سفارش کی اور اس نے میری سفارش مان بھی لی اگر میں خود غلام

آزاد کرنے سے پہلے تمہاری سفارش کرتا تو شاید وہ میری سفارش قبول نہ کرتا۔

اسماء حسنیٰ

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں' اللہ تعالیٰ کے مشہور ۹۹ اسماء میں کوئی اسمِ اعظم نہیں ہے البتہ اسمِ اعظم کے بیشتر معانی ان ۹۹ اسماء میں پائے جاتے ہیں۔ زبان کے ذریعے اسماء کا ورد کیا جاتا ہے لیکن اسمِ اعظم کا ذکر انسان کی ذات کرتی ہے لہٰذا اس ذکر کی آواز یوں محسوس ہوتی ہے جیسے پیتل (کا برتن کھٹکنے) کی آواز ہو اور یہ ذکر بہت وزنی ہوتا ہے اس لیے روزانہ ایک یا دو مرتبہ یہ ذکر کیا جاتا ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا' وہ کیوں؟ آپ نے فرمایا' اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ذکر مکمل مشاہدے کے بغیر نہیں کیا جا سکتا لہٰذا یہ بہت وزنی محسوس ہوتا ہے اور جب ذات اس کا ذکر کرتی ہے تو خوف اور ہیبت کے باعث ذات کے سامنے سے تمام جہان مفقود ہو جاتا ہے۔

آپ فرماتے ہیں' سیدنا عیسیٰ علیہ السلام روزانہ چودہ مرتبہ یہ ذکر کیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ آپ نے اسمائے حسنیٰ پر گفتگو کرتے ہوئے ارشاد فرمایا' انبیائے کرام کو' مشاہدات کی بدولت ان اسماء کے معانی کا علم حاصل ہوا جب انہوں نے کسی ایک معنی کا مشاہدہ کیا تو اس کے لیے ایک مخصوص اسم وضع کر لیا یعنی پہلے ان حضرات کے مشاہدے میں معانی کا ظہور ہوا اور پھر ان معانی کے مطابق ان حضرات نے اسماء مقرر کیے گویا تمام اسمائے حسنیٰ انبیائے کرام کے وضع کردہ ہیں' سب سے پہلے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے علیم' قوی' عظیم اور منان وضع کیے پھر اس کے بعد دیگر انبیاء بھی مختلف اسماء وضع کرتے رہے لیکن ان تمام حضرات نے یہ اسماء اپنی اپنی زبان میں وضع کیے۔ قرآن کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے ان اسماء کو عربی میں منتقل کر کے ایک ہی مقام پر جمع کر دیا ہے۔

ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا' سب سے پہلے اسمِ جلالت ہمارے جدامجد حضرت آدم علیہ السلام نے وضع کیا جب اللہ تعالیٰ نے ان میں روح پھونکی اور وہ فوراً ایک ٹانگ کھڑی کر کے دوسری کے بل اُٹھ کر بیٹھ گئے اس وقت اسی حالت میں انہیں اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ نصیب ہوا۔ چنانچہ ان کی زبان سے ایک ایسا لفظ نکلا جو اس مشاہدے کی تمام اسرار کا مفہوم ادا کر رہا تھا' ان کے منہ سے لفظ ''اللہ'' ادا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں ازل سے ہی یہ بات معلوم تھی کہ اسے ان ناموں سے یاد کیا جائے گا اس لیے اس نے ان اسماء کو مختلف انبیاء کی زبان پر جاری کیا۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مشاہدے کے مطابق ظاہر ہونے والے معانی کے لیے کوئی اسم وضع کر لیتے تو وہ اسم سننے والے تمام لوگ فنا ہو جاتے لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لیے بڑا مہربان ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) کوئی شخص اس غلط فہمی کا شکار نہ ہو کہ حضرت کا یہ بیان اہلِ سنت کے اس عقیدے کے خلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ قدیم ہیں کیونکہ اسماء کے قدیم ہونے کا مطلب ان کے معانی یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات کا قدیم ہونا ہے لیکن جو لفظ ہم اپنی زبان کے ذریعے ادا کرتے ہیں'

وہ ''عرض'' ہوتا ہے اور ہر ''عرض'' حادث ہے' خاص طور پر جب وہ آواز کی حیثیت رکھتا ہو۔

اسم جلالت کے اسرار

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا' اسم جلالت میں تین اسرار پائے جاتے ہیں:

پہلا راز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات بے شمار ہیں' عام طور پر انہیں انسانوں' جنات اور حیوانات میں تقسیم کیا جاتا ہے لیکن اس کے علاوہ اور بھی بہت سی مخلوقات ہیں جن سے بہت سے لوگ واقف نہیں لیکن مخلوقات کی اس قدر کثرت کے باوجود اللہ تعالیٰ ہر کام میں خود تدبیر (حکم صادر فرماتا) ہے اس کا کوئی وزیر نہیں ہے' ہر معاملے میں وہ خود ہی تصرف کرتا ہے' کوئی بھی چیز اس کے علم سے اوجھل نہیں ہے اور اس کی قدرت سے باہر نہیں اور وہ ہر ایک کا حاکم ہے (اس کی حاکمیت) ساری مخلوق کو گھیرے ہوئے ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

وَاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ۔ (البروج' ۸۵:۲۰)

''اور اللہ تعالیٰ ان سب کو گھیرے ہوئے ہے۔''

(اسمِ اعظم میں) دوسرا راز یہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مرضی کے مطابق اپنی مخلوق میں تصرف کرتا ہے' وہ جسے چاہے' غنی کردے یا فقیر کردے' عزت دے دے یا رسوا کردے' گورا پیدا کردے یا کالا' کسی سے حساب لے یا نہ لے' اپنی پسند کے مطابق ہر ایک کو کسی مخصوص وقت یا مقام پر پیدا کرے اس کی شان بے انتہا ہے صرف اسی کو ہر بات کا اختیار ہے' کسی بھی مخلوق کو کوئی (ذاتی) اختیار نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جو چاہے' وہ کرتا ہے' اللہ تعالیٰ پاک ہے اور اس کے سوا کوئی دوسرا عبادت کے لائق نہیں ہے۔

(اسمِ اعظم میں) تیسرا راز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات مقدس اور منزہ ہے اس کی کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی' وہ کسی بھی مخلوق کی مانند نہیں ہے' وہ عظیم اور زبردست ہے یہاں تک کہ اگر اس کی ذات اور مخلوقات کے درمیان حجابات حائل نہ ہوں تو اس کی تجلیات کے باعث ساری مخلوقات فنا ہو جائیں اور یہ کیفیت ہو کہ گویا وہ کبھی موجود ہی نہیں تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص کرم وفضل کی بدولت مخلوقات کی تقدیر مقرر فرمائی اور پھر ہر ایک کو اس کے مخصوص مقام پر رکھا اور ہر فرد کے لیے مخصوص حجاب پیدا کیا۔ اربابِ بصیرت مخلوق کے مشاہدے کی ضرورت کے بغیر ہی محض اسمِ جلالت کا ذکر کرنے سے ان تمام اسرار سے آگاہ ہو جاتے ہیں اس کے بعد آپ نے ایک مثال کے ذریعے اس بات کی وضاحت کی کہ اسمِ جلالت دیگر تمام اسماءِ صفات کا جامع ہے۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ ارشاد فرماتے ہیں' اللہ تعالیٰ کی ذات مقدس اور منزہ ہے اور اس کی ذات کسی کی مشابہ نہیں ہے' انسان اس کی ذات کے بارے میں جو بھی تصور کرے' اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے ماوراء ہوگی کیونکہ ہمارا تصور صرف ان چیزوں سے متعلق ہوگا جو ہمارے علم میں ہیں اور وہ تمام مخلوق کا حصہ ہیں لہٰذا تصور کا تعلق اس چیز کے ساتھ ہوگا جس کی کوئی مثال موجود ہو لیکن اللہ تعالیٰ کی کوئی مثال موجود نہیں ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا' کیا ہم کسی ایسے شخص کا تصور کر سکتے ہیں جو سر کے بل

چلتا ہو" آپ نے فرمایا' میں نے خود ایک ایسے انسان کو دیکھا ہے اس نے اپنی شرم گاہ کو اپنے ہاتھوں کے ذریعے چھپا رکھا تھا اور صرف ضرورت کے وقت شرم گاہ سے ہاتھ ہٹاتا تھا۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں' ایک مرتبہ میں سیّدی محمد بن عبدالکریم بصرائی کے ہمراہ بیٹھا ہوا تھا' انہوں نے مجھ سے کہا' آؤ! ہم کسی ایسی چیز کے بارے میں سوچتے ہیں جو ہمارے خیال کے مطابق سب سے زیادہ عجیب ہو پھر اس بات کا جائزہ لیں گے کہ آیا ایسی صورت والی کوئی مخلوق موجود ہے؟ اس کے بعد ہم دونوں نے سوچا اور ہمارے تصور میں ایک ایسے جانور کی شکل آئی جس کے چار پاؤں ہوں اس کی صورت اونٹ کے جیسی ہو' اس کی پشت پر عکروشہ (نامی جانور کی طرح) بہت سے منہ ہوں' اس کی پشت پر ایک کوہان ہو جس کا رنگ اس کے بقیہ جسم کے رنگ سے مختلف ہو' اس کے سر میں بہت سے سینگ ہوں اور ان کے درمیان انسان کی شکل بنی ہوئی ہو پھر ہم نے واقعی ایسی مخلوق کو دیکھا۔ ان کے نر مادہ کے ساتھ مخصوص فعل کرتے جس کے نتیجے میں مادہ حاملہ ہو جاتی اور پھر ایک برس کے بعد نر مادہ میں اور مادہ نر میں تبدیل ہو جاتے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) یہ بہت ہی عجیب و غریب واقعہ ہے۔

مشاہدہ کیا ہے؟

ایک مرتبہ مشاہدے کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا' یہ ایک بہت بڑی چیز ہے' آپ کا اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ بہت سے لوگ مشاہدے کی صلاحیت نہیں رکھتے پھر آپ نے اس کے اسباب بھی بیان کیے اور اس بارے میں ایک واقعہ سنایا۔ آپ فرماتے ہیں' ۱۱۲۷ھ میں ایک بزرگ سے میری ملاقات ہوئی' میں نے ان سے درخواست کی' آپ دعا کریں کہ مجھے مشاہدہ نصیب ہو۔ انہوں نے فرمایا' تم مشاہدے کے حصول کے لیے دعا نہ کرو' اللہ تعالیٰ خود ہی تمہیں یہ نعمت عطا کر دے گا کیونکہ اگر تم نے دعا جاری رکھی تو اللہ تعالیٰ تمہیں مایوس نہیں کرے گا لیکن اس بات کا امکان موجود ہے کہ وہ تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دے اور پھر تم اس آزمائش کو برداشت نہ کر سکو لیکن اگر اللہ تعالیٰ تمہاری دعا کے بغیر تمہیں مشاہدہ عطا کرے گا تو پھر وہ تمہیں اس آزمائش کو برداشت کرنے کی قوت بھی عطا کرے گا مگر میں نے دوبارہ درخواست کی۔ آپ میرے لیے دعا کریں' میں اس کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ انہوں نے فرمایا' تم روئے زمین پر بسنے والے سب لوگوں کے بارے میں یہ گمان کرو کہ تمہارے سامنے ان کی حیثیت ایک انگوٹھی کی مانند ہے۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ انہوں نے فرمایا' تمام جنات کے بارے میں بھی یہی تصور کرو۔ میں نے یہ بھی کیا پھر انہوں نے فرمایا' زمین' آسمان' عرش پر موجود تمام فرشتوں کے بارے میں بھی یہی تصور کرو' میں نے یہ بھی کیا۔ پھر انہوں نے اور بھی بہت سے جہانوں کا ذکر کیا جن میں جنت اور اس کی نعمتیں' جہنم اور اس کے متعلقات بھی شامل ہیں پھر فرمایا ان سب کو جمع کرو' میں نے ایسا ہی کیا۔ انہوں نے فرمایا اب تم یہ تصور کرو کہ یہ سب تمہارے سامنے موجود ہیں اور تم ایک ہی نظر میں ان سب کو الگ الگ دیکھ سکتے ہو' میں نے کوشش کی لیکن یہ تصور قائم نہیں کر سکا۔ انہوں نے فرمایا'

تم مخلوقات کا تصور بھی نہیں کر سکتے اور تصور میں انہیں اپنے سامنے حاضر بھی نہیں کر سکتے تو پھر تم خالق کا مشاہدہ کیسے کرو گے؟ (سیّدی دباغ فرماتے ہیں) یہ سُن کر مجھے حقیقت کا پتہ چل گیا اور دل ہی دل میں میرے آنسو جاری ہو گئے کہ میں نے ایسی چیز کو حاصل کرنے کی خواہش کیوں کی؟ جسے برداشت کرنے کی صلاحیت میرے اندر موجود نہیں ہے۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں' کوئی بھی انسان ایک ہی نظر میں تمام مخلوق کو اپنے سامنے حاضر نہیں کر سکتا جو اولیائے کرام حالتِ بیداری میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرتے ہیں' یہ شرف اس وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ تمام جہانوں کا مشاہدہ کر لیتے ہیں لیکن وہ بھی ان سب کو ایک نگاہ کے سامنے حاضر نہیں کر سکتے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) جب پہلی مرتبہ میری ملاقات سیّدی عبدالعزیز دباغ سے ہوئی اور میں نے روح کے موضوع پر آپ سے گفتگو کی تو آپ نے فرمایا' کوئی بھی شخص روح کی حقیقت سے اس وقت تک واقف نہیں ہو سکتا جب تک اسے تمام جہانوں کا کشف حاصل نہ ہو جائے اور اگر کسی شخص کو چند جہانوں کا مشاہدہ باقی ہو اور اسے روح کا مشاہدہ حاصل ہو جائے تو ایسا شخص فتنے کا شکار ہو جاتا ہے اگر کوئی غیر معمولی پڑھا لکھا شخص روح کے موضوع پر مجھ سے سوالات کرے اور میں ان سوالات کے جوابات دوں تو چار برس تک اگر ہم روح کے موضوع پر بحث کرتے رہیں تو بھی بحث مکمل نہیں ہوگی کیونکہ اس میں بہت سے اشکالات پائے جاتے ہیں۔

مخلوق میں کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کے مطابق اس کی معرفت حاصل نہیں کر سکتا اس نکتے کو سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ایک مثال کے ذریعے یوں بیان کیا۔ بالفرض اللہ تعالیٰ کسی برتن کو ادراک کی صلاحیت عطا کر دیتا ہے اور پھر کوئی شخص اس برتن سے اس کے بنانے والے کے بارے میں دریافت کرے کہ وہ کون ہے؟ اس کا قد' رنگ' عقل' ادراک' سماعت' بصارت' زندگی' زیر استعمال آلات' ظاہری و باطنی خوبیاں وغیرہ کیسی ہیں؟ تو وہ برتن اس کا جواب نہیں دے سکے گا کیونکہ کوئی بھی مصنوع (بنی ہوئی چیز) اپنے صانع (بنانے والے) کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہو سکتی۔ برتن اور کمہار دونوں حادث ہیں' ان دونوں کے درمیان نسبت کی یہ کیفیت ہے تو قدیم اور حادث کے درمیان فرق کا عالم کیا ہوگا؟ لہٰذا کوئی بھی مخلوق دنیا یا آخرت میں کبھی بھی اللہ تعالیٰ کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہو سکتی۔

ذکر کا ثقل

ایک دفعہ آپ نے ارشاد فرمایا' یہ ذکر انسان کے وجود پر عبادت سے زیادہ ثقیل ہوتا ہے تاہم یہاں پر ذات سے مراد خبیث ذات ہے کیونکہ ایسی ذات تاریکیوں سے سیراب ہوتی ہے جبکہ ذکر اسے نور سے سیراب کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے وجود کی تاریکی ذکر کے نور کو قبول نہیں کرتی۔ ایسا شخص ذکر کے ذریعے تبدیل نہیں ہو سکتا بالکل اسی طرح جیسے مرد' عورت نہیں بن سکتا اور عورت' مرد نہیں بن سکتی یا گندم بو کر کوئی اور پیداوار حاصل نہیں کی جا سکتی اس کے برعکس عبادت کا تعلق صرف ظاہری جسم کے ساتھ ہے' عبادت کی مثال بالکل اسی طرح ہے جیسے کوئی شخص

کلہاڑی کے ذریعے لکڑیاں کاٹتا رہے تو صرف اس کے جسم کو تھکن محسوس ہوگی۔

صفاتی اسماء کے انوار

ایک مرتبہ سیّدی دباغ نے ارشاد فرمایا' اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں ایک ایسا اسم بھی ہے جس کا نور اگر کسی شخص کو عطا کر دیا جائے تو وہ ہر وقت گریہ وزاری میں مشغول رہے۔ میں نے دریافت کیا' یہ کون سا اسم ہے؟ آپ نے فرمایا ''قریباً'' میں نے عرض کی شاید وہ اس لیے روئے گا کہ غفلت کے بعد اسے اپنے پروردگار کی طرف سے رونا نصیب ہوگا۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے کوئی شخص طویل سفر کے بعد اپنے کسی عزیز مثلاً اپنی والدہ سے ملے اور جیسے ہی اس کی صورت دِکھائی دے اس شخص کی آنکھوں میں خوشی کے مارے آنسو آ جائیں۔ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے فرمایا' والدہ سے ملاقات کے وقت نکلنے والے آنسو' خوشی کے آنسو ہوتے ہیں لیکن بارگاہِ ربّ العزت میں حاضری میں نکلنے والے آنسوؤں میں خوشی کے ساتھ شرمندگی کا احساس بھی پایا جاتا ہے کیونکہ انسان کو اپنی سابقہ کوتاہیاں یاد آنے لگتی ہیں۔

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا' اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں ایک ایسا اسم بھی ہے اگر کسی شخص کو اس کا نور نصیب ہو جائے تو وہ شخص ہمیشہ مسکراتا رہے اس کی مثال بالکل اسی طرح ہوگی جیسے بہت سے لوگ اسے گدگدی کرنا شروع کر دیں تو اس کی ہنسی تھم نہ سکے۔ میں نے دریافت کیا' یہ کون سا اسم ہے؟ آپ نے فرمایا ''المتعال'' (احمد بن مبارک کہتے ہیں) پہلے میری خواہش تھی کہ میں حضرت سے تمام اسمائے حسنیٰ کے بارے میں دریافت کروں گا لیکن پھر مجھ پر ہیبت طاری ہوگئی اور میں نے یہ خیال دل سے نکال دیا۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں' کسی بھی ولی کے لیے سب سے زیادہ مشکل وقت وہ ہوتا ہے جب اس پر اسمائے حسنیٰ کے انوار ظاہر ہو رہے ہوں کیونکہ ہر اسم کا مقتضیٰ ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ بعض اولیاء کو صرف ایک ہی اسم کے انوار عطا کیے جاتے ہیں اور وہ اسی کے مطابق ساری زندگی ہنسنے مسکرانے یا گریہ وزاری میں بسر کر دیتے ہیں۔ بعض حضرات کو دو اور بعض کو اس سے بھی زیادہ اسماء کے انوار عطا کیے جاتے ہیں۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) آپ کو کتنے اسماء کے انوار سے نوازا گیا ہے؟ آپ نے فرمایا اور بلاشبہ سچ فرمایا' مجھے ۹۷ اسماء کے انوار عطا کیے گئے ہیں۔ میں نے عرض کی مگر اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام تو ۹۹ ہیں؟ آپ نے فرمایا' نہیں بلکہ سو ہیں لیکن عام طور پر ان اسماء میں سوواں نام شمار نہیں کیا جاتا کیونکہ لوگ اس کے انوار برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور یہی اسمِ اعظم ہے جس کے وسیلے سے دعا کی جائے تو وہ قبول ہوتی ہے اور سوال کیا جائے تو وہ پورا ہوتا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس سے پہلے اسمِ اعظم کے بارے میں سیّدی دباغ کے کچھ ملفوظات بیان کیے گئے ہیں جو آپ کی معلومات کی وسعت پر دلالت کرتے ہیں۔ آپ بلاشبہ اکابر اولیاء میں سے ایک ہیں' میں نے اسمِ اعظم کے بارے میں آپ جیسی تفصیلی گفتگو کسی اور کی زبانی نہیں سُنی اور نہ ہی اس تمام گفتگو کو یہاں تحریر کیا ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں' ۱۹۷ اسماء کے انوار سے صرف ایک ولی کو سیراب کیا جاتا ہے۔(احمد بن مبارک کہتے ہیں) وہ ولی غوث ہوتا ہے اور سیّدی دباغ نے یہ بات ابتدائی زمانے میں ارشاد فرمائی تھی۔ آخری زمانے میں آپ نے ارشاد فرمایا' مجھے تمام اسماء (یعنی پورے سو اسماء) کے انوار سے فیض یاب کیا گیا ہے۔ یہ فیض دو طرح سے عطا کیا جاتا ہے۔ ایک ''مقامِ روح'' میں اور اس کیفیت میں بعض اولیاء کو ایک' بعض کو دو اور بعض کو اس سے زیادہ اسماء کے انوار سے سیراب کیا جاتا ہے تاہم غوث کے علاوہ اور کسی ولی کو پورے سو اسماء کے انوار عطا نہیں کیے جاتے ہیں۔ اسماء کے انوار کے فیض کا دوسرا مقام ''سر'' ہے۔ مقام سر میں صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پورے سو اسماء کے انوار سے سیراب کیا گیا ہے۔(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس فرمان سے بہت سے انوار و اسرار ظاہر ہوتے ہیں جسے اہلِ دل ہی سمجھ سکتے ہیں۔ ایک دفعہ اسمائے حسنیٰ اور ان کے اوراد پر گفتگو کرتے ہوئے ارشاد فرمایا اگر کسی نے' کسی اسم کا ورد کسی عارف سے لیا ہو تو کوئی نقصان نہیں ہوگا لیکن اگر کسی غیر عارف سے لیا ہو تو ورد کرنے والا نقصان اُٹھاتا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے اس کا سبب دریافت کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا' اللہ تعالیٰ کے تمام اسمائے حسنیٰ کے ہمراہ مخصوص انوار پائے جاتے ہیں لہٰذا جب کوئی کسی اسم کا ورد کرتا ہے اور اس وقت اسی اسم کا نور بھی اس کے ساتھ موجود ہو تو ایسے شخص کو کوئی نقصان نہیں ہوتا لیکن اگر اسم کے ہمراہ اس کا نور نہ ہو جو شیطانی اثرات کو روکنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے تو اس وقت شیطان پاس آ جاتا ہے اور انسان کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے' کوئی بھی عارف کامل جب اپنے کسی مرید کو کسی اسم کی تلقین کرتا ہے تو اس اسم کے انوار بھی ساتھ میں عطا کرتا ہے جو اس شخص کو شیطان کے شر سے محفوظ رکھتے ہیں لہٰذا اس اسم کا ورد کرنے والا نقصان سے محفوظ رہتا ہے۔

جب شیخ کسی مرید کو کوئی اسم عطا کرتا ہے تو شیخ کی نیت کے مطابق مرید کو اس کا نفع حاصل ہوتا ہے اگر شیخ کی نیت دنیا کا حصول ہو تو مرید کو دنیاوی فائدہ حاصل ہوتا ہے لیکن اگر شیخ نے آخرت کے فائدے کے حصول کے لیے وظیفہ بتایا تھا تو مرید کو آخرت میں فائدہ حاصل ہوگا اور اگر شیخ کی نیت معرفت کا حصول تھی تو مرید کو معرفت نصیب ہوگی لیکن اگر شیخ عارف نہ ہو بلکہ محض ایک بہروپیا ہو تو وہ مرید کو صرف ایک نام بتائے گا اور اس اسم کے انوار ساتھ موجود نہیں ہوں گے لہٰذا اس صورت میں بھی مرید کی ہلاکت کا اندیشہ ہوگا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا' قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ موجود ہیں اور حفاظ قرأت کے دوران یہ اسماء پڑھتے ہیں لیکن انہیں کوئی نقصان نہیں ہوتا حالانکہ انہیں کسی صوفی بزرگ نے باقاعدہ اجازت نہیں دی ہوتی اس کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے فرمایا' اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل کیا تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ اقدس سے لے کر قیامت تک آنے والے تمام لوگوں تک قرآن پہنچ جائے اس لیے جب کوئی شخص قرآن کی تلاوت شروع کرتا ہے اس کے شیخ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے ہیں لہٰذا جب حفاظ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں تو انہیں کچھ نہیں ہوتا۔ نیز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے

اپنی اُمت کو قرآن کے فیض کا صرف وہی حصہ عطا کیا ہے جسے برداشت کرنے کی وہ صلاحیت رکھتے ہیں یا جس کے نتیجے میں وہ قرآن کے ظاہری الفاظ سے احکام اخذ کر سکتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کے تمام انوار منتقل نہیں کیے ہیں اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم انوار کے ہمراہ قرآن دیتے تو آپ کی اُمت میں کوئی بھی شخص نافرمان نہ ہوتا بلکہ تمام لوگ اقطاب ہوتے اور کسی کو کسی بھی اسم کا ورد کرنے سے کوئی نقصان نہ ہوتا۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں' سورۂ یٰسین کے آغاز میں اللہ تعالیٰ کے دو اسماء ذکر کیے گئے ہیں۔ ''العزیز'' اور ''الرحیم'' جبکہ سورۂ یٰسین کے درمیان میں یہ دو اسماء ذکر کیے گئے ہیں۔ ''العزیز'' اور ''العلیم'' سورۂ ''ص'' میں اللہ تعالیٰ کے یہ دو نام ذکر کیے گئے ہیں ''العزیز'' اور ''الوہاب'' دنیا اور آخرت کی تمام بھلائیاں انہی اسماء کی برکت سے حاصل ہوتی ہیں۔

ایک اہم وظیفہ

سیّدی دباغ فرماتے ہیں' سورۂ ملک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ. (الملک' ۶۷:۱۴)

''انہیں نہیں معلوم کہ (سب کو) کس نے پیدا کیا ہے؟ (جس نے پیدا کیا ہے) وہ بڑا مہربان اور خبردار ہے۔''

جو شخص اس آیت کی کثرت سے تلاوت کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے فقر' جہالت' آزمائش' گناہ اور نقصان سے محفوظ رکھے گا۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے خود اس بات کا مشاہدہ کیا ہے کہ میرے ایک پیر بھائی کو دانے نکل آئے جنہیں عام طور پر لوگ ''بیش'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی پریشانی ذکر کی' آپ نے اسے یہی وظیفہ پڑھنے کی ہدایت کی تو کچھ عرصے بعد اس کی تکلیف ختم ہو گئی۔

''حضرۃ'' کا سبب کیا ہے؟

ایک مرتبہ ''حضرۃ'' (غالباً اس سے مراد وجد ہے۔ مترجم) کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ارشاد فرمایا اس کا رواج صحابہ' تابعین اور تبع تابعین کے زمانے میں نہیں تھا اور یہ تینوں زمانے بہترین زمانے ہیں کیونکہ اس کی گواہی احادیث میں دی گئی ہے۔ ایک مرتبہ کسی صاحب نے آپ سے ''حضرۃ'' کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا' میں ایک عام سا شخص ہوں اگر اس بارے میں' میں نے اپنی رائے کا اظہار کیا تو اس کی کوئی اہمیت نہیں ہو گی اس لیے میں نے سائل سے کہا' یہ مسئلہ علماء سے دریافت کرو۔ کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا ہے؟ اگر جواب ''نہیں'' ہو تو پھر دریافت کرو' کیا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایسا کیا ہے؟ پھر حضرت عمر پھر حضرت عثمان پھر حضرت علی اور پھر تمام صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں دریافت کرو کہ انہوں نے کبھی ایسا کیا ہے؟ اگر علماء یہ جواب دیں کہ ان میں سے کسی ایک سے بھی یہ بات ثابت نہیں ہے تو

ان سے پوچھو کیا تابعین میں سے یا تبع تابعینؒ میں سے کسی ایک نے ایسا کیا ہے اگر کسی ایک نے بھی ایسا نہیں کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کام قرونِ ثلاثہ سے تعلق رکھنے والے ان حضراتؒ نے نہیں کیا اس میں کوئی بھلائی نہیں ہوگی۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں ''حضرۃ'' کا رواج چوتھی صدی ہجری میں شروع ہوا' چار یا پانچ اولیاء جنہیں فتح نصیب ہوئی تھی' اپنے مریدین کے ہمراہ بیٹھ کر ذکر کیا کرتے تھے اور بعض اوقات یہ حضرات ملائکہ کو ذکر کی حالت میں دیکھتے تھے اور فرشتوں کی کیفیت یہ ہے کہ بعض فرشتے صرف زبان کے ذریعے ذکر کرتے ہیں اور بعض فرشتے پورے جسم کے ساتھ ذکر کرتے ہیں اور اس صورت میں ان کے جسم جھومتے ہوئے دِکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ بعض اوقات ان میں سے کوئی ولی' فرشتوں کے مشاہدے کی نقل کرتے ہوئے خود بھی جھومنے لگتا ہے اور چونکہ وہ شعوری طور پر وہاں موجود نہیں ہوتا تھا اس لیے اسے احساس نہ ہوتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ ان کے مریدین نے شیخ کے طریقے پر عمل کرتے ہوئے ذکر کے دوران خود بھی جھومنا شروع کر دیا۔ مریدین شیخ کو اور فرشتوں کو دیکھ کے جھومتا تھا۔ ان اولیاء کے وصال کے بعد ان کے مریدین نے اپنے شیخ کے ظاہری طریقے کو رسم کے طور پر اپنا لیا اور اس میں دیگر آلات وحرکات کا اضافہ کر دیا حالانکہ یہ ان کے مشائخ کی کمزوری تھی کہ وہ اپنی ظاہری حالت پر قابو نہ پا سکے۔

ایک مرتبہ سیّدی دباغ نے ارشاد فرمایا' بصیرت کے تین لاکھ چھیاسٹھ ہزار (۳٬۶۶٬۰۰۰) اجزا ہوتے ہیں جن میں سے ایک جزو آنکھ سے متعلق ہوتا ہے جبکہ باقی تمام اجزا عارفِ کامل کے وجود کے اندر موجود ہوتے ہیں لہٰذا وہ اپنے وجود کے ہر حصے کے ساتھ اس طرح دیکھ سکتا ہے جیسے ہم آنکھ کے ذریعے کوئی چیز دیکھتے ہیں اور یہ خصوصیت صرف ایک شخص کو نصیب ہوتی ہے یعنی وہ غوث جس کے ماتحت سات اقطاب ہوتے ہیں۔

حاضرین میں سے ایک صاحب جو سیّدی دباغ کے مرتبہ ومقام سے ناواقف تھے' نے دریافت کیا' امام عبدالوہاب شعرانی نے یہ واقعہ نقل کیا ہے' ایک مرتبہ عالمِ ملکوت میں شیخ عبدالقادر جیلانی' شیخ احمد الکبیر الرفاعی اور شیخ ابراہیم دسوقی کی ملاقات ہوئی اور وہاں ان کے درمیان کچھ گفتگو ہوئی۔ سیّدی ابراہیم دسوقی نے اپنے بعض مریدین کے سامنے اس ملاقات کا تذکرہ کیا تو انہوں نے دریافت کیا اس بات کا گواہ کون ہے؟ سیّدی ابراہیم اور ان کے مرید اس وقت مصر میں موجود تھے جبکہ بقیہ دونوں حضرات اس وقت عراق میں موجود تھے۔ سیّدی ابراہیم دسوقی نے ان دونوں حضرات کی طرف اشارہ کیا تو یہ دونوں حضرات اسی وقت وہاں تشریف لے آئے اور انہوں نے سیّدی ابراہیم دسوقی کے بیان کی تائید کی۔ (یہ واقعہ نقل کر کے وہ صاحب کہنے لگے) یہ تینوں حضرات بڑے کامل ولی ہیں۔

یہ سُن کر سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا' یہ کام تو کم درجے کا ولی بھی کر سکتا ہے۔ میں نے ایک ایسے ولی کو دیکھا ہے جسے جاندار اور بے جان' جنگلی جانوروں اور حشرات الارض' آسمان' ان کے ستارے' زمین اور جو

کچھ اس میں موجود ہے' ان ساری مخلوقات کا مشاہدہ حاصل ہے اور وہ ولی ایک ہی لمحے میں ان تمام کی آوازیں سُن سکتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کی دستگیری کر سکتا ہے بلکہ پوری کائنات اس کے لیے ایک جیسی حیثیت رکھتی ہے پھر جب اس ولی نے غور کیا تو اسے پتہ چلا کہ یہ کمال نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد سے حاصل ہوا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کمال اللہ تعالیٰ کی مدد سے حاصل ہوا ہے۔

(سیّدی دباغ فرماتے ہیں) میں نے اس ولی کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے جب میں نے یہ دیکھا کہ مجھے کسی اور طرف سے مدد حاصل ہو رہی ہے تو اس وقت مجھے یوں محسوس ہوا کہ میری مثال ایک مینڈک کی سی ہے اور باقی ساری مخلوق مجھ سے زیادہ طاقت ور ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ہمارے شیخ کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ بھی مرتبۂ غوثیت پر فائز ہوئے اور ساتوں اقطاب آپ کے ماتحت تھے۔

ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا' ساتوں آسمان' ساتوں زمینیں اور عرش مجھے اپنی ذات کا حصہ محسوس ہوتا ہے اسی طرح عرش کے اوپر ستر (۷۰) حجابات موجود ہیں اور ان میں سے ہر حجاب کے اندر ستر ہزار جہان موجود ہیں اور ایک حجاب سے دوسرے حجاب کے درمیان ستر ہزار سال کی مسافت کے برابر فاصلہ موجود ہے۔ یہ تمام حجابات فرشتوں سے بھرے ہوئے ہیں اور ان ستر حجابات کے اوپر ''عالمِ رقاء'' موجود ہے اور ان تمام مخلوقات کی سوچ میں بھی کوئی بات اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتی جب تک غوث کی اجازت نہ ہو' ان کی حرکات کا تو ذکر ہی کیا؟ (یعنی ان میں سے ہر ایک مخلوق کی ہر حرکت غوث کی اجازت کی پابند ہے)

ان باتوں کا صحیح مفہوم اولیائے کرام ہی بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان کے گروہ میں شامل فرمائے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) سیّدی دباغ کا یہ کہنا کہ معمولی مرتبے کا ولی بھی ایسے کارنامے انجام دے سکتا ہے' یہ بات بالکل درست ہے کیونکہ میں نے خود ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو فتح اور کشف کے ابتدائی درجے میں ہی اس طرح کے کام سرانجام دیا کرتے تھے۔

میں نے سیّدی عبدالعزیز دباغ سے دریافت کیا' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی وراثت ایک لاکھ چوبیس ہزار (۱۲۴۰۰۰) حصوں میں تقسیم ہے' یہ تمام میراث غوث کو کیوں نہیں ملتی؟

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا' کوئی بھی شخص روحانیت کے اس مقام تک نہیں پہنچ سکتا جو صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے۔ غوث کو جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وارث کہا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دوسرا کوئی بھی شخص غوث سے زیادہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض حاصل نہیں کرتا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ساتواں باب

اولیائے کرام کے کلام کی تشریح

درود پاک کی شرح

مشہور صوفی بزرگ' قطبِ زمان' حضرت عبدالسلام بن مشیش نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر درود بھیجنے کے لیے ایک ترکیب موزوں کی ہے۔ سیّدی دباغ نے اس کے بعض مشکل مقامات کی تشریح کی ہے جو درج ذیل ہیں:

نورِ محمدی ہر شے کی اصل ہے

شیخ عبدالسلام بن مشیش نے درود شریف کا آغاز ان الفاظ سے کیا ہے:

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مَن منه انشقت الاسرار.

''اے اللہ! اس ہستی پر درود نازل فرما جس کے ذریعے اسرار شق ہو گئے۔ (اور ان کا ظہور ہوا)''

سیّدی دباغ فرماتے ہیں' سیّدی محمد بن عبدالکریم البصراوی کا قول ہے جب اللہ تعالیٰ نے زمین کی برکات اور اس میں موجود اسرار یعنی چشمے' کنویں' دریا' درخت' پھل' پھول وغیرہ کو ظاہر کرنے کا ارادہ کیا تو پہلے ستر ہزار فرشتے زمین پر بھیجے پھر مزید ستر ہزار فرشتے بھیجے اس کے بعد پھر ستر ہزار مزید فرشتے بھیجے' ان فرشتوں نے زمین پر طواف کرنا شروع کر دیا۔ ستر ہزار فرشتوں کے پہلے گروہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمِ مبارک کا ورد شروع کیا اس سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مخصوص اسم ہے جس کی وضاحت بعد میں کی جائے گی۔ ستر ہزار فرشتوں کے دوسرے گروہ نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ و مقام کا ذکر شروع کر دیا اور تیسرے گروہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا شروع کر دیا اس وقت ان تینوں گروہوں کے ہمراہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نور مبارک موجود تھا۔ یہ کائنات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کی برکت سے وجود میں آئی ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر زمین پر کیا گیا تو اس میں ٹھہراؤ آ گیا اور جب آسمانوں پر کیا گیا تو وہ بلند ہو گئے جب یہ ذکر حضرت آدم علیہ السلام کے جسم کے جوڑوں پر کیا گیا تو وہ نرم ہو گئے جب ان کی

آنکھوں پر کیا گیا تو ان میں روشنائی آ گئی اور یہی شیخ عبدالسلام بن مشیش کے قول کا اصل مقصد ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے عرض کی "دلائل الخیرات" کی اس عبارت کا بھی یہی مفہوم ہوگا۔

وبالاسم الذی وضعته علی اللیل فاظلم وعلی النهار فاستنار وعلی السموات فاستقلت وعلی الارض فاستقرت وعلی الجبال فرست وعلی البحار فجرت وعلی العیون فنبعت وعلی السحاب فامطرت۔

"(یااللہ!) میں اس نام کے وسیلے سے (دعا کرتا ہوں) جسے تو نے رات پر رکھا تو وہ تاریک ہوگئی اور دن پر رکھا تو وہ روشن ہوگیا' آسمانوں پر رکھا تو وہ بلند ہوگئے اور زمین پر رکھا تو اس میں ٹھہراؤ آ گیا' پہاڑوں پر رکھا تو وہ (زمین میں) گڑ گئے' سمندروں پہ ڈالا تو ان میں بہاؤ آ گیا' چشموں پر ڈالا تو وہ پھوٹ پڑے اور بادلوں پر ڈالا تو وہ برسنے لگے۔"

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے فرمایا' ہاں! یہ نام ہمارے آقا و مولا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کا اسمِ گرامی ہے جس کی برکت کے وسیلے سے کائنات وجود میں آئی ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس سے پہلے ہم غوثِ زمان سیّدی احمد بن عبداللہ کا یہ قول نقل کر چکے ہیں جو آپ نے اپنے ایک مرید کے سامنے بیان کیا تھا۔

"اے میرے بیٹے! اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نور نہ ہوتا تو زمین کا کوئی بھی راز ظاہر نہ ہوتا اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات نہ ہوتی تو کوئی چشمہ جاری نہ ہوتا' کوئی دریا نہ بہتا' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نورِ مبارک مارچ کے مہینے میں تین مرتبہ تمام بیجوں پر اپنی خوشبو ڈالتا ہے جسکی برکت سے ان بیجوں سے پھل پیدا ہوتا ہے اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نورِ مبارک نہ ہوتا تو یہ پھل بھی پیدا نہ ہوتے' دوسروں کا تو خیر ذکر ہی کیا؟ جس شخص کا ایمان سب سے زیادہ کم ہوا سے بھی ایمان پہاڑ سے زیادہ وزنی محسوس ہوتا ہے اور بعض اوقات انسان اس کے بوجھ سے تنگ آ کر اس سے پیچھا چھڑانے کا خیال کرتا ہے اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نورِ مبارک (کی تجلی) اس پر پڑتی ہے اور ایمان کے ثقل کے برداشت کرنے میں انسان کی مدد کرتی ہے اس وقت وہ شخص ایمان کی مٹھاس اور لذت کو محسوس کرتا ہے۔"

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) یہ قول اسی کتاب کے آغاز میں موجود ہے۔

ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے شیخ عبدالسلام بن مشیش کے مذکورہ بالا قول کی تشریح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجودِ مسعود نہ ہوتا تو جنت اور دوزخ میں لوگوں کے درمیان کوئی تفاوت نہ ہوتا اور تمام لوگ ایک ہی مرتبے کے حامل ہوتے لیکن جب اللہ تعالیٰ نے نورِ محمدی کو تخلیق کیا تو اس سے پہلے مشیتِ الٰہی میں یہ بات موجود تھی کہ اس نور کو قبول کرنے اور اس کی طرف مائل ہونے کے اعتبار سے لوگوں کے

درمیان تفاوت پایا جائے گا اور جب اس نور کو تخلیق کر دیا گیا تو مشیت ظاہر ہوگئی اس سے پتہ چل گیا کہ بعض لوگ نورِ محمدی کو قبول کرنے میں خشوع وخضوع کے فلاں مرتبے پر فائز ہوں گے' معرفت کے فلاں مرتبے کے حامل ہوں گے اور خوف کی فلاں کیفیت کے مالک ہوں گے' فلاں کا رنگ یہ ہوگا اور فلاں کو یہ فیض نصیب ہوگا (یہ تمام امور) مخلوق کے ظہور سے پہلے (طے ہو چکے تھے) جبکہ مخلوق ابھی مرتبہ عدم میں بھی معدوم تھی۔

(سیّدی دباغ فرماتے ہیں) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کی بدولت اسرار کے شق ہونے کا مطلب یہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے باعث مخلوق کے مراتب میں تفاوت اور فرق ظاہر ہوا ہے۔

ایک اور مرتبہ اسی قول کی تشریح کرتے ہوئے سیّدی دباغ نے بیان کیا۔ تمام انبیاء اور اولیاء کے اسرار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ''سر'' سے ماخوذ ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو ''سر'' ہیں' ایک کا تعلق مشاہدے کے ساتھ ہے جو ایک وہی چیز ہے جبکہ دوسرا اس پہلے ''سر'' سے ماخوذ ہے لیکن دوسرا ''سر'' کیسا ہے اس بات کو ہم ایک مثال کے ذریعے یوں بیان کر سکتے ہیں کہ مشاہدہ کپڑے کی مانند ہے جس پر کوئی دست کار اپنے فن کا نمونہ بنا دیتا ہے۔ گویا صاحب مشاہدہ اس کپڑے پر اپنے فن کا نمونہ نقش کر دیتا ہے لہٰذا جب وہ ریشمی کپڑے پر دست کاری کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے ریشم کی صنعت سے متعلق تمام علوم سے آگاہ کر دے گا لیکن اگر وہ سوتی کپڑے پر دست کاری کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے سوتی کپڑے سے متعلق تمام امور سے آگاہ فرما دے گا اس طرح وہ شخص ان صنعتوں سے متعلق ان تمام امور سے آگاہ ہو جائے گا جن سے اس صنعت کے ماہرین آگاہ ہوتے ہیں اور ان امور سے بھی آگاہ ہو جائے گا جن سے اس صنعت کے ماہرین بھی آگاہ نہیں ہوتے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدے کی بھی یہی خصوصیت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مشاہدہ ان تمام علوم اور معارف پر مشتمل ہے جو اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادے میں پہلے سے موجود تھے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) مشاہدے کو کپڑے سے اس لیے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ دونوں کے درمیان ایک قدر مشترک ہے یعنی ان سے متعلق امور کا ایک دوسرے سے مختلف ہونا لہٰذا کپڑے میں دست کاری کے مختلف نمونے ہوتے ہیں جبکہ مشاہدے میں مختلف اسمائے حسنیٰ کے انوار واسرار ظاہر ہوتے ہیں۔ دوسری قدر مشترک یہ ہے کہ جیسے ایک ہی کپڑے پر دست کاری کے مختلف نمونے بنائے جا سکتے ہیں اسی طرح تمام اسمائے حسنیٰ کے انوار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدے میں شامل ہیں۔ تیسری صورت یہ ہے کہ جس طرح انسان دست کاری کے مختلف طریقوں میں سے کسی ایک میں مہارت حاصل کرتا ہے اسی طرح اسمائے حسنیٰ میں سے کسی ایک اسم کے انوار کے فیض سے دنیا میں کوئی تصرف کیا جاتا ہے لہٰذا مذکورہ بالا تینوں اقدار کی وجہ سے مشاہدے کو کپڑے سے تشبیہہ دی گئی ہے۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں وہ تمام خصوصیات بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں جن کی بدولت یہ مشاہدہ نصیب ہوتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مشاہدے کے تمام اسرار حاصل ہیں۔ ان

خصوصیات میں مخلوق پر رحم کرنا' ان سے محبت کرنا' ان سے درگزر کرنا' بردباری سے پیش آنا' ان کے لیے دعائے خیر کرنا کہ شاید اللہ تعالیٰ انہیں اپنی ذات پر ایمان لانے کی قوت عطا فرمادے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے یہی دعا کیا کرتے تھے لیکن آج کل لوگوں کو اس دعا کی اہمیت کا احساس نہیں ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) جب ہم یہ فرض کر لیں کہ مشاہدہ تمام اسمائے حسنیٰ پر مشتمل ہوتا ہے اور صاحبِ مشاہدہ (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) کی مثال اس شخص کی مانند ہے جو کپڑا بننے کے فن سے آشنا ہے تو اس سے قطعی طور پر یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام اسمائے حسنیٰ کے انوار حاصل ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اسرار کے مالک ہیں لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس میں صبر' رحمت' حلم' عفو' مغفرت' علم' قدرت' سماعت' بصارت' کلام حتیٰ کہ تمام اسمائے حسنیٰ کے انوار آپ کی ذاتِ اقدس میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں' جب ہم دیگر انبیاء کرام' اولیاء عظام اور فرشتوں کی طرف دیکھتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض انوار ان میں پائے جاتے ہیں اور انہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کا فیض حاصل ہے تو گویا ان سب کے اسرار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کی بدولت ہی ظاہر ہوئے ہیں۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں اگر انسان کے جسم میں دوڑنے والا خون اور رگیں' حقائق کی معرفت کے لیے رکاوٹ نہ ہوتیں تو کوئی بھی ''نبی'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر کوئی کلام نہ کرتا اور ہر ''نبی'' (اپنے اُمتیوں کو) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہونے کی تلقین کرتا اور اس بات کا اعتراف کرتا کہ اسے جو بھی فیض حاصل ہوا ہے' وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت نصیب ہوا ہے لہٰذا درحقیقت یہ تمام انبیاء نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی اولاد ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے روحانی باپ ہیں یہاں تک کہ ساری مخلوق آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض لینے میں یکساں حیثیت کی مانند ہے اور ہر ایک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرنے کا پابند ہے لہٰذا وہ تمام لوگ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں' وہ مرنے کے فوراً بعد اس حقیقت سے یقینی طور پر آگاہ ہو جاتے ہیں اور آخرت میں انہیں اس کا عملی تجربہ بھی ہو جائے گا۔ جب جنت میں داخلے کے وقت ان (کفار) کے اور جنت کے درمیان رکاوٹ آ جائے گی اور جنت ان سے منہ موڑتے ہوئے یہ بات کہے گی کہ میں تم سے واقف نہیں ہوں کیونکہ مجھے تمہارے اندر نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم دکھائی نہیں دے رہا' نتیجہ یہ نکلا کہ پہلی اُمتوں کے لوگ اپنے انبیاء سے فیض حاصل کرتے تھے اور جملہ انبیاء کرام' حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض حاصل کرتے ہیں۔ گویا ہر ایک بشر آپ ہی سے فیض یاب ہوتا ہے اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق انسان کے جسم میں موجود

خون حجاب کا باعث نہ ہوتا تو یہ سب کچھ اسی دنیا میں پیش آ جاتا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا' معرفت کے حصول میں' خون کیوں رکاوٹ بنتا ہے؟

سیّدی دباغ نے جواب دیا' اس کی وجہ یہ ہے کہ خون انسان کو اس کی بشری حیثیت کی طرف لے جاتا ہے اور فانی امور کی طرف راغب کر دیتا ہے جس کے نتیجے میں انسان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ عمارات قائم کرے' باغ بنائے اور مال و دولت اکٹھا کرے اور ان کی طرف مکمل طور پر متوجہ ہو جانا' اللہ تعالیٰ کی ذات سے غافل ہونے اور محجوب ہونے کے مترادف ہے لہٰذا اگر ان کے جسم میں خون موجود نہ ہوتا تو انسان کبھی بھی انسانی امور کی طرف متوجہ نہ ہوتا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس حجاب کی مختلف قسمیں ہیں۔ عوام میں یہ بہت گہرا ہوتا ہے جبکہ خواص میں اس کی حیثیت کمزور ہوتی ہے۔ انبیاء کرام میں یہ نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ بالکل ہی موجود نہیں ہوتا۔

ہر مخلوق نورِ محمدی سے سیراب ہوتی ہے

(سیّدی عبدالسلام بن مشیش کے درود شریف کے چند الفاظ یہ ہیں)

وانفلقت الانوار[1] ''(اے اللہ! اس ہستی پر درود نازل فرما جن سے) انوار پھیل گئے۔''

سیّدی دباغ اس کی تشریح کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں' اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کو پیدا کیا پھر اس نور سے قلم' 70 حجابات اور ان میں موجود فرشتوں کو پیدا کیا گیا پھر اللہ تعالیٰ نے لوح کو پیدا کیا پھر لوح کے مکمل ہونے سے پہلے عرش' ارواح' جنت اور برزخ[2] کو پیدا کیا۔ عرش کو نور سے پیدا کیا گیا ہے اور اس نور کو ہمارے نبی کے نور سے پیدا کیا گیا۔ عرش کو ایک بہت بڑے یاقوت کی شکل میں پیدا کیا گیا ہے جس کے حجم کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا اور پھر اس یاقوت کے درمیان میں ایک گوہر پیدا کیا گیا ہے۔ یاقوت اور گوہر ایک انڈے کی مانند ہے جس کی سفیدی یاقوت ہے اور اس کی زردی وہ گوہر ہے پھر اللہ تعالیٰ نے اس گوہر کو نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے سیراب کیا۔ یہ نور یاقوت کو پھاڑ کر گوہر کو سیراب کرتا ہے اس گوہر کو سات مرتبہ نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے سیراب کیا گیا تو وہ گوہر بہہ کر پانی کی شکل اختیار کر گیا اور وہ پانی یاقوت یعنی عرش کی تہہ میں آ گیا پھر اسی نور سے اللہ تعالیٰ نے آٹھ فرشتے پیدا کیے جو حاملینِ عرش ہیں اس نور سے ہوا کو پیدا کیا گیا اور اسے حکم دیا کہ وہ پانی کے نیچے جائے۔ ہوا پانی کے نیچے گئی اور اس نے اسے اُٹھا لیا اور پھر ہوا کے اثرات کے تحت وہ پانی جمنے لگا' ہوا نے اس کے جمے ہوئے ٹکڑوں کو خلا میں مختلف جگہ بکھیر دیا جس کے نتیجے میں

---

[1] انفلاق' لفظ ''فلق'' سے ماخوذ ہے جس کا معنی ''چیر دینا'' ''پھاڑ دینا'' ہے ہم نے اردو کے محاورے کا لحاظ کرتے ہوئے ''پھیل جانا'' ترجمہ کیا ہے۔ مترجم عفی عنہ

[2] اس کتاب میں یہی لفظ ہے لیکن شاید یہاں لفظ دوزخ ہونا چاہیے تھا کیونکہ برزخ' موت اور قیامت کے درمیانی عرصے کو کہتے ہیں۔ مترجم عفی عنہ

سات زمینیں پیدا ہوئیں اسی طرح ہوا کے پانی میں اثر کرنے کی بدولت آسمان پیدا ہوئے۔ ہوا میں آگ کے اثرات بھی موجود تھے' فرشتوں نے ان اثرات کو نکال کر دوزخ بنائی چونکہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو یہ آگ زمین و آسمان کو جلا کر بھسم کر دیتی۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نور سے زمین پر رہنے والے فرشتے پیدا کیے اور انہیں زمین پر رہ کر عبادت کرنے کا حکم دیا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نور مبارک سے آسمان کے فرشتے پیدا کیے اور انہیں آسمان میں رہ کر عبادت کرنے کا حکم دیا۔ جنت کے بعض حصوں کو چھوڑ کر بقیہ ساری جنت اور تمام ارواح کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نور سے پیدا کیا گیا' برزخ کا اوپری نصف حصہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نور سے پیدا کیا گیا لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ لوح' قلم' نصف برزخ' ستر (۷۰) حجابات اور ان میں موجود فرشتے' زمین و آسمان میں موجود تمام فرشتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نور سے کسی واسطے کے بغیر پیدا کیے گئے جبکہ عرش' جنت اور ارواح کو ایک نور سے پیدا کیا گیا ہے اور اس نور کو نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے پیدا کیا گیا ہے اس کے بعد ان تمام مخلوقات کو دوبارہ نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے سیراب کیا گیا۔

قلم جو ایک بہت بڑی مخلوق ہے جس کے نور کو اگر زمین پر ڈال دیا جائے تو روئے زمین ریزہ ریزہ ہو جائے اس قلم کو سات مرتبہ نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے سیراب کیا گیا اسی طرح پانی کو بھی سات مرتبہ نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے سیراب کیا گیا البتہ قلم کی بہ نسبت پانی کی سیرابی کی کیفیت کم مرتبے کی مالک تھی۔ ستر (۷۰) حجابات ہمیشہ نورِ محمدی سے سیراب ہوتے رہتے ہیں۔ عرش کو دو مرتبہ سیراب کیا گیا ایک اس وقت جب اس کی تخلیق ہوئی تھی اور دوسرا اس وقت کیا جائے گا جب قیامت قائم ہوگی تا کہ اس وقت عرش کا وجود باقی رہے۔ یہی کیفیت جنت کے ساتھ بھی ہے تمام انبیاء کرام علیہم السلام اور تمام اہلِ ایمان کو' خواہ ان کا تعلق سابقہ اُمتوں کے ساتھ ہو' آٹھ مرتبہ نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے سیراب کیا گیا۔ پہلی مرتبہ عالمِ ارواح میں جب ارواح کا نور پیدا کیا گیا دوسری مرتبہ اس وقت جب ارواح کو شکل وصورت عطا کی گئی۔ تیسری مرتبہ اس وقت جب اللہ تعالیٰ نے ارواح سے دریافت کیا ''کیا میں تمہارا ربّ نہیں ہوں؟'' تو انبیاء کرام اور وہ تمام اہلِ ایمان جنہوں نے اس کا مثبت جواب دیا' ان کی ارواح کو (تیسری مرتبہ) سیراب کیا گیا تاہم اس سیرابی کے دوران لوگوں میں تفاوت پایا گیا جس کی بدولت کوئی عام مسلمان رہا اور کوئی مرتبہ ولایت پر فائز ہوا۔ وہ کفار جن کے نصیب میں اس نور سے سیراب ہونا نہیں تھا' انہوں نے جب ان اہل ایمان کو حاصل ہونے والی نعمتوں اور سعادتوں کا مشاہدہ کیا تو انہیں اپنے طرزِ عمل پر پشیمانی ہوئی اور انہوں نے بھی سیراب کی درخواست کی (لیکن ان کی یہ درخواست قبول نہ ہوئی) اور انہیں ظلمتوں کے سپرد کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ ان سے محفوظ رکھے۔

جس وقت ماں کے پیٹ میں بچے کی شکل وصورت بنتی ہے اس کی ہڈیوں کی ترتیب دیا جاتا ہے اور اسے بصارت عطا کی جاتی ہے اس وقت چوتھی مرتبہ نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے سیراب کیا جاتا ہے تا کہ اس کی ہڈیاں

نرم ہو جائیں اور اسے ساعت و بصارت حاصل ہو جائیں اگر ایسا نہ ہوتو بچے کے جوڑ کبھی بھی نرم نہ ہوں۔

جب بچہ ماں کے پیٹ سے نکلتا ہے اس وقت پانچویں مرتبہ اسے نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے سیراب کیا جاتا ہے اور اس طرح اس کے اندر کچھ کھانے کی جبلت پیدا ہوتی ہے۔

چھٹی مرتبہ بچے کو اس وقت نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے سیراب کیا جاتا ہے جب وہ پہلی مرتبہ اپنی ماں کا دودھ پیتا ہے۔

ساتویں مرتبہ بچے کو اس وقت نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے سیراب کیا جاتا ہے جب اس کے جسم میں روح پھونکی جاتی ہے کیونکہ اگر یہ نور نہ ہوتو روح کبھی بھی اس کے وجود میں داخل نہ ہو سکے اس کے باوجود روح بڑی مشکل سے جسم میں داخل ہوتی ہے اور اسے جسم میں داخل کرتے وقت فرشتوں کو خاصی مشکل پیش آتی ہے اگر اللہ کا حکم نہ ہو اور روح کو اللہ تعالیٰ کی معرفت نہ ہوتو کوئی فرشتہ اسے جسم میں داخل نہ کر سکے۔

ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے اس حقیقت کو ایک مثال کے ذریعے سمجھاتے ہوئے ارشاد فرمایا' جو فرشتے روح کو جسم میں داخل کرنے پر مامور ہوتے ہیں' ان کی مثال بادشاہ کے ان غلاموں کی مانند ہے جنہیں بادشاہ یہ حکم دے کہ میرے فلاں مقرب کو قید کر دو جب ہم اس مقرب وزیر کی طرف دیکھتے ہیں تو یہی سمجھ آتی ہے کہ یہ بے چارے غلام اس وزیر کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے لیکن جب ہم بادشاہ کی طرف دیکھتے ہیں جس نے ان غلاموں کو بھیجا ہے اور جو اس وزیر کا بھی حاکم ہے اس وقت ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ یہ غلام اس وزیر پر قابو پالیں گے لہٰذا جب فرشتے روح کو جسم میں داخل کرنے لگتے ہیں اس وقت روح انتہائی کرب کا شکار ہو جاتی ہے اور خوب گریہ وزاری کرتی ہے اس کی کیفیت کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔

جب بندۂ مومن کو قیامت کے دن دوبارہ زندہ کیا جائے گا اس وقت اسے آٹھویں مرتبہ نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے سیراب کیا جائے گا تاکہ اس کا وجود برقرار رہے۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں' آٹھ مرتبہ اس کی سیرابی میں دیگر تمام انبیاء کرام علیہم السلام اور تمام اُمتوں سے تعلق رکھنے والے جملہ اہلِ ایمان سب شامل ہیں لیکن ان کے درمیان فرق موجود ہے کیونکہ جس طرح انبیاء کرام اس نور سے فیض حاصل کرتے ہیں اس طرح کوئی اور یہ فیض حاصل نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کو مرتبۂ نبوت اور رسالت پر فائز کیا گیا ہے' بقیہ اہلِ ایمان میں ہر شخص اپنے نصیب کے مطابق اس نور سے فیض یاب ہوتا ہے۔ اُمتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سابقہ اُمتوں کی سیرابی کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ اُمتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم اس نور سے اس وقت سیراب ہوئی جب یہ نور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس میں داخل ہو چکا تھا اس لیے اس نور نے آپ کی روح مبارک اور جسمِ اقدس دونوں کا فیض حاصل کیا ہے جبکہ سابقہ اُمم نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وقت فیض یاب ہوئی تھیں جب وہ ذاتِ اقدس میں داخل نہیں ہوا تھا جس کے نتیجے میں انہیں صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ مبارکہ کے ''سر'' کا فیض حاصل ہوا اسی فرق

کی بدولت اُمتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیگر تمام اُمتوں پر فضیلت دی گئی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے لیے "خیرامۃ" (سب سے زیادہ بہتر اُمت) کے الفاظ استعمال کیے ہیں اور اس نعمت پر ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ بلاشبہ اسی کی ذات تمام تعریفوں کی مستحق ہے۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ ارشاد فرماتے ہیں اسی طرح دیگر تمام مخلوقات کو بھی نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض یاب کیا گیا ہے اور اگر یہ نور نہ ہوتا تو کوئی بھی شخص' کسی بھی چیز سے' کوئی فائدہ حاصل نہیں کرسکتا۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں' جب سیدنا آدم علیہ السلام زمین پر تشریف لائے اس وقت درختوں کے پھل نکلنے کے فوراً بعد زمین پر گر جاتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان پھلوں کو باقی رکھنے کے ارادے کے تحت انہیں نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے سیراب کیا جس کے باعث درختوں کے پھل پکنے کے بعد بھی درختوں کے ساتھ لگے رہتے ہیں۔

اگر کفار کو ماں کے پیٹ میں' شکل بنتے وقت' روح پھونکتے وقت' ماں کے پیٹ سے باہر نکلتے وقت اور پہلی مرتبہ ماں کا دودھ پیتے وقت نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض عطا نہ کیا جاتا تو جہنم خود ان کے پاس آ کر انہیں ہڑپ کر لیتی اور جب تک آخرت میں بھی ان کے وجود سے یہ فیض نہیں نکالا جائے گا اس وقت تک دوزخ انہیں نہیں جلا سکے گی۔

ایک مرتبہ سیّدی دباغ نے یہ بات بیان کی جب اللہ تعالیٰ نے نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے قلم' عرش' لوح' برزخ اور جنت کو پیدا کیا اسی طرح حاملینِ عرش' جنت اور ستر (۷۰) حجابات میں موجود فرشتوں کو پیدا کیا تو عرش نے بارگاہِ ربّ العزت میں التجا کی' اے میرے پروردگار! تو نے مجھے کیوں پیدا کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس لیے تاکہ تو اپنے اوپر موجود ستر (۷۰) حجابات کے نور سے زمین پر بسنے والے میرے بندوں کو محفوظ رکھنے کے لیے حجاب بن جائے کیونکہ یہ لوگ ان انوار کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے میں انہیں مٹی سے پیدا کروں گا کیونکہ اس وقت یہ اللہ تعالیٰ کا نافرمان نہیں تھا اور جہنم بھی موجود نہیں تھی اس لیے فرشتوں نے یہ گمان کیا کہ مٹی سے پیدا ہونے والی اللہ تعالیٰ کی محبوب مخلوق جنت میں پیدا ہوگی اور جنت ہی میں رہے گی اور انہیں عرش کے ذریعے محجوب کردیا گیا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمام ارواح کے نور کو ایک ساتھ پیدا کیا اور اسے نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض یاب کیا پھر اسے مختلف حصوں میں تقسیم کر کے مختلف ارواح کی شکل دی گئی اور ہر ایک روح کو مخصوص شکل دیتے وقت اسے دوبارہ نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے سیراب کیا گیا۔ ایک مخصوص مدت تک ارواح کی یہی حالت رہی۔ بعض ارواح نے اس سیرابی سے لطف حاصل کیا اور بعض اس لطف سے محروم رہیں لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اپنے دوستوں اور دشمنوں کو ایک دوسرے سے ممتاز کرنے کے لیے جہنم کو پیدا کیا اور پھر تمام ارواح کو اکٹھا کر کے ان سے دریافت کیا:

اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۔ (الاعراف ۷:۱۷۲) (کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟)

جن ارواح نے نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے سیرابی کے بعد لطف حاصل کیا تھا اور ان کا میلان اس نور کی طرف تھا' انہوں نے پوری رضامندی اور خوشی سے اقرار کیا (کہ تو ہی ہمارا رب ہے) لیکن جن ارواح کی قسمت میں محرومی تھی' ان پر جہنم کی تاریکی چھا گئی۔ انہوں نے مجبوری اور خوف کے عالم میں اس بات کا اقرار کیا' ان کے سامنے نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم اور جہنم کی تاریکی دونوں ظاہر ہوئے اور پھر اس وقت جب انہوں نے نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا مشاہدہ کیا تو انہیں اس کی اہمیت کا احساس ہوا کیونکہ وہ دیکھ چکے تھے کہ اب ان پر اللہ کا غضب نازل ہوگا اور انہی کے لیے جہنم کو تیار کیا گیا ہے۔

انبیاء کرام پر نورِ محمدی کا فیض

ایک مرتبہ سیّدی دباغ نے ارشاد فرمایا اگرچہ تمام انبیاء کرام کو نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے سیراب کیا گیا ہے لیکن کوئی بھی مکمل طور پر اس سے سیراب نہیں ہوا بلکہ ہر ''نبی'' اپنے' اپنے نصیب کے مطابق اس سے سیراب ہوا۔ نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف رنگ اور مختلف احوال اور بے شمار اقسام ہیں لہٰذا ہر ''نبی'' کو ایک مخصوص رنگ اور مخصوص قسم عطا کی گئی۔

جب سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض حاصل کیا تو انہیں ''مقامِ غربت'' نصیب ہوا جس کا مالک کسی ایک مقام پر ٹھہرنے کے بجائے ہر وقت سیاحت میں مشغول رہتا ہے۔

جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض حاصل کیا تو انہیں کامل مشاہدے کے ہمراہ رحمت اور تواضع کا مقام حاصل ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ' حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کسی سے مخاطب ہوتا دیکھ لیں تو لہجے کی نرمی اور انداز کی انکساری کے باعث آپ یہ سمجھیں گے کہ شاید حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے مخاطب شخص کے سامنے تواضع کا اظہار کر رہے ہیں لیکن درحقیقت آپ اپنے عظیم مشاہدے کی قوت کے باعث اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہر وقت متواضع رہتے ہیں۔

جب سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض حاصل ہوا تو آپ کو مقامِ مشاہدہ پر فائز کیا گیا جہاں آپ اللہ تعالیٰ کی تمام تر نعمتوں' مہربانیوں جن کی کوئی حد نہیں ہے' کے ہمراہ مشاہدۂ حق میں مشغول رہتے ہیں اسی طرح دیگر تمام انبیاء کرام اور ملائکہ عظام کو نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے' مختلف اعتبار سے فیض حاصل ہوا۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں' تمام ''اہلِ خیر'' میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے ''خیر'' ظاہر ہوئی ہے اور یہ ''اہلِ خیر'' انبیاء کرام' اولیاء عظام' فرشتے اور عامۃ المسلمین ہیں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا' ان کے درمیان فرق کیسے کیا گیا؟

سیّدی دباغ نے جواب دیا' فرشتوں کی ذات اور ان کی ارواح دونوں کو نور سے پیدا کیا گیا ہے۔ انبیاء

کرام کی ارواح کو نور سے اور ان کی ذات کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے اور ان دونوں کے درمیان ایک اور نور ہے جس سے ان کی ذات سیراب ہوتی ہے۔ یہی کیفیت اولیاء کرام کی بھی ہے لیکن انبیاء کرام مرتبۂ نبوت پر فائز ہونے کے باعث اولیاء پر فوقیت رکھتے ہیں کیونکہ مرتبۂ نبوت کی عظمت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا عام مسلمانوں کا وجود مٹی سے پیدا ہوتا ہے اور ان کی ارواح نورانی ہوتی ہیں اس لیے ان کے وجود میں انبیاء و اولیاء کے نور سے ہلکی سی مشابہت پائی جاتی ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا' ان تمام انوار کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نور مبارک سے کیا نسبت حاصل ہے؟ نیز یہ انوار نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے کس طرح مدد حاصل کرتے ہیں؟

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے اس کے جواب میں ایک عام فہم مثال بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا' اگر بہت سی بلیوں کو کچھ عرصے تک بھوکا رہنا پڑے یہاں تک کہ انہیں کھانے کی شدید طلب محسوس ہو' وہ سب اس روٹی پر ٹوٹ پڑیں گی لیکن (وہ روٹی ایسی ہو کہ سب بلیوں کے کھانے کے باوجود) اس روٹی میں کوئی کمی نہ آ سکے۔ یہی حالت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نور مبارک کی ہے کہ تمام جہان اس نور سے فیض حاصل کرتے ہیں لیکن اس میں کوئی کمی نہیں آتی بلکہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اس میں اضافہ کرتا رہے گا۔ یاد رہے کہ اس اضافے کا مطلب یہ نہیں کہ اس نور کا حجم پھیل جاتا ہے بلکہ اس سے مراد باطنی اضافہ ہے۔ تمام انبیاء کرام' اولیاء عظام اور عامۃ المسلمین اسی نور سے فیض حاصل کرتے ہیں لیکن اس کے مراتب مختلف ہوتے ہیں۔

اجرام فلکی پر نورِ محمدی کا فیض

ایک مرتبہ سیّدی دباغ نے ارشاد فرمایا' سورج' چاند اور ستاروں کا نور برزخ کے نور سے پیدا ہوا ہے اور برزخ کا نور اس میں موجود ارواح کے نور سے پیدا ہوا ہے اور ارواح کا نور' نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے پیدا ہوا ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں' ان سب میں نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور زمین اور پہاڑوں کی پیدائش کے بعد جبکہ سیدنا آدم علیہ السلام کی تخلیق کے قریب ہوا۔ پہلے فرشتے اور ارواح اللہ تعالیٰ کی عبادت کیا کرتے تھے۔ ایک دن اچانک سورج' چاند اور ستاروں میں روشنی ظاہر ہوئی تو زمین پر رہنے والے فرشتے اس سے خوف زدہ ہو کر سائے کی تلاش میں بھاگے اور بھاگتے ہوئے انہوں نے پوری زمین کا چکر کاٹ لیا اور پھر وہیں واپس پہنچ گئے جہاں سے بھاگنے کا آغاز کیا تھا اس صورتِ حال سے وہ سخت خوف زدہ ہوئے اور یہ سمجھے کہ شاید کوئی بڑا واقعہ (تباہی) رونما ہونے لگا ہے۔ چنانچہ وہ سب ایک جگہ پر اکٹھے ہوئے' انہیں دیکھ کر آسمان سے بھی فرشتے اُتر آئے اور برزخ میں موجود ارواح بھی زمین پر اُتر آئیں اور ان سب نے مل کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا شروع کر دی جب سورج غروب ہو گیا تو یہ سب اپنی اپنی جگہ پر لوٹ گئے اور پھر اسی بات کی یادگار میں ہر سال ایک رات کے لیے اکٹھے ہوا کرتے تھے اور ان کے اس عمل کی یادگار لیلۃ القدر کی صورت میں ہمارے درمیان موجود

ہے۔

(سیّدی عبدالسلام بن مشیش کے موزوں کردہ درود شریف میں ایک مقام پر یہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں)

وفیہ ارتقت الحقائق۔

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس میں حقائق کا ارتقاء ہوا ہے)

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں' یہاں حقائق سے مراد وہ اسرار ہیں جو تمام مخلوق میں پھیلے ہوئے ہیں اور جن کی تعداد 366 ہے۔حیوانات' جمادات بلکہ ساری مخلوقات میں یہ اسرار موجود ہے۔مثلاً نباتات میں موجود ''سر'' وہ نفع ہے جو درحقیقت اللہ تعالیٰ (کے فضل) سے متعلق ہے کیونکہ ہر چیز کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہے۔(احمد بن مبارک کہتے ہیں) آئندہ سطور میں اس نکتے کی وضاحت کی جائے گی۔(سیّدی دباغ کہتے ہیں) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں (دوسروں کو) نفع پہنچانے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے اور اس بارے میں جو مقام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے' وہ کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔آپ خود غور کر سکتے ہیں کہ (ساری کائنات کو وجود کی نعمت بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے اور برکت سے حاصل ہوئی ہے) اور ساری کائنات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نور مبارک سے مدد حاصل کرتی ہے۔یہ خصوصیت اور کسی کو حاصل نہیں۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں' زمین میں یہ ''سر'' موجود ہے کہ اس نے اپنے اوپر تمام موجود چیزوں کا بوجھ اُٹھا رکھا ہے اور یہ بھی حقائق میں سے ایک حقیقت ہے اور یہ حقیقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس میں اس حد تک پائی جاتی ہے کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسرار و معارف کو مخلوق پر ڈال دیا جائے تو وہ ان کا بوجھ برداشت نہیں کر سکے گی اور ہلاکت کا شکار ہو جائے گی۔

اہلِ مشاہدہ میں یہ ''سر'' موجود ہے کہ وہ ایک لمحے کے لیے اللہ تعالیٰ کی ذات سے غافل نہیں ہوتے اور یہ خصوصیت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس میں اس مرتبے میں موجود ہے جو کسی اور کو نصیب نہیں ہو سکا۔

صدیقین میں یہ ''سر'' موجود ہے کہ وہ ''صدق'' سے متصف ہیں اور یہ خصوصیت سب سے زیادہ کمال کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں موجود ہے۔

اہلِ کشف میں معرفتِ الٰہیہ کا ''سر'' موجود ہے اور ساری مخلوق میں سب سے زیادہ معرفت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے۔

(اس ساری گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا) حقائق کا ارتقاء اللہ تعالیٰ کے انوار سے سیرابی کے مطابق ہوتا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ان تمام انوار کی اصل ہے۔تمام انوار آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات سے پھیلے ہیں لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں حقائق اس قدر زیادہ ہیں جن کا تصور نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی کوئی دوسرا اس مقام تک پہنچ سکتا ہے۔

(سیّدی عبدالسلام بن مشیش کے درود شریف کے بعض الفاظ درج ذیل ہیں کیونکہ ان کا سیاق وسباق موجود نہیں ہے اس لیے ان کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا۔ مترجم عفی عنہ)

وتنزلت علوم آدم۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں' یہاں علومِ آدم سے مراد ان اسماء کا علم ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے (قرآن مجید میں) ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا۔ (البقرۃ ۲:۳۱)

(اور اللہ نے آدم کو تمام اسماء کا علم عطا کر دیا)

الاسمآء سے مراد کیا ہے؟

یہاں اسماء سے مراد اسمائے عالیہ ہیں' اسمائے نازلہ مراد نہیں ہیں۔ (یاد رکھیں) ہر مخلوق کے دو نام ہیں' ایک اسمِ عالی اور دوسرا اسمِ نازل۔ اسمِ نازل اس نام کو کہا جاتا ہے جو عام طور پر رکھا جاتا ہے لیکن اسمِ عالی اس نام کو کہتے ہیں جو (اس نام سے متعلق چیز یعنی) مسمّیٰ کی حقیقت' اس کے فوائد اور متعلقات کی وضاحت کر دے جیسے کلہاڑی (اسمِ نازل ہے اور اس) کے لیے جو اسمِ عالی ہوگا' محض اس اسمِ عالی کا لفظ سُن کر ہمیں یہ پتہ چل جائے گا کہ اس کا کیا فائدہ ہے اور یہ کن کاموں میں استعمال ہو سکتی ہے۔ لوہارا سے کس طرح بناتا ہے غرضیکہ صرف اسمِ عالی سُن لینے سے ہی کلہاڑی سے متعلق تمام علوم اور معارف سمجھ میں آ جاتے ہیں اسی طرح تمام مخلوقات کے اسمائے عالیہ سُن کر ان تمام مخلوقات سے متعلق جملہ علوم و معارف سمجھ میں آ جائیں گے لہٰذا اللہ تعالیٰ کے مذکورہ بالا فرمان میں حضرت آدم علیہ السلام کو ان تمام اسمائے عالیہ کا علم عطا کر دیا گیا جنہیں حاصل کرنے کی وہ صلاحیت رکھتے تھے اور جو ان کی اولاد کی ضروریات سے کسی نہ کسی حوالے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں عرش کے نیچے سے لے کر فرش کے نیچے تک موجود تمام مخلوقات شامل ہوں گی جس میں جنت' دوزخ' ساتوں آسمان' ان میں جو کچھ بھی موجود ہے' ان آسمانوں کے درمیان جو کچھ موجود ہے' زمین اور آسمان کے درمیان جو کچھ موجود ہے اور زمین میں جنگل' میدان' وادیاں' سمندر' درخت غرضیکہ ہر مخلوق خواہ وہ ناطق ہو یا جامد۔

حضرت آدم علیہ السلام کو ان سب کی اصل' ان کے فوائد اور دیگر متعلقات کا علم عطا کر دیا گیا۔ مثلاً جب انہیں جنت کے اسمِ عالی کا پتہ چلا تو انہیں یہ بھی پتہ چل گیا کہ جنت کہاں موجود ہے؟ اسے کس طرح پیدا کیا گیا ہے؟ اس میں کتنے مقامات ہیں؟ کتنی حوریں ہیں؟ قیامت کے بعد یہاں کتنے لوگ آ کر آباد ہوں گے؟ اسی طرح دوزخ' آسمان' فرشتے وغیرہ تمام مخلوقات کے بارے میں جملہ متعلقات کا علم حضرت آدم علیہ السلام کو حاصل ہو گیا اور آپ کے بعد' آپ کی اولاد میں' انبیاء کرام اور کامل اولیاء عظام کو یہ علوم عطا کیے گئے۔ حضرت آدم علیہ السلام کا نام بطورِ خاص (قرآن میں) اس لیے ذکر کیا گیا کیونکہ یہ تمام علوم سب سے پہلے آپ ہی کو حاصل ہوئے اور پھر آپ کے بعد آپ کی اولاد کی طرف منتقل ہوئے۔ اس آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ

حضرت آدم علیہ السلام کے علاوہ اور کسی کو بھی ان اسماء کا علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ حضرت آدم علیہ السلام کے علوم کے ساتھ ہم نے یہ قید ذکر کی ہے کہ ان سے مراد وہ علوم ہیں جن کی انہیں یا ان کی اولاد کو ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس قید کا مقصد یہ ہے کہ کوئی شخص اس غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائے کہ تمام اشیاء کے اسمائے عالیہ کا علم حاصل کر لینے کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کا علم' اللہ تعالیٰ کے علم کے برابر ہو جائے گا۔

سیّدی عبدالسلام بن مشیش نے ''تنزلت'' کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے تاکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت آدم و دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کے علم کے درمیان فرق واضح ہو جائے کیونکہ انبیاء کرام علیہم السلام جب مشاہدۂ حق میں مستغرق ہوتے ہیں اس وقت ان کی توجہ ان علوم کی طرف کم ہو جاتی ہے اور جب انبیاء کرام علیہم السلام ان علوم کی طرف توجہ کرتے ہیں تو مشاہدۂ حق کے اندر ہلکی سی کمی آ جاتی ہے لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خصوصیت ہے کہ جب آپ حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو آپ کو حق تعالیٰ کا مکمل مشاہدہ حاصل ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ علوم کا مشاہدہ بھی مکمل طور پر حاصل رہتا ہے اور جب آپ مکمل طور پر ان علوم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اس وقت مشاہدۂ حق میں بھی کوئی کمی نہیں آتی لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مشاہدۂ حق' مشاہدۂ خلق کے لیے حجاب نہیں بنتا اور مشاہدۂ خلق' مشاہدۂ حق کے لیے حجاب نہیں بنتا۔

(مترجم عرض پرداز ہے اس کے بعد سیّدی احمد بن مبارک سلجماسی نے مذکورہ بالا درود شریف کی عبارت میں سے چند مقامات کی تشریح بیان کی ہے جس کا رواں با محاورہ اور آزاد ترجمہ ذیل ہے) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان علوم میں جس قدر رسوخ حاصل ہے' وہ کسی اور کو حاصل نہیں ہے یہاں تک کہ جب انبیاء کرام علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ان کی توجہ بھی ان علوم سے ہٹ جاتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ و مقام اس قدر بلند ہے کہ مخلوق میں سے کوئی ایک بھی اسے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور حضرت آدم علیہ السلام کی ساری اولاد میں سے کوئی بھی یا کوئی ولی بھی اس مقام تک نہیں پہنچ سکتا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ مبارکہ باطنی کمالات کے اعتبار سے سب سے زیادہ کامل ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مبارک ظاہری کمالات کے اعتبار سے سب سے زیادہ کامل ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عالمِ علوی یعنی تقدیر کے تمام معاملات کا اس وقت بھی علم تھا جب آسمان' لوح' فرشتے اور دیگر مخلوقات کو پیدا بھی نہیں کیا گیا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی بدولت عالمِ ملکوت کو رونق بخشی اور عالمِ جبروت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی فیوض و برکات سے بھرا ہوا ہے۔

عالم ملک وملکوت میں فرق

یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ عالمِ علوی جسے عالم الملک بھی کہا جاتا ہے' اسے مختلف اعتبار سے کبھی عالمِ ملکوت اور کبھی عالمِ جبروت کہا جاتا ہے۔ عالمِ ملکوت کی خوبی یہ ہے کہ یہاں کے بسنے والے خواہ وہ بولتے ہوں یا خاموش رہتے ہوں' اپنی جگہ جمے ہوئے ہوں یا عقل رکھتے ہوں' ان میں سے ہر ایک ہر حال میں صرف اللہ تعالیٰ

کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ ان سب میں یہ مشترکہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کے مشاہدے کی نعمت حاصل ہے اس کے برعکس عالم سفلی (یعنی اہلِ زمین) ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں' ان میں سے کوئی سورج کی پوجا کرتا ہے تو کوئی چاند اور ستاروں کی' کسی نے صلیب کی بندگی اختیار کر رکھی ہے اور کسی نے بتوں کو بھگوان بنا رکھا ہے۔ گویا یہاں کے بسنے والوں کے نظریات' عالمِ علوی کے برعکس' ایک دوسرے سے مختلف ہیں اس ساری گفتگو کا خلاصہ یہ نکلا کہ جس جہان کے باسی ایک عقیدے کے مالک ہوں' اسے عالمِ الملک کہا جائے گا اور یہی عالمِ علوی ہے اگر اس جہان کے باسیوں کے انوار' ان کے مقامات او احوال کے اختلاف کو پیش نظر رکھا جائے تو اسے عالم الملکوت کہیں گے جبکہ ان پر نازل ہونے والے انوار کے حوالے سے اسے عالمِ جبروت کہا جائے گا کیونکہ ان انوار کی' عالمِ جبروت میں وہی حیثیت ہے جو ہماری دنیا میں ہوا کو حاصل ہے لہٰذا اس جہان کے باسی انہی انوار کے ذریعے اپنے وجود' روح اور معارف کو سیراب کرتے ہیں اور اپنے مخصوص مقام پر فائز رہتے ہیں کیونکہ یہ انوار ان کے لیے حفاظت کا کام کرتے ہیں اس لیے (درود شریف میں) عالمِ جبروت کو حوض سے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ یہ تمام انوار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نور مبارک سے فیض حاصل کرتے ہیں اس لیے مصنف کے کہنے کا مطلب یہ ہوگا کہ عالمِ جبروت کے تمام انوار حوض کی مانند ہیں اور یہ حوض نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے سیراب ہونے کے باعث ہر وقت چھلکتا رہتا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) شیخ نے ان تینوں جہانوں کے بارے میں بہت نفیس معلومات بیان کی ہیں تاہم بعض اہلِ علم اس بات کے قائل ہیں کہ عالم الملک اس جہان کو کہا جائے گا جسے حواس کے ذریعے پہچانا جا سکے۔ عالم الملکوت اس جہان کو کہا جائے گا جسے عقل کے ذریعے پہچانا جا سکے اور عالمِ جبروت اس جہان کو کہا جائے گا جو صرف اللہ تعالیٰ کے خاص فضل وکرم کے نتیجے میں سمجھ میں آ سکے۔ بعض دیگر اہلِ علم کی تحقیق کے مطابق ظاہر اور محسوس جہان کو عالم الملک کہیں گے جبکہ باطنی اور عقل سے متعلق جہان کو عالم الملکوت کہیں گے اور عالمِ جبروت اس جہان کو کہا جائے گا جس میں ان دونوں جہانوں کی خوبیاں موجود ہوں۔ بعض اہلِ علم اس بات کے قائل ہیں کہ عالمِ جبروت سے مراد ''اسماء'' میں جبکہ عالم الملکوت سے مراد صفات ہیں کیونکہ یہی صفات اسماء اور افعال کے درمیان تصرف کا واسطہ اور ذریعہ بنتی ہیں۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں' سیّدی عبدالسلام بن مشیش نے درود شریف میں لفظ ''ریاض الملکوت'' استعمال کیا ہے یہاں ریاض سے مراد عالم الملکوت یعنی عالمِ علوی ہے جس میں لوح' قلم' برزخ اور عرش شامل ہیں کیونکہ لوحِ محفوظ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم' تمام انبیاء' تمام اولیاء اور تمام اہلِ ایمان کے اسماء تحریر ہیں اور لوحِ محفوظ کے ان حروف سے انوار چمکتے ہوئے دِکھائی دیتے ہیں اور ہر ایک کے مخصوص مرتبہ و مقام کے مطابق اس کے نام کے حروف سے نور نکلتا ہوا دِکھائی دیتا ہے لہٰذا الوح میں تحریر حروف میں سے نکلنے والے انوار کی بہت سی قسمیں ہیں اور اسی طرح قلم سے نکلنے والے انوار کی بھی بہت سی قسمیں ہیں' کوئی بھی شخص برزخ

میں سے نکلنے والے انوار کے رنگوں کی اقسام کا اندازہ نہیں لگا سکتا' یہ تمام انوار انبیاء کرام' اولیاء عظام اور عام مؤمنین کی ارواح کے انوار ہوتے ہیں اسی طرح چمک کے اعتبار سے عرش سے نکلنے والے انوار کی بھی قسمیں ہیں کیونکہ یہ اقسام جنت میں موجود اہلِ جنت کے مراتب کے اختلاف کے مطابق ہوتے ہیں۔ گویا جنت کے ہر مقام کا ایک مخصوص نور ہے اور جنت کے تمام مقامات کے مطابق انوار عرش سے ظاہر ہوتے ہیں۔

کیونکہ (عالم الملکوت سے تعلق رکھنے والی) ان تمام اشیاء کے انوار کئی اقسام پر مشتمل ہوتے ہیں اس لیے عالم الملکوت کو باغات سے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ باغات میں کئی قسم کے پھول ہوتے ہیں جن کے انوار (رنگ اور خوشبو) ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

اب کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نور مبارک مذکورہ بالا تمام اشیاء میں موجود ہے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ مبارک لوحِ محفوظ میں تحریر ہے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کے اسرار قلم سے خارج ہوتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارکہ برزخ کے سب سے بلند ترین مقام پر فائز ہے' جنت میں جو مقام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے اس کے اوپر (بلکہ اس کے برابر بھی) کوئی مقام کسی ایک کو بھی نصیب نہیں ہو سکتا لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نور مبارک مذکورہ بالا تمام اشیاء کے انوار کے ہمراہ موجود رہتا ہے اور اس کی موجودگی کی برکت کی وجہ سے ان تمام اشیاء میں ایک عجیب طرح کی شان دار رونق آ جاتی ہے۔

سیّدی عبدالسلام بن مشیش نے اپنے درود میں اسی بات کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

''عالم الملکوت کے باغات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جمال کی چمک کی وجہ سے سر سبز و شاداب ہیں۔''

اس کے بعد سیّدی عبدالسلام بن مشیش نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اور بھی بہت سی خوبیوں کا ذکر کیا ہے کہ ساری مخلوق آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد حاصل کرتی ہے اور درحقیقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہی تکیہ کرتی ہے کیونکہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ درمیان میں موجود نہ ہوتا تو کوئی بھی چیز وجود میں نہ آتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو واسطہ اس لیے قرار دیا گیا ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے تمام مخلوق وجود میں آئی ہے اور اس جملے کے ذریعے اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو زبان زد خاص و عام ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مسعود نہ ہوتا تو جنت' دوزخ' آسمان' زمین' زمان' مکان' دن' رات بلکہ کچھ بھی پیدا نہ کیا جاتا۔

(مترجم عرض پرداز ہے کہ اس مقام پر دوبارہ سیّدی احمد بن مبارک سلجماسی نے سیّدی عبدالسلام بن مشیش کے موزوں کردہ درود شریف کے مختلف مقامات سے مختلف الفاظ کی مختصر تشریح تحریر کی ہے کیونکہ ہمارے سامنے درود پاک مکمل طور پر موجود نہیں ہے اس لیے الگ الگ الفاظ کا ترجمہ کرنا اور اس کی تشریح کرنا بہت مشکل ہے۔ چنانچہ ہم ساری گفتگو جو دو مختصر سے شذروں پر مشتمل ہے' اس کا آزاد اور رواں ترجمہ تحریر کرتے ہیں۔)

اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ پر ایسا درود نازل ہو جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور مرتبہ و مقام کے مطابق ہو۔ اے اللہ! بے شک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تیرا سب سے ''جامع سر'' ہیں جس نے تیرے اس قدر

اسرار کو حاصل کیا ہے جتنے اسرار کو کوئی اور حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ جیسے جیسے مشاہدہ وسیع ہوتا چلا جاتا ہے' صاحب مشاہدہ کے علم میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مشاہدہ اور کسی کا نہیں ہے اس لیے ہمارے نزدیک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عرش سے لے کر فرش تک بلکہ عرش سے اوپر بھی جو کچھ موجود ہے' ان سب کا علم حاصل ہے اور ان معلومات کی حیثیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم مبارک کے ہزارویں حصے کے برابر بھی نہیں ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میری خواہش تھی کہ میں درود پاک کی مکمل تشریح حضرت کی زبانی سنتا اور اسے یہاں تحریر کر لیتا لیکن یہ بات میرے لیے ممکن نہیں ہو سکی کیونکہ اس دوران بعض ایسے لوگ وہاں آ گئے جو حضرت کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے اور یہ بات ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ آپ بدعقیدہ لوگوں کے سامنے معرفت کی باتیں بیان نہیں کرتے تھے اگر آپ بدستور اس درود پاک کے الفاظ کی تشریح بیان کرتے رہتے تو ہمیں بہت سی حیرت انگیز معلومات حاصل ہوتیں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) سیّدی عبدالسلام بن مشیش نے درود پاک میں یہ الفاظ بھی شامل کیے ہیں:

اللهم الحقنی بنسبه وحققنی بحسبه.

''اے اللہ! مجھے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب میں شامل رکھ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حسب مجھے بھی نصیب فرما۔''

اس کی تشریح کرتے ہوئے سیّدی دباغ نے ارشاد فرمایا یہاں نسب سے مراد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے باطن کا وہ مشاہدہ ہے جسے مخلوق برداشت نہیں کر سکتی لیکن سیّدی عبدالسلام بن مشیش کیونکہ اپنے وقت کے قطب تھے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل وارث تھے اس لیے انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدے سے فیض حاصل کرنے کی نعمت حاصل ہوئی جبکہ یہاں حسب سے مراد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات ہیں جیسے رحمت' علم' حلم اور اس کے جیسی دیگر اچھی صفات شامل ہیں اب کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدے کی مانند کسی اور کو مشاہدہ نصیب نہیں ہو سکتا اس لیے انہوں نے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ میرا الحاق ان کے ساتھ کر دے۔ (یعنی اس کا کچھ فیض مجھے بھی نصیب ہو)

سیّدی دباغ فرماتے ہیں کہ کسی بھی شیخ کی تمام تر توجہ کا مرکز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ ہوتی ہے۔ کاملین کے نزدیک کشف' تصرف یا ولایت کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

ایک دفعہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے سیّدی عبدالسلام بن مشیش کے اس قول کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا یہاں نسب سے مراد قوت اور صلاحیت ہے جبکہ حسب سے مراد وہ فیض ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوا ہے اس کے بعد سیّدی دباغ نے ایک مثال کے ذریعے اس کی وضاحت کی۔

فرض کریں ایک شخص کے پاس بہت سے اونٹ ہیں اور اس نے ان پر مخصوص وزن لادنا ہے' ان تمام

اونٹوں میں ایک کے سوا اور کوئی بھی اونٹ اس وزن کو اُٹھانے کی صلاحیت نہیں رکھتا اس لیے وہ شخص اسی ایک اونٹ پر سارا بار لا دے گا اور وہ اونٹ کسی پریشانی اور تکلیف کے بغیر اس وزن کو اُٹھا لے گا۔

شیخ ابوالحسن الشاذلی فرماتے ہیں:

لیس من الکرم ان لا تحسن الا لمن احسن الیك.

"یہ کوئی خوبی نہیں ہے کہ آپ اسی شخص کے ساتھ بھلائی کریں جس نے آپ پر احسان کیا ہو۔"

ایک مرتبہ سیّدی ابوالحسن الشاذلی کے اس قول کی تشریح کرتے ہوئے سیّدی دباغ نے ارشاد فرمایا' سیّدی شاذلی نے یہ بات اس وقت ارشاد فرمائی تھی جب وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مشاہدے میں غرق تھے اور ذات کی کمزوری کے باعث ان سے یہ الفاظ صادر ہو گئے' ان کی مثال بالکل اسی طرح ہے جیسے کوئی شخص نوحہ کرنے کے حرام ہونے سے واقف ہو لیکن اپنی طبعی کمزوری کے باعث بے اختیار نوحہ کرنے لگے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) سیّدی دباغ اسی بات کو ایک اور مثال کے ذریعے یوں واضح کرتے ہیں کہ بادشاہ کے اردگرد بہت سے افراد موجود ہیں اور بادشاہ ان میں بے دریغ خزانہ تقسیم کر رہا ہے لیکن کافی دیر تک اس شخص کو کچھ نہیں ملتا تو یہ رنج کے عالم میں بادشاہ سے یہ کہہ دیتا ہے اگر تم نے مجھے کچھ نہیں دیا تو تم سخی نہیں ہو۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) سیّدی ابوالحسن الشاذلی کے یہ الفاظ "الحزب الکبیر" میں موجود ہیں اور بہت سے لوگوں کے لیے اُلجھن کا باعث بنتے ہیں۔ شیخ ابن عباد فرماتے ہیں' ان الفاظ کو "الحزب الکبیر" میں سے نکال دینا چاہیے کیونکہ کوئی بھی اللہ تعالیٰ پر احسان نہیں کر سکتا اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کو کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے اس کی تائید قرآن کی درج ذیل آیت سے ہوتی ہے۔

اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَأْتُمْ فَلَهَا. (بنی اسرائیل ۱۷:۷)

"اگر تم کوئی احسان کرو گے تو خود اپنے اوپر کرو گے اور اگر کوئی زیادتی کرو گے تو خود اپنے ساتھ کرو گے۔"

لیکن سیّدی الشاذلی کے ان الفاظ کو کوئی بھی تبدیل نہیں کر سکتا کیونکہ انہوں نے اپنے نورِ ولایت کے ذریعے دیکھ کر یہ الفاظ تحریر کیے ہیں اور ان جیسا نورِ ولایت کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔

شیخ ابن عباد فرماتے ہیں' میں نے "الحزب الکبیر" کے بہت سے نسخوں میں' حاشیے میں یہ عبارت دیکھی ہے کہ جس شخص کو روحانی مرتبہ و مقام نصیب ہو' وہ ان الفاظ کو پڑھ لے لیکن جنہیں یہ کیفیت حاصل نہیں ہے' انہیں چاہیے کہ وہ ان الفاظ کو چھوڑ کر آگے سے پڑھیں جہاں "رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا" آتا ہے۔

شیخ البرزلی فرماتے ہیں' میں نے "الحزب الکبیر" کے ایک نسخے میں یہ عبارت تحریر دیکھی ہے:

"اس مقام کو شیخ شاذلی کے سپرد کر دیا جائے اور اپنی عقل کے گھوڑے دوڑانے کی کوشش نہ کی جائے۔"

یہ نسخہ مجھے دو واسطوں سے سیّدی الشاذلی سے ملا ہے۔

ابن الفارض کا شعر

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک مرتبہ میں نے سیّدی دباغ سے شیخ ابن الفارض کے درج ذیل شعر کا مفہوم دریافت کیا:

شربنا علی ذکر الحبیب مدامۃ
سکرنا بھا من قبل ان یخلق الکرم

''ہم انگور کی پیدائش سے پہلے ہی ذکر حبیب کی شراب پی کر مدہوش بھی ہو چکے تھے۔''

سیّدی دباغ فرماتے ہیں اس شعر میں عالمِ ارواح کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور یہاں حبیب سے مراد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ذکر کی بدولت ہی مکمل مشاہدہ نصیب ہوتا ہے جس کی وجہ سے روح ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہو جاتی ہے اور اس تبدیلی کے باعث اسے مزید معارف اور انوار نصیب ہوتے ہیں۔ اگلی حالت اور مرتبے میں پہنچ کر روح کا تعلق پچھلے مقام سے اس طرح منقطع ہو جاتا ہے کہ گویا پہلی حالت کے ساتھ اس کا کبھی کوئی واسطہ نہیں رہا۔

اس مشاہدے کو شراب سے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ ان دونوں کے درمیان تین اعتبار سے مشابہت پائی جاتی ہے:

(۱) شراب پی کر انسان ایک حالت سے (یعنی ہوش سے) دوسری حالت (یعنی مدہوشی) کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور حالت کی یہ تبدیلی مشاہدے سے بھی واقع ہوتی ہے۔

(۲) اس تبدیلی کے بعد پہلی حالت (یعنی ہوش) سے انسان مکمل طور پر لاتعلق ہو جاتا ہے اور مشاہدے میں بھی یہی صورتِ حال درپیش ہوتی ہے۔

(۳) جب انسان شراب پی لے تو اس کے اندر جرأت اور حوصلہ پیدا ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ کسی کو بھی کچھ نہیں سمجھتا۔

بالکل اسی طرح جس شخص کو یہ مشاہدہ نصیب ہو جائے اس کے سامنے تمام انوار بے معنی ہو جاتے ہیں۔

گویا شاعر کے قول کا مطلب یہ ہے کہ جب ہمیں مشاہدۂ حق اور مشاہدۂ نبوی نصیب ہو گیا تو اب ہمیں کسی بھی چیز کی پرواہ نہیں ہے اس شعر میں مدہوش ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے ہر چیز سے تعلق توڑ کر اللہ تعالیٰ کی ذات سے تعلق جوڑ لیا ہے۔ انگور کی پیدائش سے پہلے کا مطلب یہ ہے کہ یہ واقعہ عالم ارواح میں پیش آیا تھا جبکہ انگور کا تعلق عالمِ اجسام کے ساتھ ہے اور یہ اس وقت موجود نہیں تھا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک کی بدولت انسان کی روح کو جو مشاہدہ نصیب ہوتا ہے وہ اس کے وجود کے اندر داخل ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں انسان کی ذات پر ایک قسم کی غفلت طاری ہو جاتی ہے جو اسے نفسانی خواہشات سے لاتعلق کر دیتی ہے پھر جب یہ شخص کثرت کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک

کرتا اور سنتا ہے تو یہ مشاہدہ جو اس کی روح میں موجود تھا اب اس کی ذات میں سرایت کرنا شروع کر دیتا ہے یہاں تک کہ ذات کو بھی وہی تین کیفیات نصیب ہو جاتی ہیں جو روح کو حاصل تھیں اور وہ شخص ہر چیز سے لاتعلق ہو کر صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ تعلق قائم کر لیتا ہے۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں' مجھے اس شخص پر حیرت ہوتی ہے جو خود کو ولی قرار دیتے ہوئے اس بات کا دعوے دار ہو کہ وہ ساری کائنات میں موجود ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ کائنات میں دروازے کے بغیر داخل نہیں ہوا جا سکتا اور وہ دروازہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہے' کوئی مخلوق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نور مبارک کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی جب وہ شخص دروازے کو برداشت نہیں کر سکتا تو پھر باقی کائنات میں اس کی حالت کیا ہوگی البتہ اگر کسی کو ''شیطانی فتح'' کے ذریعے اپنے اندر یہ صلاحیت محسوس ہو تو ایسا شخص تو بے چارہ اپنے کمرے میں بھی نہیں سما سکتا بقیہ گھر یا پورے جہاں میں سمانا تو بہت دُور کی بات ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں' یہ بات ذہن نشین کریں کہ عرش' فرش' آسمان' زمین' جنات' حجابات' ان کے اوپر یا نیچے جو کچھ موجود ہے' یہ سب نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جز سے فیض حاصل کرتے ہیں اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پورے نور مبارک کو عرش پر ڈال دیا جائے تو وہ پگھل جائے گا اگر عرش کے اوپر موجود ستر (۷۰) حجابات پر ڈال دیا جائے تو وہ تمام حجابات تباہ ہو جائیں گے اور اگر اس نور کو ساری مخلوق پر ڈال دیا جائے تو ساری مخلوق تباہ ہو جائے گی لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نور مبارک کی موجودگی میں کوئی شخص یہ دعویٰ کیسے کر سکتا ہے کہ وہ ساری کائنات میں موجود ہے جب یہ شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر مبارک میں یا قبر انور کے پاس پہنچے گا تو اس کا وجود کہاں جائے گا یا جب یہ عالمِ برزخ میں اس مقام کے قریب پہنچے گا جہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارکہ قیام پذیر ہوتی ہے تو کیا یہ اس کے انوار کو برداشت کر سکے گا حالانکہ ساری مخلوق مل کر بھی ان انوار کو برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس شخص کی مراد یہ ہو کہ وہ صرف زمین اور آسمان کے درمیان موجود خلا میں ہر جگہ موجود ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے عرض کی' ہو سکتا ہے کہ اس کے کہنے کا مقصد یہ ہو کہ وہ اس کائنات کو اپنی ذات کے بجائے اپنے نور سے بھر دیتا ہے جیسے سورج' زمین اور آسمان میں ہر جگہ روشنی پھیلا دیتا ہے؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا' اپنی ذات کے ذریعے تو وہ اسے بھر ہی نہیں سکتا اس کی مراد نور کے ذریعے بھرنا ہوگی لیکن اس کے نور کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نور مبارک کے سامنے کوئی حیثیت نہیں ہے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نور مبارک کے سامنے اس کی حیثیت وہ بھی نہیں ہوگی جو عین دوپہر کے وقت سورج کے سامنے چراغ کی بتی کی ہوتی ہے۔ کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ چراغ کی بتی نے سورج کی روشنی کو ماند کر دیا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے عرض کی' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نور مبارک کے سامنے سورج کی وہی حیثیت ہے جو سورج کے سامنے چراغ کی بتی کی ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود سورج ساری دنیا کو روشن کر

دیتا ہے؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا' سورج کے ساری دنیا کو روشن کر دینے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نور مبارک ماند پڑ گیا کیونکہ سورج تو خود اہلِ ایمان کے نور سے روشن ہے اور اہلِ ایمان کا نور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نور سے روشن ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہماری آنکھوں کے سامنے حجابات موجود ہیں جن کی وجہ سے ہم اس نور مبارک کا مشاہدہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے بلکہ ہم تو اولیائے کرام کے انوار کا مشاہدہ کرنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نور مبارک سے ان حجابات کو ہٹا دیا جائے تو سورج کی روشنی اسی طرح ماند پڑ جائے گی جیسے سورج کے سامنے چراغ کی بتی کی روشنی ماند پڑتی ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں' ایک مرتبہ میں نے فجر کی نماز کے بعد سے لے کر چاشت کی نماز تک اس بات کا جائزہ لینے کی پوری کوشش کی کہ کیا میں اس "باب" کو اُٹھانے کی صلاحیت رکھتا ہوں تو مجھے پتہ چلا کہ وہ مجھ سے زیادہ طاقت ور ہے۔

طیِ زمانی

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے سیّدی دباغ سے اس واقعہ کے بارے میں دریافت کیا' جس کے مطابق ایک شخص نے نہانے کے دوران دریا میں غوطہ لگایا اور جب اس نے سر باہر نکالا تو اس کے ساتھی نے کہا' تم نے بہت طویل غوطہ لگایا ہے' مجھے یہ ڈر تھا کہ کہیں ہماری جمعہ کی نماز فوت نہ ہو جائے' غوطہ لگانے والے شخص نے جواب دیا' میں ابھی مصر سے آ رہا ہوں اور وہاں میں اتنے مہینے تک قیام پذیر رہا وہاں میں نے شادی کی اور میرا ایک بیٹا بھی تھا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا' یہ کیسے ممکن ہے؟ کیونکہ دونوں افراد پر ایک ہی گھڑی گزری لیکن ایک کے لیے صرف ایک گھڑی تھی اور دوسرے کے لیے وہی ایک گھڑی کئی مہینے پر مشتمل تھی حالانکہ سورج اُفق میں موجود تھا اور مہینہ بھی وہی تھا۔ جس شخص نے غوطہ لگایا تھا اگر اس پر کئی مہینے گزر گئے تو بقیہ شہر والوں پر وقت کیسے گزرا ہو گا اور اگر آپ اس کی شادی اور بچے کی پیدائش کو درست تسلیم کر لیں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ شخص کئی ماہ تک غائب رہا حالانکہ یہ ایک ناممکن چیز ہے کیونکہ اس نے دریائے دجلہ میں غوطہ لگایا تھا اور مصر میں کئی مہینے بسر کیے تھے' ان دونوں کے درمیان اتنا فاصلہ موجود نہیں ہے کہ دونوں شہروں کے وقت کے درمیان اتنا فاصلہ آ جائے اور اگر بالفرض مصر کے رہنے والوں پر بھی وہی ایک گھڑی گزری تھی تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک گھڑی کے اندر اس کی شادی بھی ہو جائے اور اس کے ہاں بچے کی پیدائش بھی ہو جائے؟ اولیاء کرام کی کرامات کے بارے میں اب تک جو روایات بھی منقول ہیں' یہ ان میں سب سے زیادہ حیرت انگیز ہے کیونکہ جگہ کو لپیٹ دینے کے مقابلے میں وقت کو مختصر کر دینا ناممکن ہے کیونکہ وقت کو لپیٹ دینے کی صورت میں اور بھی ناممکنات سامنے آئیں گے جبکہ فاصلے یا جگہ کو لپیٹ دینے کی صورت میں دیگر ناممکنات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

اس واقعہ کو بہت سے لوگوں نے نقل کیا ہے' بعض حضرات اس واقعہ کی تائید میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ قیامت کا دن پچاس ہزار سال پر مشتمل ہوگا لیکن وہ مومن کے لیے ایک گھڑی یا (زیادہ سے زیادہ) فجر کی دو رکعت کے برابر کے وقت کی مانند ہوگا لیکن یہ دلیل درست نہیں ہے کیونکہ قیامت کا دن مدت کے اعتبار سے اس قدر لمبا نہیں ہوگا بلکہ اتنا لمبا محسوس ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ حافظ ابن حجر نے بھی ''فتح الباری'' میں یہ بات تحریر کی ہے۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے یہ جواب دیا' اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اس کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے' وہ اس بات پر قادر ہے کہ جب وہ شخص دریا میں اُترا تو اسے دریا کے مشاہدے سے محجوب کر دیا گیا حالانکہ وہ اس وقت دریا میں ہی موجود تھا بالکل اسی طرح جیسے بہت سے لوگ فرشتوں کا مشاہدہ نہیں کر سکتے حالانکہ فرشتے ہر وقت ان کے ساتھ موجود رہتے ہیں لہٰذا جب وہ شخص دریا کے مشاہدے سے محجوب ہو گیا تو اسے اس قوم کا مشاہدہ نصیب ہو گیا جہاں وہ رہا ہے خواہ وہ مصر ہو یا کوئی اور جگہ ہو پھر جب اس دوسری جگہ پر اس کی مخصوص مدت پوری ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے اس دوسرے وقت اور قوم کو اس کے سامنے سے ہٹا دیا۔ شاید اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی کوئی خاص حکمت موجود ہوگی۔

میں نے عرض کی' آپ نے بجا ارشاد فرمایا ہے (اگر میں اس کا انکار کروں) تو لوگ کہیں گے یہ شخص ایک طویل عرصے تک اولیاء کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا ہے لیکن اس کے باوجود اس نے اولیاء کرام کی کرامات کا انکار کر دیا ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں' میرے ساتھ ایک اس سے بھی زیادہ دلچسپ واقعہ پیش آیا' میں نے چاشت کی نماز کے وقت ایک شخص کو دیکھا جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی جب میں ظہر کی نماز کے وقت دوبارہ وہاں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس شخص کا انتقال ہو چکا ہے اور اس کا نوجوان بیٹا اپنے باپ کا جانشین بن چکا ہے۔ چاشت کے وقت اس شخص کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی اور ظہر کے وقت اس کی شادی بھی ہو چکی تھی' بچہ بھی ہو چکا تھا' بچہ جوان بھی ہو چکا تھا اور یہ شخص فوت ہو چکا تھا۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا' وہ شخص انسان تھا یا جن تھا؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا' وہ نہ انسان تھا اور نہ ہی جن تھا' اللہ تعالیٰ کی مخلوق بے شمار ہے۔ (قرآن کہتا ہے)

وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ. (المدثر ۷۴:۳۱)

''تمہارے پروردگار کے لشکروں (مخلوقات) سے صرف وہ (پروردگار) ہی آگاہ ہے۔''

سیّدی دباغ فرماتے ہیں' اپنی والدہ کے انتقال کے بعد میرے ساتھ ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا' میرے والد نے ایک اور عورت سے شادی کر لی' ایک لونڈی بھی رکھ لی' ایک دن اس لونڈی نے مجھے بہت مارا۔ میں نے کہا' میں والد سے کس کی شکایت کروں' اپنی سوتیلی ماں کی؟ یا اس لونڈی کی اس پر وہ لونڈی اور بھی ناراض

ہوگئی اس واقعہ کے ایک سال بعد مجھے ان تمام واقعات کا مشاہدہ نصیب ہوا جو میری زندگی میں پیش آنے تھے جن مشائخ سے میری ملاقات ہونا تھی' جس عورت سے میری شادی ہونا تھی' میرے بیٹے عمر کی ولادت' اس کا عقیقہ' میری بیٹی فاطمہ کی ولادت' فتح کا حصول اور میری زندگی کے تمام تر واقعات مجھے دکھائی دیئے اور یہ سب کچھ مختصر وقت میں نظر آیا۔ میں اس وقت جاگ رہا تھا اس لیے آپ اسے خواب بھی قرار نہیں دے سکتے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) یہ مشاہدہ روح کو حاصل ہوا تھا۔

ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا' جب بچہ ماں کے پیٹ سے باہر آتا ہے تو کوئی بھی کامل ولی اسے صرف ایک نظر دیکھ کر یہ جان جاتا ہے کہ اس کی ساری زندگی میں کیا' کیا واقعات پیش آئیں گے۔ خواہ وہ اچھے ہوں یا بُرے ہوں حتیٰ کہ اگر وہ اپنے اس مشاہدے کو تحریری شکل میں محفوظ کر لے اور پھر اس بچے کی ساری زندگی کے ساتھ اس تحریر کا تقابلی جائزہ لیتا رہے تو دونوں کے درمیان کوئی فرق سامنے نہیں آئے گا۔

ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا' ایک مرتبہ ایک بزرگ کسی ویران مقام سے گزرے اور ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی۔ کاش! یہاں کوئی شہر ہوتا جس میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جاتی' اللہ تعالیٰ نے اسی وقت فرشتوں کو حکم دیا اور وہ انسانی شکل میں زمین پر اُتر آئے۔ اللہ تعالیٰ نے شہر کو قائم ہونے کا حکم دیا اور وہ قائم ہوگیا۔ (کچھ دیر بعد) اس بزرگ کا دوبارہ وہاں سے گزر ہوا تو اس نے دیکھا کہ یہاں ایک شہر آباد ہے جہاں ہر طرف اللہ تعالیٰ کی عبادت ہو رہی ہے' یہ دیکھ کر اس نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کی جب تک وہ بزرگ زندہ رہا اس وقت تک وہ شہر وہاں موجود رہا اور وہاں کے رہنے والے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہے جب اس بزرگ کا انتقال ہوگیا تو ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹ گئی' فرشتے اپنے مخصوص ٹھکانوں پر واپس چلے گئے اور شہر معدوم ہوگیا یہاں تک کہ اگر اس بزرگ کی وفات کے فوراً بعد کوئی شخص وہاں سے گزرتا تو اسے کبھی بھی یہ یقین نہیں آتا کہ یہاں کوئی آبادی بھی موجود تھی۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) کسی صاحب نے سیّدی دباغ کو بتایا تھا کہ یہ واقعہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے ساتھ پیش آیا تھا۔ ایک مرتبہ سیّدی دباغ ارشاد فرماتے ہیں' شیخ اکبر ابن عربی فرماتے ہیں' کہ میں نے جنت کو فلاں مقام پر دیکھا ہے یعنی جنت کے مخصوص مقام کے علاوہ کسی اور جگہ پر دیکھا ہے۔ سیّدی دباغ نے اس قول کی توجیہہ پیش کرتے ہوئے بیان فرمایا' جب عارف کو کسی مخصوص مقام پر مشاہدہ نصیب ہوتا ہے تو وہ مخصوص مقام اور وقت اس کے لیے سب سے زیادہ افضل اور بہتر ہوتے ہیں لہٰذا اللہ تعالیٰ جنت کو بھی اس مخصوص مقام کے سامنے کر دیتا ہے تاکہ اس کا مشاہدہ برقرار رہے۔ جس کے نتیجے میں اس عارف کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید جنت اپنے مخصوص مقام سے ہٹ کر کسی اور مقام پر آگئی ہے بلکہ وہ جنت نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ اس عارف کے لیے ایک مخصوص مخلوق کو پیدا کیا ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) سیّدی دباغ کی اس توجیہہ کو سُن کر حاضرین بہت مسرور ہوئے پھر سیّدی دباغ نے اس بات کو ایک مثال کے ذریعے واضح کیا' میرے اور آپ کے درمیان

(سیّدی دباغ نے) جواب دیا:

پہلی تکبیر کہتے وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (اور ان کے روحانی ورثاء) پہلی زمین اور پہلے آسمان میں جو کچھ بھی موجود ہے ان سب کا مشاہدہ کرتے ہیں اس کے ساتھ اس کائنات کے خالق کا بھی مشاہدہ کرتے ہیں۔

دوسری تکبیر کہتے وقت دوسرے آسمان اور تیسری زمین اور ان میں موجود جملہ مخلوقات اور ان سب میں موجود اللہ تعالیٰ کے افعال کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

تیسری تکبیر کہتے وقت تیسرے آسمان اور تیسری زمین اور ان میں موجود جملہ مخلوقات اور ان میں موجود اللہ تعالیٰ کے افعال کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

چوتھی تکبیر کہتے وقت چوتھی زمین اور چوتھے آسمان' ان میں موجود جملہ مخلوقات اور ان سب میں موجود اللہ تعالیٰ کے افعال مشاہدہ کرتے ہیں۔

پانچویں تکبیر کہتے وقت پانچویں زمین اور پانچویں آسمان ان میں موجود جملہ مخلوقات اور ان سب میں موجود اللہ تعالیٰ کے افعال کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

چھٹی تکبیر کہتے وقت چھٹی زمین اور چھٹا آسمان اور ان میں موجود جملہ مخلوقات اور ان سب میں موجود اللہ تعالیٰ کے افعال کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

ساتویں تکبیر کہتے وقت ساتویں زمین اور ساتواں آسمان اور ان میں موجود جملہ مخلوقات اور ان سب میں موجود اللہ تعالیٰ کے جملہ افعال کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

پھر دوسری رکعت میں پہلی تکبیر کہتے وقت پہلے دن جو اتوار کا دن تھا اس دن جتنی بھی مخلوقات پیدا ہوئی' ان سب کا اور ان میں موجود اللہ تعالیٰ کے افعال کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

دوسری تکبیر کہتے وقت دوسرے دن جو سوموار تھا' میں پیدا ہونے والی جملہ مخلوقات اور ان میں موجود اللہ تعالیٰ کے افعال کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

تیسری تکبیر کہتے وقت تیسرے دن جو منگل تھا' میں پیدا ہونے والی جملہ مخلوقات اور ان میں موجود اللہ تعالیٰ کے افعال کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

چوتھی تکبیر کہتے وقت چوتھے دن میں جو بدھ کا دن تھا' میں پیدا ہونے والی جملہ مخلوقات اور ان میں موجود اللہ تعالیٰ کے افعال کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

پانچویں تکبیر کہتے وقت پانچویں دن میں جو جمعرات کا دن تھا' میں پیدا ہونے والی جملہ مخلوقات اور ان میں موجود اللہ تعالیٰ کی افعال کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

چھٹی تکبیر کہتے وقت چھٹے دن میں جو جمعہ کا دن تھا' میں پیدا ہونے والی جملہ مخلوقات اور ان میں موجود اللہ تعالیٰ کے افعال کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا' ان چھ ایام میں وہی مخلوق پیدا ہوئی ہے جو ساتوں زمینوں اور ساتوں آسمانوں میں موجود ہے (پھر دونوں رکعات کے مشاہدے میں بنیادی فرق کیا ہوگا؟)

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا' جب دوسری رکعت میں ایام کی نسبت سے مشاہدہ کیا جاتا ہے تو اس وقت ابتدائے تخلیق کے وقت' ان مخلوقات کی جو کیفیت تھی اس کا مشاہدہ ہوتا ہے اور پہلی رکعت میں مختلف زمینوں اور آسمانوں کے حوالے سے جو مشاہدہ نصیب ہوتا ہے اس میں یہ دِکھائی دیتا ہے کہ اس وقت کون سی مخلوق' کس مقام پر' کس حالت میں موجود ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا' عید کی نماز میں تیرہ (۱۳) تکبیریں کہنا ہر مکلّف پر لازم ہے لیکن ہر مکلّف کو یہ مشاہدہ نصیب نہیں ہوتا (تو پھر انہیں ان تکبیرات کا پابند کیوں کیا گیا ہے؟)

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا' جس شخص کو فتح نصیب ہو چکی ہو اس پر تو یہ اعتراض وارد نہیں ہوگا باقی رہا وہ شخص جسے فتح نصیب نہیں ہوئی ہے تو اسے چاہیے کہ ہر تکبیر کہتے وقت وہ یہ تصور کرے۔ گویا وہ ان سب چیزوں کا اجمالی طور پر مشاہدہ کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ بڑا کریم اور مہربان ہے اگر انسان چند برسوں تک' ہر سال عید کی نماز میں یہ تصور کرتا رہے تو اللہ تعالیٰ اسے کبھی نامراد نہیں لوٹائے گا اور اس کے جسم سے روح نکلنے سے پہلے اسے ان امور کا تفصیلی مشاہدہ ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ بہرحال ہر شے پر قادر ہے۔ یہ لاتعلقی بندے کی طرف سے ہوتی ہے' اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوتی۔ خود قرآن کہتا ہے:

وَالَّذِیۡنَ جَاهَدُوۡا فِیۡنَا لَنَهۡدِیَنَّهُمۡ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ۔ (العنکبوت' ۶۹:۲۹)

''اور جو شخص ہمارے راستے میں کوشش کرتا ہے ہم اس کے لیے اپنے راستے آسان کر دیتے ہیں اور بے شک اللہ تعالیٰ بھلائی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا' عید قربان کے دن ظہر کے بعد سے لے کر پندرہ فرض نمازوں کے بعد جو تین مرتبہ تکبیر کہی جاتی ہے اس کا ''سر'' کیا ہے؟

سیّدی دباغ نے جواب دیا' پہلی تکبیر کے نتیجے میں انسان کو اپنے وجود کا نطفے' جمے ہوئے خون اور گوشت کے لوتھڑے کی شکل میں مشاہدہ ہوتا ہے۔ دوسری تکبیر کہتے وقت اس کی انسانی صورت کی تکمیل اس میں روح کا پھونکا جانا اور ایک مکمل انسان بن جانا دِکھایا جاتا ہے۔ (قرآن کہتا ہے)

فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخَالِقِیۡنَ۔ (المؤمنون' ۱۴:۲۳)

''پس اللہ کی ذات عظیم ہے جو سب سے ''خوب صورت تخلیق'' کرنے والا ہے۔''

تیسری تکبیر کہتے وقت انسان کو (اس کی) موت' قبر اور فنا کا مشاہدہ کروایا جاتا ہے۔

ان تینوں امور کے اندر اللہ تعالیٰ کی قدرت کی بہت سی زبردست نشانیاں موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیاء نے فقہاء کی طرح ان تکبیرات کو مخصوص ایام تک محدود نہیں رکھا بلکہ صوفیاء کے نزدیک ہر نماز کے بعد سلام

پھیرنے سے پہلے یہ تکبیرات کہی جائیں گی۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، جس شخص کو فتح نصیب ہو چکی ہو وہ ان تمام امور کو واضح طور پر اپنی آنکھوں کے ذریعے دیکھتا ہے اس وقت اسے اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت کی ایسی حیرت انگیز نشانیاں دکھائی دیتی ہیں جنہیں بیان نہیں کیا جا سکتا لہٰذا اگر کسی صاحبِ فتح بزرگ کو ایسی صورتِ حال درپیش ہو جس سے یوں محسوس ہو کہ گویا اس کی فتح ختم ہونے والی ہے یا اس میں کوئی کمی آ سکتی ہے تو اس وقت وہ اللہ تعالیٰ کی توحید کی ان نشانیوں کی طرف توجہ کرتا ہے جس کے نتیجے میں اس کی پریشان کن صورتِ حال زائل ہو جاتی ہے اور وہ روحانی کیفیت نصیب ہوتی ہے جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں، روئے زمین پر اس قدر عجائبات موجود ہیں کہ اگر دلائل و براہین کے طلب گار ان عجائبات کا مشاہدہ کر لیں تو انہیں ان عجائبات کی کوئی دلیل نہیں مل سکے گی۔ ان میں سے بعض ایسے عجائبات بھی ہیں کہ اگر کوئی بندہ ان کا مشاہدہ کرے تو صرف یہی مشاہدہ اللہ کی وحدانیت کا اقرار کرنے کے لیے کافی ہوگا اور اسے مزید کسی دلیل کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔ ان میں سے بعض عجائبات ایسے ہیں کہ اگر انسان ان کا مشاہدہ کر لے تو اسے جنت کی موجودگی کا علم ہو جائے گا اور جنت کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے مزید کسی دلیل کی ضرورت پیش نہیں آئے گی اور ان میں سے بعض عجائبات ایسے ہیں کہ اگر انسان ان کا مشاہدہ کرے تو جہنم کے وجود کا قائل ہو جائے گا اور جہنم کے وجود کو تسلیم کرنے کے لیے اسے مزید کسی دلیل کی ضرورت پیش نہیں آئے گی غرضیکہ اور بھی بہت سے عجائبات موجود ہیں۔

بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کا مفہوم

ایک مرتبہ کسی نے سیّدی بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کا مفہوم دریافت کیا:

خضنا بحورا وقفت الانبیاء بسواحلها۔

''ہم ایسے سمندروں میں ڈوب رہے ہیں انبیاء جن کے (دوسرے) کناروں (تک پہنچ کر) کھڑے ہوئے ہیں۔''

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا، نبوت کا مقام بہت بلند ہے اور نبی جس مرتبے پر فائز ہوتا ہے وہاں تک کوئی بھی غیر نبی نہیں پہنچ سکتا۔ بایزید بسطامی اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء کے پیشوا ہیں اور اللہ کی ساری مخلوق میں سب سے بہتر ہیں۔ بعض اوقات جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا خاص لباس (برکت عطا کرنے کے لیے) اپنی اُمت کے کسی کامل ولی کو عنایت کرتے ہیں تو اس وقت اس کی وہی کیفیت ہو جاتی ہے جو شیخ بایزید بسطامی نے بیان کی ہے لہٰذا اس وقت یہ قول بایزید بسطامی کا نہیں بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول شمار ہوگا۔

''میں (معرفت کے) ان سمندروں میں غوطہ زن ہوں، دیگر انبیاء جن کے ساحلوں پہ ہی کھڑے ہیں۔''

سیّدی دباغ فرماتے ہیں' بعض اولیاء اس غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ صاحب فتح ولی بعض اوقات معرفت میں نبی کا ہم پلہ ہو جاتا ہے اگر چہ مرتبے کے اعتبار سے اس کا مرتبہ نبی سے کم ہوتا ہے لیکن ان کا یہ گمان بالکل غلط ہے اور حقیقت کے منافی ہے کیونکہ کوئی بھی ولی معرفت کے کتنے ہی اونچے مقام پر کیوں نہ فائز ہو جائے' وہ کبھی بھی کسی نبی کے مقام کے برابر پہنچنا تو دُور کی بات اس کے قریب بھی نہیں پہنچ سکتا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کا مفہوم

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے سیّدی دباغ سے اس قول کے بارے میں دریافت کیا جو حجت الاسلام امام ابوحامد الغزالی سے منسوب ہے:

''موجودہ جہان سے زیادہ بہتر جہان پیدا ہونا ممکن نہیں ہے۔''

سیّدی دباغ نے جواب دیا' اللہ تعالیٰ کی قدرت محدود نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کسی بھی چیز سے عاجز نہیں ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) سیّدی دباغ کا یہ جواب یقین اور معرفت کی انتہا ہے۔ میں نے کئی بار یہ استخارہ کیا کہ بھلائی کو واضح کرنے اور اہلِ ایمان کی خیر خواہی کے لیے اس مسئلے پر کچھ تحریر کروں کیونکہ ایک تو اس مسئلے کا تعلق عقیدے کے ساتھ ہے اور دوسرا یہ مسئلہ ضروریاتِ دین کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اس پر بہت زیادہ بحث ہو چکی ہے اور بہت سے حضرات نے اس کے اتنے زیادہ جوابات دیئے ہیں کہ اب یہ ایک پیچیدہ ترین مسئلے کی حیثیت اختیار کر گیا ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ کی مدد اور تائید پر بھروسہ کرتے ہوئے میں اس موضوع پر کچھ تحریر کروں گا۔

سب سے پہلے میں اپنے مؤقف کی تائید میں قرآن کی آیات پیش کروں گا۔

عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ۝ (التحریم ۶۶:۵)

''اگر نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہیں طلاق دے دے تو عین ممکن ہے کہ اس کا ربّ اسے تم سے بہتر بیویاں عطا کر دے جو مسلمان ہوں' مومن ہوں' فرماں بردار ہوں' توبہ کرنے والی ہوں' عبادت گزار ہوں' روزہ رکھنے والی ہوں' مطلقہ بیوہ یا کنواری ہوں۔''

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْۤا اَعْمَالَكُمْ (محمد ۴۷:۳۳)

''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال ضائع نہ کرو۔''

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ (محمد ۴۷:۳۸)

''اور اگر تم نے منہ پھیر لیا تو اللہ تعالیٰ تمہاری جگہ دوسرے لوگوں کو لے آئے گا جو تمہاری طرح نہیں ہوں گے۔''

فَلَا اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ اِنَّا لَقَادِرُوْنَ ○ عَلٰی اَنْ نُّبَدِّلَ خَیْرًا مِّنْهُمْ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِیْنَ ○ (المعارج ۷۰:۴۰)

''اور میں مشرق اور مغرب کے پروردگار کی قسم اُٹھا کر کہتا ہوں کہ میں اس بات پر قادر ہوں کہ ان سے بہتر بندے لے آؤں اور میں ایسا کر سکتا ہوں۔''

وَرَبُّكَ الْغَنِیُّ ذُوالرَّحْمَةِ ؕ اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ وَیَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا یَشَآءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّیَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِیْنَ ○ (الانعام ۶:۱۳۳)

''اور تمہارا پروردگار غنی ہے، رحمت کرنے والا ہے اگر وہ چاہے تو تمہیں رخصت کر دے اور تمہاری جگہ دوسروں کو، جنہیں وہ چاہے، لے آئے جیسا کہ اس نے تمہیں دوسروں کی اولاد میں پیدا کیا ہے (اسی طرح ان دوسروں کو تمہارا جانشین بنا دے۔'')

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰی. (الانعام ۶:۳۵)

''اور اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ان سب کو ہدایت نصیب کرے''۔

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِیْنَ. (الانعام ۶:۱۴۹)

''اے رسول! تم کہہ دو اللہ کے پاس واضح حجت موجود ہے اور وہ چاہے تو تم سب کو ہدایت عطا کر دے''۔

وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِیْ كُلِّ قَرْیَةٍ نَّذِیْرًا. (الفرقان ۲۵:۵۱)

''اور اگر ہم چاہیں تو ہر بستی میں ڈرانے والا (ہادی و پیغمبر) مبعوث کر دیں۔''

اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَیْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰیَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِیْنَ. (الشعراء ۲۶:۴)

''اگر ہم چاہیں تو ان کے اوپر آسمان سے ایک نشانی نازل کر دیں جس کے سامنے ان کی گردنیں جھک جائیں گی۔''

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِیْعًا. (یونس ۱۰:۹۹)

''اور اگر تمہارا ربّ چاہے تو روئے زمین پر موجود سب لوگ ایمان لے آئیں۔''

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ○ اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ وَیَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِیْدٍ ○ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِیْزٍ ○ (فاطر ۳۵:۱۵-۱۷)

''اے لوگو! تم اللہ کی بارگاہ میں فقیر کی حیثیت رکھتے ہو اور اللہ غنی اور قابلِ تعریف ہے اگر وہ چاہے تو تمہیں رخصت کر دے اور تمہاری جگہ نئی مخلوق پیدا کر دے یہ بات اللہ کے لیے مشکل نہیں ہے۔''

وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَیْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا. (السجدہ ۳۲:۱۳)

''اگر ہم چاہیں تو ہر ایک کو ہدایت عطا کر دیں۔''

يَخۡلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ.(النور۲۴:۴۵)

''اللہ تعالیٰ جسے چاہے پیدا کر دیتا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر شئے پر قادر ہے۔''

وَيَخۡلُقُ مَالَا تَعۡلَمُوۡنَ.(النحل۱۶:۸)

''اللہ تعالیٰ نے اس مخلوق کو بھی پیدا کیا ہے جس سے تم لاعلم ہو۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان، مستند احادیث میں موجود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مرضِ وصال کے دوران صحابہ کرام (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کو حکم دیا تھا۔

ائتونی بکتاب اکتب لکم کتابا لاتضلوا بعدہ۔(صحیح بخاری،۱:۵۴، رقم:۱۱۴)

''کاغذ لاؤ میں تمہیں ایک تحریر لکھ دیتا ہوں۔ اس کے بعد تم گمراہ نہیں ہو گے۔''

تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی، ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے جبکہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں، افسوس کی بات تو یہ ہے کہ بعض حضرات نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تحریر بھی نہیں لکھنے دی۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک اور مستند روایت میں یہ بات موجود ہے کہ ایک رات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، صحابہ کرام (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کو شبِ قدر سے آگاہ کرنے کے لیے تشریف لائے تو آگے دو حضرات آپس میں جھگڑ رہے تھے اور ان کے جھگڑے کی وجہ سے شبِ قدر کا علم اٹھالیا گیا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) یہ دونوں روایات صحیح بخاری میں موجود ہیں۔

امام جلال الدین سیوطی اپنی تصنیف ''الباھر فی حکم النبی بالباطن والظاھر'' میں درج ذیل روایات نقل کرتے ہیں۔

امام ابن ابی شیبہ اور شیخ ابو یعلیٰ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

''کان فینا شاب ذوعبادۃ وزھد واجتھاد فسمیناہ لرسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فلم یعرفہ ووصفناہ بصفتہ فلم یعرفہ، فبینما نحن کذلك اذا قبل، فقلنا یارسول اللّٰہ ھوھذا، فقال انی لاری علی وجھہ سفعۃ من الشیطان، فجاء فسلم، فقال لہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم : اجعلت فی نفسك ان لیس فی القوم خیر منك؟ فقال اللھم نعم، ثم ولی فدخل المسجد، فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم : من یقتل الرجل؟ فقال ابوبکر انا، فدخل فاذاھواتانم یصلی، فقال ابوبکر کیف اقتل رجلا وھویصلی وقدنھانا النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن قتل المصلین، فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم : من یقتل الرجل؟ فقال عمر : انا یارسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فدخل المسجد فاذاھو ساجد، فقال مثل

ماقال ابوبکر، وزاد: لارجعن فقد رجع من هو خیر منی، فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم : مه یاعمر؟ فذکرله فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم : من یقتل الرجل؟ فقال علی انا، فقال انت تقتله ان وجدته، فدخل المسجد فوجده قد خرج، فقال اما واللّٰہ لو قتلته لکان اولھم واخرھم، ولما اختلف فی امتی اثنان۔" (القول الظاہر فی حکم النبی بالباطن والظاہر)

''ایک نوجوان بہت عبادت گزار تھا۔ایک مرتبہ اس کی عبادت کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے تذکرہ کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سے واقف نہیں تھے۔اس کا حلیہ ذکر کیا گیا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پھر بھی پتہ نہیں چل سکا۔اسی دوران وہ نوجوان آ گیا ہم نے عرض کی، یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! یہی وہ نوجوان ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا مجھے اس کے چہرے پر شیطانیت کے اثرات دکھائی دے رہے ہیں۔وہ نوجوان قریب آیا اور اس نے سلام کیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے دریافت کیا۔کیا تم یہ نہیں سمجھتے کہ (کثرت عبادت کے باعث) تم سب سے بہتر ہو؟ اس نے اقرار کیا، جی ہاں، پھر وہ شخص اٹھا اور مسجد میں داخل ہو گیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت کیا اسے کون قتل کرے گا؟ حضرت ابوبکر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے عرض کی میں، (حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اٹھے) اور مسجد میں داخل ہوئے تو وہ شخص نماز پڑھ رہا تھا۔حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سوچا یہ شخص نماز پڑھ رہا ہے میں اس حالت میں اسے کیسے قتل کر سکتا ہوں؟ جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نمازیوں کو قتل کرنے سے منع کیا ہے۔(یہ سوچ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ واپس آ گئے) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوبارہ دریافت کیا اسے کون قتل کرے گا؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی، میں، (حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اٹھے) اور مسجد میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہ شخص سجدے کی حالت میں ہے۔حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی وہی خیال آیا جو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آیا تھا، پھر انہوں نے یہ بھی سوچا کہ مجھ سے بہتر شخص (یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسے قتل کیے بغیر) واپس جا چکے ہیں۔ تو مجھے بھی واپس چلے جانا چاہیے۔(حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ واپس آ گئے) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت کیا عمر! کیا ہوا؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سارا ماجرا سنایا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوبارہ دریافت کیا اس شخص کو کون قتل کرے گا؟ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی، میں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔اگر وہ تمہیں مل گیا تو تم ضرور اسے قتل کرو گے۔(راوی کہتے ہیں) پھر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسجد میں داخل ہوئے تو وہ شخص نماز پڑھ کر واپس جا چکا

تھا۔ (حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ واپس آ گئے) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ کی قسم! اگر تم اسے قتل کر دیتے تو (گمراہوں میں) یہی شخص پہلا اور آخری ہوتا اور میری امت میں کوئی دو اشخاص بھی آپس میں کوئی اختلاف نہ کرتے۔"

(مترجم عرض پرداز ہے، اس کے بعد سیّدی احمد بن مبارک نے اسی روایت کو چار مختلف حوالوں سے نقل کیا ہے اور ان سب روایات میں مرکزی مضمون یہی ہے۔ صرف راویوں کے بیان اور الفاظ میں اختلاف ہے۔ اس لیے ہم نے دیگر روایات کو نقل نہیں کیا)

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) یہ تمام روایات اور ان کے درمیان الفاظ کے درمیان اختلاف امام سیوطی نے نقل کیا ہے۔ ان تمام آیات اور روایات کو پڑھنے کے بعد حقیقت آپ کے سامنے واضح ہو جائے گی۔ میں نے خود بہت سے عام لوگوں سے یہ مسئلہ دریافت کیا کیونکہ ان کے قلوب شکوک وشبہات سے خالی ہوتے ہیں اور شکوک وشبہات ہی حق کو قبول کرنے میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ میں نے بہت سے لوگوں سے یہ دریافت کیا کہ کیا ہمارا پروردگار موجودہ جہان جیسا ایک اور جہان پیدا کر سکتا ہے؟ تو ہر ایک نے یہی جواب دیا کہ اس میں سوچنے کی کیا ضرورت ہے۔ یقیناً ہمارا ربّ ہر بات پر قادر ہے اور اس کی قدرت نافذ ہے۔ وہ کسی بھی کام سے عاجز نہیں ہے۔

(احمد بن مباک کہتے ہیں) ایک مرتبہ میں نے ایک عام شخص سے یہ دریافت کیا کیا ہمارا پروردگار موجودہ جہان سے بہتر جہان پیدا کر سکتا ہے؟ تو اس نے جواب دیا تم نے قرآن کی یہ آیت نہیں پڑھی۔

اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ وَیَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِیْدٍ (فاطر ۳۵:۱۶)

"اگر اللہ چاہے تو تمہیں ختم کر کے تمہاری جگہ نئی مخلوق لے آئے۔"

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان مطلق ہے لفظ "جدید" میں کوئی قید نہیں ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نئی مخلوق ہمارے مانند بھی ہو سکتی ہے اور ہم سے بہتر یا کمتر بھی ہو سکتی ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس کا یہ جواب سن کر میں بہت حیران ہوا۔ بلاشبہ وہ ایک ذہین ترین آدمی تھا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک مرتبہ میں نے ایک فقیہ سے امام غزالی کے اس متنازعہ قول کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا اس موضوع پر امام شعرانی اور دیگر حضرات تفصیل سے کلام کر چکے ہیں۔ میں نے کہا میں آپ کی رائے دریافت کر رہا ہوں۔ اس نے کہا میری کیا رائے ہو سکتی ہے؟ میں نے کہا خدا کے بندے! یہ عقیدے کا مسئلہ ہے۔ اگر کوئی شخص تمہارے سامنے یہ سوال پیش کر دے کیا اللہ تعالیٰ موجودہ جہان سے بہتر جہان پیدا کر سکتا ہے؟ تو تم کیا جواب دو گے؟ اس نے جواب دیا میں اسے یہ جواب دوں گا، اللہ تعالیٰ کی قدرت کی کوئی انتہا نہیں ہے وہ موجودہ جہان سے ہزار گنا بہتر جہان بھی پیدا کر سکتا ہے بلکہ اس سے بھی کئی ہزار گنا زیادہ جس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اسی طرح میں نے دیگر بہت سے فقہا سے جب امام غزالی کی متنازعہ عبارت کے بارے میں سوال کیا تو امام غزالی کی عظمتِ شان کے پیشِ نظر انہوں نے خاموشی اختیار کی لیکن جب میں نے الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ یہی سوال کرتا تو وہ یہی جواب دیتے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت عام ہے اور اس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

فصل

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں یہ سمجھتا ہوں کہ مجھے پہلے اس مسئلے کے بارے میں امام غزالی کا بیان نقل کر دینا چاہیے پھر اس کے بعد اس موضوع پر دوسرے لوگوں کی آراء نقل کرنی چاہیے تاکہ قارئین اس کے تمام پہلوؤں سے بخوبی آگاہ ہو جائیں۔ امام غزالی ''احیاء العلوم'' میں توکل کے اسباب پر گفتگو کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

''توکل یہ ہے کہ انسان پختہ یقین کے ہمراہ تصدیق کرے جس میں کوئی کمزوری نہ ہو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اپنی تمام تر مخلوق کو، سب سے زیادہ عقل مند انسان کی سی عقل عطا کر دے اور سب سے زیادہ صاحبِ علم شخص کا سا علم عطا کر دے اور انہیں اس قدر علم سے نواز دے جسے برداشت کرنے کی صلاحیت ان میں موجود نہ ہو اور انہیں اس قدر حکمت عطا کرے جس کی کوئی انتہا نہ ہو اور پھر اسی کے برابر انہیں مزید علم، عقل اور حکمت عطا کرے، پھر ان کے سامنے تمام امور کے نتائج ظاہر کر دے انہیں عالم ملکوت کے اسرار سے مطلع کر دے اور اس کے علاوہ اور بہت سے دقیق لطائف کا علم عطا کر دے اور انجام کے بارے میں پوشیدہ نکات ان کے سامنے واضح کر دے جس کی بدولت یہ ساری مخلوق خیر اور شر، نفع و نقصان کے درمیان فرق کر سکے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس مخلوق کو یہ حکم دے کہ اب تم کائنات کا نظام چلاؤ۔ لہٰذا یہ ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ علم و حکمت کی بنیادی تقاضوں کے پیشِ نظر آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کے باوجود دنیا و آخرت کے کسی بھی معاملے میں اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ موجودہ نظام میں، مچھر کے پر کے برابر بھی کمی یا اضافہ نہیں کر سکیں گے۔ کسی بیماری، عیب، نقصان یا دکھ کو ختم نہیں کر سکیں گے اور نہ ہی کسی کی صحت، دولت، کمال یا دیگر انعامات میں کوئی اضافہ کر سکیں گے۔

بلکہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق، زمین یا آسمان (یا ان میں موجود جو کچھ ہے) کا بنظرِ غائر جائزہ لیں تو انہیں پوری کائنات میں کوئی خامی نظر نہیں آسکے گی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں سے جسے جو کچھ عطا کیا ہے خواہ وہ رزق ہو یا زندگی، خوشی، غم، عجز، قدرت، ایمان، کفر، اطاعت یا معصیت یہ سب عدل کے تقاضوں کے عین مطابق نظر آئیں گے اور کہیں بھی کوئی زیادتی محسوس نہ ہوگی اور نہ ہی کسی پر کوئی ظلم ہوگا بلکہ یہ سب بالکل اسی طرح موجود ہیں جیسے انہیں موجود ہونا چاہیے تھا۔ لہٰذا اصولی طور پر ان سے زیادہ بہتر اور زیادہ خوبصورت اور زیادہ کامل اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ اگر ایسا ممکن ہوتا اور اس کے باوجود اللہ تعالیٰ اس سے بہتر جہان پیدا نہ کرتا تو یقیناً (قدرت کے معاملے میں) یہ بخل ہوتا جو سخاوت کی منافی ہے اور ظلم ہوتا جو عدل کے منافی ہے لیکن اگر ہم یہ

کہیں کہ اللہ تعالیٰ (موجودہ جہان سے زیادہ بہتر جہان) پیدا ہی نہیں کر سکتا تو اس سے اللہ تعالیٰ کا عجز لازم آئے گا اور جو ذات عاجز ہو وہ معبود کہلانے کی حق دار نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا دنیا میں پیش آنے والی ہر ایک پریشانی اور مشکل، دنیاوی اعتبار سے تو مشکل ہو سکتی ہے لیکن آخرت میں وہی مشکل انسان کے لیے مفید ثابت ہو گی اور آخرت میں پیش آنے والی مشکل کسی دوسرے شخص کے لیے مفید ثابت ہو گی کیونکہ رات کی موجودگی کے بغیر دن کی اہمیت کا احساس نہیں ہوتا، بیماری کے بغیر صحت کی نعمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا اسی طرح اگر جہنم نہ ہوتی تو اہل جنت کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی عظمت کا احساس نہ ہوتا۔ (سامنے کی بات ہے) جانوروں کو انسانوں کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ اگر کوئی انسان کسی جانور کو ذبح کر کے کھا جاتا ہے تو ہم اسے ظلم نہیں کہہ سکتے کیونکہ کامل کو ناقص پر ترجیح دینا عدل کے تقاضوں کے عین مطابق ہے اسی طرح جہنمیوں کو سزا دے کر اہل جنت کی نعمتوں میں اضافہ کیا جاتا ہے کیونکہ ناقص کے وجود کے بغیر کامل کی پہچان ممکن نہیں ہے۔ اگر جانور موجود نہ ہوتے تو انسان کی عظمت کا احساس نہ ہو پاتا۔ اس لیے کہ کمال اور نقص ایک دوسرے کے مقابل آ کر ہی واضح ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا جود و کرم اور حکمت کا بنیادی تقاضا یہی ہے کہ کامل اور ناقص دونوں طرح کی مخلوق کو پیدا کیا جائے۔ چنانچہ اگر ہاتھ میں ناسور پیدا ہو جائے تو بقیہ جسم کو زہر سے محفوظ رکھنے کے لیے ہاتھ کو کاٹ دینا عدل کے تقاضے پورے کرنے کے مترادف ہے کیونکہ یہاں بھی ناقص کو کامل پر فدا کر دیا گیا ہے۔ مخلوق کے درمیان موجود تفاوت کی اصل یہی نکتہ ہے اس لیے یہ عدل کے تقاضوں کے عین مطابق ہے اور اس میں کوئی زیادتی نہیں پائی جاتی۔

یہ ایک مشکل مسئلہ ہے اور بہت سے لوگ اسے نہیں سمجھ سکتے کیونکہ اس میں تقدیر کا بنیادی راز پایا جاتا ہے۔ جس سے واقف ہو کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔ اس سے واقف لوگ اسے دوسروں کے سامنے ظاہر نہیں کرتے۔ مختصر یہ کہ خیر ہو یا شر، ہر بات طے ہو چکی ہے۔ مشیت کے مطابق جو ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ اس پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتا، چھوٹی اور بڑی ہر بات تحریر ہو چکی ہے۔ صرف اس کے ظہور کا انتظار ہوتا ہے۔ کسی کو جو ملنا ہے وہ مل کر رہے گا اور اگر نہیں ملنا وہ کبھی بھی نہیں مل سکے گا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ''احیاء العلوم'' کی اس عبارت کو امام نورالدین سمہودی نے اس موضوع پر اپنی تصنیف میں نقل کی ہے۔ جس کا نام ''ایضاح البیان لمن ارادالحجة من لیس فی الامکان ابدع مما کان'' ہے۔ امام برہان الدین البقاعی نے بھی اس عبارت کو اپنی تصنیف میں نقل کیا ہے۔ جس کا نام ''دلالة البرهان علی ان لیس فی الامکان ابدع مما کان'' ہے۔

امام سمہودی لکھتے ہیں یہی عبارت امام غزالی نے اپنی تصنیف ''جواهر القرآن'' میں تحریر کی ہے اس کے علاوہ اپنی دوسری تصنیف ''الاجوبة المسكتة'' میں بھی اسی نوعیت کی عبارت نقل کی ہے۔ مؤخر الذکر کتاب ان اعتراضات کے جوابات پر مشتمل ہے جو مصنف کی زندگی میں ان کے سامنے پیش کیے گئے ہیں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اسی طرح کی ایک عبارت امام غزالی نے اپنی کتاب ''مقاصد الفلاسفه''

میں تحریر کی ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) امام غزالی سے منسوب اس مسئلے میں علماء کے درمیان اختلافِ رائے پایا جاتا ہے اور اس بارے میں علماء کے تین گروہ ہیں۔ بعض حضرات نے اس مسئلے کو غلط قرار دیتے ہوئے اس کی تردید کی ہے۔ بعض نے امام غزالی کے اس بیان کی تاویل کی ہے جبکہ بعض دیگر حضرات کی تحقیق کے مطابق اس مسئلے کو امام غزالی سے منسوب کرنا درست نہیں ہے کیونکہ وہ اس بات کے قائل ہی نہیں ہیں۔ (بلکہ ان کی کتابوں میں تحریف کر کے اس طرح کی باتیں شامل کی گئی ہیں)

پہلا گروہ ان حضرات پر مشتمل ہے جس نے اس مسئلے میں امام غزالی کے نکتۂ نظر کی تردید کی ہے اور یہ کام امام غزالی کے زمانے سے شروع ہو کر اب تک جاری ہے۔ امام ابوعبداللہ القرطبی اپنی تصنیف ''شرح اسماءِ حسنیٰ'' میں امام ابوبکر بن العربی کا یہ قول نقل کرتے ہیں۔

> ''ہمارے شیخ ابوحامد الغزالی نے ایک ایسی بات کہہ دی ہے جس پر علماءِ عراق نے شدت کے ساتھ تنقید کی ہے اور اللہ تعالیٰ گواہ ہے کہ اس پر تنقید ہونی بھی چاہیے۔'' غزالی نے کہا ہے کہ ''یہ بات اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شامل نہیں ہے کہ حکمت اور مضبوطی کے اعتبار سے اس موجودہ جہان سے زیادہ اچھا جہان پیدا کر سکے اگر یہ ممکن ہوتا اور اللہ تعالیٰ ایسا نہ کرتا تو یہ جود کے منافی ہوتا۔'' (اس کے بعد) غزالی کے اس قول پر تنقید کرتے ہوئے ابن العربی لکھتے ہیں ''اگرچہ میری حیثیت غزالی کے سامنے بالکل اسی طرح ہے جیسے سمندر کے سامنے ایک قطرہ ہو لیکن اس کے باوجود میں خود غزالی ہی کے اقوال کے ذریعے ان کے اس قول کی تردید کروں گا۔ (اللہ کی ذات) پاک ہے جس نے ہمارے شیخ (الغزالی) کو سب لوگوں پر (علم و فضل کی کثرت کے ذریعے) فضیلت عطا کی اور پھر انہیں اس واضح راستے سے بے بہرہ کر دیا۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) امام ابوالعباس ناصر الدین الاسکندری المالکی نے بھی امام غزالی کے اس مؤقف کی تردید میں ایک رسالہ تحریر کیا ہے جس کا نام ''**الضیاء المتلا لالی فی تعقب الاحیاء للغزالی**'' ہے۔ اس میں اسکندری تحریر کرتے ہیں ''میرے خیال کے مطابق اس مسئلے میں امام غزالی نے فلاسفہ اور معتزلہ کی پیروی کی ہے''۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) الاسکندری کے اسی رسالے کی تردید اور امام غزالی کے مؤقف کی تائید میں امام نور الدین سمہودی نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ آئندہ صفحات میں ہم اس کا مزید تذکرہ کریں گے۔

امام کمال الدین بن ابی شریف اپنی کتاب ''شرح المسایرہ'' میں تحریر کرتے ہیں ''اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ موجودہ جہان سے زیادہ بہتر جہان پیدا کر سکے۔'' اس کے بعد لکھتے ہیں ''احیاء العلوم'' کے باب ''توکل''

میں اس کے برعکس تحریر ہے شاید فلاسفہ کی پیروی میں مصنف نے یہ بات تحریر کردی ہے۔ حجتہ الاسلام (امام غزالی) کے معاصرین آئمہ نے ان کی تردید کی ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) امام شمس الدین ذھبی نے اپنی تصنیف ''تاریخ الاسلام'' میں امام غزالی کے معاصرین کی اس تردید کا ذکر کیا ہے۔

امام بدرالدین زرکشی، امام غزالی کے اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔ ''اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس طرح کی فضولیات تحریر کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ تاہم ممکن ہے کہ شاید غزالی اس بات کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی عظمت کے کسی پوشیدہ پہلو کو اجاگر کرنا چاہتے ہوں۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اللہ تعالیٰ کی ذات کو تمام اختیارات حاصل ہیں۔ نیز اس کی ذات ظلم، بخل اور عجز سے پاک ہے۔ لہٰذا امام غزالی کا مذکورہ بالا قول اللہ تعالیٰ کی قدرت کے منافی ہے۔ خود امام غزالی نے اپنی تصنیف ''الاقتصاد'' میں یہی بات تحریر کی ہے کہ ظلم، بخل وغیرہ جیسی منفی صفات اللہ تعالیٰ کی ذات میں نہیں پائی جاسکتی ہیں۔ لہٰذا اگر امکان کے باوجود بھی اللہ تعالیٰ نے موجودہ جہان سے بہتر جہان پیدا نہیں کیا تو یہ اس کی مرضی ہے اور اسے اس بات کا اختیار بھی حاصل ہے۔ آپ اسے بخل یا عاجزی کا نام نہیں دے سکتے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ان سے پاک ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اللہ تعالیٰ ابن العربی پر اپنی بے انتہا رحمتیں نازل کرے۔ (انہوں نے کتنی اچھی بات کہی ہے) ''میں غزالی کے سمندر کے سامنے ایک قطرے کی حیثیت بھی نہیں رکھتا لیکن میں انہی کے اقوال کے ذریعے ان کے اس قول کی تردید کروں گا۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اگر آپ غزالی کے اس مؤقف کی تردید میں انہی کے اقوال حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ان کی تصنیف ''الاقتصاد'' یا ''القسطاس المستقیم'' کا مطالعہ کریں بلکہ ''احیاء العلوم'' کے دیگر بہت سے مقامات پر انہوں نے عقیدۂ توحید کے بارے میں مختلف جزئیات بیان کی ہیں۔

علماء کا دوسرا گروہ ان حضرات پر مشتمل ہے جنہوں نے امام غزالی کے اس قول کی صحیح تاویل کی ہے۔ ان میں سے سب سے پہلی شخصیت خود امام غزالی ہیں کیونکہ جب ان کے معاصرین نے ان پر اعتراضات کیے تو امام غزالی نے ان کی تردید میں ''الاجوبتہ المسکتہ'' نامی کتاب تحریر کی اور اس میں اپنی وہ عبارت پہلے نقل کی جس پر اعتراض کیا جاتا تھا پھر اس پر مختلف اعتراضات وارد کر کے ان کے جوابات تحریر کیے ہیں۔ غزالی لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے اس جہان کی تخلیق کو اپنے اختیار کے مطابق مؤخر کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ جو چاہے کرے پھر جب اپنے اختیار کے مطابق اس نے اس جہان کو پیدا کردیا تو اب یہ ناممکن ہے کہ وہ جہان کو اسی انتہا کے مطابق پیدا نہ کرے جو حکمت کا بنیادی تقاضہ ہے۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) امام غزالی کا یہ جواب تسلی بخش نہیں ہے کیونکہ جس طرح کسی بھی فعل کی انجام دہی سے پہلے اللہ تعالیٰ کو اس کے کرنے یا نہ کرنے کا اختیار ہے بالکل اسی طرح فعل کی انجام دہی کے دوران اس میں کمی وبیشی کرنے کا بھی اختیار ہوگا اور اس فعل کی انجام دہی کے بعد بھی اللہ تعالیٰ کچھ بھی کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔لہٰذا جس اختیار کے تحت اللہ تعالیٰ نے اس جہان کی تخلیق کو مؤخر کیا تھا اسی اختیار کے تحت اللہ تعالیٰ اس سے بہتر جہان کی تخلیق کو ترک کرسکتا ہے۔امام غزالی کا یہ کہنا کہ ''یہ بات ناممکن ہے کہ جہان کی تکمیل کے وقت اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ بہتر جہان پیدا نہ کرے۔'' کیونکہ غزالی کے اس قول سے یہ مفہوم اخذ ہوتا ہے کہ شاید کسی فعل کی انجام دہی کے وقت اللہ تعالیٰ کا اختیار ختم ہو جاتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس عیب سے پاک ہے۔
غزالی کا یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ حکمت جس بات کی متقاضی ہو وہ فعل اللہ پر لازم ہوگا کیونکہ غزالی سے یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ اس جہان کی تکمیل کو مؤخر نہ کرنا (حکمت کی رو سے) زیادہ مناسب تھا تو اللہ تعالیٰ نے اس جہان کو پہلے کیونکر نہیں پیدا کیا؟ وہ یقیناً اس کا یہی جواب دیں گے''کہ اللہ تعالیٰ نے اس جہان کی تخلیق کو اس لیے مؤخر کیا کہ اسے مؤخر کرنے کا اختیار حاصل ہے۔''تو ان سے سوال کیا جائے گا کیا جہان کی تخلیق کے وقت اللہ تعالیٰ کو یہ اختیار حاصل نہیں تھا کہ وہ زیادہ بہتر یا کم بہتر جہان میں سے کسی ایک کو تخلیق کے لیے اختیار کرے۔''
اگر وہ یہ کہیں کہ جہان کی تخلیق سے پہلے تو اللہ تعالیٰ کو یہ اختیار حاصل تھا لیکن اس کی تخلیق کے وقت کوئی اختیار نہیں تھا تو یہ بات درست نہ ہوگی کیونکہ اس صورت میں اللہ تعالیٰ کی ذات سے اختیار کی نفی لازم آئے گی حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ازل سے اس اختیار کی مالک ہے۔امام غزالی کے خلاف یہ ایک مضبوط دلیل ہے۔

امام عبدالوہاب شعرانی اپنی تصنیف''الاجوبته المرضیه عن ساداتنا الفقهاء والصوفیه''میں تحریر کرتے ہیں جن حضرات نے امام غزالی کے اس قول پر تنقید کی ہے ان کا بنیادی اعتراض یہ ہے کہ اس قول کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا عجز لازم آتا ہے۔اُن کے جواب میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اپنی کتاب''الفتوحات المکیه''میں تحریر کرتے ہیں۔''تحقیقی نکتۂ نظر سے غزالی کی رائے درست ہے اور اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا کیونکہ وجود دو طرح کا ہے ایک''قدیم''اور دوسرا''حادث''اللہ تعالیٰ کی ذات قدیم ہے اور ساری مخلوق حادث ہے۔لہٰذا اگر اللہ تعالیٰ موجودہ جہان کو اس کی تخلیق کے وقت سے پہلے بھی پیدا کر دیتا تب بھی یہ جہان حادث رہتا اور یہ سوال نہیں کیا جاسکتا کہ کیا اللہ تعالیٰ کسی قدیم کو پیدا کرسکتا ہے؟ (کیونکہ قدیم اسی وجود کو کہا جاسکے گا جسے کسی نے پیدا نہ کیا ہو) اس لیے یہ ایک بے معنی سوال ہوگا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) یہ جواب درست ہے کیونکہ اس کا اصل مسئلے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔یہ جواب اس وقت درست ہوسکتا تھا جب غزالی کا دعویٰ یہ ہوتا کہ موجودہ''قدیم''سے زیادہ بہتر قدیم کا پایا جانا ناممکن ہے اور ان کے مخالفین اس بات سے قائل ہوتے کہ موجودہ''قدیم''سے زیادہ بہتر''قدیم''کا پایا جانا ممکن ہے۔''حادث''کبھی بھی''قدیم''کے مرتبے تک نہیں پہنچ سکتا۔جبکہ امام غزالی کا دعویٰ''حادث''سے متعلق ہے اور وہ

اس بات کے قائل ہیں کہ موجودہ حادث سے زیادہ بہتر دوسرا حادث نہیں پایا جا سکتا جبکہ ان کے مخالفین اس بات کے قائل ہیں کہ موجودہ حادث سے زیادہ بہتر حادث کا پایا جانا ممکن ہے۔ (اگر ہم اسے ناممکن قرار دیں) تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی قدرت کو محدود سمجھتے ہیں اور یہ بات شانِ قدرت کے منافی ہے۔ جس کی بدولت اللہ تعالیٰ کا عجز لازم آتا ہے۔ لہٰذا یہ جواز درست نہیں ہے۔

اس کے بعد امام عبدالوہاب شعرانی نے ایک اور جواب نقل کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں ''شیخ عبدالکریم الجیلی نے اس کا جواب دیا ہے کہ ہر موجود چیز پہلے سے اللہ تعالیٰ کے علم میں موجود ہے۔ لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ کوئی موجود چیز اللہ تعالیٰ کے قدیم علم سے کم یا زیادہ ہو جائے (اور اللہ تعالیٰ نے اپنے علمِ قدیم کے مطابق اس جہان کو پیدا کیا ہے)''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) یہ جواب بھی درست نہیں ہے کیونکہ یہ اصول ہی غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں موجود کوئی بھی چیز کم یا زیادہ نہیں ہو سکتی۔ (اور اگر اس اصول کو درست بھی تسلیم کر لیا جائے) تو بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ موجودہ کائنات سے بہتر جہان کی تخلیق ناممکن ہے۔ یہ جواب اس وقت درست ہو سکتا تھا جب امام غزالی کا دعویٰ یہ ہوتا کہ یہ بات ناممکن ہے کہ کوئی چیز اللہ تعالیٰ کے علمِ قدیم میں سے کم یا زیادہ ہو جائے۔

امام عبدالوہاب شعرانی تیسرا جواب نقل کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں ''شیخ المغربی الشاذلی اور امام جلال الدین سیوطی نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ غزالی کے مذکورہ بالا قول کا مطلب یہ ہے کہ ہماری عقل کے مطابق موجودہ جہان سے بہتر جہان کی تخلیق ناممکن ہے البتہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے حوالے سے ایسا ہونا ممکن ہے کیونکہ جو جہان ہمارے سامنے موجود ہے وہی سب سے زیادہ کامل اور بہتر ہوگا اور اگر یہ ایسا نہ ہو تو پھر ناقص ہوگا اور کسی بھی تخلیق کا نقص اس کے خالق کا نقص شمار ہوتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات نقص سے پاک ہے۔ تمام ادیان کے ماننے والے اس بات پر متفق ہیں کہ کامل خالق کسی کامل چیز کو ہی پیدا کرتا ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنَاهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ وَالْاَرْضَ فَرَشْنَاهَا فَنِعْمَ الْمَاهِدُوْنَ (الذاریات ۵۱: ۴۷)

''اور آسمان کو ہم نے اپنے دست (قدرت) سے پیدا کیا ہے اور ہم نے وسعت دی ہے اور زمین ہم نے بچھائی ہے اور کتنا اچھا بچھایا (پیدا کیا) ہے؟''

(اصول یہ ہے) صرف وہی چیز قابلِ تعریف قرار دی جا سکتی ہے جو سب سے زیادہ کامل ہو۔ اللہ تعالیٰ کسی ناقص چیز کی تعریف کیسے کر سکتا ہے یا کسی کم بہتر چیز کے ذریعے کسی پر کیسے احسان جتا سکتا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اگر کسی نے اس میں تحریف نہیں کی تو یہ جواب بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ اس جواب کے اندر تناقض پایا جاتا ہے۔ جواب کے ابتدائی حصے سے یہ ظاہر ہوتا ہے اگرچہ ہماری عقل کے اعتبار سے موجودہ جہان سے بہتر جہان کی پیدائش ناممکن ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت کے حوالے سے یہ بات ممکن ہے لیکن جواب کا آخری حصہ کچھ اور ثابت کرتا ہے کیونکہ اگر ہم موجودہ جہان سے بہتر جہان کے امکان کو تسلیم کر

پس تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ موجودہ جہان ناقص ہے اور مخلوق کے نقص سے خالق کا نقص لازم آئے گا۔ اس لیے ہم اس جواب کے پہلے حصے کو درست تسلیم کرتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک اس کا آخری حصہ درست نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات نقص سے پاک ہے۔ (اور یہ اصول ہی غلط ہے) کہ مفعول کے نقص سے فاعل کا نقص لازم آتا ہے۔ یہ ایک عام فہم سی بات ہے کیونکہ ہر حادث (اصلِ فطرت کے اعتبار سے) ناقص ہے کیونکہ وہ ہر معاملے میں اپنے خالق کا محتاج ہے۔ لہٰذا اگر مفعول کے باعث فاعل کو بھی ناقص قرار دیا جائے تو موجودہ جہان سے زیادہ جہان کی موجودگی ناممکن قرار دینا پڑے گا کیونکہ حادث ہونے کی وجہ سے وہ بھی نقص سے خالی نہیں ہو گا۔

(ان حضرات کا یہ کہنا کہ تمام ادیان کے ماننے والوں کا اس بات پر اتفاق ہے) یہ دلیل بھی درست نہیں ہے کیونکہ اس طرح کے مسائل کے بارے میں لوگوں کے اتفاق کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ اس مسئلے کا تعلق اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ساتھ ہے۔ جس کے نتیجے میں تمام افعال ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ لہٰذا (لوگوں کا اتفاق بھی ایک فعل ہے اور اسی کے ذریعے) اللہ تعالیٰ کی قدرت پر بحث نہیں کی جاسکتی۔

(اسی بات کا) دوسرا جواب یہ ہے کہ وہ اتفاق جسے حجت قرار دیا جاسکے وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت (کے آئمہ کا بطور خاص اور عوام کا بالعموم) اتفاق ہے۔ اس بارے میں دیگر ادیان کے پیروکاروں کا اتفاق کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور امت محمدیہ کا اس بات پر اتفاق ہے اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق میں ہر قسم کا تصرف کرنے کا اختیار حاصل ہے وہ جو چاہے کرسکتا ہے۔ وہ پاک ہے اور اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اللہ بہتر جانتا ہے کہ میرا مقصد اپنے اکابرین پر اعتراض کرنا نہیں ہے بلکہ نفسِ مسئلہ کے اصل خدوخال کو نمایاں کر کے حق کو ظاہر کرنا ہے۔

امام ابوالبقا البکری الشافعی نے (غزالی پر اعتراض) کا یہ جواب دیا ہے۔ ''موجودہ جہان سے بہتر جہان کی تخلیق ناممکن ہے کیونکہ اگر یہ ممکن ہوتا تو اللہ تعالیٰ کی کتاب میں اس مسئلے کا ضرور ذکر ہوتا۔'' قرآن خود کہتا ہے:

مَافَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ (الانعام ۶:۳۸)

''ہم نے قرآن میں کوئی کمی نہیں رہنے دی۔''

اسی طرح احادیث میں بھی اس بات کا ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ اگر احادیث میں اس کا ذکر موجود ہوتا تو علماءِ کرام اس کو بیان کر دیتے۔ لہٰذا ثابت یہ ہوا کہ امام غزالی کی نقل کردہ صورت میں اللہ تعالیٰ کی قدرت میں کوئی نقص لازم نہیں آتا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس جواب پر بھی بہت سے اشکالات وارد ہوتے ہیں کیونکہ کتاب وسنت میں اس مسئلے کا ذکر موجود ہے (کہ اللہ تعالیٰ ہر بات پر قادر ہے) دوسرا یہ کہ کتاب وسنت سے صرف نقلی امور میں استدلال کیا جاسکتا ہے اور وہ بھی ان نقلی امور میں جن میں عقل کو کوئی دخل نہیں ہوتا لیکن جو مسائل صرف عقل کے

ساتھ تعلق رکھتے ہوں ان میں کسی نقلی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جیسے واجب الوجود، ممکن الوجود، ممتنع الوجود وغیرہ کی تقسیم خالصتاً عقلی مسئلہ ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہمارے مسئلے کا تعلق ایک ممکن الوجود کے امکان یا عدمِ امکان کے ساتھ ہے اس لیے اس مسئلے میں کسی نقلی دلیل کی ضرورت نہیں ہوگی۔ تیسرا اشکال یہ ہے کہ بہت سے بدیہی اشیاء کا ذکر بھی کتاب وسنت میں موجود نہیں ہے جیسے ''4'' ایک جفت عدد ہے اور یہ ''8'' کا نصف ہے یا ''1'' ''2'' کا نصف ہے۔ لہٰذا آپ کے بیان کردہ قاعدے کے مطابق یہ باتیں کتاب وسنت میں مذکور نہیں ہیں انہیں بھی ناممکن قرار دیا جائے گا۔

(امام غزالی پر ہونے والے اعتراض کا) جواب دیتے ہوئے امام بدرالدین زرکشی تحریر کرتے ہیں۔ غزالی کے قول کا مطلب یہ ہے کہ ہماری عقل کی قوت ادراک کے اعتبار سے موجودہ جہان سے بہتر جہان کی پیدائش ممکن نہیں ہے۔ ان کا ہرگز مقصد یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علمِ غیب کی رو سے ایسا ہونا ناممکن ہے۔

جیسا کہ خود ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَيَخْلُقُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ. (النحل ۸:۱۶)

''اور اللہ تعالیٰ نے ان اشیاء کو بھی پیدا کیا ہے جن کا تمہیں علم بھی نہیں ہے۔''

لہٰذا صوفی اللہ تعالیٰ کی قدرت کی بجائے اپنے فہم وادراک کے مطابق فتویٰ دیتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تو ہر چیز کا احاطہ کر رکھا ہے لیکن انسان کے لیے تمام اشیاء کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے اسے ایک خاص حد تک علم عطا فرما دیتا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) یہ جواب بھی محلِ نظر ہے۔ کیونکہ ہر عقل مند شخص باآسانی یہ نتیجہ اخذ کرسکتا ہے کہ موجودہ جہان سے بہتر جہان کی تخلیق ممکن ہے اور اس کے لیے کسی غیر معمولی غور وفکر کی ضرورت پیش نہیں آتی کیونکہ ہم پہلے یہ وضاحت بیان کر چکے ہیں کہ یہ مسئلہ ان ممکنات سے متعلق ہے۔ جو لازمی و بدیہی حیثیت رکھتے ہیں۔ زرکشی کا یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ صوفی اپنے فہم وادراک کے مطابق فتویٰ دیتا ہے کیونکہ اس فہم و ادراک کی ضرورت اس وقت پیش آئے گی جب کوئی مسئلہ غیر معمولی طور پر الجھن کا باعث ہو اور تمام لوگ اسے سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں لیکن لازمی و بدیہی امور میں صوفی اور غیر صوفی کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوگا۔

میں نے ایک عام شخص سے یہی مسئلہ دریافت کیا تو اس نے مجھے جواب دیا کیا قدرت کسی ممکن چیز کو پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی؟ میں نے جواب دیا۔ رکھتی ہے۔ اس نے دریافت کیا اگر کوئی شخص یہ کہے کہ قدرت بعض ممکنات کو وجود عطا کرسکتی ہے بعض کو نہیں تو کیا اس صورت میں اللہ تعالیٰ کا عاجز ہونا لازم نہیں آئے گا؟ جبکہ عجز ایک عیب ہے۔ میں نے جواب دیا ایسا ہی ہے۔ اس نے دریافت کیا' کیا اللہ تعالیٰ کا عاجز ہونا محال ہے؟ میں نے جواب دیا ہاں۔ اس نے کہا مسئلہ واضح ہوگیا پھر الجھن کس بات کی؟

اسی طرح میں نے ایک اور شخص سے دریافت کیا تو اس نے جواب دیا تم جو بات کہہ رہے ہو اللہ تعالیٰ اس

پر قدرت رکھتا ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کا عجز لازم آئے گا اور اللہ تعالیٰ کا عاجز ہونا ممکن نہیں ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) امام غزالی کی تصنیف ''قواعد العقائد'' کی شرح میں سیّدی احمد زروق ارشاد فرماتے ہیں۔

(غزالی لکھتے ہیں) اللہ کی ذات کے سوا ہر چیز حادث ہے اور اللہ کے فضل کے تحت سب سے زیادہ خوبصورت کامل اور بہتر شکل میں موجود ہے۔

(احمد زروق کہتے ہیں) ہر وہ چیز جو قدرت الٰہی کے نتیجے میں ظاہر ہوئی علم الٰہی میں یقینی طور پر موجود تھی اور اللہ تعالیٰ کا ارادہ اس کے ساتھ متعلق ہوا تو ایسی چیز ناقص نہیں ہوسکتی کیونکہ جن اوصاف کے نتیجے میں وہ پیدا ہوئی ہے وہ ناقص نہیں ہیں کیونکہ اگر اسے ناقص قرار دیا جائے تو اللہ تعالیٰ کے علم، قدرت اور ارادے کو بھی ناقص قرار دینا پڑے گا۔ پھر یہ کہنا بھی پیشِ نظر رہے کہ کسی چیز میں حسن وخوبی یا قباحت کا پایا جانا، عقل، شریعت اور عرف میں مختلف معیارات کے تحت ہوگا۔ لہٰذا امام غزالی نے جو بات یہاں ذکر کی ہے وہ ہمارے اعتبار سے حکمت کے مطابق ہے اور جو قول ان سے منسوب کیا جاتا ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی نسبت کا اعتبار کیا گیا ہے کیونکہ جو کچھ بھی موجود ہے اور قیامت تک موجود ہوگا اس سے بہتر جہان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس کا وجود علمِ الٰہی کا مرہونِ منت ہے اور علمِ الٰہی میں کوئی عیب نہیں ہوسکتا۔ اس کا وجود اللہ تعالیٰ کے ارادے کا تابع ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارادہ عیب سے پاک ہے اور اس جہان کا ظہور اللہ تعالیٰ کی قدرت کے نتیجے میں ہوا ہے اور قدرت بھی ہر قسم کے عیب اور نقص سے پاک ہے۔ لہٰذا یقینی طور پر یہ جہان خوبصورت اور کامل ترین شکل میں ظاہر ہوا ہے اور امام غزالی کے متنازعہ قول کا مطلب بھی یہی ہے۔ اگر آپ اس کے علاوہ کوئی اور معنی مراد لینے کی کوشش کریں گے تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کو ناقص تسلیم کرنا پڑے گا اور یہ تصور باطل ہے۔ کوئی عقل مند تو کجا؟ کوئی احمق بھی یہ بات نہیں کہہ سکتا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) یہ جواب بھی درست نہیں ہے کیونکہ جب آپ ''اثر'' کو ناقص تسلیم کریں گے تو ''مؤثر'' کا ناقص ہونا لازم آئے گا۔ جس کے نتیجے میں یہ بات یقینی طور پر سامنے آئے گی کہ موجودہ جہان سے بہتر جہان کا وجود محال ہے اور موجودہ جہان کا سب سے بہتر جہان ہونا لازم ہے اور اس بات کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے اختیار کی نفی ہو جائے گی۔ لہٰذا صحیح نکتۂ نظر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے سب سے بہتر جہان کی تخلیق کو لازم قرار دینا درست نہیں ہے بلکہ موجود جہان سے زیادہ بہتر یا اس سے بھی کم تر جہان کی تخلیق ممکن ہے اور یہ سب اللہ تعالیٰ کے اختیار میں شامل ہے اور اللہ تعالیٰ کو اس کی قدرت بھی حاصل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی کوئی حد نہیں ہے۔ جہاں تک اللہ تعالیٰ کے لیے کسی چیز کے لازم ہونے کا تعلق ہے تو خواہ اس کا تعلق نفس امر کے ساتھ ہو یا حکمت کے تقاضے کے پیشِ نظر ہو یا ہماری فہم کی بات ہو ان سب نکات پر ہم شیخ زرکشی کے کلام پر گفتگو کرتے ہوئے مختصراً اظہارِ خیال کریں گے۔

امام غزالی کے ایک اور معاصر اور مؤید شیخ برہان الدین بن ابوشریف ہیں جو امام غزالی کے وصال کے بعد ایک طویل عرصہ تک زندہ رہے آپ فرماتے ہیں حجۃ الاسلام امام غزالی نے کوئی بھی چیز اللہ تعالیٰ کے لیے واجب قرار نہیں دی اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی قدرت کو پابند قرار دیا ہے اور نہ ہی موجودہ جہان سے بہتر جہان کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نفی کی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ اس قدر جہانوں کو پیدا کر سکتا ہے جن کی کوئی انتہا نہ ہو لیکن کیونکہ اس جہان کی تخلیق اللہ تعالیٰ کے قدیم علم، ارادے اور قدرت سے متعلق ہے اس لیے اس جہان کو سب سے عمدہ اور بہتر قرار دیا گیا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی عظمت کا اظہار ہو سکے اور جن چیزوں کی تخلیق کو امام غزالی نے ناممکن قرار دیا ہے اس سے مراد وہ اشیاء ہیں جن کا قدرت، علم یا ارادے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس جواب میں دو خامیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے علم اور ارادے کو اس بات کی دلیل قرار دیا گیا ہے جو چیز بھی پیدا ہو گی وہ سب سے بہتر ہے حالانکہ یہ بات دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ علم اور ارادے کی پہلے سے موجودگی صرف اس بات کی دلیل بن سکتی ہے کہ موجودہ جہان اللہ تعالیٰ کے علم اور ارادے کے تحت پیدا ہوا لیکن کیا (ممکنہ طور پر) یہ سب سے بہتر ہے؟ یہ بات ثابت نہ ہوتی۔

اس جواب میں دوسری خامی یہ ہے، یہ بات آپ جان چکے ہیں کہ ''خوبصورت ترین'' کی کوئی انتہا نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ چیز قدرت کے ساتھ متعلق ہے اور جو چیز قدرت کے ساتھ متعلق ہو اس کی کوئی انتہا نہیں ہو سکتی کیونکہ قدرت کی بھی کوئی انتہا نہیں ہے۔ تو جب ''خوبصورت ترین'' کی کوئی انتہا نہیں ہو گی تو اب اللہ تعالیٰ کا ارادہ اس بے انتہا ''خوبصورت ترین'' میں سے کسی ایک فرد کو اختیار کر لیتا ہے تو ''خوبصورت ترین'' کی دیگر ممکنہ صورتوں کا امکان باقی رہ جائے گا جن کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ جبکہ شیخ برہان الدین کے جواب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاید ''خوبصورت ترین'' کسی ایک متعین صورت کا نام ہے۔ بالفرض اگر ہم اسے درست تسلیم کر لیں تو نتیجہ کیا نکلے گا؟ کہ اس ایک متعین صورت کے علاوہ کسی بھی اور صورت کا وجود محال ہو گا اور بات پھر وہیں آ جائے گی لیکن اگر ہم ''خوبصورت ترین'' جہان کو (منطقی اصطلاح کے مطابق) ایک کلی تصور کر لیں تو اس کے افراد کی کوئی انتہا نہیں ہو گی اور کسی اور فرد کی موجودگی سے دوسرے افراد کے امکان کی نفی لازم نہیں آئے گی۔

شیخ ابوالمواہب تیونسی نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہاں امکان سے مراد حکمت الٰہیہ کا امکان ہے قدرت الٰہیہ کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ہم اس بات کو تسلیم ہی نہیں کرتے کہ حکمت الٰہیہ کے تحت موجودہ جہان سے بہتر جہان کی تخلیق ممکن نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی طرح اس کی حکمت کی بھی کوئی انتہا نہیں کیونکہ حکمت کا تعلق علم کے ساتھ ہے اور اللہ تعالیٰ کے علم کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ لہٰذا شیخ تیونسی کا یہ کہنا غلط ہے کہ حکمت الٰہیہ صرف موجود جہان میں منحصر ہو سکتی ہے۔

آئندہ صفحات میں ہم حکمت الٰہیہ کے موضوع پر مزید گفتگو کریں گے اور اس بات کی وضاحت کریں گے

کہ امام غزالی کے نزدیک کس چیز پر حکمت کا اطلاق کیا جا سکتا ہے؟

شیخ الاسلام زکریا انصاری تحریر کرتے ہیں کسی بھی شخص کو امام غزالی پر یہ الزام عائد نہیں کرنا چاہیے کہ (غزالی کے نزدیک) اللہ تعالیٰ موجودہ جہان سے زیادہ بہتر جہان کو پیدا کرنے سے عاجز ہے کیونکہ یہ وہم اس وقت پیدا ہو سکتا ہے جب غزالی کے کلام میں موجود لفظ ''امکان'' کو ''قدرت'' کے مترادف کے طور پر استعمال کیا جائے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ لفظ اپنے مشہور معنی کے مطابق امتناع (ناممکن) کے متضاد کے طور پر استعمال ہوا ہے یعنی امکان کا مطلب ممکن ہونا ہے۔ اب امام غزالی کی اس عبارت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت جن امور سے متعلق ہو چکی ہے (یعنی جو جہان پیدا ہو چکا ہے) اس سے زیادہ بہتر جہان کی پیدائش ممکن نہیں ہے اور یہ بات درست بھی ہے کیونکہ وجود عدم سے بہتر ہوتا ہے (اور موجودہ جہان موجود ہے اور مفروضہ بہتر جہان معدوم ہے لہٰذا موجودہ جہان فرضی جہان سے بہتر ہوگا)

معتزلہ اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر بھی نہیں ہے کہ موجودہ جہان سے بہتر جہان پیدا کر سکے اور یہ بات دیگر تمام اہل سنت کی طرح امام غزالی کے نزدیک بھی باطل ہے کیونکہ معتزلہ کا یہ عقیدہ اس اصول پر مبنی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ''اصلح'' (دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنا) لازم ہے اور معتزلہ کا یہ اصول بھی غلط ہے۔

(انصاری لکھتے ہیں) اگر حجۃ الاسلام کے قول کا یہ مطلب ہو کہ متنازعہ مسئلہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے تحت ناممکن ہے تو حجۃ الاسلام کا مؤقف بھی معتزلہ کی مانند ہو جائے گا۔ لہٰذا ہمیں حجۃ الاسلام کے کلام کے من مانے معنی متعین کرنے کی بجائے اس کی صحیح تاویل کرنی چاہیے اور امام غزالی کی طرف کسی غلطی یا لغزش کو منسوب نہیں کرنا چاہیے کیونکہ غزالی کا قول صحیح عقیدے کا ترجمان ہے۔

شیخ الاسلام کی تاویل پر تبصرہ

احمد بن مبارک کہتے ہیں: امکان کو وجوب اور امتناع کا مدمقابل قرار دے کر حجۃ الاسلام کے دفاع کی جو کوشش کی گئی ہے۔ اس سے صحیح دفاع نہیں ہو سکتا کیونکہ اصل مسئلہ تو پھر بھی اپنی جگہ برقرار رہے گا۔ کیونکہ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ موجودہ جہان سے زیادہ خوبصورت جہان کی تخلیق ممکن نہیں ہے لہٰذا موجودہ جہان سے زیادہ خوبصورت فرضی جہان ممتنع (ناممکن) ہوگا اور یہ بات غلط ہے کیونکہ وہ ''مفروضہ خوبصورت ترین جہان'' ممکن ہے اور جو چیز ممکن ہو اسے ممتنع قرار نہیں دیا جا سکتا۔ نیز جو چیز ممتنع ہو اس کا قدرت سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ لہٰذا اس قول کا مفہوم یہی بنے گا کہ اللہ تعالیٰ ایسے فرضی جہان کی تخلیق پر قادر نہیں ہے۔ کیونکہ جب وہ ''مفروضہ جہان'' ممتنع قرار پائے گا تو اس صورت میں ''امکان'' کو ''قدرت'' یا ''امتناع وایجاب'' کے مقابل قرار دینے کا مفہوم ایک ہی ہوگا۔

لہٰذا شیخ الاسلام زکریا الانصاری کا یہ کہنا' کہ حجتہ الاسلام کی عبارت کا مفہوم یہ ہے' جس خوبصورت ترین جہان کے ساتھ قدرت متعلق ہی نہ ہو اس کا پایا جانا ممکن نہیں ہے کیونکہ ''وجود' بہرطور ''عدم'' سے بہتر ہے۔ شیخ انصاری کی اس عبارت سے مقصود حاصل نہیں ہو پاتا۔ کیونکہ اصل متنازع مسئلہ یہ نہیں ہے کہ عدم' وجود سے زیادہ بہتر ہو سکتا ہے یہاں تک کہ اس کے ذریعے حجتہ الاسلام کی رائے کو درست ثابت کیا جائے۔ بلکہ اصل بحث اس مسئلے کے بارے میں ہے کہ ''مفروضہ خوبصورت ترین جہان'' کی تخلیق ممکن ہے یا نہیں ہے؟ حجتہ الاسلام نے اس بات کی نفی کی ہے اور یہ غلط ہے۔

شیخ الاسلام زکریا انصاری نے معتزلہ کی یہ رائے نقل کی ہے کہ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ موجودہ جہان سے زیادہ خوبصورت جہان کی تخلیق پر قادر ہی نہیں ہے' جبکہ یہی بات حجتہ الاسلام کے کلام سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ جس کی شیخ الانصاری تاویل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کیونکہ جب آپ زیادہ خوبصورت فرضی جہان کو ناممکن قرار دیں گے تو اس سے لازم آئے گا کہ اس کا وجود ممتنع ہے جس کا قطعی مطلب یہی ہے کہ قدرت کا تعلق ممتنع کے ساتھ نہیں ہے اور پھر وہی ممنوع صورت سامنے آ جائے گی۔

لہٰذا امکان کو قدرت پر محمول کیا جائے یا اس کے مشہور معنی کے مطابق اسے امتناع وایجاب کا مدمقابل قرار دیا جائے ہر صورت میں یہ قول غلط ہوگا۔ اس لئے شیخ الاسلام کا غزالی کے اس قول کو حق قرار دینا اور اس پر اعتقاد کو واجب قرار دینا بھی غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ نہ کرے کہ کسی کا یہ عقیدہ بھی ہو' کہ اللہ تعالیٰ اگر موجودہ جہان سے زیادہ خوبصورت جہان کی تخلیق پر قادر ہونے کے باوجود اسے پیدا نہ کرے تو یہ بخل ہوگا۔ یہ عقیدہ معتزلہ کے ''نظریہ اصلح'' کے عین مطابق ہے۔ اہل ایمان کے لئے یہ اعتقاد رکھنا واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ارادے کے مطابق جو چاہے کر سکتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کی مختلف آیات سے ثابت ہے (اور ہم نے سابقہ صفحات میں ان آیات کو ذکر کیا ہے)

امام سیوطی کی تاویل

حافظ جلال الدین سیوطی نے اس مسئلے میں حجتہ الاسلام کی تائید میں ایک کتاب تحریر کی ہے جس کا نام ''تشیید الارکان لمسالتہ لیس فی الامکان ابدع مما کان'' ہے۔ آپ تحریر کرتے ہیں۔

''بعض حضرات اس مسئلے میں خاموشی اختیار کرتے ہیں۔ اور یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ یہ مسئلہ اہل سنت کی بجائے معتزلہ کے نظریے کے مطابق ہے۔ چونکہ یہ عدل کے خلاف ہے جو اہل سنت کا موقف ہے۔ باوجودیکہ ''اصلح'' اہل سنت کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اور معتزلہ کے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ پر واجب ہے کیونکہ ان کے نزدیک حسن اور قبیح عقلی ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اشکال درست ہے اور میں خود بھی خاصے عرصے تک اس بارے میں خاموش رہا ہوں مگر پھر میں نے اللہ کی بارگاہ میں گریہ وزاری کی جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ

نے مجھ پر مہربانی کرتے ہوئے مجھے اس مسئلے کا فہم عطا کیا۔ اور یہ جواب القاء کیا کہ حجۃ الاسلام نے اس قول کے ذریعے فریقین کے مذہب کی تائید میں دلیل دی ہے تاکہ فریقین کے مذہب کے مطابق عدم امکان کا دعویٰ مکمل ہو جائے گویا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ فریقین کا مفروضہ حسین ترین جہان کے محال ہونے پر اتفاق ہے اھل سنت کے نزدیک اس اعتبار سے کہ یہ اس فضل کے منافی ہے جو اللہ تعالیٰ کی شان عطا کے لائق ہے۔ اور معتزلہ کے نزدیک یہ ظلم ہے جو عدل کے منافی ہے لہٰذا انہوں نے ہر فریق کے لیے ایک جملہ استعمال کیا۔ انکی مراد دونوں جملوں سے کسی ایک مذہب کی تائید نہیں ہے''۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اگر حجۃ الاسلام نے یہی معنی مراد لیا ہوتا تو یہ تاویل کی جاسکتی تھی لیکن وہ تو یہ کہتے ہیں کہ مفروضہ جہان کی تخلیق کی قدرت رکھنے کے باوجود اسے پیدا نہ کرنا بخل ہے اور یہ جود کے منافی ہے اھل سنت کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی ذات بخل سے پاک ہے۔ حجۃ الاسلام کے اس جملے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انکی پہلی عبارت اھل سنت کے مذہب کے مطابق نہیں ہے۔

شیخ شرف الدین تلمسانی اپنی تصنیف ''شرح اللمع'' میں بغدادی معتزلہ کا یہ مذہب ذکر کرتے ہیں ''اصلح'' کی رعایت واجب ہے (تلمسانی کہتے ہیں) انہوں نے یہ رائے فلسفیوں سے حاصل کی ہے' اللہ تعالیٰ جواد ہے اور جو جہاں موجود ہے وہ امکان کی انتہائی شکل میں موجود ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو اس سے اللہ تعالیٰ کی شانِ جوادیت پر حرف آئے گا۔

شیخ ابن ھمام ''المسایرۃ'' میں تحریر کرتے ہیں' معتزلہ اس بات کے قائل ہیں کہ ''اصلح'' کو ترک کرنا بخل ہے اور بخل سے اللہ کی ذات کو پاک ماننا ضروری ہے۔ لہٰذا یہ بات بھی ضروری ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی بھی فعل ''اصلح'' کے خلاف نہیں ہوگا۔ اس لیے جب دوسری شق معتزلہ کے اصول سے ماخوذ ہے تو پہلی شق کا بھی یہی حکم ہوگا۔

سید سمہودی کی تاویل

محدث کبیر سیّد سمہودی نے اپنے رسالے میں حجۃ الاسلام کی تائید میں طویل گفتگو کی ہے۔ آپ کی یہ تحقیق باریک خط کے 33 صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں انہوں نے شیخ ناصر الدین بن منیر کی آراء سے اختلاف کیا ہے جسکا ذکر ہم سابقہ سطور میں کر چکے ہیں۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے پوری تحقیق سے سید سمہودی کی اس تحقیق کا مطالعہ کیا ہے۔ اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان سے تین بنیادی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ ایک اصل مطلب سے دور ہٹ جانا' دوسرا حسن اور قبح کے عقلی مفہوم کے وضاحت میں غلطی اور تیسرا بیشتر مقامات پر شیخ ابن منیر کے کلام کا عدم فہم' لہٰذا ہم ان تینوں اعتبارات پر تفصیل سے گفتگو کرتے ہوئے اس کی وضاحت کرینگے تاکہ اگر کوئی شخص سیّد سمھودی کی تصنیف کا مطالعہ کرے تو وہ الجھن کا شکار نہ ہو۔

سید سمہودی کہتے ہیں' یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ حجۃ الاسلام کے کلام میں وجوب سے مراد وہ ذاتی وجوب نہیں ہے جو اختیار کے منافی ہو جیسا کہ گمراہ فلسفی اس بات کے قائل ہیں اور نہ ہی اس سے مراد وہ عقلی وجوب ہے جو فلسفیوں کے پیروکار معتزلہ کا عقیدہ ہے بلکہ حجۃ الاسلام کے نزدیک اس سے مراد وہ متعین ترتیب ہے جس کا حصول ضروری ہے۔ جیسا کہ اسی کی تائید احیاء العلوم میں ان کی اپنی گفتگو سے ہو جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں حسین ترین اور کامل ترین واجب الحصول جہان مشیت' تقدیر اور قضا کے فیصلے کے تحت وجود میں آیا ہے اور حکمت اسی کا تقاضا کرتی ہے۔ لہٰذا اس اعتبار سے اس وجوب کا مطلب اختیاری وجوب ہوگا کیونکہ یہ علم الٰہی اور مشیت الٰہی کا تابع ہے اور اس کا خلاف محال ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور قدرت اور حکمت نے جو چیز طے کر دی ہے وہ یقیناً کامل ترین شکل میں ہوگی۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) حجۃ الاسلام کی مراد متعین ترتیب سے وہ چیز ہے جس کا حصول ضروری ہے اگر اس سے مراد عقل لیا جائے تو یہ معتزلہ کا مذہب ہے جس کی انہوں نے نفی کر دی ہے۔ اور اگر اس سے مراد علم یا مشیت کی سبقت لی جائے تو یہ چیز مسلم ہے لیکن یہ ہمارے موضوع سے متعلق نہیں ہے کیونکہ حجۃ الاسلام نے اس بات پر کوئی دلیل پیش نہیں کی کہ جو چیز علم اور مشیت سے متعلق ہونے کی وجہ سے واجب ہوئی ہے وہ سب سے زیادہ حسین اور سب سے زیادہ کامل ہے جس سے زیادہ حسین اور کامل کے موجود ہونے کا امکان بھی نہیں ہے۔ لہٰذا حسین تر اور کامل ترین جہان کے وجوب کا بدیہی مطلب ''اصلح'' کی رعایت کرنا ہے۔ جو معتزلہ کے نکتۂ نظر کے مطابق ہے اور اگر اس کا علم اور مشیت کی سبقت کے حوالے سے جائزہ لیا جائے تو یہ موضوع بحث سے خارج ہے۔

سید سمھودی کا یہ کہنا کہ علم اور مشیت کا سابق ہونا یہ اس بات کو واجب کر دیتا ہے کہ صرف وہی جہان پیدا ہو جو سب سے زیادہ خوبصورت ہے تو یہ بات نفس موضوع سے متعلق نہیں ہے اور اگر اس سے مراد یہ ہو کہ موجودہ جہان سے زیادہ خوبصورت جہان کی موجودگی کا احتمال موجود ہے مگر وہ موجود نہیں ہے تو یہ بات طے شدہ ہے اور یہ تاویل سیّد سمھودی کو کوئی فائدہ نہیں دے سکے گی۔

پھر ان پر یہ اعتراض بھی کیا جا سکتا ہے کہ کامل ترین جہان کی موجودگی کا وجوب اگر حکمت کا تقاضا ہے یعنی حکمت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اشیاء کو ان کے مخصوص مقامات پر رکھا جائے تو اب یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ آپ حکمت سے کیا معنی مراد لیں گے؟ خود امام غزالیؒ اپنی کتاب ''مقاصد الفلاسفہ'' میں تحریر کرتے ہیں۔

''الاول (یعنی اللہ تعالیٰ) پاک ہے اور حکیم ہے کیونکہ حکمت کا اطلاق دو چیزوں پہ کیا جاتا ہے ایک علم یعنی کسی شے کی ماہیت کا حقیقی تصور کرنا نیز اس کی یقینی طور پر تصدیق کرنا اور دوسرا حکمت سے مراد وہ فعل ہے جو محکم اور مرتب اور تمام ضروری امور کا جامع ہو''۔

حکمتِ الٰہی کی وضاحت

پھر امام غزالی اللہ تعالیٰ کے علم کی وضاحت کرنے کے بعد مزید ارشاد فرماتے ہیں۔

''اللہ تعالیٰ کے افعال' حکمت کی انتہا ہیں کیونکہ اس نے ہر شے کو پیدا کیا اور اسے ہدایت دی اور اسے تمام ضروری نعمتیں عطا کیں اور وہ تمام نعمتیں عطا کیں جو اس کی آرائش وزیبائش اور تکمیل کے لئے ضروری ہیں۔ اگر چہ یہ زیب وزینت بنیادی ضرورت نہیں ہے جیسے ابرو' پلکیں اور داڑھی وغیرہ کے بال اور وہ بے شمار چیزیں جو حیوانات' نباتات بلکہ کائنات کے تمام اجزاء میں موجود ہیں''۔

اب اگر آپ حکمت سے مراد وہ علم لیں جس کا تعلق اشیاء کے ساتھ پہلی صورت کے اعتبار سے ہے تو بلاشبہ عقل اس بات کا تقاضا کرے گی کہ موجودہ جہان سے خوبصورت جہان کے وجود کا وجوب ضروری نہیں ہے کیونکہ علم کا تعلق ہر شے سے ہے اور اگر آپ حکمت کے ذریعے دوسرے معنی مراد لیں تو بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ اس صورت میں حکمت کا تعلق قدرت کے ساتھ ہوگا اور یہاں تک کہ وہ قدرت اس بات کا تقاضا کرے گی کہ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا جہان ہی سب سے زیادہ کامل اور خوبصورت ہو کیونکہ کسی بھی فعل کے محکم اور مضبوط ہونے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ لازمی طور پر یہ صرف سب سے زیادہ خوبصورت جہان ہی کی پیدائش کا باعث بنے گا اور دیگر تمام افراد کے امکان کی نفی کر دی جائے گی۔

مختصر یہ کہ حکمت اس بات کا تقاضا نہیں کرتی جس کا سیّد سمہودی نے تذکرہ کیا ہے کیونکہ یا تو حکمت کا تعلق علم سے ہوگا یا اس کا تعلق قدرت سے ہوگا اور یہ دونوں اس بات کا تقاضا نہیں کرتے کہ سب سے زیادہ خوبصورت جہان کی تخلیق واجب ہے بلکہ ان دونوں کا اقتضاء دو امور میں سے کوئی ایک فاسد امر ہوگا۔ ایک یہ کہ فلسفیوں کی طرح اللہ تعالیٰ کے اختیار کی نفی کر دی جائے یا پھر یہ کہ معتزلہ کی طرح اس کو بخل یا ظلم قرار دیا جائے۔

مزید برآں یہ کہ سب سے زیادہ خوبصورت اور کامل ترین جہان کے افراد کی کوئی انتہا نہیں ہوگی جیسا کہ پہلے بھی اس بات کی وضاحت کی جا چکی ہے لہٰذا جب حکمت اس کے بعد افراد کی موجودگی کا تقاضا کرے گی تو حصر کی موجودگی اور باقی افراد کے وجود کے محال ہونے کی کوئی دلیل نہیں مل سکے گی۔ لہٰذا امام غزالی کے قول کا مفہوم یہ ہوگا کہ سب سے زیادہ خوبصورت اور کامل جہان ایک شخصی جزئی ہے لہٰذا جب حکمت' علم کی سبقت کے باعث اس کے وجود اور دیگر کے محال ہونے کا تقاضا کرے گی تو یہ تقاضا باطل ہوگا کیونکہ اگر سب سے زیادہ کامل ترین جہان کو ایک شخصی جزئی قرار دے دیا جائے تو اس کا بدیہی مطلب یہ ہوگا کہ مقدورات کو محدود کر دیا گیا ہے۔ گویا جب ہم یہ کہیں گے کہ موجودہ جہان سے زیادہ خوبصورت جہان کی موجودگی کا امکان نہیں ہے تو گویا ہم نے مقدوراتِ الٰہی کو اس موجودہ جہان میں محدود کر دیا ہے اور مزید کسی جہان کی ایجاد کے امکان کی قدرتِ الٰہی سے نفی کر دی ہے۔ اس موضوع پر اتنی ہی گفتگو کافی ہے۔ کیونکہ چاول کے چند دانوں سے ہی دیگ کا اندازہ ہو جاتا

ہے۔

سید سمھودی فرماتے ہیں کہ عقل جن چیزوں کے بارے میں حسن یا قبح کا فیصلہ دیتی ہے جیسے علم اور عدل کا حسن ہونا اور جہل کا قبیح ہونا یہ بات ہمارے اور معتزلہ کے درمیان مشترک ہے۔ اس کے بعد سیّد سمھودی اپنے رسالے کی دوسری فصل میں تحریر کرتے ہیں' اعتراض کرنے والے اس غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں کہ شاید امام غزالیؒ نے اپنے استدلال کی بنیاد معتزلہ کے عقیدے پر رکھی ہے کہ ان کے نزدیک حسن اور قبیح کا معیار عقل ہے اور یہ بات اہل سنت کے قواعد کے خلاف ہے مگر یہ وہم مردود ہے۔ ایک اس اعتبار سے کہ ہم پہلے بھی اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ کسی بھی صفت کے کمال یا نقص کے اعتبار سے عقل کے فیصلے کی درستگی پر اہلسنّت اور معتزلہ دونوں کا اتفاق ہے جیسے علم اور عدل مثبت صفات ہیں جبکہ جہل اور ظلم منفی صفات ہیں۔ نیز اس بات پر بھی فریقین متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات صفت الوہیت سے متصف ہے اور اس کی ذات تمام نقائص سے پاک ہے اور ان تمام امور سے مبرا ہے جو کسی نقص کا نقطۂ آغاز ثابت ہو سکتے ہوں اس لیے فریقین اس بات پر بھی متفق ہیں کہ جس بات کا وقوع علم الٰہی سے طے پا چکا ہو اس کا عدم وقوع محال ہے کیونکہ اس کا وقوع واجب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ جہل سے پاک ہے جو مذکورہ بالا بات کے عدم وقوع کی صورت میں لازم آئے گا۔ یہ بات اس شخص سے پوشیدہ نہیں رہ سکے گی جو اس موضوع پر مشتمل بنیادی اصول کلام کی کتب کا مطالعہ کرے گا۔ فریقین کے درمیان اصل اختلاف اس نکتے میں ہے کہ کیا عقل اللہ تعالیٰ کے حکم کے بارے میں حسن یا قبیح کا فیصلہ کر سکتی ہے؟ معتزلہ اس کے قائل ہیں اور اشاعرہ نے اس کا انکار کیا ہے اور پھر اسی اصول کے تحت یہ کہا ہے کہ حسین ترین جہان کو پیدا کرنا نقص ہے اور پھر پہلے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ اس کے نقص ہونے کا سبب یہ ہے کہ اس کا وجود حکمت کے منافی ہے اور یہ بات عقلی اعتبار سے نقص ہے۔

پھر دوسرا اس بات کی نشاندہی کی کہ جس چیز کے بارے میں پہلے سے علم ہو یہ اس کے خلاف ہوگا جو جہل کے مترادف ہے اور جہل نقص ہے جبکہ نقص عقلی اعتبار سے قبیح ہے۔ لہٰذا حجۃ الاسلام کا بیان اس عقلی حسن کی طرف لوٹایا جائے گا جو ہمارے اور معتزلہ کے درمیان متفق علیہ ہے جبکہ معترضین اس غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں کہ شاید اس سے مراد وہ حسن ہے جو صرف معتزلہ کا نکتۂ نظر ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ (یہاں زیر بحث) حسن عقل سے مراد صفت کا کمال یا نقص ہے اور حسن عقلی ہمارے اور معتزلہ کے نزدیک متفقہ ہے جیسا کہ کتب اصول میں اس بات کی صراحت موجود ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) یہ سیّد سمھودی کے بیان کا خلاصہ ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ہمارے نزدیک یہ تاویل مردود ہے۔ سب سے پہلے ہم امام غزالی کے کلام سے ہی اس کی تردید کریں گے۔ امام غزالی نے اپنے تصنیف ''الاقتصاد السنی فی الاعتقاد السنی'' میں اس مسئلے کی وضاحت کی ہے اسی طرح اپنی آخری تصنیف ''المستصفی'' میں بھی اس پر روشنی ڈالی ہے۔ ''المستصفی'' کے خطبے

میں اسی مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''معتزلہ یہ کہتے ہیں اگر کسی عقلمند کے سامنے سچ اور جھوٹ دونوں برابر حیثیت سے سامنے آ جائیں تو اگر وہ عقلمند ہوگا تو طبعی طور پر سچ کی طرف مائل ہوگا۔ صرف اسی سچ کے حسن کی وجہ سے اگر بہت سے صوبوں کا حکمران بادشاہ کسی کمزور کو ہلاکت کا شکار ہوتے دیکھے گا تو یقینی طور پر اسے بچانے کی کوشش کرے گا۔ اگر چہ وہ کسی مذہبی عقیدے کا پیروکار نہ بھی ہو اور ثواب کے حصول کا طلبگار نہ ہو اور اپنے اس عمل کے عوض میں اس کمزور سے کسی جزا یا شکریے کا بھی طلبگار نہیں ہوگا بلکہ حکماء تو اس بات کے قائل ہیں کہ اگر کسی شخص کو کلمہ کفر کہنے' راز افشاء کرنے یا عہد توڑنے پر مجبور کیا جائے تو (ایسا کرنے کے بجائے) صبر کرنا زیادہ بہتر ہے۔ مختصر یہ کہ اچھے اخلاق اور بھلائی کرنے کا کوئی بھی عقلمند انکار نہیں کرسکتا۔

(غزالی کہتے ہیں) ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ یہ تمام باتیں بنی نوع انسان میں مشہور بھی اور قابل تعریف بھی۔ لیکن (سوال یہ ہے کہ) ان کی سند کیا ہے؟ ان کی سند یا تو کسی دین کے شرعی احکام ہونگے یا عام غرض لیکن ہم ان امور کو اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت نہیں کر سکتے ہیں کیونکہ وہ کسی بھی غرض کی پابندی سے پاک ہے۔ لوگوں کے درمیان ان کا رواج اغراض کے باعث ہے۔ بعض اوقات کوئی غرض دقیق اور خفی ہوتی ہے اور اس کا سراغ صرف محققین لگا سکتے ہیں۔ اس طرح کی مثالوں میں عام طور پر تین بنیادی غلطیاں کی جاتی تھیں''۔

افعالِ باری کا حکم انسانوں سے مختلف ہے

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس کے بعد امام غزالی نے بڑے سائز کے پورے ورق پر یہ مثالیں بیان کی ہیں جو قابل مطالعہ ہیں۔ غزالی نے یہ ثابت کیا ہے کذب' کفر' جہل اور ظلم وغیرہ جسے معتزلہ قبیح قرار دیتے ہیں اور عرف و عادت میں قبیح سمجھا جاتا ہے اس میں تین بنیادی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ اس بحث کے آخر میں غزالی کہتے ہیں:

''ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے ہیں کہ عرف میں ظلم و کذب وغیرہ میں سے ایک چیز کو دوسری سے زیادہ قبیح سمجھا جاتا ہے لیکن ہمارا موضوع سخن اللہ تعالیٰ کی طرف حسن اور قبیح کی نسبت کرنے کے بارے میں ہے اور جو اس بارے میں (عام عرف کو سامنے رکھ کر) فیصلہ کرے گا اس کی دلیل قیاس ہوگا۔ مگر غائب کو حاضر پر کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے؟ اگر کوئی آقا اپنے غلاموں اور باندیوں کو کھلی چھوٹ دیدے کہ وہ آپس میں فواحش کا ارتکاب کریں اور پھر انہیں روکنے اور منع کرنے کی قدرت رکھنے کے باوجود انہیں منع نہ کرے تو یہ طرز عمل اس کے لئے قبیح ہوگا۔ مگر اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے ساتھ یہی معاملہ ہے مگر اسے قبیح قرار نہیں دیا جا سکتا۔ معتزلہ کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس لیے مہلت دی ہے تاکہ وہ اپنے آپ کو زجر و توبیخ کرکے ثواب کے مستحق قرار پا سکیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یقیناً پہلے سے یہ بات جانتا ہے کہ اس کے بہت سے

بندے حقوق بندگی کا خیال نہیں رکھ سکیں گے۔ اس لیے اسے چاہیے تھا کہ وہ زبردستی انہیں ممنوع امور کے ارتکاب سے باز رکھتا کیونکہ کتنے ہی گناہوں سے محض عاجز رہ جانے کی بدولت باز رہا جا سکتا ہے اور یہ جانتے ہوئے کہ بندے باز نہیں رہ سکیں گے انہیں مہلت دینے کے بجائے انہیں زبردستی روکنا زیادہ بہتر ہے''۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) یہ ''مستصفی'' کی عبارت تھی۔ ''الاقتصاد'' کی عبارت زیادہ طویل اور زیادہ جامع ہے۔ یہی گفتگو قاضی ابوبکر باقلانی نے اپنی تصنیف ''البرہان'' میں امام الحرمین نے ''البرہان'' میں اور ابوالحسن الابیاری نے ''شرح البرہان'' میں ذکر کی ہے۔

اس ساری گفتگو سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ ہمارے اور معتزلہ کے درمیان جس حسن اور قبیح پر اتفاق ہے اس کا تعلق لوگوں کے عام محاورے اور گفتگو کے ساتھ ہے جبکہ معتزلہ اللہ تعالیٰ کے افعال اور احکام کو مخلوق پر قیاس کرتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے پاک اور منزہ ہے اور یہ قیاس فاسد ہے جیسا کہ امام غزالی نے اس کی صراحت کی ہے۔ لہٰذا اب فریقین کے نزدیک حسن وقبیح کا مطلب یہ ہوگا کہ طبیعت جس کو پسند کرتی ہو یا جس سے نفرت کرتی ہو اور حسن وقبیح کا تعلق عرف وعادت (میں لوگوں کے) ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے افعال اور احکام کو ان پر منطبق نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ سیّد سمھودی اسی غلطی کا شکار ہوئے ہیں۔ لہٰذا ان کا یہ کہنا غلط ہے کہ حجۃ الاسلام کے قول کی مراد وہ حسن وقبیح ہے جو معتزلہ اور اہلسنت کے نزدیک متفقہ ہے بلکہ اس سے مراد وہ حسن ہوگا جو صرف معتزلہ کے نزدیک حسن ہے اور وہ غائب کو حاضر پر قیاس کرتے ہیں۔ سیّد سمھودی کا یہ کہنا ہے کہ کتب اصول کا مطالعہ کرنے والے سے یہ بات خفیہ نہیں رہے گی۔ (یہ بھی درست نہیں ہے) سیّد سمھودی سے یہ بات پوشیدہ رہ گئی کہ اصولیوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس حسن وقبیح کا تعلق لوگوں کے عادات و اطوار کے ساتھ ہے۔

تاہم اللہ تعالیٰ کے احکام کے بارے میں متکلمین میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ معتزلہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو بندوں کے احکام پر قیاس کرتے ہیں۔ جبکہ اہل سنت ان کی مخالفت کرتے ہوئے اس بات کے قائل ہیں کہ غائب کو حاضر پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اختلاف قدیم اصولیوں کے درمیان رونما ہوا تھا یہاں تک کہ یہ بات مشہور ہو گئی کہ حسن اور قبیح کے بارے میں اہلسنت اور معتزلہ کی رائے ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ متاخرین نے پھر محل اختلاف کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ مقیس علیہ وہ امور ہیں جن کا تعلق بنی نوع انسان کے ساتھ ہے اس لیے انسانی طبیعت نے نفرت یا پسندیدگی کے باعث کسی صفت کو نقص یا کمال قرار دیا لیکن مقیس کا تعلق احکام باری تعالیٰ کے ساتھ ہے لہٰذا بندوں کے احکام کو اس پر منطبق نہیں کیا جا سکتا کیونکہ غائب کو حاضر پر کسی اعتبار سے قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ ایک یہ کہ قیاس عقلیات میں مفید ثابت نہیں ہوتا کیونکہ یہ ظن کا فائدہ دیتا ہے اور عقلیات میں صرف قطعی امر مفید ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ ہمارے معاملات میں حسن وقبیح اغراض کے تابع

ہیں اور اغراض باری تعالیٰ کے حق میں محال ہیں۔ لہٰذا ''جامع'' کی عدم موجودگی اور ''فارق'' کی موجودگی کے باعث یہ قیاس باطل ہوگا۔ تیسرا یہ کہ کوئی چیز باری تعالیٰ کے حق میں حسن ہوگی مگر وہ بندے کے حق میں حسن نہیں ہوسکتی جیسا کہ امام غزالی کی ''مستصفیٰ'' کے حوالے سے ہم پہلے ہی اس کی مثال ذکر کر چکے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حق میں کوئی بھی چیز قبیح نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ جیسے چاہے اپنی ملک میں تصرف کرسکتا ہے۔

سید سمھودی نے اپنی گفتگو کے آغاز میں متفقہ ''حسن'' کے بارے میں جو مثالیں بیان کی ہیں وہ محل نظر ہیں۔ عدل، ظلم اور جہل کے بارے میں معتزلہ کے نکتہ نظر کی تردید میں امام غزالی کی تحقیق سابقہ سطور میں نقل کی جا چکی ہے۔ اگر اس حسن وقبیح کو بندوں کی طرف منسوب کیا جائے تو یہ مسلم ہیں لیکن اگر ان کی نسبت اللہ تعالیٰ کے احکام، جو ہمارا اصل موضوع ہے، کی طرف کی جائے تو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوسکے گا۔

جہاں تک اللہ تعالیٰ کے لئے الوہیت کے اثبات، اس کی ذات کا نقص سے پاک ہونا اور علم الٰہی کے برخلاف کسی شے کے خارج میں واقع ہونے کا تعلق ہے تو یہ امور ہماری متنازع بحث سے متعلق نہیں ہیں کیونکہ یہ علم کلام کے مسائل ہیں ان میں سے بعض کے ادراک میں عقل پر اعتماد کیا جاسکتا ہے جیسے پہلی اور تیسری مثال اور بعض میں عقل پر اعتماد کیا ہی نہیں جاسکتا اور اس بارے میں سمع (نبی اکرم کی اطلاع) کی ضرورت پیش آئے گی جیسے دوسری مثال، اس بارے میں عقلی دلیل ضعیف شمار ہوگی۔ جیسا کہ علم کلام کی کتابوں میں اس بات کی تصریح موجود ہے اور اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ (اللہ تعالیٰ کے لئے) سمع، بصر اور کلام کا اثبات سمع پر موقوف ہوگا۔ (آپ اس سے تفصیلی آگاہی کے لئے) صغریٰ اور اس کی شروحات کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔ عقل کے ادراک میں آنے والی ہر چیز اگر ''متفق علیہ حسن'' سے متعلق ہوتی تو اس سے لازم آتا کہ علم کلام کے تمام عقلی مسائل ''متفق علیہ حسن'' کے تحت ہوتے اور کوئی بھی اس بات کا قائل نہیں ہے۔

اس بنیاد پر، پھر سیّد سمھودی نے' حسین ترین جہان کی عدم پیدائش کو نقص قرار دیا۔ یہ بھی غلط ہے اور ان کی پیش کردہ دونوں توجیہات باطل ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ حسین ترین جہان کی بجائے کم تر جہان پیدا کرنا عقل کی نظر میں نقص ہے کیونکہ یہ حکمت کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ یہ بھی مردود ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے افعال یا احکام میں سے کسی ایک کو بھی قبیح قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ (کے احکام وافعال کی) حکمتوں کی کوئی حد نہیں ہے اور کوئی حادث (یعنی کوئی بھی مخلوق) ان تمام حکمتوں سے واقف نہیں ہوسکتا اس لیے وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ فلاں حکم باری حکمت کے تقاضوں کے خلاف ہے کیونکہ یہ فیصلہ اس وقت کیا جاسکتا ہے جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی تمام تر حکمتوں سے آگاہ ہوجائے اور یہ بات محال ہے جہاں تک ''حسین ترین جہان'' سے پہلے علم اور مشیت کی موجودگی کا تعلق ہے تو یہ ہمارے موضوع بحث سے خارج ہے جیسا کہ ہم پہلے بھی اس بات کی وضاحت کرچکے ہیں۔

سید سمہودی نے یہ حیران کن بات بیان کی ہے کہ حنفیہ جو اہل سنت کے مشہور امام ابو منصور ماتریدی کے پیروکار ہیں۔ انہوں نے بھی اسی بات کی تصریح کی ہے جو تحقیق ہم نے حجۃ الاسلام کی مراد کی وضاحت میں تحریر کی ہے۔

(سمہودی کہتے ہیں' احناف اس بات کے قائل ہیں) ہمارے نزدیک کافر کو معاف کرنا اور اسے ہمیشہ کے لئے جنت میں داخل کر دینا' اللہ تعالیٰ کے لئے جائز نہیں ہے اور نہ ہی یہ جائز ہے کہ اہل ایمان کو ہمیشہ جہنم میں رکھا جائے کیونکہ حکمت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ نیک اور گنہگار کے درمیان فرق کیا جائے اور جو بات حکمت کے منافی ہوگی وہ حماقت ہوگی اور اس کا صدور اللہ تعالیٰ سے محال ہے۔

سید سمہودی کہتے ہیں یہ رائے حجۃ الاسلام کے بیان کے عین مطابق ہے۔ لہٰذا غزالی اس متنازع مسئلے میں اہلسنت میں منفرد نہیں ہیں اور نہ ہی ان کا یہ کہنا غلط ہے کہ ایجاد عالم کا حکمت کے مطابق ہونا اس حسن اور قبیح کی روشنی میں ہے جو اہلسنت اور معتزلہ کے نزدیک متفق ہے۔ تاہم عقلی اعتبار سے کسی شے کا حسین یا قبیح ہونے کے بارے میں اختلافی نقطۂ نظر چونکہ بہت دقیق ہے اس لیے اکابر اشاعرہ نے حجۃ الاسلام کے موقف کی تائید میں سکوت اختیار کیا ہے۔ یعنی امام غزالی نے جو احیاء العلوم میں یہ لکھا ہے کہ ظلم عدل کی ضد ہے اور بعض اشاعرہ نے غزالی کے اس قول میں بھی توقف کیا ہے کہ بخل سخاوت کی ضد ہے تاہم جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اس مسئلے کی حقیقی صورت سے واقف کیا' ہمارے علم کے مطابق ان میں سے کسی ایک نے بھی سکوت نہیں کیا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) محل نزاع کے بارے میں سمہودی کے بیان کی غلطی ہم پہلے آشکار کر چکے ہیں کہ ان کے نزدیک حسن اور قبیح صفت کمال و نقص عقلی کے مترادف کے طور پر استعمال ہوتے ہیں اور پھر سمہودی اس غلط فہمی کا شکار ہوئے کہ یہ تقسیم اللہ تعالیٰ اور بندوں دونوں کے افعال و احکام کو شامل ہوگی وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ یہ تقسیم صرف بندوں کے احکام کے ساتھ مخصوص ہے۔

جہاں تک سمہودی کے احناف کے نقطۂ نظر کو نقل کرنے کا تعلق ہے تو یہ دو اعتبار سے درست نہیں ہے کیونکہ خود امام غزالی کی تصریح اس کے خلاف ہے۔ امام غزالی اپنی تصنیف ''الاقتصاد فی الاعتقاد'' میں پانچویں دعویٰ کے تیسرے مطلب میں تحریر کرتے ہیں۔

''جب اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو مخصوص احکام کا مکلف کیا اور پھر ان بندوں نے اس کی اطاعت کی تو اب انہیں ثواب دینا اللہ تعالیٰ پر واجب نہیں ہے بلکہ اگر وہ چاہے تو انہیں ثواب عطا کرے اور اگر چاہے تو انہیں عذاب دے۔ اگر چاہے تو انہیں مرتبۂ عدم میں ہی رہنے دے اور کبھی انہیں دوبارہ زندہ نہ کرے۔ نیز اللہ تعالیٰ کے لئے یہ بھی کوئی مشکل کام نہیں ہے کہ وہ تمام کفار کو بخش دے اور تمام اہل ایمان کو عذاب دے یہ عمل اس کے لئے ناممکن نہیں ہے اور نہ ہی یہ اس کی شان الوہیت کے خلاف ہے کیونکہ وہ اپنے بندوں میں کسی بھی قسم کا

تصرف کرسکتا ہے۔

کیونکہ ثواب عطا کرنا ازسرنو کوئی کام آغاز کرنے کے مترادف ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ قدرت کے باوجود ثواب یا ترک ثواب کا مکلف کرنا قبیح ہے تو ہم یہ جواب دینگے کہ اگر تمہارے خیال میں قبیح سے مراد یہ ہے کہ ایسا کرنا مکلّف کی غرض کے خلاف ہے تو اللہ تعالیٰ مکلف ہونے اور اغراض سے پاک ہے اور اگر آپ اس سے یہ معانی مراد لیں کہ یہ مخلوق کی غرض کے خلاف ہے تو اگر چہ یہ بات درست ہے لیکن جو چیز مخلوق کے لئے قبیح ہو اس کا صدور اللہ تعالیٰ کی ذات سے ناممکن قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اللہ کی ذات کے حق میں اور اس کے ہاں حسن اور قبیح ایک ہی مرتبے کے حامل ہیں لیکن اگر ہم معتزلہ کے فاسد قول کو مفروضہ طور پر صحیح تسلیم کر لیں کہ عادتاً ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص اپنے غلام سے خدمت لیتا ہے تو اسے کوئی جزا دیتا ہے مگر اسے واجب قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اگر غلام کے عمل کا معاوضہ دینا شرط قرار دے دیا جائے تو پھر غلامی کا کیا فائدہ ہوگا؟ غلام کا فرض صرف یہ ہے کہ وہ اپنے آقا کی خدمت کرے۔ اگر وہ معاوضے کے حصول کے لئے یہ کام کرتا ہے تو اسے خدمت قرار نہیں دیا جا سکتا۔

معتزلہ کا ایک حیران کن نظریہ یہ بھی ہے کہ ان کے نزدیک بندوں پر شکر ادا کرنا واجب ہے تاکہ وہ حق نعمت ادا کرسکیں اور پھر اللہ تعالیٰ پر واجب ہے کہ وہ اس شکر کا بھی ثواب عطا کرے۔ حالانکہ یہ محال ہے کیونکہ جب کوئی شخص اپنا فرض ادا کر دے تو وہ معاوضے کا مستحق نہیں بنتا اور اس سے بھی زیادہ عجیب نظریہ یہ ہے کہ جو شخص کفر کا مرتکب ہوگا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے کہ وہ اسے ہمیشہ عذاب کا شکار رکھے اور دائمی طور پر جہنم میں رہنے دے کیونکہ یہ بات مہربانی' مروت' عقل' عبادت' شریعت اور تمام امور سے جہالت کے مترادف ہوگی۔ (غزالی کہتے ہیں) ہمارے نزدیک رواج فیصلہ دیتا ہے اور عقل بھی اسی بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ معافی اور درگزر کرنا سزا دینے اور انتقام لینے سے زیادہ بہتر ہے۔ ہر شخص انتقام لینے والے کی بجائے معاف کرنے والے کی زیادہ تعریف کرے گا۔ کوئی بھی شخص معافی اور انعام کو قبیح اور طویل انتقام کو بہتر قرار نہیں دے گا اور یہ معاملات اس شخص کے بارے میں ہیں جسے کسی کے ہاتھوں کسی نقصان یا اذیت کا سامنا کرنا پڑا ہو جبکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں فرمانبرداری اور نافرمانی' کفر اور ایمان ایک سی حیثیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا معتزلہ کے نظریے کے مطابق ایک لمحاتی گناہ یعنی کلمۂ کفر کے بدلے میں دائمی عذاب کو کس طرح مستحسن قرار دیا جا سکتا ہے؟ اگر کوئی شخص اس کو مستحسن سمجھتا ہے تو اسے علماء کے مجمع میں بیٹھنے کے بجائے دماغی امراض کے ہسپتال میں داخلہ لینا چاہئے۔ اگر کوئی شخص بعینہٖ اس نظریے کے الٹ چلے تو اس کی رائے زیادہ درست ہوگی اور جس حسن و قبیح کو معیار بنا کر اوہام و خیالات پیش کیے جاتے ہیں اس کے قانون سے وہ بخوبی واقف ہو جائے گا۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ انسان سے جب کسی قبیح فعل کا صدور ہوتا ہے تو اسے سزا دی جاتی ہے اور اس سزا کے دو بنیادی مقصد ہوتے ہیں۔

۱۔ اس سزا کے ذریعے دوسروں کو تنبیہ کی جائے اور مستقبل میں ایسے کسی واقعے کے صدور کے امکان کو ختم کیا جائے۔ اگر کسی سزا میں یہ خصوصیت نہ ہو تو وہ سزا ہی قبیح ہوگی۔ سزا کو حسن اس وقت قرار دیا جائے گا جب اس کا کوئی فائدہ ہو اور جب اس کا فائدہ ہی نہ ہو تو وہ انتہائی قبیح ہوگی۔

۲۔ جب کسی شخص کے ساتھ زیادتی کی جائے تو وہ غضبناک ہو کر کسی کو تکلیف دے اس تکلیف دینے کے باعث اس کا غضب ٹھنڈا ہوگا لیکن دوسری طرف غضب کی شدت میں مقابل کو تکلیف دینا فی نفسہ کم عقلی شمار ہوگا۔ لہٰذا جب کسی گناہ گار کو سزا دینے کو اللہ تعالیٰ کے لئے واجب قرار دیا جائے اور وہ سزا بھی ایسی ہو جس کا کوئی فائدہ نہ ہو اور نہ ہی اس سزا کے ذریعے کسی دوسرے شخص کو اس گنہگار کی زیادتی سے محفوظ رکھنا مقصود ہو تو وہ سزا قبیح ہوگی۔

یہ بات اس نظریے سے زیادہ ٹھوس ہے کہ اگر کفار کو عذاب نہ دیا جائے تو یہ زیادہ قبیح ہے حالانکہ دونوں ہی باتیں غلط ہیں کیونکہ یہ اس وہم کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں جس کا تعلق اغراض کے ساتھ ہے اور اللہ کی ذات اغراض سے پاک ہے۔ ہم نے ایک فاسد نظریے کے مقابلے میں فاسد مثال اس لیے پیش کی تاکہ معتزلہ کے خیال کا فساد ظاہر ہو جائے''۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) یہ امام غزالی کا کلام تھا جسے اس کی خوبی اور عمدگی کے باعث ہم نے یہاں نقل کیا۔ حیرانی کی بات یہ ہے (سید سمھودی نے) اس کلام کو اس کے برعکس مفہوم پر محمول کیا ہے۔

سمھودی نے احناف کا یہ قول نقل کیا کہ ہمارے نزدیک کسی کافر کو معاف کرنا اللہ تعالیٰ کے لئے جائز نہیں ہے تو یہاں یہ سوال کیا جائے گا کہ یہ محال ذاتی اعتبار سے ہے؟ یا عرفی اعتبار سے ہے؟ یعنی اس کے وجوب کا سبب کوئی اور ہے اگر اسے ذاتی اعتبار سے واجب قرار دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کے محال ہونے اور اس کی متضاد صورت کے واجب ہونے کے باعث قدرت کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوگا کیونکہ قدرت کسی بھی واجب یا محال شے کے ساتھ متعلق نہیں ہو سکتی اور اس اصول کے تحت قدرت کو معطل جاننا لازم آئے گا اور اگر اس محال سے مراد عرضی محال لیا جائے جو کسی دوسرے کی وجہ سے واجب ہوتا ہے تو یہ سوال پیدا ہوگا کہ وہ دوسری چیز کیا ہے؟ اگر آپ یہ کہیں کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا علم قدیم ہے تو یہ جواب دیا جائے گا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ذات کی عظمت شان کے پیش نظر عفو کے جواز کی نفی نہیں کرتا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ دوسری چیز تقاضائے حکمت ہے تو یہ جواب دیا جائے گا کہ حکمت کا مرجع علم اور قدرت ہیں اور ان دونوں کے تعلقات کی کوئی حد نہیں ہے لہٰذا حکمت کی بھی کوئی حد نہیں ہوگی۔ تو سوال یہ پیدا ہوگا کہ کیا آپ نے اللہ تعالیٰ کی لامحدود حکمت کا احاطہ کر لیا ہے؟ جس کا احاطہ کرنا فی نفسہ محال ہے۔ اگر وہ یہ جواب دے کہ جو حضرت خضر نے حضرت موسیٰ سے فرمایا تھا کہ میرا اور تمہارا علم اللہ تعالیٰ کے علم میں وہ کمی بھی نہیں کر سکتا جو کوئی چڑیا سمندر سے پانی پی کر اس کے پانی میں

کمی کرتی ہے تو پھر یہی کہا جائے گا کہ اس بارے میں خاموشی ہی بہتر ہے۔

اسی مسئلے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا صرف قہر میں منحصر ہے؟ اگر اس بات کو درست مان لیا جائے تو اللہ تعالیٰ کا عاجز ہونا لازم آئے گا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے پاک ہے اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہو یعنی اللہ تعالیٰ جو چاہے وہ کرسکتا ہے تو احناف کا یہ قول باطل ہو جائے گا۔

اس کے بعد سیّد سمھودی نے قبیح کے بارے میں احناف کے موقف کی توضیح کرتے ہوئے اس کا دائرہ اس قدر پھیلا دیا ہے تاکہ امام غزالی کو بھی اس میں شامل کیا جاسکے کیونکہ آخر احناف اہلسنت و جماعت سے تعلق رکھتے ہیں مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اگر امام غزالی ان کی موافقت بھی کریں اور ساتھ ہی ان کی مخالفت بھی کریں؟ جو شخص اپنی عقل کے تحت اللہ تعالیٰ کے افعال میں سے کسی فعل کو قبیح قرار دیتا ہے تو وہ تین میں سے ایک صورت کا ضرور دعوے دار ہوگا۔

(i) ایک یہ کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی مخلوق میں موجود اسرار کا احاطہ کر لیا ہے اور یہ کیسے ممکن ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان موجود ہے کہ ''تمہیں تھوڑا سا علم عطا کیا گیا ہے'' نیز یہ فرمان بھی ہے کہ ''تم اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتے''۔

(ii) دوسری صورت یہ ہے کہ انسان حضرت خضر کے مقولے کا اعتقاد رکھے اس صورت میں اسے اپنے ذاتی نظریے کی غلطی کا احساس ہوگا۔

(iii) تیسری صورت یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے افعال کو عام محاورے کے مطابق بندوں کے افعال پر قیاس کرے اور یہ قیاس غلط ہے جیسا کہ ہم پہلے اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔

لہٰذا کسی بھی صورت میں اللہ تعالیٰ کے کسی بھی فعل کو قبیح قرار دینا فاسد اور باطل ہے یہاں تک کہ امام غزالی اپنی کتاب ''الاقتصاد'' میں تحریر کرتے ہیں'' جو لوگ اللہ تعالیٰ کے کسی فعل کو قبیح قرار دیتے ہیں ان کا ماخذ صرف ان کے ذاتی اوہام ہیں''۔ غزالی مزید کہتے ہیں: ''یہ بات اگرچہ واضح ہو چکی ہے مگر اس سے غافل نہیں ہونا چاہئے کیونکہ انسان کسی بھی وقت ایسے کسی وہم کا شکار ہو کر پھسل سکتا ہے۔ عقل کی پیروی صرف اولیاء کر سکتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ انہیں حق دکھا دیتا ہے اور انہیں اس کی پیروی کی صلاحیت عطا کرتا ہے اگر آپ عقائد میں اس کا تجربہ کرنا چاہیں تو کوئی عقلی مسئلہ کسی عام معتزلی کے سامنے رکھیں تو وہ فوراً اسے قبول کرلے گا لیکن اگر آپ اسے یہ بتائیں کہ یہ اشاعرہ کا نظریہ ہے تو وہ فوراً اسے رد کر دے گا۔ حالانکہ اس نے خود پہلے اس کی تصدیق کی تھی مگر اب اس کی تکذیب کرے گا۔ صرف اشاعرہ سے بدگمانی کی وجہ سے ہے کیونکہ یہی بدگمانی اس کے خمیر میں شامل ہے۔ اسی طرح ایک عام عقلی مسئلہ کسی عام اشعری کے سامنے رکھیں اور پھر اسے بتائیں کہ یہ معتزلہ کی رائے ہے تو وہ اسے قبول کرنے کے بجائے اس کی تکذیب کرے گا۔ یہ صرف عوام کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ علماء کہلانے والے بھی

اسی صورتحال کا شکار ہیں کیونکہ تقلید میں وہ بھی عوام کی مانند ہیں بلکہ ان کے نزدیک مذہب میں تقلید دلیل میں تقلید کے مترادف ہے۔ان کا مقصد حق کی طلب نہیں ہوتا بلکہ یہ حیلے بہانے سے اس بات کو سچ ثابت کرنا چاہتے ہیں جو ان کے بڑوں سے بطور تقلید ان تک پہنچی ہو اگر انہیں ایسی کوئی تاویل مل جائے تو یہ کہتے ہیں کہ ہمیں دلیل مل گئی ہے اور اگر ان کے اعتقاد کے برعکس کوئی دلیل سامنے آ جائے تو یہ کہتے ہیں کہ ہمارے سامنے ایک شبہ پیش کیا گیا ہے۔گویا اپنی تائید والی ہر بات کو یہ دلیل اور مخالف قول کو شبہ قرار دیتے ہیں۔(احمد بن مبارک کہتے ہیں) یہ تمام گفتگو امام غزالی کی تھی۔

احناف کا یہ کہنا (بھی غلط ہے) کہ حکمت کے تقاضوں کے منافی عمل حماقت ہے۔امام غزالی ''الاقتصاد'' میں تحریر کرتے ہیں۔''یہ غلط ہے کیونکہ حماقت ایسا عمل ہے جس سے کرنے والے کو کوئی نقصان لاحق ہو یا جس سے کرنے والے کو نہ تو کوئی فائدہ ہو اور نہ ہی کوئی نقصان ہو اور یہ اس وقت ہوگا کہ جب انسان کا فعل کسی غرض سے متعلق ہو جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات اغراض سے پاک ہے''۔

اسی طرح (احناف کا یہ کہنا بھی غلط ہے) کہ جس میں کوئی فائدہ نہ ہو وہ کام عبث ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات سے کسی عبث فعل کا ظہور محال ہے۔امام غزالی کہتے ہیں'یہ'' بھی غلط ہے کیونکہ عبث اس فعل کو کہتے ہیں جس کا کوئی فائدہ نہ ہو اور یہ ایسے افعال سے متعلق ہوتا ہے جس سے اغراض بھی متعلق ہوں لہٰذا جس شے کے ساتھ غرض متعلق نہ ہو اسے عبث قرار نہیں دیا جا سکتا جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ یہ دیوار غافل ہے یعنی علم اور جہل سے خالی ہے تو یہ قول باطل ہوگا کیونکہ غفلت کا اطلاق اس ذات پر کیا جا سکتا ہے جس میں علم اور جہالت قبول کرنے کی صلاحیت ہو اور پھر وہ ان دونوں سے خالی ہو لیکن جس ذات کے اندر انہیں قبول کرنے کی صلاحیت ہی نہ ہو اس پر اس لفظ کا اطلاق مجازی ہوگا۔لہٰذا اللہ تعالیٰ اور اس کے افعال کے لیے اس لفظ ''عبث'' کا بھی یہ مفہوم ہوگا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) یہاں تک گفتگو امام غزالی کی تھی اور اس سے سیّد سمھودی کے اس بیان کی تردید ہو جاتی ہے کہ اس مسئلے کی دقت کے باعث اکابر اشاعرہ نے امام غزالی کے اس قول کی تائید میں توقف کیا ہے کہ ظلم عدل کے منافی ہے اور بخل سخاوت کے منافی ہے کیونکہ یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اس مسئلے میں کوئی دقت نہیں ہے بلکہ یہ باطل ہے۔

امام غزالی کے جن حامیوں نے ظلم اور بخل کے مسئلے میں خاموشی اختیار کی ہے ان کے لئے یہ خاموشی مناسب نہیں ہے بلکہ انہیں چاہیے کہ وہ پوری شدت سے اس کی تردید اور انکار کریں کیونکہ بدیہی بات ہے کہ یہ فلاسفہ اور معتزلہ کے نظریات کے مطابق ہے جبکہ غزالی اس سے بری الذمہ ہیں کیونکہ خود انہوں نے پوری تندہی اور جانفشانی سے اس مسئلے کا رد کیا ہے جس کے نتیجے میں اسلامی تعلیمات نکھر کر سامنے آ گئی ہیں۔یہاں تک کہ شیخ ابن العربی ''العواصم'' میں فلاسفہ کے مختلف مکاتب ہائے فکر اور ان کی اسلام دشمنی کا تذکرہ کرنے کے بعد تحریر

کرتے ہیں۔

''پھر اللہ تعالیٰ نے ایک گروہ کو یہ توفیق دی کہ وہ ان فلاسفہ کی تردید کرے تاہم ان حضرات نے تردید کے دوران فلسفیانہ زبان اور طریق کار استعمال نہیں کیا۔ انہوں نے فلاسفہ اور ان کے پیروکار دیگر مبتدعین کا اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کی روشنی میں رد کیا۔ لیکن جب فلاسفہ اس کی گہرائی تک نہ پہنچ سکے تو انہوں نے ان عبارات کا مذاق اڑانا شروع کر دیا اور ان کے دلائل پر طعنہ زنی شروع کر دی اور ان کے قائلین کی طرف جہالت منسوب کرتے ہوئے ان دلائل کو ہنسی میں اڑانا شروع کر دیا یہاں تک کہ امام ابوحامد غزالی نے انہی کے طریق کار کے مطابق ان کی اپنی زبان میں ان کا قاہر رد کیا اور انہیں ذلت و رسوائی سے دوچار کیا۔ آپ نے ان کے اقوال سے ان کے نظریات کا فساد ظاہر کیا اور انہی کی چھری سے انہیں ذبح کیا اور بلاشبہ اس بارے میں آپ کی خدمات سب سے بہتر ہیں۔ آپ نے فلاسفہ اور دیگر مبتدعین کے خلاف اپنی تحقیقات ایک مستقل تصنیف کی شکل میں ''تہافتہ الفلاسفہ'' کے نام سے پیش کی ہیں جو آپ کے علم وفضل کی واضح دلیل ہیں۔ آپ نے فلاسفہ کے مقرر کردہ قوانین کی روشنی میں ان کا ردّ و ابطال کیا اور علم منطق کی روشنی میں فقہی اور کلامی مثالوں کے ہمراہ ان کی تردید کی یہاں تک کہ یونانی فلسفے کے تاروپود بکھیر دیئے۔ اس سے پہلے شیخ ابن حزم نے الکندی کی تصانیف کا مطالعہ کر کے ان کی مختصر تردید کی تھی اور علم منطق میں ایک مناسب رسالہ مدوّن کیا تھا مگر امام غزالی (اس بارے میں سب پر سبقت لے گئے ہیں)۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) یہاں تک ابن العربی کا کلام تھا۔ معتزلہ اور ان کے باطل نظریات کی تردید میں امام غزالی نے ''الاقتصاد'' کے نام سے ایک مستقل تصنیف یادگار چھوڑی ہے جس میں بطور خاص اللہ تعالیٰ کی ذات سے ظلم کے صدور کے محال ہونے کی نفی کی گئی ہے۔ (مثلاً آپ فرماتے ہیں)

''(اللہ تعالیٰ کی ذات سے) ظلم کی نفی سلب محض کے طور پر کی گئی ہے جیسے دیوار سے غفلت اور ہوا سے عبث ہونے کی نفی کی جائے کیونکہ ظلم کا ارتکاب اس ذات سے ہوسکتا ہے جس کے لئے یہ ممکن ہو کہ اس کے فعل کا منفی تصرف کسی دوسرے کی ملک میں ہو اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے حق میں تصور نہیں کی جا سکتی (یا پھر ظلم کا تصور اس وقت ہوسکتا ہے) جب کوئی اس ذات کو کسی بات کا حکم دے اور پھر وہ اس حکم کی خلاف ورزی کرے (اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کے لئے محال ہے) انسان اپنی ملک میں جو بھی تصرف کرتا ہے اسے ظلم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ماسوائے اس صورت کے جب وہ کسی شرعی حکم کی خلاف ورزی کرے مگر اس صورت میں وہ معنوی اعتبار سے ظالم ہوگا۔ مگر جس ذات کے بارے میں یہ تصور ہی ممکن نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے کی ملک میں تصرف کر سکتی ہے یا وہ کسی دوسرے کے حکم کی پابند ہوسکتی ہے تو اس سے ظلم کا صدور یقیناً محال ہوگا۔ یہ اصول اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کیونکہ یہاں پھسلنے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ تاہم اگر ظلم کی اس کے علاوہ کوئی اور تعریف کی جائے تو وہ کیونکہ ہمیں

معلوم نہیں ہے لہٰذا نفی یا اثبات کے حوالے سے اس پر بحث نہیں کی جاسکتی''۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) یہ شذرہ اور اس کی مانند غزالی کے دوسرے کلام سے سیّد سمھودی کے اس بیان کی نفی ہو جاتی ہے جس میں انہوں نے ظلم اور بخل کی تاویل کرنے کی کوشش کی ہے جو سابقہ صفحات میں نقل کیا گیا ہے مگر میں نے طوالت سے بچنے کے لئے اس پر مزید گفتگو نہیں کی ہے۔

(میں یہ سمجھتا ہوں) سیّد سمھودی، شیخ ابن منیر کے مقاصد کو اچھی طرح سمجھ ہی نہیں سکے ہیں مگر میں اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتا کیونکہ اس طرح کلام طویل ہو جائے گا۔ تاہم مختصر طور پر میں یہ ضرور کہوں گا کہ شیخ ابن منیر کی تحقیق بلاشبہ صحیح اور حق ہے۔ انہوں نے ''احیاء العلوم'' کی عبارت کی تردید میں جو دلائل پیش کیے ہیں وہ درست ہیں ان میں کوئی خامی نہیں ہے۔ اس کے برعکس سیّد سمھودی کے جوابات تشنہ ہیں۔ تاہم ایک مسئلے میں مجھے ابن منیر سے اختلاف ہے۔ انہوں نے امام غزالی کی شان میں جو تنقیصی کلمات استعمال کیے ہیں ان سے مجھے اختلاف ہے کیونکہ شیخ ابو حامد غزالی دین و دنیا کے امام اور عالم اسلام و مسلمانوں کے عالم ہیں۔ ان سے منسوب عبارت غلط اور جھوٹی ہے کیونکہ خود امام غزالی کا کلام ان کی دیگر تصانیف میں اس کے متضاد نظریے کے بارے میں منقول ہے جس کی ہم آئندہ سطور میں اس کی وضاحت بھی کریں گے۔

اہل علم کا تیسرا گروہ وہ ہے جس کے نزدیک اس کے قول کو امام غزالی سے منسوب کرنا غلط ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ جب اس قول کو امام غزالی کی دیگر تصانیف کے سامنے رکھا جائے تو دیگر تصانیف میں ان کا کلام اور یہ قول ایک دوسرے کی ضد ہوں گے اور امام غزالی تو کجا کوئی عام عقل مند بھی اس طرح کی دو متضاد باتیں نہیں کہہ سکتا۔ اس لیے ہم اس مسئلے کی امام غزالی سے نسبت کو باطل قرار دیں گے اور ان کی دیگر تصانیف میں جو عبارات اس کے خلاف موجود ہیں انہیں پیش کریں گے۔

پہلی عبارت:

سب سے پہلے ''المستصفی'' کی وہی عبارت ہے جسے پہلے بھی نقل کیا جا چکا ہے۔

''(معتزلہ کا) یہ کہنا خام خیالی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (گناہگاروں کو) اس لیے چھوٹ دی ہے تا کہ وہ خود ہی گناہوں کے ارتکاب سے باز آ جائیں گے اور پھر ثواب کے مستحق قرار پائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ پہلے سے یہ بات جانتا ہے کہ وہ باز نہیں آئیں گے اس لیے انہیں زبردستی روکنا چاہیے تھا کیونکہ عاجزی و کمزوری کے باعث کتنے ہی لوگ گناہوں کے مرتکب نہیں ہو پاتے۔ لہٰذا علم کے باوجود انہیں ان کے حال پر چھوڑنے کے بجائے زبردستی روکنا زیادہ بہتر ہے''۔

اس عبارت میں امام غزالی نے زبردستی روکنے کو یا گناہوں کے ارتکاب سے عاجز کر دینے کو گناہوں کے ارتکاب کی چھوٹ دینے سے ''احسن'' (زیادہ بہتر) قرار دیا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ گناہگاروں کو ان کے حال پر

چھوڑ چکا ہے (یعنی یہ ہو چکا ہے) اور انہیں زبردستی روکنا ممکن ہے جسے امام غزالی نے ''احسن'' قرار دیا ہے۔ گویا ''احسن'' کا وجود غزالی کے نزدیک ممکن ہے (لہٰذا ثابت یہ ہوا کہ موجودہ کائنات سے احسن کائنات کی تخلیق غزالی کے نزدیک ممکن ہے)۔

امام غزالی نے سیر و سیاحت سے فارغ ہونے کے بعد عمر کے آخری حصے میں ''المستصفی'' تحریر کی ہے جبکہ ''احیاء العلوم'' سیر و سیاحت سے پہلے تحریر کی تھی جیسا کہ ''المستصفی'' کے خطبے میں انہوں نے اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ امام غزالی نے ۴۸۸ھ میں درس و تدریس کو خیرباد کہا تھا اور ۴۹۹ھ میں دوبارہ اس کی طرف رجوع کیا گویا آپ کی گوشہ نشینی اور سیاحت کا عرصہ گیارہ برس پر محیط ہے۔ آپ نے اپنی تصنیف ''المنقذ من الضلال'' میں اپنی گوشہ نشینی اور پھر دوبارہ تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کی رجوع کے اسباب پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ قارئین اپنی پسند کے مطابق اس کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

دوسری عبارت:

امام غزالی ''الاقتصاد'' میں تحریر کرتے ہیں۔

''اہل عقل موجودہ مخلوق (یعنی انسان ہونے) کے معدوم ہونے کے تمنائی رہے ہیں۔ کسی نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ کاش میں کوئی بھولی بسری چیز ہوتا۔ کوئی اس بات کا آرزومند تھا کہ کاش میں کچھ بھی نہ ہوتا اور کسی نے یہ کہا کہ کاش میں ایک تنکا ہوتا جسے زمین سے اٹھایا جا سکتا۔ یہ اقوال انبیاء کرام اور اولیائے عظام کے (مقدس گروہ سے تعلق رکھنے والے بعض افراد کے) ہیں جو (حقیقی معنی میں) عقل مند تھے۔ ان میں سے بعض نے پیدا نہ ہونے کی آرزو کی اور بعض نے مکلف نہ ہونے کی خواہش کا اظہار کیا کہ کاش وہ بے جان چیز ہوتے۔ میں حیران ہوں کہ کوئی بھی عقل مند یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ مخلوق کے لئے مکلف ہونا فائدہ مند ہے کیونکہ اصل فائدہ تو مکلف نہ ہونے میں ہے۔ مکلف ہونا تو المناک ہے۔ اگر اس پہلو کا جائزہ لیا جائے کہ مکلف ہونے کے باعث ثواب کا فائدہ حاصل ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ مخلوق کو مکلف کیے بغیر ہی اجر و ثواب عطا کر دے۔

اگر یہ کہا جائے کہ محض مہربانی کی بدولت بلا معاوضہ ثواب کی بہ نسبت کسی استحقاق کے باعث حاصل ہونے والے ثواب سے زیادہ خوشی ملتی ہے تو ہم اس کے جواب میں سب سے پہلے تو ایسی عقل سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگیں گے جو بارگاہِ ربّ العزت میں بڑائی کے حصول کی جرأت کرے جس عقل کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے احسان سے محرومی بلند مرتبت اور اس کی نعمتوں سے خروج لذت کے حصول کا باعث ہے اور شیطان مردود کی بہ نسبت ایسی عقل سے پناہ مانگنا زیادہ بہتر ہے جس کے ذہن میں اس طرح کے وسوسے پیدا ہوتے ہوں اسے کس طرح عقل مند قرار دیا جا سکتا ہے؟ (عبادت و ریاضت) کی مشقت برداشت کیے بغیر ہی ہمیشہ کے لئے جنت میں رہنا جس شخص (کے ضمیر کو) بوجھ محسوس ہو اسے مخاطب کرنا ہی فضول ہے۔

ہم اس بات سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انسان کو عقل سے محروم رکھے۔ جو شخص اس نوعیت کے خیالات رکھتا ہو اس سے مناظرہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا چاہیے کہ وہ اسے عقل عطا کرے''۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ''الاقتصاد'' کی اسی نوعیت کی کچھ عبارات پہلے بھی نقل کی گئی ہیں اور بعض دیگر عبارات کو طوالت کے خوف سے میں نے چھوڑ دیا ہے۔

تیسری عبارت:

امام غزالی ''احیاء العلوم'' میں ''قواعد العقائد'' کے باب میں تحریر کرتے ہیں۔

''اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا ہے اور ان کے اعمال، رزق اور عمر کو مقرر کیا ہے۔ کوئی مقدور اس کی قدرت سے الگ نہیں ہے اور نہ مختلف طرح کے امور کا تصرف اس کی قدرت سے مخفی رہ سکتا ہے اس کے علم اور قدرت کی کوئی انتہا نہیں ہے''۔

پھر آپ فرماتے ہیں۔ ''اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل کے تحت مخلوق کو پیدا کیا اور انہیں (اپنے احکام کا) مکلف کیا۔ یہ بات اس پر واجب نہیں تھی اس نے اپنی مخلوق پر مختلف طرح کے انعام واکرام نازل کیے۔ یہ بھی اس کے لئے لازم نہیں تھا۔ یہ سب اس کا فضل، احسان، مہربانی اور انعام ہے کہ وہ اپنے بندوں کو مختلف طرح کی پریشانیوں اور مصائب وآلام کا شکار کر سکتا ہے (مگر ایسا نہیں کرتا) اگر وہ ایسا کر بھی دے تو یہ عدل ہوگا۔ اسے ظلم یا قبیح قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی بھی چیز واجب نہیں ہے اس لیے اس سے ظلم کے صدور کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ نیز کسی کا بھی اللہ تعالیٰ کے ذمے کوئی حق نہیں ہے''۔

اگر یہ کہا جائے کہ اگر اللہ تعالیٰ بندوں کو نفع پہنچانے کی قدرت رکھنے کے باوجود انہیں عذاب کا شکار کرتا ہے تو یہ قبیح ہوگا (کیونکہ ایسا کرنا) حکمت کے منافی ہے؟

غزالی اس کا جواب دیتے ہیں۔ ''ظلم کی طرح اللہ تعالیٰ سے قبیح کے صدور کا بھی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کسی دوسرے کی ملک میں تصرف کرے گا''۔

یہاں تک کہ غزالی فرماتے ہیں: ''حکیم'' اسے کہتے ہیں جو اشیاء کی حقیقتوں سے واقف ہو اور ''قادر'' اسے کہتے ہیں جو اپنے ارادے کے مطابق کچھ بھی کر سکے (تو معتزلہ کے عقیدے کے مطابق) ''اصلح'' کی پاسداری کی ضرورت بیچ میں کہاں سے آ گئی؟

بنی نوع انسان میں عقل مند اسے کہا جاتا ہے جو خود کو ان امور کا پابند کرے جو دنیا میں اس کے لئے تعریف کے حصول اور آخرت میں ثواب کے حصول کا باعث بنیں یا کسی نقصان و عذاب سے بچنے کا عذاب بنیں اور یہ تمام صورتیں اللہ تعالیٰ کے لئے محال ہیں''۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس طرح کی کئی عبارات ''احیاء العلوم'' میں موجود ہیں۔ آپ ان کا مطالعہ کر

عدل کے منافی ہے تو امام غزالی نے خود اپنے کلام میں اللہ تعالیٰ کی ذات سے ظلم کے صدور کی نفی کی ہے جیسا کہ ہم نے ان کی عبارت نقل کی ہے۔ اگر اس کا سبب بخل کو قرار دیا جائے تو امام غزالی نے ''الاقتصاد'' میں اس کی بھی نفی کی ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اگر اس کی دلیل یہ ہو کہ یہ حکمت کے منافی ہے تو امام غزالی ''احیاء العلوم'' اور ''الاقتصاد'' میں اس کی بھی نفی کر چکے ہیں۔ اگر اس کی دلیل عقلی استحسان اور اصلح کی رعایت ہو تو امام غزالی ''احیاء العلوم'' ''القسطاس'' اور ''الاقتصاد'' میں ''اصلح'' کے نظریے کو بھی باطل قرار دے چکے ہیں۔

اگر اس کی دلیل وہ متفقہ استحسان ہو جس کی تاویل سیّد سمھودی نے پیش کی ہے تو سابقہ سطور میں ہم اسے بھی باطل ثابت کر چکے ہیں اور اگر اس کی دلیل سیّد سمھودی کے بیان کے مطابق علم اور مشیت کی سبقت ہو تو ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ یہ موضوع بحث سے متعلق نہیں ہے۔ اگر اس کی دلیل یہ ہو کہ کوئی بھی ناقص چیز کسی کامل سے صادر نہیں ہو سکتی تو ہم اس کے بطلان کو بھی واضح کر چکے ہیں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے اس مسئلے پر تفصیل سے بحث اس لیے کی ہے اور اس کے مختلف جوابات اس لیے پیش کیے ہیں کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ اکثر لوگ اس سے ناواقف ہیں اور محض امام غزالی سے نسبت کی بدولت اسے صحیح قرار دیتے ہیں۔

امام غزالی اپنی تصنیف ''المنقذ من الضلال'' میں تحریر کرتے ہیں۔

''کم عقل لوگوں کی یہ عادت ہے کہ وہ لوگوں کو حق کے ذریعے پہچاننے کے بجائے حق کو لوگوں کے ذریعے پہچانتے ہیں جبکہ عقل مند لوگ امیر المؤمنین حضرت علی ابن ابو طالب کے اس قول کی پیروی کرتے ہیں۔

''حق کو لوگوں کے ذریعے نہ پہچانو' حق کو پہچان لو' اہل حق کا تمہیں خود ہی پتا چل جائے گا''

لہٰذا عقل مند پہلے حق کو پہچان کر پھر کسی بات میں غور کرتا ہے اگر وہ حق کے مطابق ہو تو اسے قبول کر لیتا ہے خواہ اس کا کہنے والا راہ حق پر گامزن ہو یا باطل کا پیروکار ہو۔

(یہاں تک کہ غزالی لکھتے ہیں) اکثر لوگوں کی یہی عادت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر آپ ان کے کسی ممدوح کے حوالے سے کوئی بات بیان کریں گے تو وہ فوراً قبول کر لیں گے اگرچہ وہ بات باطل ہی کیوں نہ ہو اور اگر آپ ان کے کسی مخالف کے حوالے سے کوئی بات پیش کریں گے تو وہ فوراً اسے رد کر دیں گے اگرچہ وہ بات درست ہی کیوں نہ ہو۔ یہ ہمیشہ لوگوں کے حوالے سے حق کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں جو انتہائی گمراہی ہے''۔

امام غزالی کی عظمتِ شان

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ہمارے شیخ سیّدی دباغ کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے مجھے امام غزالی (کی شان میں تنقیص سے) محفوظ رکھا۔ جس کی صورت یوں ہوئی کہ جب میں نے اس مسئلے کی تردید کا ارادہ کیا اور شیخ دباغ کو اس کا پتہ چلا تو آپ نے میرے دل اور ذہن میں امام غزالی کی عظمت کا احساس اجاگر کر دیا۔ یہاں تک

کہ میرا ذہن ان کی عظمت شان کے تصور سے معمور ہو گیا اور میرے رد کا مرکز نفس مسئلہ رہا۔ امام غزالی کے بارے میں میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا بلکہ ان کے بارے میں الحمدللہ صرف تعظیمی اور احترام آمیز کلمات استعمال کیے۔ یہ صرف میرے شیخ سیّدی دباغ کی برکت ہے۔

حضرت سیّدی دباغ کے وصال کے بعد ان کی ایک عنایت مجھ پر یہ ہوئی کہ ایک مرتبہ میں نے آپ کو خواب میں دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ آپ کا وصال ہو چکا ہے اور میں خود اس وقت نیند اور بیداری کی درمیانی حالت میں تھا۔ اس دوران میں نے آپ سے طویل گفتگو کی پھر ہم امام غزالی کے پاس چلے گئے۔ سیّدی دباغ نے مجھ سے کہا۔ یہ (غزالی) قطب ہیں۔

پھر سیّدی دباغ نے مجھے امام غزالی کی تعظیم کرنے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

''ان کو ایک ایسا لباس (نعمت یا اخروی مرتبہ) ملا ہے جسے دیکھ کر مجھے اپنا آپ کم تر محسوس ہوتا ہے۔ بے شک یہ اکابر اولیاء میں سے ایک ہیں''

پھر سیّدی دباغ نے مجھ سے کہا آج جو میں تمہیں کہہ رہا ہوں اسے (غور سے) سنو! پھر سیّدی دباغ نے اپنی انگلیاں میری انگلیوں میں پیوست کرتے ہوئے کہا یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد ہے کہ غزالی بہت بڑے ولی ہیں۔

پھر میں نے سیّدی دباغ سے امام غزالی کی عظمت وشان کے بارے میں مزید گفتگو کی۔ آپ نے دوبارہ انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر یہ عہد دہرایا کہ غزالی بہت بڑے ولی ہیں۔

پھر سیّدی دباغ نے فرمایا۔ ابو حامد (غزالی) میرے ساتھ ہوتے ہیں (یا شاید یہ فرمایا) مجھ سے جدا نہیں ہوتے اور مجھ سے اکثر ان علوم کے بارے میں دریافت کرتے رہتے ہیں جن کی انہیں ضرورت پیش آتی ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) یعنی آخرت میں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) یہ ایک خواب تھا جب میں بیدار ہوا تو امام غزالی کی محبت میرے دل میں گھر کر چکی تھی اور یہ صرف میرے شیخ سیّدی عبدالعزیز دباغ کی برکت ہے جس پر میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اور یہ دعا کرتا ہوں کہ ان سطور کی تحریر کو صرف اپنی رضا کے لئے مخصوص کر دے۔

ولا حول ولا قوة الا باللّٰہ العلی العظیم

الحمدللّٰہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللّٰہ

وصلی اللّٰہ علیٰ سیدنا محمد النبی الامی وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم تسلیما کثیرا

والحمد للّٰہ ربّ العالمین

آٹھواں باب

تخلیقِ آدم علیہ السلام کا بیان

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو دس (10) دن تک ان کے جسم کو بنانے کے لیے مٹی کو اکٹھا کیا گیا پھر اسے بیس (20) دن تک پانی میں رکھا گیا پھر چالیس (40) دن اس کی صورت بنانے میں صرف ہوئے جب شکل بن گئی تو پھر بیس (20) دن تک بڑی رہی۔ یہاں تک کہ وہ مٹی کی شکل سے ایک جسم کی شکل میں تبدیل ہوگئی۔

یہ سارا عمل تین ماہ میں مکمل ہوا جو رجب، شعبان اور رمضان تھے۔ پھر اس جسم کو جنت میں لے جایا گیا اور جنت میں ہی اس جسم میں روح پھونکی گئی۔ اس کے بعد اس جسم سے، جنت میں، سیّدہ حوا علیہا السلام کو پیدا کیا گیا۔ جب ان کی پیدائش کو دو (2) ماہ ہو گئے تو حضرت آدم علیہ السلام اور سیّدہ حوا علیہا السلام کی فطرت میں شہوت کا جذبہ رکھا گیا۔ جس کے نتیجے میں حضرت آدم علیہ السلام نے ان سے صحبت کی اور وہ حاملہ ہوگئیں۔ اس کے تین (3) ماہ بعد یہ دونوں زمین پر اتر آئے اور زمین پر ہی ان کے ہاں پہلے بچے کی پیدائش ہوئی۔ اس کے بعد ہر بچے کی پیدائش کا عرصہ نو (9) ماہ رہا اور آج تک یہی معمول جاری ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا، حضرت آدم علیہ السلام کو جس مٹی سے پیدا کیا گیا تھا وہ کون سی مٹی تھی؟ آپ نے جواب دیا یہ تمام معادن (کانوں) کی مٹی تھی مثلاً سونے کی کان، چاندی کی کان، تانبے کی کان اور دیگر تمام کانیں۔ ہر کان سے ان کی مٹی حاصل کی گئی اور پھر ان سب کے مجموعے کے ذریعے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی۔

میں نے دریافت کیا اس مٹی کو کس نے جمع کیا تھا؟ آپ نے جواب دیا فرشتوں نے لیکن ان میں سب سے زیادہ سیدنا جبرائیل علیہ السلام نے یہ کام کیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ اس کی سب سے برگزیدہ مخلوق کو مٹی سے پیدا کیا جائے گا اور حضرت جبرائیل علیہ السلام ان کے ساتھی اور دوست ہوں گے اور اس تعلق کے باعث بہت سی برکات سے فیض یاب ہوں گے وہ مخلوق سیّد عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ لہٰذا اسی نعمت کے حصول کے لیے مٹی جمع کرنے کے معاملے میں حضرت جبرائیل (علیہ السلام) نے زیادہ کوشش کی۔

بتدریج تخلیق کی حکمت

میں نے دریافت کیا وہ کتنی مٹی تھی؟ آپ نے جواب دیا اگر اسے زمین پر بچھایا جائے تو تقریباً ایک میل کے لگ بھگ فاصلہ بن جائے گا۔ میں نے دریافت کیا اللہ تعالیٰ اسے ایک لمحے میں بھی جمع کر سکتا تھا۔ پھر اس کے لیے دس (10) دن کیوں صرف کیے گئے؟ آپ نے جواب دیا اللہ تعالیٰ تو ایک لمحے میں سب زمینوں اور آسمانوں کو بھی پیدا کر سکتا ہے پھر اس نے چھ (6) دن کیوں صرف کیے؟ پھر وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ مٹی کے بغیر ہی حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کر دے پھر اس نے مٹی کو کیوں منتخب کیا؟ اس کی حکمت یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کو درجہ بدرجہ ارتقاء کی طرف لے جاتے ہوئے چند ایام میں مکمل کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں ملاء اعلیٰ میں رہنے والوں کو توحید کے اسرار سمجھنے میں مدد ملتی ہے کیونکہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقلی اور آہستہ آہستہ منتقلی کی وجہ سے ملاء اعلیٰ اس سارے عمل میں موجود امرِ الٰہی کو بہت غور سے مشاہدہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کس طرح پیدا کیا ہے؟ اس کا نتیجہ اور انجام کیا ہوگا؟ لہٰذا اپنے اس مشاہدے کے دوران انہیں اللہ تعالیٰ کے علم، اس کی ذات، اس کی قدرت، قدرت کا مخلوق سے تعلق وغیرہ کے حوالے سے بہت سے مشاہدات نصیب ہوتے ہیں۔ اسی حکمت کے تحت کسی مخلوق کو تدریجاً پیدا کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس عمل میں کچھ اور حکمتیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً کسی مخلوق کے تدریجی ارتقاء کے دوران (ضمنی طور پر) چند دیگر اشیاء بھی پیدا ہوتی ہیں۔ بہر حال اللہ تعالیٰ اپنے فیصلوں کے اسرار اور حکمتوں سے بخوبی آگاہ ہے۔

تخلیق آدم کون سے پانی سے ہوئی؟

میں نے دریافت کیا وہ کون سا پانی تھا جس میں بیس (20) تک یہ مٹی موجود رہی؟ آپ نے فرمایا یہ ایک خاص قسم کا پانی تھا اور اس میں حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد کے لیے بہت سا نفع موجود تھا اور یہ نفع اس لیے موجود تھا کیونکہ اس کا تعلق اسی زمین کے ساتھ تھا۔ جس کے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام کے جسدِ خاکی کو نسبت حاصل تھی۔

میں نے دریافت کیا اس کا تعلق زمین کی تہہ کے ساتھ تھا یا اس کی کوئی اور صورت تھی؟ آپ نے جواب دیا اس کا تعلق زمین کی تہہ سے تھا۔ تاہم یہ زمین کے بہت سے حصوں پر سے گزر چکا تھا۔ بعض اوقات سطحِ زمین کے ایک مخصوص حصے سے گزرنے والا پانی اس مخصوص حصے کا ''سِرّ'' حاصل کرتا ہے اور کبھی کوئی پانی پوری روئے زمین یا اس کے اکثر حصے سے گزرتا ہے تو اسی حصے کا ''سِرّ'' حاصل کر لیتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق جس پانی کے ذریعے ہوئی وہ ''شام'' میں موجود ایک چشمے کا پانی تھا اور ''شام'' ہی میں ایک مخصوص مقام پر حضرت آدم علیہ السلام کی مٹی کو جمع کیا گیا تھا۔ اس مٹی کو اسی پانی سے سیراب کیا گیا جسے روئے زمین پر موجود دیگر پانیوں کی مدد حاصل تھی لہٰذا آپ دیکھیں گے کہ وہ پانی زمین کے اجزاء کو کاٹتا ہوا اس چشمے تک پہنچتا تھا۔ یہ چشمہ آج

بھی موجود ہے اور زمین پر موجود دیگر تمام طرح کے پانیوں کے مقابلے میں اس میں انسان کی بہتری کی زیادہ صلاحیت موجود ہے۔ مختصر یہ کہ بیس (20) دن یہ مٹی اس پانی میں موجود رہی پھر اس کے بعد اس مٹی کے خدوخال نمایاں کیے جانے لگے اور چالیس (40) دن میں وہ مٹی ایک جسم میں تبدیل ہوئی۔ اس وقت حضرت آدم علیہ السلام کی انگلیوں میں ایک آبلہ ظاہر ہوا جو بھر کے پھٹ گیا اور اس میں موجود مادہ انگلی پر جم کر اس طرح سفید ہو گیا جیسے کھجور کے درخت کی چھال اتارنے کے نتیجے میں اندر سے سفید گودہ باہر آتا ہے۔ اس کے بعد وہ سفید رطوبت اس جسم کے ہر جزو میں سرایت کر گئی یہاں تک کہ وہ سارا جسم گیہوں کے گندھے ہوئے آٹے کی مانند ہو گیا۔ اسی سے حضرت آدم علیہ السلام کی صورت بنائی گئی اور ان کے پورے جسم میں خون داخل کیا گیا۔ جس کی وجہ سے وہ مٹی پھٹ گئی اور اس میں خشکی ظاہر ہوگئی۔ ہوا کے ذریعے ان اجزاء کو خشک کیا گیا جس کے نتیجے میں ہڈیاں وجود میں آئیں۔ بیس (20) دن کے عرصے میں تخلیق کا یہ عمل مکمل ہوا اور پھر جب اللہ تعالیٰ نے اس میں روح پھونکنے کا ارادہ کیا تو حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں منتقل کر دیا گیا۔

حضرت آدم کس جنت میں قیام پذیر رہے؟

میں نے دریافت کیا یہ کون سی جنت تھی؟ آپ نے فرمایا یہ پہلی جنت تھی۔ جب حضرت آدم علیہ السلام وہاں منتقل ہوئے اور ان کے جسم میں روح پھونک دی گئی تو ان کے وجود کے اندر عقل اور علم کو بھی داخل کیا گیا جس کے نتیجے میں انہیں اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوئی۔ لہٰذا انہوں نے فوراً کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن لہرا کے گر گئے دوبارہ کوشش کی دوبارہ گر گئے۔ بالکل اسی طرح جیسے بچے چلنا سیکھتے وقت بار بار گرتے ہیں۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے انہیں وہ مشاہدہ عطا کیا جس کا ذکر اسماءِ حسنیٰ کے ضمن میں بیان کیا جا چکا ہے۔ یہ مشاہدہ آپ کو ایسی حالت میں نصیب ہوا جب آپ ایک ٹانگ کے گھٹنے کو زمین پر بچھا کر اور دوسرے کو کھڑا کر کے بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ کو جب یہ مشاہدہ نصیب ہوا تو آپ کی زبان سے یہ کلمات جاری ہوئے۔

اللہ اللہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ۔

اس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو قوت عطا کی اور آپ سیدھے کھڑے ہو کر جنت میں چلنے پھرنے لگے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی پسلی میں ایک درد پیدا کیا جس کے نتیجے میں وہاں ایک بہت بڑا پھوڑا پیدا ہو گیا۔ کچھ دن بعد اس میں سے ایک ڈھانچہ نکل کر زمین پر گرا جب حضرت آدم علیہ السلام نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی شکل اپنی شکل سے ملتی جلتی تھی۔ جنت کی ہوائیں اس ڈھانچے پر سے گزرتی رہیں جس کے نتیجے میں وہ ڈھانچہ تیزی سے نشو و نما پانے لگا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے بھی اس کی دیکھ بھال شروع کر دی وہ ڈھانچہ بہت تیزی سے بڑا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام اس سے مانوس ہوتے چلے گئے اور اس کے پاس بیٹھنے لگے اس وقت اللہ تعالیٰ نے اس ڈھانچے کو عقل عطا کی اور اس نے حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ گفتگو شروع کر دی۔ اس کے دو ماہ بعد ان دونوں کے اندر شہوت کا مادہ ودیعت کیا گیا جس کی تفصیل ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں حضرت آدم علیہ السلام کومخصوص انوار عطا کرنے کے لیے جنت میں لے جایا گیا تھا تاکہ آپ کی اولاد ''یوم الست'' میں دیا گیا عہد بھول نہ جائے۔ دوسرا مقصد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت وشان کا اظہار تھا (کہ آدم علیہ السلام نے اپنی پیدائش کے فوراً بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کی گواہی دی) اس نکتے کو اہل علم بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

میں نے دریافت کیا حضرت آدم علیہ السلام کو جس درخت کا پھل کھانے سے منع کیا گیا تھا۔ وہ کون سا درخت تھا؟ آپ نے جواب دیا اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ وہ انجیر کا درخت تھا اور اس کا پھل کھانا اس لیے ممنوع قرار دیا گیا تھا کیونکہ اس درخت بلکہ جنت کے تمام درختوں کا پھل کھانے کے نتیجے میں وہ ''اسہال'' کا شکار ہو سکتے تھے۔ جس کے نتیجے میں ان کے لیے جنت میں رہنا مشکل ہو جاتا۔

میں نے دریافت کیا جنت کے کھانے، پھل اور دوسری نعمتیں اگرچہ وجود رکھتی ہیں لیکن ان کی حیثیت صرف انوار کی سی ہے جن میں کوئی وزن نہیں ہوتا جیسا کہ بہت سی احادیث میں یہ بات بیان کی گئی ہے لہٰذا جس چیز کا اپنا وزن ہی نہ ہو وہ پیٹ میں گرانی کا باعث کیسے بن سکتی ہے؟

آپ نے جواب دیا تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اہل جنت جب قیامت کے بعد جنت میں داخل ہوں گے اس وقت ان کے وجود میں بہت سی طاقت موجود ہوگی لیکن جب حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں داخل کیا گیا تھا اس وقت ان کے جسم کے اندر اتنی طاقت موجود نہیں تھی۔ جس کے نتیجے میں وہ جنت کے کھانوں کو برداشت نہیں کر سکے لیکن قیامت کے بعد جب جنتی جنت میں داخل ہوں گے تو ان کے وجود کے اندر یہ قوت موجود ہوگی کہ وہ جنت کی نعمتوں کی برداشت کر سکیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت جنت کی نعمتوں کی مانند اہل جنت کے وجود بھی انوار کی شکل میں ہوں گے۔ اس کے برعکس جب حضرت آدم علیہ السلام جنت میں داخل ہوئے تھے اس وقت ان پر خاکی وجود کا رنگ غالب تھا۔

میں نے دریافت کیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس وقت حضرت آدم علیہ السلام جنت میں کھائے، پیئے بغیر رہتے ہوں گے؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا جنت کی نعمتیں دو قسم کی ہیں ایک وہ جو خالص انوار پر مشتمل ہیں اور وہ دنیا میں موجود کسی بھی شئے سے مشابہت نہیں رکھتی ہیں۔ ان میں کوئی بھاری پن موجود نہیں ہوتا اور جنت کی بیشتر نعمتیں اسی قسم پر مشتمل ہیں۔ جنت میں موجود نعمتوں کی دوسری قسم وہ ہے جو دنیاوی نعمتوں سے مشابہت رکھتی ہیں اور ان میں ثقل پایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پہلی قسم کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کا حکم دیا تھا اور حضرت آدم علیہ السلام انہیں برداشت بھی کر سکتے تھے جبکہ دوسری قسم کی نعمتوں کو کھانا ان کے لیے ممنوع تھا کیونکہ ان کا وجود انہیں برداشت نہیں کر سکتا تھا جس کے نتیجے میں جنت میں رہنا ان کے لیے مشکل ہو جاتا۔

اہل جنت کی کیفیات

سیدی دباغ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے جنت کی نعمتوں کو مذکورہ بالا دو قسموں میں اس لیے تقسیم کیا ہے کیونکہ

یہ بات اس کے علم میں موجود تھی کہ اہل جنت کی دو حالتیں ہوں گی۔

پہلی حالت اکثر لوگوں کو نصیب ہوگی اور وہ یہ ہے کہ جنت میں رہائش کے دوران انہیں کبھی بھی دنیا یا اس کے متعلقات کا خیال بھی نہیں آئے گا۔ دنیا مکمل طور پر ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے گی۔ ایسے لوگ جنت کی پہلی قسم کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے۔

دوسری حالت یہ ہے اگر چہ یہ حالت بہت کم لوگوں میں پائی جائے گی کہ انہیں دنیاوی نعمتوں و آسائشوں کا خیال آئے گا اور ان کے اندر یہ طلب پیدا ہوگی کہ ہم جنت میں ان دنیاوی نعمتوں سے لطف اندوز ہوں تو جنت کی دوسری قسم سے تعلق رکھنے والی نعمتیں، دنیاوی نعمتوں کی شکل میں ان کے سامنے آجائیں گی۔

اصولی طور پر پہلی حالت زیادہ کامل ہے کیونکہ ان کی حالت بالکل اسی طرح ہے جیسے وہ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں حاضر ہیں اور انہیں اپنے رب کے سوا اور کسی بات کا کوئی ہوش نہیں ہے۔ نعمتوں کے حوالے سے ان کی نعمتیں زیادہ بہتر ہوں گی کیونکہ جنت کے مخصوص ماحول کے مطابق انہیں یہی نعمتیں نصیب ہونی چاہئیں کیونکہ ہمیشہ باقی رہنے والی نعمتیں ہیں جبکہ دوسری حالت میں فکری اعتبار سے یہ کمی پائی جاتی ہے کہ ان لوگوں کی مثال اس شخص کی مانند ہے جسے مشاہدۂ حق نصیب نہیں ہے اور مشاہدۂ حق کی عدم موجودگی میں انہیں اپنی ذات اور ذاتی پسند کا خیال آیا اور انہوں نے دنیاوی نعمتوں کے حصول کی آرزو کی۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اس بات کا پہلے سے علم تھا کہ جنت میں بعض لوگ ایسے بھی موجود ہوں گے جو دنیاوی نعمتوں کے حصول کی آرزو کریں گے اس لیے جنت کے عام ماحول کے مطابق بعض ایسی نعمتیں پیدا کی گئی ہیں جن میں کوئی ثقل نہیں ہوتا اور ان لوگوں کے لیے بعض ایسی نعمتیں پیدا کی گئی ہیں جو جنت کے عام ماحول سے ذرا مختلف ہیں اور ان میں ثقل پایا جاتا ہے اور وہ دنیاوی نعمتوں سے مشابہت رکھتی ہیں تاہم جب قیامت کے بعد جنتی لوگ جنت میں داخل ہوں گے تو ان کے وجود میں اس قدر طاقت پیدا کر دی جائے گی کہ اس طاقت کی موجودگی میں انہیں ثقل محسوس نہیں ہوگا جبکہ حضرت آدم علیہ السلام کے اندر کیونکہ یہ مخصوص قوت نہیں رکھی گئی تھی اس لیے ان کا وجود دوسری قسم سے تعلق رکھنے والی نعمتوں کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں اس پھل کو کھانے سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کی پوری توجہ اپنے پروردگار کی طرف مبذول تھی اور آپ اپنی ذاتی خواہشات سے بالکل غافل تھے لیکن جب آپ نے وہ پھل کھایا تو معاملہ الٹ ہو گیا۔ اب آپ کی توجہ اپنی ذات کی طرف مبذول ہوگئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ درخت کا پھل کھانے سے پہلے وہ صرف ایک نعمت کے حصول کے طور پر کچھ کھایا پیا کرتے تھے۔ انہیں بھوک یا پیاس کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے وہ اپنے آپ سے بے پرواہ ہو کر صرف اللہ کی طرف متوجہ رہتے تھے لیکن جب درخت کا پھل کھانے کے بعد انہیں معدے میں گرانی کی شکایت ہوئی اور بھوک لگی تو اب ان کی توجہ اپنی ذات کی طرف ہوگئی اور انہوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ بھوک سے نجات کی کیا صورت ممکن ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں اس

دنیا میں بھیج دیا جہاں تنگی و پریشانی موجود رہتی ہے۔

چونکہ یہ بات پہلے سے علمِ الٰہی میں موجود تھی کہ حضرت آدم علیہ السلام عنقریب زمین پر اتریں گے اس لیے اللہ تعالیٰ نے زمین میں ان کی رہائش کے اسباب پیدا کر دیے اور ان کے جنت میں سے نکلنے سے پہلے یہ راستے مقرر کر دیے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تھا تو مٹی سے بہت سے جانور پیدا کیے گئے۔ جن کی شکل کیڑوں کی مانند تھی اور ان میں سے ہر ایک قسم کے پانچ، پانچ جوڑے پیدا کیے گئے۔

پھر جب اللہ تعالیٰ نے انہیں جنت میں منتقل کر دیا تو زمین پر زبردست بارش نازل ہوئی۔ جس کے نتیجے میں زبردست سیلاب آ گیا اور یہ حیوانات کی نشو و نما کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔ ہر طرف ہریالی ہو گئی۔ نو (9) ماہ بعد جب حضرت آدم علیہ السلام زمین پر واپس تشریف لائے تو انہوں نے بہت سے جانوروں کو زمین پر گھومتے پھرتے دیکھا۔ جو تیزی سے بڑے ہو رہے تھے۔ اس وقت انہیں پتہ چلا کہ یہ سب کچھ ان کے اور ان کی اولاد کے لیے ہے تاکہ وہ باآسانی زندگی بسر کر سکیں۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں جس کی مٹی سے حضرت آدم علیہ السلام کا سر بنایا گیا تھا۔ وہاں کھجور، انگور، انجیر اور زیتون کے درخت پیدا کر دیے گئے۔ جب حضرت آدم علیہ السلام زمین پر تشریف لائے اور انہیں بھوک محسوس ہوئی تو انہوں نے انہی درختوں سے غذا حاصل کی۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا۔

اکرموا عمتکم النخلته فانها من طین آدم.

''کھجور کا احترام کیا کرو کیونکہ اسے حضرت آدم علیہ السلام کی مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔''

کیا یہ حدیث ہے یا نہیں؟ آپ نے فرمایا نہیں ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ابن حجر، زرکشی، سیوطی اور دیگر حفاظ حدیث بھی اسی بات کے قائل ہیں۔

میں نے دریافت کیا کیا اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے لیے ان چار درختوں کے علاوہ کوئی اور درخت بھی پیدا کیا تھا؟ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا وہ تمام درخت جن کا ذکر قرآن میں موجود ہے انہیں اللہ تعالیٰ نے انہی کی مٹی سے پیدا کیا تھا۔

ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ کہنے لگے اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق میں تخلیقی اعتبار سے سب سے زیادہ خوبصورت انسان ہے کیونکہ یہ سب سے زیادہ خوبصورت، سب سے افضل، سب سے بلند ترین اور سب سے زیادہ مضبوط ہے۔ اگر کوئی عقل مند انسان کے جسم میں موجود ترکیب و ترتیب کا بنظر غائر جائزہ لے اور ظاہری باطنی خوبیوں کا اندازہ لگانے کی کوشش کرے تو انسان کے خالق کی عظمت کے سامنے سربسجود ہو جائے گا۔

انسان کی فرشتوں پر فضیلت کا سبب

میں نے دریافت کیا انسان کو فرشتوں پر کیوں فضیلت دی گئی ہے؟ آپ نے فرمایا انسان کے وجود میں جو

کچھ ہے وہ فرشتوں کے اندر موجود نہیں ہے کیونکہ فرشتوں کو نور سے پیدا کیا گیا ہے اور اس نور کے اندر عقل رکھی گئی ہے لیکن انسان کے وجود میں نور، عقل، روح، آگ، ہوا، مٹی، پانی اور ان کے اسرار ودیعت کیے گئے ہیں۔ لہٰذا جب ایک ہی وجود میں یہ تمام اسرار اکٹھے ہو جائیں گے تو ان اسرار کی بدولت وہ ذات قوی ہو جائے گی۔ گویا انسان کے وجود کے اندر مختلف مخلوقات (کے اسرار) پائے جاتے ہیں اور کسی مخلوق کو یہ خصوصیت حاصل نہیں ہے۔ اس لیے انسان جس قدر (اللہ تعالیٰ کے) اسرار کا مشاہدہ کر سکتا ہے کوئی فرشتہ ایسا نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بطورِ خاص لباسِ بشریت عطا کیا گیا۔ حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ساری مخلوق میں سب سے زیادہ انوار برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اگر کسی اور مخلوق میں یہ صلاحت زیادہ ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس مخلوق کی جنس سے پیدا کیا جاتا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) انسان ساری مخلوق سے زیادہ خوبصورت ہے اور سب سے زیادہ طاقتور ہے۔ امام ابوالقاسم القشیری نے اپنی تصنیف ''التحبیر فی شرح اسماء اللہ الحسنٰی'' میں اسی بات کا تذکرہ کیا ہے لیکن سیّدی عبدالعزیز دباغ کا کلام زیادہ تفصیلات پر مشتمل ہے اور اس بارے میں میں نے حضرت کا پورا کلام نقل نہیں کیا بلکہ اس کا کچھ حصہ تحریر کیا ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، اگرچہ انسان ساری مخلوق سے زیادہ خوبصورت ہے لیکن یہ بات اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے سے موجود تھی کہ بعض انسان جنت میں جائیں گے اور بعض دوزخ کا ایندھن بنیں گے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی نگاہوں کے سامنے حجاب پیدا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے وجود میں روح داخل کی اور انسان کی ذات کا ''سر'' عقل ہے۔ اگر مشاہدے کے ہمراہ ایمان کا نور اور اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو جائے تو انسان کے وجود اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے درمیان موجود حجاب اٹھ جاتا ہے اور انسان کو کامل طور پر اپنے خالق کی معرفت نصیب ہو جاتی ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ کسی کو جہنم کا ایندھن بنانے کا ارادہ کرے تو اس کی بصیرت کے آگے حجابات آ جاتے ہیں جس کے نتیجے میں مشاہدہ ختم ہو جاتا ہے اور انسان اللہ تعالیٰ سے لاتعلق ہو جاتا ہے۔ اے کاش! جب انسان اللہ تعالیٰ سے لاتعلق ہوتا ہے اس وقت اس کا تعلق کسی اور (یعنی دنیا) سے نہ ہو کیونکہ یہ کیفیت اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے لاتعلق ہونے کے ساتھ ساتھ دنیا سے تعلق قائم کر لے کیونکہ اس صورت میں انسان اپنی عقل کو ہی سب کچھ سمجھنے لگ جاتا ہے اور ہر معاملے میں اپنی عقل پر اعتماد کرتا ہے جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی ذات سے لاتعلقی بڑھتی چلی جاتی ہے کیونکہ جب اس نے یہ سمجھا کہ عقل اس کی ذاتی خصوصیت ہے اور یہ ہر معاملے میں اس کی مددگار ثابت ہو سکتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ اس کی لاتعلقی اور اس کی اپنی ذات کے ساتھ تعلق مزید مضبوط ہو جائے گا لیکن اگر وہ یہ خیال کرے کہ اس کی عقل اللہ تعالیٰ کی عطا کا نتیجہ ہے اور اللہ تعالیٰ ہی عقل کو غور و فکر کرنے کی صلاحیت عطا کرتا ہے تو اس صورت میں اس کی توجہ اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف متوجہ ہو جائے گی اور مشاہدے کی وہ کیفیت جو زائل ہو گئی تھی وہ واپس آ جائے

گی۔ مختصر یہ کہ اگر انسان کی ذات اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق ختم کرے اور حادث (دنیا) کی طرف متوجہ ہو جائے تو اللہ تعالیٰ سے تعلق ختم ہو جائے گا لیکن اگر انسان دنیا کی طرف متوجہ نہ ہو تو یہ اس کے لیے بہتر ہے۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں، جب انسان ہر معاملے میں عقل ہی کو معیار بنا لے تو اس کے راہِ راست سے بھٹکنے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لیے بنی نوع انسان کو گمراہی سے بچانے کے لیے انبیاء کرام کو مبعوث کیا گیا تا کہ وہ دوبارہ بنی نوع انسان کو معرفتِ الٰہیہ کے راستے پر گامزن کریں۔ لہٰذا تقدیر کے ازلی فیصلے کے مطابق بعض حضرات نے انبیاء کرام کی دعوت کو قبول کیا اور بعض نے اس کا انکار کیا۔ جن لوگوں نے انبیاءِ کرام کی دعوت کو قبول کیا تھا انہوں نے ایک خاص حد تک عقل کی پیروی کی اور جنہوں نے انبیاء کا انکار کیا وہ مکمل طور پر اپنی (ناقص) عقل کے غلام ہو کے رہ گئے۔

مشاہدہ ختم ہونے کا سبب

میں نے دریافت کیا، وہ کون سا حجاب ہے جس کی وجہ سے مشاہدہ ختم ہو جاتا ہے؟ کیا وہ خون ہے جو غفلت کا باعث بنتا ہے یا اس کے علاوہ کوئی اور چیز ہے؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا، اس حجاب کا باعث ایک تاریکی ہے جس کا تعلق جہنم کے ساتھ ہے۔ جو ذات کا احاطہ کر لے تو معرفت محجوب ہو جاتی ہے۔

میں نے دریافت کیا، اس تاریکی اور خون کے درمیان کیا نسبت ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا ان دونوں کے درمیان کوئی نسبت نہیں البتہ خون اللہ تعالیٰ کی ذات سے دوری کا باعث بنتا ہے اور یہ تاریکی حجاب میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ پھر سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ایک مثال کے ذریعے یہ بات واضح کی کہ کس طرح خون اللہ تعالیٰ سے دوری کا باعث بنتا ہے۔ ایک شخص کا ایک کمسن بیٹا تھا وہ اپنے بیٹے سے بہت محبت کرتا تھا۔ بالفرض اگر وہ بچہ چیچک کا شکار ہو جاتا ہے اور یہ بیماری اس کے چہرے اور دیگر تمام جسم کو گھیر لیتی ہے تو اب اس کے والد کو اپنے بیٹے پر بہت ترس آئے گا اور اسے اپنے بیٹے کی تکلیف کے باعث خود بھی شدید تکلیف محسوس ہو گی لیکن اس تکلیف کے باعث وہ اپنے بیٹے سے دور نہیں بھاگے گا بلکہ اپنے بیٹے کی محبت غالب ہونے کے باعث اسے بیٹے کی ظاہری حالت سے نفرت بھی محسوس نہیں ہو گی بلکہ اس بیماری کی موجودگی کے باوجود وہ اپنے بیٹے کو چومے گا، اپنے ساتھ لگائے گا۔ اس کی بنیادی وجہ صرف اس کے اور اس کے بیٹے کے درمیان موجود تعلق ہو گا۔ اب ہم اگر یہ فرض کریں کہ یہی بیماری کسی اجنبی بچے کو لاحق ہو جائے جس کا اس شخص کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو تو یہ شخص اسی بیماری کے باعث اس بچے سے دور بھاگے گا لہٰذا مومن اور کافر کے جسم میں موجود خون کی یہی کیفیت ہے۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا، جو لوگ انبیاءِ کرام کی دعوت کو قبول کر لیتے ہیں ان کی دو قسمیں ہوں گی۔ ایک وہ لوگ جنہوں نے انبیاء کی دعوت کو قبول کیا۔ ان پر ایمان لائے لیکن انہیں فتح نصیب نہ ہوئی۔ یہ عام مسلمان ہیں۔ دوسرے وہ لوگ جنہیں فتح بھی نصیب ہوئی۔ جن لوگوں کو فتح نصیب ہوئی ہو ان کی پھر دو قسمیں ہوں گی۔ ایک وہ جن کی فتح میں مسلسل ترقی ہوتی رہی اور دوسرے وہ فتح کے حصول کے بعد ایک

خاص مقام پر پہنچ کر ٹھہر گئے۔ جن لوگوں کی فتح میں اضافہ ہوتا رہا وہ ہر وقت ترقی کی منازل طے کرتے رہیں گے لیکن جو ایک مقام پر آ کر ٹھہر گئے ان کی کیفیت میں کمی ہو سکتی ہے۔ پھر آپ نے ایک مثال کے ذریعے ان لوگوں کے درمیان موجود فرق کی وضاحت بیان کی۔

فرض کریں دو فقیر ایک مال دار شخص کے گھر جاتے ہیں اور خیرات مانگتے ہیں وہ مال دار شخص دونوں کو ایک ایک درہم دے دیتا ہے۔ دونوں میں سے ایک فقیر اسی ایک درہم پر قناعت کر کے بیٹھ جاتا ہے جبکہ دوسرا دوبارہ دستِ سوال دراز کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ دس مرتبہ بھیک مانگتا ہے اور ہر مرتبہ اسے ایک درہم ملتا ہے۔ اب بالفرض وہ مالدار شخص ایسا ہے کہ اس کا خزانہ کبھی ختم نہیں ہوتا تو سائل جب تک اس سے مانگتا رہے گا تو مال دار شخص اسے دیتا رہے گا۔ یہی حال ان اولیاء کا ہے جو کبھی کسی ایک روحانی مقام پر نہیں ٹھہرتے بلکہ ان کے روحانی مقامات میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ جب موت ان کے دروازے پر دستک دیتی ہے تو انہیں موت کا بھی احساس نہیں ہوتا کیونکہ ان کی توجہ مکمل طور پر اللہ کی طرف مبذول ہوتی ہے غیر اللہ کا انہیں کوئی خیال نہیں ہوتا۔ اب کیونکہ موت بھی غیر اللہ ہے اس لیے انہیں اس کا بھی احساس نہیں ہوتا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) جس شخص کی روح اللہ کے راستے میں قبض ہو گی اسے معروف معنی کے مطابق موت نہیں آئے گی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلنا ہی موت کا بہترین علاج ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

نواں باب

فتح کے احکام

اس باب میں نورانی اور ظلمانی فتح سے متعلق گفتگو کی جائے گی۔ نورانی فتح کی مختلف اقسام کا تذکرہ ہوگا۔ عقل کی غیر موجودگی کے وصفِ مشترک کے باوجود احمق اور مجذوب کے درمیان بنیادی فرق کی وضاحت کی جائے گی اور جن لوگوں کو فتح نصیب ہوتی ہے ان کے متعلق دیگر جزئیات کا ذکر ہوگا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس کتاب میں بہت سے مقامات پر فتح کا تذکرہ کیا گیا ہے ان میں سے ہر ایک واقعہ اپنے مخصوص باب سے کوئی نہ کوئی مناسبت رکھتا تھا اس لیے تکرار سے بچنے کی خاطر ان کا اعادہ نہیں کیا جائے گا۔ اس لیے آپ انہی مقامات کو دوبارہ ملاحظہ کرلیں اور بطور خاص جہاں درج ذیل آیات مبارکہ کی تفسیر بیان کی گئی تھی۔

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ۝

(آل عمران' ۳:۴۲)

''اور جب فرشتوں نے مریم سے کہا، بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہیں منتخب کرلیا ہے اور تمہیں پاک کر دیا ہے۔ تمہیں تمام جہانوں کی عورتوں میں سے منتخب کرلیا ہے۔''

وہاں اس بات کی وضاحت کی گئی تھی کہ جس شخص کو فتح نصیب ہوتی ہے اسے ظلمتوں سے معمور کون' کون سے باطل اور فانی امور یا نورانیت سے معمور ثابت اور باقی امور کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس لیے ان تفاصیل کو ایک مرتبہ دوبارہ ملاحظہ کرلیں۔ اس کے علاوہ پانچویں باب میں، جہاں حالتِ بیداری میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کے مسئلے پر گفتگو کی گئی ہے وہ بہت نفیس گفتگو ہے۔ اسے بھی ایک مرتبہ دیکھ لیں اسی طرح درج ذیل حدیث کی شرح میں اہلِ کمال کی فتح کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

ان هذا القرآن انزل على سبعة احرف. (صحیح بخاری' ۶:۲۵۴۱' رقم: ۶۵۳۷)

''اس قرآن کو سات حروف پر نازل کیا گیا ہے''

اہل ظلمت کی فتح

اس باب میں فتح سے متعلق صرف وہ تفاصیل پیش کی جائیں گی جو اس سے پہلے بیان نہیں کی گئی ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے سیّدی عبدالعزیز دباغ سے دریافت کیا، سقراط، بقراط، افلاطون، جالینوس اور دوسرے فلسفی جو سب کے سب کافر تھے انہوں نے افلاکیات کے بارے میں بہت سے ایسے امور بیان کیے ہیں جو غیب سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ یہ حواس کے دائرہ کار سے باہر ہوتے ہیں اور محض عقل کے ذریعے ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ مثلاً قمر فلک اوّل میں، عطارد فلک دوم میں، زہرہ فلک سوم میں، شمس فلک چہارم میں، مریخ فلک پنجم میں، مشتری فلک ششم میں اور زحل فلک ہفتم میں موجود ہے یا اس کے علاوہ دیگر بنیادی معلومات۔ بعض لوگ اس بات کے دعویدار ہوتے ہیں کہ یہ تفاصیل اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے اپنے بعض انبیاء پر نازل کی تھیں۔ بعض حضرات نے اس بارے میں حضرت ادریس علیہ السلام کا نام لیا ہے لیکن یہ نسبت مشکوک ہے کیونکہ ان فلسفیوں اور حضرت ادریس علیہ السلام کے درمیان زمانی اعتبار سے ایک بہت بڑا فاصلہ موجود ہے اس لیے اگر یہ امور واقعی حضرت ادریس علیہ السلام نے بیان کیے ہوں تو ان کی سند مشکوک ہوگی کیونکہ سند میں تواتر ممکن نہیں ہے اور خبر واحد قابل اعتبار نہیں ہوسکتی کیونکہ اس خبر واحد کے نقل کرنے والے اگر فلاسفہ ہوں گے تو وہ کافر ہوں گے اور خبر واحد صرف ثقہ راوی کی مقبول ہوگی لیکن بالفرض وہ راوی فلسفی نہیں ہے تو پھر یہ طے نہیں کیا جاسکتا کہ کیا وہ مسلمان ہے یا غیر مسلم ہے؟

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا، اللہ تعالیٰ نے حق اور نور کو پیدا کیا ہے اور ان دونوں کے لیے ان کے اہل پیدا کیے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ظلمت اور باطل کو بھی پیدا کیا ہے اور ان دونوں کے لیے ان کے اہل پیدا کیے ہیں۔ چنانچہ اہلِ ظلمت کو ظلمت اور اس سے متعلق دیگر تمام امور کی فتح نصیب کی جاتی ہے۔ جیسے اہلِ حق کو حق اور اس سے متعلق امور کی فتح عطا کی جاتی ہے۔ درج ذیل امور کو حق کی اقسام قرار دے سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا، اس کے ربّ ہونے کا اقرار کرنا، اس بات کی تصدیق کرنا کہ اللہ تعالیٰ جو چاہے وہ پیدا کرسکتا ہے۔ اسے ہر قسم کا اختیار حاصل ہے۔ انبیاء اور فرشتوں پر ایمان لانا اور ہر اس چیز پر ایمان لانا جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوسکتی ہے جبکہ درج ذیل امور ظلمت شمار ہوں گے۔ ان میں کفر اور ہر وہ چیز شامل ہوگی جو اللہ تعالیٰ سے لاتعلقی کا باعث بنے اور جو چیزیں اللہ تعالیٰ سے لاتعلقی کا باعث بنتی ہیں ان میں بذاتِ خود دنیا اور اس کے حوادث و متعلقات بھی شامل ہیں۔ دنیا کی مذمت کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہی فرمان کافی ہے۔

الدنیا ملعونۃ، ملعون مافیھا الا ذکر اللّٰہ وما والاہ۔ (جامع ترمذی ۴: ۵۶۱، رقم: ۲۳۲۲)

"دنیا ملعون ہے، اللہ کے ذکر اور اس کے متعلقات کے سوا، اس میں موجود سب کچھ ملعون ہے"

"حق" اللہ تعالیٰ کے انوار میں سے ایک نور ہے اور یہ نور اہلِ حق کو عطا کیا جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں معرفت کے انوار اہلِ حق کی شخصیتوں میں چمک اٹھتے ہیں جبکہ باطل ایک ظلمت ہے جس کی وجہ سے عقل تاریکی

میں ڈوب جاتی ہے اور بصارت اندھی ہو جاتی ہے سماعت کو حق سننے کا چارہ نہیں رہتا بلکہ اہلِ ظلمت کی عقلوں میں کوئی حق بات نہیں سما سکتی اور نہ ہی انہیں حق بات کا خیال آ سکتا ہے۔ ان کے نزدیک حق کی مثال ایک ایسی شئے کی مانند ہے جو گویا وجود ہی نہیں ہے۔ لہٰذا یہ لوگ حق سے اسی طرح غافل ہوتے ہیں جیسے عقل مند کسی معلوم چیز سے غافل ہوتے ہیں۔ اسی لیے اہلِ باطل کو آسمانِ دنیا اور زمین سے متعلق بہت سے امور کا مشاہدہ حاصل ہوتا ہے تاہم ان کا مشاہدہ صرف ان فانی امور سے متعلق ہوتا ہے جو حادث سیارگان اور ان کی ہیئت سے تعلق رکھتے ہیں۔ جیسے علمِ نجوم میں یہ بات ذکر کی جاتی ہے کہ فلاں ستارے کا مقام فلاح فلک ہے۔ نیز اگر فلاں کا قِر ان فلاں ستارے کے ساتھ ہوگا تو اس کا یہ نتیجہ سامنے آئے گا یا عربی زبان برج عقرب سے منسوب ہے اور فارسی زبان مریخ سے متعلق ہے۔

لیکن روضۂ مبارک، وہاں سے نکل کر قبۂ برزخ تک جانے والا نور، اولیاءِ کاملین کی شخصیات، قبروں میں موجود عام اہلِ ایمان، فرشتوں اور ان تمام اسرار کا مشاہدہ نصیب نہیں ہوتا جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ تک پہنچنے کا وسیلہ بن سکتے ہیں۔ اگرچہ یہ سب ہماری اسی دنیا میں موجود ہیں لیکن ان اہلِ ظلمت کو ان کا مشاہدہ نصیب نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ باتیں ان کی عقل میں آ سکتی ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ظلمت ان کے اندر گھر کر چکی ہوتی ہے اور یہ لوگ حق سے بالکل لاتعلق ہو چکے ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر کسی اہلِ باطل کو کسی تختی پر قرآن کی آیات لکھی ہوتی نظر آ جائیں تو اگرچہ وہ آیات بہت سی بیماریوں کی شفا کا باعث بنتی ہیں لیکن ان اہلِ باطل کی توجہ آیات کی اس خصوصیت کی طرف مبذول نہیں ہوگی بلکہ وہ صرف تختی کے جسم تک متوجہ رہے گا۔ اسی طرح اہلِ ظلمت آسمانوں میں موجود اللہ تعالیٰ کے اسرار کا مشاہدہ نہیں کر سکتے، کسی فرشتے کو نہیں دیکھ سکتے، اس کی تسبیح کی آواز نہیں سن سکتے، جنت، قلم، لوح، قلم سے نکلنے والے حروف وغیرہ ان تمام چیزوں کے انوار کا مشاہدہ نہیں کر سکتے یہاں تک کہ اپنے خالق کی معرفت بھی حاصل نہیں کر سکتے۔

مختصر الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی ذات سے محجوب کر دیا ہے بلکہ ہر اس چیز سے بھی محجوب کر دیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات تک پہنچنے کا وسیلہ بن سکتی ہے اور ان کے سامنے ہر اس چیز کو واضح کر دیا ہے جو درحقیقت ان کے لیے نفع کی بجائے نقصان کا باعث بنتی ہے۔ لہٰذا فلسفیوں کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ فلاں ستارے کی فلاں حرکت کی وجہ سے یہ ہوتا ہے کیونکہ انہوں نے امور کو ستاروں سے منسوب کر دیا ہے حالانکہ اصل تصرف اللہ تعالیٰ کی مشیت کا ہے جو ان ستاروں کا خالق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان نقل کیا ہے۔ (اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے)

اصبح من عبادی مومن بی کافر، فامامن قال: مطرنا بفضل اللہ وبرحمته فذلك مومن بی کافر بالکوکب، وامامن قال: مطرنا بنوءِ کذا وکذا فذلك کافر بی ومؤمن بالکوکب۔ (صحیح بخاری ۱: ۲۹۰ رقم ۸۱۰)

"بعض بندے مجھ پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض میرا انکار کرتے ہیں۔ جو شخص یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل اور رحمت کے باعث ہم پر بارش نازل کی ہے تو ایسا شخص مجھ پر ایمان رکھتا ہوگا اور ستاروں کا منکر ہوگا اور جو یہ کہے کہ فلاں ستارے کی وجہ سے ہم پر بارش نازل ہوئی ہے تو ایسا شخص میرا منکر ہوگا اور ستاروں کا قائل ہوگا۔"

لہٰذا اللہ تعالیٰ نے فلسفیوں کو اپنی ذات سے اور اپنی معرفت سے محجوب کر دیا ہے اور ان کی عقل کو ستاروں کی طرف متوجہ کر دیا ہے تاکہ وہ ان ستاروں کی مشاہدے میں ہی مشغول رہیں۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے مطابق (انہیں جہنم کا ایندھن بنادے)۔ اگرچہ ستاروں کی حرکات سے متعلق جو قواعد بیان کیے گئے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ نظام سے متعلق ہوتے ہیں لیکن ان میں کچھ غلط ہیں اور کچھ درست ہیں۔

اہل حق کی فتح کی اقسام

اہلِ حق کو دو طرح کی فتح نصیب ہوتی ہے۔ پہلی قسم اس فتح کی ہے جو اہلِ ظلمت کو دنیا اور اس کے متعلقات سے آگاہی کی صورت میں نصیب ہوتی ہے لیکن ولی کی ساتوں زمینوں اور ساتوں آسمانوں اور ان میں جو کچھ موجود ہے، سب کا مشاہدہ حاصل ہوتا ہے اور ایسا صاحبِ فتح ان تمام امور کا مشاہدہ بھی کرتا ہے جو لوگ اپنے گھروں میں سرانجام دیتے ہیں۔ تاہم اس مشاہدے کا تعلق ظاہری بصارت کی بجائے روحانی بصیرت کے ساتھ ہے جس کے سامنے کوئی پردہ یا دیوار حائل نہیں ہوسکتے۔ اسی طرح یہ صاحبِ فتح ان واقعات کا بھی مشاہدہ کرتا ہے جو آئندہ زمانے میں پیش آئیں گے مثلاً فلاں مہینے یا فلاں سال میں ہوگا۔ ایسی فتح ایک مخصوص حد تک اہلِ ظلمت کے مشاہدات سے مشابہت رکھتی ہے اسی لیے یہ کہا جاتا ہے۔

الكشف اضعف درجات الولايه.

"کشف ولایت کا سب سے کمزور درجہ ہے۔"

کیونکہ یہ عام طور پر اہلِ حق کی بجائے اہلِ باطل کے ہاں پایا جاتا ہے اور جو شخص صرف اسی کا ہو کے رہ جائے اس کے بارے میں اندیشہ باقی رہتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے لاتعلق ہو جائے گا اور اہلِ ظلمت میں شامل ہو جائے گا۔ یہ اندیشہ اس وقت ختم ہوتا ہے جب یہ صاحبِ فتح اس مقام سے ترقی کر کے اگلے مرتبے پر فائز ہوتا ہے۔

دوسری فتح یہ ہے کہ صاحبِ فتح کو اللہ تعالیٰ کے اسرار کا مشاہدہ نصیب ہو وہ اسرار جنہیں اہلِ ظلمت نہیں دیکھ سکتے۔ لہٰذا ایسا صاحبِ فتح اولیاء کاملین کا مشاہدہ کرتا ہے اور ظاہری دوری کے باوجود ان سے اس طرح گفتگو کرتا ہے جیسے وہ اس کے پاس موجود ہیں۔ اسی طرح وہ قبروں پر موجود عام مسلمان کی عام ارواح کا مشاہدہ کرتا ہے۔ کراماً کاتبین اور دیگر فرشتوں کا مشاہدہ کرتا ہے۔ برزخ اور اس میں موجود مرحومین کی ارواح کا مشاہدہ کرتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر مبارک کی زیارت کا شرف حاصل کرتا ہے اور اس نور کا مشاہدہ کرتا ہے جو قبر انور سے نکل کر سیدھا قبہ برزخ تک جاتا دکھائی دیتا ہے۔ پھر جب اسے حالت بیداری نبی اکرم صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم کی مستقل زیارت کا شرف حاصل ہو جائے تو وہ شیطان کے حملوں سے محفوظ ہو جاتا ہے کیونکہ اب وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت یعنی نبی اکرم صلی الہ علیہ وآلہ وسلم کی پناہ میں آ چکا ہے۔

پھر بارگاہِ رسالت کی مستقل حاضری، معرفت الٰہیہ کے حصول کا سبب بنتی ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کی ازلی ذات کا مشاہدہ نصیب ہوتا ہے کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس مکمل طور پر مشاہدۂ حق میں مستغرق ہے۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی برکت سے اس صاحب فتح ولی کو بھی مستقل طور پر مشاہدۂ حق نصیب ہوتا ہے اور اس میں مسلسل ترقی ہوتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ مشاہدے کے ساتھ ساتھ اسے معرفت کے اسرار اور محبت کے انوار بھی نصیب ہوتے ہیں۔ یہی فتح کی دوسری قسم ہے جو اہلِ حق اور اہلِ باطل کے درمیان امتیاز کا باعث بنتی ہے۔ جہاں تک فتح کی پہلی قسم کا تعلق ہے تو وہ اہلِ حق کی طرح اہلِ باطل کو بھی عطا کی جاتی ہے جس کی وجہ سے صاحب فتح کو فانی امور کا مشاہدہ نصیب ہوتا ہے اور وہ ان فانی امور میں تصرف بھی کرسکتا ہے۔ للہذا عین ممکن ہے کہ کوئی اہلِ باطل ہمیں پانی پر چلتا ہوا، ہوا میں اڑتا ہوا، غیب سے رزق حاصل کرتا ہوا دکھائی دے حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کا منکر ہو گا۔ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے نور پیدا کیا تو اس نور سے فرشتے بھی پیدا کیے جو اہلِ نور کی مدد کرتے ہیں۔ اسی طرح جب ظلمت کو پیدا کیا تو اس سے کچھ شیاطین بھی پیدا کیے جو مختلف طرح کے کرتب دکھانے میں اہلِ باطل کی مدد کرتے ہیں اور ان کی گمراہی میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔

سیّد ابراہیم الخواص رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں، اسی اصول کے تحت ہم اس واقعے کو سمجھ سکتے ہیں جو مشہور صوفی بزرگ حضرت ابراہیم الخواص رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ پیش آیا۔ ایک مرتبہ کشتی میں سفر کے دوران ان کا ایک یہودی سے تعارف ہوا۔ یہودی نے کہا اگر تمہارا دین سچا ہے تو مجھے پانی پر چل کے دکھاؤ؟ وگرنہ میں تمہیں چل کے دکھاتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ یہودی اٹھا اور اس نے پانی پر چلنا شروع کر دیا۔ سیّدی ابراہیم الخواص نے خود سے کہا، اگر یہ یہودی مجھ پر غالب آ گیا تو یہ میرے لیے بے عزتی کی بات ہوگی یہ کہہ کر آپ نے بھی پانی پر پاؤں رکھا اور اسی طرح چلنے لگے جیسے یہودی چل رہا تھا۔ پھر دونوں حضرات سمندر کے باہر آ گئے۔ یہودی نے فرمائش کی میں آپ کے ساتھ سفر کرنا چاہتا ہوں۔ سیّدی ابراہیم الخواص نے رضامندی ظاہر کر دی۔ یہودی نے شرط عائد کی اس سفر کے دوران ہم کسی مسجد میں داخل نہیں ہوں گے کیونکہ مجھے مسجد پسند نہیں ہے۔ اسی طرح کسی ''گرجا گھر'' میں بھی داخل نہیں ہوں گے کیونکہ اسے تم پسند نہیں کرو گے اور ہم کسی شہر میں بھی داخل نہیں ہوں گے کیونکہ لوگ کہیں گے کہ ایک یہودی اور ایک مسلمان کیوں ایک دوسرے کے دوست بن گئے ہیں۔ ہم صرف ویرانوں اور جنگلوں میں سفر کریں گے۔ ہمارے پاس کوئی سامان نہیں ہو گا۔ چنانچہ یہ دونوں حضرات سفر پر روانہ ہوئے اور تین دن تک کچھ نہیں کھایا۔ تین دن بعد وہ ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک کتا آیا جس کے منہ میں تین

روٹیاں موجود تھیں اس نے وہ روٹیاں یہودی کے سامنے ڈالیں اور واپس چلا گیا۔ سیّدی ابراہیم الخواص فرماتے ہیں اس یہودی نے مجھے کھانے کی دعوت دی لیکن میں بھوکا رہا۔ یہاں تک کہ کچھ دیر بعد ایک خوبصورت نوجوان میرے پاس آیا جو خوشبو میں بسا ہوا تھا اس کا چہرہ بہت خوبصورت تھا۔ انسان اسے دیکھتا رہ جائے۔ اس کے ہاتھ میں اسی کی مانند بہترین کھانا موجود تھا۔ اس نے وہ کھانا میرے سامنے رکھا اور واپس چلا گیا۔ میں نے یہودی کو کھانے کی دعوت دی لیکن اس نے انکار کر دیا۔ (کچھ دیر بعد) یہودی کہنے لگا اے ابراہیم! تمہارا اور میرا دونوں کا دین حق ہے اور ان دونوں میں سے کسی ایک کے ذریعے بھی منزلِ مقصود تک پہنچا جا سکتا ہے لیکن تمہارا دین زیادہ بہتر ہے۔ اس لیے میں اس میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔ سیّدی ابراہیم الخواص فرماتے ہیں اس کے بعد اس نے اسلام قبول کر لیا اور وہ علم تصوف کے ماہرین میں سے ایک بڑا ماہر بنا۔"

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) حافظ ابو نعیم اصفہانی نے اپنی کتاب "حلیۃ الاولیاء" میں سیّدی ابراہیم الخواص کے حالات کے ضمن میں یہ واقعہ نقل کیا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے سیّدی عبدالعزیز دباغ سے اس طرح کے غیر مسلم عبادت گزاروں کے بارے میں دریافت کیا، تو آپ نے ارشاد فرمایا ان کے کرتبوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ شیاطین انہیں بے وقوف بناتے ہیں اور یہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید ان کے عبادت حق ہے اور اسی عبادت کے نتیجے میں انہیں کمال حاصل ہوا ہے۔ اس کے بعد حضرت نے مذکورہ بالا تفصیلی گفتگو کے ذریعے اہلِ حق اور اہلِ باطل کے احوال کے درمیان موجود فرق کی وضاحت کی۔ جس کے بعد مزید وضاحت کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔

علم فلسفہ وفلکیات کی اصل

ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا، علمِ فلسفہ اور علمِ فلکیات اور ان جیسے علوم کی اصل یہ ہے کہ ایک شخص حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لایا اور اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبانی ان مشاہدات کے بارے میں سنا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آسمانوں اور زمین میں ملاحظہ کیے تھے۔ یہاں تک کہ اس شخص کو بھی (ایک خاص حد تک) ان کے بارے میں فتح نصیب ہو گئی لیکن اس نے اسی فتح پر قناعت کی اور اللہ تعالیٰ سے لاتعلق ہو کر دنیا و آخرت میں خسارے کا شکار ہو گیا۔ یہ شخص دنیا اور اس سے متعلق امور کا مشاہدہ کر کے خوش ہوتا تھا اسی نے سب سے پہلے سیاروں کے مخصوص مقامات اور ان سے متعلق دیگر احکام کو بیان کیا۔ یہ شخص آخر کار دین ابراہیمی سے پھر گیا لیکن اس کے شاگردوں نے اس سے حاصل شدہ معلومات کو آگے منتقل کیا۔ یہاں تک کہ وہ یونانی فلسفیوں تک پہنچ گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس شخص پر شدید غضب نازل کیا کیونکہ اس نے لوگوں کو غیر اللہ کی طرف راغب کر دیا تھا اور جو شخص دوسروں کو غیر اللہ کی طرف راغب کر دے وہ انہیں اللہ تعالیٰ سے لاتعلق کر دیتا ہے۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں نبوت اور رسالت کا بنیادی فائدہ یہی ہے کہ ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ یہ بات اگرچہ ناممکن ہے لیکن ہم فرض کر لیتے ہیں کہ ایک شخص کو اللہ

تعالیٰ مرتبہ نبوت پر فائز کرتا ہے اور پھر وہ شخص اللہ کی طرف رہنمائی کرنے کی بجائے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے اور انہیں اللہ تعالیٰ سے لاتعلق کر دیتا ہے۔تو اس کا حکم بھی اسی شخص کی مانند ہوگا جس نے لوگوں کو ستاروں کی طرف متوجہ کیا تھا۔ یہ بات اگرچہ محال ہے کہ کسی نبی سے ایسے فعل کا صدور ہو لیکن ہم نے مبالغے کے طور پر یہ خیال بیان کیا ہے تاکہ قارئین کو اس بات کا احساس ہو سکے کہ کسی کو غیر اللہ کی طرف راغب کرنا کتنا بڑا گناہ ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک دن میں سیّدی عبدالعزیز دباغ کے ہمراہ شہر ''فاس'' کے ایک دروازے باب الحدید کے پاس موجود پل کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ سیّدی دباغ نے دریافت کیا اس پل کا کیا فائدہ ہے؟ میں نے جواب دیا اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے انسان ڈوبے بغیر دریا کے دوسری طرف پہنچ جاتا ہے۔ آپ نے دریافت کیا بالفرض اگر ہمیں اس پل کے ذریعے یہ فائدہ حاصل نہیں ہو تو کیا اس پل کا وجود ہمارے لیے بے کار ہوگا؟ میں نے عرض کی، جی ہاں۔ آپ نے فرمایا بالکل اسی طرح (بالفرض محال) اگر انبیاء، اولیاء اور فرشتے لوگوں کی اللہ تعالیٰ کی طرف رہنمائی نہیں کرتے تو وہ بھی اس پل کی طرح ہوں گے۔

کشف اور اولیاء کاملین

سیّدی عبدالعزیز دباغ ارشاد فرماتے ہیں کامل اولیاءِ کرام آئندہ آنے والے واقعات کے بارے میں گفتگو کرنے کو پسند نہیں کرتے کیونکہ یہ مشاہدے کی ابتدائی کیفیت ہے۔ جب انہیں اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ نصیب نہیں ہوا تھا اس وقت وہ گزشتہ و آئندہ کا مشاہدہ کیا کرتے تھے لیکن جب انہیں مشاہدہِ حق نصیب ہو گیا تو اب پہلا مشاہدہ ان کے نزدیک باطل ہوگا۔ اس لیے وہ اسے یا اس کے بارے میں گفتگو کو پسند نہیں کرتے۔ نیز دنیا اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے اور جو چیز اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہو یہ حضرات بھی اسے پسند نہیں کرتے۔ بالفرض اگر کبھی انہیں اس موضوع پر گفتگو کرنا پڑ جائے تو یہ اپنے مقام سے اتنا نیچے آ کے گفتگو کرتے ہیں جیسے کوئی اوجِ ثریا سے اتر کر تحت الثریٰ میں آ کر گفتگو کرے کیونکہ دنیاوی معاملات بھی ایک لحاظ سے ظلمت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ اولیاءِ کاملین کو اللہ تعالیٰ کے انوار کے ذریعے مشاہدہ نصیب ہوتا ہے اور یہ انوار زمان و مکان کے پابند نہیں ہوتے اس لیے اس مقام پر آ کر ماضی، حال اور مستقبل کے درمیان کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا کسی ولی کو نورِ حق کے ذریعے صرف اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ فلاں واقعہ یقینی طور پر رونما ہوگا لیکن اس کا مخصوص دن اور وقت کیا ہوگا؟ اس کا جواب اس وقت مل سکتا ہے جب وہ نیچے اتر کر اس مقام پر آ جائیں جہاں وقت کی تقسیم شروع ہوتی ہے اور یہ مقام نورِ حق کے مقابلے میں ظلمت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی مثال بالکل اسی طرح ہوگی جیسے سورج آسمان سے زمین پر نازل ہو اور کسی آئینے کے سامنے بیٹھ کر اس آئینے میں موجود سورج کو دیکھنے لگے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے عرض کی اللہ تعالیٰ کو تمام واقعات، زمانی ترتیب کے ہمراہ معلوم ہیں۔ ماضی و حال و مستقبل کی ہر بات سے وہ آگاہ ہے۔ ولی چونکہ نورِ حق کی مدد سے مشاہدہ کرتا ہے اس لیے اصولی طور

پر درجہ ظلمت تک اترے بغیر اسے ان امور کے مخصوص وقت کا علم حاصل ہونا چاہیے۔ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا، اللہ تعالیٰ کا علم ہر شئے پر محیط ہے۔ اس لیے ہر بات اس کے علم میں موجود ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ قوی ہے اور بندہ کمزور ہے۔ بندے کو اللہ تعالیٰ پر قیاس نہیں کیا جاسکتا یہی وجہ ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کر کے یہ ارشاد فرمایا تھا:

"میرا اور تمہارا علم اللہ تعالیٰ ک علم کے سامنے وہ حیثیت بھی نہیں رکھتے جو سمندر کے سامنے پانی کے اس قطرے کی ہے جو اس چڑیا نے پیا ہے۔"

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں، کوئی بھی ولی اپنے مقام سے خاصا نیچے اتر کر آئندہ آنے والے واقعات کی خبر دیتا ہے۔ یہ عمل گناہ نہیں ہے لیکن روحانی اعتبار سے آپ اسے ایک خامی قرار دے سکتے ہیں۔

اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روحانی مرتبہ و مقام کا خیال کیا جائے تو بھی یہ بات بے ادبی شمار ہوگی کیونکہ آپ جیسا مرتبہ و مقام اور کسی کو حاصل نہیں ہوا۔ تاہم بیشتر اولیاءِ کرام جب مستقبل کی بات کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو وہ صرف تقدیر کے تابع ہوتی ہے۔ اولیاء چونکہ اللہ تعالیٰ کا مظہر ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ ایسی باتوں کو ان کے زبان پر جاری کر دیتا ہے۔

عام لوگوں کی غلط فہمی

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) بہت سے لوگوں کو اولیاءِ کرام کی صحبت کے نتیجے میں اسی لیے نقصان کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ انہیں اہلِ حق اور اہلِ ظلمت کی فتح کے درمیان فرق کا اندازہ نہیں ہوتا اور وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ شاید کشف اور خرقِ عادت ہی کمال کی دلیل ہے۔ لہٰذا وہی شخص ولی اللہ ہوگا جس کے ذریعے کشف اور کرامت کا ظہور ہوگا۔ اس لیے بعض لوگ اس غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ شاید کشف ہی ولایت کی انتہا ہے۔ بعض لوگ اس بات کے قائل ہو جاتے ہیں کہ جو شخص ظاہری طور پر ہمیشہ عبادت و ریاضت میں مشغول رہے وہی ولی کامل ہے اگرچہ اس شخص کا باطن (درحقیقت) حق سے خالی اور غیر اللہ کی طرف متوجہ ہو۔ اس لیے بھی ولی کی صحبت سے اس وقت نقصان ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کو کسی کامل ولی کی بارگاہ میں حاضر ہونے کی توفیق عطا کرے اور پھر وہ شخص اس کامل ولی کے بارے میں الٹ سوچ اختیار کرلے کیونکہ ولی کی صحبت اختیار کرنے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے پروردگار کی معرفت حاصل کرے اور ہر اس چیز سے بچنے کی کوشش کرے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے لاتعلقی کی صورت پیدا ہوسکتی ہے اور ان میں سب سے بڑی چیز دنیا اور اس میں موجود اشیاء کی محبت ہے۔ لہٰذا جب کوئی انسان ایک طویل عرصے تک کسی ولی کی خدمت میں رہتے ہوئے صرف دنیا کے حصول کا خواہش مند رہے اور اللہ تعالیٰ کی معرفت کے بارے میں کبھی کچھ دریافت نہ کرے تو ولی اس سے ناراض ہو جاتا ہے۔ اس لیے ایسے شخص پر اگر کوئی مصیبت نازل ہو تو یہ اس کی بہت بڑی خوش قسمتی ہوگی۔ اس ناراضگی کے بہت سے اسباب ہیں۔

ولی کی ناراضگی کے اسباب

ایک وجہ یہ ہے کہ وہ شخص اس ولی سے اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لیے محبت نہیں کرتا بلکہ اس کی محبت ذاتی غرض کی وجہ سے ہے اور یہ محبت انتہائی نقصان دہ ہوتی ہے کیونکہ اس کی موجودگی میں شیطانی حملے اور وسوسے سامنے آتے ہیں اور ایسے شخص کو کبھی بھی حق کا نور نصیب نہیں ہوتا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ جب ولی یہ دیکھتا ہے کہ دنیا کے ساتھ تعلق رکھنے کی وجہ سے اس شخص کا باطن اللہ تعالیٰ سے لاتعلق ہو چکا ہے تو وہ اس کے باطن میں موجود اس لاتعلقی کو ختم کرنا چاہتا ہے جبکہ وہ شخص (مزید دنیا کے حصول کے ذریعے) اس میں اضافے کا خواہش مند ہوتا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اگر ولی اس شخص کے سامنے اپنے کشف یا کرامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی کوئی حاجت پوری کردے تو وہ شخص اس غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے کہ ولی کا مقصد صرف دنیاوی حاجت کی تکمیل ہے۔ حالانکہ یہ سوچ بالکل غلط ہے۔

ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا، ولی کی مثال ایک فنکار کی مانند ہے اس کے پاس اگرچہ بہت سا مال و دولت موجود ہو لیکن اس کی توجہ اس مال و دولت کی بجائے صرف اپنے فن کی طرف مبذول ہو اور وہ اس بات کا خواہش مند ہو کہ ہر شخص اس کے ساتھ اس کے فن کے بارے میں تبادلۂ خیال کرے۔ فن کے علاوہ کسی اور موضوع پر گفتگو اسے اتنی ناپسند ہو کہ اس بات کا اندیشہ موجود ہو کہ فن کے علاوہ کسی اور موضوع پر گفتگو کرنے والے شخص کو کہیں اس سے نقصان نہ پہنچ جائے پھر اس کے پاس دو شخص آئیں اور انہیں اس فنکار کی اس طبیعت کے بارے میں پتہ ہو لیکن ان دونوں کی یہ خواہش ہو کہ ہم اس فنکار سے اس کی دولت حاصل کریں گے۔ تو دونوں میں عقل مند وہی شخص ہوگا جو اس فنکار سے اس کے فن کے بارے میں گفتگو کرے تاکہ فنکار اس سے مانوس ہو جائے اور محبت کرنے لگے، پھر اگر وہ فنکار سے کچھ رقم طلب کرے گا تو وہ باآسانی وہ رقم فراہم کر دے گا لیکن وہ شخص انتہائی احمق ہوگا جو آنے کے فوراً بعد رقم کے حصول کے لیے دستِ سوال دراز کر دے۔ اب اگر وہ فنکار طیش میں آ کر اس کے سر میں کوئی چیز مار کر اس کا سر نہیں پھوڑتا تو یہ اس شخص کی خوش قسمتی ہوگی۔

ولی کی مثال بھی اسی طرح ہے اس کا تمام فن صرف اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس سے متعلق دیگر اشیاء کی تعلیم و [illegible]ت پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ ولی کو اور کسی بات کی ہوش نہیں ہوتی اور اس کے علاوہ وہ اور کسی موضوع پر گفتگو کرنا چاہتا۔ اس کے علاوہ اس کی کوئی خواہش اور کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ لہٰذا جو شخص یہ بات پیشِ نظر رکھے گا وہ [illegible]رت میں بہت سے فوائد حاصل کرے گا اور جو اس کا خیال نہیں رکھے گا اس کا معاملہ برعکس ہوگا۔

یہ دنیاوی معاملات باطل ہیں؟

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا باطل اس چیز کو کہتے ہیں جس کی کوئی حقیقت نہ ہو لیکن

دنیاوی معاملات کا ہم اپنی آنکھوں کے ذریعے مشاہدہ کرتے ہیں اور دیگر حواس کے ذریعے بھی ان سے آگاہی حاصل کرتے ہیں تو پھر دنیاوی معاملات کو کس طرح باطل قرار دیا جا سکتا ہے؟

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے سامنے موجود دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا، کیا ہمیں یہ دیوار نظر نہیں آ رہی؟ حالانکہ یہ فنا ہو جائے گی لیکن ہم اس کے خالق کو نہیں دیکھ سکتے۔ جس نے اسے پیدا کیا ہے اور اس کا وجود برقرار رکھا ہے۔ حالانکہ وہ ہمیشہ زندہ رہے گا اس پر کبھی فنا طاری نہیں ہوگی اور وہ ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ وہ ہمارا مالک ہے اور جس طرح چاہے ہمارے وجود کے اندر تصرف کر سکتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی ذات کے مقابلے میں دنیا کے مشاہدے کی حیثیت نہ ہونے کے مترادف ہوگی۔ گویا ہم یہاں نظریۂ اضافت کو سامنے رکھ رہے ہیں یعنی جو چیز بظاہر ہمارے مشاہدے میں موجود ہے وہ اس چیز کے مقابلے میں معدوم کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کا ہم بظاہر مشاہدہ نہیں کر رہے اور ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ جب تک الفاظ سمجھ میں نہ آئیں اس وقت تک تحریر کا مشاہدہ بے کار ہوگا۔ لہٰذا جس شخص پر رحم کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ اسے فتح نصیب کرتے ہوئے اپنی ذات، صفات اور افعال کا مشاہدہ عطا کرے تو اس کا تعلق اس ربّ کے ساتھ ہو جائے گا جس کی قربت کے بعد ایسی زندگی نصیب ہوتی ہے کہ اس کے بعد موت کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی اور نہ ہی آخرت میں کسی قسم کی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ جب کسی ''فانی'' کا تعلق ''باقی'' کے ساتھ ہو جائے گا تو (بالواسطہ طور پر) وہ فانی بھی باقی ہو جائے گا۔ اس سے پہلے بھی ہم اس نکتے کی وضاحت کر چکے ہیں۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں، فتح کی پہلی قسم اگرچہ اہلِ حق اور اہلِ باطل کے درمیان مشترک ہوتی ہے لیکن دونوں کے مقصد میں بنیادی فرق پایا جاتا ہے۔ اہلِ باطل اس فتح کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے اور دور ہو جاتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ان سے ناراض ہو کر، انہیں اپنی ذات سے لاتعلق کر دیتا ہے اور ان کے قلوب کو دوسری چیزوں کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ انہیں مختلف طرح کے ظاہری کمالات عطا کرتا ہے تاکہ وہ اسی غلط فہمی کا شکار رہیں کہ وہ کسی مرتبے پر فائز ہیں جبکہ اہلِ حق اس فتح کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ سے زیادہ محبت کرنے لگتے ہیں اور ان کے درجات میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انہیں فتح نصیب ہوتی ہے تو ان کی نگاہوں کے سامنے سے حجابات ہٹتے چلے جاتے ہیں اور ان کے قلوب اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس وقت اللہ تعالیٰ انہیں بھی خوارق عطا فرماتا ہے تاکہ ان کی بصیرت مضبوط ہو اور معرفت پختہ ہو جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّهُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰی رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ (التوبۃ ۹:۱۲۴)

''جو لوگ ایمان لائے (قرآن کی آیات) ان کے ایمان میں اضافہ کر دیتی ہیں اور وہ ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہیں لیکن جن کے قلوب میں بیماری موجود ہو ان کی غلاظت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ کفر کی حالت میں مرتے ہیں۔''

ولایت و کشف کی کمی و بیشی

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں، بعض اوقات کسی کم مرتبے کے مالک ولی کو دنیاوی معاملات میں کامل اولیاء سے زیادہ کشف حاصل ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کامل ولی ہر وقت مشاہدۂ حق میں مشغول ہوتا ہے لیکن کم مرتبے کے مالک ولی کی قوتِ پرواز صرف دنیاوی امور کے مشاہدے تک محدود ہوتی ہے۔ اگرچہ (ایک خاص حد تک) اسے بھی مشاہدۂ حق نصیب ہوتا ہے لیکن کامل ولی کے مقابلے میں یہ کم ہوتا ہے۔ گویا کامل ولی کا مشاہدہ حق مضبوط اور مشاہدہ خلق کمزور ہوتا ہے لیکن کم مرتبے کے مالک ولی کا مشاہدہ خلق مضبوط اور مشاہدہ حق کمزور ہوتا ہے۔

اسی اصول کے پیشِ نظر سیدنا خضر اور سیدنا موسیٰ علیہم السلام کے واقعے کی حکمت سامنے آجاتی ہے، جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کیا ہے۔ کشتی، بچے اور دیوار کے واقعے میں اصل حکمت سے حضرت خضر علیہ السلام آگاہ تھے لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کی طرف متوجہ نہیں تھے کیونکہ وہ مشاہدہ حق میں مستغرق تھے لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اس معاملے میں عدمِ علم ان کے کمال کی نشانی ہوگا۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ ارشاد فرماتے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے واقعے کو ہم ایک عام فہم مثال کے ذریعے اس طرح واضح کر سکتے ہیں جیسے ایک بادشاہ کے دو غلام ہوں۔ جن میں سے ایک کو بادشاہ اپنی خدمت کے لیے خاص کر لے۔ اس غلام کا فرض صرف یہی ہو کہ وہ ہمیشہ بادشاہ کی خدمت میں حاضر رہے۔ جب بادشاہ کہیں آئے یا جائے کھائے یا پیئے یا گفتگو کرے ہر وقت یہ غلام پاس موجود ہو جبکہ دوسرے غلام کو رعایا کے امور کی انجام دہی کے لیے مخصوص کر لیا جائے۔ اب پہلا غلام کیونکہ ہر وقت بادشاہ کی خدمت میں حاضر رہتا ہے اس لیے اگر اس سے رعایا کے کسی مسئلے کے بارے میں دریافت کیا جائے گا تو وہ کوئی جواب نہیں دے سکے گا۔ یہی حال حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہے کہ وہ ہر وقت بارگاہِ رب العزت میں حاضر رہتے تھے جبکہ حضرت خضر علیہ السلام دنیاوی امور کی انجام دہی پر مامور تھے۔ اسی لیے تمام اہلِ علم اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مرتبہ و مقام حضرت خضر علیہ السلام سے زیادہ ہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے رسول، کلیم اور صفی ہیں۔

حضرت خضر نبی نہیں تھے

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا، بعض اہلِ علم حضرت خضر علیہ السلام کی نبوت کے قائل ہیں یہاں تک کہ حافظ ابن الحجر عسقلانی نے بخاری شریف کی شرح میں یہ بات تحریر کی ہے، حضرت خضر علیہ السلام کی نبوت کا اعتقاد رکھنا ضروری ہے تا کہ کسی غیر نبی کا کسی نبی سے زیادہ عالم ہونا لازم نہ آئے؟

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا، سیدنا خضر علیہ السلام نبی نہیں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں معرفت اور تصرف کرنے کی صلاحیت عطا کی تھی۔ آپ کو وہی تصرف اور معرفت عطا کیے گئے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم کی امت میں غوث کو عطا کیے جاتے ہیں اور سیدنا خضر علیہ السلام نے یہ مقام کسی بھی شیخ کی تربیت یا سلوک کی منازل باقاعدہ طور پر طے کیے بغیر حاصل کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں براہِ راست اس مقام پر فائز کیا تھا لیکن یہ مقام مرتبہ نبوت یا مرتبہ رسالت کے برابر نہیں ہوسکتا۔ نیز ان معاملات میں حضرت خضر علیہ السلام کا علم حضرت موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ نہیں تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو کسی غیر نبی کا نبی سے زیادہ عالم ہونا لازم آتا لیکن اس مسئلے میں اصل وجہ یہ تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مشاہدۂ حق میں مستغرق تھے۔ جس کے برابر اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا حضرت خضر علیہ السلام کی نبوت کا اعتقاد ضروری نہیں ہوگا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) بعض اہلِ علم قرآن کی اس آیت کے ذریعے حضرت خضر علیہ السلام کی نبوت پر استدلال کرتے ہیں:

وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ ط ذٰلِكَ تَاْوِیْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَیْهِ صَبْرًا ۝ (الکہف ۱۸:۸۲)

"میں نے اپنی خواہش کے تحت یہ کام نہیں کیے تھے۔ جنہیں دیکھ کر آپ صبر نہیں کر سکے، ان کی اصل حکمت یہ ہے۔"

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا، کوئی بھی غوث یا قطب یا کوئی اور اہلِ تصرف اپنی ذاتی خواہش کے تحت تصرف نہیں کرتے بلکہ ان کا تصرف اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود انہیں نبی یا رسول قرار نہیں دیا جاسکتا لیکن بہت سے لوگ اس بات سے بھی واقف نہیں ہوتے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس کے بعد سیّدی عبدالعزیز دباغ نے اس موضوع پر نہایت نفیس گفتگو کی لیکن چونکہ یہ گفتگو ان اسرار سے متعلق تھی جنہیں تحریر نہیں کیا جاسکتا اس لیے میں نے وہ گفتگو یہاں نقل نہیں کی ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت سے راضی ہو کہ انہیں کس قدر معرفت حاصل ہے؟

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ظاہری عدمِ علم کی جو حکمت بیان کی ہے۔ اسی کے پیشِ نظر کسی بزرگ کا وہ واقعہ میرے ذہن میں تازہ ہو گیا جس کے مطابق وہ بزرگ بہت سے دنیاوی معاملات میں اپنے مرید سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں میرے فلاں مرید کا جب انتقال ہو گیا تو آسمان سے متعلق اطلاعات منقطع ہو گئیں لیکن جب وہ دوسرا فلاں مرید آ گیا تو پھر اطلاعات موصول ہونے لگیں۔ لہٰذا وہ چیز جو مجھ سے جدا ہو گئی تھی وہ دوبارہ مجھے مل گئی ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے جان بوجھ کر اس بزرگ کا نام تحریر نہیں کیا کیونکہ اس کی یہاں کوئی ضرورت نہیں ہے۔

بیداری میں آنحضرت کی زیارت

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں، ہر چیز کی ایک مخصوص علامت ہوتی ہے اور بیداری کی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مستقل زیارت (کی نعمت کے حصول) کی علامت یہ ہے کہ انسان کی توجہ ہر

وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف مبذول رہے۔ دنیا کی کوئی بھی چیز اس توجہ کو منتشر نہ کر سکے کھاتے، پیتے، سوتے، جاگتے ہر حالت میں یہ شرف اسے حاصل رہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا، کیا یہ نعمت کسب یا حیلے کے ذریعے حاصل کی جاسکتی ہے؟ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا، نہیں۔ اگر کسب یا حیلے کے ذریعے اس کا حصول ممکن ہوتا تو پھر اس غفلت کا اندیشہ باقی رہتا اور کسی اور امر کی بدولت انسان وقتی طور پر اس نعمت سے غافل ہو جاتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ اپنے کسی مقرب بندے کو یہ نعمت عطا فرماتا ہے۔ اس میں انسان کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ اگر انسان خود اس کیفیت کو ختم کرنا چاہے تو یہ اس کے لیے ممکن نہیں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کا کوئی بھی کام اس مشاہدے میں رکاوٹ نہیں بنتا۔ ایسے شخص کا باطن ہر وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف متوجہ رہتا ہے جبکہ اس کا ظاہر بغیر کسی ارادے کے لوگوں کے ساتھ گفتگو میں مشغول ہوتا ہے۔ غرضیکہ تمام ظاہری امور اس کی ذات سے کسی بھی کسب اور ارادے کے بغیر صادر ہوتے ہیں کیونکہ اصل اعتبار دل (اور باطنی توجہ) کا ہوتا ہے اور اس کا باطن بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوتا ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ ایسے بندے کو مستقل طور پر مشاہدہِ نبوی کی نعمت عطا کرتا ہے۔ (اب سوال یہ ہے کہ ابتداء میں انسان کو کتنے عرصے تک اپنی توجہ، کلی طور پر، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف متوجہ رکھنی چاہیے؟) یہ مدت مختلف ہوتی ہے بعض لوگوں کو ایک ماہ بعد، کسی کو اس سے کم مدت میں اور کسی کو اس سے بھی زیادہ مدت کے بعد مشاہدے کی نعمت نصیب ہوتی ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، حالت بیداری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مستقل زیارت ایک بہت بڑی نعمت ہے اس کی عظمت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ اگر اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال نہ ہو تو انسان کبھی بھی اس کو برداشت نہ کر سکے۔ اس کی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ بالفرض ایک ایسا شخص موجود ہو جس کی طاقت چالیس (40) ایسے اشخاص کے برابر ہو کہ طاقت اور بہادری کے اعتبار سے ان میں سے ہر ایک شخص شیر کو کان سے پکڑ سکتا ہو اور پھر جس شخص کو ایسے چالیس (40) اشخاص کے برابر طاقت حاصل ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے سامنے تشریف لے آئیں۔ تو اس کا جگر پھٹ جائے گا اور اس کا وجود پگھل جائے گا اس کی روح پرواز کر جائے گی اور یہ سب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رعب اور دبدبے کے باعث ہوگا اور اس شکوہ کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کے وقت جو لذت اس شخص کو حاصل ہوگی اس کی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی۔ صرف اتنا سمجھ لیں کہ جن لوگوں کو یہ نعمت حاصل ہے ان کے نزدیک یہ نعمت جنت سے افضل ہے کیونکہ کسی بھی جنتی کو جنت کی تمام نعمتیں حاصل نہیں ہوں گی بلکہ ہر ایک کو اس کے مخصوص مرتبے کے مطابق مخصوص نعمتیں نصیب ہوں گی لیکن جب کسی شخص کو مشاہدہ نبوی کی نعمت حاصل ہو جائے تو اس ایک نعمت کے اندر جنت کی تمام نعمتوں کا رنگ، مزہ اور لذت موجود ہوں گے۔ (اس کے علاوہ دیگر لذات کی کوئی حد نہیں ہے) جنت کی ساری نعمتیں اس ہستی کے سامنے کیا حیثیت رکھتی ہیں؟ جن کے نور سے جنت کو پیدا کیا گیا۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں، کسی بھی مشاہدے کے نتیجے میں انسان کو فیض حاصل ہوتا ہے اور جس شخص کو مستقل طور پر یہ نعمت حاصل ہوگی۔ اسے مستقل طور پر فیض نصیب ہوتا رہے گا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) شمائل ترمذی وراس کی شروحات میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اعضاء کی ظاہری ساخت اور دیگر احوال کے بارے میں محدثین کی نقل کردہ مختلف روایات کو پڑھ کر میں خاصی الجھن کا شکار ہوتا تھا پھر میں سیّدی دباغ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس اختلاف کا تذکرہ کرتا اور آپ مجھے اس طرح جواب دیتے گویا آپ خود اپنی آنکھوں کے ذریعے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کر رہے ہیں (اور واقعی ایسا ہی تھا) اس بارے میں کچھ روایات ہم نے پہلے باب کے آخر میں ذکر کی ہیں۔

ایک مرتبہ میں آپ سے کچھ سوالات کر رہا تھا آپ اس وقت پودوں کی جھاڑ پونچھ کر رہے تھے اور بظاہر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے آپ میرے سوالات کی طرف توجہ نہیں دے رہے لیکن جیسے ہی میرا سوال پورا ہوتا آپ فوراً اس کا جواب ارشاد فرماتے اور اس بارے میں آپ کو ذرا بھی غور وفکر کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ اس کی وجہ یہ تھی اصل اعتبار باطن کا ہوتا ہے اور ظاہری امور بلاارادہ صادر ہوتے ہیں لہٰذا پودوں کی کانٹ چھانٹ بلاارادہ تھی۔ آپ کا باطن ہر وقت بارگاہِ ربّ العزت کی طرف متوجہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو جواب دیتے وقت غور وفکر کی زحمت نہیں کرنا پڑتی۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں، بندے کو مشاہدۂ حق نصیب ہو جانے کی علامت یہ ہے کہ مشاہدہ نبوی حاصل ہونے کے بعد انسان کی توجہ اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم کرنے کی طرف مبذول ہو جائے۔ بالکل اسی طرح جیسے پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف مبذول ہوئی تھی۔ لہٰذا اب اس کی توجہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہٹ کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جائے گی جس کے نتیجے میں اسے مشاہدہ حق نصیب ہوگا۔ جو اصل مقصود ہے۔ مشاہدہ نبوی کے وقت تو جنت اور اس کی تمام نعمتوں کی لذت حاصل ہوئی تھی تو پھر مشاہدۂ حق کا عالم کیا ہوگا؟ (اس کا اندازہ بھی نہیں کیا جاسکتا)

اہل فتح کی اقسام

مشاہدہ حق نصیب ہو جانے کے بعد اہلِ فتح کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ بعض لوگ ہر چیز کو چھوڑ کر صرف اسی مشاہدے کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور بعض لوگ باطنی طور پر مشاہدے میں مشغول رہتے ہیں لیکن ظاہری طور پر انہیں مشاہدۂ نبوی حاصل رہتا ہے۔ ان کا باطنی مشاہدہ ظاہری اور ظاہری مشاہدہ باطنی مشاہدے کے لیے رکاوٹ نہیں بنتا۔ اس دوسری قسم سے تعلق رکھنے والے لوگ زیادہ کامل ہوتے ہیں۔

یہ اس لیے زیادہ کامل ہوتے ہیں کیونکہ حق تعالیٰ کا مشاہدہ انہیں زیادہ کامل طور پر حاصل ہوتا ہے کیونکہ یہ مشاہدہ حق کے مرتبے تک پہنچنے کے بعد مشاہدہ نبوی سے لاتعلق نہیں ہو جاتے جو کہ مشاہدہ حق کے حصول کا بنیادی سبب ہے۔ لہٰذا جس شخص کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جس قدر زیادہ مشاہدہ حاصل ہوگا اسے مشاہدہ حق میں

بھی اتنی ہی زیادہ ترقی نصیب ہوگی اور مشاہدۂ نبوی میں کمی مشاہدہ حق میں کمی کا باعث بنتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی شخص کو یہ اختیار حاصل ہو اور اس کی عمر نوے (90) برس پر مشتمل ہو تو اسے چاہیے اپنی ساری زندگی میں مشاہدۂ نبوی کو اختیار کرے اور پھر موت سے ایک دن پہلے اسے مشاہدۂ حق نصیب ہو۔ اس وقت جو فتح اسے نصیب ہوگی وہ اس شخص کی فتح سے زیادہ کامل ہوگی جسے اس سارے عرصے کے دوران مشاہدۂ حق اور مشاہدۂ نبوی دونوں کی نعمت حاصل رہی ہو اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ اسے مشاہدۂ نبوی میں رسوخ حاصل ہے۔

پھر آپ نے اپنی نگاہوں کے سامنے محدب آئینہ رکھتے ہوئے ارشاد فرمایا، کیا اس آئینے کی وجہ سے حروف مزید نمایاں نہیں ہو جاتے؟ اور آئینہ جتنا صاف ہوگا دیکھنے والے کو اتنا ہی واضح دکھائی دے گا؟ میں نے عرض کی، جی ہاں۔ آپ نے فرمایا، مشاہدہ نبوی کی حیثیت اس آئینے کی مانند ہے اور مشاہدۂ حق کی مثال ان حروف کی طرح ہے۔ لہٰذا جس شخص کو جتنا کامل مشاہدۂ نبوی حاصل ہوگا اسے اتنا ہی کامل اور واضح مشاہدۂ حق نصیب ہوگا۔

ایک مرتبہ ایک فقیہ نے دریافت کیا، کیا کوئی ولی نماز ترک کر سکتا ہے؟ آپ نے جواب دیا، یہ ناممکن ہے کہ کوئی ولی نماز ترک کرے اور یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے؟ جبکہ ولی کو مستقل طور پر دو شعلوں سے داغا جاتا ہے ایک مشاہدہ نبوی اور دوسرا مشاہدہ حق اور یہ دونوں مشاہدات ولی کو نماز پڑھنے اور احکام شریعت پر عمل پیرا ہونے کا حکم دیتے ہیں ایک اور مرتبہ سیّدی دباغ نے ارشاد فرمایا، کوئی بھی ولی نماز کو کیسے ترک کر سکتا ہے کیونکہ دونوں مشاہدات میں جو بھی اسرار حاصل ہوتے ہیں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیض کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیض نصیب ہو اور وہ اس کے باوجود وہ کام نہ کرے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول تھا۔

ایک مرتبہ مشاہدۂ حق پر گفتگو کرتے ہوئے ارشاد فرمایا، جب مشاہدہ حق نصیب ہوتا ہے اور انسان اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھنے لگتا ہے تو اس وقت ماضی، حال اور مستقبل کی تقسیم اس کی نگاہ سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ غرضیکہ آپ نے مشاہدہ حق کی کیفیت، اسماءِ الٰہی کے انوار سے فیض کا حصول، اسماء کی تعداد کے مطابق ولایت کے مراتب کی تقسیم، دیگر اسرار سے متعلق فتح اور اس جیسے دیگر بہت سے امور بیان فرمائے ہیں لیکن انہیں احاطۂ تحریر میں لانا ممکن نہیں ہے۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں، جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے پر اپنا خاص فضل کرتے ہوئے اسے حجاب کی حالت سے فتح کی حالت کی طرف منتقل کر دے تو اس بندے کے بارے میں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کیا اس کا انتقال تو نہیں ہو جائے گا؟ یا اگر وہ زندہ بھی رہا تو کہیں اس کی عقل سلب نہ ہو جائے؟ عقل کے سلب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی توجہ صرف مشاہدے کی طرف مبذول رہے گی۔ اپنی ذات یا دنیا کی طرف (ظاہری طور پر) متوجہ نہیں رہ سکے گی اور عقل کے باقی رہنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان ان مشاہدات کے ساتھ (ظاہری طور پر) اپنے آپ سے بھی غافل نہ ہو اور بظاہر اپنے کھانے، پینے، پہننے وغیرہ جیسے ضروری امور کا خیال رکھ سکے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، جس شخص پر اللہ تعالیٰ کی یہ رحمت ہوتی ہے اس کے شیخ کے علاوہ اور کوئی یہ بات نہیں جان سکتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) جو بھی صاحب فتح اپنے مرکز سے باہر نکلتا ہے وہ یا تو مرجاتا ہے یا اس کی عقل زائل ہو جاتی ہے۔

سیدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں جب کسی بندے کو فتح نصیب ہوتی ہے تو وہ فرشتوں، جنات اور شیاطین کا مشاہدہ کرتا ہے اس دوران بہت سے خطرناک صورتیں اور آوازیں سامنے آتی ہیں جن کی بدولت اس بات کا اندیشہ موجود ہوتا ہے کہ کہیں خوف کی شدت کی وجہ سے اس کا جگر پھٹ نہ جائے۔

ایک مرتبہ ایک شخص اپنی دکان میں بیٹھا خرید و فروخت میں مشغول تھا۔ اسی وقت اسے فتح نصیب ہوئی اور اس نے ان چیزوں کو دیکھا جسے دیکھنے اور برداشت کرنے کی صلاحیت اس کے اندر موجود نہیں تھی۔ اس لیے اسی وقت اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔ لوگ یہ سمجھے کہ شاید اچانک کسی سبب کے بغیر اس کی موت واقع ہوگئی ہے حالانکہ اس کی موت کا بنیادی سبب فتح کا حصول تھا۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں، ایک مرتبہ میں عطر فروشوں کے بازار سے گزر رہا تھا اور وہاں ایک شخص اپنی دکان میں بیٹھا مہندی فروخت کررہا تھا۔ اچانک اسے فتح نصیب ہوئی۔ وہ بے ہوش ہو کے گرا اور فوراً مرگیا۔ لوگ یہ سمجھے کہ یہ اچانک مرگیا ہے حالانکہ اسے ولایت کی حالت میں موت نصیب ہوئی۔

پاگل اور مجذوب میں فرق

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا، ایک شخص کو فتح کے حصول کے بعد عقل رخصت ہو جاتی ہے اور دوسرے کی عقل کسی اور وجہ سے رخصت ہو جاتی ہے۔ دونوں کے درمیان بنیادی فرق کیا ہوگا؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا، فتح کے حصول کے باعث جس شخص کی عقل سلب ہو جاتی ہے درحقیقت اس کی عقل سلب نہیں ہوتی بلکہ اس کی توجہ مکمل طور پر مشاہدہ حق کی طرف مبذول ہوگئی ہے اور وہ ہر وقت مشاہدے کے سمندر میں تیرتا رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی خاص حکمت کے تحت اس کی عقل کو اس کے وجود سے لاتعلق کر دیتا ہے۔ البتہ دوسرے شخص کی عقل مکمل طور پر زائل ہو جاتی ہے۔ (عام طور پر) اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کی عقل کو زائل کرنے کا ارادہ فرمالے تو اس کی روح کو گھڑی بھر کے لیے اپنی ذات کے مشاہدے سے لاتعلق کر دیتا ہے اور اس ایک لمحے میں اس شخص کی روح کی توجہ اس شخص کے افعال کی طرف مبذول ہو جاتی ہے کیونکہ وہ بندہ گنہگار ہوتا ہے اس لیے اس کے افعال کے لحاتی مشاہدے کے نتیجے میں روح پر قبض کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں عقل زائل ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔ جب قبض کی یہ کیفیت مستقل طور پر روح پر طاری ہو جائے تو عقل بھی مستقل طور پر زائل ہو جاتی ہے لیکن اگر قبض کی کیفیت مستقل طور پر نہ ہو تو روح کو دوبارہ مشاہدۂ حق نصیب ہو جاتا ہے اور اس شخص کی عقل واپس آجاتی ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا، بعض اوقات کسی بچے کی عقل بھی زائل ہو جاتی ہے جبکہ بچے سے کوئی قبیح فعل صادر نہیں ہو سکتا اور بچے کو گنہگار بھی نہیں کہا جا سکتا؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا روح کے نزدیک

بندے کا ہر عمل گناہ ہوتا ہے کیونکہ فطری طور پر روح کے مشاہدے کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ انسان ہر وقت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سربسجود رہے اور اس معاملے میں روح کے سامنے بالغ یا نابالغ کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوتا۔

اگر کسی صاحب فتح ولی کے پاس دو اشخاص آ کر بیٹھ جائیں جن کی عقل زائل ہو چکی ہو۔ ان میں سے ایک کی عقل فتح کی وجہ سے زائل ہوئی ہو اور دوسرے کی کسی اور وجہ سے زائل ہوئی ہو۔ پھر وہ دونوں گفتگو شروع کر دیں تو صاحب فتح ولی اس شخص کی گفتگو کے ذریعے اسے پہچان لے گا جس کی عقل فتح کے حصول کے باعث زائل ہوئی تھی کیونکہ ایسے شخص کا ظاہری کلام اگرچہ سمجھ میں نہ آئے لیکن باطنی طور پر اس کے کچھ اسرار ظاہر ہو جاتے ہیں۔ جنہیں اہلِ بصیرت بخوبی پہچان لیتے ہیں۔ اس کے برعکس جس شخص کی عقل کسی اور وجہ سے زائل ہوئی ہو اس سے کسی قسم کے کوئی اسرار ظاہر نہیں ہوتے۔ ولی کی ایک اور پہچان یہ بھی ہے کہ اس کی روح ہمیشہ خوش وخرم دکھائی دیتی ہے جبکہ دوسرے شخص کی روح مغموم اور رنجیدہ دکھائی دیتی ہے۔

جن لوگوں کی عقل کسی اور سبب کی وجہ سے زائل ہوتی ہے ان کی حیثیت جانوروں کی مانند ہوتی ہے تاہم اللہ تعالیٰ ایسے شخص پر رحم کرتے ہوئے اسے جنت میں داخل کر دے گا اور ان کی انسانی صورت ان کے لیے شفاعت کرے گی۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ وہ انسانی شکل میں موجود بعض جانور ہیں لیکن کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو بھی انسانی صورت میں پیدا کیا تھا اس لیے ان پاگلوں کی ظاہری صورت کا احترام کرتے ہوئے انہیں بھی جنت میں داخل کر دیا جائے گا تاکہ وہ دوسرے جانوروں کی مانند مکمل طور پر فنا نہ ہو جائیں۔

ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا، فتح کے حصول کے باعث جس شخص کی عقل زائل ہو جائے وہ قابلِ احترام ولی ہوتا ہے لیکن اسے تصرف کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہوتا ایسا شخص غوث یا قطب کے مرتبے پر بھی فائز نہیں ہو سکتا البتہ جب دجال کے خروج کا زمانہ قریب آ جائے گا تو اس طرح کے اشخاص کو تصرف کا اختیار دے دیا جائے گا۔ اس وقت کے غوث کی بھی یہی حالت ہو گی۔ جس کے نتیجے میں دنیا کے نظام میں ایک عظیم خلل واقع ہو گا۔ اسی طرح کے لوگوں کے تصرف کے زمانے میں دجال کا خروج ہو گا۔ دجال کے مرنے کے بعد ان لوگوں کا تصرف بھی ختم ہو جائے گا اور پھر دوبارہ کبھی بھی انہیں تصرف کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہو گا۔

سب سے عظیم ترین نعمت اور آفت کون سی ہیں؟

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں، ایک مرتبہ سیّدی عبداللہ برناوی نے مجھ سے دریافت کیا، تمہارے خیال میں دنیا کی کون سی ایسی نعمت ہے جو جنت سے بہتر ہے؟ اور کون سی ایسی مصیبت ہے جو جہنم سے بدتر ہے؟ میں نے جواب دیا، حالتِ بیداری میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مستقل زیارت جنت سے بہتر ہے اور فتح کے حصول کے بعد اس کا سلب ہو جانا جہنم سے بدتر ہے۔

یہ جواب سن کر سیّدی عبداللہ البرناوی جھکے اور انہوں نے میرے پاؤں کو بوسہ دینا شروع کر دیا۔ میں نے دریافت کیا، آپ میرے پاؤں کیوں چوم رہے ہیں؟ انہوں نے فرمایا، میں نے اسی (80) سے زیادہ مشائخ

سے یہ سوال کیا لیکن ان میں سے کسی ایک کا جواب بھی تمہارے جواب جتنا بہترین نہیں تھا۔
(احمد بن مبارک کہتے ہیں) کیا سیّدی عبداللہ البرناوی اس جواب سے واقف تھے؟ اور کیا وہ اس سوال کے ذریعے لوگوں کی ذہانت کا امتحان لینا چاہتے تھے؟ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا، ہاں! وہ اس جواب سے واقف تھے اور سوال کرنے کا مقصد صرف امتحان لینا تھا۔
(احمد بن مبارک کہتے ہیں) پھر میں نے دریافت کیا، فتح کے حصول کے بعد اس کا سلب ہو جانا جہنم سے بدتر کیوں ہے؟
سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا، فتح کا سلب ہونا اس شخص کے لیے جہنم سے بدتر ہے جسے اس بات کا اندیشہ ہو کہ کہیں اس سے فتح سلب نہ ہو جائے تاہم جس شخص سے فتح سلب ہو چکی ہو اس کی یہ کیفیت نہیں ہوتی کیونکہ اس کا دل پتھر کی مانند سخت ہو چکا ہوتا ہے اور اسے یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ فتح کے حصول کے بعد اس نے کن امور کا مشاہدہ کیا تھا بلکہ اس کا خبیث وجود فتح سے نجات حاصل کرنے کے بعد اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگتا ہے۔ دنیا میں اگر کسی شخص کی امارت سلب ہو جائے تو اس کی حالت فتح سلب ہو جانے والے شخص سے بہتر ہوتی ہے چونکہ اس امیر کو اپنی سلب شدہ امارت کا خیال آ جاتا ہے اور اپنے مال و دولت کو یاد کر کے ہی وہ خوش ہو جاتا ہے لیکن جس شخص کی فتح سلب کر لی گئی ہو اسے کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ اس کا دل ایک صاف سلیٹ کی مانند ہو جاتا ہے اور اس کی بصیرت کا سورج تاریک ہو جاتا ہے۔
سیّدی محمد البناطرابلسی چودہ (14) برس تک کسی کامل ولی کی تلاش میں رہے آپ نے مصر، شام، عراق، ترکی اور ہندوستان تک کا سفر کیا۔ ولایت کے دعویدار بہت سے لوگوں کو دیکھا لیکن گوہر مقصود حاصل نہ ہوا۔ آپ اپنے والد کے ہاتھ پر بیعت ہوئے تھے جو ایک مشہور بزرگ تھے لیکن آپ کو فتح نصیب نہیں ہوئی تھی اور اسی کے حصول کے لیے آپ کسی کامل ولی کی تلاش میں تھے اور یہ تلاش باطنی اعتبار سے تھی دنیاوی شہرت کا اس میں کوئی دخل نہیں تھا۔ آخر عراق میں آپ کی ملاقات ایک شخص سے ہوئی۔ جس کے بے شمار مریدین تھے۔ اس نے ایک خانقاہ قائم کر رکھی تھی۔ جہاں زائرین کی کثرت کے باعث روزانہ چار (4) من کے برابر کھانا پکتا تھا۔ زائرین کے قیام کے لیے رہائشی کمرے موجود تھے۔ اس شیخ نے اپنی ذاتی رہائش کے لیے ایک خلوت گاہ قائم کر رکھی تھی۔ وضو اور رفع حاجت کا انتظام اسی خلوت گاہ میں تھا۔ خلوت گاہ کے دروازے پر کھانا رکھ دیا جاتا جسے وہ شیخ حاصل کر لیتا۔ شیخ کا معمول تھا کہ وہ ستائیس (27) دن تک اسی خلوت گاہ میں عبادت و ریاضت میں مشغول رہتا تھا اور صرف تین (3) دن کے لیے لوگوں سے ملاقات کی خاطر خلوت گاہ سے باہر آتا۔ جب وہ باہر آیا تو میری (سیّدی محمد البناطرابلسی کی) اس سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اس سے کہا میں آپ سے دو باتیں دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ ایک کا تعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہستی سے ہے اور دوسری اللہ تعالیٰ کی ذات سے متعلق ہے۔ اس نے کہا پوچھو! میں نے کہا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا ۝ لِیَغۡفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡۢبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ۔(الفتح ۴۸:۱-۲)

''بے شک ہم نے تمہیں روشن فتح عطا کر دی ہے تا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اگلے اور پچھلے ''ذنوب'' کو معاف کر دے۔''

اس آیت سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے بھی گناہ کا صدور ہوتا تھا اور بعد میں بھی ہوگا لیکن ان دونوں طرح کے گناہوں کو معاف کرنے کی بشارت دی گئی ہے جبکہ (ہمارا عقیدہ یہ ہے) کہ نبی معصوم ہوتا ہے اور اعلان نبوت سے پہلے یا بعد میں اس سے گناہ کا صدور ممکن نہیں ہے۔(جب یہ طے ہوگیا تو) پھر آیت کا مفہوم کیا ہوگا؟ اس نے جواب دیا، گناہ کی دو قسمیں ہیں، خفیف اور ثقیل۔ ثقیل گناہوں میں زنا کاری، شراب نوشی اور اس طرح کے دیگر گناہ شامل ہوں گے جبکہ خفیف گناہوں میں کسی ایک بیوی کی طرف زیادہ مائل ہونا، ایام کی تقسیم میں ایک کو دوسری پر ترجیح دینا اور اس نوعیت کے دیگر امور شامل ہوں گے۔ یہ خفیف امور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صادر ہوئے ہیں اور انہی کی مغفرت کی اس آیت میں بشارت دی گئی ہے۔

سیّدی محمد البنا فرماتے ہیں، مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرتبہ و مقام سے آگاہ نہیں ہے اور اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ نبی کی ذات، صغیرہ اور کبیرہ، ہر طرح کے گناہوں سے پاک ہوتی ہے کیونکہ کوئی بھی گناہ اس شخص سے صادر ہوگا جو محجوب ہو، غفلت اور ظلمت کا شکار ہو، اہلِ قرب اور اہلِ مشاہدہ سے بھی گناہ کا صدور نہیں ہوتا۔ انبیاء کرام کا تو معاملہ ہی جدا ہے۔ پھر سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں کس طرح یہ گمان کیا جاسکتا ہے؟

میں نے کہا، میرا دوسرا سوال قرآن کی اس آیت کے بارے میں ہے:

وَهُوَ مَعَكُمۡ اَيۡنَمَا كُنۡتُمۡ۔(الحدید ۵۷:۴)

''تم جہاں کہیں موجود رہو، اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ (موجود ہوتا) ہے۔''

یہاں معیت سے مراد کیا ہے؟

اس نے جواب دیا، اس سے مراد اہلِ ایمان ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کے دل میں موجود ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کی عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔

(سیّدی محمد البنا فرماتے ہیں) اس کا یہ جواب سن کر مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ شخص اپنے پروردگار کی عظمتِ شان کا بھی علم نہیں رکھتا اور صرف ایک بہروپیا ہے۔

سیّدی محمد البنا فرماتے ہیں، اسی طرح مجھے ہندوستان میں ایک شخص سے ملنے کا اتفاق ہوا جس کی کثرت عبادت کا بہت چرچا تھا۔ میں جب اس کے ہاں پہنچا تو دیکھا واقعی وہ کثرت سے عبادت کرتا تھا۔ اس کی خوراک انتہائی کم تھی۔ میں نے اس سے اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایک سوال کیا تو وہ اس سے ناواقف تھا۔ جس سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ اس کی عبادت کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔

اسی طرح ایک مرتبہ میں ایک شہر کی بندرگاہ پر کھڑا ہوا مزدوروں کو انتہائی وزنی سامان اٹھاتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور ان کی مشقت پر دل میں حیران ہو رہا تھا کہ اچانک میرے پاس ایک مزدور آ کر کھڑا ہوا۔ اس نے کشف کے ذریعے میری حیرانگی کا پتہ چلالیا اور مجھے مخاطب ہو کر کہنے لگا، اس میں حیران ہونے والی کون سی بات ہے؟ تم اللہ تعالیٰ کی اس قدرت پر حیران ہونا جو ابھی ظاہر ہوگی۔ چنانچہ وہ شخص اپنا سامان اٹھا کر مقررہ مقام تک پہنچا کر واپس آیا اور ہاتھ پاؤں پھیلا کر زمین پر لیٹ گیا اور اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ اس کا اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ درحقیقت ''قوی'' اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو ہر چیز پر قادر ہے اور جسے جتنی چاہے قوت عطا کر سکتی ہے اور جس سے چاہے قوت واپس لے سکتی ہے۔ اس لیے اللہ کی عظمتِ شان کے بارے میں غور و فکر کر کے حیران ہونا چاہیے۔ قرآن کہتا ہے:

فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ. (المومنون ۲۳:۱۴)

''اللہ کی ذات بابرکت ہے جو سب سے بہترین خالق ہے۔''

سیّدی محمد البنا کہتے ہیں، اس کے بعد مجھے اولیاء کا ایک گروہ ملا۔ انہوں نے میری رہنمائی کی کہ مجھے اپنے وطن واپس چلا جانا چاہیے کیونکہ وہیں پر میرا مقصد حل ہوگا۔ لہٰذا میں اپنے وطن واپس آ گیا۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں، ان کے وطن (طرابلس) میں ایک شخص نے انہیں بتایا کہ تمہارا مقصد ''فاس'' پہنچ کر پورا ہوگا چنانچہ وہ ''فاس'' آ گئے اور وہاں ان کی ملاقات ایک شخص سے ہوئی جس کی بدولت انہیں فتح نصیب ہوئی اور وہ اللہ تعالیٰ کے مقرب بندوں میں شامل ہو کر ''دیوان الصالحین'' کے رکن بن گئے۔

سرّ اور سرِّ ذات

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا، سیّدی محمد البنا کو (آپ کے وسیلے سے) آپ کی زندگی میں کس طرح فتح نصیب ہوئی؟ کیونکہ (اصول یہ ہے) کسی بھی ولی کو اس کے شیخ کی موجودگی میں فتح نصیب نہیں ہوتی کیونکہ فتح صرف ذات کے ''سرّ'' پر نازل ہوتی ہے جب شیخ کی ذات کا ''سرّ'' مرید کی طرف منتقل ہوگا اس وقت اس مرید کو فتح نصیب ہوگی جبکہ شیخ کی زندگی میں اس کا ''سرّ'' کسی دوسرے کی طرف منتقل نہیں ہوسکتا۔ اس لیے شیخ کی زندگی میں مرید کے لیے فتح کا حصول ممکن نہیں ہے اور بالفرض اگر شیخ کی زندگی میں مرید کو فتح مل بھی جائے تو بھی یہ برقرار نہیں رہتی بلکہ بہت جلد زائل ہو جاتی ہے۔ جبکہ سیّدی محمد البنا کو آپ کے ذریعے فتح نصیب ہوئی ہے اور ان کی فتح برقرار ہے اور آپ بھی ابھی بقید حیات ہیں؟

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا، وہ میرا روحانی جانشین نہیں ہے بلکہ کسی اور کا فیض میرے ذریعے اسے ملا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) کس کا فیض ملا ہے؟ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا، مراکش میں رہنے والے ایک صوفی بزرگ کا انتقال ہو گیا ان کے وصال کے بعد ان کا ''سرّ'' میرے پاس آ گیا۔ جب محمد البنا میرے پاس آئے تو میں نے وہ ''سرّ'' انہیں دے دیا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا، اس بزرگ کا ''سرّ'' سیّدی محمد البنا میں اس وقت تک برقرار نہیں رہ سکتا جب تک اس بزرگ کی ذات کا سرّ ان کی طرف منتقل نہ ہو۔ جبکہ سیّدی محمد البنا نے اس بزرگ کی زیارت نہیں کی، پھران کی فتح کیسے برقرار رہ سکتی ہے؟ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا، اس کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بزرگ کی ذات کا ''سرّ'' کسی دوسرے بزرگ کے پاس بطور امانت رکھوا دے اور پھر اس دوسرے بزرگ کو یہ صلاحیت عطا کر دے کہ وہ اس بزرگ کے ''سرّ'' اور اس بزرگ کی ذات کے ''سرّ'' کو اہل شخص تک منتقل کر دے۔ تاہم اس کے باوجود ''سرّ'' حاصل کرنے والا شخص پہلے بزرگ کا روحانی جانشین قرار پائے گا جس کے ''سرّ'' کا وہ وارث بنا ہے۔

روحانی وراثت کا بنیادی اصول

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا، مرحوم بزرگ مراکش کے رہنے والے تھے اور ان کا رواحانی جانشین طرابلس کا رہنے والا ہے۔ کیا مراکش کے رہنے والوں میں کوئی ان کا جانشین بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا؟ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا، کوئی بھی شخص صرف اس وقت کسی بزرگ کا روحانی جانشین بن سکتا ہے جب عقل، فطرت اور خون کے اعتبار سے دونوں کے درمیان مشابہت موجود ہو۔ فلاں بزرگ فرماتے ہیں ''اگر رشتے داری کے اعتبار سے کسی کو روحانی جانشین بنانا ممکن ہوتا تو میرا بیٹا میرا روحانی جانشین ہوتا۔ اگر طاقت کا لحاظ رکھا جاتا تو بادشاہِ وقت ہوتا، اگر خدمت باعث بنتی تو میرا فلاں خادم مستحق قرار پاتا لیکن روحانی جانشینی صرف عقل سے عقل، طبیعت سے طبیعت اور خون سے خون کی موافقت کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے اس میں کسب یا عمل کا کوئی دخل نہیں ہے''۔

(سیّدی دباغ فرماتے ہیں) محمد البنا تینوں اعتبار سے اس مرحوم بزرگ سے مشابہت رکھتے تھے (اس لیے اس مرحوم بزرگ کے روحانی جانشین بن گئے)

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں، میں نے ایک بزرگ کو دیکھا ہے جو اکثر یہ کہا کرتے تھے میرا فلاں مرید میرا روحانی وارث ہوگا۔ اس لیے میرے بعد تم اس کا دامن تھام لینا لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شیخ کی پسند کے مطابق جانشین نہیں بنتا کیونکہ اسرارِ ربانی کی وصولی کا طریقہ کار انسانی گمان سے ماورا ہے۔ بہت سے ایسے مشائخ کو یہ اسرار نصیب ہو جاتے ہیں جو لوگوں کے گمان کے مطابق ان اسرار کے اہل نہیں ہوتے اور اسی طرح بہت سے لوگ ان اسرار سے محروم ہو جاتے ہیں حالانکہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ اسرار مستقل طور پر انہیں حاصل رہیں گے۔

اس کے بعد سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ایک حکایت بیان کی، ایک بزرگ کے آٹھ مریدین ان کی بہت خدمت کرتے تھے۔ ایک مرید تھک ہار کے خدمت سے کنارہ کش ہو گیا۔ وہ اب کسی بھی خدمت کی بجا آوری کے لائق نہیں رہا تھا۔ بقیہ سات مریدین بدستور خدمت کرتے رہے۔ پھر ان میں سے بھی چار (4) مریدین شیخ کی خدمت سے کنارہ کش ہو گئے۔ بقیہ تین (3) مریدین بدستور شیخ کی خدمت میں مشغول رہے اور ان تینوں

نے اپنی ایک ایک بیٹی شیخ کے نکاح میں دی۔ ان تینوں میں سے ایک کی بیٹی زیادہ خوبصورت تھی۔ شیخ اس سے بہت محبت کرتے تھے اور اس کے والد کے ساتھ خصوصی برتاؤ کرتے تھے۔ سب لوگوں کو اس بات کا یقین تھا کہ یہی شخص شیخ کا روحانی جانشین ہوگا۔ جب شیخ کا آخری وقت قریب آیا تو آپ کے مریدین خدمت میں حاضر تھے۔ شیخ نے اپنے اسی مرید کو بلوایا جو سب سے پہلے ان کی خدمت سے کنارہ کش ہوگیا تھا اور اس سے کہا، تم ہی میرے روحانی جانشین ہو۔ یہ کہہ کر شیخ کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔

ایک شخص کو لوگ حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور دوسرے کو تعظیم کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ دونوں میں سے پہلے شخص پر اللہ تعالیٰ خاص فضل و کرم فرماتا ہے۔ اسی لیے بظاہر (بعض اوقات) حقیر دکھائی دینے والے لوگ اسرار ربانی کے حامل ہوتے ہیں۔

ایک سیّد کا قصہ

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں ایک بزرگ کے دو مرید تھے جن میں سے ایک عام خاندان کا چشم و چراغ تھا اور دوسرا سادات کے خانوادے سے تعلق رکھتا تھا۔ دونوں میں سے کسی ایک کو بھی فتح نصیب نہیں ہوئی تھی۔ ایک دن بزرگ نے غیر سیّد سے کہا، تم سیّد کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ وہ اپنا ''سرّ'' اور فتح تمہیں فروخت کردے۔ وہ شخص سیّد کے پاس گیا اور اس سے فرمائش کی تم اپنا ''سرّ'' اور ''فتح'' میرے ہاتھ فروخت کر دو۔ سیّد نے ایسا کرنے سے معذرت کرلی۔ غیر سیّد نے پہلے ایک سو اور پھر دو سو دینار قیمت مقرر کی۔ جب سیّد راضی نہ ہوا تو اس نے قیمت میں پہلے اپنے خادم اور پھر بیٹی کے نکاح کو بھی شامل کرلیا۔ مگر سیّد راضی نہ ہوا۔ آخر ان سب چیزوں کے ہمراہ اس نے اپنا گھر بھی قیمت میں شامل کرلیا۔ اس بات پر سیّد راضی ہوگیا۔ غیر سیّد گیا اور گواہ لے آیا۔ اس نے گواہوں کی موجودگی میں یہ اقرار کیا میں اپنی یہ تمام چیزیں، سرّ اور فتح کے عوض سیّد صاحب کے حوالے کر رہا ہوں۔ سیّد نے بھی اقرار کیا کہ میں ان تمام چیزوں کے عوض فتح اور سرّ سے دستبردار ہوتا ہوں۔ چنانچہ سیّد نے دو سو (200) دینار وصول کیے، گھر پر قبضہ لیا، خادم حاصل کیا اور غیر سیّد کی بیٹی سے نکاح بھی کرلیا۔ سیّد کی ساری زندگی میں اس سے زیادہ اچھی رات کوئی نہ آئی تھی۔ دوسری طرف غیر سیّد نے زندگی میں ایسی پریشان کن صورتحال کا سامنا کبھی نہیں کیا تھا۔ ساری رات طرح طرح کے وسوسے اسے تنگ کرتے رہے لیکن وہ اپنے شیخ کی طرف سے بدگمان نہ ہوا۔ اگلے دن علی الصبح وہ فتح اور سرّ پہلے سیّد کے پاس آئے۔ سیّد نے ان کا مشاہدہ کیا تو وہ ایک ایسی نعمت تھی جس کی خوبی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جب اس نے اچھی طرح اسے دیکھ لیا تو یہ فتح اور سرّ اس سے سلب ہوگئے اور اس غیر سیّد کو مل گئے اور وہ غیر سیّد اولیاء کرام کی صف میں شامل ہوگیا۔ سیّد صاحب نے جو قیمت وصول کی تھی وہ اس سے کوئی فائدہ نہیں حاصل کر سکے کیونکہ جیسے ہی ان سے فتح سلب ہوئی ان کی عقل رخصت ہوگئی۔ ہر وقت ان کی زبان پر یہی کلمات جاری رہتے، تم کہاں ہو؟ اپنا گھر واپس لے لو، خادم بھی لے لو، دینار بھی لے لو، اپنی بیٹی بھی واپس لے لو بلکہ میری (بیوہ) والدہ سے شادی بھی

کرلو۔ گویا وہ سیّد، غیر سیّد کو مخاطب کرتا رہتا تھا اور معاوضہ واپس کرنا چاہتا تھا۔ اس واقعہ کے بعد وہ سیّد ساٹھ (60) برس تک زندہ رہا اور اس تمام عرصے کے دوران اس کی عقل رخصت رہی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔ حاضرین میں سے کسی نے عرض کی اس سیّد کی تو دنیا اور آخرت دونوں ہی ضائع ہو گئیں۔ سیّدی دباغ نے فرمایا، اس نے سرّ کو بھی کھو دیا اور ایک اور چیز کو بھی کھو دیا جس کا میں نام نہیں لینا چاہتا۔

ایک موچی کا واقعہ

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں، میں ایک ایسے شخص سے واقف ہوں جس کی عقل سلب ہو چکی ہے اور وہ ہر وقت اپنا سر پیٹتا رہتا ہے۔ میں ایک عرصے تک اسے اس حالت میں دیکھتا رہا لیکن مجھے اس کی حالت کے سبب کے بارے میں پتہ نہیں چل سکا۔ آخر ایک دن مجھے اس کی وجہ کا بھی پتہ چل گیا۔

پیشے کے اعتبار سے وہ ایک موچی تھا۔ ایک دن ایک بزرگ اس کے پاس آئے اور اسے ایک درہم دیتے ہوئے فرمایا، مجھے ایک ٹوپی لا دو۔ یہ گیا ٹوپی خریدی مگر واپس آتے وقت نیت خراب ہو گئی اور اس نے وہ ٹوپی خود پہن لی اور اپنی پرانی ٹوپی دو روپے کے عوض میں فروخت کر دی۔ جب ولی کو اس کی اس زیادتی کا پتہ چلا تو وہ اگلے دن اس کی دکان پر آئے اور اس کے سر سے ٹوپی اتارتے ہوئے کہا، دیکھو تم نے اللہ تعالیٰ کی کون سی نعمت کو کھو دیا ہے؟ اس لمحے اسے فتح نصیب ہوئی اور اس نے ان امور کا مشاہدہ کیا جنہیں نہ کسی (عام انسانی) آنکھ نے دیکھا ہے اور نہ ہی کانوں نے ان کے بارے میں کچھ سنا ہے۔ بلکہ کسی کو اس کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ موچی کے سامنے سے اچانک یہ منظر آ کر غائب ہوا تو اس نے دیکھا وہ بدستور اپنی دکان میں موجود ہے یعنی اسے ایک لمحے کے لیے فتح نصیب ہوئی اور پھر سلب ہو گئی۔ اسی بات نے اس کا دماغ الٹ دیا۔ تاہم اسے یہ پتہ چل چکا تھا کہ یہ ساری آفت سر پر موجود ٹوپی کی وجہ سے پیش آئی ہے۔ اس کے بعد اس نے مستقل طور پر سر کو پیٹنا شروع کر دیا اور اس کا یہ معمول آج تک جاری ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک مرتبہ میں نے بھی اس شخص کو اسی حال میں دیکھا تھا۔

سرّ اور فتح میں فرق ہے

ایک مرتبہ میں نے سیّدی عبدالعزیز دباغ سے دریافت کیا، صوفیاء جس چیز کو "سرّ" قرار دیتے ہیں وہ کیا ہے؟ آپ نے ایک مثال کے ذریعے جواب ارشاد فرمایا، فرض کرو ایک بادشاہ کے پاس سونا موجود ہے بادشاہ وہ سونا اپنے مقرب امراء کو دے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں صرف چند منتخب لوگوں کو سرّ کی نعمت عطا کرتا ہے۔

میں نے دریافت کیا، کیا "سرّ" فتح کا دوسرا نام ہے؟ آپ نے فرمایا، نہیں! فتح ایک الگ چیز ہے لیکن فتح کی موجودگی میں "سرّ" زیادہ طاقتور ہو جاتا ہے کیونکہ جس شخص کو فتح عطا کر دی جائے اس کی چشمِ بصیرت وا کر دی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ آسمانوں اور زمینوں کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ اس کی سماعت کو کھول دیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ آسمان میں اڑتے ہوئے پرندے کے پر کی حرکت کی آواز بھی سن لیتا ہے اور ایک برس کی

مسافت کے برابر فاصلے سے چیونٹی کے چلنے کی آواز بھی سن لیتا ہے۔ اس شخص کی سونگھنے کی حس کو کھول دیا جاتا ہے جس کے نتیجے میں وہ مٹی، پانی، خاکی وجود، ارواح، زندوں اور مردوں کی مخصوص بو کو فوراً پہچان لیتا ہے۔ اس شخص کے چکھنے کی حس کو کھول دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ کوئی بھی چیز باقاعدہ چکھے بغیر اس کے ذائقے سے آگاہ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اس کے چھونے کی حس کو کشادہ کر دیا جاتا ہے اس کی سماعت کو کشادہ کر دیا جاتا ہے جس کے نتیجے میں بہت سی آوازیں اس کے لیے اشتباہ کا باعث نہیں بنتی ہیں اور ایک آواز دوسری کے لیے رکاوٹ نہیں بنتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر ایک ہی لمحے میں ہزاروں لوگ اس سے مخاطب ہوں تو وہ ہر ایک کی بات کو سن اور سمجھ لے گا۔ اس لیے اگر "سرّ" کے ہمراہ فتح بھی نصیب ہو جائے تو دو قوتیں حاصل ہو جاتی ہیں لیکن اگر صرف "سرّ" ہی نصیب ہو تو یہ بھی بڑی نعمت ہے تاہم صرف "سرّ" کے مالک کے پاس وہ قوت موجود نہیں ہوتی جو صاحب فتح ولی کو حاصل ہوتی ہے۔

میں نے دریافت کیا، اگر فتح کے بغیر "سرّ" حاصل ہو جائے تو کیا صورتحال پیش آتی ہے؟ آپ نے جواب دیا، سرّ کے حصول کے نتیجے میں بہت سی صفات باری تعالیٰ کا پرتو حاصل ہوتا ہے۔ ایسا شخص ہمیشہ حق پر ثابت قدم رہتا ہے۔ اس کا کہنا، سننا صرف حق ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات سے فیض حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح ایسے شخص کو عفو، بردباری، حیا، مہربانی اور اس طرح کی دیگر بہت سی اچھی صفات حاصل ہو جاتی ہیں اور پھر جب فتح بھی نصیب ہو جائے تو دونوں قوتیں نصیب ہو جاتی ہیں جن کا ذکر ابھی میں کر چکا ہوں۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں، جب قوت کے نور سے پہلے کسی شخص پر فتح نازل ہو جائے تو ایسا شخص یا تو انتقال کر جاتا ہے یا اس کی عقل زائل ہو جاتی ہے کیونکہ فتح کے حصول کے بعد اس کے وجود میں ایک بہت بڑا خلل پیدا ہو جاتا ہے لیکن اگر قوت کا نور پہلے سے موجود ہو اور پھر فتح کا نور نصیب ہو جائے تو ایسی صورت میں فتح کے حصول کے باعث جسم کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا، یہ قوت کیا ہے؟ آپ نے ایک کمزور تنکے کو دیکھتے ہوئے ارشاد فرمایا، اگر وہ قوت اس کمزور تنکے کو عطا کر دی جائے تو یہ تنکا پہاڑ کو اٹھانے کے قابل ہو جائے گا۔ لہٰذا جس شخص کو توفیق نصیب ہو وہ فتح کا نور حاصل ہونے سے پہلے قوت کے نور کے حصول کی دعا کرتا رہے۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں، جب میں نے سیّدی منصور کی خدمت میں حاضر ہونا شروع کیا تو آپ ان دنوں کپڑا بنانے کا کام کرتے تھے۔ ایک دن آپ کو روتے دیکھ کر میں نے رونے کا سبب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا، ہم کیا کریں؟ اور کیا کر سکتے ہیں؟ ابھی اس کپڑے کو بناتے وقت میں نے اس میں اللہ تعالیٰ کے فعل کا مشاہدہ کیا ہے حالانکہ پہلے میں یہ سمجھتا تھا کہ شاید یہ کپڑا میں بناتا ہوں لیکن اب پتہ چلا ہے اسے تو کوئی اور بناتا ہے۔

(سیّدی دباغ فرماتے ہیں) اس وقت تو ان کی بات میری سمجھ میں نہ آئی لیکن آج اس کا مطلب میں اچھی طرح سمجھ چکا ہوں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے عرض کی (اگر اس وقت آپ کو یہ بات سمجھ آ جاتی) تو آپ کیا جواب دیتے؟ آپ نے فرمایا، میں ان سے کہتا اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ آپ کو اس سے اگلا مرتبہ عطا فرمائے کیونکہ آپ ابھی "حادث" کے مشاہدے کی منزل تک پہنچے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے افعال کی مثال بھی حادث مخلوق کی مانند ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا، کیا سیّدی منصور کو اگلے مقام تک ترقی نصیب ہوئی؟ آپ نے فرمایا، نہیں! بلکہ اسی مقام پر رہتے ہوئے ان کا انتقال ہو گیا۔

سیّدی عمر کی شخصی خصوصیات

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں، اگر کسی شخص کو میرے شیخ سیّدی عمر کی خصوصیات کا پتہ چل جائے تو وہ کبھی بھی کسی اور شیخ کی خدمت میں حاضر نہ ہو کیونکہ ان میں چار ایسی خصوصیات موجود ہیں جو کسی میں موجود نہیں ہوں گی۔

۱- آپ کسی شخص کے بارے میں گفتگو نہیں کرتے تھے۔ محفل میں یا تنہائی میں کبھی کسی کو برے الفاظ سے یاد نہیں کرتے تھے۔

۲- گوشہ نشینی، آپ ساری زندگی، سیّدی علی بن حرزہم کی درگاہ پر گوشہ نشین رہے اور ہر وقت "دلائل الخیرات" یا تسبیح پڑھنے میں مصروف رہتے تھے۔ صرف شام کے وقت مغرب کے نزدیک، گھر تشریف لے جاتے۔ اگر درگاہ پر زائرین کا ہجوم زیادہ ہو جاتا تو درگاہ کے پاس موجود بیری کے درخت کے پاس آ کے بیٹھ جاتے اور لوگوں سے الگ ہو کر اپنے معمول میں مصروف رہتے۔

۳- آپ نے تمام بے کار چیزوں کو ترک کر دیا تھا۔ آپ کوئی بھی چھوٹی یا بڑی خوبی اپنی ذات کی طرف منسوب نہیں کرتے تھے۔

یہاں تک کہ جو لوگ سیّدی علی بن حرزہم کی درگاہ کی زیارت کے لیے آیا کرتے تھے اور بطور خاص وہ لوگ جو جمعہ کی رات درگاہ کے احاطے میں بسر کیا کرتے تھے۔ ان کے خیال میں آپ کو کوئی "سر" حاصل نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر زائرین (آپ کے بھائی) سیّدی علی سے دعا کی درخواست کیا کرتے تھے۔ آپ بھی لوگوں کی موافقت کرتے ہوئے سیّدی علی کی دعا میں شامل ہو جایا کرتے تھے۔

۴- دنیا سے بے رغبتی، جب میں نے (سیّدی دباغ نے) ان سے ملنا شروع کیا تو یہ بات میرے مشاہدے میں آئی کہ آپ روزانہ صبح سیّدی علی کے پاس آیا کرتے تھے۔ تو آپ کے پاس کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ سیّدی علی کو جو نذر وصول ہوتی اگر اس میں سے کچھ کھانے کے لیے مل جاتا تو آپ لے لیتے۔ ورنہ سارا دن بھوکے بسر کرتے۔ میں نے خود کئی بار دیکھا ہے کہ جب آپ کو روٹی کا ٹکڑا مل گیا تو آپ اس روٹی کے ٹکڑے پر تھوڑا سا تیل لگا کر نمک کے ہمراہ کھا لیتے اور اگر تیل نہ ملتا تو صرف پانی کے ہمراہ روٹی کھا لیتے۔

اولیاء کا صبر واستقامت

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں، اولیاءِ کرام میں ایک خصوصیت موجود ہوتی ہے۔ اگر عام لوگوں کو اس کے فوائد کا اندازہ ہو جائے تو وہ اس خصوصیت کے حصول کے لیے اپنا سب کچھ وارنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ وہ خصوصیت یہ ہے کہ جب تک ولی پر کوئی مصیبت نازل نہ ہو جائے وہ اس وقت تک ملول و دل گرفتہ نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ اگر اسے اس بات کا یقین ہو کہ ایک لمحے کے بعد اس پر ایک انتہائی شدید مصیبت نازل ہو گی تو پھر بھی لمحہِ موجود میں اس مصیبت کی حیثیت ولی کے سامنے اس طرح ہو گی جیسے وہ موجود ہی نہیں ہے۔ اگر چہ ولی آئندہ نازل ہونے والی مصیبتوں کا مشاہدہ کرتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کے کھانے، پینے، ہنسنے، بولنے کے عام معمولات متاثر نہیں ہوتے گویا اسے اس مصیبت کے بارے میں کچھ پتہ ہی نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اولیاءِ کرام اس بات سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے تصرف کا کوئی بھی شخص احاطہ نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ اپنے تصرف کے ذریعے اس چیز کو نافذ کر دیتا ہے جس کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ اسی طرح جس چیز کے بارے میں ولی یہ دیکھ رہا ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ضرور رونما ہو گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے تصرف کے ذریعے اسے رونما ہونے سے روک لیتا ہے۔ گویا اولیاءِ کرام اللہ تعالیٰ کے تصرف کے مشاہدے میں مشغول رہتے ہیں۔ جسے محدود نہیں کیا جا سکتا اور اس مشاہدے کے نتیجے میں ایسی راحت حاصل ہوتی ہے جس کی کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی۔

وہ ولی جسے فتح نصیب ہوتی ہے اور وہ امور کا مشاہدہ بھی کرتا ہے۔ (سب کچھ ہوتا دیکھنے کے باوجود وہ اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہتا ہے) تو جو شخص محجوب ہے اسے بدرجہِ اولیٰ اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہنا چاہیے اور ہر قسم کی پریشانی سے چھٹکارہ حاصل کر لینا چاہیے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا، وہ کون سا ولی ہے جس کے تین سو چھتیس (336) وجود ہوتے ہیں؟ آپ نے فرمایا، وہ کامل وارث یعنی غوث ہوتا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے عرض کی، غوث، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وارث ہوتا ہے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک لاکھ چوبیس ہزار (124000) وجود ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ غوث کو اتنے وجود نصیب نہیں ہوتے؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روحانی طاقت کی مانند اور کسی شخص کے پاس طاقت نہیں ہے۔ جب غوث کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا روحانی وارث کہا جاتا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ غوث سے زیادہ کسی اور شخص کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیض نصیب نہیں ہوتا۔

ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا، جن لوگوں کو ''فتح کبیر'' نصیب ہو جاتی ہے ان کے اگلے پچھلے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ ان کی نیکیاں بارگاہِ ربّ العزت میں مقبول ہوتی ہیں۔ فتح کے حصول سے پہلے ان سے صادر ہونے والے گناہوں کو نیکیوں میں تبدیل کر دیا جاتا ہے جبکہ فتح کے حصول کے بعد یہ حضرات گناہوں کے

ارتکاب سے محفوظ رہتے ہیں کیونکہ انہیں ہر وقت مشاہدۂ حق نصیب ہوتا ہے اور یہی مشاہدہ انہیں گناہوں کے ارتکاب سے محفوظ رکھتا ہے بالکل اسی طرح جیسے فرشتے گناہوں کے ارتکاب سے محفوظ رہتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآ اَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (التحریم ۶۶:۶)

''اللہ تعالیٰ ان فرشتوں کو جس بات کا حکم دیتا ہے وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے بلکہ ہر حکم کو بجالاتے ہیں''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے ''صلوۃ العارفین'' کے بارے میں دریافت کیا، یہ کیا چیز ہے؟ اور کس طرح ادا کی جاتی ہے؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا، یہ وہ نماز ہے جس میں ظاہری جسم کے ساتھ ساتھ انسان کی روح بھی نماز ادا کرتی ہے، رکوع و سجود کرتی ہے۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں، ایک دن میں نے روح اور ظاہری جسم کی طرف توجہ کی کہ ان دونوں میں کون زمین کے زیادہ قریب ہے۔ تو محافظ فرشتے نے مجھے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ تاہم روح کی نماز بہر حال مقبول ہوتی ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے عرض کی، شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ روح حق ہے، حق کی طرف سے آتی ہے اور حق ہی کی طرف واپس لوٹ جائے گی۔ ظاہری نماز کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ اکثر لوگ روحانی نماز ادا نہیں کر سکتے۔ تاہم صوفیاء کرام اپنے ظاہری جسم اور باطنی روح کے ہمراہ نماز ادا کرتے ہیں تاکہ شریعت کے احکام کی پاسداری ملحوظ رہے۔ اس کے بعد آپ نے ایک مثال کے ذریعے اس بات کی وضاحت کی کہ ایک شخص درزی کا پیشہ اس لیے اختیار کرتا ہے تاکہ اسے ریشمی کپڑے کو بنانے کا طریقہ آ جائے لیکن بالفرض اگر کسی استاد کی مدد کے بغیر اور باقاعدہ طور پر کچھ سیکھے بغیر اللہ تعالیٰ اسے ریشم سازی کا فن سکھا دے اور پھر بھی یہ شخص درزیوں کے درمیان ہی چھپا بیٹھا رہے اور درزیوں کا مخصوص لباس اور طور طریقے اختیار کرے۔ پھر درزیوں کا مخصوص ظاہری لباس ترک کر کے ریشم سازوں کا سا حلیہ اختیار کر لے، جب لوگ اس تبدیلی کی وجہ دریافت کریں تو وہ یہ جواب دے، میرا اصل مقصد ریشم سازی کا فن سیکھنا تھا وہ میں نے سیکھ لیا ہے اس لیے اب میں ریشم سازوں کا سا حلیہ اختیار کروں گا۔ حالانکہ علمِ الٰہی میں یہ طے پا چکا تھا کہ وہ شخص درزی کا پیشہ اختیار کرے گا تو اسے ریشم سازی کا فن سیکھنا نصیب ہوگا اور اس مہارت کا اظہار قیامت کے دن ہوگا۔ تو ایسے شخص کو چاہیے کہ وہ درزیوں کے حلیے میں رہے۔

اہل باطل کی فتح جادوگری ہے

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے سیّدی عبدالعزیز دباغ سے، دسویں صدی سے تعلق رکھنے والی ایک مشہور شخصیت کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا، اسے پہلے فتح نصیب ہو گئی تھی لیکن پھر وہ اپنی حالت پر ٹھہرا رہا اور آخر کار جادوگری کی طرف مائل ہو گیا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے اس کا سبب دریافت کیا تو سیّدی دباغ نے جواب دیا، جب انسان کو

فتح نصیب ہوتی ہے تو سب سے پہلے اسے لوگوں کے گناہ اور ان گناہوں کے اسباب دکھائی دیتے ہیں کہ لوگ کس طرح گناہ کی دلدل میں دھنس جاتے ہیں۔ اسی طرح اسے وہ تاریکی دکھائی دیتی ہے جس سے اہلِ ظلمت مدد حاصل کرتے ہیں اور اسی طرح کے دیگر امور دکھائی دیتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ ایسے کسی صاحب فتح کے ساتھ برائی کا ارادہ فرمالے تو اس کی توجہ مکمل طور پر انہی امور کی طرف مبذول کر دی جاتی ہے اور اگر انسان ایک لمحے کے لیے ان امور کی طرف متوجہ ہو کر اللہ تعالیٰ سے لاتعلق ہو جائے تو پھر اس کی ساری فتح انہی امور تک محدود ہو کے رہ جاتی ہے۔ یہ مقام انسان کے لیے بہت بڑی آزمائش ہوتا ہے اور شیاطین کے لیے مضبوط ٹھکانہ ہے۔ اس مقام پر آ کر انسان کو وہی مشاہدہ حاصل ہوتا ہے جو شیاطین کو حاصل ہوتا ہے لہٰذا یہ ایک دوسرے کے مددگار بن جاتے ہیں اور جادو کرتے ہیں یہ شیاطین اس انسان کی مدد کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ شخص باقاعدہ جادوگر بن جاتا ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ کسی صاحب کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرمالے تو اس کے سامنے وہ مشاہدہ آ جاتا ہے جو ان امور سے انسان کی توجہ ہٹا دیتا ہے اور انسان اگلے مقامات کی طرف ترقی کرتا چلا جاتا ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں، فتح ایک بڑی عجیب و غریب چیز ہے۔ بہت سے محبوب بندوں کو فتح نصیب نہیں ہوتی اور یہی ان کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ کیونکہ فتح کے دوران بعض اوقات ایسے امور کا مشاہدہ نصیب ہوتا ہے کہ اگر صاحبِ فتح متقی و پرہیزگار نہ ہو تو وہ ایک لمحے میں نصرانیت اختیار کرلے گا یا یہودی بن جائے گا۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جنہیں جیسے ہی فتح نصیب ہوتی ہے، اسی وقت ان کی روح پرواز کر جاتی ہے اور بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جن کا انتقال ایسی حالت میں ہوتا ہے کہ انہیں فتح نصیب نہیں ہوئی تھی لیکن قیامت کے دن اللہ تعالیٰ انہیں ایسی حالت میں دوبارہ زندہ کرے گا جو ایسے بہت سے افراد سے بہتر ہوگی جنہیں دنیا میں فتح نصیب ہوئی تھی۔

ایک مرتبہ سیّدی دباغ نے اپنے ایک عزیز[1] کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا، یہ ایک بڑا بوجھ ہے جسے اس تابوت میں رکھ دیا گیا ہے۔ ایک مرتبہ سیّدی دباغ نے اسی عزیز کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا، تمہاری ایسی بہت سی نیکیاں ہیں جنہیں دیکھ کر مجھے رشک آتا ہے اور ایک مرتبہ فرمایا، کیا تم اپنی نیکیاں مجھے دینا پسند کرو گے؟ کیونکہ میں اکثر ان کی عظمت دیکھ کر حیران ہوتا ہوں۔

سیّدی دباغ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ جب کسی شخص کو فتح نصیب ہوتی ہے تو اس کے وجود میں سے ایک سیاہ چیز کو نکال دیا جاتا ہے جو دراصل ظلمت ہوتی ہے جس نے اس کے پورے وجود کو گھیر رکھا ہوتا ہے۔ جب یہ ظلمت دور ہو جائے تو فتح کا نور انسان کے وجود پر انڈیل دیا جاتا ہے۔ یہ نور بہت عظیم ہوتا ہے۔ فرشتے اسے لے کر آتے ہیں، بعض دیگر فرشتے انسان کے جسم سے ظلمت دور کرنے میں مشغول رہتے ہیں اور جب یہ ظلمت ہٹ جاتی ہے تو وہ نور انسان کے وجود میں ڈال دیا جاتا ہے۔ جب وہ ظلمت انسان کے وجود سے نکلتی ہے اس وقت اس بات کا اندیشہ موجود

---

[1] غالب گمان یہ ہے کہ اس عزیز سے مراد، جامع ملفوظات سیّدی احمد بن مبارک سلجماسی مالکی ہیں۔ مترجم عفی عنہ

ہوتا ہے کہ شاید اس فتح کے نتیجے میں اس شخص کی عقل زائل نہ ہو جائے۔ وہ شخص موت کا شکار نہ ہو جائے اس لیے اس دوران وہ فرشتے اس دعا میں مشغول رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو فتح برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، جس شخص کو فتح نصیب ہونا ہو، فتح کے حصول سے تین دن پہلے حضرت جبرائیل علیہ السلام اس شخص سے دوستی کرتے ہیں اور اسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت سے مانوس کرتے ہیں۔ اس راستے کو اس شخص کے لیے آسان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس کے علاوہ سیّدی دباغ نے اور بھی بہت سے اسرار بیان کیے۔

فرشتے کی زیارت کا حکم

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) معزز قارئین! حضرت جبرائیل علیہ السلام کا ذکر سن کر آپ کسی پریشانی کا شکار نہ ہوں۔ بطور خاص جبکہ آپ بعض فقہا کے اس قول سے آگاہ ہوں کہ جو شخص فرشتوں کو دیکھنے کا دعویٰ کرتا ہے اس کا دعویٰ درست نہیں ہے۔ ان فقہا نے فرشتوں کو دیکھنے کی بڑی شدت سے تردید کی ہے لیکن بعض دیگر فقہا نے ان کی رائے سے اختلاف کیا ہے کیونکہ انسان کا فرشتوں کو دیکھنا کوئی محال کام نہیں ہے اور نہ ہی انسان کے کسی فرشتے کو دیکھنے کی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں کوئی کمی آئے گی بلکہ ان حضرات نے اپنے مؤقف کی تائید میں مشہور صحابی حضرت عمران بن الحصین الخزاعی کے اس واقعے سے استدلال کیا ہے۔ جس کے مطابق حضرت عمران رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرشتوں کو دیکھا کرتے تھے اور فرشتے انہیں سلام کیا کرتے تھے پھر جب انہوں نے اپنے جسم کو داغا تو یہ کیفیت ختم ہو گئی۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) امام عبدالوہاب شعرانی اپنی تصنیف ''المنن'' میں ان حضرات کے اسماء ذکر کیے ہیں جنہیں حضرت جبرائیل علیہ السلام کو دیکھنے اور ان سے گفتگو کرنے کا شرف حاصل ہے اور خود امام شعرانی کو ان حضرات سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے۔

اگر کوئی شخص کسی موضوع کے بارے میں نہ جانتا ہو تو اسے خاموش رہنا چاہیے۔ یہ سب کے لیے بہتر ہوگا، پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ متفق علیہ احادیث میں یہ بات موجود ہے کہ سابقہ امتوں کے لوگوں کو فرشتوں کو دیکھنے کا شرف حاصل ہوا ہے تو پھر اس امت کے لوگوں کے لیے یہ کس طرح ناممکن ہو سکتا ہے؟ آپ اس بارے میں صحیح بخاری کے ان ابواب کا مطالعہ کر سکتے ہیں جن میں بنی اسرائیل سے متعلق روایات نقل کی گئی ہیں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) صاحب ''فتح کبیر'' کو برزخ، جنت، دوزخ، صراط، حوض، فرشتوں، محافظ فرشتوں اور اولیاء کرام کا مشاہدہ بھی حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے ہم ان میں سے چند امور آئندہ صفحات میں بیان کریں گے۔

دسواں باب

برزخ کا بیان

برزخ کی ہئیت

ایک مرتبہ برزخ کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا: برزخ کی شکل اس طرح ہے جیسے کوئی چیز نیچے سے تنگ ہو اور جیسے، جیسے اوپر جاتے جائیں وہ کھلی ہوتی چلی جائے یہاں تک کہ جب آپ اس کے کنارے پر پہنچیں تو وہ ایک بڑے گنبد کی شکل اختیار کر جائے۔ اس کی مثال اودھ کی لکڑی کی مانند ہوتی ہے جو نیچے سے تنگ اور اوپر سے کھلی ہوتی ہے اور جب اس کے کھلے سرے پر گنبد کی مانند ٹوپی رکھ دی جائے تو یہ برزخ کی سی شکل اختیار کر جائے گی جہاں تک برزخ کے حجم کا تعلق ہے تو اس کا نچلا حصہ آسمان دنیا پر موجود ہے اور یہ پہلے آسمان کے اوپری حصے سے شروع ہو کر دیگر چھ آسمانوں کو کاٹتی ہوئی اس قدر بلندی تک چلی جاتی ہے جس کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا اور پھر وہاں اس کے سرے پر گنبد موجود ہے اور یہی گنبد بیت المعمور ہے۔

بیت المعمور

(احمد بن مبارک کہتے ہیں کہ) میں نے عرض کی، بیت المعمور ساتویں آسمان پر موجود ہے جبکہ برزخ کا ایک کنارہ پہلے آسمان پر ہے اور دوسرے کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔ لہٰذا یہ تو ہر آسمان میں موجود ہے۔ سیّدی دباغ نے جواب دیا، بیت المعمور کی وضاحت کرتے ہوئے ساتویں آسمان کے اوپری حصے کا اس لیے تذکرہ کیا جاتا ہے کیونکہ وہیں سے گنبد شروع ہو جاتا ہے اور یہ برزخ کا سب سے زیادہ بزرگ مقام ہے اور اس مقام پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان حضرات کی ارواح قیام کرتی ہیں۔ جنہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خاص نسبت حاصل ہے ان میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہرات، صاحبزادیاں اور قیامت تک آنے والی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ تمام اولاد جو عقیدۂ حق پر ثابت قدم رہے۔ ان کے علاوہ خلفائے راشدین کی ارواح' ان تمام شہداء کی ارواح جنہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ظاہری حیات میں شہادت کا شرف حاصل ہوا اور انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاطر اپنی جانیں قربان کی تھیں۔ ان کے اس نیک عمل کے صلے

میں اللہ تعالیٰ نے ان کی ارواح کو وہ قوت عطا کی ہے جو دوسروں کو نصیب نہیں ہوئی۔ اس کے علاوہ اس گنبد میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کامل روحانی ورثاء یعنی وہ اولیاءِ کرام جو مرتبہ غوثیت وقطبیت پر فائز ہوئے، کی ارواح بھی قیام کرتی ہیں۔ اس لیے یہ گنبد برزخ کا سب سے زیادہ عظیم حصہ ہے۔ جن روایات میں ساتویں آسمان پر بیت المعمور کی موجودگی کا تذکرہ ہے اس سے مراد برزخ کا یہی حصہ ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) حدیث معراج کی شرح میں "فتح الباری" کے بعض نسخوں میں علامہ ابن حجر نے بعض محدثین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ہر آسمان پر بیت المعمور موجود ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، جہاں تک برزخ کی چوڑائی کا تعلق ہے تو اس کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ سورج اسی کے گرد چکر لگاتا ہے اور اس کا ایک چکر ایک سال میں پورا ہوتا ہے۔ اس میں مختلف کھڑکیاں بنی ہوئی ہیں جن میں ارواح قیام کرتی ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاص مصاحبین کی ارواح گنبد میں قیام کرتی ہیں اور جنت کی مانند اس گنبد کے بھی سات حصے ہیں اور ہر حصہ جنت کے ایک مخصوص حصے سے مشابہت رکھتا ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خاص مقام اگرچہ وہی گنبد ہے لیکن آپ کی روحِ مبارک ہر وقت اس گنبد میں قیام نہیں کرتی کیونکہ یہ گنبد یا کوئی بھی مخلوق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روحِ مبارکہ کے اسرار کو برداشت کرنے کی صلاحت نہیں رکھتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روحِ مبارکہ کے اسرار کو صرف آپ کا جسم مبارک برداشت کرسکتا ہے۔ اسی لیے آپ کی روحِ مبارکہ عالمِ برزخ میں کسی ایک مقام پر مستقل طور پر قیام نہیں کرتی۔

جو ارواح چوتھے یا اس سے اوپر والے آسمانوں میں موجود ہوتی ہیں ان کے انوار زیادہ شدید ہوتے ہیں اور جو ارواح تیسرے یا اس سے نیچے والے آسمانوں میں موجود ہوتی ہیں ان کے انوار کم ہوتے ہیں۔ برزخ میں موجود کھڑکیاں حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے ارواح سے بھری رہتی تھیں اور ان ارواح میں نور موجود تھا (لیکن دنیا میں آنے کے بعد اور) جسم سے نکلنے کے بعد ان کے نور میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، جب حضرت آدم علیہ السلام کی روح ان کے جسم میں داخل ہوئی تو برزخ میں ان کی جگہ خالی ہوگئی اس طرح جو روح جسم میں داخل ہوتی ہے اس کی جگہ خالی ہو جاتی ہے اور ارواح جب دوبارہ برزخ میں داخل ہوتی ہیں تو اب ان کا قیام ان کھڑکیوں میں نہیں ہوتا بلکہ انہیں کسی دوسری جگہ پر رکھا جاتا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) حضرت کے کہنے کا یہ مقصد ہے کہ اگر کسی مومن کی روح ہوگی تو اسے مومن کے جسم سے علیحدہ ہونے کے بعد کسی اچھی جگہ پر رکھا جائے گا اور کافر کی روح کو اس کے حسب حال جگہ پر رکھا جائے گا۔

سیدی دباغ فرماتے ہیں، برزخ کی ان خالی کھڑکیوں کو دیگر مخلوقات (فرشتوں) کے ذریعے آباد کیا جاتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے "یوم الست" کے دن ارواح سے خطاب کیا تھا اس سے پہلے ارواح اس بات سے واقف نہیں تھیں کہ ان کا انجام کیا ہوگا اور ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارادہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ازلی ارادے کے تحت سیدنا اسرافیل علیہ السلام کو صور پھونکنے کا حکم دیا۔ انہوں نے صور پھونک دیا۔ جس کے نتیجے میں تمام ارواح ایک مقام پر اکٹھی ہوگئیں اور ان پر شدید خوف کا عالم طاری ہوگیا۔ یہ بالکل وہی کیفیت تھی جو قیامت کے دن صور پھونکنے کے بعد پیدا ہوگی۔ جب تمام ارواح ایک مقام پر اکٹھی ہوگئیں تو اللہ تعالیٰ نے ان سے خطاب فرمایا، جس کی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی۔

اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ۔ (الاعراف ۷:۱۷۲)

"کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟"

جن لوگوں کے نصیب میں سعادت لکھی ہوئی تھی انہوں نے نہایت خوشی اور سرور کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کیا۔ ان کے اس جواب دینے سے ہی ان کے مراتب کی تقسیم واضح ہوگئی۔ شیخ، مرید سے ممتاز ہو گیا اور یہ بھی پتہ چل گیا کہ فلاں کا تعلق فلاں کے ساتھ ہوگا، فلاں، فلاں سے لاتعلق ہو جائے گا۔ اسی طرح انبیاءِ کرام کے درجات اور ان کی امتوں کے درمیان فرق بھی ظاہر ہوگیا۔

لیکن بدبخت لوگوں نے جب یہ خطاب سنا تو وہ بے چین ہوگئے۔ ان کی طبیعت خراب ہوگئی اور انہوں نے مجبوری کے عالم میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کیا اور وہاں سے یوں بھاگے جیسے شہد کی مکھی دھوئیں سے دور بھاگتی ہے۔ جس کے نتیجے میں انہیں ذلت اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی وقت کافر اور مسلمان کے درمیان امتیاز نمایاں ہوگیا اور ہر روح کے لیے برزخ میں ایک مخصوص مقام مقرر کیا گیا۔ اس سے پہلے کوئی بھی روح برزخ میں کسی بھی جگہ قیام کرسکتی تھی اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوسکتی تھی۔

آج اگر کوئی شخص برزخ پر نظر ڈالے تو اسے بعض ارواح کے انوار کی قوت یا ظلمت کی کثرت کے باعث یہ پتہ چل جائے گا کہ یہ دنیا سے ہوکر واپس آچکی ہیں اور اسی طرح بعض ارواح میں انوار کے ضعف یا ظلمت کی قلت کے باعث یہ پتہ چل جائے گا کہ ابھی دنیا میں نہیں جاسکی ہیں۔ جب تک تمام ارواح ایک مرتبہ دنیا میں نہیں آجائیں گی اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی۔

قیامت کا معین علم

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس سے تو یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اہلِ کشف اس بات سے واقف ہیں کہ قیامت کب آئے گی؟ حالانکہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ۔ (لقمان ۳۱:۳۴)

"بے شک، اللہ تعالیٰ ہی کو قیامت (کے معین وقت) کا علم ہے۔"

نیز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

فِیْ خَمْسٍ لَا یَعْلَمُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ۔ (صحیح بخاری ۱:۲۷، رقم:۵۰)

"پانچ چیزوں کا علم اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کسی کو بھی نہیں ہو سکتا۔"

(اور ان میں سے ایک قیامت کے آنے کے عین وقت کا علم بھی ہے)

سیّدی دباغ نے جواب دیا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس وقت ایک خاص حکمت کے تحت یہ جواب دیا تھا۔ وگرنہ مذکورہ بالا آیت میں موجود پانچوں چیزوں کا علم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاصل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ باتیں کس طرح مخفی رہ سکتی ہیں حالانکہ ان کا علم تو (ہر زمانے کے) ساتوں اقطاب کو ہوتا ہے جن کا مرتبہ غوث سے کم ہوتا ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ غوث اور خود سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علوم کا عالم کیا ہوگا۔ حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بدولت ہر چیز کو وجود نصیب ہوا۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے وقت اور اس سے پہلے برزخ میں بہت کم نور موجود تھا لیکن جیسے جیسے اہلِ ایمان کے انتقال کے بعد ان کی ارواح برزخ میں پہنچتی گئیں برزخ کے نور میں اضافہ ہوتا چلا گیا کیونکہ انبیاءِ کرام اور اولیاءِ عظام کی ارواح جب دنیا سے رخصت ہو کر برزخ میں جاتی ہیں تو ان کے ہمراہ بے شمار انوار ہوتے ہیں کیونکہ یہ ارواح بتدریج برزخ میں داخل ہوئی تھیں اس لیے برزخ کے انوار میں بھی بتدریج اضافہ ہوتا چلا گیا۔

بعد از مرگ کفار کا ٹھکانہ

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا، دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد کفار کی ارواح برزخ میں کس جگہ قیام کرتی ہیں؟ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا، برزخ کی تہہ میں رہتی ہیں اور ان کا ٹھکانا کوئلے کی مانند سیاہ ہوتا ہے اور یہ سیاہی ان کے کفر کی سیاہی ہوتی ہے۔ آخرت کا معاملہ دنیا سے بالکل مختلف ہے۔ دنیا میں اگر کوئی شخص صاف شفاف لباس پہن لے تو جب تک باہر کی کوئی گندگی اس پر نہیں لگے گی لباس میلا نہیں ہوگا لیکن آخرت میں باطن کی گندگی ظاہری لباس پر اثر انداز ہوتی ہے۔ بالفرض آخرت میں کوئی کافر صاف شفاف سفید لباس پہن لے تو ایک لمحے کے اندر وہ کپڑا سیاہ ہو جائے گا۔ سیّدی دباغ فرماتے ہیں، خلا کا حکم بھی دنیا اور آخرت میں ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ دنیا میں اگر کہیں روشنی ہوگی تو ہر چیز روشن ہوگی اس میں کافر یا مسلمان کی کوئی قید نہیں ہے لیکن اس کے برعکس انسان کا وجود آخرت میں ماحول پر اثر انداز ہوگا اور اہلِ ایمان جہاں موجود ہوں گے وہاں ہر طرف روشنی ہی روشنی ہوگی اور کفار جس جگہ قیام کریں گے وہاں ہر طرف تاریکی پھیلی ہوگی۔ مختصر یہ کہ آخرت میں باطن کا اعتبار کیا جائے گا کیونکہ انسان کی حقیقت اس کا باطن ہے اور آخرت حقیقت کا گھر ہے۔

ایک مرتبہ آخرت میں پسینے کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے آپ نے ارشاد فرمایا، (قیامت کے دن) بعض لوگ منہ تک پسینے میں ڈوبے ہوئے ہوں گے، بعض کمر تک اور بعض گھٹنوں تک پسینے میں ڈوبے ہوں گے حالانکہ زمین کی سطح ہموار ہوگی۔ بالفرض اگر دنیا میں یہ تینوں ایک جگہ پر کھڑے ہوں تو یہ ناممکن ہے کہ تینوں کے ڈوبنے کی مقدار ایک دوسرے سے مختلف ہو لیکن آخرت میں ان کے باطن کا اعتبار کرتے ہوئے تینوں کو الگ الگ کیفیت سے دوچار کیا جائے گا۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، برزخ کے جس حصے میں کفار رہتے ہیں وہاں عمودی اور مستطیل ''چمنیاں'' ہیں جن کا دوسرا سرا جہنم سے ملتا ہے اور ان ''چمنیوں'' میں رہنے والے کفار یہیں رہ کر جہنم کے عذاب کا مزہ چکھتے ہیں اور ان ''چمنیوں'' میں منافقین اور کفار کی ارواح رہتی ہیں۔

برزخ کے جس حصے میں اہلِ ایمان رہتے ہیں وہاں بھی کچھ چمنیاں موجود ہیں۔ جن کا دوسرا سرا جنت سے جا ملتا ہے اور یہ اہلِ ایمان برزخ میں رہتے ہوئے جنت کی خوشبو اور ٹھنڈک کو یوں محسوس کرتے ہیں گویا وہ جنت ہی میں قیام پذیر ہیں۔ ان چمنیوں میں شہداء کی ارواح اور وہ لوگ رہتے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہو۔

یہ دونوں طرح کی چمنیاں اگرچہ برزخ کا حصہ ہیں لیکن ان کی ظاہری شکل ایسے ہے جیسے کوئی چیز اصل وجود سے باہر نکلی ہوئی ہو اور ان کا دوسرا سرا برزخ کی بجائے کسی اور طرف جاتا دکھائی دیتا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا، برزخ کی تہہ آسمانِ دنیا پر موجود ہے اور کفار کی ارواح اس تہہ میں رہتی ہیں۔ جس کا بدیہی مطلب یہ ہوگا کہ ان کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں لیکن ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ۔ (الاعراف ۷:۴۰)

''ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے۔''

نیز علماء بیان کرتے ہیں، اہلِ ایمان کے لیے برزخ ان کی قبروں سے لے کر اعلیٰ علیین تک ہے جبکہ کفار کے لیے ان کی قبر سے لے کر ''سجین'' تک ہے جو (کائنات) کا سب سے پہلا حصہ ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، جب کافر کی روح آسمانِ دنیا یعنی برزخ کی تہہ میں پہنچتی ہے تو اس پر حجابات مسلط کر دیے جاتے ہیں اس کی بینائی، سماعت، قلب بلکہ تمام اعضاء حجابات کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں اور گویا قرآن نے ان حجابات کو بطور مثال یوں بیان کیا کہ گویا ان کے لیے آسمان کے دروازے کھولے ہی نہیں جاتے۔

سیّدی دباغ نے اس کا ایک اور جواب دیا، برزخ میں رہنے والے کفار کی ارواح کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ قسم ہے جو ظلمت اور بدحالی کے غلبے کے باعث حجابات کی لپیٹ میں ہے یہاں تک کہ اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا اور یہ حجاب اللہ تعالیٰ کا غضب ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔ دوسری قسم وہ ہے جو مکمل طور پر

حجاب کی لپیٹ میں نہیں ہے۔ انہیں صرف اس عذاب کا مشاہدہ نصیب ہوتا ہے جو ان کے لیے تیار کیا گیا ہے لہٰذا ان دونوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی مثال اسی طرح ہے جیسے ان کے لیے آسمان کے دروازے کھولے ہی نہیں جاتے۔

آیت کریمہ کی مختلف تفاسیر

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) سیّدی عبدالعزیز دباغ کے اس جواب کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ خود مفسرین کے نزدیک بھی اس آیت کریمہ کی تفسیر میں اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ان کفار کی (مرنے کے بعد) دعاؤں کی قبولیت کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے۔ یعنی (مرنے کے بعد) وہ (بخشش کی) کتنی ہی دعائیں کیوں نہ کرلیں یہ دعائیں قبول نہیں ہوں گی لیکن بعض مفسرین اس بات کے قائل ہیں کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح مؤمنین کی ارواح کے لیے آسمانوں کے دروازے کھولے جاتے ہیں اس طرح کفار کی ارواح کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے۔ اس اختلاف کی وضاحت تفسیر بیضاوی میں کی گئی ہے۔

اسی طرح ایک روایت میں یہ بات منقول ہے کہ (معراج کی رات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا) حضرت آدم علیہ السلام کے بائیں جانب ان کی اولاد میں سے کفار کی ارواح موجود تھیں۔ اس حدیث کے بارے میں بھی علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض علماء حدیث کا ظاہری مفہوم مراد لیتے ہیں اور بعض نے ان الفاظ کی تاویل کی ہے۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے مذکورہ بالا سوال کا ایک یہ جواب بھی عنایت کیا، برزخ کے بارے میں' میں نے یہ کہا ہے کہ اس کا آغاز آسمانِ دنیا سے ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ برزخ ہمارے سر کے اوپر موجود ہوگی۔ عین ممکن کہ یہ ہمارے پاؤں کے نیچے موجود ہو۔ کیونکہ آسمان نے زمین کو گھیرا ہوا ہے اور ہر آسمان نے اپنے اندر موجود اشیاء کو گھیرا ہوا ہے۔ (اس میں دیگر اشیاء کے علاوہ پہلا آسمان اور اس کے اندر موجود زمین بھی شامل ہوگی جبکہ عرش نے ان سب (آسمانوں اور ان کے اندر موجود اشیاء) کو گھیرا ہوا ہے۔ برزخ ایک بہت بڑی مخلوق ہے اور اس کی تہہ میں موجود سب سے تنگ ترین حصہ سات زمینوں کے برابر چوڑا ہے۔ لہٰذا اگر ہم اسے اپنے سر کے اوپر بھی قرار دیں تو بھی اس کا ایک حصہ ہمارے پاؤں کے نیچے ہوگا۔ لہٰذا بعض علماء نے برزخ میں کفار کی ارواح کا مقام سب سے نچلا حصہ بیان کیا ہے۔ تو اس سے مراد برزخ کی وہ تہہ ہوگی جو ہمارے پاؤں کے نیچے کی جانب کی طرف ہے۔

برزخ کے انتہائی کنارے کون سے ہیں؟

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) سیّدی عبدالعزیز دباغ کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ برزخ ساتوں آسمانوں کو

چیرتے ہوئے اعلیٰ علیین تک پہنچ جاتا ہے (اور دوسری طرف) ساتوں زمینوں کو پھاڑتے ہوئے "اسفل سافلین" تک چلا جاتا ہے۔ گویا اس کا ایک کنارہ "سجین" میں ہے اور بالائی کنارہ "علیین" میں ہے۔ سیّدی دباغ نے بار بار اس بات کی صراحت کی ہے۔ اس سے اس بات کی تائید ہو جاتی ہے کہ جنت ساتوں آسمانوں کے اوپر ہے اور دوزخ سات زمینوں کے نیچے ہے۔ لہٰذا برزخ کا نیچے والا کنارہ جہنم کی طرف ہوگا اور یہاں کفار کی ارواح رہتی ہوں گی اور برزخ کا اوپری کنارہ جنت کی طرف ہوگا اور یہاں اہلِ ایمان کی ارواح رہتی ہوں گی۔ لہٰذا یہ جواب قرآن کی اس آیت کے منافی نہیں ہوگا۔

ایک دفعہ ارشاد فرمایا، بعض کفار کی ارواح کو برزخ میں جانے سے روک دیا جاتا ہے اور اس پر ان شیاطین کو مسلط کر دیا جاتا ہے جو دنیا میں اس کے دل میں وسوسے ڈالا کرتے تھے۔ لہٰذا جیسے ہی اس کی روح جسم سے نکلتی ہے شیاطین اسے گھیرے میں لے لیتے ہیں اور اس سے اسی طرح کھیلتے ہیں جیسے کوئی بچہ گیند کے ساتھ کھیلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے۔ لہٰذا وہ شیاطین اس کی روح کو ایک دوسرے کی طرف پھینکتے ہیں۔ اٹھا کر پٹختے ہیں جس کے نتیجے میں اسے ناقابلِ برداشت عذاب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پھر جب قبر میں اس کا جسم مٹی کا حصہ بن جاتا ہے تو اس کی روح کو برزخ کی تہہ میں جانے کی اجازت ملتی ہے۔ مذکورہ بالا آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اگرچہ ان تمام جوابات میں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ ایک ہی حقیقت کو مختلف اعتبار سے بیان کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان تمام جوابات میں بعض امور مشترک ہیں لیکن کیونکہ میں نے مختلف اوقات میں یہ جوابات سنے تھے اس لیے انہیں الگ الگ تحریر کر دیا ہے۔

اب اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ حضرت کے جوابات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ برزخ کی تہہ آسمان دنیا پر موجود ہے لیکن یہاں یہ کہا جا رہا ہے کہ برزخ کی تہہ "اسفل سافلین" میں موجود ہے۔ تو ان دونوں باتوں کے درمیان تضاد موجود ہے کیونکہ ایک جواب کے اعتبار سے برزخ کی تہہ ساتویں زمین کے نیچے موجود ہے اور دوسرے جواب کی رو سے برزخ کی تہہ پہلے آسمان کے اوپر موجود ہے؟ اس کا جواب یہ ہوگا کہ جہاں پہلے آسمان کے اوپری حصے کو برزخ کی تہہ قرار دیا گیا ہے اس سے مراد مؤمنین کے مخصوص حصے کی تہہ ہے اور جہاں اسفل سافلین کو برزخ کی تہہ قرار دیا گیا ہے اس سے مراد کفار کے مخصوص حصے کی تہہ ہے۔

اگر اس پر یہ اعتراض کیا جائے کہ حضرت کے ایک جواب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کفار کی ارواح برزخ کی اس تہہ میں موجود ہیں جو آسمان دنیا پر ہے لہٰذا نتیجہ یہ نکلے گا کہ یہ ارواح اسفل سافلین میں نہیں بلکہ آسمان دنیا پر موجود رہتی ہیں۔ لہٰذا تضاد سامنے آ گیا! اس کا جواب یہ ہے کہ کفار کی ارواح برزخ کے مختلف مقامات پر رہتی ہیں۔ اس سے پہلے بھی ہم اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں۔ لہٰذا بعض ارواح برزخ کے اس حصے میں رہتی ہیں جو آسمانِ دنیا پر ہے۔ بعض برزخ کی چمنیوں میں رہتی ہیں اور بعض اس کے دیگر حصوں میں رہتی ہیں۔

ایک مرتبہ سیّدی دباغ نے بیان فرمایا، میں نے برزخ کے اس حصے میں جو تیسری زمین کے برابر ہے بعض لوگوں کو عذاب کا شکار دیکھا جو تنگ کوٹھریوں اور گہرے کنوؤں میں عذاب سہہ رہے تھے۔ ان میں سے کسی کے منہ سے جیسے ہی کوئی آہ نکلتی اسے فوراً برزخ کی گہرائی میں پھینک دیا جاتا اور یوں وہ برزخ کے مختلف درجات میں اوپر نیچے ہوتا رہتا۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں میں ابھی ان لوگوں کو دیکھ ہی رہا تھا جب ایک شخص نے مجھے آواز دی میں دنیا میں اس شخص سے اچھی طرح واقف تھا۔ میں نے اس کا نام لے کر اس سے پوچھا، اے بدنصیب! تو کس جرم کی پاداش میں یہاں پہنچا ہے؟ ابھی وہ جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ اسے نیچے پھینک دیا گیا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے عرض کی، جس مقام پر اسے پھینکا گیا ہوگا وہ بھی برزخ ہی کا حصہ ہوگا کیونکہ وہ شخص تیسری زمین کے برابر موجود برزخ کے حصے میں عذاب بھگت رہا تھا جبکہ برزخ ساتویں زمین کے نیچے تک موجود ہے۔ سیّدی دباغ نے میری بات کی تائید کی۔ جس شخص کو سیّدی دباغ نے عذاب کا شکار دیکھا تھا وہ دنیا میں مسلمان کے طور پر معروف تھا۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی مشیت کا یہ عجیب پہلو ہے کہ کفار آخرت میں اہلِ ایمان سے کوئی نفع حاصل نہیں کر سکتے حالانکہ آخرت میں کوئی حجاب موجود نہیں حالانکہ اہلِ ایمان کی ارواح کے انوار اس قدر شدید ہوتے ہیں کہ چاند اور سورج کی روشنی بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی بلکہ ان کی روشنی اہلِ ایمان کا فیض ہے لیکن اس کے باوجود کفار ان انوار سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکیں گے بلکہ بدستور اپنی ظلمتوں میں گم رہیں گے جس کی تاریکی کے اظہار کے لیے الفاظ کا دامن تنگ ہے۔ اس کی مثال آپ یوں سمجھ سکتے ہیں جیسے کسی چیز کو برتن میں ڈال کر سیسے کے ذریعے اس کا منہ بند کر دیا جائے۔ البتہ آخرت میں نہ تو کوئی مخصوص برتن ہوگا اور نہ ہی برتن کو کسی خاص چیز سے بند کیا جائے گا۔ صرف اللہ تعالیٰ کی مشیت حد فاصل کا کام دے گی۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، البتہ مؤمنین کی ارواح کو ایک دوسرے سے فائدہ حاصل ہوگا۔ ایک روح دوسری سے فیض حاصل کرے گی۔ ایک روح دوسری کی شفاعت کرے گی یہاں تک کہ آپ کو کسی روح پر گناہ کے اثرات دکھائی دیں گے لیکن جب وہ روح کسی مقرب روح کے قریب ہوگی تو اس مقرب کی قربت کی وجہ سے گناہ کے آثار ختم ہو جائیں گے۔

ایمان اور کفر ڈورے

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، برزخ میں مؤمنین کے ٹھکانے اور جنت کے درمیان نور کے کچھ ڈورے موجود ہیں۔ جو اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب مؤمنین کی ارواح دنیا سے واپس برزخ میں آ جاتی ہیں اور یہ ڈورے درحقیقت ان ارواح کے ایمان کا نور ہوتا ہے جیسے ایک شخص کی روح سے اس کے ایمان کا نور نکل کر جنت تک چلا جاتا ہے اور پھر اسی نور کے ذریعے اس شخص کو جنت کی نعمتوں کی لذت، برزخ میں رہتے ہوئے محسوس ہوتی

ہے۔

اسی طرح برزخ میں کفار کے رہائشی مقامات اور دوزخ کے درمیان ظلمت کی ڈوریاں ہوتی ہیں اور یہ ڈوریاں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب ان کی روح دنیا سے واپس برزخ میں آتی ہے۔ یہ ڈوری درحقیقت ان کا کفر ہوتا ہے جس کی وساطت سے جہنم کے عذاب کا ذائقہ برزخ میں رہتے ہوئے انہیں محسوس ہوتا ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، برزخ کی طرح دنیا میں بھی اہلِ ایمان کے اجسام کے درمیان نور کے ڈورے موجود ہوتے ہیں اور صاحبِ بصیرت اولیاء ان ڈوروں کو اسی طرح دیکھتے ہیں جیسے کسی بند دروازے میں موجود ایک چھوٹے سے سوراخ کے راستے سے سورج کی کرن اندر آتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اسی طرح ہر مومن کے سر میں سے ایمان کے نور کی شعاع نکلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ جس کا کم از کم حجم ایک بالشت کے برابر ہوتا ہے اور زیادہ سے زیادہ یہ برزخ میں اس بندہ مومن کے مخصوص مقام تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کا حجم بھی ازلی تقسیم کے مطابق ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ موٹائی میں بھی اس کا حجم مختلف لوگوں میں مختلف ہوتا ہے۔

اسی طرح کفار کے اجسام میں ظلمت کا ''ڈورا'' موجود ہوتا ہے جو ان کے وجود سے نکل کر برزخ میں ان کے مخصوص مقام تک چلا جاتا ہے تاہم اس کا رنگ گندھک کی آگ کی مانند سیاہی مائل نیلا ہوتا ہے۔ جس شخص کے جسم پر یہ ڈورا دکھائی دے وہ یقیناً ایک بدبخت شخص ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔ کفر کے مراتب میں اختلاف کے مطابق اس ڈورے کا حجم کم اور زیادہ ہوتا ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، ایک دفعہ میں نے چند یہودی ملاحوں کو دیکھا تو ان کے سروں سے تاریک ڈورے نکلتے ہوئے دکھائی دیے جو افق میں جا کر ایک دبیز سیاہ دھند کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ ان میں سے بعض ڈوروں میں کہیں تھوڑی سی سفیدی دکھائی دی تو مجھے اندازہ ہوا کہ ان ''ڈوروں'' کے مالکان عنقریب مسلمان ہو جائیں گے۔ اسی طرح بعض اوقات کسی مسلمان بستی کی طرف توجہ کروں تو وہاں سے سفید ڈورے نکل کر برزخ کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ بعض اوقات ان میں سے چند ایک میں نیلاہٹ دکھائی دی جاتی ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ ان کے مالکان میں بدبختی کے کچھ اثرات پائے جاتے ہیں۔

تقدیر کا فیصلہ

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) درج ذیل حدیث میں اسی طرح کے لوگوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ان احدکم لیعمل بعمل اهل الجنة حتی ما یکون بینه وبینها الا ذراع ثم یسبق علیه الکتاب فیختم له بعمل اهل النار فیدخلها وان احدکم لیعمل بعمل اهل النار حتی مایکون بینه وبینها الا ذراع یسبق علیه الکتاب فیختم له بعمل اهل الجنة فیدخلها۔ (جامع ترمذی ۴:۴۴۶، رقم ۲۱۳۷)

''ایک شخص بظاہر اہلِ جنت کے سے عمل کرتا ہے لیکن پھر تقدیر کا حکم غالب آ جاتا ہے اور وہ جہنمیوں

کی مانند عمل کرنے لگتا ہے اور آخر کار جہنم کا ایندھن بن جاتا ہے۔ اسی طرح ایک شخص اہلِ دوزخ کے سے عمل کرتا ہے اور اس کے اور دوزخ کے درمیان صرف ایک بالشت کا فاصلہ باقی رہ جاتا ہے پھر وہ اہلِ جنت کے سے عمل شروع کر دیتا ہے اور آخر کار جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔''

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، جو شخص تقدیر کے فیصلے کی اہمیت کا اندازہ لگانا چاہے اسے یہ حدیث قدسی پیشِ نظر رکھنی چاہیے۔

هولاء الى الجنة ولا ابالى ء هولاء الى النار ولا ابالى۔

''یہ جنتی ہوں گے اور مجھے ان کی کوئی پرواہ نہیں اور یہ جہنمی ہوں گے اور مجھے ان کی بھی کوئی پرواہ نہیں ہے۔''

اسی طرح دو بچوں کو دیکھ لینا چاہیے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس کا مطلب یہ ہے کہ بچے مکلف نہیں ہیں لیکن تقدیر کے فیصلے کے مطابق ان کے سروں سے بھی سفید یا نیلے ڈورے نکلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جنہیں کوئی بھی صاحبِ کشف با آسانی دیکھ سکتا ہے۔

ایک دفعہ سیّدی دباغ کے ہمراہ میں دو بچوں کے پاس سے گزرا جن کی عمر چار سال کے قریب ہو گی۔ وہ دونوں کھیل رہے تھے۔ سیّدی دباغ نے مجھ سے کہا، دیکھو! اس نے کیا کام کیا ہے؟ اور دوسرے کا کیا قصور ہے؟ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) آپ کا مطلب یہ تھا کہ دونوں میں سے ایک کے سر سے سفید اور دوسرے کے سر سے نیلا ڈورا نکلتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

اسی طرح ایک مرتبہ ہم کچھ بچوں کے پاس سے گزرے جو کھیل کود میں مشغول تھے۔ آپ نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے ارشاد فرمایا، آج کل کے بچے آئندہ آنے والے بچوں سے بہتر ہیں کیونکہ ان کے انوار میں زیادہ خوبصورتی اور ملائمت محسوس ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ ہم کہیں جا رہے تھے کہ راستے میں ایک بچہ سامنے آ گیا، آپ نے اس کا نام دریافت کیا اس نے جواب دیا ''مقداد''۔ آپ نے فرمایا اس بچے کے ہاں ایک ولی پیدا ہو گا جسے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں خاص مقام حاصل ہے۔

ایک مرتبہ ایک بچے کو دیکھ کر آپ نے ارشاد فرمایا، ذرا دیکھو! اس کے نورِ ولایت کو دیکھو! اس کے چہرے میں موجود حلاوت کو دیکھو! اس کی ذات میں موجود ولایت کو دیکھو! جو مخفی نہیں ہے۔ پھر آپ نے مجھے تاکید کی اس کا خاص خیال رکھنا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) الحمد للہ، آج وہ بچہ بڑا ہو چکا ہے اور ایک عظیم شخصیت کا مالک ہے۔ بلند روحانی مرتبے خوبصورت ظاہری شخصیت اور اچھے اخلاق سے آراستہ ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، جیسے ہی کوئی بچہ ماں کے پیٹ سے باہر آتا ہے اسی وقت صاحبِ کشف کو پتہ

چل جاتا ہے کہ کس مقام تک پہنچے گا۔ جیسے ایک تالاب میں جب تک کچھ نہ اگے نہیں پتہ چلتا کہ کیا اس میں کوئی پودا موجود ہے یا نہیں ہے لیکن جب پودا نکل آئے تو پتہ چل جاتا ہے کہ یہ پودا تربوز کا ہے یا کسی اور چیز کا یا جیسے ایک پھول پیلا ہو تو وہ سبز نہیں ہو سکتا اور اگر سرخ ہو تو زرد نہیں ہو سکتا۔

منافقین کفار سے بدتر کیوں ہیں؟

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا، منافقین کو کفار سے بدتر کیوں قرار دیا گیا ہے؟ نیز انہیں جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں کیوں رکھا گیا ہے؟ حالانکہ بظاہر یہ نمازیں بھی پڑھتے ہیں، روزے بھی رکھتے ہیں، حج کرتے ہیں، جہاد میں شریک ہوتے ہیں اور یہ سب کچھ نہ بھی ہو تو کم از کم ظاہری طور پر مسلمانوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتے؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا، سبحان اللہ! کیا بات کہی ہے آپ نے، کفر اور اس کے خباثت اعمال کی وجہ سے نہیں بلکہ تقدیر کے فیصلے کے مطابق ہوتی ہے۔ بارہا مجھے یہ مشاہدہ کرنے کا موقع ملا ہے کہ برزخ سے نیلے رنگ کا ایک موٹا اور بڑا ڈورا نکل کر کافروں کے کسی ملک پر نازل ہوا اور میں نے یہ خیال کیا کہ یہ کافروں کے حکمران پر نازل ہوگا یا پھر کسی انتہائی گنہگار شخص پر نازل ہوگا لیکن پھر جب میں نے اس ڈورے کا تعاقب کیا تو وہ ایک بوڑھے اور ضعیف شخص پر نازل ہوا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک مرتبہ سیّدی دباغ نے مجھے بتایا، نیلا ڈورا اگرچہ بدبختی کی علامت ہے لیکن بعض اوقات اس کا رنگ تبدیل ہو جاتا ہے خاص طور پر اس وقت جب اس کا مالک نیک لوگوں کی صحبت اختیار کر لے تو یہ ڈورا بتدریج صاف ہوتے ہوئے مکمل طور پر نیک لوگوں کے ڈوروں کی مانند ہو جاتا ہے۔

اگر ڈورے کا رنگ نیلا ہو لیکن اس میں چمک موجود نہ ہو تو بعد میں اس کا رنگ تبدیل (ہو کر سفید) ہو جاتا ہے لیکن اگر چمک بھی موجود ہو تو پھر اس کا رنگ تبدیل نہیں ہوتا۔

اجتماعیت کے فوائد

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، انبیاءِ کرام کی بعثت کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ یہ حضرات لوگوں کو ایک کلمے پر جمع ہونے کی دعوت دیتے ہیں تاکہ وہ سب ایک ملت کی حیثیت اختیار کر جائیں اور ایک دوسرے کو نصیحت کریں، (نیکی کے کاموں میں) ایک دوسرے کی مدد کریں کیونکہ ان میں بعض لوگ سعادت مند ہوتے ہیں جبکہ بعض کے ڈورے نیلے ہوتے ہیں ایسے لوگ اگر اہلِ سعادت کی صحبت اختیار کر لیں تو انہیں بھی سعادت نصیب ہو جاتی ہے گویا بعثت کے نتیجے میں اجتماعیت پیدا ہوتی ہے اور اجتماعیت حالت میں تبدیلی کا باعث بنتی ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان کی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ''جماعت'' کا دامن تھامنے اور اس سے علیحدگی سے بچنے کی تلقین کی ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ جو شخص ''جماعت'' سے الگ ہو جائے وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک مرتبہ میں سیّدی عبدالعزیز کے ہمراہ بازار سے گزر رہا تھا اور آپ سے مختلف سوالات کر رہا تھا اچانک ایک شخص ہمارے سامنے آ گیا جو ایک صوفی بزرگ کی حیثیت سے لوگوں میں مشہور تھا۔ اس نے ہمیں ایک نصیحت کی لیکن درحقیقت وہ ہم پر چوٹ کرنا چاہ رہا تھا۔ ہم خاموش رہے جب وہ چلا گیا تو سیّدی دباغ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا، اس کا ڈورا نیلا ہے اور اس بات پر کئی مرتبہ قسم اٹھائی پھر فرمایا، مجھے نہیں معلوم کہ اس کے ڈورے کا رنگ تبدیل ہوگا یا نہیں۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، مرنے کے بعد روح برزخ میں پہنچ جاتی ہے اور جب جسم گلنے سڑنے لگتا ہے تو روح کا ''سرّ'' جسم سے نکال دیا جاتا ہے۔ تاہم بعض اولیاء کی ارواح کا سرّ قبر میں موجود رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے ایمان کے نور کا ڈورا قبر سے نکل کر برزخ میں موجود روح کی طرف جاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جیسے ان کی زندگی میں ان کے جسم سے نکلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، کئی مرتبہ ''فاس'' میں مدفون حضرات کی قبور میں سے انوار نکلتے ہوئے دکھائی دیے جو ایک ستون کی مانند قبر سے نکل کر برزخ تک جاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ حضرات اولیاءِ کرام ہیں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اسی طرح آپ نے کئی مرتبہ مجھے بتایا کہ اس جگہ کوئی بڑا ولی دفن ہے کیونکہ یہاں سے نور نکل کر برزخ کی طرف جاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

روضہ انور کے انوار

(سیّدی دباغ فرماتے ہیں) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضۂ مبارک سے بھی نور کا ایک ستون نکل کر برزخ میں اس مقام کی طرف جاتا ہے جہاں آپ کی روحِ مبارکہ قیام کرتی ہے۔ فرشتے گروہوں کی شکل میں آ کر اس نور کا طواف کرتے ہیں اور برکت کے حصول کے لیے اس نور کے قریب ہوتے ہیں اور اس طرح اس نور کی طرف لپکتے ہیں جیسے شہد کی مکھیاں یعسوب (ملکہ مکھی) کی طرف لپکتی ہیں۔ چنانچہ اگر کسی فرشتے کو اللہ تعالیٰ کے کسی حکم یا سرّ کو برداشت کرنے میں دقت محسوس ہو یا کوئی اور دقت ہو تو وہ فوراً آ کر اس نور کا طواف شروع کر دیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں اس کی قوت میں اضافہ ہو جاتا ہے اس نور کے گرد فرشتوں کا طواف ہر وقت جاری رہتا ہے۔ ایک گروہ جاتا ہے دوسرا آ جاتا ہے اور سب نہایت تیزی کے ساتھ طواف کرتے ہیں۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں، جب اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل و کرم کی بدولت مجھے فتح عطا کی تو میں ''فاس'' میں موجود تھا۔ میں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبرِ مبارک میرے سامنے موجود ہے، پھر میں نے اس میں سے نکلنے والے نور کو دیکھا۔ جو میرے قریب آتا چلا گیا اور جب میرے بالکل قریب آ گیا تو اس میں سے ایک صاحب باہر تشریف لائے۔ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔

اس وقت میرے شیخ (غوث زمان) سیّدی عبداللہ برناوی نے فرمایا، اے عبدالعزیز! یہ سرکارِ دو عالم صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ آج اللہ تعالیٰ نے تجھے اپنی رحمت کی آغوش میں لے لیا ہے۔ اب مجھے یہ ڈر نہیں ہے کہ شیطان تمہیں بہکا سکے گا۔

بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَان

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں، برزخ بھی عجیب چیز ہے کہ اہلِ ایمان کے نور کو اس طرح برداشت کر لیتی ہے کہ عقل دنگ رہ جائے حالانکہ سورج کا نور اہلِ ایمان کی ارواح کے نور سے حاصل کیا گیا ہے جبکہ چاند اور ستاروں کا نور سورج سے حاصل کیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود برزخ کا نیچے والا حصہ مکمل طور پر تاریکی میں ڈوبا رہتا ہے اور اسے اہلِ ایمان کے نور کی وہ روشنی نصیب نہیں ہوتی جس کے ذریعے سورج روشن ہو گیا تھا۔ اس لیے کہ اگر یہ وہ روشنی حاصل کر لیں تو برزخ کا نیچے والا حصہ مکمل طور پر روشن ہو جائے گا اور کفار کی ارواح مؤمنین کی ارواح سے نفع حاصل کر لیں گی اور یہ بات اللہ تعالیٰ کی مشیت میں شامل نہیں ہے اسی لیے سورج نے مؤمنین کی ارواح سے نفع حاصل کر لیا کیونکہ وہ برزخ سے باہر ہے اور کیونکہ دیگر ستارے اس کے بالمقابل ہیں اس لیے انہوں نے سورج کے نور سے روشنی حاصل کر لی۔ جن میں چاند بھی شامل ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے عرض کی، علم نجوم کے ماہرین اس بات کے قائل ہیں کہ ستارے آٹھویں آسمان پر موجود ہیں؟ آپ نے فرمایا: ان کی دلیل کیا ہے؟ میں نے عرض کی، ان کا کہنا ہے کہ سات سیارگان اور دیگر ستاروں کی رفتار میں فرق ہے۔ سیّدی دباغ نے فرمایا، ان کا گمان غلط ہے۔ تمام ستارے آسمانِ دنیا پر موجود ہیں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس کے بعد سیّدی دباغ نے ساتوں آسمانوں اور ان میں موجود اشیاء کے بارے میں تفصیل سے بیان کیا لیکن یہ باتیں تحریر نہیں کی جا سکتی ہیں۔ قارئین اس غلط فہمی کا شکار نہ رہیں کہ میں نے سیّدی دباغ کے تمام ملفوظات یہاں نقل کر دیے ہیں بلکہ میں نے صرف بعض ملفوظات یہاں نقل کیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان سے نفع حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

گیارہواں باب

جنت کا بیان

ایک مرتبہ جنت الفردوس کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے سیّدی دباغ نے ارشاد فرمایا، دنیا میں انسان جن نعمتوں کا تذکرہ کرتا ہے اور وہ تمام نعمتیں جن کا ذکر انسان نے کبھی نہیں سنا وہ سب جنت الفردوس میں موجود ہیں۔ جنت کی (جملہ اقسام میں موجود) تمام نہریں اسی جنت سے نکلتی ہیں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) یہ بات ''صحیح بخاری'' اور احادیث کی دیگر کتب میں بھی موجود ہے۔ ان نہروں کی کیفیت یہ ہے کہ ایک نہر میں بیک وقت چار اشیاء دودھ، شہد، پانی اور شربت بہہ رہی ہوں گی لیکن خصوصیت یہ ہے کہ ان چاروں میں سے کوئی ایک چیز دوسری کے ساتھ نہیں ملے گی جیسے قوس قزح کا ہر رنگ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے نیز یہ جنتیوں کی خواہشات کے مطابق بہیں گی۔ ایک جنتی کو چاروں چیزیں مرغوب ہیں۔ اس کے محل کے پاس سے گزرتے ہوئے نہر میں چاروں نعمتیں موجود ہوں گی۔ کسی کو دو چیزیں مرغوب ہیں تو اس کے محل کے پاس سے گزرتے وقت نہر میں صرف وہی دو چیزیں موجود ہوں گی باقی دونوں موجود نہیں ہوں گی۔ غرضیکہ جنت میں ہر جنتی کی خواہش کے مطابق نعمتیں میسر ہوں گی لہٰذا اگر آپ صرف اس نہر کا جائزہ لیں تو کہیں اس میں چاروں نعمتیں بہتی ہوئی دکھائی دیں گی اور کہیں دو اور کہیں تین اور ایک یا بعض اوقات چار سے بھی زیادہ نعمتیں بہتی ہوئی دکھائی دیں گی۔ تاہم ایک ساتھ بہنے کے باوجود کوئی چیز دوسری میں خلط ملط نہیں ہوگی۔ پس ان کا خالق (ہر عیب سے) پاک ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، ان کا بہاؤ کھدی ہوئی جگہ میں نہیں ہوگا۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک حدیث میں بھی یہی بات منقول ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے عرض کی، فلاں بزرگ نے ایک بار یہ بات بیان کی تھی کہ جنت کا پھل ایک بالشت کے برابر ہوتا ہے۔ سیّدی دباغ نے جواب دیا، میں نے بھی اسے دیکھا ہے۔ اس کا حکم اس دیوار کی مانند ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) یعنی باب الفتوح کی مسجد میں قبلہ کی طرف دیوار موجود ہے۔ ایک

مرتبہ سیّدی دباغ نے فرمایا، اس کے پھل کا حجم اس دیوار سے کچھ کم ہے یا کچھ زیادہ ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جنت الفردوس جنت کی تمام اقسام میں سب سے افضل اور بلند ہے اور کوئی بھی دوسری جنت اس کے برابر نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ ایک جنت، جنت الفردوس سے بھی افضل و اعلیٰ ہے۔ اس جنت میں کوئی بھی نعمت موجود نہیں ہے اور یہاں صرف انبیاء اور اولیاء ہی قیام کریں گے جنہیں مشاہدۂ حق کی نعمت حاصل ہے۔ جن لوگوں کو یہ نعمت نصیب ہو ان کے نزدیک اس سے زیادہ عمدہ اور بہتر نعمت کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اس جنت کے رہنے والے کسی اور جنت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کریں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے جنت میں رہنے والے دنیا کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا گوارا نہیں کریں گے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، جنت الفردوس کے باسیوں میں اکثریت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امتیوں کی ہوگی۔ چند مخصوص لوگوں کے سوا بقیہ ساری امت جنت الفردوس میں رہے گی۔ ہم بھی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے طلب گار ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی امت سے شدید محبت ہے۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خواہش تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی امت کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھیں۔ عزیز رشتے داروں کی طرح اپنی امت کے ساتھ عمدہ سلوک کریں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس مقام پر ٹھہرایا ہے جہاں جنت الفردوس کی نعمتیں بھی حاصل ہوں گی اور اہلِ مشاہدہ کے لیے مخصوص جنت عالیہ کی نعمت بھی حاصل ہوگی۔ لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قیام گاہ دونوں جنتوں پر مشتمل ہوگی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر حال میں ان کا خیال رکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں یہ توفیق عطا فرمائے کہ ہم صحیح طور پر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پیروی کر سکیں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) جنت عالیہ وہی جنت ہے جسے حدیث میں جنت علیین کے نام سے یاد کیا گیا ہے جیسا کہ، حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ان اهل عليين ليشرف احدهم على الجنة فيضيء وجهه لهم كما يضئ القمر لاهل الدنيا ليلة البدر وان ابابكر و عمر لمنهم۔ (طبرانی، المعجم الاوسط ۲:۲۱۷)

''جب جنت علیین کا رہنے والا کوئی امتی دوسری جنت والوں کی طرف دیکھے گا تو دوسری جنتوں میں رہنے والے لوگوں کو اس کا چہرہ اس طرح روشن دکھائی دے گا جیسے دنیا میں چودھویں کا چاند روشن دکھائی دیتا ہے۔ بے شک ابوبکر اور عمر جنت علیین کے رہنے والوں میں شامل ہیں۔''

امام احمد ترمذی، ابن حبان، حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور طبرانی حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جبکہ ابن عساکر، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے حوالے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان نقل کرتے ہیں:

ان اهل الدرجات العلی یراهم من اسفل منهم کما یری الکوکب الطالع فی الأفق من آفاق السمآء وان ابابکر وعمر منهم وأنعما۔ (سنن ابن ماجہ ۱: ۳۷ رقم: ۹۶)

''جنت کے نچلے درجوں میں رہنے والے، سب سے اوپر والے درجے میں رہنے والوں کو اس طرح دیکھیں گے جیسے دنیا کا کوئی شخص آسمان میں موجود ستاروں کو دیکھتا ہے۔ ابوبکر اور عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) جنت کے اسی سب سے اوپر والے درجے میں ہوں گے۔''

یہ احادیث ''الجامع الصغیر'' میں منقول ہیں۔ اس کے علاوہ (امام سیوطی کی تصنیف) ''البدور السافرۃ'' کے جس باب میں روایت باری تعالیٰ سے متعلق روایات نقل کی گئی ہیں وہاں بھی یہ احادیث موجود ہیں۔ جنت کے سب سے بلند مرتبے کے لیے چند دیگر نام بھی منقول ہیں۔

جیسے حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ ایک حدیث میں اس کا نام ''دار المزید'' منقول ہے۔

حافظ ابونعیم اصفہانی نے حضرت بایزید بسطامی کا یہ قول نقل کیا ہے، اگر اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کو جنت میں اللہ تعالیٰ کے دیدار سے محجوب کر دیا جائے تو اسی طرح داد و فریاد شروع کر دیں گے جیسے اہلِ جہنم فریاد کریں گے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) جس ''جنت عالیہ'' کا آپ نے ذکر کیا ہے میرے خیال میں اس سے مراد جنت علیین ہے۔ آپ نے فرمایا، نہیں! جنت علیین دوسری ہے۔ میں نے عرض کی، لیکن احادیث میں تو اسی طرح منقول ہے۔ پھر میں نے حضرت ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول روایت بیان کی۔ آپ نے فرمایا، ہاں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں سمجھ گیا کہ آپ مجھے ٹالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے عرض کی، آپ اپنے علم کے مطابق جواب دیں۔ آپ نے فرمایا، جنت علیین کا مرتبہ جنت الفردوس سے زیادہ ہے لیکن جنت عالیہ دوسری جنت ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کے مشاہدے کے علاوہ اور کوئی نعمت موجود نہیں ہے۔ میں نے عرض کی، کیا اس کا نام ''دار المزید'' ہے؟ آپ نے فرمایا، ہاں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس سے پہلے یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ اہلِ مشاہدہ کے نزدیک سب سے بڑی نعمت اللہ تعالیٰ کا دیدار ہے کیونکہ اس دیدار کے نتیجے میں حاصل ہونے والی لذت جنت کی تمام نعمتوں سے بہتر ہے۔ اس جنت میں رہنے والوں کو روحانی لذت حاصل ہوگی لیکن باقی جنت میں رہنے والوں کو جسمانی لذت نصیب ہوگی اور جس شخص کو ایک قسم کی لذت نصیب ہوگی اسے دوسری قسم کی لذت نصیب نہ ہو سکے گی۔ صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دونوں طرح کی لذت سے لطف اندوز ہوں گے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس طرح مشاہدۂ حق اور اس کے اسرار سے لذت حاصل کر سکتے ہیں اس طرح کوئی اور نہیں کر سکتا اور جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنت کی دوسری نعمتوں سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں اس طرح کوئی اور نہیں ہو سکتا

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ایک نعمت سے لذت کا حصول دوسری نعمت سے لذت کے حصول کے لیے رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ پس اللہ کی ذات پاک ہے جس نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ طاقت اور صلاحیت عطا کی ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، جنت عالیہ، جنت الفردوس سے بلند ہے لیکن اس کے رہنے والوں کی تعداد دیگر تمام جنتوں سے کم ہوگی۔ جنت علیین میں بے شمار نعمتیں ہوں گی مگر جنت الفردوس کی نعمتوں کی تعداد اور اقسام اس سے زیادہ ہوں گی لیکن جنت علیین کی نعمتیں زیادہ لطیف ہوں گی۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) گویا سیّدی عبدالعزیز دباغ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جنت علیین کی نعمتیں ''دار المزید'' کی معنوی نعمت (دیدارِ خداوندی) کے زیادہ قریب ہیں۔ لہٰذا جنت علیین کی نعمتیں (جنت الفردوس سے) زیادہ لطیف ہوں گی تاہم جنت الفردوس میں نعمتوں کی تعداد زیادہ ہوگی۔ جنت علیین میں انبیاءِ کرام بھی سکونت اختیار کریں گے۔ جن میں حضرت سیدنا ابراہیم اور حضرت سیدنا اسمٰعیل علیہما السلام شامل ہیں۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے سوال کیا، پھر آپ ان احادیث کا کیا جواب دیں گے جن کے مطابق جنت الفردوس سب سے بلند مرتبہ جنت ہے؟ جیسا کہ صحیح بخاری میں یہ روایت منقول ہے:

اذا سألتم فاسئلوا اللّٰہ الفردوس فانہ وسط الجنۃ واعلیٰ الجنۃ.

''ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے جنت الفردوس کے حصول کی دعا مانگو کیونکہ یہ سب سے بہترین جنت ہے۔''

بعض علماء کے نزدیک اس حدیث میں منقول لفظ ''وسط'' کا معنی عمدہ اور بہترین ہے اور لفظ ''اعلیٰ'' اپنے حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے بلند تر اور افضل۔ امام سیوطی نے بھی یہی بیان کیا ہے کہ وسط سے مراد کسی چیز کا بلند ترین حصہ ہوتا ہے۔

جنت الفردوس کیا ہے؟

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے جواب دیا، اگر کوئی چاہے تو جنت کی ان تینوں قسموں کو ایک ہی قسم قرار دیتے ہوئے ''جنت الفردوس'' کہہ سکتا ہے۔ چونکہ جس قبہ مبارک میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیام پذیر ہوں گے وہ جنت کی ان تینوں قسموں پر مشتمل ہوگا۔ لہٰذا جنت الفردوس، جنت علیین اور دار المزید کا ہر باسی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ رہنے کا شرف حاصل کرے گا۔ لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہمراہی کا اعتبار کرتے ہوئے جنت کی ان تینوں قسموں کو ایک ہی جنت قرار دیا جا سکتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قبہ مبارک جنت علیین، جنت الفردوس اور دار المزید کے بلند حصوں پر مشتمل ہے۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس تقریر کے ذریعے اس بارے میں منقول تمام روایات میں موجود ظاہری اختلاف ختم ہو جاتا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا، کیا ان تینوں کے علاوہ دیگر جنتوں میں بھی نعمتیں موجود ہوں گی؟ آپ نے جواب دیا، ہاں! ان جنتوں کے رہنے والوں کے اعمال کے مطابق انہیں بھی نعمتیں نصیب

ہوں گی۔ البتہ جنت الفردوس میں صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت رہے گی۔ اس کے علاوہ صرف وہ لوگ رہیں گے جنہوں نے کسی بھی نبی (علیہ السلام) کا زمانہ نہیں پایا لیکن وہ اللہ تعالیٰ کی توحید کے قائل تھے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے کہا، جیسے قس بن ساعدہ اور زید بن عمرو بن نفیل۔

سیّدی دباغ نے دریافت کیا، کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دونوں کے جنتی ہونے کی گواہی دی ہے؟ اس وقت مجھے یہ مسئلہ یاد نہیں تھا لیکن بعد میں میں نے شیخ ابن خلیل سبتی کی تصنیف ''منظومتہ القبور'' کی شرح میں یہ حوالہ پڑھ لیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دونوں حضرات کا نام لے کر ان کے جنتی ہونے کی گواہی دی۔

کتاب کی اصل عبارت درج ذیل ہے:

''وہ لوگ جنہوں نے اپنی بصیرت کے ذریعے توحید کا عقیدہ اختیار کیا اور انہیں کسی شریعت میں شامل ہونے کا موقع نہیں مل سکا جیسے ''قس بن ساعدہ اور زید بن عمرو بن نفیل۔''

اس کے بعد مصنف نے بقیہ دو قسموں کا ذکر کرنے کے بعد تحریر کیا ہے:

''پہلی قسم سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں سے قس بن ساعدہ اور زید بن عمرو بن نفیل کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

انہ یبعث یوم القیامۃ امۃً واحدۃ۔

''انہیں قیامت کے دن ایک (مستقل) امت کی شکل میں زندہ کیا جائے گا۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) یہاں بعض علماء سے مراد صحیح مسلم کے شارح ''شیخ ابی'' ہیں جن کا کلام امام جلال الدین سیوطی نے اپنی تصنیف ''مسالک الحنفاء'' میں تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس کے بعد میں سیّدی دباغ کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے آپ کو ان حوالہ جات کے بارے میں بتایا۔

سیّدی دباغ نے فرمایا، میں بھی یہی بات کہنا چاہتا تھا لیکن مجھے یہ اندیشہ تھا کہ کہیں لوگ میرے حوالے سے اس بات کو نقل کرنا شروع نہ کر دیں اس لیے میں اس بات کا منتظر تھا کہ اس بارے میں کوئی حوالہ مل جائے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اب وہ حوالہ مل گیا ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، ان جیسے لوگ اس لیے جنت الفردوس میں جائیں گے کیونکہ انہوں نے کفار میں رہنے کے باوجود اللہ تعالیٰ پر ایمان مضبوط رکھا اور ان لوگوں پر خاص فضل و کرم فرمایا کہ انہیں وہ نور عطا کیا جس نے کفر کی تاریکیوں کو چیر کر انہیں توحید تک پہنچا دیا حالانکہ کسی شخص نے ان کی کوئی رہنمائی نہیں کی۔

جنت کی اقسام

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا، جنت کی کتنی قسمیں ہیں؟ آپ نے فرمایا، آٹھ ہیں۔

میں نے دریافت کیا، ان میں سے پہلی جنت کون سی ہے؟ آپ نے فرمایا، دار السلام، جنت النعیم، جنت الماویٰ، دار الخلا، جنت عدن، جنت الفردوس، جنت علیین اور دار المزید۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) علماء کی کسی بھی تحریر میں جنتوں کی تعداد کے بارے میں کوئی یقینی قول موجود نہیں ہے جیسا کہ امام جلال الدین سیوطی نے اپنی تصنیف ''البدور السافرہ'' میں تمام اقوال نقل کیے ہیں۔ بعض علماء کے نزدیک ان کی تعداد چار (4)، بعض کے نزدیک سات (7) اور بعض کے نزدیک صرف ایک (1) ہے لیکن سیّدی عبدالعزیز دباغ کا یہ کہنا کہ جنتوں کی تعداد آٹھ (8) ہے یہ قول اس روایت سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے جس کے مطابق فلاں نیک عمل کرنے والے کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ یہ الفاظ بہت سی روایات میں منقول ہیں جن کی تفصیل ''البدور السافرہ'' میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ تمام جنتیں اوپر تلے موجود ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ آپ کسی بھی سمت سے آئیں آپ کے سامنے آٹھ (8) جنتیں موجود ہوں گی کیونکہ آخرت کی کوئی بھی چیز دنیاوی معاملات سے مشابہت نہیں رکھتی۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک دفعہ میں نے سیّدی دباغ سے جنتوں کی ترتیب کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا، جنت کی کوئی بھی چیز دنیا یا کسی بھی اور مخلوق سے کوئی مشابہت نہیں رکھتی۔ صرف برزخ میں جنت کے ساتھ ہلکی سی مشابہت پائی جاتی ہے لیکن برزخ بھی کسی نے نہیں دیکھی ہے۔ اس لیے اس کی مثال دینا بھی بے سود ہوگا۔ میں نے عرض کی، احادیث میں یہ بات موجود ہے کہ برزخ ''صور'' کا دوسرا نام ہے اور یہ سینگ جیسی شکل کی ایک بہت بڑی مخلوق ہے۔ جس کے ایک حلقے کا حجم زمین و آسمان کے درمیان موجود فاصلے کے برابر ہے؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا، ہاں! اور برزخ میں کچھ سوراخ (کھڑکیاں یا الماریاں) موجود ہیں جن میں ارواح قیام کرتی ہیں۔ یہ سوراخ بہت گہرے ہوتے ہیں۔ اگر ہم ایک سوراخ کو شہد کے چھتے سے تشبیہ دیں اور پھر شہد کے بیس چھتوں کو ایک جگہ اکٹھا کریں اور ان سب کا مجموعہ ایک سوراخ بن جائے جو بے شمار سوراخوں پر مشتمل ہو۔ لہٰذا اس کا ظاہری حصہ بے شمار سوراخوں پر مشتمل ہو اور باطن میں صرف ایک ہی سوراخ ہو، جس میں شہد موجود ہو اور اس شہد کو بھی ڈھانپ دیا جائے تو یہ مثال درست ہوگی۔

جنت کی مثال

اب ہم جنت کو سامنے رکھتے ہیں کہ جنت کی مثال ان تمام چھتوں کے مجموعے کی مانند ہے۔ ہم صرف مثال بیان کررہے ہیں ورنہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی کوئی انتہا نہیں ہے، پھر اس مجموعے کو سات حصوں میں تقسیم کیا جائے تو پہلے حصے کا صرف ایک ٹکڑا موجودہ دنیا جیسی دس دنیاؤں کے برابر ہوگا۔ دوسرا حصہ اس پہلے حصے سے بھی کئی گنا بڑا ہوگا۔ تیسرا حصہ اس دوسرے حصے سے بھی کئی گنا بڑا ہوگا، چوتھے حصے میں وہ نعمتیں ہوں گی جن کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، پانچواں حصہ تیسرے کے مانند ہوگا، چھٹا دوسرے جتنا اور ساتواں پہلے جتنا ہوگا۔ یہاں آپ کو

اس غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے کہ پہلے حصے کے لوگ دوسرے حصے کے لوگوں سے کم مرتبے کے مالک ہوں گے لیکن بعض امور میں پہلے حصے کے لوگ دوسرے حصے میں بسنے والے لوگوں پر فوقیت رکھتے ہوں گے۔

ایک مرتبہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا، اللہ تعالیٰ بندۂ مومن کو جنت میں اتنی جگہ عطا فرمائے گا جتنا چھ (6) سمتوں میں انسان اور عرش کے درمیان فاصلہ موجود ہے اور یہ اس شخص کا حال ہوگا جس کا مرتبہ جنت میں سب سے کم ہوگا۔ اسی طرح آپ اس غلط فہمی کا شکار نہ ہوں کہ ہم نے جو مثال بیان کی ہے اس میں جنت کی صحیح کیفیت کو بیان کر دیا گیا ہے کیونکہ جنت اور اس مثال کے درمیان کوئی نسبت نہیں ہے۔ مثال بیان کرنے کا مقصد صرف یہ تھا تا کہ لوگ جنت سے مانوس ہو جائیں کیونکہ خاموش رہنے سے مثال بیان کر دینا بہتر ہے۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں، جنت میں موجود تخت مختلف رنگوں کا دکھائی دے گا کہیں سونے، کہیں چاندی کہیں سبز زمرد، کہیں مخمل، کہیں سرخ یاقوت وغیرہ کے رنگ پر مشتمل ہوگا۔ اس کے علاوہ اور بھی طرح کے رنگ ہوں گے جن کی کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی۔ تاہم ان کی حقیقت مختلف یا متعدد ہونے کی بجائے صرف ایک ہوگی۔ وہ تخت جنتی کو اس کی خواہش کے مطابق کہیں بھی لے جا سکے گا۔ دنیا میں ہم صرف آگے کی سمت بڑھ سکتے ہیں لیکن جنت میں چھ (6) جہات میں سے کسی بھی طرف جا سکیں گے اسی طرح جنت میں پڑوسی چھ (6) جہات میں موجود ہوں گے جبکہ دنیا میں (عام طور پر) اوپر یا نیچے کوئی پڑوسی نہیں ہوتا۔

جنت میں کھانے پینے سے متعلق جو نعمتیں ہیں دنیا کی کوئی بھی چیز ان کی مانند نہیں ہو سکتی۔ اگر ان تمام نعمتوں کی حقیقت اور ان کے انوار کے مطابق ان کا نام رکھا جائے تو کوئی بھی شخص ان کا مفہوم نہیں سمجھ سکے گا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم کی بدولت ان کے وہ نام رکھے ہیں جن سے اہلِ دنیا آگاہ ہیں اور اپنے عام محاورے میں یہی نام استعمال کرتے ہیں لہٰذا اہلِ دنیا کو سمجھانے کے لیے ان چیزوں کے نام رکھے گئے ہیں تا کہ لوگ کسی حد تک مفہوم سے آگاہ ہو سکیں اگرچہ ان ناموں کے حقیقی معانی (مروجہ معانی سے) یکسر مختلف ہیں۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، اس کی مثال ہم یوں بیان کر سکتے ہیں جیسے انتہائی چھوٹے بچوں کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے ہم چیزوں کے مختلف نام رکھ دیتے ہیں کیونکہ ان چھوٹے بچوں کی عقل محدود ہوتی ہے۔ جیسے ہمارے ہاں بچوں کے سامنے روٹی کو ''بب'' اور گوشت کو ''شتی'' کہا جاتا ہے۔

جب ہم یہ سنتے ہیں کہ جنت میں انگور ہوں گے تو ہم یہ گمان کرتے ہیں کہ شاید وہ بھی دنیاوی انگوروں کی مانند ہوں گے حالانکہ اگر جنت الفردوس کے انگور کا ایک دانہ نچلی جنت میں آ جائے تو اس جنت کے باسی اپنی جنت میں موجود تمام نعمتوں سے غافل ہو جائیں گے۔ اسی طرح نچلی جنت کے انگور کا ایک دانہ اس سے نیچے والی جنت میں آ جائے تو وہاں کے باسیوں کی بھی حالت یہی ہوگی۔ مختصر یہ کہ سب سے نیچے والی جنت کے انگور کا ایک دانہ اگر ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں میں آ جائے تو اس کے نور کی وجہ سے سورج، چاند اور تمام ستاروں کا نور ماند پڑ جائے گا اور صرف انگور کے اس دانے کا نور باقی رہ جائے گا۔

باب جنت اور حاملین عرش

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں، جنتوں کی تعداد کے مطابق ان کے دروازوں کی تعداد بھی آٹھ(8) ہے۔ جب لوگ جنت میں داخل ہو جائیں گے تو پھر یہ دروازے باقی نہیں رہیں گے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے کہا کیونکہ دروازے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ انسان اندر داخل ہو سکے یا باہر آ سکے لیکن جنت میں ایک مرتبہ داخل ہونے کے بعد باہر آنا ممکن نہیں رہے گا۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَاهُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ۔ (الحجر ۱۵:۴۸)

''جنتی وہاں سے نکالے نہیں جائیں گے۔''

سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں، حاملینِ عرش آٹھ(8) فرشتے ہیں اور یہ آٹھوں جنت کے آٹھ دروازوں کے بالمقابل کھڑے ہوں گے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا، اس میں کیا راز ہے؟ آپ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے ان آٹھوں فرشتوں اور آٹھوں جنتوں کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نور مبارک سے پیدا کیا ہے۔ اس لیے آٹھوں اقسام کو آٹھ فرشتوں کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے تا کہ اصل اور ''سر'' کے اعتبار سے دونوں میں مناسبت پائی جائے چنانچہ ہر فرشتہ اپنی مخصوص جنت کے نور سے فیض حاصل کرتا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے دریافت کیا، توبہ کا دروازہ جو اس وقت تک کھلا ہوا ہے جب تک سورج مغرب سے طلوع نہیں ہو جاتا کیا وہ بھی جنت کا ایک دروازہ ہے جیسا کہ بعض روایات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ امام ابویعلیٰ، ابن ابی الدنیا اور طبرانی نے حضرت عبداللہ بن مسعود کے حوالے سے یہ روایت نقل کی ہے:

وللجنة ثمانية ابواب سبعة مغلقة وباب مفتوح للتوبه حتى تطلع شمس منه.

(مستدرک امام حاکم، ۴:۲۹۰، رقم: ۷۶۷۱)

''جنت کے آٹھ دروازے ہیں۔ ان میں سات دروازے بند ہیں اور آٹھواں دروازہ توبہ کا ہے جو اس وقت تک کھلا ہے جب تک سورج مغرب سے طلوع نہیں ہو جاتا۔''

اس روایت کو امام جلال الدین سیوطی نے اپنی تصنیف ''البدور السافرۃ'' میں نقل کیا ہے۔

سیّدی عبدالعزیز دباغ نے اس روایت کی تاویل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ایمان کا نور بھی ایک جنت ہے بلکہ یہی نور تمام جنتوں کے حصول کا سبب ہے بلکہ یہ خود جنت کے وجود کا سبب ہے اور ہر بھلائی اور سعادت کے حصول کا بنیادی سبب ہے کیونکہ توبہ ایمان کا دروازہ ہے اس لیے توبہ جنت کا بھی ایک دروازہ شمار ہوگی۔ جو شخص جنت میں داخل ہوگا وہ ایک ادنیٰ مقام سے آ کر اعلیٰ مقام میں داخل ہوگا۔ اسی طرح توبہ کرنے والا شخص ایک ادنیٰ حالت سے بہتر حالت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اس لیے ہم توبہ کو بھی جنت کا ایک دروازہ قرار دے سکتے ہیں۔

(سیّدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں) سورج کے مغرب کی طرف سے طلوع ہونے کے بعد اس دروازے کے بند ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ اب دنیا سے حق کا نور اٹھا لیا گیا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں لفظ ''امر اللہ'' کے ذریعے اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ حدیث کے اصل الفاظ یہ ہیں:

لاتزال طائفة من امتي ظاهرين على الحق لا يضرهم من خذلهم حتى ياتي امر الله۔ (صحیح مسلم ۳: ۱۵۲۳، رقم: ۱۹۲۰)

''میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر کاربند رہے گا، معاندین کی دشمنی انہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آ جائے۔''

یہ اہلِ دیوان ہیں جن میں سے ہر ایک اپنے نصیب کے مطابق اس نور کو حاصل کرتا ہے یہی حضرات اس نور کے محافظ ہیں اور انہی کی بدولت دنیا کا نظام قائم ہے۔ جب اللہ تعالیٰ ان سب کو دنیا سے اٹھا لے گا تو دنیا میں یہ نور باقی نہیں رہے گا کیونکہ اب اس کا محافظ کوئی نہیں رہا۔ (احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس کے علاوہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے کچھ اور بھی اسرار بیان کیے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) سیّدی عبدالعزیز دباغ نے مذکورہ بالا حدیث کی جو تاویل بیان کی ہے امام عبدالرؤف مناوی نے ''الجامع الصغیر'' کی شرح میں امام ناصر الدین بیضاوی کے حوالے سے اسی طرح کی ایک تاویل نقل کی ہے اور خود بھی اس کی تائید کی ہے۔ اگر امام بیضاوی کی تاویل کا سیّدی عبدالعزیز دباغ کی تاویل سے موازنہ کیا جائے تو سیّدی دباغ کی تاویل زیادہ مناسب اور بہتر معلوم ہو گی۔

درود پاک کی برکت سے جنت پھیلتی ہے

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے سیّدی دباغ سے دریافت کیا، درود شریف پڑھنے کی وجہ سے جنت میں وسعت پیدا ہوتی ہے لیکن دیگر اذکار کو پڑھنے سے ایسا نہیں ہوتا، اس کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے جواب دیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ جنت کی اصل نورِ محمدی ہے۔ اس لیے جنت اس نور کی اسی طرح مشتاق ہوتی ہے جیسے کوئی بچہ اپنے والد کا مشتاق ہوتا ہے۔ اس لیے جنت آپ کا ذکر خیر سن کر اس کی طرف لپکتی ہے کیونکہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی سے فیض حاصل کرتی ہے، پھر سیّدی دباغ نے اس بات کو ایک مثال کے ذریعے بیان کیا، اگر کسی جانور کی خوراک چارا ہو اور وہ جانور سخت بھوکا ہو تو جیسے ہی آپ چارا اس کے پاس لائیں گے اور وہ چارے کی بو کو محسوس کرے گا تو وہ فوراً اس کی طرف لپکے گا۔ اگر آپ چارے کو پیچھے کریں گے تو وہ جانور اور آگے بڑھے گا اور اس وقت تک بڑھتا رہے گا جب تک وہ چارا اسے مل نہیں جاتا۔ جنت کے اطراف اور دروازوں پر متعین فرشتوں کی بھی یہی کیفیت ہے کہ وہ ہر وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیجنے میں مشغول رہتے ہیں اس لیے جنت ہر طرف پھیلتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اسے پابند نہ کیا ہوتا تو یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ظاہری زندگی میں دنیا میں آ جاتی اور ہر جگہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ موجود رہتی لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے اس

کے مخصوص مقام تک رہنے کا پابند کیا ہے تاکہ اہلِ ایمان آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان پر یقین کرتے ہوئے ایمان بالغیب کے طور پر جنت پر ایمان لائیں۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی امت جنت میں داخل ہو جائیں گے تو خوشی کے عالم میں جنت میں مزید اضافہ ہو جائے گا لیکن جب دیگر انبیاءِ کرام اور ان کی امتیں جنت میں داخل ہوں گے تو جنت سکڑ جائے گی۔ یہ حضرات اس کا سبب دریافت کریں گے تو جنت جواب دے گی، نہ مجھے تم سے پیدا کیا گیا ہے اور نہ تمہیں مجھ سے پیدا کیا گیا ہے۔ پھر یہ حضرات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا واسطہ پیش کریں گے جس کے نتیجے میں جنت دوبارہ پھیل جائے گی۔

بعض علماء اس بات کے قائل ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بھیجا جانے والا درود پاک یقینی طور پر مقبول ہوتا ہے۔ اس بات کی تشریح کرتے ہوئے سیّدی دباغ نے ارشاد فرمایا، بلاشبہ درود شریف پڑھنا سب سے افضل عمل ہے۔ جنت کے اطراف میں موجود فرشتوں کا وظیفہ بھی یہی ہے۔ جب وہ فرشتے درود شریف پڑھتے ہیں تو درود شریف کی برکت سے جنت پھیل جاتی ہے اور فرشتے مسلسل درود شریف پڑھتے رہتے ہیں اس لیے درجات میں بھی اضافہ جاری رہتا ہے۔ فرشتوں کا درود شریف پڑھنا اور جنت کا پھیلاؤ اس وقت رکتا ہے جب فرشتے تسبیح پڑھنا شروع کر دیتے ہیں اور فرشتے اس وقت تسبیح پڑھنا شروع کرتے ہیں جب وہ اللہ تعالیٰ کی تجلی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اگر فرشتے اپنی تخلیق کے فوراً بعد سے لے کر ابدالآباد تک تسبیح پڑھتے رہتے تو جنت میں کوئی اضافہ نہ ہوتا۔ جنت میں اضافہ صرف درود شریف پڑھنے کی برکت سے ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود صرف ان لوگوں کا درود یقینی طور پر مقبول ہوتا ہے جن کا وجود پاک وصاف ہو کیونکہ جب انسان کے وجود سے درود شریف نکلتا ہے تو وہ ہر قسم کے نقائص سے پاک ہوتا ہے مثلاً ریاکاری اور خود پسندی اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سے نقائص ہیں لیکن جس شخص کا وجود پاک وصاف ہوگا اس کے اندر یہ عیوب نہیں پائے جائیں گے۔

بعض روایات میں یہ منقول ہے:

من قال لا اله الا الله دخل الجنة۔ ''جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا وہ جنت میں داخل ہوگا۔''

(مستدرک امام حاکم، ۹:۴، ۲۷۹، رقم: ۷۶۳۸)

اس حدیث کا مفہوم بھی یہ ہے کہ جب کلمہ پڑھنے والے کی ذات اور دل پاک ہوں اور اس نے صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لیے کلمہ پڑھا ہو تو اسے یہ نعمت نصیب ہوگی لیکن اس کے باوجود یہ بات بھی پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات بے نیاز ہے، انسان کا دل مشیت الٰہی کے تابع ہے۔ اللہ تعالیٰ جس طرف چاہے اسے موڑ سکتا ہے اور اس کے برے اعمال بھی اسے اچھے دکھائی دے سکتے ہیں یہاں تک کہ انسان گناہ کی زندگی کو عبادت کی زندگی سے بہتر سمجھنے لگتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی مشیت کے فیصلے سے بھی بے پرواہ نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ دنیا و آخرت کا خسارہ نصیب ہوتا ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) سیّدی دباغ نے جو جواب دیا ہے اس کی صحت میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

درود شریف ہر حال میں مقبول ہوتا ہے

ایک مرتبہ مشہور ولی اور فقیہہ سیّدی محمد بن یوسف سنوسی سے یہی مسئلہ دریافت کیا گیا کہ بعض علماء یہ بات بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بھیجا جانے والا درود ہر حال میں مقبول ہوتا ہے (کیا یہ بات درست ہے؟) تو سیّدی سنوسی نے جواب دیا، ایسا ہی ہے اور یہ بات ''شاطبیہ'' کے شارح امام ابواسحاق شاطبی نے نقل کی ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) شیخ سنوسی سے سوال کیا گیا کہ اگر اس بات کو درست تسلیم کرلیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ درود شریف پڑھنے والا شخص یقینی طور پر ایمان کی حالت میں دنیا سے رخصت ہوگا۔ حالانکہ کسی کے بارے میں بھی یقینی طور پر یہ بات نہیں کی جاسکتی؟ شیخ سنوسی نے اس کے دو جوابات دیے ہیں لیکن دونوں عقلی جوابات ہیں اور ان کی کوئی شرعی دلیل موجود نہیں ہے۔ حالانکہ اس طرح کے معاملات میں صرف شرعی دلیل مقبول ہوسکتی ہے۔

شیخ سنوسی کا پہلا جواب یہ ہے کہ درود شریف کے قطعی طور پر قبول ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کے بارے میں یہ فیصلہ کرلے کہ اس کا انجام بخیر ہوگا تو پھر اسے یہ توفیق عطا فرماتا ہے کہ وہ عمدہ طریقے سے بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ہدیہ درود پیش کرے۔ تاہم دوسری تمام نیکیوں کی قبولیت کے بارے میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اگرچہ ان کا مرتکب ایمان کی حالت میں انتقال کر جائے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) شیخ کا یہ جواب محلِ نظر ہے کیونکہ درود شریف کو دوسری تمام نیکیوں سے ممتاز کرنا ایک شرعی حکم ہے اور اس کے لیے کسی شرعی دلیل کی موجودگی ضروری ہے۔ اگر شرعی دلیل مل جائے تو ٹھیک ہے ورنہ یہ قول مقبول نہیں ہوگا۔

شیخ سنوسی نے دوسرا جواب یہ دیا، درود شریف کے قطعی طور پر مقبول ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت سے معمور ہوکر ہدیہ درود پیش کرے گا تو یہ درود یقیناً مقبول ہوگا اور درود بھیجنے والے کو آخرت میں اس کا فائدہ نصیب ہوگا۔ خواہ وہ فائدہ عذاب میں کمی کی صورت میں ہی کیوں نہ ہو اور اللہ تعالیٰ نے اسے ہمیشہ عذاب میں مبتلا رکھنے کا فیصلہ کیا ہو۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس کے بعد شیخ سنوسی نے اسی مسئلے کو اس روایت پر قیاس کیا ہے جس کے مطابق سوموار کے دن ابولہب کے عذاب میں تخفیف کی جاتی ہے اور اس کی انگلیوں سے پانی نکلتا ہے جسے وہ پی لیتا ہے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش کی خوشخبری سنانے والی لونڈی کو اس نے اسی انگلی کے اشارے سے آزاد کردیا تھا۔ نیز ابوطالب کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمایت کی بدولت جہنم میں سب سے کم عذاب دیا جائے گا کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نسبت نہ ہوتی تو انہیں جہنم کے سب سے

نیچے والے درجے میں (سب سے زیادہ سخت) عذاب دیا جاتا۔ (حالانکہ ان دونوں صاحبان نے صرف دنیاوی رشتے داری کے اعتبار سے یہ اعمال کیے تھے) تو جب فطری محبت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت فائدہ دے سکتی ہے تو جو شخص ایمان کی حالت میں محبت اور شوق کے ساتھ ہدیہ درود پیش کرے گا اس کے اجر و ثواب کا عالم کیا ہوگا؟

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) یہ جواب بھی محل نظر ہے کیونکہ کتاب وسنت میں ایسی بہت سی نصوص موجود ہیں جن کے مطابق کفار کے تمام نیک اعمال ضائع ہو جائیں گے اور کسی بھی عمل کی قبولیت کے لیے ایمان شرط ہے جبکہ ابوطالب اور ابولہب کا معاملہ حدیث میں منقول ہونے کی وجہ سے استثنائی حیثیت اختیار کر جائے گا۔ اس لیے دیگر احکام کو اس پر قیاس نہیں کیا جاسکتا کیونکہ قیاس کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ جس حکم پر آپ کسی مسئلے کو قیاس کر رہے ہیں وہ حکم مخصوص یا استثنائی نہ ہو۔

امام جلال الدین سیوطی اپنی تصنیف ''الدرر المنتثرہ'' میں تحریر کرتے ہیں، درج ذیل روایت کی کوئی سند ہم میں نہیں ہے:

عرضت علی اعمال امتی فوجدت منها المقبول والمردود الاالصلوٰة علی۔

''میرے سامنے میری امت کے اعمال پیش کیے جاتے ہیں جو مقبول یا مردود ہو سکتے ہیں سوائے مجھ پر بھیجے والے درود کے۔''

''تمییز الطیب من الخبیث فیما یدور علی الالسنة من الحدیث'' کے مصنف فرماتے ہیں حافظ ابن حجر نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔

کل الاعمال فیها المقبول والمردود الا الصلوٰة علی فانها مقبولة غیر مردودة۔

''مجھ پر بھیجنے والے درود کے سوا ہر عمل مقبول یا مردود ہوسکتا ہے لیکن درود ہمیشہ مقبول ہوگا کبھی بھی مردود نہیں ہوگا۔''

سید سمہودی اپنی تصنیف ''الغماز علی اللماز'' میں درج ذیل حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں، ابن حجر نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

کل الاعمال فیها المقبول والمردود الاالصلوٰة علی فانها مقبوله غیر مردودة۔

''ہر نیک عمل مقبول یا مردود ہوسکتا ہے لیکن درود ہمیشہ مقبول ہوگا۔ کبھی بھی مردود نہیں ہوگا۔''

''تمییز الطیب'' کے مصنف فرماتے ہیں، مندرجہ ذیل جملہ حدیث نہیں بلکہ شیخ ابوسلیمان دارانی کا قول ہے۔

الصلوٰة علی النبیؐ لاترد

''درود شریف کو رد نہیں کیا جاتا۔''

امام غزالی نے ''احیاالعلوم'' میں اسے حدیث کے طور پر نقل کیا ہے۔ حالانکہ ہمارے شیخ (سخاوی) فرماتے

ہیں میں اس کی کسی سند سے واقف نہیں ہوں۔ البتہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول منقول ہے۔

اذا سألتم الله حاجته فابدؤا بالصلوة على النبي فان الله اكرم من ان يسال حاجتين فيقضي احداهما ويردا الاخرى۔ (کشف الخفاء ۲:۳۹)

''جب تم اللہ کی بارگاہ میں دستِ سوال دراز کرو تو آغاز میں درود شریف پڑھ لو کیونکہ اللہ تعالیٰ بڑا کریم ہے (یہ نہیں ہو سکتا) وہ تمہارے ایک سوال (درود شریف) کو قبول کر لے اور دوسرے سوال (تمہاری حاجت) کو رد کر دے۔''

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) مصنف نے اپنے جس شیخ کی طرف اشارہ کیا ہے وہ حضرت امام ابوالخیر شمس الدین محمد بن عبدالرحمان بن محمد السخاوی ہیں، جن کی تصنیف ''المقاصد الحسنۃ فی بیان کثیر من الاحادیث الدائرۃ علی الالسنۃ'' مشہور و معروف ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس تمام گفتگو کے ذریعے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بھیجے جانے والے درود کے یقینی طور پر مقبول ہونے کے بارے میں کوئی شرعی دلیل موجود نہیں ہے البتہ جن اعمال کے مقبول ہونے کا گمان غالب ہو ان میں درود شریف سب سے پہلے ہے۔

اہل جنت کا لباس

ایک مرتبہ اہلِ جنت کے لباس کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے سیّدی دباغ نے ارشاد فرمایا، یہ لباس نہ تو فنا ہوگا اور نہ ہی اہلِ جنت کے اجسام سے جدا ہوگا۔ ایک شخص ایک ہی لمحے میں ستر ہزار (70000) لباس زیب تن کر سکے گا۔ (میں نے سوال کیا) اگر اہلِ جنت کا لباس اتارا نہیں جا سکتا تو پھر جنتی ستر ہزار (70000) جوڑوں کا وزن کس طرح برداشت کرے گا؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا، یہ لباس نور کے ہوں گے۔ جنت میں کسی بھی جنتی کی نگاہ کسی خاص حد تک پہنچ کر نہیں رکے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی کوئی حد نہیں ہے۔ جبکہ جنتی کسی ایک نعمت کا مشاہدہ کرے گا تو اسی کے ضمن میں دیگر بہت سی نعمتوں کا مشاہدہ نصیب ہوگا اور اس مشاہدے کے اختلاف کی وجہ سے اسے ہر نظر کے اندر ایک نئی لذت محسوس ہوگی۔ اس کے بعد سیّدی دباغ نے اس بات کو مثال کے ذریعے سمجھاتے ہوئے بیان فرمایا، بالفرض ہم ایک بہت بڑا آئینہ دیکھتے ہیں جس میں پورا انسان دکھائی دے سکتا ہے تو ہم حیران ہوں گے لیکن پھر اگر ہمیں اسی جتنا ایک اور بڑا آئینہ مل جائے تو ہمیں حیرانگی نہیں ہوگی لیکن اگر اس سے مختلف (یعنی اس سے بھی بڑا) آئینہ نظر آئے تو ہم پھر حیران ہو جائیں گے اور اس لیے جنت میں نظر آنے والی ہر نعمت دوسرے سے مختلف ہوگی۔ (اگرچہ دونوں کی جنس ایک ہی کیوں نہ ہو کیونکہ ہر نئی اور مختلف چیز زیادہ پسند آتی ہے) سیّدی دباغ فرماتے ہیں، اولیائے کرام کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ اگر ہم ایک نعمت کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد دوبارہ پہلی نعمت کو دیکھیں تو کیا وہ پہلی نعمت وہی سابقہ نعمت ہوگی یا ایک نئی چیز ہوگی؟

اہل جنت کی حسرت ویاس

ایک دفعہ سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا، بعض اہلِ جنت' جنت میں پہنچنے کے بعد بھی غمگین ہوں گے اور حسرت کا اظہار کریں گے، حاضرین میں ایک عالم دِین بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے حضرت کے اس قول کا انکار کرتے ہوئے کہا، جنت میں کوئی حسرت اور افسوس نہیں ہوگا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے ان سے کہا، آپ حضرت کی بات کا انکار نہ کریں کیونکہ ان کی ہر بات کی تائید میں کوئی نہ کوئی نص مل جاتی ہے خواہ وہ خاص ہو یا عام ہو اور میں پانچ برس سے مسلسل اس بات کا تجربہ کر رہا ہوں۔ ہم دونوں اس وقت سفر کر رہے تھے۔ میں نے ان عالم دین سے کہا، جس بات کا آپ نے انکار کیا ہے اس کے بارے میں بھی ایک نص موجود ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس سے پہلے حضرت کا کلام ذکر کروں گا اور پھر اس کے بعد وہ نص تحریر کروں گا۔

سیّدی دباغ نے مجھے مخاطب ہوتے ہوئے ارشاد فرمایا، مفتی صاحب نے پتہ نہیں کیوں انکار کیا حالانکہ جب اہلِ جنت، جنت میں داخل ہوں گے تو حمد کا نور ان کی زبانوں پر روشن ہوگا اور یہ نور دنیا میں انہیں نصیب ہونے والی معرفت حق کے مطابق ہوگا۔ جب یہ حضرات جنت میں داخل ہو جائیں گے اور انہیں اپنے پروردگار کی مزید معرفت نصیب ہوگی۔ جو دنیا میں ان کی معرفت سے زیادہ ہوگی اور اتنی زیادہ ہوگی کہ اس کی کوئی حد بیان نہیں کی جا سکتی۔ اس وقت وہ اہلِ جنت اس بات پر افسوس کا اظہار کریں گے کہ دنیا میں انہوں نے اپنے پروردگار کی معرفت کے حصول اور اپنے پروردگار کی بندگی میں جو کوتاہیاں کی ہیں کاش وہ نہ کی ہوتیں۔ آخرت میں ایسا ہی ہوگا اور اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ اسی طرح کا معاملہ زانیوں کے ساتھ پیش آئے گا جب وہ جنت میں تجلی حق کا مشاہدہ کریں گے تو انہیں احساس ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کس قدر عظیم ہے اور ہم لوگ کس طرح اس کی نافرمانی کرتے رہے ہیں۔ یہ سوچ کر انہیں ندامت کا احساس ہوگا اور شرم کے مارے وہ بے ہوش ہو جائیں گے اور ایک طویل عرصے تک بے ہوشی کا شکار رہیں گے۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں زنا کے ارتکاب سے محفوظ رکھا وہ اس وقت یہ کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر بڑا فضل کیا کہ ہمیں آج کے دن کی شرمندگی سے بچا لیا، پھر وہ بے ہوش لوگ جب ہوش میں آئیں گے تو انہیں اس قدر کمال اور معرفت نصیب ہوگی جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) سیّدی دباغ نے صرف انہی دو واقعات کے پیشِ نظر مطلق طور پر یہ ارشاد فرمایا تھا کہ بعض جنتی، جنت میں حسرت کا اظہار کریں گے۔ اس کی تائید میں درج ذیل روایات ملاحظہ ہوں۔

احادیث سے استدلال

امام جلال الدین سیوطی نے اپنی تصنیف ''البدور السافرہ'' میں ایک مستقل عنوان کے تحت وہ روایات نقل

کی ہیں جن میں اہلِ جنت کی حسرت کا ذکر موجود ہے۔ چنانچہ امام طبرانی اور بیہقی، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالے سے نقل کرتے ہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

لم یتحسر اھل الجنة الاعلی ساعة مرت بھم لم یذکروا اللّٰہ فیھا۔(مجمع الزوائد، ۱۰:۷۳)

''اہل جنت کو اپنی دنیاوی زندگی کے ان لمحات پر حسرت ہوگی جن میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کا ذکر نہیں کیا تھا۔''

امام احمد ترمذی، ابن حبان اور حاکم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان نقل کیا ہے:

ماقعد قوم مقعدا لا یذکرون اللّٰہ فیہ ویصلون علی النبی الاکان علیھم حسرة یوم القیامة وان دخلوا الجنة للثواب۔(موارد الظمآن، ۱:۵۷۷، رقم: ۲۳۲۲)

''جب کچھ لوگ کہیں بیٹھتے ہیں اور وہاں اللہ تعالیٰ کا ذکر نہیں کرتے اور درود نہیں پڑھتے تو اگرچہ وہ اپنے دیگر نیک اعمال کی بدولت جنت میں داخل ہو جائیں گے پھر بھی انہیں حسرت ہوگی (کہ انہوں نے اس مجلس میں اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ذکر کیوں نہیں کیا تھا)''

امام بیہقی اور ابن ابی الدنیا، ام المؤمنین سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حوالے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان نقل کرتے ہیں:

مامن ساعة تمر بابن آدم لم یذکر اللّٰہ فیھا الا تحسر علیھا یوم القیامة۔

(شعب الایمان، ۱:۳۹۲، رقم: ۵۱۱)

''انسان جس گھڑی میں اللہ کا ذکر نہیں کرتا وہ گھڑیاں قیامت کے دن اس کے لیے حسرت کا باعث بنیں گی۔''

امام سیوطی اہلِ جنت کے لباس کے عنوان کے تحت درج ذیل روایات نقل کرتے ہیں:

امام ابوداؤد طیالسی، نسائی، ابن حبان اور حاکم، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان نقل کرتے ہیں:

من لبس الحریر فی الدنیا لم یلبسہ فی الاخرة وان دخل الجنة لبسہ اھل الجنة ولم یلبسہ ھو۔(صحیح ابن حبان، ۱۲:۲۵۸، رقم: ۵۴۳۷)

''جو شخص دنیا میں ریشمی کپڑے پہنے گا وہ آخرت میں نہیں پہن سکے گا۔ اگرچہ وہ جنت میں داخل ہو بھی گیا تو اسے ریشمی لباس نصیب نہیں ہوگا۔ اگرچہ دیگر اہلِ جنت نے ریشمی کپڑے پہن رکھے ہوں گے۔''

امام بخاری و امام مسلم، حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ

فرمان نقل کرتے ہیں:

من شرب الخمر فی الدنیا ثم لم یتب منها حرمها فی الاخرۃ۔

''جو شخص شراب نوشی کرے اور پھر توبہ نہ کرے تو وہ آخرت میں (جنتی مشروبات سے) محروم رکھا جائے گا۔'' (صحیح بخاری'۵:۲۱۱۹'رقم:۴۲۵۳)

اس بارے میں اور بھی بہت سی احادیث منقول ہیں لیکن ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں کیونکہ کتاب کا مرکزی مضمون سیّدی دباغ کے ملفوظات کو اکٹھا کرنا ہے۔اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے ذریعے نفع عطا فرمائے۔

سیّدی دباغ ارشاد فرماتے ہیں، عام مؤمنین جنت کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے اور ان نعمتوں کی طرف متوجہ رہیں گے لیکن اولیاءِ کرام کیونکہ غیر اللہ سے لاتعلق ہو چکے ہوتے ہیں اس لیے ان کی توجہ جنت کی نعمتوں کی طرف مبذول نہیں ہو گی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ان اولیاء کی توجہ پہلے غیر اللہ کی طرف مبذول ہوتی ہے اور پھر اللہ تعالیٰ انہیں غیر اللہ سے لاتعلق کر دیتا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں سرے سے غیر اللہ کا خیال آتا ہی نہیں ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) سیّدی عبدالعزیز دباغ کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ انسان نعمتوں کے حصول کے بعد نعمتیں عطا کرنے والی ذات سے غافل نہ ہو بلکہ اپنے آقا و مولا کی طرف متوجہ رہے اس کی بارگاہ میں گریہ وزاری کرے۔ جب اس کی توجہ نعمت کی طرف مبذول ہو تو یہی خیال آئے کہ اس نعمت کی وجہ سے مجھے اپنے ربّ کی محبت نصیب ہوئی ہے اور انسان اس بات کا اقرار کرے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے یہ نعمت عطا کی ہے۔لہٰذا وہ ہمیشہ اس بات کو پیشِ نظر رکھے۔ بالفرض اگر وہ نعمت حاصل نہ ہوتی یا حاصل ہونے کے بعد رخصت ہو جاتی تو بھی اس کی توجہ صرف اپنے خالق کی طرف مبذول رہتی اور وہ ہر وقت بحرِ توحید اور اسرارِ الوہیت میں غوطہ زن رہتا۔ نعمت کی موجودگی یا عدم موجودگی اللہ تعالیٰ کی ذات سے غفلت کا باعث نہ ہوتی۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، جب ولی کو اللہ تعالیٰ سے اپنی مراد مل جائے تو اسے یہ پرواہ نہیں ہوتی کہ اللہ تعالیٰ اسے کس حال میں رکھے گا؟

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس کے بعد سیّدی دباغ نے ایک مثال کے ذریعے اس بات کی وضاحت کی۔

شہد کے کیڑے کو شہد کھانے کا بہت شوق ہوتا ہے اگر اسے شہد کے مٹکے میں ڈال دیا جائے تو اسے اپنا گوہرِ مقصود مل جائے گا اور وہ دن رات شہد کھانے میں مصروف رہے گا۔ پھر اگر اس مٹکے کو ایک اور مٹکے میں ڈال دیا جائے جس میں سیسہ بھرا ہوا ہو تو اس کیڑے کی توجہ شہد کے علاوہ اور چیز کی طرف متوجہ نہیں ہو گی اور سیسے کی بو اس کی طبیعت خراب نہیں کرے گی کیونکہ شہد کی طرف اس کی توجہ اور شوق نے اسے ہر چیز سے غافل کر دیا ہے اس لیے اسے کسی بھی چیز کا خیال ہی نہیں آئے گا۔

بارھواں باب

جہنم کا بیان

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، جہنم میں اہلِ جہنم کو درخت اور نہریں جو درحقیقت ان کے قریب ہوں گی بہت دور محسوس ہوں گی اتنی دور جتنا سات زمینوں کے درمیان موجود فاصلہ ہے۔ یہ بات بھی ان کے لیے عذاب کا باعث ہوگی چونکہ انہیں یہ محسوس ہوگا کہ دور بہت دور سرسبز وشاداب درخت دکھائی دے رہے ہیں۔ وہ ان درختوں کا پھل کھانے اور اپنے عذاب سے بچنے کے لیے لپک کر ان درختوں کی طرف جائیں گے اور اس قدر طویل فاصلے کو تین قدموں میں پورا کرلیں گے اور جاتے ساتھ ہی ان درختوں کے پھل اور پتے توڑ کر منہ میں ڈالیں گے۔ جنت یا جہنم میں جو چیز ایک مرتبہ منہ میں ڈال لی جائے اسے واپس باہر نہیں نکالا جاسکتا۔ البتہ دنیا میں ہم ایسا کر سکتے ہیں۔ لہٰذا جب جہنمی ان درختوں کا پھل کھائیں گے تو ان کا ذائقہ سابقہ عذاب سے زیادہ محسوس ہوگا اور وہ الٹے قدموں واپس دوڑیں گے یہاں تک کہ ان پھلوں کی جلن کے باعث واپسی کا فاصلہ وہ ڈیڑھ قدم میں طے کریں گے۔

جہنم کی آگ

ایک مرتبہ جہنم کی آگ کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے سیّدی دباغ نے ارشاد فرمایا، جہنم کی آگ کی مثال دنیاوی آگ کی مانند نہیں ہے کیونکہ اگر کوئی جسم کچھ دیر تک دنیاوی آگ میں موجود رہے تو اس آگ سے مانوس ہو جاتا ہے اور تکلیف کی شدت باقی نہیں رہتی جو ابتدا میں تھی۔ اس لیے جہنم میں وہ آگ ہوگی جس کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔ اگر اس آگ کے چھوٹے سے ٹکڑے کو خلا میں دھوئیں کی شکل میں بکھیر دیا جائے تو (سورج، چاند، ستاروں کی) تمام روشنی چھپ جائے گی اور اگر ساری روئے زمین کو آگ بنا دیا جائے تو پھر اسے بھینچ کر ایک صندوق کی شکل دے دی جائے اس وقت یہ صحیح آگ بنے گی جو دوزخ میں موجود ہوگی۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، جہنم میں بہت سی وادیاں ہوں گی۔ ایک مرتبہ میں نے ایک عورت کو پیاس کی شدت کے باعث ایک دوسری وادی کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا جو اتنے ہی فاصلے پر موجود تھی جتنے فاصلے پر

درخت محسوس ہوتے تھے۔ اس عورت نے اپنے کمسن بچے کو پشت پر لادا ہوا تھا لیکن جب اس نے دوسری وادی میں پہنچ کر پانی کا گھونٹ بھرا تو وہ دونوں ماں بیٹا جل گئے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے سیّدی دباغ سے یہ دریافت نہیں کیا کہ کیا وہ بچہ جہنم میں پیدا ہوا تھا یا دنیا میں پیدا ہوا تھا؟ اگر وہ دنیا میں پیدا ہوا تھا تو مجھے معلوم ہے کہ ایسے بچوں کے بار میں علماء کی آراء مختلف ہیں کیونکہ ایک روایت کے مطابق کفار کے بچوں کے انجام کے بارے میں دریافت کیے گئے ایک سوال کے جواب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا:

اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا عَامِلِيْنَ۔ (صحیح مسلم ۴:۲۰۴۸، رقم:۲۶۵۸)

''اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ کیا عمل کرتے''

امام مالک کی بھی یہی رائے ہے۔ لہٰذا اس اصول کے تحت جس بچے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کو یہ علم ہو کہ اگر وہ بڑا ہوتا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لاتا، ایسا بچہ جنت میں داخل ہوگا اور جس بچے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کو یہ علم ہو کہ اگر وہ بڑا ہوتا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انکار کرتا تو ایسا بچہ جہنم میں داخل ہوگا۔ لہٰذا مذکورہ روایت کو اسی اصول کے پیشِ نظر پرکھا جائے گا اور حضرت خضر علیہ السلام نے جس بچے کو کمسنی میں قتل کر دیا تھا اس کی بھی یہی توجیہہ ہوگی کیونکہ اس کے بارے میں علماء کا بیان ہے کہ کمسنی کے باوجود فطری طور پر وہ کافر تھا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) میں نے سیّدی دباغ سے یہ مسئلہ دریافت کیا، آپ نے جواب دیا، صحیح قول یہی ہے جو تمہاری بیان کردہ حدیث سے ثابت ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، بہت سے کمسن بچوں کو قیامت کے دن قرآن کے حافظوں کی شکل میں اٹھایا جائے گا کیونکہ یہ بات اللہ تعالیٰ کے علم میں موجود تھی۔ اگر وہ بچے بڑے ہوتے تو قرآن حفظ کرتے۔ اسی طرح بہت سے کمسن بچوں کو اولیاء و علماء کی شکل میں اٹھایا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ اس بات سے واقف ہے کہ اگر وہ بچے بڑے ہوتے تو علماء و اولیاء کی صف میں شامل ہوتے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) زمانہ طالب علمی میں ہمارا ایک ساتھی جو سنِ بلوغ کی حد تک پہنچ چکا تھا اس نے قالون اور ابن کثیر کی روایت کے مطابق قرآن پڑھ رکھا تھا۔ وہ مشہور صوفی بزرگ شیخ ابویعزیٰ کی زیارت کے لیے گیا تاکہ ان سے ساتوں قرأتوں کی اجازت کرے۔ شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی درخواست پیش کرتے ہوئے اس نے کہا، میں تین دن تک سفر کرنے کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں اور میرا مقصد صرف اجازت کا حصول ہے لہٰذا آپ مہربانی فرمائیں۔ یہی بات کہتے ہوئے اس کی آنکھ لگ گئی اس نے خواب میں دیکھا، سیدی ابویعزیٰ اس کے پاس کھڑے ہوئے ہیں اور ان کے ہاتھ میں ایک اجازت نامہ موجود ہے۔ بلادِ مغرب کے عام رواج کے مطابق اس پر دیگر علماء اور قراء کے تائیدی دستخط موجود ہیں کہ یہ شخص ساتوں

قرأتوں کا عالم ہے۔ پھر اس کی آنکھ کھل گئی اور سیّدی ابویعزیٰ نے اسے ساتوں قرأتوں کا تحریری اجازت نامہ عطا کیا۔ اپنے گھر واپس آنے کے فوراً بعد وہ شدید بیمار ہوکر انتقال کرگیا۔ اسے قرأت سیکھنے کا موقع نہیں مل سکا۔ اس کے والد نے مجھ سے اس خواب کی تعبیر پوچھی تو میں نے جواب دیا، قیامت کے دن وہ ساتوں قرأتوں کے علماء کے زمرے میں اٹھایا جائے گا۔ یہ تعبیر سن کر اس کا والد بہت خوش ہوا اور اس کا غم ہلکا ہوگیا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) کفار کی اولاد کے بارے میں تفصیلات کے لیے علامہ ابن حجر کی تصنیف ''فتح الباری'' کے کتاب الجنائز اور امام سیوطی کی ''البدور السافرہ'' کا مطالعہ کیا جائے۔

جہنم کے پاس سے گزرنے والا ہر مسلمان یا کافر جہنم کے داروغے کو دیکھ سکتا ہے لیکن جب مومن اسے دیکھے گا تو اس سے خوفزدہ نہیں ہوگا کیونکہ وہ یہ بات جانتا ہے کہ اس داروغے کو اس کے ایمان کے نور سے پیدا کیا گیا ہے لیکن کافر اسے دیکھنے کے ساتھ ہی رعب کے مارے مرجائے گا۔

جہنم کی وسعت

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، ادنیٰ ترین کافر کے لیے بھی جہنم کی وسعت کا عالم یہ ہوگا جتنا دس زمینوں کا مجموعی حجم ہوتا ہے۔ میں نے عرض کی، پھر ان کے لیے تنگی کس طرح ہوگی؟ آپ نے فرمایا، انہیں عذاب کی وجہ سے تنگی پیش آئے گی۔ میں نے عرض کی، اگر کسی شخص کو اس کے گھر میں زدوکوب کیا جائے اور اسے اپنے گھر کی وسعت کا علم ہو تو اس کی بے چینی اس شخص کی نسبت کم ہوگی جسے ایک مختصر اور تنگ کوٹھری میں مارا پیٹا جارہا ہو؟

سیّدی دباغ نے جواب دیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ کھلے مکان والے شخص کے لیے گھر کی فضا عذاب کا باعث نہیں لیکن جہنم کی فضا بھی عذاب ہوگی کیونکہ وہ خالص ترین آگ سے بنی ہوگی۔ اس لیے جہنمیوں کو ظاہری اور باطنی دونوں طرح کا عذاب دیا جائے گا اور وہ یوں تڑپے گا جیسے مرغی کی گردن پر چھری پھیر دی جائے تو وہ تڑپنے لگتی ہے۔ اس حالت میں وہ روئے گا، چیخے چلائے گا، فریاد کرے گا اگر اس وقت کوئی مومن اس کے پاس سے گزر جائے تو اس کی داد فریاد کی شدت کے باعث اس مومن کے حواس معطل ہو جائیں گے لیکن جہنمیوں کے عذاب میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے گا آگ کی شدت ان کے لیے زیادہ ہوتی چلی جائے گی بالکل اسی طرح جیسے کوئلے کی راکھ جھاڑنے سے اس کے اندر موجود آگ کی شدت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔

جہنم میں مکانات، محلات، دروازے، درخت، باغات اور وادیاں بھی موجود ہوں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے دنیا میں یہ سب کچھ موجود ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اگر آپ جہنم کے ان محلات میں سے کسی ایک محل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا بھی لے لیں تو وہ بھی آگ سے بنا ہوا ہوگا۔ گویا یہ سب گھر، محل، درخت، باغات اور وادیاں سب کچھ خالص آگ سے بنا ہوا ہوگا اور اگر اس ایک ٹکڑے کو زمین پر ڈال دیا جائے تو ساری دنیا جل کر راکھ ہو جائے گی۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، انسان کے کسی برے عمل کے نتیجے میں اس کے لیے جہنم میں آگ کا محل تعمیر کر

دیا جاتا ہے پھر جب وہ اس برائی سے سچی توبہ کرلے اور اللہ تعالیٰ بھی اس کی توبہ کو قبول فرمالے تو وہ محل ختم ہو جاتا ہے اور اس کے عوض میں اس بندۂ مومن کے لیے جنت میں ایک محل تعمیر کر دیا جاتا ہے۔

اس کے بعد سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ایک واقعہ سنایا، ایک مسلمان عورت حاملہ تھی۔ اس کے پیٹ میں موجود بچے نے بڑا ہو کر غوث بننا تھا۔ اس عورت کے پڑوس میں شادی کی تقریب تھی وہ عورت بھی اس تقریب سے لطف اندوز ہونے کے لیے وہاں چلی گئی۔ اتفاق سے دلہن کا ایک قیمتی کپڑا چوری ہو گیا اور اس چوری کا الزام اس عورت پر عائد کیا گیا۔ اس عورت کو شادی کے گھر میں ہی روک لیا گیا۔ اس عورت کا شوہر ایک سیّد تھا اور اس بات کو سخت ناپسند کرتا تھا کہ اس کی بیوی پڑوسیوں کے گھر جانا تو بہت دور کی بات ہے اپنے گھر کے دروازے تک بھی آئے۔ اس کا شوہر غصے کا بھی تیز تھا۔ اس لیے اس عورت کو یہ اندیشہ ہوا کہ اگر میرے خاوند کو صرف اتنا ہی پتہ چل گیا کہ میں پڑوسیوں کے ہاں آئی ہوں تو وہ میرے ساتھ سختی سے پیش آئے گا اور اسے یہ پتہ چل گیا کہ مجھ پر چوری کا الزام بھی عائد کیا گیا ہے تو نجانے کیا ہو؟ مزید ستم یہ ہے کہ پڑوسیوں نے اسے اپنے گھر میں قید بھی کر لیا ہے۔ وہ عورت شدید خوف زدہ ہو گئی۔ لہٰذا جس عورت نے اس پر جھوٹا الزام عائد کیا تھا اس کے لیے جہنم میں آگ کے محل تعمیر کر دیے گئے۔ اس عورت کے ہاں بچہ پیدا ہوا وہ بچہ بڑا ہوا اس دوران اس کے والدین انتقال کر چکے تھے۔ اب اس نوجوان کی یہ خواہش تھی کہ وہ نکاح کر لے (لیکن مطلوبہ رقم موجود نہیں تھی۔ اس کی ماں پر چوری کا جھوٹا الزام لگانے والی) اس عورت نے اس نوجوان کو نکاح کے لیے کچھ رقم دی جسے مہر کے طور پر ادا کر کے اس نوجوان نے نکاح کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم کی بدولت اس عورت کی نیکی کو قبول کرتے ہوئے اس نیکی کی بدولت جہنم میں اس عورت کے لیے تیار کیے گئے محلات کو ختم کر دیا۔ بلاشبہ اللہ کی ذات پاک ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، انسان جو بھی قدم آگے یا پیچھے کی طرف بڑھاتا ہے اس کے عوض میں اس کے لیے جنت یا جہنم میں ایک محل تعمیر کر دیا جاتا ہے یہاں تک کہ اگر نیند کی حالت میں اس کے باطن میں کوئی اختلاج پیدا ہو تو اس کے نتیجے میں بھی جنت یا جہنم میں ایک محل بن جاتا ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انسان جب کوئی اچھا یا برا عمل کرتا ہے اس کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے؟

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) خواب انسان کے ارادے کے تحت نہیں آتے لہٰذا جو عمل انسان کے ارادے اور اختیار سے باہر ہو اس کا بدلہ کیسے مل سکتا ہے؟ سیّدی دباغ نے جواب دیا، اصل اعتبار اس حالت میں ہوگا جس میں انسان کو قصد اور ارادے کا اختیار حاصل ہو۔ جب کافر کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے تو وہ اس اختیار کو کفر کے لیے استعمال کرتا ہے اس لیے قصد یا غفلت کسی بھی حالت میں اس سے صادر ہونے والے برے فعل کے نتیجے میں اس کے لیے جہنم میں محل تعمیر کیے جاتے ہیں لیکن جب مومن کو قصد یا ارادے کا اختیار حاصل ہوگا تو وہ ایمان کو اختیار کرے گا۔ اس لیے قصد یا غفلت کی حالت میں اس سے صادر ہونے والے کسی بھی نیک عمل کے نتیجے میں اس کے لیے جنت میں محلات تعمیر کر دیے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ایمان پر ثابت قدم رہنے اور

مؤمنین کے گروہ میں شامل رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

کفار فروعی احکام کے پابند ہیں؟

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس مسئلے میں علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے کہ کفار شرعی احکام کے فروعی مسائل پر عمل کرنے کے پابند ہیں یا نہیں ہیں؟ پھر علماء میں یہ اختلاف بھی پایا جاتا ہے کہ کفار کے ان اعمال کا کیا حکم ہو گا جو مباح ہوں، مثلاً کھانا پینا؟ بعض علماء اس بات کے قائل ہیں کہ کفار کے لیے کوئی بھی چیز مباح نہیں ہے کیونکہ کسی چیز کا مباح ہونا ایک شرعی حکم ہے جبکہ کفار، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت کے قائل ہی نہیں ہیں۔ امام تقی الدین سبکی اور دیگر محققین کی یہی رائے ہے اور ہمیں بھی یہی درست معلوم ہوتی ہے کہ کفار کا ہر عمل ان کے لیے گناہ ہے اور شیخ کے کلام سے بھی یہی بات واضح ہوتی ہے۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، اگر آپ جنت یا جہنم کے باغات اور محلات کو دیکھ لیں تو آپ کو اس انعام و اکرام یا عذاب اور لوگوں کے اعمال کے درمیان ایک ربط دکھائی دے گا۔

نیکی کی جزا

اس کے بعد سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ایک واقعہ بیان کیا، ایک ولی نے کسی زندہ مسلمان کا جنت میں محل دیکھا جو مسلسل پھیل رہا تھا۔ پھر اس ولی نے اس مسلمان کو دیکھا کہ وہ اپنی دکان میں بیٹھا ہوا کپڑے فروخت کر رہا ہے۔ اچانک اسے کچھ خیال آیا وہ اٹھا دکان بند کی اور اپنے گھر روانہ ہو گیا۔ گھر جا کر اس نے اپنی اہلیہ سے کہا، ہمارے پڑوسیوں کے ہاں کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ (سیّدی دباغ فرماتے ہیں) اس شخص کے پڑوس میں ایک بیوہ عورت رہتی تھی۔ جس کی چند بیٹیاں تھیں۔ اس عورت نے اپنی بیٹیوں سے کہا، تم جلدی سے محنت کر کے کپڑے تیار کرو تا کہ ہم انہیں فروخت کر کے کھانے پینے کا سامان خرید سکیں۔ دوسری طرف اس شخص نے اپنی بیوی سے کہا، تم اپنے لیے اور پڑوسیوں کے لیے کھانا تیار کرو اور خود بازار سے جا کر دودھ لے آیا۔ جب کھانا تیار ہو گیا تو اس نے کھانے اور دودھ کے دو حصے کیے ایک حصہ اپنے لیے رکھا اور دوسرا ایک برتن میں رکھ کر پڑوسیوں کے دروازے تک آیا۔ پڑوسن کی بیٹیاں شدید بھوکی ہونے کے باوجود پوری تندہی سے کام میں مصروف تھیں۔ اس نے ان سے کہا، یہ میں تمہارے لیے کھانے کے لیے کچھ لے کے آیا ہوں۔ تم یہ کھا لو۔ اس کے ساتھ دودھ بھی موجود ہے۔ ان بچیوں نے کھانا کھا کر اور دودھ پی کر انتہائی مسرت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ دعا کی کہ اللہ تعالیٰ اس کے صدقے کو قبول کرے۔

اس ولی نے جب اس بندہ مومن کی اس نیکی کی طرف دیکھا تو وہ بڑھ کر اس قدر پھیل چکی تھی۔ جسے بیان نہیں کیا جا سکتا حالانکہ جس شخص نے یہ نیکی کی تھی اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ میری نیکی اس قدر پھیل چکی ہو گی۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی انسان کو یہ توفیق عطا فرماتا ہے جس کے نتیجے میں وہ آخرت کے بے شمار اجر و ثواب کا مستحق ہو گا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) ایک مرتبہ میں نے سیّدی دباغ سے ایک ظالم حاکم کے بارے میں دریافت کیا جسے معزول کیا جاچکا تھا اور لوگ اس کی معزولی سے خوش تھے۔ میں نے عرض کی، آپ اسے بددعا دیں۔ آپ نے فرمایا، بھائی صاحب! ابھی اس کا وقت پورا نہیں ہوا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اسے دوبارہ اس کے منصب پر بحال کر دیا گیا اور آج 1136ھ میں رمضان المبارک کی آخری تاریخ ہے وہ ظالم آج بھی اپنے منصب پر ظلم وستم میں مصروف ہے۔

سیدی دباغ فرماتے ہیں، حیوانات کو کوئی ثواب یا عذاب نہیں ہوگا۔ البتہ بعض حیوانات کو جہنم میں اہلِ جہنم کو عذاب دینے کے لیے مامور کیا جائے گا اور بعض حیوانات جنت میں نعمت کے طور پر اہلِ جنت کو نصیب ہوں گے۔

عیدالاضحیٰ کے دن سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ارشاد فرمایا، آج کے دن بہت سے فرشتے قربانی کے جانوروں کی ارواح قبض کرنے کے لیے زمین پر نازل ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہر اس مقام پر فرشتے گھومتے ہیں جہاں قربانی کی جاتی ہے۔ یہ فرشتے آج کے دن کے سوا اور کسی بھی دن نازل نہیں ہوتے۔ جب کسی جانور کو ذبح کر دیا جاتا ہے تو یہ اس کی روح کو جنت یا جہنم میں لے جاتے ہیں۔ اگر قربانی کرنے والے شخص نے نیک نیّتی کے ہمراہ، اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے قربانی کی ہو تو یہ فرشتے اسے جنت میں لے جاتے ہیں جہاں یہ جانور ایک نعمت کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے لیکن اگر قربانی کرنے والے کی نیت خراب ہو اور اس نے اللہ کی رضا کے حصول کی بجائے کسی اور مقصد کے حصول کے لیے قربانی کی ہو تو اس جانور کی روح کو فرشتے جہنم میں لے جاتے ہیں جہاں وہ ایک عذاب کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ اگر آپ اس کی روح کو جہنم میں دیکھ لیں تو آپ کو یوں محسوس ہوگا کہ جیسے وہ جانور اور اس کے تمام اعضاء سخت ترین آگ سے بنے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔

اس کے بعد سیّدی عبدالعزیز دباغ نے ہمیں تلقین کی، دوسروں کو بھی یہ بات بتا دیں کیونکہ اس کا جاننا بہت ضروری ہے۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں، کیونکہ وہ عید کا دن تھا) اس لیے میں نے بھی کچھ لوگوں کو یہ بات بتا دی۔ اللہ تعالیٰ ہم تمام مسلمانوں کو نیک نیّتی کے ہمراہ نیک اعمال کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

جنات کو ملنے والا عذاب

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، جہنم میں جنات کو آگ کا عذاب نہیں دیا جائے گا کیونکہ آگ ان کی سرشت میں داخل ہے۔ اس لیے انہیں آگ کی تکلیف محسوس نہیں ہوگی۔ جنات کو سردی کا عذاب دیا جائے گا کیونکہ دنیا میں بھی جنات سردی سے بہت ڈرتے ہیں یہاں تک کہ اگر گرمی کے موسم میں ٹھنڈی ہوا چل پڑے تو جنات پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جنات اور شیاطین پانی میں داخل نہیں ہوتے۔ یہاں تک کہ اگر کسی جن یا شیطان کو پانی میں ڈال دیا جائے تو اس طرح ہلاک ہو جائے گا جیسے کوئی انسان آگ میں گر کر ہلاک ہو جاتا

ہے۔

اگر آپ یہ جاننا چاہیں کہ جنات کا جسم کیسا ہوتا ہے تو آپ کسی ایسی تاریک آگ کو دیکھیں جس میں بے شمار دھواں موجود ہو۔ جیسے کمہاروں کی بھٹی میں سے دھواں نکلتا ہے اس دھوئیں کے ذریعے جو شکل بنے گی وہ جن کی مانند ہوگی۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، قاتلوں کو عام اہلِ جہنم (انسانوں) سے مختلف عذاب دیا جائے گا۔ میں نے اس کا سبب دریافت کیا تو آپ نے ایک مثال کے ذریعے اس کی وضاحت کی، فرض کریں ایک بادشاہ نے دو دیواریں قائم کر رکھی ہیں جن میں سے ایک پر مسلمان کو موت کی سزا دی جاتی ہے اور دوسری کفار کو سزا دینے کے لیے مخصوص ہے۔ اب اگر وہ بادشاہ کسی مسلمان کو کفار کے لیے مخصوص دیوار پر قتل کیے جانے کی سزا دے دے تو اس کا یقینی مطلب یہی ہوگا کہ موت کی سزا کے ساتھ ساتھ اس کو تذلیل کی سزا بھی دی گئی ہے۔

میں نے عرض کی، اس مثال کی وضاحت فرمائیں، آپ نے ارشاد فرمایا، جہنم میں دو طرح کا عذاب ہوگا۔ ایک گرم، جس میں کافر انسانوں کو مبتلا کیا جائے گا اور دوسرا ٹھنڈا، جس میں شیاطین کو مبتلا کیا جائے گا۔ قاتلوں کو بھی یہی عذاب دیا جائے گا اور یہ عذاب صرف قاتلوں کو ہی نہیں بلکہ بعض دیگر نافرمانوں کو بھی دیا جائے گا۔

(احمد بن مبارک کہتے ہیں) اس کے بعد سیّدی دباغ ان نافرمانوں کی تفصیل اور اس عذاب کی حکمت بیان کرنا چاہتے تھے کہ کسی نے درمیان میں آ کر قطع کلامی کر دی۔

سب سے زیادہ سخت عذاب کسے ہوگا؟

ایک دفعہ سیّدی دباغ نے مجھ سے دریافت کیا، کیا تم جانتے ہو قیامت کے دن سب سے زیادہ سخت عذاب کسے دیا جائے گا؟ میں نے دریافت کیا، کسے؟ آپ نے فرمایا، وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ تندرست جسم، کامل عقل اور مکمل صحت عطا فرمائے، اسے رزق عطا فرمائے، زندگی بسر کرنا اس کے لیے آسان ہو اور پھر ایک یا دو دن تک اس شخص کو اپنے خالق کا خیال ہی نہ آ سکے اور اس کے برعکس جب وہ کسی معصیت کا مرتکب ہونے لگے تو اس کی توجہ مکمل طور پر معصیت کی طرف مبذول ہو اور وہ بھرپور طریقے سے اس گناہ سے لطف اندوز ہو گویا گناہ سے اس کا تعلق پختہ ہو چکا ہو اور وہ اللہ تعالیٰ سے لاتعلق ہو چکا ہے۔ اس لیے اسے قیامت کے دن سب سے زیادہ شدید عذاب دیا جائے گا۔

سیّدی دباغ فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی ذات سے غافل ہونا اور خاص طور پر معصیت کے ارتکاب کے وقت غافل ہونا بہت بڑا گناہ ہے۔ اس لیے بندۂ مومن کو چاہیے کہ اگر کسی وقت اس سے گناہ کا صدور ہونے لگے تو وہ فوراً یہ خیال کرے کہ اس کا ربّ موجود ہے جو (اسے عذاب دینے پر) قادر ہے۔ یہ سوچ کر اس بندۂ مومن کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا ہوگا اور اس حالت میں اگر اس کا گناہ مکمل طور پر معاف نہ بھی ہو تو بھی گرفت کی شدت میں کمی آ جائے گی۔

یہ وہ آخری الفاظ تھے جو فقیہ، علامہ، شیخ، سیّدی احمد بن مبارک السلجماسی اللمطی نے اپنے شیخ طریقت، غوث زمان، سیّدی ومولائی عبدالعزیز بن مسعود الدباغ الحسنی الادریسی کی زبانی سنی ہوئی باتوں کو ملفوظات کی شکل میں مرتب کر کے تحریر کیے۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات سے راضی رہے اور انہیں بھی راضی رکھے اور ہم سب مسلمانوں کو ان کے علوم سے فیض یاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

وصلی اللّٰہ علیٰ سیدنا و مولانا محمدوالہٖ واصحابہٖ وبارك وسلم۔

حسبنا اللّٰہ ونعم الوکیل۔

ولاحول ولاقوۃَ الاباللّٰہِ العلی العظیم۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

١

https://ataunnabi.blogspot.com/
المتجر الرابح
الابریز
حضرۃ عبدالعزیز دباغ
بہترین تشریحات
ذخیرۃ الملوک
سید علی ہمدانی
معارف جہانگیری
محمد محی الدین
نوریہ رضویہ پبلیکیشنز